DUE DATE

*Cl. No.*_______________ *Acc. No.* _______________

Late Fine Ordinary books 25 p. per day, Text Book Re. 1/- per day, Over night book Re. 1/- per day.

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

شگوفہ

مجتبیٰ حسین نمبر

جلد ۲۰ ○ نومبر ۱۹۸۷ء

شمارہ خصوصی

ایڈیٹر:
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

سرورق
طالب خوندمیری

کتابت
محمد عبدالرؤف
مسعود انور
محمود سلیم

مجلسِ مشاورت
○ بھارت چند کھنہ
○ نریندر لوتھر
○ یوسف ناظم

مجلسِ ادارت
○ حمایت اللہ
○ محمد منظور احمد
○ مسیح انجم

قیمت خصوصی نمبر ۵۵ روپے

مطبوعہ: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس
چارکمان، حیدرآباد ۲
۔ دائرہ پریس، چھتہ بازار

خط و کتابت کا پتہ:
شگوفہ
۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱
فون آفس: 557716 ☆ فون رہائش: 521064

فہرست

قصہ مختصر (زندگی کے حالات)

مجتبیٰ حسین..... سوانحی حالات ۳۳

قطعِ کلام (تنقید)

تکلف برطرف (خاکے)

عبارت کیا...

... اشارت کیا

... اداکیا؟

سو ہے یہ بھی آدمی

(مباحثہ)

الغرضؔ (انتخابؔ)

بہرحال (بیگم و صاحبزادی کے تاثرات)

سو ہے یہ بھی مجتبیٰ

(منظومات)

جنابِ سیّد ہاشم علی اختر کا ایک خط

SYED HASHIM ALI
VICE CHANCELLOR

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH-202001
۸۷/۶/۲۳

عزیزم مصطفیٰ کمال صاحب

السلام علیکم۔ آپ کا دلچسپ خط مجھے ۱۷/۶ کو ملا۔ انگریزی خطوں کے جواب تو فوراً پرائیویٹ سکریٹری کو لکھوادیتا ہوں لیکن اُردو خطوں کے جواب دینے میں اکثر تاخیر ہوجاتی ہے اس لیے کہ اس مصروف زندگی میں اُس کے لیے وقت نکالنا مشکل ہوجاتا ہے اور اگر بال پائنٹ پن ایسے وقت پر داغ دے دے جیساکہ ابھی ہوا ہے تو تاخیر کا ایک اور جواز مل جاتا ہے۔

مجتبیٰ صفِ اول کے مزاح نگار ہیں۔ لیکن میں نے سلامتی کے خیال سے اُنھیں ہمیشہ میرے دوست محبوب حسین جگر کے چھوٹے بھائی لہٰذا میرے چھوٹے بھائی کی طرح سمجھا ہے اور جب سے میں علی گڑھ آیا ہوں میرے دہلی کے ہر سفر میں اُن کی سعادت مندی کی وجہ سے ملاقات ہوجاتی ہے۔ اِسی سعادت مندی کی وجہ اُن کی جولانیٔ طبع اور بذلہ سنجی کا مظاہرہ میری موجودگی میں نہیں ہوتا۔ لہٰذا اُن کی اصلی شخصیت مجھے معلوم نہیں ہوسکی۔ کسی نے کہا تھا کہ جب آدمی ساٹھ سال کا ہوجاتا ہے تو اُس کے بزرگوں کی بزرگی کی شدّت میں کمی ہوجاتی ہے۔ شاید مجتبیٰ کے ساٹھ سال کی عمر تک پہونچ جانے کے بعد اُن کی اصلی شخصیت مجھے نظر آنے لگے۔

اُن کے فن کے متعلق شاید میں کچھ لکھنے کے موقف میں نہیں ہوں۔ میں نے اُن کے چند مضامین پڑھے ہیں لیکن زندہ دلانِ حیدرآباد کے جلسوں میں اُن کے مزاح کا رُعب دیکھا ہے کہ حیدرآباد کا مجمع ان کے مزاح کا پیشگی قہقہوں سے استقبال کرلیتا ہے اور دوسرے مضامین سُننے والے اپنے آپ کو گھاٹے میں پاتے ہیں۔

اس عہدہ کی مصروفیت خود اپنے مزاح کی کمی کا باعث ہوتی ہے۔ اگر مجھ سے کوئی مضمون کی اُمید ہو تو میرے وظیفہ کا انتظار کیجیے ——— اُمید کہ آپ سب خیریت سے ہوں گے۔

برادرِ بزرگ کھنہ صاحب اور برادرِ عزیز لوھر کو سلام
یوسف ناظم آج یہاں ہیں۔

مخلص
ہ علی





مجتبیٰ حسین (۱۹۶۶)



(۱۹۸۴)

(۱۹۸۵)





۶ر جولائی ۱۹۸۴ء کو وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے ہاتھوں پہلا غالب انعام برائے اردو طنز و مزاح حاصل کرتے ہوئے۔

دہلی کی ایک محفل میں وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی کے ساتھ۔ پروفیسر اشتیاق عابدی چیرمین ماڈرن فوڈ انڈسٹریز بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔





۱۹؍نومبر ۱۹۸۳ء کو مرکزی وزیر توانائی مسٹر شیو شنکر کے ہاتھوں
"نشانِ امتیاز" حاصل کرتے ہوئے۔

سفرنامہ "جاپان چلو" کی رسم اجراء کے موقع پر انگریزی کے مشہور
صحافی خشونت سنگھ اور سفارت خانہ جاپان کے فرسٹ سکریٹری مسٹر
یوجوادکانو کے ساتھ۔





۱۹۶۹ء میں زندہ دلان حیدرآباد کے تیسرے سالانہ اجتماع میں مضمون سناتے ہوئے ۔ تصویر میں مشہور فلمی اداکار آئی ۔ ایس جوہر، بھارت چند کھنہ، ڈاکٹر سید عبدالمنان اور مصطفیٰ علی بیگ دیکھے جاسکتے ہیں۔

۲۲ جنوری ۱۹۷۱ء کو حیدرآباد میں زندہ دلان حیدرآباد کی ایک محفل کی نظامت کرتے ہوئے ۔ خواجہ عبدالغفور مضمون سنارہے ہیں۔ بھارت چند کھنہ، علی باقر، مسیح انجم اور برق آشیانوی کو دیکھا جاسکتا ہے





۱۱؍اپریل ۱۹۸۰ء کو زندہ دلانِ حیدر آباد کے ادبی اجلاس میں مضمون سناتے ہوئے۔



۱۴؍اپریل ۱۹۸۳ء کو زندہ دلانِ حیدر آباد کی محفلِ لطیفہ گوئی میں ادبی لطیفے سناتے ہوئے۔ مشہور افسانہ نگار انتظار حسین بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔



۱۹۸۷ء میں دہلی میں علی باقر کے افسانوں کے مجموعہ "خوشی کے موسم" کی رسمِ اجراء کے موقع پر خاکہ سناتے ہوئے۔ تصویر میں ابو الفیض سحر، حیات اللہ انصاری، عصمت چغتائی اور علی باقر۔



۱۹۸۴ء میں بمبئی میں ہندی مزاح نگاروں کے اجتماع "چکلس" میں مضمون سناتے ہوئے۔

مارچ ۱۹۸۴ء میں لندن یونیورسٹی کے ہال میں اردو مجلس برطانیہ کی ایک محفل سے خطاب کرتے ہوئے، عباس زیدی اسکریٹری اردو مجلس برطانیہ اور بیرسٹر غلام یزدانی، صدر اردو مجلس کو دیکھا جا سکتا ہے۔







اکتوبر ۱۹۸۰ء میں ٹوکیو میں یونیسکو کے ایشیائی ثقافتی مرکز کی جانب سے منعقدہ سیمینار میں مختلف ممالک کے مندوبین اور جاپانی اسکالروں کے ساتھ۔

جاپان کی مشہور مصوّر مسز مارو کی ایڈی کی قیام گاہ پر دیگر مندوبین کے ساتھ۔



اکتوبر ۱۹۸۰ء میں نارا (جاپان) کے ایک پگودا کے سامنے سیمینار کی خاتون مندوبین کے ہمراہ۔



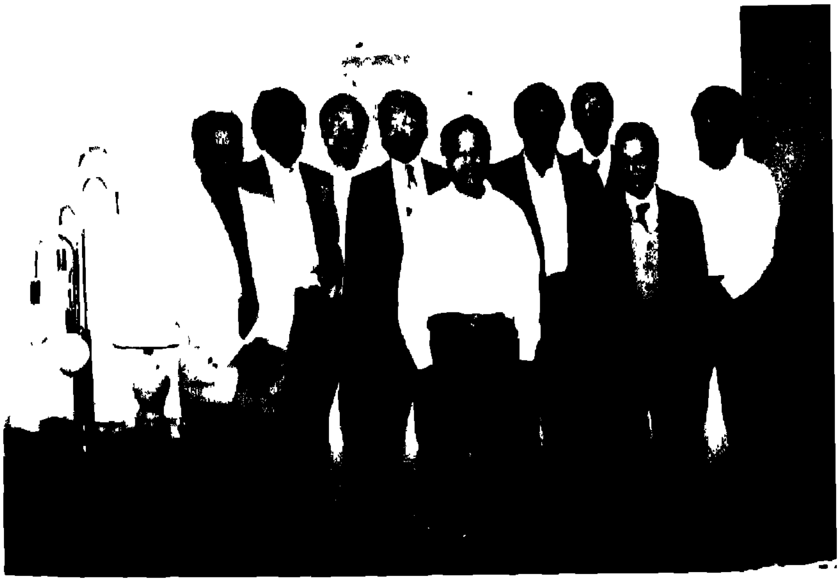
سوویت یونین کی مشہور اُردو اسکالر میلا واسی لیوا کے ساتھ
غالب کے مزار کے آگے ۔ (۱۹۸۷ء)



۱۱ رمئی ۱۹۶۶ء کو حیدرآباد میں کرشن چندر اور سلمیٰ صدیقی
کے ساتھ ۔



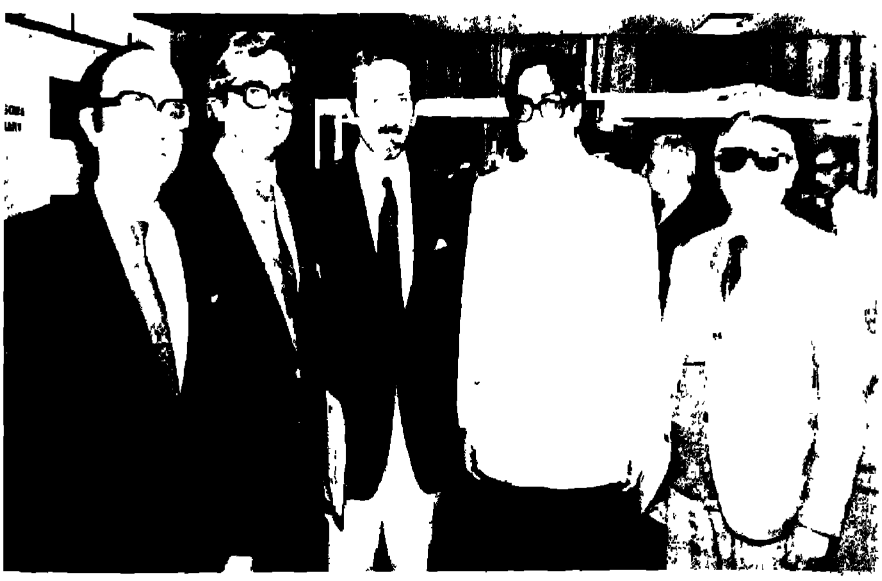
یکم مئی ۱۹۷۶ء کو زندہ دلانِ
حیدرآباد کی ادبی محفل کے بعد۔
(دائیں سے بائیں) بھارت چند
کھنہ، یوسف ناظم، نریندر لوتھر
سید نصرت، فکر تونسوی، فیروز
حیدر، مجتبیٰ حسین، مصطفیٰ علی
بیگ، پرویز یداللہ مہدی،
رشید قریشی اور مسیح انجم۔



شکاگو کی ایک ادبی محفل کے بعد ڈاکٹر
ابوالحسن صدیقی کے ساتھ (دائیں سے بائیں)
عزیزالرحمٰن، ولی اللہ بخاری، مجتبیٰ حسین،
ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی، مظفرالدین فاروقی،
ڈاکٹر خورشید خضر اور چچازاد بھائی خورشید حسین



۲ مارچ ۱۹۸۴ء کو لندن میں منعقدہ خیر مقدمی تقریب کے بعد لندن کے ادیبوں اور احباب کے ساتھ (دائیں سے بائیں) پروفیسر حسن عسکری، عباس زیدی، نقی تنویر، چاند کرن، افتخار عارف، مجتبیٰ حسین، بیرسٹر غلام یزدانی، وقار لطیف، ساقی فاروقی، رضا علی عابدی، ڈاکٹر ضیاءالدین شکیب، زبیدہ یٰسین علی خاں، نواب یٰسین علی خاں۔



اردو مرکز لندن اور
حیدرآباد دکن ایسوسی ایشن
کی جانب سے منعقدہ
خیر مقدمی تقریب کے بعد
(دائیں سے بائیں) حبیب
حیدرآبادی، افتخار عارف
پرنس مفخم جاہ، مجتبیٰ حسین
اور مشتاق احمد یوسفی



پامپیڈو آرٹ سینٹر،
پیرس کے سامنے (مارچ
۱۹۸۴ء)



پیرس میں محراب فتح کے سامنے



ایفل ٹاور اور
مجتبیٰ حسین
(مارچ ۱۹۸۴ء)

پیرس میں ممارت کے گرجا
گھر کے سامنے اپنے دوست
مسرور خورشید کے ہمراہ
(مارچ ۱۹۸۴ء)

پیرس کی شاہراہ شانزلیزے پر









نیویارک کے ہوائی اڈہ پر اپنے دو پاکستانی بھتیجوں شہریار
ملیس اور طاہر حسین کے ساتھ (اپریل ۱۹۸۴ء)

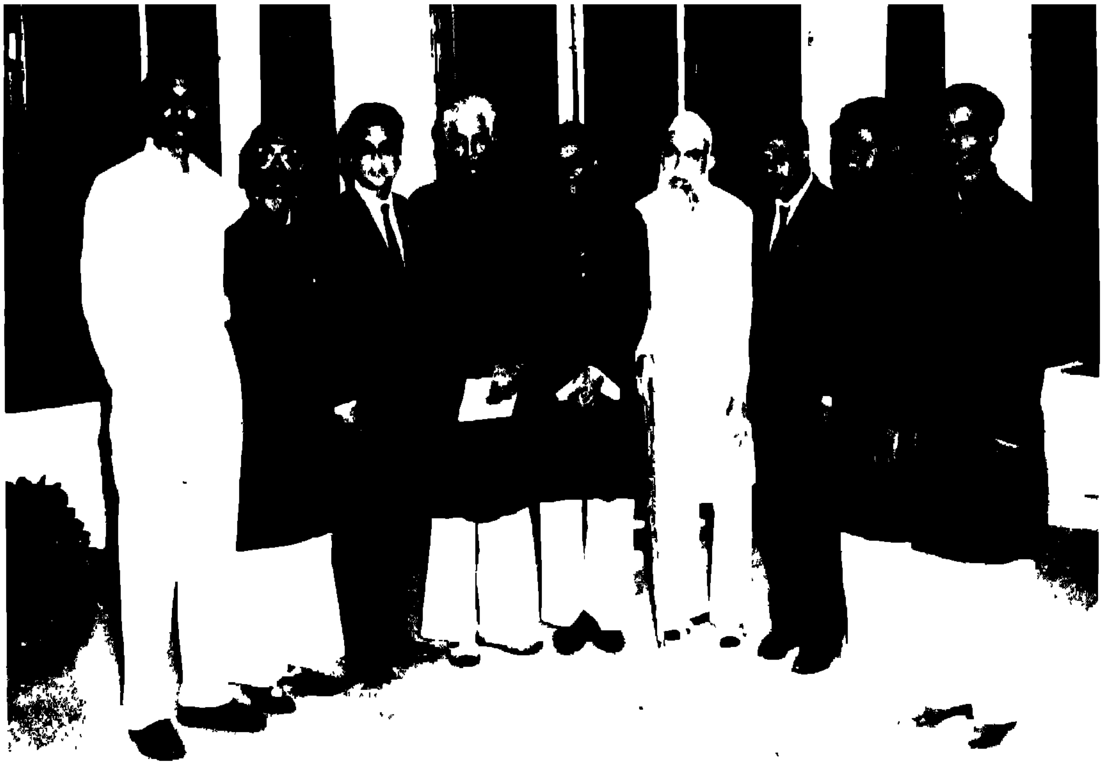
لندن میں مشتاق احمد یوسفی کی قیام گاہ پر ایک تقریب میں
(دائیں سے بائیں) مشتاق احمد یوسفی، مغنی تبسم، مجتبیٰ حسین
نقی تنویر اور ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب (۱۹۸۴ء)



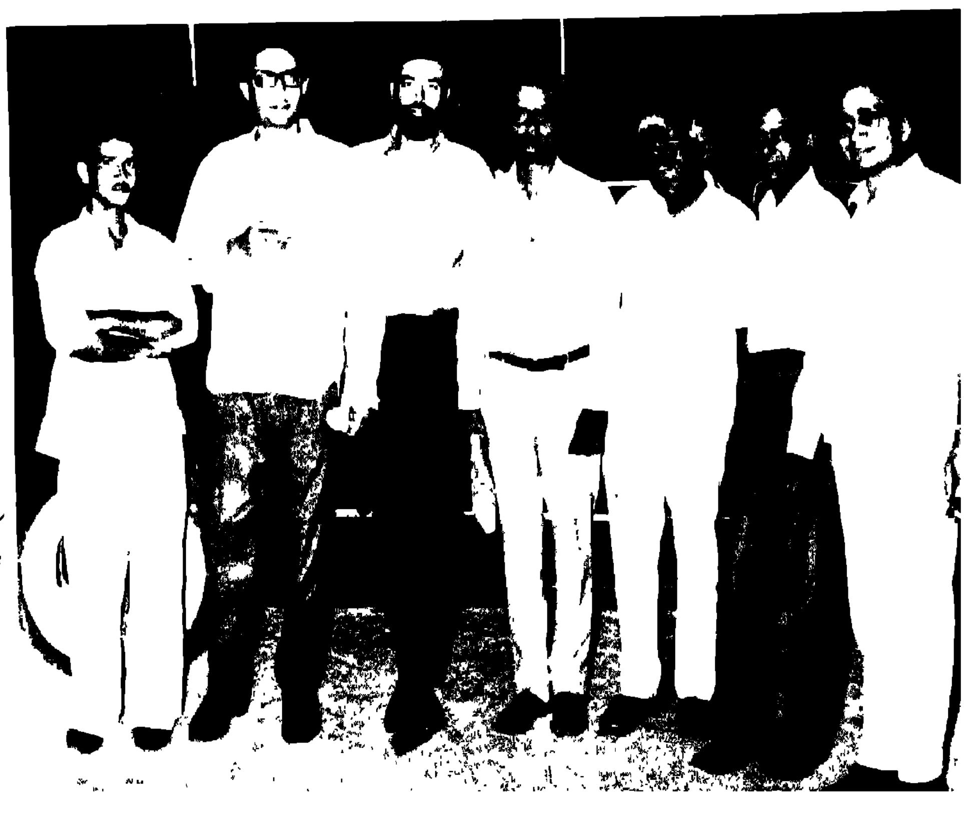
لندن میں اپنے حیدرآبادی دوستوں کے ہمراہ (دائیں سے بائیں)
مجتبیٰ حسین، عامر موسوی، مسز عامر موسوی، نقی تنویر [illegible] لطیف



روزنامہ "جنگ" لندن
کے دفتر میں ایڈیٹر جنگ
اشرف قاضی اور صحافی
ظہور نیازی کے ساتھ۔
(اپریل ۱۹۸۴ء)



اکتوبر ۱۹۷۲ء میں راج بھون حیدرآباد میں منعقدہ ایک ادبی محفل کے شرکا۔ (دائیں سے بائیں) ... حسین، قادر علی بیگ،
محمد سلیمان، مرزا شکور بیگ، بھارت چند کھنہ، علی صائب میاں، مصطفیٰ علی بیگ ...



۱۹۷۳ء میں ... میں چندا ... کے
ساتھ (دائیں
بائیں) ...
کمار یاشی ...
...



سفرنامہ جاپان کی جاپانی مترجم مسز
شاشورے کے ہمراہ (۱۹۸۴ء)



فکر تونسوی اور مجتبیٰ حسین (۳۰ نومبر ۱۹۷۱ء)



شہریار اور مجتبیٰ حسین (۱۹ نومبر ۱۹۸۳ء)

مشتاق احمد یوسفی اور مجتبیٰ حسین (اپریل ۱۹۸۴ء)





بڑے بھائی جناب محبوب حسین جگر کے ساتھ (۱۹۸۳ء)



مشہور شاعر سلام مچھلی شہری کے ساتھ (۱۹۷۳ء)



مشہور شاعر رضا نقوی واہی کے ساتھ (۱۹۸۲ء)

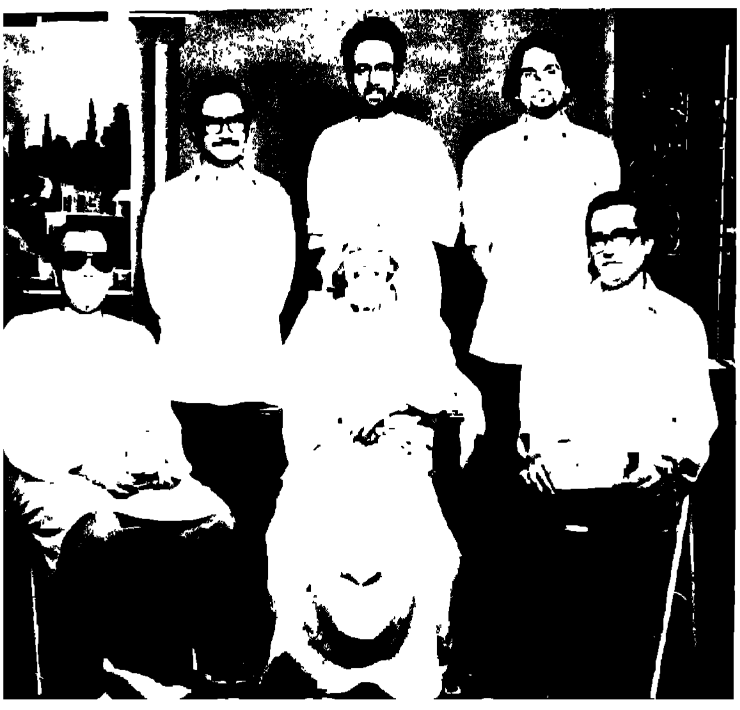


ممتاز صحافی احسن علی مرزا کے ساتھ (۱۹۷۱ء)



مشہور شاعر ناصر کرنولی کی شادی کے موقع پر (دائیں سے بائیں) مصحف اقبال توصیفی
افسانہ نگار عوض سعید، شاذ تمکنت ناصر کرنولی اور مجتبیٰ حسین (۱۹۶۸ء)

۱۹۸۰ء میں کٹک میں ہاسیہ رتن کا خطاب پانے کے بعد اڑیا زبان کے ممتاز مزاح نگار
فتور آنند کے ساتھ تصویر میں ناظم مرزائی، پاگل عادل آبادی، بوگس حیدرآبادی، اور اسمٰعیل
آذر کو دیکھا جاسکتا ہے۔





ہندوستانی آرٹسٹ ایم۔ایف۔حسین، پاکستانی
آرٹسٹ صادقین اور مجتبیٰ حسین۔



لستانی شعرا احسن رضوی، سلیم کوثر اور سعادت سعید اور مکتبہ جامعہ دہلی کے انچارج وحید صاحب کے ساتھ



مجتبیٰ حسین اپنے عزیز دوست محمود الحسن خاں صوفی کے ساتھ



۱۷ فروری ۱۹۸۱ء کو امروہہ میں منعقدہ ایک ادبی محفل کے بعد (دائیں سے بائیں) شرافت حسین رضوی، رئیس نجمی، فکر تونسوی، مجتبیٰ حسین، محسن امیر، شوق امروہوی، غیور حسن، نریندر لوتھر اور سخی حسن صدیقی

۷۷ ۱۹ء کی ایک ادبی محفل میں نریندر لوتھر، خواجہ عبدالغفور، مجتبیٰ حسین اور یوسف ناظم





دسمبر ۱۹۸۰ء میں منعقدہ ایک تقریب میں پاکستانی افسانہ نگار منیر احمد شیخ، نریندر لوتھر، مجتبیٰ حسین اور چودھری مسعود۔



مجتبیٰ حسین کے گھر پر
منعقدہ ایک محفل کے بعد
دائیں سے بائیں (بیٹھے ہوئے)
چھوٹی بیٹی نجیبہ رئیس
بڑی بیٹی راشدہ رئیس
بیگم مجتبیٰ حسین، مسز منورما
نارنگ اور ترون نارنگ۔
ایستادہ (دائیں سے) مجتبیٰ
حسین، ڈاکٹر ظہیر احمد
صدیقی، افتخار عارف،
رحمٰن نیر، مدیر بیسویں صدی
اور پروفیسر گوپی چند نارنگ

جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں فیض احمد فیض کے خیر مقدم کے بعد (دائیں سے بائیں) پروفیسر نامور سنگھ، ڈاکٹر محمد حسن
فیض احمد فیض، مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر نصیر احمد خاں اور دوسرے۔



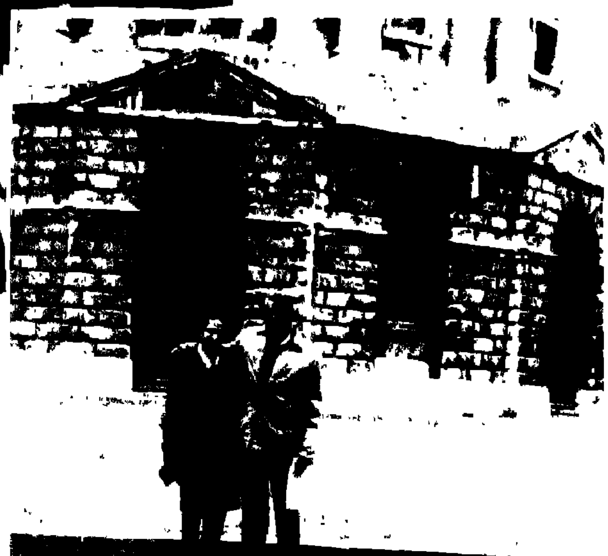
دورہ سوویت یونین سے واپسی پر خواجہ حسن
ثانی نظامی کی جانب سے منعقدہ خیر مقدمی
تقریب کے بعد (دائیں سے بائیں) بیٹھے ہوئے
(پہلی صف) احمد جمال پاشا، مجروح سلطانپوری
دلیپ سنگھ، مجتبیٰ حسین، حکیم عبدالحمید،
جناب سید حامد، پروفیسر علی محمد خسرو، شفیع
قریشی، (دوسری صف میں) سخی حسن صدیقی
پروفیسر انور صدیقی، ضامن مرادآبادی،
انیس دہلوی، ذہین نقوی، رفعت سروش،
شریف الحسن نقوی، اختر الواسع۔
(ایستادہ) خواجہ حسن ثانی نظامی، دمار احمد
رئیس مرزا، عبداللطیف اعظمی، ڈاکٹر کامل
قریشی، دیوان بریندر ناتھ (ظفر پیامی)
شارب ردولوی اور محمود سعیدی۔



عالمی مزاح کانفرنس منعقدہ حیدرآباد
کے موقع پر دائیں سے بائیں ہلال سیوہاروی
مسیح انجم، ضمیر جعفری، کنور مہندر سنگھ بیدی
سحر، عطاء الحق قاسمی، مجتبیٰ حسین
اور برہان حسین۔



لسفورڈ یونیورسٹی کی ایک عمارت کے آگے اپنے
ست نقی تنویر کے ساتھ (اپریل ۱۹۸۴ء)



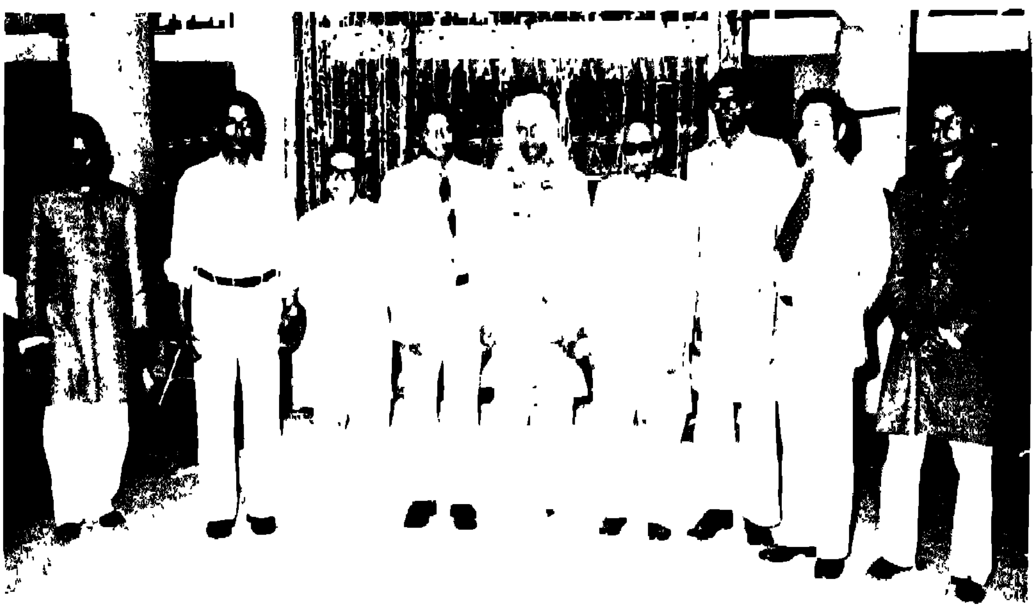


سمرقند میں سوویت احباب کے ساتھ (دائیں سے بائیں) غفور جہاں گستری،
مجتبیٰ حسین، گلنارا، ڈاکٹر لیدیا اور پروفیسر اشتیاق عابدی (اکتوبر ۱۹۸۶ء)

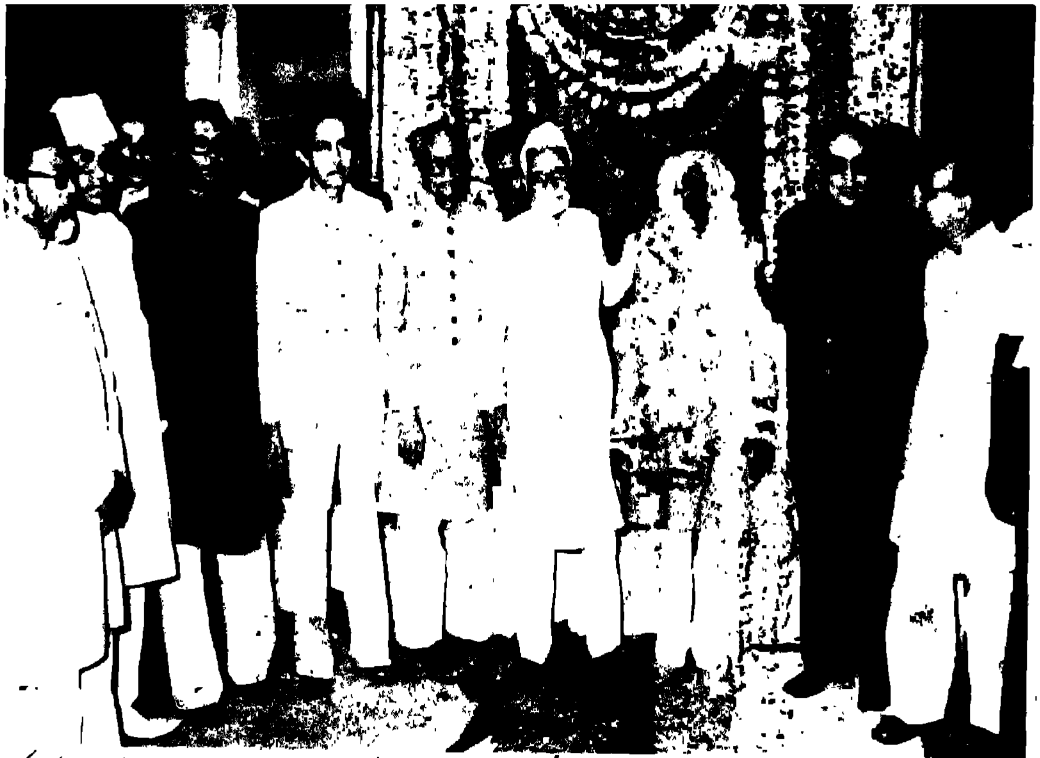
ماسکو کی سوویت۔ہند دوستی انجمن کے دفتر پر خیر مقدمی تقریب کے بعد (دائیں
سے بائیں) ڈاکٹر لیدیا، پروفیسر اشتیاق عابدی سکریٹری دوستی انجمن مسز ایرینا
پرشووا، اکمل گولویف، ایڈیٹر "سوویت ناری" مشہور اردو اسکالر، آنا الکسینا
کووالنکاوا، مجتبیٰ حسین اور دیگر روسی اسکالر۔





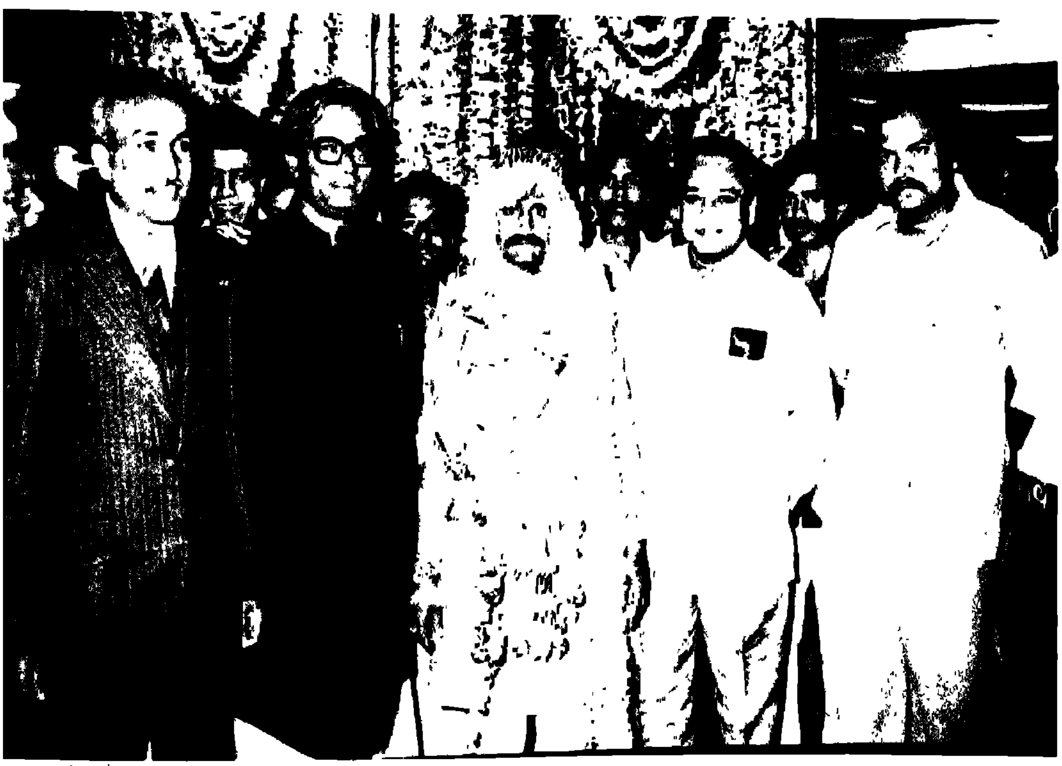


بھتیجہ ساجد حسین کی شادی کے موقع پر (دائیں سے بائیں) یوسف الدین (ہم زلف) ڈاکٹر شوکت حسین (بھتیجہ) عابد حسین (بھائی) جناب محبوب حسین جگر، نوشہ ساجد حسین (بھتیجہ) یوسف حسین (بھائی) جناب عابد علی خاں، مجتبیٰ حسین اور چچازاد بھائی حامد حسین۔



بیٹی راشدہ رئیس کی شادی کے موقع پر (دائیں سے بائیں) جناب عابد علی خاں، ایڈیٹر "سیاست" مسٹر محمد علی، سابق وزیر ٹرانسپورٹ کرناٹک، داماد غلام صمدانی، بیرسٹر اکبر علی خاں سابق گورنر اڑیسہ، حامد حسین، جناب محبوب حسین جگر، قاضی سلیم، سابق رکن پارلیمنٹ اور مجتبیٰ حسین۔

بڑی بیٹی کی شادی کا ایک اور منظر (دائیں سے بائیں) حسام الدین، مسٹر جگن ناتھ راؤ، سابق ڈپٹی چیف منسٹر آندھرا پردیش، داماد غلام صمدانی، مجتبیٰ حسین اور بشارت اللہ حسینی۔





بڑا بیٹا ہادی حسین چھوٹی بیٹی نجیبہ رئیس اور بیگم مجتبیٰ حسین -



ماسکو کی لوممبا یونیورسٹی کے ہاسٹل کے آگے چھوٹے بیٹے مصباح حسین اور اُس کے دوستوں کے ہمراہ (اکتوبر ۱۹۸۶ء)



مجتبیٰ حسین اور بیگم مجتبیٰ حسین اپنے نواسے غلام احمد کرمانی کے ساتھ ۔

داماد غلام صمدانی ۔ بڑی بیٹی راشدہ رئیس اور اور نواسے غلام احمد کرمانی کے ساتھ ۔





بیگم مجتبیٰ حسین (ناصرہ رئیس)

مُحَمَّد اَسلَم

مجتبیٰ حسینؒ سوانحی حالات

مجتبیٰ حسین ۱۵ ؍جولائی ۱۹۳۶ء کو موجودہ ریاست کرناٹک کے ضلع گلبرگہ کی تحصیل چنچولی میں پیدا ہوئے۔ ان کے تعلیمی صداقت نامے میں تاریخ پیدائش ۱۵ ؍جولائی ۱۹۳۳ء درج ہے۔ تاریخ پیدائش کو تین سال بڑھا کر لکھانے کی ضرورت غالباً اس لیے پیش آئی کہ مجتبیٰ حسین نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور سیدھے چوتھی جماعت میں گلبرگہ کے مدرسۂ تحتانیہ آصف گنج میں داخل کرا دیئے گئے۔ اُن دنوں سابق ریاست حیدرآباد میں میٹرک کے امتحان میں بیٹھنے کے لیے ایک خاص عمر کی پابندی ضروری تھی۔ اُن کے والد محترم مولوی احمد حسین اگرچہ ضلع عثمان آباد کے رہنے والے تھے لیکن اُن کی ملازمت کا زیادہ عرصہ گلبرگہ میں ہی گزرا جہاں وہ تحصیلدار کے عہدے پر فائز تھے۔ مولوی احمد حسین ادب سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ اور اردو کے کلاسکی شاعروں کے بے شمار اشعار انھیں زبانی یاد تھے۔ وہ خود انگریزی نہیں جانتے تھے لیکن سابق ریاست حیدرآباد کے انگریز عہدہ داروں کے نام اور ان کی صلاحیتوں کے بے پناہ معترف اور قائل تھے۔ مجتبیٰ حسین کو ادب سے یہ لگاؤ ورثے میں ملا ہے۔ ان کے دو بڑے بھائی محبوب حسین جگر، جوائنٹ ایڈیٹر روزنامہ "سیاست" حیدرآباد، اور جناب ابراہیم جلیس (مرحوم) اردو دنیا کی اہم شخصیتوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ جناب محبوب حسین جگر نے افسانہ نگاری سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا تھا لیکن بعد میں حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ وہ صحافت کے ہی ہو کر رہ گئے۔ موجودہ اردو صحافت کو ایک نیا آہنگ اور اعتبار عطا کرنے میں محبوب حسین جگر کی کوششوں کو بڑا دخل رہا ہے۔ اُنھوں نے ۱۹۴۸ء میں جناب عابد علی خان کی رفاقت میں روزنامہ "سیاست" کے اجراء کے ذریعہ اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ گذشتہ پچھلے چار دہوں میں جناب محبوب حسین جگر نے سینکڑوں صحافیوں اور ادیبوں کی ذہنی تربیت کی جن میں مجتبیٰ حسین بھی شامل ہیں۔ وہ حیدرآباد میں ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں سے ہیں۔

ابراہیم جلیس ان کے دوسرے بڑے بھائی ہیں۔ ابراہیم جلیس (مرحوم) نے برصغیر ہندو پاک کے صف اوّل کے افسانہ نگار اور طنز نگار کی حیثیت سے شہرت پائی۔ ابراہیم جلیس اُن چند گنے چُنے ادیبوں میں سے ہیں جنھیں بہت کم عمری میں بے پناہ شہرت ملی۔ ۱۹۴۸ء میں وہ پاکستان ہجرت کر گئے اور وہاں بھی اُنھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ ۲۵ ؍اکتوبر ۱۹۷۷ء کو کراچی میں اُن کا انتقال ہوا۔ اُس وقت وہ پاکستان

پیپلز پارٹی کے اخبار "مساوات" کے ایڈیٹر تھے۔

اس خاندانی پس منظر کے ساتھ مجتبیٰ حسین کا ادب سے لگاؤ ایک فطری بات نظر آتی ہے۔ ملک کی تقسیم اور سابق ریاستِ حیدرآباد کے خاتمہ کے وقت وہ آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے۔ ان کی زیادہ تر ابتدائی تعلیم گلبرگہ میں ہی ہوئی۔ ملک کی تقسیم کے وقت اُن کے والد عثمان آباد منتقل ہو گئے تھے، لیکن مجتبیٰ حسین ہوسٹل میں مقیم رہ کر تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اپنی طالب علمی کا زیادہ عرصہ انھوں نے ہوسٹلوں میں ہی گزارا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ دوستوں کے رسیا ہیں اور اپنا زیادہ وقت دوستوں کے لیے وقف کر دیتے ہیں انہوں نے ۵۲ء میں گلبرگہ انٹرمیڈیٹ کالج سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان کامیاب کیا وہ گلبرگہ انٹرمیڈیٹ کالج کی بزم اردو کے جنرل سکریٹری بھی رہے اور ۵۳ء میں گلبرگہ میں ایک تاریخی مشاعرہ بھی منعقد کیا جس میں مجروح سلطان پوری، کیفی آعظمی، جگن ناتھ آزاد، سلیمان اریب اور شاہد صدیقی وغیرہ جیسے اہم شاعروں نے حصّہ لیا۔ گلبرگہ کا یہ یادگار تاریخی مشاعرہ تھا۔ مجتبیٰ حسین نے گلبرگہ کے زمانۂ طالب علمی میں تہذیبی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ خاص طور پر ایک اداکار اور گلوکار کی حیثیت سے کالج کے طلبا میں بے حد مقبول رہے۔ خواجہ احمد عباس کے ڈرامہ "یہ امرت ہے" میں اُنھوں نے مزدور کا کلیدی رول ادا کیا تھا اور انعام اول کے مستحق قرار پائے۔ ۱۹۵۳ء میں گریجویشن کی تکمیل کے لیے حیدرآباد آ گئے اور عثمانیہ یونیورسٹی کے آرٹس کالج میں داخلہ لے لیا۔ گو کہ وہ گلبرگہ سے حیدرآباد آئے تھے لیکن پھر بھی بہت جلد آرٹس کالج میں ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع ہو گیا اور وہ بزم ادب کے انتخابات میں جنرل سکریٹری منتخب ہوئے۔ اس طرح اُس وقت کے آرٹس کالج کی ادبی و تہذیبی زندگی میں مجتبیٰ حسین نے بہت اہم رول ادا کیا۔ گریجویشن کی تکمیل کے بعد نومبر ۱۹۵۶ء میں اُن کی شادی اپنی چچا زاد بہن ناصرہ رئیس کے ساتھ ہوئی۔ اسی دوران انھوں نے ایوننگ کالج سے ڈپلوما ان پبلک ایڈمنسٹریشن کا امتحان بھی کامیاب کیا۔

ابتداء میں مجتبیٰ حسین چند مہینوں تک ریاستِ حیدرآباد کے محکمۂ مال میں ملازم رہے۔ لیکن طبعی میلان چونکہ اُدب کی طرف تھا۔ اسی لیے اس ملازمت سے دست بردار ہو کر روزنامہ "سیاست" سے وابستہ ہو گئے۔ جہاں ان کے بڑے بھائی محبوب حسین جگر پہلے ہی سے جوائنٹ ایڈیٹر تھے۔ لکھنے پڑھنے کا آغاز انھوں نے صحافت سے کیا اور سخت جانفشانی کے ساتھ صحافت کے پیشے کو اپنایا۔ صحافت کے میدان میں اُن کی تربیت محبوب حسین جگر کے ہاتھوں ہوئی۔ تقریباً سات برسوں تک وہ صحافی کی حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے رہے۔ اکتیس جولائی ۱۹۶۲ء کو روزنامہ "سیاست" کے مشہور کالم نگار شاہد صدیقی کا انتقال ہوا تو "سیاست" کے انتظامیہ کو ایک ایسے ادیب کی ضرورت لاحق ہوئی جو یہ کالم لکھ سکے۔ شاہد صدیقی اپنے وقت کے بے حد مقبول کالم نویس تھے۔ بالآخر قرعۂ فال مجتبیٰ حسین کے نام نکلا اور ۱۲ر اگست ۱۹۶۲ء کو صبح جب وہ اپنے دفتر پہنچے تو اُن کے بڑے بھائی محبوب حسین جگر نے حکم دیا کہ وہ اس دن کا مزاحیہ کالم لکھیں۔ یہیں سے مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کالم میں ان کا فرضی نام "کوہ پیما" تھا۔ مجتبیٰ حسین کا کالم دیکھتے ہی دیکھتے مقبول ہوتا چلا گیا اور نہ صرف ہندوستان بلکہ پاکستان کے اخبارات میں بھی نقل کیا جانے لگا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی جیسے صاحب طرز ادیب اور عالم نے اپنے اخبار "صدقِ جدید" میں اُن کے کالم کی تعریف کی تھی۔

مجتبیٰ حسین نے اپنے اصلی نام کے ساتھ پہلا مزاحیہ مضمون "ہم طرفدار ہیں غالب کے سخن فہم نہیں" ۱۹۶۴ء

میں لکھا۔ جسے ادبی حلقوں نے بے حد پسند کیا۔ اس کے بعد سے آج تک انھوں نے مزاح نگاری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔ ۱۹۶۶ء کے اوائل میں اُن کے ذہن میں یہ بات آئی کہ کیوں نہ ہندوستان کے سارے اردو مزاح نگاروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے۔ اُن کے قریبی دوست حفیظ قیصر نے اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے میں پوری مدد کا وعدہ کیا اور اس طرح زندہ دلانِ حیدرآباد کے بینر تلے ۱۳، ۱۴، ۱۵/ مئی ۱۹۶۶ء حیدرآباد میں اُردو کے مزاح نگاروں کی وہ تاریخی کل ہند کانفرنس منعقد ہوئی۔ جسے آج بھی لوگ یاد کرتے ہیں۔
مجتبیٰ حسین اس کانفرنس کے جنرل سکریٹری اور بھارت چند کھنہ اس کے صدر تھے۔ برصغیر ہند و پاک کی تاریخ میں مزاح نگاروں کا اس سے بڑا اجتماع کبھی منعقد نہیں ہوا تھا۔ کرشن چندر نے اس کانفرنس کی صدارت کی تھی اور مخدوم محی الدین نے اس کا افتتاح کیا تھا۔ اتنے بڑے پیمانے پر نثری ادب کو اسٹیج پر پیش کرنے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ ہزاروں سامعین نے دو دنوں تک نہایت ذوق و شوق کے ساتھ مزاحیہ مضامین کو سُنا۔ اس کانفرنس میں مجتبیٰ حسین نہ صرف ایک کامیاب منتظم کے روپ میں اُبھر کر سامنے آئے بلکہ ایک کامیاب مزاح نگار کی حیثیت سے بھی اُن کی شہرت عام ہوئی۔ کانفرنس کے نثری اجلاسوں میں ان کا ہر مضمون قہقہوں اور تالیوں کی گونج میں سُنا گیا۔ اس کانفرنس کے باعث آنجہانی کرشن چندر سے اُن کا وہ گہرا ربط استوار ہوا جو کرشن چندر کے مرنے تک برقرار رہا۔ کرشن چندر انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ اس کانفرنس کی کامیابی کے بعد مجتبیٰ حسین نے اپنے طور پر مزاح کو ایک تحریک کی شکل دے دی۔ ہندوستان کے کئی شہروں میں اس طرح کے اجتماعات منعقد ہونے لگے اور دوسری زبانیں بھی اس سے متاثر ہوئیں۔ مجتبیٰ حسین سات برس تک زندہ دلانِ حیدرآباد کے جنرل سکریٹری رہے اور آج بھی زندہ دلانِ حیدرآباد کی ساری سرگرمیوں سے ان کا راست واسطہ قائم ہے۔ ۱۹۶۸ء میں بمبئی کی تنظیم "سر سنگار سمد" نے حیدرآباد کے تجربے کی تقلید میں طنز و مزاح کا ایک پروگرام "قہقہہ" کے عنوان سے آراستہ کیا۔ مجتبیٰ حسین اِس میں شرکت کے لیے گئے تو ہندی کے کئی مشہور ادیبوں کو انھیں سننے کا موقع ملا۔ ہندی کے ادیب اور صحافی کنہیا لال نندن اور ممتاز ادیب اور ہندی رسالہ 'دھرم یگ' کے ایڈیٹر ڈاکٹر دھرم ویر بھارتی نے سیدھی سادی زبان میں لکھے گئے اُن کے مضامین کو بے حد پسند کیا اور اپنے رسالہ میں لگاتار کئی برسوں تک انھیں چھاپتے رہے اور اِس طرح ہندوستان کی دیگر زبانوں میں انھیں منتقل کیا جانے لگا۔ مجتبیٰ حسین ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۲ء تک حکومت آندھرا پردیش کے محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ سے بھی وابستہ رہے۔ حکومت ہند نے جب اردو کے مسائل کا جائزہ لینے کے لیے گجرال کمیٹی تشکیل دی تو انھیں اس کمیٹی کے شعبۂ ریسرچ میں کام کرنے کی دعوت دی گئی۔ ۱۰/ نومبر ۱۹۷۲ء کو مجتبیٰ حسین اپنی نئی خدمت کا جائزہ حاصل کرنے کی غرض سے دہلی آئے اور تب سے دہلی میں مقیم ہیں۔ کمیٹی کا جب کام ختم ہوا تو وہ ۱۹/ ستمبر ۱۹۷۴ء کو نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ سے وابستہ ہو گئے۔ اور ان دنوں وہ کونسل کے پبلی کیشن ڈپارٹمنٹ میں شعبۂ اردو کے ایڈیٹر ہیں۔ مجتبیٰ حسین نے دہلی میں بھی طنز و مزاح کی محفلوں کے انعقاد کی طرف توجہ کی۔ ۱۹۷۳ء میں انھوں نے ڈاکٹر خلیق انجم اور سبھدرا جوشی کے رسالے "سیکولر ڈیموکریسی" کے تعاون سے لال قلعہ کے میدان میں ایک کل ہند مزاحیہ مشاعرے کا انعقاد بھی کیا۔ جسے لوگ آج بھی یاد کرتے ہیں۔ حیدرآباد کے کئی مزاحیہ شعراء اسی مشاعرے کے ذریعہ شمال میں روشناس ہوئے اور مقبولیت حاصل کی۔

اکتوبر ۱۹۸۰ء میں ٹوکیو میں یونیسکو کے ایشیائی ثقافتی مرکز کی جانب سے طباعت واشاعت کے موضوع پر ایک سمینار اور ورکشاپ کے لیے ہندوستان سے کئی نمائندوں کو روانہ کرنے کی دعوت دی گئی تو اس سمینار کے لیے مجتبیٰ حسین کا انتخاب عمل میں آیا۔ یونیسکو کی دعوت پر انھوں نے لگ بھگ سوا مہینے تک جاپان کا دورہ کیا۔ ٹوکیو کی یونیورسٹی برائے بیرونی مطالعات نے اُن کے اعزاز میں ایک خیر مقدمی تقریب کا بھی اہتمام کیا۔ جاپان کے اس کامیاب دورے کی روداد اُنھوں نے اپنے دلچسپ سفرنامے "جاپان چلو، جاپان چلو" میں بیان کی ہے۔ اُن کا یہ پہلا بیرونی دورہ تھا۔ ۱۹۸۴ء میں وہ "اردو مجلس" برطانیہ کی دعوت پر انگلستان گئے جہاں اُن کے اعزاز میں کئی ادبی محفلیں آراستہ کی گئیں۔ برطانیہ کے مختلف شہروں کا دَورہ کرنے کے علاوہ وہ ایک ہفتہ کے لیے پیرس بھی گئے۔ یورپ میں ایک مہینہ کے قیام کے بعد وہ امریکہ چلے گئے جہاں اُن کے اعزاز میں واشنگٹن، شکاگو اور ڈیٹرائٹ میں کئی اَدبی محفلیں آراستہ کی گئیں۔ بعد میں اُنھوں نے کینیڈا کا بھی دورہ کیا۔

ستمبر ۱۹۸۶ء میں روس۔ ہندوستی کی انجمن کی دعوت پر اُردو ادیبوں کے دو رکنی وفد کے ایک رُکن کی حیثیت سے وہ سوویت یونین کے دورے پر گئے۔ اس وفد کے دوسرے رکن پروفیسر اشتیاق عابدی تھے۔ سوویت یونین کے دَورے میں وہ تاشقند، سمرقند، بخارا، لینن گراڈ اور ماسکو گئے۔ سوویت یونین میں انھوں نے کئی روسی ادیبوں اور اردو اسکالروں سے ملاقاتیں کیں۔

جہاں تک اعزازات کا تعلق ہے یہ بات قابلِ غور ہے کہ مجتبیٰ حسین کو پہلا اعزاز کسی اُردو تنظیم کی طرف سے نہیں بلکہ اُڑیا زبان کے ادیبوں کی تنظیم "مِسرِن ساہتیہ سمیتی" کی جانب سے دیا گیا۔ اس تنظیم نے ۱۹۸۰ء میں ان کے مضامین کا ایک مجموعہ اُڑیا زبان میں شائع کیا۔ اور انھیں بطورِ خاص کٹک بلوا کر ایک خصوصی تقریب میں "ہاسیہ رتن" کے خطاب سے بھی نوازا۔ انھیں یہ اعزاز ہندوستانی اَدب میں طنز ومزاح کے فروغ کے لیے اُن کی خدمات کے اعتراف کے طور پر دیا گیا۔ مجتبیٰ حسین کی تقریباً ساری تخلیقات ہندی میں چھپ چکی ہیں۔ اس کے علاوہ کئی دیگر ہندوستانی زبانوں میں ان کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ ۱۹۸۵ء میں اُن کے سفرنامے "جاپان چلو، جاپان چلو" کا جاپانی میں ترجمہ شائع ہوا۔ جسے جاپان کے ادبی حلقوں نے بے حد سراہا۔ اس سفرنامے کا ترجمہ جاپان کی مشہور اردو اسکالر مسز شاشوررے نے کیا۔

۱۹۸۲ء میں دہلی کے غالب انسٹی ٹیوٹ نے جب طنز ومزاح کے لیے بھی غالب انعام دینے کا فیصلہ کیا تو اس سلسلے کا پہلا انعام مجتبیٰ حسین کو دیا گیا۔ دہلی کی ایک ادبی تنظیم بزمِ سازو ادب نے ۱۹۸۳ء میں انھیں "نشانِ امتیاز" سے نوازا۔

آخر میں مجتبیٰ حسین کی گھریلو زندگی کا بھی کچھ بیان ہو جائے۔ ان کو دو لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں جن میں سے بڑی بیٹی راشدہ رئیس گلبرگہ کے ایک کالج میں تاریخ کی لکچرار ہے۔ داماد غلام صمدانی الیکٹریکل انجینئر ہیں۔ بڑا بیٹا ہادی حسین انجینئرنگ کے آخری سال میں زیرِ تعلیم ہے۔ چھوٹا بیٹا مصباح الحسین ماسکو کی فرینڈشپ یونیورسٹی میں میکانیکل انجینئرنگ کے دوسرے سال میں زیرِ تعلیم ہے اور چھوٹی بیٹی نجیبہ انٹرمیڈیٹ کے دوسرے سال میں زیرِ تعلیم ہے۔

مجتبیٰ حسین کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:

۱. تکلف برطرف :۔ پہلا ایڈیشن، سال اشاعت ۱۹۶۹ء، ناشر نیشنل بک ڈپو، حیدرآباد۔
دوسرا ایڈیشن، سال اشاعت ۱۹۸۳ء، ناشر حسامی بک ڈپو، حیدرآباد۔

۲. قطع کلام :۔ پہلا ایڈیشن، سال اشاعت ۱۹۶۹ء، ناشر نیشنل بک ڈپو، حیدرآباد۔
دوسرا ایڈیشن، سال اشاعت ۱۹۸۴ء، ناشر حسامی بک ڈپو، حیدرآباد۔

۳. قصہ مختصر :۔ پہلا ایڈیشن، سال اشاعت ۱۹۷۲ء، ناشر نیشنل بک ڈپو، حیدرآباد
دوسرا ایڈیشن، سال اشاعت ۱۹۸۴ء، ناشر حسامی بک ڈپو، حیدرآباد

۴. بہرحال :۔ پہلا ایڈیشن، سال اشاعت ۱۹۷۴ء، ناشر نیشنل بک ڈپو۔ حیدرآباد!
دوسرا ایڈیشن، سال اشاعت ۱۹۸۷ء، ناشر حسامی بک ڈپو، حیدرآباد۔

۵. آدمی نامہ :۔ (خاکے) سال اشاعت ۱۹۸۱ء ناشر حسامی بک ڈپو، حیدرآباد

۶. بالآخر :۔ سال اشاعت ۱۹۸۲ء ناشر حسامی بک ڈپو۔ حیدرآباد۔

۷. جاپان چلو جاپان چلو :۔ سال اشاعت ۱۹۸۳ء ناشر حسامی بک ڈپو، حیدرآباد۔

۸. الغرض :۔ سال اشاعت ۱۹۸۷ء ناشر حسامی بک ڈپو۔ حیدرآباد

۹. سو ہے وہ بھی آدمی :۔ (خاکے) سال اشاعت ۱۹۸۷ء، ناشر حسامی بک ڈپو، حیدرآباد۔

۱۰. قصہ آرام کرسی کا :۔ (ہندی میں) سال اشاعت ۱۹۸۷ء ناشر پستکائن، نئی دہلی۔

تالیفات :۔

شیشہ و تیشہ (شاہد صدیقی کے کالموں کا انتخاب) سال اشاعت ۱۹۶۴ء ناشر آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈیمی۔

ضبط شدہ نظمیں :۔ سال اشاعت ۱۹۷۵ء بہ تعاون ڈاکٹر خلیق انجم۔

ماہنامہ "آج کل" :۔ طنز و مزاح نمبر، مہمان مدیر کی حیثیت سے دو نمبر مرتب کئے ۱۹۷۴ء میں۔

مجتبیٰ حسین نے کئی کتابوں کے ترجمے بھی کئے۔ ان کے کئی مضامین مختلف ریاستوں کی نصابی کتابوں میں شامل ہیں۔ ■□

ایک سال پہلے یوسف ناظم نے ہمیں بتایا کہ بیدی صاحب کسی بات پر ہم سے ناراض ہیں۔ ہم نے یوسف ناظم سے پوچھا "اگر آپ کہیں تو میں بیدی صاحب کو خط لکھ دوں اور اگر کسی بات پر خفا ہوں تو معافی مانگ لوں۔" یوسف ناظم بولے "خط لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان کے کمزور حافظے پر پورا بھروسہ رکھو، وہ یہ بات بہت جلد بھول جائیں گے۔" ("آدمی نامہ" سے)

شمس الرحمٰن فاروقی

مجتبیٰ حسین اور طنز و مزاح نگاری

مزاح نگار کو ہمارے یہاں عام طور پر درجۂ دوم کا فن کار اور مزاح نگاری کو درجۂ دوم کی چیز سمجھا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہماری زبان یا ہمارے ملک میں مزاح کی صلاحیت نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو زبان اور اس کے بولنے والوں میں مزاح کی صلاحیت عام جدید ہندوستانی زبانوں اور ان کے بولنے والوں سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری زبان جن عناصر سے مرکب ہے، یعنی سنسکرت اور فارسی، دونوں میں اعلیٰ مزاح کی روایت بہت قدیم اور بہت دیرپا رہی ہے۔ دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں کی طرح سنسکرت، فارسی اور پھر اردو میں بڑے ادیبوں نے مزاح کو نام نہاد سنجیدگی سے الگ کوئی چیز نہیں سمجھا موجودہ زمانے میں بعض لوگوں نے یہ خیال کیا کہ مزاحیہ اور طنزیہ تحریریں صرف ہلکی پھلکی تحریریں ہوتی ہیں۔ ان میں کوئی گہرائی یا وزن نہیں ہوتا یا اگر ہوتا بھی ہے تو اس درجہ نہیں جس درجہ کسی سنجیدہ تحریر میں ہوتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ انگریزی تعلیم کے بعض غلط نتائج نکلے، کیونکہ زیادہ تر لوگ انگریزی یا مغربی ادب سے پوری طرح واقف نہیں تھے۔ ان کا مبلغ علم سُنی سُنائی باتوں یا اِدھر اُدھر کی باتوں تک محدود تھا۔ پھر انگریزی تنقید کے بعض اہم نمائندوں کی ایک آدھ تحریر پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کیا گیا مثلاً آرنلڈ نے سو برس پہلے لکھا کہ ڈرائڈن اور پوپ انگریزی شاعری کے نہیں بلکہ انگریزی نثر کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ پھر کیا تھا، لوگ فوراً ایمان لے آئے کہ جب آرنلڈ جیسا نقاد ڈرائڈن اور پوپ جیسے بڑے طنز و مزاح نگار شعراء کو شاعروں کی فہرست سے ہی خارج کر رہا ہے تو اردو کے چھٹ بھیّوں کی کیا اوقات ہے؟ لوگ یہ بھول گئے کہ آرنلڈ کا قول غلط بھی ہو سکتا ہے۔ لوگ یہ بھی بھول گئے کہ آرنلڈ کی اس رائے کو اس کے زمانے میں بھی بہت سے لوگوں نے قبول نہیں کیا اور اس کے پچیس ہی تیس برس بعد ٹی ایس ایلیٹ نے ان شاعروں کی تعریف کی بلکہ بڑی شاعری کی ایک صفت یہ بھی بتائی کہ اس کو پڑھ کر پوری طرح نہیں کھلتا کہ شاعر سنجیدہ ہے یا مذاق کر رہا ہے یا سنجیدہ بھی ہے یا مذاق بھی کر رہا ہے۔ غالب اور میر کے یہاں یہ صفت واضح ہے۔ لیکن ہم لوگوں نے ان کے یہاں بھی ایسے شعروں کو نظر انداز کر دیا بلکہ اکثر ان پر شرمندہ بھی ہوئے کہ صاحب یہ پرانے زمانے کے نیم مہذب لوگ تھے، ان کی عمر کا لحاظ کر کے انھیں معاف کر دیجئے۔

لیکن سارا قصور انگریزی تعلیم کا نہیں ہے کیوں کہ اسی انگریزی تعلیم کے دور دورے کے نکلنے میں ہمارے یہاں اکبر الہ آبادی جیسا عظیم طنز و مزاح نگار پیدا ہوا۔ اسی زمانے میں اقبال تک نے ظریفانہ شعر کہے اور ان لوگوں کے فوراً بعد ہمارے یہاں رشید احمد صدیقی اور پطرس بخاری نے ہمارے ادب کو مالا مال کیا۔ اسی زمانے میں ظریف لکھنوی بھی تھے اور خواجہ حسن نظامی بھی۔

ظریفانہ ادب اور ادیب کی تقلیل قدر یعنی DEVALUATION کی کچھ ذمہ داری ہمارے ظریفانہ ادیبوں پر بھی ہے جنھوں نے بھونڈے پن کو ظرافت اور کھردرے جھلائے ہوئے انداز بیان کو طنز نگاری سمجھا۔ طنزیہ مزاحیہ ادیب کی پہلی صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ خود کو دنیا والوں اور رسم و رواج سے بندھی ہوئی ان کی ذہنیت سے برتر اور الگ سمجھتا ہے یعنی طنز و مزاح قائم اسی وقت ہوتے ہیں جب ہم طنز نگار یا مزاح نگار کی ذہنی برتری یا اخلاقی برتری کو قبول کریں۔ طنز و مزاح نگار اگر دنیا اور اہل دنیا کو حقیر یا بے وقوف یا ناسمجھ نہ سمجھے تو اس کی تحریر کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا۔ لیکن ذہنی اور اخلاقی برتری کا یہ رویّہ لطیفہ بازی، جملہ بازی، دانت پیس پیس کر کوسنے، گلا پھاڑ کر چلّانے سے نہیں قائم ہوتا۔ ہمارے زمانے کے ظریفانہ ادیبوں نے خود کو مسخرا یا جھگڑالو بنا کر پیش کرنا پسند کیا۔ ذہنی اور اخلاقی برتری نصیب نہیں تھی، ان میں سے اکثر میں وہ MALICE یا کینہ توزی بھی نہ تھی جس نے سودا سے شاہ ولی اللہ جیسے محترم اور مقدس اور مفکر بزرگ اور مرزا مظہر جانِ جاناں جیسے مرنجاں مرنج اور فرشتہ صفت صوفی کی ہجویں لکھوائیں۔ لہٰذا اُنھوں نے خود کو بھانڈ یا محفل کی وقت گزاری کو آسان کرنے والے لطیفہ گو یا فقرہ باز یا بات بات پہ گالیاں سنانے والے سٹھیائے ہوئے بڈھے کے روپ میں پیش کرنے میں عافیت سمجھی۔ ہمارے زمانے کے اکثر طنز و مزاح نگار اپنے لیے "میں" کے بجائے "ہم" کا استعمال کرتے ہیں، کیونکہ "ہم" میں ایک طرح کی گمنامیت ANONYMITY ایک طرح کی مسکینی اور عاجزی ہے۔ یہ وہ "ہم" نہیں ہے جو غزل کا شاعر استعمال کرتا ہے، بلکہ یہ وہ "ہم" ہے جسے لوگ عام بول چال میں گھریلو انداز میں استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے اکثر طنزیہ مزاحیہ مضامین میں "ہم" ایک سادہ لوح شخص کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ یہ سادہ لوح شخص بیوی سے ڈرتا ہے، دوست اس کی شرافت اور سیدھے پن کا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ دفتر میں یا کاروبار میں اسے ترقی نہیں ملتی۔ اس کی خوبی صرف یہ ہے کہ وہ موقع بے موقع بھونڈے یا سپاٹ لطیفوں سے اپنی باتوں کو قابلِ برداشت بناتا ہے۔ مرزا مظہر جانِ جاناں اور میر کے بارے میں سودا کے اشعار، خواجہ سرا کی ہجو میں میر کے اشعار، ظہور اللہ نوا کی ہجو میں جرأت کا مخمس، انگریزی تہذیب کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہندوستانی نوجوانوں کے بارے میں اکبر کی نظمیں پڑھ کر جس شخصیت کے خدو خال سامنے آتے ہیں اس کو آپ ناپسندیدہ کہہ سکتے ہیں، اس سے دوستی کرنا آپ شاید پسند نہ کریں، لیکن آپ اسے گھر گھسنا، لکھوڑ، زن مرید، دوستوں اور ساتھیوں کے لتروں کا ہدف نہیں کہہ سکتے۔ نہ ہی آپ اسے کٹ کھنا، چڑچڑے بوڑھے کی طرح بڑبڑاتا ہوا کوئی مجہول الحال لفظوں کا بھاڑ جھونکنے والا کہہ سکتے ہیں۔ آج کل ہمارے زیادہ تر مزاح و طنز نگار جس شخصیت اور ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ انھیں دو خانوں میں سے ایک میں فِٹ ہو سکتی ہے۔

مزاح میں گہرائی طنز کے بغیر نہیں آسکتی اور طنز کی پہلی شرط غصّہ نہیں بلکہ فکر ہے۔ یہ سمجھنا کہ طنز نگار کا میلان مفکرانہ نہیں ہوتا طنز نگاری اور کالم نگاری کو غلط ملط کرنا ہے۔ مفکرانہ میلان سے میری مراد یہ نہیں کہ طنز نگار کسی فلسفے کی تلقین کرتا ہے یا وہ افلاطون اور ارسطو کی کتابیں پڑھ کر ان کے خیالات کو بیان کرتا ہے۔ مفکرانہ میلان سے مراد یہ ہے کہ طنز نگار خود کو دنیا اور اہل دنیا کی کمزوریوں اور مجبوریوں سے اوپر سمجھتا ہے لیکن وہ ان کمزوریوں اور مجبوریوں سے بخوبی واقف ہوتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ وہ خود بھی ان برائیوں کا شکار ہو سکتا ہے۔ اس میں کھلنڈرا پن نہیں ہوتا لیکن ایک طرح کی IRREVERENCE اس میں ضرور ہوتی ہے جیسا کہ S.J. PERELMAN نے کہا ہے، لوگوں کے کولھوں میں کبھی کبھی سوئی چبھوتے رہنا چاہیے۔ لیکن یہ IRREVERENCE سرکس کے مسخرے والی حرکت نہیں ہوتی جو ہیرو ئن کو چپت لگا کر خود چاروں شانے چت گر جاتا ہے۔ ہمارے زمانے کے اکثر ظریفانہ ادیبوں نے خود کو میر کے شیخ کا مصداق بنالیا ؎

شہرہ رکھے ہے تیری خرمستی جہاں میں شیخ ✽ مجلس ہو یا کہ دشت اچھل کود ہر جگہ

بہت دن پہلے جب میں نے مجتبیٰ حسین کی تحریریں پڑھی تھیں تو ان کی نثر کی چستی اور چٹکلوں سے اچھل کود والے لطیفوں اور فقروں سے ان کے اجتناب کو دیکھ کر مجھے محسوس ہوا تھا کہ اعلیٰ مزاحیہ تحریروں کا گھر جو ایک عرصے سے اُردو میں بند پڑا تھا آہستہ آہستہ کھل رہا ہے۔ میں نے اس وقت بھی ان کا خیر مقدم کیا تھا جب وہ حیدرآباد کے ایک بالکل نوآمدہ لیکن چلبلے اور کسی طائر لاہوتی کی طرح نئی نئی اڑانیں بھرنے کے شائق مزاح نگار کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آئے تھے۔ پچھلے بیس برسوں میں میں نے بہت سے نئے ادیبوں سے توقعات وابستہ کیں، اور ان میں سے اکثر نے بعد میں مایوس کیا۔ یہ بھی ہمارے زمانے کا المیہ ہے کہ لوگوں کے شعلے بہت جلد بجھ جاتے ہیں یا شاید اب کے لوگ کاروبار ادب میں روحانی اور داخلی منفعت کے بجائے شہرت اور مالی منفعت زیادہ تلاش کرتے ہیں۔ بات جو بھی ہو، میری کتابوں کی الماریاں ایسے مجموعوں سے بھری پڑی ہیں جن میں شامل تحریروں کے لکھنے والے آج یا تو خاموش ہیں یا پہلے سے بہت خراب لکھ رہے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کے بارے میں بھی مجھے یہ خوف کئی سال تک رہا کہ یہ چمک دمک یہ آن بان کہیں چار دن کی چاندنی نہ ہو۔ میں نے ان کی ہر تحریر کو اور بعد میں جب ان سے ملاقات ہوئی اور ملاقاتیں ہونے لگیں تو خود ان کو اسی غور اور شوق اور تشویش سے دیکھا جس غور اور شوق اور تشویش سے کوئی ماہر نباتات کسی ایسے پودے کو دیکھتا ہو جس کا دنیا میں صرف ایک نمونہ ہو اور جس پر اس پودے کی تمام نسل کے قیام و استقلال کا دارومدار ہو۔ وہ جس طرح ہر ہر پتی، ڈالی کی ہر نوک اور پھنگی کو توجہ سے دیکھتا ہے کہ کہیں مُرجھا تو نہیں رہی ہے، کمزور تو نہیں پڑ رہی ہے، اسی طرح مجتبیٰ حسین اور ان کی تحریروں کو دیکھتا تھا کیوں کہ مجھے یقین ہی نہ آتا تھا کہ ایسا طرحدار مزاح نگار دس پانچ برس کے بعد بھی ترقی کرتا رہے گا کیا معلوم ہمارے بزرگ مزاح و طنز نگاروں کا بھونڈاپن، ان کا مسخراپن، ان کی تلملاتی ہوئی جھنجھلاہٹ اس پر کب اثر انداز ہو جائے۔ لیکن مجتبیٰ حسین نے میں ہی کیا مجھ سے بہتر لوگوں کو بھی حیرت میں مبتلا رکھا۔ اور اب جب کہ ہم ان کے سفرنامۂ جاپان کا خیر مقدم کرنے یہاں جمع ہوئے ہیں تو اس اطمینان اور یقین کے ساتھ کہ ابھی اس کنوئیں میں کئی ڈول پانی ہے۔

معاصر ظریفانہ ادیبوں میں دو ہی چار ایسے ہیں جنھوں نے طنز و مزاح کی ادبی حیثیت کو دوبارہ مستحکم کیا ہے۔ ایسے لوگوں میں مجتبیٰ حسین کا نام بہت نمایاں ہے۔ مشتاق احمد یوسفی، ظاہر ہے، اس گروہ کے سردار ہیں۔ کوئی اور اصطلاح میسر نہ ہونے پر میں ان لوگوں کو ادبی مزاح و طنز نگار کہتا ہوں۔ اس وجہ سے نہیں کہ مشتاق احمد یوسفی کی طرح مجتبیٰ حسین کے یہاں بھی اردو کے ادب عالیہ کی روایت اور اس کے کارناموں سے گہری واقفیت کا اظہار ہوا ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ ان لوگوں نے طنز و مزاح کی اس روایت کو زندہ کیا ہے جس کا سلسلہ سودا اور میر سے لے کر پطرس بخاری تک پھیلا ہوا ہے۔ مجتبیٰ حسین ابھی "ہم" کے جال سے اور لطیفہ گوئی کے گورکھ دھندے سے پوری طرح آزاد نہیں ہوئے ہیں۔ شاید وہ وقت نزدیک ہی ہے جب وہ ان بیساکھیوں کو بالکل ترک کر دیں گے لیکن جو چیز ان کی سب سے بڑی قوت ہے وہ یہ کہ انھیں زبان کو مزاحیہ طریقے سے برتنے کا سلیقہ آتا ہے جیمس تھربر JAMES THURBER نے NEW YORKER کے ایڈیٹر ہیرالڈ راس HAROLD ROSS کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ جس مزاح نگار کو کم تر درجے کا قرار دیتا تھا اس کے بارے میں وہ کہتا تھا کہ HE IS NOT FUNNY. HE DOES NOT KNOW ENGLISH یعنی اس کی ظرافت مزے دار نہیں ہے اس کو زبان نہیں آتی۔ تھربر کہتا ہے کہ جب راس سے اس کی پہلی ملاقات ہوئی اور تھربر نے اس کو اپنی لیاقتوں کی فہرست بتائی تو راس نے پوچھا۔ "وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن تم کو انگریزی آتی ہے کہ نہیں؟" تھربر نے جواب دیا کہ "کیوں نہیں آتی!" تو راس نے کہا "خدا غارت کرے، انگریزی کسی کو نہیں آتی"۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مزاح نگار کو زبان کی قوت

کا اندازہ ہونا کس قدر ضروری ہے۔ ہنسی پیدا کرنے والے واقعات تو ہم شاسب نکال لیتے ہیں لیکن زبان کو اس طرح برتنا کہ تضاد، تناسب، توازن کے ذریعہ ہنسی والی بات بن جائے ہر ایک کا کام نہیں۔ مجتبیٰ حسین ان تینوں طریقوں کو بہت خوبی سے برتتے ہیں۔ "ہمارے معاشرے کی خرابی یہ ہے کہ جب بھی زمین پر کوئی آفت آتی ہے تو آسمان کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔" "کپڑے بنانے والی کمپنیاں ہمیشہ اپنے کیلنڈروں پر ایسی حسیناؤں کی قدآدم تصویر چھاپتی ہیں جن کے بدن پر گھڑی اور انگوٹھی کے سوائے کوئی لباس نہیں ہوتا۔" "مہنگائی کا یہ عالم ہے کہ اس شہر میں ہمیں اپنے سوا کوئی اور سستی چیز نظر نہیں آتی۔" "کمرہ اتنا چھوٹا ہے کہ اس میں کسی خواب کے داخل ہونے کی گنجائش نہیں ہے۔" ان جملوں میں وہ باریکیاں ہیں جو تخلیقی زبان میں ہوتی ہیں۔

پھر یہ بھی ہے کہ مجتبیٰ حسین کو غیر متوقع CONNECTIONS ملانا خوب آتا ہے۔ یہ صفت بھی زبان کے خلاقانہ استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔ "قدرت اللہ مجھ سے ہمیشہ یہ کہتے تھے کہ وہ کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ درست بھی تھا کیوں کہ ایک بار میں نے خود اپنی آنکھوں سے انھیں سوکھی روٹی کا ٹکڑا چٹنی کی مدد سے کھاتے اور بعد میں پانی پیتے دیکھا تھا۔" ایک زمانے میں انگریزی تعلیم کے زیر اثر لوگوں کا خیال تھا کہ INCONGRUITY مزاح کا جوہر ہے۔ بات صحیح ہے لیکن INCONGRUITY کا مطلب بے تکا پن نہیں، بلکہ غیر متوقع چیزوں کو یک جا کرنا ہے۔ مجتبیٰ حسین اس کے ذریعہ طنز کا بھی کام لیتے ہیں۔ ان کی شگفتگی کو دیکھ کر بعض لوگ اس بات کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ وہ معاصر دنیا سے خاصے ناراض بھی ہیں اور ان کا مزاح ان کے طنز سے الگ نہیں ہے۔ "جاپان چلو جاپان چلو" میں ان کی ناراضگی ذرا کم جھلکتی ہے۔ ویسے ٹھیک بھی ہے، کیوں کہ میں انھیں سفرنامہ نگار یا نامہ نگار نہیں سمجھتا بلکہ میں انھیں پطرس بخاری کی کرسی کی طرف بڑھتا ہوا دیکھنا پسند کرتا ہوں ــــ!

□□

ایک صاحب کسی دوست کے ہاں مہمان بن کر گئے اور دوست کی ساری اشیاء کو بلا تکلف استعمال کرنے لگے۔ ایک دن ان کے دوست نے ان کی حرکتوں کے بارے میں لوگوں سے یہ شکایت کی :

"صاحب! یہ عجیب و غریب آدمی ہیں۔ داڑھی بنانی ہو تو میرا شیونگ سیٹ استعمال کرتے ہیں۔ باہر جانا ہو تو میرے کپڑے استعمال کرتے ہیں۔ مجھے سب چیزیں گوارہ ہیں لیکن دلی صدمہ تو مجھے اس وقت پہنچتا ہے جب یہ پان چبانے کے لیے میرے مصنوعی دانتوں کا سیٹ استعمال کرتے ہیں۔ اور مزید افسوس کی بات تو یہ ہے کہ میرے ہی دانت نکال کر مجھ پر ہنستے ہیں۔ بتایئے یہ کس قدر گھٹیا اور کمینہ حرکت ہے۔

مجتبیٰ حسین

مجھے میرے دھوبی سے بچاؤ ۔ تکلف برطرف

پروفیسر سید وحید اختر
صدر شعبۂ فلسفہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مجتبیٰ حسین کا شناس نامہ: حیدرآباد

جامعہ عثمانیہ کے آرٹس کالج کی حسین اور پُرشکوہ سنگی شاندار عمارت کا باب الداخلہ اپنی باہیں کھولے ہوئے علوم کے ماہرین اور طلباء کی آماجگاہ اُس وقت سے ہے جب یہ عدیم النظیر دانش گاہ شہر سے اپنے نو زائیدہ کیمپس میں منتقل ہوئی۔ جامعہ عثمانیہ بیسویں صدی کے برصغیر میں اسلامی، علمی، نشاۃ ثانیہ کی سب سے نمایاں علامت بھی ہے اور یادگار بھی۔ علامت اس لیے کہ اس دانشگاہ نے مسلمانوں کو جدید علوم کے زیور سے آراستہ کرنے کے لیے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی زائیدہ و پروردہ زبان اردو کو ذریعہ تعلیم کے طور پر انتخاب کرکے قومی زبانوں کی خود مختاری اور پُرمائیگی کا ثبوت فراہم کیا۔ انسانی علوم ہی نہیں بلکہ عمرانی علوم سے لے کر طبعی علوم، ٹیکنالوجی، انجینئرنگ، جدید طب، علم حیوانات و زراعت سب کی اعلیٰ درجے کی تعلیم و تحقیق اردو زبان کے وسیلے سے ہوتی تھی۔ اس جامعہ کے فارغ التحصیل آزادی کے بعد بھی ہندوستان و پاکستان میں اس کامیاب تجربے کے زندہ اور فعال شواہد بنے رہے۔ دارالترجمہ نے عربی، فارسی، انگریزی اور دوسری زبانوں سے قدیم و جدید علمی کُتب کا ترجمہ شائع کرکے اردو کو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں کھڑا کر دیا۔ اسلامی تاریخ میں مغول اور تاتاریوں کی یورش نے اسلامی ممالک کے علمی ذخیروں کو تباہ کرنے کا الزام اپنے سر لیا تھا لیکن اس بے مثال علمی و لسانی سرمائے کی تباہی کسی غیر متمدن وحشی، اجنبی قوم کے ہاتھوں نہیں ہوئی، بلکہ اس کے قاتل ہم خود ہیں۔ نو آزاد ہندوستان کی بزعم خود روادار غیر مذہبی اور ہمہ جہتی پالیسی نے اردو کو اس جامعہ سے جلا وطن کرکے اور دارالترجمے کے ذخیرے میں آگ لگا کر ایک ایسے کامیاب تجربے پر پانی پھیر دیا جو ہمارے ملک اور پڑوسی ملک میں قومی زبانوں کی علمی پیش رفت کے لیے مثالی نمونہ تھا۔

جامعۂ عثمانیہ کے قیام نے حیدرآباد میں اُردو ادب کو نئی زندگی، توانائی اور روشنی بخشی۔ اس ادبی اور تخلیقی فعالیت نے حیدرآباد کو غیر منقسم برصغیر میں ادبی مرکزیت بخش دی تھی۔ ترقی پسند مصنفین کی وہ شاندار کانفرنس جس نے پُرانے اور نئے لکھنے والوں کو ایک پلیٹ فارم پر یکجا کیا حیدرآباد نے ۱۹۴۲ء میں منعقد کی تھی۔ اس آواز کو دکن ریڈیو حیدرآباد نے ہوا کی لہروں کے ذریعہ نشر کرکے پوری ریاست اور اُس کے باہر ادب شناس سامعین تک پہنچایا۔ ۱۹۴۸ء کے فوجی ایکشن کے بعد وہ شیرازہ منتشر ہوگیا جسے دہ ھا سال کی محنت نے جمع کیا تھا۔ اڑائے کچھ ورق لالے نے

نے، کچھ گُل کچھ گلستان نے یہ ورق مرصرِ زماں نے کہاں کہاں اُٹھا کر پھینکے، پاکستان، انگلستان، کینیڈا، امریکہ، خلیجی ممالک ۔ جہاں تک ہجرت کی ہوا اُڑا سکتی تھی اِس دفتر کے ورق اُڑا لے گئی۔ نہ تو جامعۂ عثمانیہ کی وفات پر کسی نے مرثیہ لکھا نہ حیدرآباد کے ادبی زوال کا کوئی المیہ لکھا گیا۔ یہ سب جمہوریت، سیکولرازم اور قومی یکجہتی کو مضبوط کرنے کے نام پر تھا۔ نہ تو ریاستِ حیدرآباد کے آخری دَور کی ناعاقبت اندیش مُسلم قیادت نے اِس المیے کی پیش بینی کی اور نہ سیکولر جمہوری ہندوستان کے مرکز دہلی نے اُس قومی نقصان کا اندازہ لگایا جو آگے چل کر ہمارے ملک میں بدترین علاقائی، لسانی اور بین مذہبی منافرت و فسادات کا دیباچہ بننے والا تھا۔ سیاست کی دُنیا میں ہمیشہ نئی نسلیں جہاندیدہ باراں گزیدہ بزرگوں کی حماقتوں کا خمیازہ بھگتی ہیں۔ حیدرآباد میں جامعہ عثمانیہ کے نوبالغ طلباء بے۔ این چودھری کی دبابوں اور جدید ترین آلاتِ قتل سے مسلح فوجوں کے سامنے نہتے جاں نثار کرنے گئے، قائدینِ ملّت ہوا کے دوش پر اُڑ کر پاکستان مہاجرت فرما گئے۔ یہ شمالی ہند میں بھی ہوا لیکن حیدرآباد کی مُسلم ریاست تقسیم کے بعد تمام ملک کے بے گھر، لُٹے ہوئے اور تباہ حال مسلمانوں کا ملجا و ماویٰ بنی ہوئی تھی۔ اورنگ آباد میں جو ممالکِ محروسۂ سرکارِ عالی نظام کی سرحد پر پہلا بڑا تہذیبی مرکز تھا، میں نے اپنے بچپن کی آنکھوں سے اُجڑے اور لُٹے ہوئے خاندانوں کے خیمہ در خیمہ شہر دیکھے ہیں۔ اورنگ آباد کے رہنے والے ان بن بلائے مہمانوں کو مہاجر سمجھ کر اپنی بانہوں میں سمیٹتے تھے ۔۔ غریبوں کے گھروں کے فاقہ زدہ، غربت گزیدہ، افلاس چشیدہ ہاتھوں کی پکائی ہوئی روٹیاں بچوں کے بھوکے دہنوں کو ترسا کر مہاجرین کے خیموں تک لے جائی جاتی تھیں۔ اسلامی اخوت کی داستانیں ہجرتِ رسول اکرمؐ کے ذیل میں کتابوں میں پڑھی اور مجالس عزا کے منبروں سے سُنی اور کہی تھیں اُن کا مظاہرہ شعور نے سیاست اور معیشت کی دنیا میں اُن آنکھوں سے دیکھا جو ابھی سیاست و معیشت کی بے رحمی و انسان کُشی سے آشنا نہیں تھیں جس دن اورنگ آباد میں ہندوستانی فوجیں داخل ہوئی ہیں میں اپنے اسکول کے چند ناپختہ، سیاست ناآشنا دوستوں کے ساتھ ظفر دروازے کے پاس اُن کی آمد کے طمطراق کو دیکھتا کھڑا تھا۔ یہ پتہ نہیں تھا کہ اورنگ آباد میں چند مہینوں کے لیے خیموں کا شہر بسانے والے شمالی ہند کے مہاجرین دوبارہ اُس ارضِ موعود کی ہجرت کا سفر شروع کریں گے جہاں آزادی کے چالیس سال گزار لے کے بعد بھی انہیں مہاجر ہی کہا جائے گا۔ ہجرت کے اس قافلے میں پوری ریاستِ حیدرآباد کے جمے جمائے، بسے بسائے افراد اپنا بچا کھچا سرمایہ سر پہ اُٹھائے واہگہ کی سرحد پار کرتے نظر آئیں گے۔ ایک تہذیب تھی جو اُجڑ گئی، ایک تحریک تھی جو قبل از بلوغ مر گئی، ایک نشاۃ ثانیہ تھی جو برگ و بار لانے سے پہلے تقسیم اور فسادات کے مسموم جھونکوں سے مُرجھا گئی۔ عثمان آباد میں فوجی ایکشن کے پچیس، تیس سال بعد تک بیواؤں اور یتیموں کی بازآبادکاری ایک مسئلہ بنی رہی۔ گلبرگہ، بیدر اور رائچور تک اِس تباہی کی لہریں پہنچیں ۔۔ لیکن تہذیبی اور لسانی نشاۃ ثانیہ کی جڑیں اتنی سطحی نہیں تھیں کہ آسانی سے اپنی زمین سے اُکھڑ جائیں۔ یہ جڑیں تقسیم اور حیدرآباد پر فوجی ایکشن کے بعد بھی کہیں کہیں برگ و گُل و ثمر لاتی رہیں۔ مجتبیٰ حسین اِسی اجڑی ہوئی نشاۃ ثانیہ کے دورِ خزاں کا ایک ثمرہ ہیں۔

ممالکِ محروسۂ نظام حیدرآباد کے سقوط کی داستان ذرا لمبی ہو گئی ۔۔ حالانکہ یہ بڑی دردناک تصویر کا صرف اجمال ہے ۔۔ لیکن یہ تمہید ناگزیر ہے اُس حیدرآباد کی نئی نسل کے ادیبوں اور شاعروں کو سمجھنے کے لیے جنھوں نے آزادی اور سقوطِ حیدرآباد کے اولین برسوں میں اپنے اَدبی شعور و اظہار کے وسیلے سے دنیا کو دیکھنا، سمجھنا، محسوس کرنا اور اُس کو فن میں بیان کرنا سیکھا ۔ یہ پس منظر خود میرے اَدبی اظہار کی تربیت کا بھی ہے اور مجتبیٰ حسین کی ادبی نشو و نما

کا بھی دیباچہ ہے یہ پس منظر مجھے اُن سے اور اُنھیں مجھ سے ایک اٹوٹ رشتے میں جوڑتا ہے۔ مجتبیٰ حسین ہندوستان اور پاکستان کے اردو ادبی حلقوں میں ایک مزاح نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ مزاح اور طنز دراصل کسی گہرے اندرونی کرب اور المیے کا پردہ ہوتا ہے۔ بڑا ادب وہ ہے جو الفاظ کی نقابوں میں اُن چہروں کو چھپالے جو آنسوؤں سے بھیگے ہوئے ہیں۔ یہ پردہ پوشی کبھی کبھی پردہ دری بھی بن جاتی ہے۔ میں نے مجتبیٰ کی شناخت کے لیے جو تمہید باندھی ہے اس کے نقوش خود اُن کی تحریروں میں نظر آتے ہیں :

"ابراہیم جلیس افسانہ نگار تھے مگر میرے لیے صرف افسانہ تھے۔ حالانکہ وہ میرے بڑے بھائی تھے۔ وہ پڑوسی ملک کے شہر کراچی میں رہتے تھے مگر لگتا تھا کہ وہ لاکھوں کروڑوں میل دُور ہیں۔ حالانکہ یہ فاصلہ چند سو میل سے زیادہ کا نہیں تھا۔

وہ مجھ سے بارہ تیرہ برس بڑے تھے لیکن لگتا تھا وہ کافی عمر رسیدہ ہو گئے ہیں حالانکہ ان کی عمر ۵۴ برس سے زیادہ نہیں تھی۔

حقیقت جب افسانہ بن جاتی ہے، فاصلے جب پھیل جاتے ہیں، عمریں جب دھوکا دینے لگتی ہیں تو دو بھائیوں کے رشتے کتنے بے بس، مجبور اور بے معنی ہو جاتے ہیں . . . ۱۹۴۸ء میں وہ زندگی کے ایک بڑے بحران سے گزر رہے اور ایک دن خاندان والوں کو پتہ چلا کہ وہ ہندوستان سے چلے گئے ہیں۔ والد صاحب کو پورے دو مہینوں بعد ان کے ہندوستان سے چلے جانے کی اطلاع ملی۔ کئی دنوں تک پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ پھر پتہ چلا کہ وہ لاہور میں کسی اخبار سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ پھر چند ہی دنوں بعد ان کا مشہور رپوتاژ "دو ملک ایک کہانی" چھپ کر آیا۔

جلیس صاحب کی یہ وہ کتاب ہے جس میں انھوں نے نہ صرف اس برصغیر کو تقسیم کرنے والی سیاست سے ٹکر لی تھی۔ بلکہ اپنے آپ سے بھی ٹکر لی تھی۔ یہیں انھوں نے اپنے ٹوٹے پھوٹے وجود کو بڑے جتن کے ساتھ پھر سے جوڑا تھا۔ اور بڑی بے باکی اور بے جگری کے ساتھ اپنے آپ کو بھی نشانہ ملامت بنایا تھا۔ یہ کتاب اوروں کے لیے تو اس برصغیر کی تاریخ کے ایک سنگین دور کی دستاویز ہے لیکن خود جلیس صاحب کے لیے یہ کتاب "تزکیۂ نفس" کی حیثیت رکھتی تھی۔ اسی کتاب کے ذریعہ انھوں نے اپنے دل میں چبھے ہوئے کانٹوں کو چن چن کر باہر نکالا۔ اس کتاب کے بعد وہ پھر ایک بار چٹان کی طرح مضبوط بن گئے اور نئے تجربوں سے ٹکر لینے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔

جلیس صاحب کی زندگی کے وہ دن بڑے کٹھن تھے۔ نیا ملک نئی سرزمین، نئے لوگ، ان حالات میں اپنے لیے جگہ بنانا ان کے لیے کتنا دشوار تھا مگر وہ ہمت ہارنا جانتے ہی نہ تھے۔ ان کے بچے اور بیوی برسوں یہیں ہندوستان میں رہے۔ وہ بیوی بچوں اور اپنے وطن کا اپنے رشتہ داروں اور اپنے احباب کے لیے تڑپتے رہے لیکن کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ نفرت، لوٹ کھسوٹ اور انسان دشمن نظریات کے خلاف انہوں نے بدستور اپنی جنگ جاری رکھی۔ اس ضمن میں وہ جیل بھی گئے۔

والد صاحب کو جب پاکستان میں ان کی گرفتاری کا پتہ چلا تو وہ اس اطلاع سے یوں خوش ہوئے جیسے ان کی کوئی دیرینہ خواہش پوری ہوئی ہو۔ پرانی نسل کے لوگ بھی کیسی کیسی باتوں پر خوش

ہونا جانتے تھے اور آج ہماری خوشیاں کتنی مختلف ہیں . . . . ۲۷ اکتوبر ۱۹۷۷ء جب جلیس صاحب کو اس دنیا سے رخصت ہوئے پورے ۲۷ گھنٹے بیت چکے تھے اِن کا جسدِ خاکی منوں مٹی کے بوجھ تلے دب چکا تھا۔ مجھے "ٹائمز آف انڈیا" کی خبر سے پتہ چلا کہ ارضِ دکن کے باغی ادیب نے سندھ کی وادی میں اپنا پڑاؤ ڈال دیا ہے۔ دو بھائیوں کے بیچ کمیونی کیشن کا یہی ایک سنگین ذریعہ رہ گیا تھا۔ ان کے انتقال سے دو ملکوں میں رہنے والے بھائیوں کے درمیان دبی دبی سی جو ایک کہانی ۲۹ برسوں سے جاری تھی وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔"

یہ وہ کہانی ہے جو دو بھائیوں کے قلم کو جو ایک ہی شجرِ نور کی دو شاخیں تھیں ایک دوسرے سے جُدا کر لی ہے۔ لیکن یہ دو ملکوں کی وہی ایک کہانی ہے جس کا بیج تقسیم ہند اور سقوطِ حیدرآباد کی زمین میں بویا گیا تھا۔ مجتبیٰ حسین ایک اچھے خاکہ نگار بھی ہیں، جن کے شخصی خاکوں میں خوش دلی، چھوٹے چھوٹے واقعات اور مضحک مواقع کو اُبھار کر مزاح کا رنگ بھرتی ہے۔ ابراہیم جلیس، اُن کے بچھڑے ہوئے جلا وطن بھائی، ان کے لیے دوسرے ملک کی ایک اپنی مگر اجنبی شخصیت تھے، یہ اگر طنز ہے تو اُس سیاست پر جس نے مذہب اور سیاست کے نام پر تہذیب کو کاٹا، زمینوں کو بانٹا اور دلوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ جلیس کا زہر میں ڈوبا ہوا طنز لگا قلم ان کے برادرِ خورد مجتبیٰ کے ہاتھ میں آکر خوش مزاجی کا امرت ٹپکانے لگا۔ تقسیم کے حادثے نے سارا زہر نچوڑ لیا اور اُسے لطیف دردمندی بخش دی۔

جامعۂ عثمانیہ ۱۹۵۲ء اور اس کے آس پاس کے برسوں میں یوں لگتی تھی جیسے اُس کے سینے پر سے ابھی ابھی کوئی لشکر گزرا ہو۔ لیکن اس پامال شدہ دُنیا میں بھی ابھی تک اس زندگی، ہماہمی اور تہذیبی سرگرمی کے آثار باقی تھے جو اس سے روٹھ چکی تھی۔ میں ۱۹۵۲ء میں اورنگ آباد سے انٹرمیڈیٹ سائنس کا امتحان پاس کر کے حیدرآباد آیا تو نہ انجینئرنگ کالج کے وعدۂ معاش نے دامن تھاما نہ سائنس کی عمارتوں میں دل لگا۔ وہی آرٹس کالج کا بابِ الداخلہ جس میں داخل ہوتے ہی "اَنَا مَدِیْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُهَا" کے روشن حرف اپنی طرف کھینچتے تھے، دامن گیر ہوا۔ یہیں آٹھ سال یوں گزرے جیسے خواب کا سا عالم۔ حیدرآباد شہر میں ابھی گزشتہ دور کے کچھ باقیات ادب کی اُس شمع کو جلائے ہوئے تھے جس نے چند برس پہلے برصغیر کو اپنی طرف متوجہ کر رکھا تھا۔ یہی روشنی ادب کے ایک پروانے کو اس شہر میں کھینچ لائی تھی۔ اِس روشنی کا مبداء اب بھی جامعۂ عثمانیہ کا آرٹس کالج ہی تھا۔ ۱۹۵۴ء میں بزمِ اردو آرٹس کالج کی صدارت کے لیے یہ خاکسار اُمیدوار ہوا تو اُس کی مقامی شاعرانہ شہرت اور تعلیمی کامیابی نے ہر دوسرے عہدے کے اُمیدوار کو مجبور کیا کہ وہ اُسی کے ساتھ الیکشن میں معاہدہ کرے۔ ایک خاتون کا اس انتخابی اکھاڑے میں میری نیابت کے لیے اُترنا دشتِ جنوں کے دیوانوں کے لیے مہمیز بن گیا۔ اِس الیکشن میں بڑی اُلٹ پھیر ہوئی۔ میں نے اپنی شاعری کی نومولود شہرت اور مقبولیت کے سامنے کسی دوسرے اُمیدوار کو اہمیت ہی نہ دی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میں ہارا اور دوسرے جیتے۔ میری نیابت کی اُمیدوار خاتون بھی اس لیے فتح یاب ہوئیں کہ ہر اُمیدوار اُن کے ساتھ مل کر "بزمِ اُردو" کی شمع کو جلانا چاہتا تھا۔ اس ہار جیت کے بعد جو صاحب "بزمِ اردو" کے سیکریٹری منتخب ہوئے تھے انھیں اپنے ڈیپارٹمنٹ میں آتا جاتا دیکھا۔ گہرا سانولا رنگ، لمبا قد، لہجے میں نہ حیدرآبادی محاورے کی شیرینی اور لچک، نہ آواز میں مٹھاس۔ صاف لگتا تھا کہ "شہر" سے باہر کے ہیں۔ حیدرآباد والے شہر صرف اپنے شہر کو سمجھتے ہیں، باقی سب اضلاع ہیں۔ میں بھی اضلاع کا تھا اِس لیے کہ حیدرآباد کے ضلع اورنگ آباد سے آیا تھا مگر والدین سے

اردو کی خالص کوثر میں دُھلی ہوئی گنگ و جمن میں نہائی ہوئی زبان، لہجہ اور محاورہ سیکھنے کی وجہ سے "ہو" اور "ہکو" کہنے والوں کے درمیان خود کو واحد متکلم صیغے میں "ہم" کہنے کی وجہ سے تھا لفظ بہ دیگر شعبے کی وجہ سے "مابدولت" کیا الیکشن میں اس "ہم" کا استعمال کیا گیا۔ نوعمری میں شہرت اور اہمیت حاصل ہونے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ آدمی اپنے ہم عمروں سے کٹ جاتا ہے، اپنے ہم درسوں سے اس دوری اور لولی چال کی غیر حیدرآبادیت کو جس شخص کی وجہ سے میں نے پہلی بار اپنا زیاں محسوس کیا، وہ وہی شخص تھا جو الیکشن میں "بزم اردو" کا سیکریٹری منتخب ہو کر کبھی کبھی نائب صدر سے ملنے کے لیے شعبۂ فلسفہ بھی آنے لگا تھا۔ یہ شخص جس کے ہاتھوں مجھے یونیورسٹی کے کسی الیکشن میں پہلی بار شکست ہوئی، مجتبیٰ حسین تھا۔

اُس وقت مجتبیٰ بی۔ اے کے طالب علم تھے اور میں ایم۔ اے کر رہا تھا۔ اُن کا تعلق کاچی گوڑہ کے گلبرگہ اسٹوڈنٹس کا ٹیج سے تھا جہاں کبھی کبھی مشاعرے اور ادبی محفلیں بھی برپا ہوتی رہتی تھیں۔ لیکن اُس وقت بھی اور اس کے بعد بھی برسوں تک مجتبیٰ ان محفلوں تک میں محض سامع ہوتے تھے اور میں قاری۔ ۱۹۶۰ء میں حیدرآباد مجھ سے چھوٹ گیا۔ مجتبیٰ بی۔ اے کے بعد تعلیم ترک کر کے ملازمت اور حصولِ معاش کے چکر میں پڑ چکے تھے۔ کبھی کبھی وہ اورینٹ ہوٹل آجاتے جہاں اُس دور میں حیدرآباد کے ادیب، شاعر، ٹریڈ یونین لیڈر، سیاستداں، مصور اور دانشور جمع ہوتے تھے۔ وہ جس میز پر بیٹھتے وہاں سے اُن کی آواز کے جلو میں قہقہے اُبھرتے سنائی دیتے تھے۔ یہ قہقہے مجھے ۱۹۵۴ء کے بزم اردو کے انتخاب کے زمانے سے ناگوار گزرتے تھے۔ مجھے اس شخص سے ایک چھپی ہوئی کد تھی۔ چہرے، لہجے، بات کرنے کے انداز اور ہنسنے میں کہیں تو کوئی پختگی اور فنکاری ہو، کچھ نہیں۔ علی گڑھ سے تعطیلات میں جب حیدرآباد بطور مہمان جانے لگا تو یہ چہرہ، یہ آواز، یہ قہقہے بار بار ہر ریسٹوران اور ہر محفل میں میرا پیچھا کرنے لگے کچھ نہیں تو مجھے اس آواز کا غائبانہ ذکر ہی سننا پڑتا تھا۔ میرے دوست سلیمان اریب بھی کبھی اِن قہقہوں کے پیچھے کار فرما شخص کے لطیفے مزے لے لے کر سناتے تھے۔ اریب نے ہاؤزنگ سوسائٹی سے ایک گھر بالاقساط ادائیگی کی اسکیم کے تحت خریدا تھا۔ اس کی ایک دیوار گری تو بازتعمیر میں مہینوں لگ گئے۔ اس زمانے میں اریب ہندوستان کا مشہور اور منفرد ادبی ماہنامہ "صبا" نکالتے تھے جس کی وی۔ پی سے بھیجی ہوئی کاپیاں اکثر موہوم و معدوم خریداروں کے پتے سے بیرنگ واپس آیا کرتی تھیں۔ "صبا" کا ایک ایک نسخہ بکنا ایک ادبی داستان ہوتا تھا۔ اریب کے گھر کی گرتی ہوئی دیوار خشت بہ خشت تعمیر ہو رہی تھی۔ ایک دن اریب نے ہنستے ہوئے کہا کہ ایک نوجوان کہتا ہے جب "صبا" کی ایک کاپی بکتی ہے تو اریب کے گھر کی دیوار میں ایک اینٹ بڑھتی ہے۔ کچھ دن بعد تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ حیدرآباد اور ہندوستان کے اپنے دور کے ممتاز ترین اور محبوب ترین، مخدوم محی الدین بھی اس نوجوان کے کہے ہوئے فقرے ہنس ہنس کر دہرانے لگے۔ جو لوگ مخدوم کی بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی کی صلاحیت سے آشنا ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ مخدوم اپنی گفتگو میں کسی کے مزاحیہ فقرے دہرائیں تو یہ اُس کی خوش مزاجی کے لیے ایک سند ہوتی تھی۔ یہ نوجوان جس کے فقرے اریب سے لے کر مخدوم تک دہرانے لگے تھے وہی مجتبیٰ حسین تھا۔

پہلی بار مجتبیٰ سے قریبی ملاقات حیدرآباد کے مشہور ہوٹل ویکاجی میں حسن عسکری کے توسط سے ہوئی۔ برسوں کی دور کی شناسائی کے فاصلے اتفاق نشست نے تھوڑے سے کم کیے۔ پھر ایک بار یہ پتہ چلا کہ مجتبیٰ روزنامہ "سیاست" کا طنزیہ کالم "شیشہ و تیشہ" لکھنے لگے ہیں۔ یہ کالم برسوں حیدرآباد کے مقبول اور

زندہ دل شاعر شاہد صدیقی لکھا کرتے تھے۔ کسی وجہ سے ۱۹۵۶ء یا ۱۹۵۷ء میں شاہد اس سے کنارہ کش ہوکر آخر کے اخبار "عوام" میں جو اُن کے اور قاضی عبدالغفار کے "پیام" کا جانشین تھا، چلے گئے تو قرعہ فال میرے نام نکلا۔ تقریباً ایک سال حصولِ معاش کے لیے "ہم" نے مزاح نگاری بھی فرمائی۔ مجتبیٰ نے تو "شیشہ و تیشہ" کے کالم سے آگے بڑھ کر ہندوستان میں طنز و مزاح کی اقلیم پر دھاوا بول دیا لیکن "ہم" طنز و مزاح کو تحریر کی بجائے اپنی گفتگو تک محدود رکھ کر شاعری کی زیادہ سنجیدہ وادی میں گامزن رہے۔ جس "ہم" کو مجتبیٰ نے "بزمِ اردو" کے انتخاب میں شکست دی تھی اُسے حیدرآباد بھی چھوڑنا پڑا۔ وہ حیدرآباد جو دلّی اور لکھنؤ میں مسلمانوں کے زوال کے بعد شمالی ہند کے مسلمانوں اور اردو والوں کی منزلِ مقصود بنا رہا تھا اب خود اپنے ملکی شہریوں کو بھی معاش فراہم نہ کرسکتا تھا۔ جامعہ عثمانیہ کے آرٹس کالج کا عظیم الشان بابُ الداخلہ اُردو والوں پر بند اور مسلمانوں پر تنگ ہوچکا تھا۔ میرے والد صاحب تلاشِ معاش میں اودھ سے ریاستِ حیدرآباد گئے تھے۔ میری ہجرت شکم کا راستہ برعکس تھا، مجھے حیدرآباد سے شمالی ہند آنا پڑا۔ وہ جامعہ عثمانیہ جس نے اورنگ آباد اور گلبرگہ اور نہ جانے کتنے پرانے تہذیبی اور تاریخی مرکزوں کے نوجوانوں کو اپنی آغوش میں سمیٹا اور ان کے ذوقِ علم و ادب کی ترتیب کی تھی اب شہر حیدرآباد کے اردو لکھنے والوں سے بھی آنکھ چرانے لگی تھی۔ میں ۷۰ء کے آس پاس ایک بار دہلی گیا تو معلوم ہوا کہ مجتبیٰ حیدرآباد کے محکمۂ اطلاعات کی ملازمت چھوڑ کر دہلی آچکے ہیں اُن سے پہلی ملاقات ہوئی تو وہ اِس شہر میں اجنبی تھے۔ چند ماہ بعد پھر ملے تو ایسا لگا جیسے وہ اپنے ساتھ اور بینٹ ہوٹل کی میزوں سے اُبھرنے والے فقرے، قہقہے اور لطیفے اُٹھا کر دہلی سمیٹ لائے ہیں۔ جس سے ملے وہ کسی نہ کسی عنوان سے ہر موضوع، ہر واقعے، ہر ادبی سانحے، ہر ادیب، ہر شاعر، ہر کتاب، ہر جلسے کے متعلق مجتبیٰ کا کوئی فقرہ مزے لے کر سُناتا۔ عجیب آدمی ہے کہ صرف دو سال جامعہ عثمانیہ میں پڑھ کر الیکشن میں اپنے سے سینئر طلباء کو شکست دی اور اب پوری دہلی کو چند مہینوں میں تسخیر کرلیا۔ ہم یہاں بھی اجنبی بنے رہے، اور اس نے دلّی میں ایک نیا اور شگفتہ حیدرآباد ڈھونڈ لیا۔

مجتبیٰ کی تسخیری مہم ادبی حلقوں اور جلسوں تک ہی محدود نہ رہی۔ اعلیٰ سے اعلیٰ سرکاری افسر، بڑے سے بڑا سیاستداں، حتیٰ کہ مرکزی کابینہ کے وزراء تک اِس تسخیرِ سمٰوات و ارض کی زد میں تھے۔ ایک بار مجھے اپنے طالب علمی کے زمانے کے ایک دوست علی باقر سے کسی معاملے میں ٹیلیفون پر بات کرنی تھی، وہ مجتبیٰ کے ہم درس رہ چکے تھے۔ بار بار انھوں نے یہ کہا کہ مجتبیٰ آپ کو اپنا دوست اور "محسن" کہتے ہیں۔ اُس وقت سے آج تک میری سمجھ میں یہ نہ آیا کہ مجھے "محسن" کہنے میں طنز یا مزاح کا کون سا پہلو مخفی ہوگا۔ لیکن یہ ضرور سمجھ میں آیا کہ بعد کے برسوں میں جب بھی دہلی جانا ہوا مجتبیٰ ہر معاملے میں میرے عقدہ کشا ثابت ہوئے۔ شاید انھوں نے غائبانہ مجھے بڑا اچھا "محسن" کہہ کر اپنے آئندہ احسانوں کے لیے زمین تیار کی تھی۔ حیدرآباد سے آنے والا کوئی بھی شخص دہلی میں مجتبیٰ کی مدد کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔ یہاں تک کہ قاضی سلیم، جو کانگریس پارٹی کے ممبر پارلیمنٹ ہوکر دہلی آئے، حکمراں طبقے میں شامل ہونے کے باوجود اپنے نجی اور ذاتی کاموں کے لیے جب بھی کڑا وقت پڑتا، مجتبیٰ ہی کی طرف ہاتھ بڑھاتے تھے۔ مجھ ایسا تساہل پسند جو بغیر کسی دوست کے سہارے کے ایک قدم بھی نہیں چل سکتا، دہلی میں مجتبیٰ کے بغیر ہمیشہ خود کو بے دست و پا محسوس کرنے لگا۔ یہ آخری شکست تھی جو میرے "ہم" کو جامعہ عثمانیہ کے الیکشن میں ہرانے والے نے اِس طرح دی کہ یہ شکست مستقل دوستی کا پیش خیمہ بن گئی۔ اب لہجے کا وہ کھردرا پن، آواز کی وہ سختی اور چہرے کا وہ کڑا سا تناؤ پن

جو کبھی بُرا لگتا تھا، صرف اچھا ہی نہیں محسوس ہونے لگا بلکہ ان کے بغیر دہلی کا ہر سفر بے رنگ اور روکھا پھیکا نظر آنے لگا۔ مجتبیٰ نے ہندوستان میں جو محبوبیت ادبی طنز و مزاح کے وسیلے سے حاصل کی ہے اسے سمجھنے کے لیے اُن کی شخصیت کے اس پہلو کو سمجھنا ضروری ہے۔ جامعہ عثمانیہ کی گود سے جلاوطن کیے ہوئے اِس شخص نے اپنی محبت کی باہیں ہر اس شخص کے لیے پھیلا دیں جو اُس کی طرح دلیس نکالا لے کر دہلی آتا تھا۔ خواہ اِن افراد میں قاضی سلیم الدین رحمت علی ایم۔ پی ہوں، ڈی۔ انجیا، شیو شنکر اور اُن کے ایسے بااثر سیاستداں ہوں یا میر حسن الدین اور نریندر لوتھر ایسے آئی۔ اے ایس افسران۔ عثمانیہ کا یہ رشتہ اردو کا رشتہ ہے اور اردو کا رشتہ صرف حیدرآباد سے نہیں پورے برصغیر سے ہے۔ اس لیے اردو کا ہر ادیب، ہر شاعر، ہر دوست، ہر پرستار مجتبیٰ کے انتہائی وسیع دامنِ دوستی میں سمٹ آتا ہے۔ اُن کا "آدمی نامہ" پڑھئے، نظیر اکبرآبادی کے "آدمی نامے" کا ہر آدمی اس کے صفحات پر ہنستا بولتا، شرماتا لجاتا، عرضِ مدعا کرتا اور گریزاں، خاموش اور گویا نظر آئے گا۔ یہ وہی تہذیب ہے جس کے نشاۃ ثانیہ پر تقسیم ہند اور سقوطِ حیدرآباد نے حملہ کیا تھا۔ لیکن یہ تہذیب اپنی پوری دلنگارنگی کے ساتھ مجتبیٰ حسین کے خاکوں اور انشائیوں میں آج بھی زندہ ہے۔ رشید احمد صدیقی کی شناخت علی گڑھ سے ہے۔ اور وہ دُنیا کو مسلم یونیورسٹی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ پطرس یا مشتاق احمد یوسفی کی دیدگاہ کوئی خاص شہر نہیں۔ پھر بھی پطرس کا وسیلۂ شناخت لاہور اور زندہ دلانِ پنجاب ہیں۔ یوسفی نے دنیا کو بینک کی کرسی اور کھڑکی سے دیکھا۔ بقول اقبال بینک کی عمارتیں ہمارے دورِ سرمایہ داری کے معبد و کلیسا ہیں۔ گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات۔ یوسفی کی خود نوشت جس کا نام ہی "زرگزشت" ہے بینک کی ملازمت کی آپ بیتی ہے۔ ابن انشا کی دیدگاہ کراچی ہے لیکن وہ ابن بطوطہ کے تعاقب میں چین و ماچین کا بھی سفر کرتے ہیں اور اُس سے بڑھ کر دیارِ مغرب کی شاشار گاہوں سے بھی نظیر اکبرآبادی کے کھلنڈرے انداز میں گزرتے ہیں۔ بٹک دیکھ لیا، جی شاد کیا اور چل نکلے۔ عظیم بیگ چغتائی کے یہاں راجستھان کی مسلم اور دیسی معاشرت غالب ہے۔ محمد خالد اختر کی آماجگاہ پنجاب اور شمالی پاکستان ہے۔ شوکت تھانوی پاکستان میں رہ کر بھی لکھنؤ کی دیدگاہ سے ہی دُنیا کی سیر کرتے رہے۔ فرحت اللہ بیگ نے پوری زندگی ریاستِ حیدرآباد کی ملازمت میں بسر کی لیکن اُن کے قلم کی ہتھیلی پر دہلی کا ہی شناس نامہ رکھا رہا۔ تخلص بھوپالی اپنے نام کی مناسبت سے بھوپال کی بول چال اور معاشرت کے نمائندے تھے۔ مجتبیٰ حسین کی ادبی زندگی کی ابتداء حیدرآباد سے ہوئی وہ سالہا سال سے دہلی کی ملازمت کرنے کے باوجود ہر لمحہ حیدرآباد ہی میں گزارتے ہیں۔ اُن کی زبان کا تانا بانا، اُن کا لہجہ، اُن کی حسِ مزاح، ان کے موضوعات سب حیدرآباد کی تہذیب کے زائیدہ و پروردہ ہیں۔

مجتبیٰ نے رشید احمد صدیقی کی طرح کہیں یہ نہیں لکھا کہ جو بھی اچھا شخص ملتا ہے اور اس کے متعلق یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ علی گڑھ میں نہیں رہا تو افسوس ہوتا ہے کہ ایک کمی رہ گئی۔ لیکن مجتبیٰ کے مضامین کو بین السطور میں پڑھا جائے تو منکشف ہوگا کہ جس بات کا سارے فسانے میں ذکر نہیں وہ یہی ہے کہ اگر کوئی حیدرآباد کی تہذیب میں رچا بسا نہیں، یا اُس نے کم از کم ایک دو بار حیدرآباد کی زیارت نہیں کی تو اس میں خاصی کمی رہ گئی۔ رشید احمد صدیقی کے یہاں ایک طرح کی عصبیت کا احساس ہوتا ہے۔ مجتبیٰ کے یہاں یہ تعصب نظر نہیں آتا اس لیے کہ انھوں نے دہلی، بمبئی، علیگڑھ، پنجاب اور نہ جانے کن کن شہروں کے اُردو ادیبوں، مولفوں اور شاعروں پر طبع آزمائی کی ہے۔ رشید صاحب کے یہاں کسی غیر علیگ یا علی گڑھ سے ناوابستہ کا سراغ لگانا مشکل ہے۔ اصغر اور جگر کو بھی انھوں نے علی گڑھ [illegible]

وساطت سے ہی جاتا ہے حتیٰ کہ اقبال کو بھی وہ علی گڑھ کی اسلامی فکر و تہذیب کی روایات کے تناظر ہی میں دیکھتے ہیں۔ اگر مجتبیٰ کے انشائیوں، خاکوں اور سفرناموں کو بہ نظر غائر پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ بھی ہر شخص، ہر واقعے اور ہر ادبی حادثے کو حیدرآباد کی اردو تہذیب کی عینک سے دیکھتے اور اسی سرزمین سے دوسروں کو دکھاتے ہیں۔ جاپان کے سفر کی روداد میں گو حیدرآباد براہ راست موضوع نہیں بنا تب بھی ایک حیدرآبادی بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ اگر وہ دنیا کے کسی خطے کی سیر کو نکلے تو اسی نظر سے اُسے دیکھے گا جس نظر سے مجتبیٰ نے جاپان کو دیکھا اور بیان کیا۔ مجتبیٰ کی تحریروں میں حیدرآباد رچا بسا ہے لیکن اُسی طرح جیسے پھول کی پتی میں خوشبو اور رنگ رچ بسے ہوتے ہیں! انہیں آپ قریب سے سونگھ کر ہی محسوس کر سکتے اور لذت لے سکتے ہیں۔ ان کی حیدرآبادیت رشید صاحب کی علیگڑھیت یا اودھ پنچ کے طنز نگاروں کی لکھنویت کی طرح جارحانہ نہیں جو دوسروں پر زور شور سے حملہ آور ہو یہ شاید خود حیدرآباد اور شمالی ہند کے مزاج کا فرق ہے۔ حیدرآبادیوں کو برسوں علی گڑھ میں بہاریوں کے بعد دوسرے نمبر پر سادہ لوح سمجھا جاتا رہا ہے۔ بہاری اپنی جارحانہ مقامی عصبیت کی بنا پر ہدف طنز بنتے رہے اور حیدرآبادی اپنے ضرورت سے زیادہ غیر جارحانہ، مرنجان مرنج، صلح کل انداز معاشرت کی وجہ سے ضعیف الارادہ و ضعیف الفہم سمجھے گئے۔ حیدرآباد کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شمال سے آنے والوں کو ریاست کے زمانہ میں غیر ملکی تو سمجھتا تھا لیکن اُن کو اپنا تا بھی رہا۔ شمالی ہند کے کتنے ہی خانوادے صد در صد حیدرآبادی بن گئے۔ عماد الملک اور سید علی بلگرامی کا خاندان، امیر مینائی اور جلیل مانکپوری، نظم طباطبائی اور آشفتہ لکھنوی وغیرہ کے خاندان کے افراد کو آج حیدرآبادی ہی سمجھا جاتا ہے۔ اور تو اور نریندر لوتھر جو بسلسلۂ ملازمت حیدرآباد گئے، وہاں کی تہذیب اور مزاج میں ایسے ڈھلے کہ انہیں کوئی سے کرہ حیدرآبادی بھی غیر حیدرآبادی نہیں کہہ سکتا۔ ایسی کتنی ہی مثالیں ہیں۔ علی گڑھ بھی برصغیر کے ہر علاقے سے آنے والے کو اپنے سانچے میں ڈھال لیتا ہے لیکن باہر سے آنے والے پرانے اور نئے طلبا سے پوچھ لیجئے کہ علیگڑھ کس طرح اُن پر داخلے کے ساتھ ہی جارحانہ حملہ آور ہوتا ہے۔ حیدرآباد ابتداء میں باہر سے آنے والوں کے ساتھ ذرا سرد و نرم رویہ اختیار کرتا ہے لیکن دل میں انہیں کچھ بھی سمجھے ایرانیوں کی طرح زبان کے تکلفات و تصنعات و تشریفات کے ساتھ ہی اُن کو برتتا ہے۔ یہ عمل شدید سے شدید تعصب کی دھار کو کند کر دیتا ہے۔ حیدرآباد اپنا خود ہی مذاق اڑاتا بھی جانتا ہے۔ حیدرآبادی لہجے، محاورے اور تلفظ کا مذاق اڑاتے ہوئے آپ دہلی لکھنؤ اور علی گڑھ والوں کو کبھی کبھی سُنیں گے لیکن حیدرآباد کے ادیبوں اور شاعروں کی محفل میں جائیے تو وہ خود آپ کو اپنی زبان، لہجے اور تلفظ پر بے محابا ہنستے نظر آئیں گے۔ مخدوم صد در صد حیدرآبادی تھے اور جن پر مجتبیٰ نے خاکہ لکھتے ہوئے انہیں حیدرآباد شہر کے مترادف قرار دیا ہے:

> "مخدوم کے بارے میں اب سوچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ مخدوم ایک انسان نہیں تھے۔ جیتا جاگتا سانس لیتا ہوا شہر تھے۔ اس شہر کی ہم نے برسوں سیر کی ہم سب اسی شہر میں آباد تھے۔ مخدوم کے انتقال کے بعد پہلی بار احساس ہوا کہ "غریب الوطنی" کس کو کہتے ہیں۔ اس شہر میں کتنی سڑکیں تھیں کتنی گلیاں تھیں، کتنے موڑ تھے اور یہ سب راستے انسانیت اور سچائی کی طرف جاتے تھے۔"

اسی سچائی کے راستوں کے رہ نورد نے اپنے دہلی سے حیدرآباد کی واپسی کے ایک سفر کی روداد مجھے اور کچھ دوستوں کو سنائی، وہ دہلی سے ٹرین میں سوار ہوئے تو ریزرویشن نہ تھا (مخدوم اکثر بے ریزرویشن سفر کرتے تھے)۔

اس لیے کہ وہ عوام کے آدمی تھے اور عوام کی طرح وقت بے وقت بستر باندھ کر ٹرین پر سوار ہو جاتے تھے۔ خود میرے ساتھ انھوں نے حیدرآباد سے سری نگر تک ایک ایسا ہی بے ریزرویشن سفر کیا ہے۔ مخدوم نے زندگی میں کبھی اپنے لیے کوئی ریزرویشن نہیں مانگا اور اُن کی موت کا سفر بھی اچانک ان کے ہر سفر کی طرح بے ریزرویشن ہی ہوا۔ ٹرین میں اتنی بھیڑ تھی کہ وہ اُوپر کی سامان والی برتھ پر چڑھ گئے تو حیدرآباد تک ۳۶ گھنٹوں کے سفر میں انہیں نیچے اُترنے کے لیے پاؤں دھرنے کی جگہ بھی نہ ملی۔ مسافروں کی زبان اور لہجے اور رویے سے ہی اندازہ لگاتے رہے کہ ٹرین کس علاقے سے گزر رہی ہے۔ کرخنداری اور ہریانوی، مغربی یو۔پی کے لہجے نے انہیں بتایا کہ ٹرین ابھی اسی نواح میں ہے۔ ذرا تکلف آمیز شستہ لہجے میں باتیں سنیں تو سمجھے کہ لکھنؤ اور اودھ کے مسافر سوار ہو رہے ہیں اور آگے بڑھے تو مدھیہ پردیش اور پھر مہاراشٹر کے لہجوں اور زبان سے اِن علاقوں کو پہچانا۔ آنکھ لگ گئی اچانک تلنگانہ کی ثقیل اور کھڑی آوازوں نے نیند سے جگا دیا۔ انگڑائی لے کر اُٹھ بیٹھے کہ آگیا "اپنا وطنِ مالوف"۔

مجتبیٰ نے لکھا ہے:

"مخدوم کو حیدرآباد سے بے پناہ پیار تھا۔ جسے وہ ہمیشہ "وطنِ مالوف" کہا کرتے تھے حیدرآباد مخدوم کے اندر تھا اور مخدوم حیدرآباد کے اندر۔ حیدرآباد کی گلی گلی میں اُن کے چرچے —— حیدرآبادیوں نے انہیں لُوٹ کر چاہا بھی۔"

حیدرآباد والوں کی خود پر ہنس سکنے کی اسی صلاحیت نے ۱۹۶۱ء کے آس پاس زندہ دلانِ حیدرآباد کو جنم دیا۔ اس انجمن نے سارے ہندوستان میں طنز و مزاح کے ادب کو ایک تحریک کی طرح فروغ دیا اور عام کیا۔ زندہ دلانِ حیدرآباد نے فائن آرٹس اکیڈیمی کے بطن سے جنم لیا۔ اِس اکیڈیمی کے فن کاروں میں اقبال قریشی، حمایت اللہ، ممتاز، حکیم راگی، وٹھل، اور مصطفےٰ علی بیگ نمایاں تھے۔ اکیڈیمی کے پروگراموں میں مزاحیہ خاکے، لطیفے، مکالمے اور چھوٹے چھوٹے ڈرامے بھی پیش کئے جاتے تھے۔ اِس اکیڈیمی کے ادبی مشیر عزیز قیسی تھے۔ انہی فنکاروں نے مجتمع ہو کر زندہ دلانِ حیدرآباد کی پہلی کانفرنس منعقد کی جس میں بیرونِ حیدرآباد کے کئی ادیبوں نے شرکت کی۔ مخدوم محی الدین نے اس کا افتتاح کیا۔ مخدوم نے اپنے ادبی کیریر کا آغاز ڈرامہ نگار اور ایکٹر کی حیثیت سے کیا تھا۔ اُن کی شاعری ایک مزاحیہ نظم "پیلا دوشالہ" سے شروع ہوئی تھی۔ مخدوم کے چھٹے اور ساتویں دہوں میں لکھے ہوئے مضامین میں بہت ہی اعلیٰ درجے کا مزاح انتہائی شگفتہ نثر میں زیریں لہر کی طرح کارفرما ہے۔ یہ کانفرنس حیدرآباد کا سالانہ مقامی تہوار بن کر ہر سال منعقد ہونے لگی۔ اسی کے ساتھ مزاحیہ مشاعرے کی بنیاد بھی پڑی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پہلے مزاحیہ مشاعرے کے موقع پر میں حیدرآباد گیا ہوا تھا۔ مجھے اور مغنی تبسم کو یہ مشاعرہ سننے کے دعوت نامے ملے۔ گھر میں ذکر آیا۔ میری بیوی جنھوں نے کبھی کسی سنجیدہ مشاعرے میں جانا قبول نہیں کیا تھا، بیگم مغنی تبسم کے ساتھ خوشی خوشی اس مشاعرے میں ہمارے دعوت ناموں پر شریک ہوئیں۔ آدھی رات کے بعد یہ خواتین واپس ہوئیں تو سراپا خندہ و تبسم تھیں شاعری کے معیار سے نہ انہیں مطلب تھا اور نہ ہزاروں سامعین کو۔ ہم اعلیٰ اور اچھی شاعری کے معیار کی بات کر کے خود ہی شرمندہ ہوئے۔ بہت بعد میں مجھے یہ احساس ہوا کہ ہماری روتی بسورتی دنیا میں جہاں عموماً لوگ کسلمندیت کی لوریت اور چھوٹے چھوٹے مسائل کے جال میں گرفتار رہتے ہیں، ان کے لیے جی کھول کر ہنس لینا ایک

ایسی نعمتِ غیر مترقبہ ہے کہ جو بھی انھیں یہ نعمت فراہم کر سکے وہ اُس کے دیوانے ہو جاتے ہیں۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کے جلسوں، مشاعروں اور کانفرنسوں نے حیدرآباد کے بجھے ہوئے دلوں میں روشنی کی کرن جگمگائی اور سیاست و معیشت کے بوجھ تلے دبے ہوئے احساس کو شگفتگی سے روشناس کیا۔ میرے خیال میں یہ خود بڑا کارِ ثواب ہے۔ آہستہ آہستہ اس نئی ادبی اور ثقافتی تحریک نے ایک ادبی معیار اور وقار بھی حاصل کر لیا۔ اس کے کرتا دھرتا وہ ادیب بھی تھے جنھیں فائن آرٹس اکیڈیمی کو چلانے کا کام یا تجربہ تھا اور وہ بھی جو برسوں پہلے سے ادبی معیار کی طنز و مزاح نگاری کرتے رہے تھے۔ لیکن انھیں عوام سے اور ہندوستانی کے ادبی حلقوں سے پوری طرح متعارف اسی انجمن نے کرایا۔ بھارت چند کھنہ، رشید قریشی، نریندر لوتھر، یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین، حمایت اللہ، مسیح انجم، اور کتنے ہی نئے مزاح نگار اسی تحریک کے دامن میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے۔ یہی نہیں بہت سے سنجیدہ ادیبوں اور افسانہ نگاروں نے بھی زندہ دلانِ حیدرآباد کے توسط سے ہلکا پھلکا ادب لکھنے کے تجربے کیے۔ زینت ساجدہ، جیلانی بانو، رشید موسوی، عوض سعید، آمنہ ابوالحسن اور ایسے کتنے ادیبوں کو جو کبھی کبھی ریڈیو کے لیے انشائیہ لکھ لیتے تھے، اس انجمن نے باضابطہ مزاح نگار بنا دیا۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کی تحریک کو ہندوستان گیر بنانے اور ہندوستان کے بہترین مزاح نگار اور طنز نویس شاعروں ادیبوں کو اس پلیٹ فارم پر لانے میں اگر کسی ایک شخص نے سب سے نمایاں رول ادا کیا ہے تو وہ مجتبیٰ حسین تھے۔

مجتبیٰ کا "آدمی نامہ" پڑھیے تو ایک طرح سے ہندوستان کے مختلف ادیبوں کی زندہ دلانِ حیدرآباد کے جلسوں میں شرکت کی تاریخ سامنے آ جائے گی۔ کنہیا لال کپور باوجود بار بار بلائے جانے کے حیدرآباد نہ آ سکے۔ لیکن انہیں مزاح کی اس تحریک سے مجتبیٰ نے مربوط کر لیا۔ راجندر سنگھ بیدی سے وہ پہلی بار اسی انجمن کے واسطے سے ملے۔ کرشن چندر سے بھی اُن کا ربط اسی واسطے سے ہوا۔ فکر تونسوی، رضا نقوی واہی، اور کئی دوسرے ادیبوں کے ورودِ حیدرآباد کی روداد مجتبیٰ کے مضامین میں بکھری ہوئی مل جائے گی۔ فہرست بہت طویل ہے چند نام جو یاد آ رہے ہیں بلا ترتیب پیش کیے جاتے ہیں۔ دلاور فگار، تخلص بھوپالی، احمد جمال پاشا، شفیقہ فرحت، سرور جمال، ناظر خیامی، باقر حسن لکھنوی، فکر تونسوی، خواجہ عبدالغفور، ان سب نے زندہ دلانِ حیدرآباد کے جلسوں اور مشاعروں میں شرکت کی۔ ان میں سے جو مشاہیر ہیں وہ مجتبیٰ کے توسط سے ہی بلائے اور لائے گئے۔ آج زندہ دلانِ حیدرآباد نے اپنے شہر میں جو حیثیت ایک ادبی اور ثقافتی ادارے کی سی حاصل کر لی ہے اس کے پیچھے مجتبیٰ کی ہمہ گیر دوستیاں، تعلقات اور روابط کارفرما ہیں۔

مجتبیٰ سے پہلے بھی حیدرآباد میں مزاحیہ ادب کے نمائندے تھے لیکن بیشتر کی حیثیت اور شہرت مقامی تھی۔ پورے ملک میں جس شخص نے زندہ دلانِ حیدرآباد کے وجود میں آنے سے قبل ہندوستان گیر ادبی شہرت اور اہمیت حاصل کر لی تھی وہ یوسف ناظم تھے۔ یوسف ناظم اصل میں مہاراشٹر سے تعلق رکھتے ہیں۔ ریاست کی لسانی تقسیم کے بعد بھی وہ مہاراشٹر اسٹیٹ ہی میں رہے۔ اُن کے یہاں بھی مزاح کا لب و لہجہ حیدرآبادی ہے مگر کلاسکی شعر و ادب خصوصاً غالب سے استفادہ کر کے اُنھوں نے اپنی تحریروں میں وہ فضا پیدا کی ہے جو انہیں قیدِ مقام سے آزاد کر دیتی ہے۔ بمبئی میں اُن کے طویل قیام نے بھی انھیں اور اُن کی تحریروں کو کاسموپولیٹن بنا دیا۔ دوسرا فرق یوسف ناظم اور مجتبیٰ میں یہ ہے جہاں مجتبیٰ واقعات کے بیان میں جزئیات نگاری اور مبو ا تبع

کی ڈرامائیت سے کام لیتے ہیں وہاں یوسف ناظم چھوٹے چھوٹے شگفتہ شاعرانہ فقروں کی ایمائیت و اشاریت سے اپنا کام چلاتے ہیں۔ یوسف ناظم نثری مزاح میں غزل کے آدمی ہیں جب کہ مجتبیٰ نظم کے نمائندے ہیں۔ اشاریت اور ایمائیت کی اپیل جہاں وسیع ہوتی ہے وہیں وہ ادب کو ایک طرح کی تجریدیت ABSTRACTION کی سطح پر بھی اٹھالے جاتی ہے۔ مجتبیٰ کا فن تجریدی نہیں حقیقت پسندانہ اور ہے۔ اسی لیے ان کے یہاں مقامیت کا عنصر دوسرے تمام حیدرآبادی مزاح نگاروں سے زیادہ نمایاں ہے۔ مجتبیٰ کا ذہن ہر وقت حیدرآباد میں رہتا ہے۔ "آدمی نامہ" ہی میں آپ غیر حیدرآبادی ادیبوں اور شاعروں کے خاکے پڑھ لیجئے آپ محسوس کریں گے کہ ہر شخص کو مجتبیٰ نے حیدرآباد ہی کے توسط سے دیکھا، جانا اور بیان کیا ہے۔ کنھیا لال کپور ہوں یا راجندر سنگھ بیدی، اعجاز صدیقی یا کرشن چندر، سجاد ظہیر ہوں یا عمیق حنفی، فکر تونسوی یا رضا نقوی واہی، باقر ہوں یا مخمور سعیدی، کسی نہ کسی عنوان سے ہر خاکے میں برسرِ سطور یا بین السطور آپ کی ملاقات حیدرآبادی سے ہوگی۔ مخدوم، جیسا کہ اوپر کے اقتباس سے ظاہر ہے، بذاتِ خود حیدرآبادی تھے۔ ان کا خاکہ دراصل حیدرآباد ہی کا خاکہ ہے۔ خواجہ عبدالغفور اور حسن الدین احمد، اصلاً حیدرآبادی تھے اور ہیں۔ حسن الدین احمد کا خاکہ فیوڈل حیدرآباد کی ریاستی تہذیب وروایت، شائستگی، تکلف اور مروت کا بیان ہے جس میں مجتبیٰ نے اس تہذیب کی مروت اور نفاست پر ہنستے ہوئے بھی اس کے مثبت اور قابلِ محبت واحترام پہلو کو اجاگر کیا ہے۔ اسی کو میں نے غیر جارحانہ مقامی عصبیت کا نام دیا ہے۔ نریندر لوتھر اتنے برس حیدرآباد میں رہے کہ اُن کی شخصیت بھی حیدرآباد ہی کے سانچے میں ڈھل گئی۔ مجتبیٰ نے اُن کے اسی پہلو کو نمایاں کیا ہے۔ یہ حوالے تو میں نے سرسری طور پر مجتبیٰ کے ایک ہی مجموعے "آدمی نامہ" سے دیئے ہیں لیکن اگر بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو اُن کے ہر انشائیے، ہر خاکے، ہر سفرنامے میں حیدرآباد رچا بسا نظر آئے گا۔

مجتبیٰ کے روابط عامہ بھی بہت وسیع ہیں اور حیدرآباد میں ان کا ہیڈ کوارٹر روزنامہ "سیاست" کا دفتر ہے جس کے جوائنٹ ایڈیٹر مجتبیٰ اور جلیس کے بڑے بھائی محبوب حسین جگر ہیں۔ جگر صاحب صحافی ہیں لیکن وہ اور ان کے دوست اور شریک کار عابد علی خاں "سیاست" کے مالک و مدیر، حیدرآباد کے تمام ادیبوں، شاعروں کو جلیس اور مجتبیٰ کے رشتے سے اپنا چھوٹا بھائی سمجھتے ہیں۔ یہی نہیں حیدرآباد آنے والا ہر ادیب وشاعر اُن کا اپنا مہمان بھی ہوتا ہے۔ آپ اگر عابد علی خاں اور جگر کو جاننا اور سمجھنا چاہیں تو مجتبیٰ سے مل لیجئے۔ سیاست کی حیثیت بھی حیدرآباد میں ایک ثقافتی ادارے کی سی ہے۔ برسوں مجتبیٰ سیاست کا طنزیہ کالم "شیشہ وتیشہ" لکھتے رہے شاید اب بھی کبھی کبھی لکھتے ہیں۔ مقصود اِس تفصیل کا یہ ہے کہ حیدرآباد کے بیشتر اداروں سے مجتبیٰ کی دسترس اور رسائی ہے۔ یہی نہیں اگر آپ کو دہلی میں آندھرا پردیش گیسٹ ہاؤس جانا ہو تو مجتبیٰ کا تعارفی فون یا خط آپ کا بہترین معاون ثابت ہوگا۔ آندھرا پردیش گیسٹ ہاؤس کا افسر کوئی بھی ہو، اور یہ افسر بدلتے رہتے ہیں لیکن مجتبیٰ کی حیثیت دہلی میں حیدرآباد کے مستقل تہذیبی سفیر کی سی ہے۔ یہاں ایک جملۂ معترضہ لکھ دوں۔ حیدرآباد میں جہاں اور بہت سی بدعتیں رائج ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ ہر ادبی جلسے میں کئی مہمان خصوصی ہوتے ہیں۔ خیر یہ تو وہاں کے ادیبوں، شاعروں کی نظری یا معاشی مجبوری یا ادبی محتاجی کی دلیل ہے جس پر کچھ لکھنا حیدرآباد کے ادبی ماحول کی دکھتی رگوں کو چھیڑنا ہے۔

ایک صاحب جو خود کو تہذیبی سفیر کہلاتے ہیں، کم از کم ستر اسّی فیصد ادبی تقریبات کے مہمان خصوصی ہوتے ہیں۔ میری یا ان کی شومئی قسمت کہ ایک ایسے جلسے میں جہاں وہ خصوصی مسند پر براجمان تھے، مجھے بھی بلا اطلاع اور وارننگ کے تقریر کرنے کی زحمت دی گئی۔ میں نے تہذیبی سفیر کے معنی و مطالب سمجھنے کی کوشش کی خدا جانے کتنے سامعین میری بات کا مطلب سمجھے لیکن تہذیبی سفیر مزید پہلو بدلتے رہے۔ مجتبیٰ نے حیدرآباد کی تہذیبی سفارت زور، زر اور زبردستی سے حاصل نہیں کی۔ دلی میں اُن کا وجود اور سرگرمیاں اِس کی شاہد ہیں اور ہندو پاک کے موجودہ بہترین مزاحیہ و طنزیہ ادب میں مجتبیٰ کی تحریریں اس "تہذیبی سفارت کے صداقت نامے" ہیں۔ اگر مجھ سے یہ پوچھا جائے کہ ہندوستان کے مزاحیہ ادب کی بھرپور نمائندگی کون شہر کرتا ہے تو بلا جھجک حیدرآباد کا نام لوں گا اور اگر یہ دریافت کیا جائے کہ حیدرآباد کی نمائندگی کون کرتا ہے تو میں بے دریغ ایک ہی نام لے سکتا ہوں اور وہ ہے مجتبیٰ حسین۔

اِسی لیے میں نے اِس مضمون کا عنوان رکھا ہے "مجتبیٰ حسین کا شناس نامہ: حیدرآباد" مجتبیٰ اس وقت برصغیر کے معدودے چند بہترین مزاح نگاروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ جو خصوصیت انھیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کی حیدرآبادیت ہے۔ ہر اچھا ادب آفاقی ہوتے ہوئے مقامی بھی ہوتا ہے مقامیت اُس کی ہمہ گیر اپیل کو کم نہیں کرتی بلکہ دیدگاہ کا کام کرتی ہے۔ مجتبیٰ دیدگاہ حیدرآباد ہے اور ان کی تحریریں حیدرآبادی تہذیب، زبان اور لہجے کی سفیر بن ہیں! □□

میں نے پہلا خاکہ ۱۹۶۹ء میں اپنے بزرگ دوست حکیم یوسف حسین خاں کا لکھا تھا۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے، خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ مرحوم کئی خوبیوں کے مالک تھے۔ کئی خوبیوں کی ایک خوبی ان میں یہ تھی کہ اپنے میں کم اور دوسروں میں زیادہ خوبیاں "تلاش کرتے تھے۔ جب ان کی کتاب "خواب زلیخا" کی تقریب رونمائی کا مرحلہ آیا تو نہ جانے ان کے جی میں کیا آئی کہ مجھ سے اپنا خاکہ لکھنے کی فرمائش کر بیٹھے۔ اس وقت تک میں نے مزاحیہ مضامین ہی لکھے تھے۔ کسی کا خاکہ نہیں لکھا تھا، بہت عذر پیش کئے۔ پہلے تو اپنی کم علمی اور کم مائیگی کا حوالہ دیا۔ یہ عذر قابل قبول نہ ہوا تو عمر کے اُس فرق کا حوالہ دیا جو میرے اور اُن کے بیچ حائل تھا۔ اس پر بھی وہ مُصر رہے کہ مجھے خاکہ لکھنا ہی ہوگا۔ یہ پہلا خاکہ تھا جسے سامعین اور صاحب خاکہ دونوں نے پسند فرمایا تھا۔"

مجتبیٰ حسین ــــ (آدمی نامہ)

پروفیسر گوپی چند نارنگ

★

مجتبیٰ حسین، فن کے چند پہلو

۱۹ر نومبر ۱۹۸۳ء کو غالب اکیڈیمی، دہلی میں مُجتبیٰ حسین کے سفرنامہ "جاپان چلو جاپان چلو" کی رسمِ اجرا کی تقریب کے موقع پر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے یہ تقریر کی تھی۔!

صدرِ جلسہ خشونت سنگھ صاحب، مہمانِ خصوصی پی شیوشنکر صاحب، مجتبیٰ حسین صاحب، ساتھیو اور دوستو! وقت خاصا ہوگیا ہے اور میں تفصیلی گفتگو سے اگرچہ اس کا تقاضہ تھا لیکن گریز کروں گا اس لیے کہ ہمیں ابھی خشونت سنگھ صاحب کے خیالات سے استفادہ کرنا ہے۔ شام کا وقت ہے خشونت سنگھ صاحب معمولات کے آدمی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہاں سے ......

مجھے مسرت ہے کہ آج کی تقریب سہ آتشہ ہے ہندی کے ادیبوں نے بھی اظہار کیا ہے مجتبیٰ حسین کے بارے میں اُردو کے ادیبوں نے تو اظہارِ خیال کیا ہی ہے خشونت سنگھ غالباً انگریزی میں اظہارِ خیال کریں گے اور انگریزی کے دو اور مضامین بھی سووینئر میں شریک ہیں یعنی بلراج ورما اور علی باقر کے۔ تو اتنے احباب کے اظہارِ خیال کے بعد یعنی جو تقریریں ہوچکی ہیں اور جو بہت اچھے مضمون یہاں پڑھے گئے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی، سید رحمت علی، عمیق حنفی اور شیوشنکر صاحب نے دوسرے احباب نے جو کچھ فرمایا ہے تو بہت کم گنجائش رہ جاتی ہے مجتبیٰ حسین کے بارے میں کچھ کہنے کی۔

مجتبیٰ حسین میرے دوست ہیں جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں اور آپ میں سے بہتوں کے دوست ہیں۔ یہ غلط فہمی وہ اکثر پیدا کر دیا کرتے ہیں۔ بعض لوگ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ وہ ان کے خاص دوست ہیں۔ ان کے خاص دوستوں کا حلقہ بھی بہت وسیع ہے لیکن ایک معاملہ اور بھی ہے نہ صرف یہ کہ وہ میرے خاص دوست ہیں بلکہ میرے پڑوسی بھی ہیں۔ مجتبیٰ حسین صاحب کے بارے میں میں جب جب سوچتا ہوں ایک بات کی طرف میرا خیال بار بار جاتا ہے۔ سب سے پہلی بار ان سے ملاقات ہوئی تھی تکر تونسوی صاحب کے یہاں برسوں پہلے۔ غالباً ان کے دوسرے مجموعے کی رسمِ اجراء تھی۔ عمیق حنفی نے اس موقع پر ایک مضمون پڑھا تھا۔ مجھے اس وقت بھی خیال آیا تھا کہ اکثر ہماری تاریخ میں یلغار شمال سے جنوب کی طرف ہوتی رہی ہے۔ کئی بار شمال نے جنوب کو زیر کیا ہے لیکن ہماری ادبی تاریخ میں دو سانحے ایسے ہیں کہ جنوب نے شمال پر دھاوا بولا اور شمال کو زیر کر لیا۔ ایک تو زمانہ اورنگ زیب کے فوراً بعد کا ہے آخری مغل تاجداروں کا جب ولی کا دیوان وہاں پہنچا تھا اور جہاں ولی کی غزلوں نے ایک نئی گونج پیدا کر دی۔ اورنگ زیب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے زندگی

کا بیشتر حصہ خانہ دیس میں دکن میں خیموں میں گزارا تھا پھر جو شمال اور جنوب میں رابطہ پیدا ہوا اور راہیں استوار ہوئیں تو اس کے بعد سے (اگرچہ لسانی رابطے تو پہلے بھی تھے) لیکن شعری رابطہ استوار ہوا تو دکن نے دہلی کے دل کو جیت لیا۔ دوسری بار ہمارے زمانے میں یہ کام مجتبیٰ حسین نے سرانجام دیا ہے۔ ادھر دہلی والوں کی ادبی زندگی میں ایسی کچھ کمی تھی کہ جب مجتبیٰ حسین یہاں آئے تو انھوں نے بہت جلد دلوں کو تسخیر کرنا شروع کیا اور ہماری مزاح کی محفلوں میں ایک نئی معنویت پیدا ہوگئی۔ یہ نہیں کہ یہاں مزاح کا چرچا نہیں تھا۔ تھا۔ فکر تونسوی لکھ رہے تھے دوسرے احباب بھی ہیں کبھی کبھی مزاح کے شعراء بھی آجاتے ہیں، مشاعروں میں شعری نشستوں میں لیکن یہ بات نہیں تھی۔ ہمارے یہاں ہر طرح کا ادب تخلیق ہو رہا تھا۔ غزل تھی، نظم تھی، افسانہ تھا، ڈرامہ تھا، ناول تھا لیکن مزاح نگاری جس کو صحیح معنوں میں مزاح نگاری کہا جاتا ہے، اسے دہلی کی زندہ ادبی روایت کا حصہ مجتبیٰ حسین نے بنایا اور یہ معمولی کارنامہ نہیں ہے چنانچہ اس طرح جنوب اور شمال کے، دکن اور دہلی کے رشتے کو ایک بار پھر انھوں نے جوڑ دیا۔ ابھی شمس الرحمن فاروقی صاحب نے فرمایا کہ بعض لوگ مزاح نگار کو ادب میں دوسرے درجے کا مسافر سمجھتے ہیں اگرچہ ادب میں درجہ بندی سے مفر نہیں لیکن یہ پوری سچائی بھی نہیں کیونکہ اوّل تو پھر سب کو شاعری کرنی چاہیئے، دوسرے، تیسرے یا چوتھے درجے کے شعراء کو اول درجے کے نثر نگاروں پر ترجیح دینی لازم آئے گی۔ حقیقت کا ایک رُخ یہ ہے کہ صنف چھوٹی یا بڑی نہیں ہوتی، فنکار چھوٹا یا بڑا ہوتا ہے یعنی جو بھی ہو جس میں کمال اچھا ہے پھر آپ کسی درجے میں سفر کرتے ہوں مزاح کو کہیں رکھیں لیکن ادب کا کوئی تصوّر طنز و مزاح کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتا۔ آخر کیا وجہ ہے ہر ادب میں طنزیہ پیرائے کی جس میں لغوی معنی کی تقلیب ہوتی ہے، نیز شگفتہ تحریروں کی ہنسنے ہنسانے کی ظریفانہ تحریروں کی بڑی گنجائش ہوتی ہے کسی بھی زبان کا ادب اگر وہ صحت مند معاشرے سے تعلق رکھتا ہے تو اس میں مزاحیہ عنصر ضرور ہوگا۔ کسی بھی ادب کا تصوّر آپ اس کے مزاحیہ حصّے کے بغیر نہیں کر سکتے۔ یاد رہے طنز و مزاح ادب سے جب جب غائب ہوا ہے معاشرہ بیمار ہوگیا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو فرخ سیر، جعفر زٹلی کو قتل نہ کروا دیتا۔ ان دنوں ہم اردو میں آفات ارضی و سماوی کے جس دور سے گزر رہے ہیں۔ سیاسی اور معاشی طور پر تو ہنسنے ہنسانے کی بڑی ضرورت ہے۔ ادھر یہ صلاحیت معاشرے میں کچھ کم ہوگئی ہے۔ یہ نہیں کہ اردو میں روایت نہیں تھی۔ شاعری میں خاصی روایت رہی ہے لیکن یہ ذاتی حملوں کی روایت تھی۔ حریف کو نیچا دکھانے کی ہجو نگاری اور پھکڑپن کی۔ نثر میں جو بات پطرس، کنہیا لال کپور، رشید احمد صدیقی نے پیدا کی، اس روایت کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے خصوصاً پطرس کی روایت کو۔ مجتبیٰ حسین کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اس راہ میں قدم بڑھایا ہے۔ وہ ترقی کر رہے ہیں۔ اُن کے فن کے اندر بڑی وسعت ہے اور جتنے حربے، جتنے طریقے جتنی تکنیک ہو سکتی ہیں مزاح پیدا کرنے کی فطری طور پر یہ سب ان کے فن میں موجود ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ برابر لکھ رہے ہیں اور ان کے قلم کی روشنائی خشک نہیں ہوئی۔ مزاح کس طرح پیدا ہوتا ہے یا کس طرح پیدا کیا جاتا ہے؟ میں تو عرض کروں گا کہ مزاح نگار اگر وہ فطری طور پر مزاح کی طرف راغب نہیں ہے اور محض کوشش و کاوش سے بات بناتا ہے تو بہت جلد بے نقاب ہو جاتا ہے اور اپنے سفر میں پیچھے رہ جاتا ہے۔ بہت سی ایسی مثالیں ہیں جن کے نام لینے سے کچھ حاصل نہیں۔

جتنے بھی گُر ہیں اس فن کے مجتبیٰ حسین ان سب سے واقف ہیں اور ان حربوں کو وہ نہایت سہولت سے فطری طور پر برتتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو وہ BORN HUMOURIST ہیں اگرچہ ادب میں پیدائشی کچھ

نہیں ہوتا ہر چیز تربیت دسعی و توجہ سے وجود پاتی ہے۔ طنز و مزاح کی جان تعریض ہے اور یہی حربہ مجتبیٰ حسین کے فن میں مرکزیت رکھتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ خود کو بیوقوف محض سمجھ لیتے ہیں جیسا کہ بعض احباب کا خیال ہے۔ یہ سادہ لوحی نظر کا دھوکا ہے مزاح کی نقاب ہے۔ تعریض کے فن کو جس خوبی سے مجتبیٰ برتتے ہیں وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر اس طرح سے پرتیں کھول کر لفظوں کے پیچھے جھانکنے کی کوشش کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے آرٹ میں اس سے کیا کیا کام لیا جاتا ہے۔ مجتبیٰ حسین مبالغے کو کس طرح سے برتتے ہیں۔ تقابل کو کس طرح برتتے ہیں، غیر متناسب اشیاء یا عوامل کو کس طرح لاتے ہیں (جس کی طرف اشارہ کیا گیا) نیز زبان سے مزاح کس طرح پیدا کرتے ہیں یہ سب دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ہماری شاعری میں تو بالخصوص یہ روایت رہی کہ محض زبان سے مزاح پیدا کیا گیا۔ زبان کا مزاح لفظوں کی مدد سے مضحک پہلوؤں کو ابھارنے کی خصوصیت رشید احمد صدیقی کے یہاں نمایاں ہے۔ مجتبیٰ حسین صورتحال (SITUATION) سے بھی مزاح پیدا کرتے ہیں اور طنز خصوصاً سماجی طنز کی آمیزش بھی کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ مزاح کے لیے ذہانت بہت ضروری ہے اور طنز کے لیے سماجی شعور۔ اپنے معاشرے کی کمیوں کا اس کی کوتاہیوں کا اس کی طاقتوں کا اندازہ ہونا اور احساس نہ ہو تو بات نہیں بنتی۔ ایک دو مثالیں پیش کروں گا، تفصیل کا وقت نہیں۔ دیکھئے تعریض کو وہ کس طرح سے برتتے ہیں۔ کتابوں کا جو شوق جاپان میں ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" جاپان کی آبادی تقریباً ساڑھے گیارہ کروڑ ہے اور سال بھر میں تقریباً ۸۰ کروڑ کتابیں فروخت ہوتی ہیں۔ گویا ہر جاپانی سال بھر میں ساڑھے چھ کتابیں ضرور خریدتا ہے۔ ایک ہم ہیں کہ پڑھنے لکھنے کے معاملے میں شہرت رکھنے کے باوجود پچھلے تین برسوں میں ہم نے کوئی کتاب نہیں خریدی۔ ہاں، ادیب دوستوں کی کتابوں کے اعزازی نسخے ضرور قبول کرتے ہیں اور انھیں پڑھے بغیر ردّی میں بیچ دیتے ہیں۔"

اس طرح جب وہ تقابل کرتے ہیں تو جہاں جہاں جاپان میں انھیں کوئی چیز ایسی معلوم ہوتی ہے جس سے تعجب ہوتا ہے تو فوراً ہندوستانی معاشرے سے اس کا مقابلہ کرتے ہیں اور اس میں سماجی طنز کی ہلکی سی آمیزش سے ان کی ترقی اور اپنے یہاں کی پس ماندگی کے مضحک پہلوؤں کو بے نقاب کرتے جاتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ ایسے موقعوں پر ان کے دل کا درد بھی جھلکتا ہے لیکن اس کے دیکھنے کے لیے نظر چاہیئے۔ جہاں جاپان کی گاڑیوں کا ذکر کیا ہے اور ان کی تعریف کی ہے تو دیکھیے کہ تقابل اور طنز سے کیا لطف پیدا کیا ہے۔ خاص طور سے دیکھئے کہ ایسے موقعوں پر طنز میں الفاظ کے معنی کس طرح بالکل الٹ دیئے جاتے ہیں اور تحریر میں شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے ۔!

" جاپانیوں کو سفر کرنا بالکل نہیں آتا۔ اس معاملے میں یہ لوگ ہم سے بہت پیچھے ہیں۔ صرف آرام دہ ریل گاڑیاں بنانے سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ سفر کرنے کے کچھ آداب بھی ہوتے ہیں جن سے جاپانی بالکل واقف نہیں ہیں۔ ہمیں جاپانی ریل گاڑیوں سے یہ شکایت بھی ہے کہ یہ بہت ٹھیک وقت پر چلتی ہیں۔ انتظار میں جو لذت ہوتی ہے اس کا مزہ جاپانیوں کو کیا معلوم۔ ایسے ہی کئی معاملات ہیں جن میں جاپانی ہم سے بہت پیچھے ہیں آپ یقین کریں کہ ہمیں ٹوکیو میں کسی بھی اسٹیشن پر ٹرین کے لیے دو منٹ سے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ایک ٹرین جاتی ہے تو دوسری اس کے پیچھے آجاتی ہے اور پھر ان کی رفتار بھی ایسی تیز کہ آدمی کا کلیجہ منہ کو آجائے۔ پتہ نہیں انھیں کہاں جانے کی جلدی ہوتی ہے۔ ہماری ریل گاڑیاں اسٹیشن میں داخل ہونے سے پہلے بیرونی سگنل کے پاس ضرور رکتی ہیں، سیٹیاں بجاتی ہیں اور مسافر

کھڑکیوں میں سے جھانک کر سگنل کو دیکھتے ہیں۔ کتنا مزہ آتا ہے۔ لگتا ہے جاپانی ریل گاڑیوں کا کوئی سگنل ہی نہیں ہوتا۔ بس منہ اُٹھائے کسی بھی اسٹیشن میں گھس جاتی ہیں۔"

یہ سفرنامہ بھی ہے اور مزاح کی کتاب بھی۔ اردو میں اس سے پہلے اس کی نظیر صرف ابن انشا کی تحریروں میں ملتی ہے یعنی "چلتے ہو تو چین کو چلیے" یا "ابن بطوطہ کے تعاقب میں" یا ان کی اس طرح کی تحریریں۔ اگرچہ اب سفرنامہ باقاعدہ ایک صنف کے طور پر لکھا جا رہا ہے بالخصوص پاکستان میں اس طرف خاصی توجہ ہے اور بہت سے لوگوں نے سفرنامے لکھے ہیں لیکن ایسا سفرنامہ جس میں مزاح کا عنصر غالب ہو، کم از کم میری نظر سے ابن انشا کے بعد اس طرح کی کوئی تحریر نہیں گزری۔ ملاحظہ ہو محض ایک لفظ سے اور لفظ بھی نہیں محض صیغۂ تانیث سے پورا باب 'یونیسکو کی چھتری' مزاح کا شاہکار بن گیا ہے۔ یہ جملے دیکھئے :

" وہ ہمیں ٹوکیو میں دوسرے دن ملی اور ہم نے اسی دن اپنی بیوی کو خط لکھا "وہ ہمیں آج ملی ہے دیکھنے میں کچھ خاص نہیں مگر پھر بھی اچھی ہے۔ اب ہمیں اسی کی رفاقت میں ٹوکیو کے شب و روز گزارنے ہیں! اسی کے سائے میں رہنا ہے"۔

ہر ہر جملے کی تانیث چھتری کی طرف بھی راجع ہے اور محبوبہ کی طرف بھی۔ مبتدا میں ایک بار ذکر کر کے مزاح نگار اس کو گول کر دیتا ہے۔ بیوی کے خط میں لفظ چھتری لکھنے سے رہ گیا ہے اور اس طرح ابہام سے شبہ پیدا ہوا۔ اس طرح میاں بیوی میں جو نوک جھونک ہوتی ہے وہ قاری کے لیے تفنن طبع کا سامان فراہم کر دیتی ہے۔ یہ بار بار وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ بی بی میں نے تو چھتری کے بارے میں لکھا تھا روانی میں لفظ چھتری لکھنا بھول گیا تم کس تصور میں غرق ہو؟ اور وہ بالکل نہیں مانتی یہ اس کے سر کی قسم کھاتے ہیں۔ وہ کہتی ہے :

" اچھا تو میرے سر کی عزت کرتے ہو تبھی تو میرے سر پر ایک نئی چھتری لا رہے ہو"۔

یہ سارا کا سارا باب شگفتگی کا شاہکار ہے۔ صورتِ حال (SITUATION) کا مزاح بھی جگہ جگہ انھوں نے پیدا کیا ہے۔ ہلکا سا اشارہ اس کی طرف کروں گا کہ مزاح کا ایک خاص حربہ مبالغہ ہے۔ مبالغے کا عنصر بھی جب تک مزاح نگار داخل نہ کریں، مزاح، مزاح نہیں بنتا جس طرح آپ ہر روز کارٹون میں دیکھتے ہیں شکل کو کچھ بگاڑا جاتا ہے اور فیچرز کو تھوڑا بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔ معانقہ کا ذکر چل رہا ہے، جاپانی آداب کا ذکر کرتے ہوئے مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں :

" ہماری تربیت کچھ ایسی ہوئی ہے کہ نہ صرف معانقہ کرنے کو ضروری سمجھتے ہیں بلکہ موقع ملے تو ملاقاتی سے گلے مل کر اس کی پسلیوں کی مضبوطی کا امتحان بھی لیتے ہیں ہم سے دو چار دنوں تک یہ بدتہذیبی سرزد ہوتی رہی کہ دھڑا دھڑ جاپانیوں سے معانقہ کرتے رہے یہ اور بات ہے کہ جس کسی سے معانقہ کرتے وہ فوراً اپنے ہاتھ دھونے کے لیے چلا جاتا۔ آخر کو سمجھدار آدمی ہیں تاڑ گئے کہ ہمارے معانقے اور بغل گیریاں ضائع جا رہی ہیں۔ ہم نے بھی ملاقات کے جاپانی آداب اختیار کر لیے۔ جاپانی جب بھی کسی شناسا کو دیکھتا ہے تو دو تین گز دور کھڑا ہو جاتا ہے اور ساٹھ درجہ کا زاویہ بنا کر تعظیماً جھک جاتا ہے گویا کہنا چاہتا ہے کہ بھیا تجھے دور ہی سے سلام"۔

پھر لکھتے ہیں کہ :

" تعظیماً جھکنے کے اور بھی کئی ذیلی آداب ہیں۔ پتہ چلا کہ ملاقاتی کی عمر اور رتبہ کے لحاظ سے آپ کو جھکنے کے زاویہ کا تعین کرنا پڑتا ہے۔ کتنی مرتبہ آپ کو جھکنا ہے اس کا انحصار بھی کئی باتوں پر ہوتا ہے۔ جو شخص جھکنے میں پہل کرتا ہے وہ جتنی مرتبہ جھکے اتنی ہی مرتبہ آپ کو بھی جھکنا پڑتا ہے۔ ایک بار ہم نے اپنے جاپانی دوست کے آگے جھکنے میں پہل

کی تھی وہ جھکا تو ہمیں احساس ہوا کہ ہمیں اور بھی جھکنا چاہیئے۔ اب جو ہم دونوں کے بیچ جھکنے کا سلسلہ شروع ہوا تو رُکنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔"

کیونکہ انھیں معلوم ہی نہ تھا کہ رُکنا بھی ان ہی کو ہے۔ آخر میں، میں اشارہ کرنا چاہوں گا مزاح کی ایک اور طاقت کی طرف جو مجتبیٰ حسین کی تحریروں سے جھلکتی ہے اور وہ ہے کردار نگاری۔ کوئی مزاح نگار اگر ایسے کرداروں کو خلق نہیں کرسکتا جن کی پوری شخصیت مزاح سے بھرپور ہو اور جن کی ہر بات میں شگفتگی ہو، اس وقت تک وہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔ مجتبیٰ حسین کے خاکوں اور مضامین کے مجموعوں میں بہت سے ایسے کردار ملتے ہیں اور اس سفرنامے میں بھی کئی دلچسپ کردار ایسے ہیں۔ آخری باب میں لنکا کے جس مندوب سے انھوں نے ملاقات کرائی ہے جیاکوڈی ہے۔ وہ تو ایسا زبردست کردار ہے کہ الگ سے اس کو خاکوں کے مجموعے میں شامل کرلینا چاہیئے۔ کہتے ہیں کہ وہ مندوب ہمیشہ کہا کرتا تھا ـــــ

"مجھے سری لنکا کے وزیراعظم نے بطورِ خاص اس سیمینار میں شرکت کے لیے نامزد کیا ہے ہر دم وزیرِ اعظم سری لنکا سے اپنے گہرے روابط و مراسم کا ذکر کرتے اور ہم سے پوچھتے رہتے کہ ہندوستان کی وزیراعظم سے ہمارے مراسم کیسے ہیں۔ ہمیں بھی جواباً کہنا پڑتا تھا کہ ہمیں ہندوستان کی وزیراعظم نے بطورِ خاص اس سیمینار میں شرکت کے لیے بھیجا ہے اور یہ کہ ہم بھی وزیراعظم ہندوستان کے خاص آدمی ہیں اور ہمارے مشورے کے بغیر حکومتِ ہند کوئی فیصلہ نہیں کرتی، ہم جاپان میں ہیں تو حکومت کے سارے کاروبار ٹھپ ہوگئے ہیں۔ ہم اپنی دانست میں یہ سمجھتے تھے کہ جیاکوڈی چونکہ صرف ڈینگ ہانکتے ہیں اس لیے ہمیں بھی ڈینگ ہانکنے کا حق حاصل ہے۔ مگر ان ہی دنوں جب وزیراعظم سری لنکا، جاپان کے سرکاری دورے پر آئے تو یہ ہمیں اپنے وزیراعظم سے ملانے کے لیے گئے۔ ملاقات سے پہلے ہمیں پابند بھی کیا کہ ہم ان کے وزیراعظم کی دو چار کتابیں پڑھ کر چلیں اور ان کے بارے میں رائے بھی دیں۔ ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ وزیراعظم سری لنکا سے جیاکوڈی کے بیچ سچ بہت گہرے اور بے تکلفانہ مراسم ہیں۔ جیاکوڈی یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان اور سری لنکا کے بیچ جو چند نزاعی امور ہیں تو ان کو سلجھانے کے لیے ہم اپنے اثرات اور رسوخ کو کام میں لے آئیں۔ کہتے تھے میں اپنے وزیراعظم کو سمجھاتا ہوں تم اپنی وزیراعظم کو سمجھاؤ جیاکوڈی نے ہمیں سری لنکا آنے کی دعوت بھی دی تھی۔ کہتے تھے کہ تمہارا شہر میں تمہیں والا خیر مقدم کرواؤں گا مگر وہ تو خدا کا شکر ہے کہ ان کے سری لنکا اور ہمارے ہندوستان واپس آنے کے چند ہی دنوں بعد مسٹر پریماداس کی حکومت ٹوٹ گئی جس حکومت کے مشیر جیاکوڈی ہوں اس کا یہ حشر تو ہونا ہی تھا۔"

مجتبیٰ حسین نے جیاکوڈی کے بہت سے مزاحیہ پہلو ابھارے ہیں، سب کے ذکر کی گنجائش نہیں ورنہ بہت سے واقعات ہیں۔ صرف ایک اور پہلو کی طرف اشارہ کروں گا :

"جیاکوڈی بہت دلچسپ آدمی ہیں۔ کبھی ہم لوگ کسی مقام سے دو ٹیکسیاں لے کر اپنے ہوٹل پر پہنچتے تھے تو وہ بڑے غور سے دونوں ٹیکسیوں کے میٹر کا مطالعہ ضرور کرتے تھے اور اس بات پر گھنٹوں اظہارِ حیرت کرتے رہتے تھے کہ دونوں ٹیکسیوں کا میٹر ایک ریڈنگ دے رہا ہے۔ کم از کم میرے ملک میں تو ایسا نہیں ہوتا۔"

آخر میں ایک مزے کی بات لکھی ہے اور اس کے بغیر یہ حوالہ مکمل نہیں ہوسکتا۔ ایک دن جیاکوڈی نے پوچھا کہ ہندوستان میں شائستہ سلام کے لیے آپ کے یہاں کون سا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ مجتبیٰ حسین نے کہا کہ نمستے کہا کیجیے۔ بولے نمستے تو میں جانتا ہوں کوئی اور مہذب سلام سکھاؤ۔" مجتبیٰ حسین نے آداب عرض کا نسخہ تجویز کیا۔ بولے یہ بھی نہیں

چلے گا کوئی ایسا سلام سکھاؤ جو بہت ہی مہذب ہو۔" مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

"ہمیں مذاق سوجھا اور ہم نے انھیں ایک ناقابلِ اشاعت گالی سکھا دی۔ بہت خوش ہوئے اور ہر صبح کو اسی گالی سے ہمارا استقبال کرنے لگے۔ ہم بھی جی ہی جی میں خوش ہوتے رہے کہ چلو دیارِ غیر میں کوئی ہمیں گالی دینے والا بھی ہے۔ ایک دن ہم لوگ گنزہ کی ایک ہندوستانی ریستوران میں کھانا کھانے گئے۔ جیا کوڈی نے اتنی محبت سے ہم سے یہ سلام سیکھا تھا۔ اس نادر موقع کو بھلا کس طرح ہاتھ سے جانے دیتے۔ سو انھوں نے ہندوستانی بیرے کو بلا کر نہایت ادب کے ساتھ اپنی دانست میں ہمارا سکھایا ہوا سلام عرض کر دیا۔ ہم چپ چاپ بیٹھے تماشہ دیکھتے رہے۔ بیرے نے منیجر سے شکایت کی اور جب منیجر ان سے بازپرس کرنے کے لیے آیا تو جیا کوڈی نے جھک کر پھر یہی سلام ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ منیجر سمجھدار آدمی تھا۔ اس نے جان لیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ اس نے الگ لیجا کر جیا کوڈی کو سلام کے معنی و مفہوم سے آگاہ کیا۔ جیا کوڈی ٹیبل پر واپس آئے تو نہایت غیر مہذب لہجے میں یہی سلام ہماری خدمت میں پیش کرتے ہوئے بولے "تم بہت سنگین مذاق کرتے ہو۔ وہ تو اچھا ہوا کہ منیجر شریف آدمی تھا۔ اگر کوئی دوسرا ہندوستانی ہوتا تو نہ جانے اس سلام کا جواب مجھے کس طرح ملتا۔ بعد میں جیا کوڈی نے بہت چاہا کہ ہم بھی سنہالی زبان میں ان سے سلام کرنے کے مہذب اور شائستہ کلمات سیکھ لیں مگر ہم نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا۔"

تو مجتبیٰ حسین کے فن کے بہت سے پہلو ہیں اور باتیں کرنے کو بہت سی ہیں لیکن وقت کم ہے اور میں نے مختصراً تعریض، تقابل، مبالغہ، صورتِ حال کے مزاح یا کردار نگاری کے مزاح کی طرف یا سماجی طنز کی طرف اشارے کیے۔ آخر میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ کوئی بھی شخص جو مزاح لکھتا ہو یا شگفتہ تحریریں لکھتا ہو یا دوسروں کو ہنستا ہنساتا ہو کہیں نہ کہیں اس کے دل میں کوئی نہ کوئی چھپا ہوا درد ضرور ہوتا ہے۔ مجھے بھی یقین ہے کہ مجتبیٰ حسین کی آنکھوں سے تنہائی میں کبھی کبھی کوئی گرم گرم آنسو ضرور ٹپکتا ہوگا۔ اور کوئی نہ کوئی چوٹ دبی ہوئی ان کے دل میں ایسی ضرور ہوگی جو انھیں خود بھی ہنسنے اور دوسروں کو ہنسانے پر مجبور کرتی ہے! اسی دعا کے ساتھ اور نیک تمناؤں کے ساتھ کہ ان کا سفر جس طرح سے خوب سے خوب تر کی تلاش میں جاری ہے جس طرح اپنی تحریروں پر انھوں نے ضبط رکھا ہے اگرچہ وہ بہت لکھ رہے ہیں کچھ زیادہ لکھ رہے ہیں اور زیادہ لکھنے والے کو ہمیشہ خطرہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے معیار سے گر نہ جائے لیکن مجتبیٰ حسین نے جس طرح معیار کے معاملے میں بھی نگہداشت کی ہے مجھے یقین ہے کہ ان کا سفر اگر اسی رفتار سے جاری رہا تو یقیناً وہ اردو کے مزاحیہ ادب میں بہت اونچا مقام حاصل کریں گے۔ خوشی کے اس موقع پر بہت بہت دعائیں۔

شکریہ!

مُغنی تبسّم

مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری

مجتبیٰ حسین ہندوستان کے اُن چند ایک مزاح نگاروں میں سے ہیں جن کی شہرت اور مقبولیت ارضی اور لسانی سرحدوں کو عبور کرگئی ہے۔ برّصغیر کے علاوہ دُنیا کے اور مُلکوں میں جہاں کہیں اُردو بولی اور سمجھی جاتی ہے لوگ مجتبیٰ حسین کے نام ہی سے نہیں کام سے بھی واقف ہیں اور ان کی تحریروں کو دلچسپی کے ساتھ پڑھتے اور سُنتے ہیں۔ خود مجتبیٰ حسین دُنیا کے کئی ملکوں کا دورہ کرچکے ہیں۔ وہ جہاں بھی گئے ان کے اعزاز میں محفلیں منعقد ہوئیں، اُن کے مضامین سُنے گئے۔ اس کے علاوہ ان کے سفرناموں، انشائیوں اور خاکوں کے ترجمے کئی زبانوں میں ہوچکے ہیں۔

یہاں مجھے مزاح نگاری کے فن، اس کے لوازم اور اُردو میں مزاح نگاری کے ارتقا کا جائزہ لینا نہیں ہے صرف یہ دیکھنا ہے کہ مجتبیٰ حسین کس طرح مزاح تخلیق کرتے ہیں اور اس کی ادبی قدر و قیمت کیا ہے۔

اُردو میں مزاح نگاری کے دو پیرایوں کی واضح نشان دہی کی جاسکتی ہے۔ ایک پیرایہ وہ ہے جس میں واقعات کے سہارے مزاح پیدا کیا جاتا ہے۔ حُسنِ بیان پر زیادہ اور لطفِ زبان پر کم توجہ دی جاتی ہے۔ اس رجحان کی نمائندگی پطرس کرتے ہیں۔ دوسرا پیرایہ وہ ہے جس میں واقعات ضمنی حیثیت رکھتے ہیں۔ مزاح نگار زیادہ تر الفاظ سے کھیلتا ہے اور زبان کے مخصوص استعمال سے مزاح پیدا کرتا ہے۔ رشید احمد صدیقی کا مزاح کچھ اسی نوعیت کا ہے مشتاق احمد یوسفی نے اِن دونوں اسالیب کے امتزاج سے اپنا منفرد طرز ایجاد کیا ہے۔ مجتبیٰ حسین بھی اِن دونوں پیرایوں سے کام لیتے ہیں۔ لیکن ان کا طریقۂ کار اور اسلوب مختلف ہے۔

مجتبیٰ حسین بنیادی طور پر ایک قصّہ گو ہیں۔ ان کا موضوع انسان ہے اور وہ انسان کو سماج کے چوکھٹے میں دیکھتے اور پیش کرتے ہیں۔ انھیں واقعہ نگاری اور مرقع کشی میں کمال حاصل ہے۔ اُن کا مشاہدہ جزئیات بیں ہے اور اسی وَصف کو کام میں لاکر وہ کسی واقعے کے مضحک پہلوؤں کو اُجاگر کرتے ہیں۔ روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے معمولی واقعات بھی ان کی توجہ سے نہیں چُوکتے۔ سماج کے مختلف طبقوں اور شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے طرزِ زندگی، ان کے مسائل اور ان کے مخصوص رویّوں، عادتوں اور خصائل کا اُنھوں نے گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے کسی واقعہ کو محسوس بناکر پیش کرنا اور کسی کردار کی جیتی جاگتی تصویر کھینچ دینا مجتبیٰ حسین کے فن کا خاص وصف ہے۔

اس سلسلے میں وہ محاکات نگاری اور پیکر تراشی کے تمام وسائل (تشبیہ، استعارہ، صفات و متعلقات فعل) کو بروئے کار لاتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات ملاحظہ کیجئے:

> "تھوڑی دیر بعد جب اچانک سانپ کے پھنکارنے اور پھر سانپ کو مارنے کی آوازیں آنے لگتی ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ سات بج گئے ہیں اور ہمارے دوسرے پڑوسی کے گھر میں نل کھل گیا ہے اور اُن کی نوکرانی لکشمی نہ صرف آچکی ہے بلکہ کپڑے بھی دھونے لگ گئی ہے"
>
> (کالونی میں رہنا)

> "حسن الدین احمد صاحب بدستور ہمارے دوست کی خادمہ کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے رہے۔ اُس بھی کیا بُری چیز ہوتی ہے پھر آہستگی سے بولے "اصل میں آپ کے صاحب نے ہمیں رات کے کھانے پر بُلایا تھا۔ کیا وہ تمہیں اس بارے میں کچھ کہہ گئے ہیں؟ ہوسکتا ہے کہ انھوں نے ہمارا کھانا تیار کروادیا ہو۔" یہ سنتے ہی بڑھیا گھر کے اندر چلی گئی اور دروازے کے ایک پٹ کو بھیڑکر اور دوسرے کو آدھا کھینچ کر دروازے میں یوں کھڑی ہوگئی جیسے گولکنڈے کے قلعے پر اورنگ زیب کے حملے کے وقت عبدالرزاق لاری قلعے کے دروازے پر کھڑا ہوگیا تھا۔ اس نے کہا "معاف کرنا یہاں کوئی کھانا وانا تیار نہیں ہوا ہے۔ میں خود دوپہر سے بھوکی ہوں۔ صاحب کل آئیں گے تو اُن سے بات کیجئے۔"
>
> (حسن الدین احمد ـــ لفظوں کا آدمی)

مجتبیٰ حسین کی تشبیہات میں بڑی تازگی اور انفرادیت ہوتی ہے۔ ان کی تشبیہات بالعموم موضوع اور نفسِ مضمون سے مناسبت رکھتی ہیں۔ اسی کے ساتھ رعایتِ الفاظ بھی ملحوظ رہتی ہے۔ باقی جدید دور کے ایک بلند مرتبہ غزل گو شاعر تھے۔ وفات سے پہلے طویل علالت کا شکار رہے۔ ان کے ایک مجموعۂ کلام کا نام "حسابِ رنگ" ہے۔ مجتبیٰ حسین نے ایک خاکے میں باقی کی تصویر ان لفظوں میں کھینچی ہے۔

> "باقی اِن دنوں چھوٹی بحر کا مصرعہ بن گئے تھے۔ ہاتھ میں ایک چھڑی آگئی تھی جو اس مصرعہ کو وزن سے گرنے نہیں دیتی تھی۔ چھڑی کیا تھی، اچھی خاصی ضرورتِ شعری تھی۔ اس وقت باقی کے حسابِ رنگ میں ایک ہی رنگ جڑا ہوا تھا اور وہ تھا زرد رنگ ـــ یُوں لگتا تھا جیسے باقی باقی نہیں ہلدی کی گانٹھ ہیں۔"
>
> (باقی ـــ نو آدمیوں کا آدمی)

کبھی وہ کسی غیر مرئی چیز کو مرئی چیز سے تشبیہ دے کر کسی داخلی احساس یا تجربے کی تجسیم کر دیتے ہیں۔ کبھی تشبیہ کو اتنا پھیلادیتے ہیں کہ وہ تمثیل بن جاتی ہے۔ ذیل کے اقتباس میں یہ دونوں خصوصیات یکجا ہوگئی ہیں:

> "ہم ذاتی طور پر نئے سال کی خوشی اس لیے نہیں مناتے کہ نیا سال آگیا ہے بلکہ خوشی اس بات کی مناتے ہیں کہ پُرانا سال گزر گیا اور ہم نہیں گزرے۔ تب ہم پرانے سال کی طرف یوں حقارت سے نظر ڈالتے ہیں جیسے کشتیوں کے دنگل میں فتح پانے کے بعد کوئی پہلوان ہارے ہوئے

پہلوان کی طرف فاتحانہ نظر ڈالتا ہے۔ سچ پوچھئے تو پرانا سال بھی ایک پہلوان ہوتا ہے جس سے آپ مسلسل ۳۶۵ دن فری اسٹائیل کشتی لڑتے ہیں۔ وہ آپ کو گھونسے رسید کرتا ہے کبھی دھوبی پٹخنی دے ڈالتا ہے، کبھی آپ اس کے سینے پر سوار ہوجاتے ہیں اور وہ کبھی آپ کے سینے پر مونگ دلنے لگتا ہے۔"

(نیا سال پرانا جال)

جہاں تک زبان کے مزاح کا تعلق ہے لفظوں کی مزاج دانی ضروری ہوتی ہے۔ مجتبیٰ حسین لفظوں کے اچھے پارکھ ہیں۔ انھیں ذومعنی الفاظ کے استعمال سے مزاح پیدا کرنے کا خاص سلیقہ آتا ہے۔ اکثر وہ جملے یا عبارت میں کسی لفظ کو معنوں کے اختلاف کے ساتھ مکرر لاتے ہیں۔ اس تکرار کی وجہ سے ایک نئی معنوی جہت ابھرتی ہے جس میں ظرافت کا عنصر شامل رہتا ہے۔ پہلے ذومعنی الفاظ کا وہ استعمال دیکھئے جسے 'ایہام' اور ایہام تناسب کا نام دیا گیا ہے۔

"جب ریس کا سیزن آتا ہے تو اچھا خاصا آدمی بے لگام ہوجاتا ہے۔"

(دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے)

"اگر آپ ایک بار فون کر دیں تو پولیس زیادہ سے زیادہ ۳ منٹ ۲۳ سکنڈ کے اندر اندر مقامِ واردات پر پہنچ جاتی ہے۔ ہماری پولیس کی طرح نہیں کہ فون کرنے کے گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد بڑے اطمینان کے ساتھ سیٹیاں بجاتی ہوئی چلی آتی ہے۔ ہماری پولیس امن کم قائم کرتی ہے اور سیٹیاں زیادہ بجاتی ہے۔"

(جاپان چلو)

"اب لوگوں کو اُن کی تقریر زبانی یاد ہو چکی ہے۔ اُردو زبان کی مٹھاس اور چاشنی پر جان دیتے ہیں چنانچہ ساری اُردو شاعری کو وہ حلوائی کی دکان سمجھتے ہیں اسی لیے تو انھیں مشاعروں میں پابندی سے بُلایا جاتا ہے۔"

(ایک مشاعرے کی رننگ کامنٹری)

"ادب میں اتنے تجربے کیے گئے کہ ادب لیباریٹری میں تبدیل ہوگیا ہے۔ ہر ادیب نے ادب کو ایک نیا موڑ دینا چاہا۔ چناں چہ ہمارا ادب اتنا مڑا تڑا ہوگیا ہے کہ اسے دیکھتا تو احساس ہوتا کہ برسوں بعد کسی گھڑے میں سے نکالی ہوئی شیروانی کو دیکھ رہا ہوں۔"

(اُردو کا آخری قاری)

مجتبیٰ حسین کے اسلوب کی تشکیل میں محاوروں اور کہاوتوں کے برجستہ، معنی خیز اور پُرمزاح استعمال کا خاص حصہ ہے۔ محاورے 'ایہام' ایہام تناسب اور صنعتِ تجنیس کے ساتھ بکثرت استعمال ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ محاوروں کی دلچسپ انداز میں تحریف کرتے ہیں جس کی وجہ سے محاورے کی سنجیدگی ختم ہوجاتی ہے اور اس میں ایک مضحک پہلو اُبھر آتا ہے۔

"بچے بچے کی زبان پر آپ کا نام تو تھا ہی، اب بڑوں کی زبان پر بھی آپ کا نام ہے۔"

(مرزا غالب کی پریس کانفرنس)

"میں مخمورؔ سے واقف نہیں ہوں۔ سُنا ہے کہ ٹونک میں اُن کے گھر پہ ہاتھی جھُوما کرتے تھے۔
اب اُن کے اشعار پر سامعین جھُوما کرتے ہیں۔ مگر مخمورؔ کو ہاتھی اور سامعین کے فرق کو
ضرور ملحوظ رکھنا چاہئے کیوں کہ ہاتھی سوچ سمجھ کر جھُومتا ہے اور سامعین سوچے سمجھے بغیر
ہی جھُومتے ہیں۔" (مخمور سعیدی۔۔ بحیثیتِ مجموعی آدمی)

کبھی وہ محاوروں کو کہاوتوں سے جوڑ کر مزاح کو دو آتشہ بنا دیتے ہیں۔

" اتنے برسوں تک بھانت بھانت کے رکشاؤں میں بیٹھنے کے بعد، میں اس نتیجے پر پہنچا
ہوں کہ جب گھوڑے کی قسمت پھوٹ جاتی ہے تو وہ تانگے میں جوت دیا جاتا ہے اور
جب انسان کی قسمت پھوٹتی ہے تو وہ رکشا چلاتا ہے اور جس شخص کی قسمت کسی وجہ
سے پھوٹنے نہیں پاتی بلکہ پھوٹنے کی منتظر رہتی ہے تو وہ رکشا میں بیٹھ جاتا ہے۔ ہزار
بار رکشا والوں کو سمجھاتا ہوں کہ میاں سلامتی کی چال چلو کہ زندگی میں یہی کلیدِ کامیابی ہے
تو وہ مجھ سے کہتے ہیں "حضور! سلامتی کی چال چل کر تو اس نوبت کو پہنچے ہیں اور
اب مزید سلامتی کی چال چلیں تو زمانہ قیامت کی چال چل جائے گا اور ہم مُنہ دیکھتے
رہ جائیں گے۔" (یہ رکشا والے)

یہ ساری عبارت، محاوروں اور کہاوتوں کے تانے بانے سے بُنی گئی ہے۔ کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ کہاوتیں اور محاورے تکلف کے ساتھ ارادتاً لائے گئے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کی فن کاری اس وقت بطورِ خاص داد طلب ہوتی ہے جب وہ کسی لفظ کو مرکزی حیثیت دے کر دورانِ تحریر اس لفظ سے تشکیل پانے والے محاوروں کا برجستہ استعمال کرتے ہیں۔ ذیل کی عبارت میں لفظ 'سینے' کا استعمال قابلِ توجہ ہے۔

" ٹرین جب ہچکولے کھاتی ہوئی آگے بڑھتی ہے تو ہم اپنے سامان پر ایک اُچٹتی سی نظر ڈال لیتے ہیں اور کتاب کھول کر برتھ پر دراز ہو جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر تک تو کتاب اور ٹرین دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر اس کے بعد ہماری نظروں کے سامنے کتاب کی سطریں بڑی تیزی سے پٹریاں بدلنے لگتی ہیں اور اس کے بعد نہ جانے کب ہماری آنکھیں خود بخود بند ہو جاتی ہیں پھر کتاب ہمارے سینے پر سوار ہو جاتی ہے جیسے وہ خود ہمارا مطالعہ کر رہی ہو .... اچانک ایک جھٹکے سے ہماری نیند اُچٹ جاتی ہے۔ ہم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتے ہیں۔ ہمارا ہاتھ اپنے سینے پر کتاب کو تلاش کرنے لگتا ہے مگر کتاب وہاں نہیں ہوتی .... یہ کتاب ہمیں اپنے پاس والی برتھ کے مسافر کے سینے پر نظر آتی ہے۔۔ جب ہم اپنی کتاب کو پڑوسی مسافر کے سینے پر سے بڑی آہستگی کے ساتھ یوں اُٹھاتے ہیں جیسے ہم اس کتاب کی چوری کر رہے ہوں... پھر یہ کتاب ہمارے سینے پر دراز ہو جاتی ہے۔ جب ہم دوبارہ جاگتے ہیں تو پھر ہم اس کتاب کو اپنے پڑوسی مسافر کے سینے پر پاتے ہیں اور یہ سلسلہ منزلِ مقصود کے آنے تک جاری رہتا ہے۔ کتاب کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی چلی جائے..... درمیان میں جب بھی ہماری آنکھ کھُلتی ہے تو اپنی کتاب کو کسی نئے مسافر کے

سینے پر پاتے ہیں۔ پھر ایک موقع ایسا بھی آتا ہے جب ہماری کتاب اچانک ٹرین سے غائب ہو جاتی ہے۔ ہم اُسے ڈبّے سے لے کر باتھ روم میں تک تلاش کرتے ہیں مگر وہ ہمیں داغِ مفارقت دے جاتی ہے۔ ہم سینے پر کتاب رکھنے کے بجائے پتھر رکھ لیتے ہیں۔"

(ٹرین میں پڑھنا)

کبھی وہ کسی لفظ کے محاوراتی سلسلوں کو اس طرح جوڑتے چلے جاتے ہیں کہ ضلع جگت کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

"ہم نے کہا' بیگم! ہم تمہاری بات سے صد فی صد متفق ہیں۔ ہمارا جی بھی اب یہی چاہتا ہے کہ قدرت ہم سے ہماری بصارت چھین لے۔ ہم نے سچ مچ بہت دُنیا دیکھ لی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب تمہیں دیکھتے تو دیکھتے رہ جاتے تھے۔ اب تمہیں دیکھنے کا لُطف بھی جاتا رہا۔ دوستوں کی کرم فرمائیاں دیکھیں، حالات کی بے مہری دیکھی، اب اس دُنیا میں دیکھنے کو باقی ہی کیا بچا ہے۔ اپنا انجام دیکھنا ہے سو وہ ہم نہیں دیکھتے، تم دیکھ لو۔ تمہاری آنکھیں بھی تو ہماری آنکھیں ہیں۔" (سورج گہن کی یاد میں)

مجتبیٰ حسین بات سے بات پیدا کرنے کا ہُنر خوب جانتے ہیں۔ یہ وصف محاوروں کے استعمال کے سلسلے میں ہم دیکھ چکے ہیں۔ ان کی تحریروں میں خیال سے خیال اُبھرتا ہے لیکن وہ اپنے موضوع سے بھٹکتے نہیں۔ خیال کو رُو کو شعور کی گرفت میں رکھتے ہیں۔" باتیں بنانا" مجتبیٰ کے اسلوب کا وصفِ خاص ہے۔ وہ باتیں اس طرح بناتے ہیں کہ اکثر بات بن جاتی ہے لیکن کبھی کبھی اس رو میں اس طرح بہہ جاتے ہیں کہ بات کا سرا ہاتھ سے نکل جاتا ہے لیکن ایسا کم کم ہی ہوتا ہے۔

تخلیقی اظہار کی خوبی یہ ہے کہ بات کنایوں میں کہی جائے۔

ع برہنہ حرف نہ گفتن کمالِ گویائی است

اور مجتبیٰ حسین کی گویائی کا کمال بھی یہی ہے وہ کسی بات کو صاف لفظوں میں بیان کرنے کے بجائے بالواسطہ پیرایہ کو کام میں لاتے ہیں۔ کنائے کے استعمال سے جہاں کفایتِ لفظی کے ساتھ معنیٰ آفرینی کی جاتی ہے وہیں اظہار میں شائستگی بھی پیدا ہوتی ہے اور مزاح کو پھکڑ اور ہزل بننے سے بچایا جا سکتا ہے۔ مجتبیٰ حسین بالعموم اپنی بات، ایما و اشارے میں کہہ جاتے ہیں۔ کنایوں کے اختراع میں بھی انھوں نے جودتِ طبع کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے ذیل کے اقتباسات کا جائزہ لیجئے:

"ہم نے عید سے ایک دن پہلے ایک گوالے کو دیکھا جو بالٹیوں میں پانی بھر کر لے جا رہا تھا۔ ہم نے پوچھا" یہ کیا ہو رہا ہے؟" وہ بولا" جی کچھ نہیں ذرا عید کی تیاری ہو رہی ہے۔"

(عید کی تیاری)

"صاحبو! اپنے دیش کا کھانا اپنے ہی دیش میں اچھا لگتا ہے۔ بعد میں ہم ٹوکیو کے اور بھی کئی علاقوں کے ہندوستانی ریستورانوں میں کھانا کھانے کے لیے نہیں بلکہ ان کا ٹائیلٹ استعمال کرنے گئے۔"

(جاپان چلو)

"ایک دن یہ مژدۂ جاں فزا ملا کہ "تناظر" کا کاتب کہیں غائب ہوگیا ہے۔ بعض کاتب اس طرح ادب کی بڑی خدمت انجام دیتے ہیں۔"
(بلراج ورما نے "تناظر" نکالا)

تحریف نگاری، ادبی مزاح کا ایک دلکش پیرایہ ہے، واقعاتی مزاح کے برخلاف تحریف یا پیروڈی سے وہی قاری لطف اٹھا سکتے ہیں جو ادب کا ستھرا ذوق رکھتے ہیں اور جن کا شعر و ادب کا مطالعہ وسیع ہوتا ہے۔ کسی ادبی تخلیق یا کسی اسلوب کی باضابطہ تحریف سے ہٹ کر تحریف کا استعمال، انشائیوں اور خاکوں میں مزاح پیدا کرنے کی غرض سے بھی کیا جاتا ہے۔ اس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں (۱) کسی مصنف کے معروف جملے یا فقرے کو یا کسی شعر کو لفظی تغیر کے ساتھ شاملِ مضمون کیا جائے (۲) کسی جملے یا فقرے، شعر، مصرعے یا مصرعے کے جزو کو کسی تبدیلی کے بغیر عبارت میں شامل کیا جائے یا اس طرح حوالہ دیا جائے کہ اس میں مزاحیہ مفہوم در آئے۔ مجتبیٰ حسین نے ایک محدود پیمانے پر اس اسلوب کو برتا ہے مثلاً

"سردی کے دن تھے، اس لیے ہر روز یہ معمول بن گیا تھا کہ کھانا دوبارہ گرم ہوتا تھا" ایک میرے آنے سے پہلے اک مرے آنے کے بعد۔"
(حسن الدین احمد ـــ لفظوں کا آدمی)

"وہ جب کسی ادیب یا شاعر پر تنقید کرتا ہے تو اس قدر جوش میں آجاتا ہے جیسے وہ ابھی قلم رکھ کر اٹھ جائے گا اور اس ادیب کے گھر پہنچ کر اس کا گلا پکڑ لے گا اور بقیہ تنقید کو ہاتھا پائی کے ذریعہ مکمل کرلے گا۔ مجھے تو اس کی کتاب میں اکثر مقامات پر یوں محسوس ہوا جیسے وہ کہنا چاہتا ہے۔ ع کاغذ کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں
(ظ انصاری سے ظ انصاری تک)

کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انھوں نے کسی خط میں اپنی بیماری کا "دوسرا ایڈیشن" نکالا ہو۔ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ان کی ہر بیماری نہ صرف یہ کہ 'غیر مطبوعہ' ہوا کرتی تھی بلکہ "قابلِ اشاعت" بھی ہوا کرتی تھی۔ ان کی بیماریوں میں بھی ایک قسم کا تنوع تھا۔

ع ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلّی

(اعجاز صدیقی ـــ اُردو کا آدمی)

مجتبیٰ حسین کے انشائیے اور خاکے ظاہراً غیر رسمیت اور بے تکلفی کے باوصف بڑے منضبط ہوتے ہیں اور فنی تکمیل کا احساس دلاتے ہیں۔ انشائیوں کے مقابلے شخصی خاکوں میں کسی مرکزی خیال کو ابھارنا اور مجموعی تاثر پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے۔ مجتبیٰ حسین خاکہ لکھتے وقت شخصیت کے کسی نمایاں وصف کو مرکزیت دے کر اس کے اطراف اپنے خاکے کا جال بنتے چلے جاتے ہیں کبھی وہ یہی کام کسی کلیدی لفظ سے لیتے ہیں۔ مخدوم محی الدین کا خاکہ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے:

"پچیس چھبیس برس ادھر کی بات ہے۔ مخدوم محی الدین "انڈر گراونڈ" تھے اور میں مڈل اسکول کا طالب علم تھا۔ ان دنوں بھی مجھے اتنی ہی انگریزی اور اردو آتی تھی جتنی کہ آج آتی ہے لہٰذا میں

اپنے تئیں "انڈرگراونڈ" کا آسان ترجمہ "زیرِ زمین" کرکے گھنٹوں حیران رہا کرتا تھا کہ مخدوم بھائی آخر 'زیرِ زمین' رہ کر کیا کرتے ہیں۔ مجھے تو وہ 'ذیلے از معدنیات' قسم کی کوئی چیز لگتے تھے۔

'زیرِ زمین' کے کلیدی لفظ کا مجتبیٰ نے بھرپور استعمال کیا ہے۔ آگے وہ اس ترجمے کے لفظی معنوں سے مزاح کا پہلو تراشتے ہیں:

"جن دنوں 'بنّے بھائی' یعنی سجاد ظہیر پاکستان میں پارٹی کی سرگرمیوں کے سلسلے میں روپوش تھے، تاجکستان کے مشہور شاعر مرزا ترسون زادہ پاکستان کے دورے پر آئے اور ایک پاکستانی شاعر سے فارسی میں پوچھا "سجاد ظہیر کجا است"۔ پاکستانی شاعر نے بڑی روانی کے ساتھ فارسی میں ترکی بہ ترکی جواب دیا "سجاد ظہیر زیرِ زمین است" یہ سنتے ہی مرزا ترسون زادہ کی آنکھوں میں کم و بیش اتنی ہی روانی کے ساتھ آنسو آگئے۔ بولے "یہ کب ہوا؟ ہمیں تو کچھ بھی پتہ نہ چلا۔ آخر انھیں کیا بیماری تھی؟"

آگے چل کر مخدوم کی شخصیت کے متنوع پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے مضمون کا اختتام انہی 'کلیدی الفاظ' کے ساتھ ہوتا ہے۔ جن لفظوں سے مضمون کے آغاز میں مزاح پیدا کیا تھا، وہی الفاظ مضمون کے آخر میں الم ناک کیفیت پیدا کرتے ہیں:

"مخدوم کے جنازے میں ہزاروں لوگ دھاڑیں مار کر رو رہے تھے ۔۔۔ اور یوں وہ پھر 'زیرِ زمین' چلے گئے مگر اس بار وہ زیرِ زمین جاتے ہوئے اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لے گئے۔"

گزشتہ چند برسوں میں ہمارے ادب میں مزاح نگاری کی طرف کچھ زیادہ ہی توجہ ہونے لگی ہے۔ بہت سے نئے مزاح نگار سامنے آئے ہیں جس کی وجہ سے ادب میں خاصی چہل پہل نظر آنے لگی ہے۔ مزاح کا تعلق براہِ راست تہذیبی اقدار سے ہوتا ہے۔ جب سماج میں اہم تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں یا تعطل و جمود کو توڑنے کی مساعی تیز ہوتی ہیں تو ردّ و قبول اور عمل و ردّ عمل کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ ایسے میں مزاح کے لیے سازگار فضا پیدا ہوتی ہے لیکن اعلیٰ مزاح کے پنپنے اور پروان چڑھنے کے لیے ضروری ہے زبان سے وابستہ کلچر میں اظہار و ترسیل کے بالواسطہ اور کنایاتی پیرائے تہذیب و شائستگی کی شناخت بن جائیں۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ پاکستان میں مزاح کا معیار کیوں بلند ہے۔ ہندوستان میں اردو زبان مسلسل روبہ انحطاط ہے اور وہ رفتہ رفتہ ماقبل تحریر دور میں لوٹ رہی ہے۔ شعر و ادب پڑھنے سے زیادہ سننے کی چیز بن کر رہ گئے ہیں۔ شاعری کا ذوق مشاعروں اور موسیقی کی محفلوں میں پورا کیا جاتا ہے۔ مزاحیہ ادب بھی ہندوستان میں پڑھا کم جاتا ہے۔ مزاحیہ مضامین سے دلچسپی بھی شاعری کی طرح جلسوں اور محفلوں میں سننے سنانے تک محدود ہوکر رہ گئی ہے۔ جو ادب سنانے کے لیے تخلیق کیا جائے وہ تصریح اور بیان کا شکار ہوجاتا ہے۔ مجتبیٰ حسین اپنے محدود قارئین کے علاوہ کثیر سامعین کی کشش بھی رکھتے ہیں۔ اس کے اثرات ان کے فن پر مرتب ہونے لگے ہیں۔ وہ ایما اور اشارے میں کوئی بات کہہ کر مطمئن نہیں ہوتے۔ غیر ضروری طور پر اس کی تصریح بھی کرتے ہیں تاکہ وہ معمولی سمجھ بوجھ کے قارئین اور عام سامعین کی سمجھ میں آجائے۔ کبھی مبالغے کو غلو کی سرحدوں سے ملا دیتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ وہ قارئین سے کچھ مایوس ہوچلے ہیں۔ لیکن قارئین کا حلقہ کتنا ہی محدود کیوں نہ ہو اعلیٰ درجے کے ادب کی تخلیق کے لیے انہیں کے ذوقِ صحیح کو مطمئن کرنا ہوگا ۔۔

ڈاکٹر قمر رئیس

مجتبیٰ حسین کے مزاحیوں میں معنوی آہنگ

گزشتہ ایک سال کا زمانہ مجتبیٰ حسین کی ولادت کے جشنِ زرّیں اور ان کی ظرافت کے جشنِ سیمیں کے سال کی حیثیت سے یادگار رہے گا۔ اس عرصے میں اُردو میں طنز و مزاح کا جو نشاۃ ثانیہ ہوا ہے اور ادب میں زندہ دلی اور خوش طبعی کی جو اونچی نیچی لہریں اُٹھی ہیں ان کے پیچھے سید مصطفیٰ کمال اور مجتبیٰ حسین دونوں کی پُرخلوص سرگرمیوں کا نمایاں حصّہ رہا ہے۔

اُردو میں جو ادیب صحافت اور کالم نگاری کے راستے سے طنز و مزاح کے میدان میں آئے ہیں اُن کو اپنی صلاحیتوں کا بڑا حصّہ صحافت کی سطحیّت سے نجات پانے میں صرف کرنا پڑا۔ پھر بھی یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کی مزاح نگاری صحافتی بے رنگی سے پوری طرح آزاد ہو سکی۔ اس لحاظ سے مجتبیٰ حسین خوش نصیب ہیں کہ ان کی مزاح نگاری ابتدا ہی سے ادبی آب و رنگ سے آراستہ رہی۔ شاید اس لیے کہ صحافت اور اخباری کالم نگاری سے ان کی وابستگی زیادہ طویل اور گہری نہیں تھی۔ دوسرے یہ کہ ان کا تخیّل اور تجربہ سیاسی واقعات کے مقابلے میں تہذیبی اور انسانی صورت حال سے زیادہ مانوس اور ہم آہنگ تھا۔ اس لیے انھیں اپنی تحریروں کو تخلیقی پیکر دینے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔

مجتبیٰ حسین نے اپنی مزاح نگاری کا محرک اور مُدعا ہنسنا ہنسانا بتایا ہے لیکن خندہ آوری کا یہ تصوّر اُس تصوّر سے مختلف ہے جو عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی اور بعض دوسرے مزاح نگاروں کی تحریروں میں ملتا ہے۔ یہ وہ ہنسی ہے جو آنسوؤں کی تراوش سے پروان چڑھتی ہے جس کے پیچھے بنی نوع انسان کے المیوں اور محرومیوں کا المناک احساس بیدار رہتا ہے۔ مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں :

"بعض لوگ مزاح کی کیفیت کو بہت معمولی کیفیت سمجھتے ہیں حالانکہ سچّا مزاح وہی ہے جس کی حدیں سچّے غم کی حدوں کے بعد شروع ہوتی ہیں۔ زندگی کی ساری تلخیوں اور اس کی تیزابیت

کو اپنے اندر جذب کرلینے کے بعد جو آدمی قہقہے کی طرف جست لگاتا ہے وہی سچا اور باشعور قہقہہ لگاسکتا ہے۔" (قصہ مختصر)

"ہنسی کو ایک مقدس فریضہ جانتا ہوں اور قہقہہ لگانے کو زندگی کا سب سے بڑا ایڈونچر.... زندگی کے بے پناہ غموں میں گھرے رہنے کے باوجود انسان کا قہقہہ لگانا ایسا ہی ہے جیسے وسیع سمندر میں بھٹکتے ہوئے ایک جہاز کو اچانک کوئی جزیرہ مل جائے۔" (تکلف برطرف)

"آج کے انسان کی ہنسی کا المیہ یہ ہے کہ اس کی ہنسی کبھی کبھی آنسو بن کر آنکھ سے ٹیک پڑتی ہے نہ جانے ہر قہقہے کے پیچھے مجھے تلخیوں، نا آسودگیوں اور محرومیوں کے آنسو کیوں نظر آتے ہیں۔" (قطع کلام)

سماج کے مجبور اور محکوم انسانوں کے دکھوں اور محرومیوں کا یہ شدید احساس مجتبیٰ حسین کے فن ظرافت کا وہ پہلا ہے جو اردو مزاح نگاری میں ان کی علاحدہ شناخت کو مستحکم کرتا ہے۔ دردمندی کا یہی وہ عنصر ہے جس کے بغیر زندہ رہنے والا آرٹ جنم نہیں لیتا۔ فن کار دکھی انسانوں سے رشتۂ یگانگت جوڑ کر ہی وسیع تر انسانیت کی آواز بنتا ہے۔ اس طرح وہ ان قوتوں کے خلاف احتجاج بھی کرتا ہے جو انسان کو غم کے اندھیروں میں ڈھکیلتی آتی ہیں۔ عرفانِ غم کا یہ منصب دوسرے فن کاروں کے مقابلے میں مزاح نگار کے لیے زیادہ آزمائشوں کا حامل ہوتا ہے یہی وہ منصب ہے جس نے چارلی چپلن کے سر پر بے مثال عظمت اور عالمی شہرت کا تاج سجادیا تھا۔ اردو طنز و مزاح میں اس کی تابناک پرچھائیاں کرشن چندر، کنہیا لال کپور، ابراہیم جلیس، فکر تونسوی اور یوسف ناظم کی نگارشات میں ملتی ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ اس نوع کی بے شمار تحریروں میں طنز کی تلخی اور نشتر زنی، خندہ آوری پر غالب آگئی ہے۔ مجتبیٰ حسین نے اپنے مزاحیوں میں ایسے ہنر اور حربوں سے کام لیا ہے کہ طنز کے باوجود خوش طبعی اور شگفتگی کی ایک ہموار کیفیت ابتدا سے آخر تک قائم رہتی ہے۔

'تکلف برطرف' سے 'قصہ مختصر' تک مجتبیٰ حسین کے مزاحیوں کا سلسلہ وار مطالعہ کیجئے تو ان میں ایک ہیرو کے مانوس اور تیکھے نقوش ابھرتے نظر آئیں گے اس کے کئی روپ ہیں، کئی چہرے ہیں اور کئی طرح کے لباسوں میں وہ دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس کی باطنی ہیئت میں کوئی خاص تغیر نہیں ہوتا، کئی مضامین مثلاً 'انتخابی نعرے' 'مرزا کی یادیں' 'ہوٹل شبانہ' 'کیلنڈر جمع کرنے والے' اور 'مجھ کو میرے دھوبی سے بچاؤ' میں وہ مصنف کے دوست "مرزا" کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ وہ ایک کلرک ہے۔ نچلے متوسط طبقے کی یہ مخلوق ایک ناہموار سماج کی چکی میں سب سے پسنے والی روح ہوتی ہے۔ اس کی زندگی کے دردناک حادثات اس کے چہرے پر پڑھے جاسکتے ہیں۔ خود مزاح نگار کی سیرت بھی کئی مضامین میں اسی کردار کا عکس نظر آتی ہے۔ اس کی زندگی کے مختلف ادوار اور اطوار کی تفصیل دیکھنا ہو تو ——— "نوکرانی کی تلاش میں" "مہمان" "کالونی میں رہنا" اور "قصہ پہلے گریجویٹ درویش کا" جیسے مضامین پڑھئے لگتا ہے۔ یہ ایک ہی شخص کی آپ بیتی کے مختلف ابواب ہیں ان میں ربط ہے۔ وہ سب دکھ سکھ کے ایک ہی جھولے میں جھولتے ہیں، ایک جیسی ذلتیں اور اذیتیں سہتے ہیں۔ ایک ہی شرح سے جینے کی قیمت ادا کرتے ہیں۔

ان مضامین میں جو ظریفانہ منظر آفرینی ہے وہ قاری کے ہونٹوں کو تبسم سے ہمکنار رکھتی ہے لیکن یہ وہ معنی خیز

ظرافت ہے جو اس کے وجود میں گدازِ قلب (PATHOS) کی نازک کیفیت بھی پیدا کرتی رہتی ہے۔ مجتبیٰ حسین کے ان مزاحیہ مضامین کا انجام ڈرامائی ہی نہیں ہوتا ان میں المیاتی کا پہلو بھی پوشیدہ ہوتا ہے مثلاً "کیلنڈر جمع کرنے والے" کی یہ آخری سطریں دیکھئے:

"سچ تو یہ ہے کہ میں بھی کیلنڈروں کو جمع کرنے کا شوقین ہوں مگر میں کیلنڈر میں صرف ایک ہی تاریخ دیکھتا ہوں اور وہ ہے پہلی تاریخ۔ اس تاریخ کو میں نہیں میری بیوی بھی دیکھتی ہے میں اس لیے دیکھتا ہوں کہ اس دن مجھے تنخواہ ملتی ہے اور میری بیوی اسے اس لیے دیکھتی ہے کہ اُس دن وہ، میری تنخواہ کو مجھ سے چھین لیتی ہے۔ مگر صاحب کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ صرف ایک تاریخ کو دیکھنے کے لیے سالم کیلنڈر کو دیوار پر لگانے کی کیا ضرورت ہے۔"

"سورج گہن کی یادیں" کا اندھا فقیر کہتا ہے۔

"بھائی صاحب۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر میں چشمہ لگائے بغیر سورج کی طرف دیکھوں تو کہیں میری آنکھوں میں بینائی نہ آجائے۔ میرا ذریعہ معاش تو یہی اندھا پن ہے۔ اگر یہ چلا گیا تو بھوکوں مرجاؤں گا۔ میں تو دنیا کو اپنی آنکھوں سے نہیں پیٹ کی نظر سے دیکھتا ہوں۔"

نچلے متوسط طبقہ کی اندوہناک زندگی کی جھلکیاں 'یہ رکشا والے' کے علاوہ 'ڈائرکٹر کا کتّا' میں بھی دیکھئے جس میں کتّا ایک کلرک کا ٹفن باکس لے کر بھاگتا ہے۔ کلرک کہتا ہے۔

"دوستو! یہ ٹفن باکس اس کے مُنہ سے چھینو۔ یہ میری عزت کا سوال ہے۔ اگر کُتّے نے اس ٹفن باکس کو کھول لیا تو میں کسی کو مُنہ دکھلانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ آج تک دفتر میں کسی کو یہ پتہ نہیں ہے کہ میں سالن کے بغیر ہی ایک چپاتی ٹفن باکس میں ڈال کر لاتا ہوں پھر یہ اکلوتی چپاتی بھی اس قابل نہیں ہے کہ اسے ڈائرکٹر صاحب کا کتّا کھا سکے۔"

سماج کے دبے کچلے، مجبور انسانوں کے تئیں درد مندی کا یہ احساس مجتبیٰ حسین کے فنِ مزاح نگاری میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے ان کی ظرافت میں ایک وقار گہرائی اور تہہ داری پیدا ہوئی ہے۔ اپنے مزاح میں تازگی اور طرفگی لانے کے لیے جہاں اُنھوں نے پیش رَو باکمالوں کی ٹیکنیک سے فیض اٹھایا ہے وہاں نئے تجربے بھی کئے ہیں اور کئی طرح کی تدبیروں کو ملا کر مزاح کے نئے اسالیب بھی وضع کئے ہیں۔ چند مضامین سے قطع نظر ان کا طنز نازک، تیکھا اور تہہ دار ہے۔ اس میں تلخی اور زہرناکی اس لیے نہیں آتی کہ ان عناصر کو وہ خود اپنی شخصیت میں جذب کر لیتے ہیں اور اپنے قاری کو زندگی کی ناہمواریوں، بوالعجبیوں اور طرحداریوں سے لُطف اندوز ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔

ان کے مزاحیوں میں ایسے کردار کثرت سے ملتے ہیں جو دلچسپ، منفرد، اور خندہ آور ہونے کے ساتھ ساتھ معاشرے کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔ ایسے کردار ہر شہر اور قصبے میں مل جاتے ہیں۔ مثلاً علامہ نادر صاحب شہرستانی کے جان لیوا مرض کا شکار ہیں یا مثلاً "گریجویٹ درویش" جو لاکھوں بے روزگار نوجوانوں کے صحیفۂ نفسیات کے اوراق کھول دیتا ہے یہاں وہ داستانی نثر کی پیروڈی سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہی کردار مزاحیہ مضمون 'نوکری کی تلاش' میں ہماری ہنسی اور ہمدردی دونوں کا مرکز بن جاتا ہے 'لوٹ پیچھے کی طرف' میں قاضی کا کردار بھی ہمارے معاشرہ کا جانا مانا

کردار ہے۔ اور پھر "ڈائرکٹر کا کتا"، اور "کالونی میں رہنا" جیسے مضامین میں ہندوستانی کلرک کی بڑی سوری اور ترشی تصویریں اُبھرتی ہیں۔ "ڈائرکٹر کا کتا" میں کلرک کی ذہنیت اور نوکرشاہی نظام کا جو مرقع پیش کیا گیا ہے اُردو میں وہ اپنی مثال آپ ہے۔

مجتبیٰ حسین اپنے مزاحیوں میں ایسی دلکشا فضا پیدا کر دیتے ہیں جس سے قاری اپنی ذات کو مانوس اور ہم آہنگ محسوس کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ مصنف ہنسانے کے لیے بے جا مبالغہ سے کام لے رہا ہے اس لیے وہ ہنستے ہنستے بھی اُس حقیقت کا اِدراک کر لیتا ہے جو مبالغہ کے پیچھے چھپی ہوتی ہے۔

مجتبیٰ حسین کی ایک خاص ٹیکنک یہ ہے کہ وہ مزاحیہ میں افسانوی اور ڈرامائی دونوں عناصر سے کام لیتے ہیں۔ واقعات لطیفوں اور پیکروں کا وہ ایک ایسا سلسلہ خلق کرتے ہیں جو قاری کی دلچسپی ایک پل کے لیے کم نہیں ہونے دیتا۔ صرف یہی نہیں وہ واقعاتی تسلسل میں تصادم اور کشمکش کے عناصر بھی پیدا کرتے ہیں۔ کلائمکس بھی تعمیر کرتے ہیں۔ اس کی سب سے موثر مثال "ڈائرکٹر کا کتا" ہے۔ اس میں کتے کو پکڑنے کے سلسلے میں کشمکش ہوتی ہے۔ ورماجی (کلرک) اور اکونٹنٹ نٹ راجن کے درمیان اور وہ اُس وقت منتہا کو پہنچتی ہے جب کتا سیکشن آفیسر کلکارنی کی میز سے ایک اہم فائیل مُنہ میں دبا کر فرار ہو جاتا ہے۔ اس ڈرامہ کا نہایت المناک انجام اُس وقت سامنے آتا ہے جب ورماجی اور نٹ راجن کی فائیلیں ڈائرکٹر کی میز سے واپس آتی ہیں اور پتہ چلتا ہے کہ نہ ورماجی کا پروموشن ہوا ہے اور نہ ہی نٹ راجن کرپشن کے الزامات سے بَری ہوا ہے۔ اس طرح دونوں کا باہمی تصادم ختم ہوتا ہے اور وہ گلے ملتے ہیں۔ اسی طرح کی تاثر آفریں کشمکش "ریل منتری مسافر بن گئے" "اردو کا آخری قاری"، اور دوسرے مزاحیوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ کہیں کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ جن واقعات سے وہ مضمون کا تانا بانا بنتے ہیں، وہ واقعات اپنے آپ میں بھرپور ڈرامائی اثرات کے حامل ہوتے ہیں۔ بیانیہ کی قوت ایسی محاکاتی ہوتی ہے کہ لگتا ہے ہم ڈرامہ کا ایک منظر دیکھ رہے ہیں مثلاً یہ واقعہ دیکھئے:

"ایک بار کا ذکر ہے کہ ہم ایک ڈاکٹر کے پاس پہنچے تو وہ حسبِ دستور گھوڑے پر سوار تھے۔ ہمارے جاتے ہی انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ہمارے مُنہ میں تھرمامیٹر ٹھونس دیا، نبض دیکھی، آنکھیں چیر کر دیکھ ڈالیں۔ جبڑوں کے نیچے غدود کو ٹٹولتے رہے۔ گردن کو جھٹکے دے دے کر ہلایا۔ بال پکڑ کر نوچ ڈالے۔ مُنہ پر طمانچہ رسید کیا۔ پھر گوشمالی کرنے لگے اور ہم ان ساری حرکتوں کے جواب میں تھرمامیٹر کو مُنہ میں پکڑے نہایت سعادت مندی کے ساتھ ان کے سامنے بیٹھے رہے پھر ڈاکٹر صاحب کے جی میں جانے کیا آئی کہ انھوں نے اچانک ہماری آستین اوپر چڑھائی اور بجلی کی سی سُرعت کے ساتھ انجکشن کی سرنج ہمارے ہاتھ میں دھنسا دی۔ ہم درد کے مارے مچل اٹھے۔ ہمارے مُنہ سے تھرمامیٹر گر پڑا اور ہم چیخنے لگے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے غصہ سے کہا "میاں اب چپ رہو کیا چھوٹے بچے ہو جو انجکشن کا درد بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ اُس پر ہم نے ڈاکٹر صاحب کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "مگر ڈاکٹر صاحب میری بات تو سُنئے۔ اصل میں مَیں بیمار نہیں ہوں بلکہ میں تو اپنے ماموں کے مرض کی کیفیت بیان کرنے آیا ہوں۔"

(ناز اٹھانے کو ہم رہ گئے ڈاکٹروں کے)

مجتبیٰ حسین مزاح پیدا کرنے کے لیے جہاں دوسرے حربے کام میں لاتے ہیں وہاں ان کا ایک منفرد اور آزمودہ حربہ ہے۔ "محکمہ جاتی رنگ" یا "پیشہ ورانہ رنگ" یعنی ان کے کردار جس پیشے سے تعلق رکھتے ہیں وہاں بھارت میں وہ اسی پیشہ سے تعلق رکھنے والی تشبیہات اور اظہارات کا استعمال کرتے ہیں مثلاً "نامہ بر والے" مضمون میں ایک افسانہ نگار جو پوسٹ مین ہے اپنے افسانے میں لکھتا ہے:

"... اور نجمہ اپنے بچے کو ایک کونے میں ڈھکیل کر یوں پیٹنے لگی جیسے کوئی پوسٹ مین خطوں پر مہریں لگا رہا ہو
نجمہ کا شوہر خالد دور کھڑا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا مگر وہ نجمہ کے غصہ کے آگے کچھ بھی نہ کر سکتا تھا... خالد کی حیثیت
تو ایک 'بے رنگ لفافہ' کی سی تھی کہ جو بیسہ دے اس کو وہی حاصل کرلے۔ نجمہ کے ہاں گزشتہ مہینہ ہی چوتھی
'ڈلیوری' ہوئی تھی۔ خالد ان "اکسپریس ڈلیوریوں" سے تنگ آچکا تھا۔ اس کی ساری خوشیاں اس کے دل کے
نہاں خانے میں یوں دبی پڑی تھیں جیسے "ڈیڈ لیٹر آفس" میں خطوط پڑے رہتے ہیں۔"

یہاں وہ مزاحیہ بھی قابل ذکر ہے جس میں ایک کلرک (مرزا صاحب) ہر کام پنڈنگ (PENDING) میں رکھنے میں مہارت رکھتے ہیں اور جو بھی کام کرتے ہیں وہ 'تھرو پراپر چیانل' کرتے ہیں یہاں تک کہ "اگر گھر میں ان کا سب سے چھوٹا بچہ شرارت کرتا تو اسے 'تھرو پراپر چیانل' مارنے کے لیے وہ پہلے اپنی بیوی کو پیٹتے پھر بڑے لڑکے کو اور علی الترتیب اپنی ساری اولاد کے گالوں پر طمانچے رسید کرتے ہوئے اپنے چھوٹے بچے کے گال تک پہنچتے تھے۔"

مجتبیٰ حسین اپنے مزاحیہ اور طنزیہ مضامین کا مواد اکثر اردگرد کی زندگی سے ہی اخذ کرتے ہیں۔ واقعہ نگاری میں ان کی شوخیِ طبع ایسی جزئیات کا انتخاب کرتی ہے اور ایسا مرقع ابھارتی ہے کہ قاری ہنسنے اور مسکرانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہاں انھوں نے پطرس کی ظریفانہ واقعہ نگاری سے فائدہ اٹھایا ہے اور کہیں کہیں رشید احمد صدیقی کی طرح شعر و ادب سے بھی اکتساب کیا ہے (مثلاً 'تکیہ کلام' اور 'ہم طرفدار ہیں غالب کے سخن فہم نہیں') لیکن اپنے اس منفرد اسلوب کے پہلو بہ پہلو انھوں نے فنطاسیہ (FANTACY) کے ذریعہ بھی طنز و مزاح پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں ان کے یہ مضامین خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ (۱) اردو کا آخری قاری (۲) شاعروں کی حکومت (۳) مرزا غالب کی پریس کانفرنس۔

ان مضامین میں طنز کا پہلو نمایاں ہے۔ 'اردو کا آخری قاری' میں مجتبیٰ حسین نے اردو زبان اور ادب کی پرآشوب صورت حال کے بارے میں ایسی باتیں اور اتنے موثر انداز سے کہی ہیں جو عالموں اور نقادوں سے ممکن نہیں تھا۔ 'شاعروں کی حکومت' صرف اردو شاعروں کے 'حال زار' پر طنز نہیں ہے بلکہ اس میں نام نہاد جمہوری حکومت کے نظام کو طنز و تضحیک کا نشانہ بنایا گیا ہے کوئی جماعت کس طرح اقتدار کو اپنے مفادات کا آلۂ کار بناتی ہے۔ اس سچائی کو مزاح نگار نے بڑے لطیف اور کارگر ڈھنگ سے جتایا ہے۔ یہ اقتباس دیکھئے:

"شاعروں کی حکومت نے ایک اور فیصلہ کے ذریعہ سماجی تقریبات میں 'مشاعروں' کو لازمی قرار دے دیا اور ہر ضلع اور تعلقہ کی سطح پر "صدر مشاعرہ" کے عہدے تشکیل دے دیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جگہ جگہ مشاعرے ہونے لگے۔ کسی کا چہلم ہوتا تو اس کے ساتھ مشاعرہ بھی ہوتا۔ کسی بچہ کی سالگرہ ہو تو مشاعرہ، کسی کا 'چھلہ' ہو تو مشاعرہ، کسی کی برسی ہو تو مشاعرہ، کسی کی منگنی ہو تو مشاعرہ۔ کہیں مشاعرہ ہو تو مشاعرہ۔ گویا ہر طرف مشاعرہ ہی مشاعرہ ہو گیا۔ تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ زندگی مشاعرہ در مشاعرہ گزرنے لگی۔ "عرض کیا ہے" "توجہ چاہتا ہوں" اور "مکرر ارشاد" تو گویا روزمرہ میں شامل ہو گئے۔ سماج کا ڈھانچہ ہی بدل گیا۔ شاعروں کو سرآنکھوں پر بٹھایا جانے لگا"

لیکن جب شاعروں کا اقتدار ختم ہو جاتا ہے تو سماج میں ان کی کیا حالت ہوتی ہے ذرا یہ بھی دیکھئے:

"ماضی کے حکمراں شاعر اب پھر سڑکوں پر نکل آئے ہیں۔ پہلے جو ٹھیک سے آپ کے سلام کا جواب تک نہیں دیتے تھے وہ آج آپ کو ایک میل کی دوری سے سلام کرتے نظر آتے ہیں۔ کسی کو شعر سنانا چاہتے ہیں تو وہ بے نیازی سے کہتا

ہے" میاں معاف کرو۔ اور آگے کا راستہ ناپو۔ اچھے خاصے ہٹے کٹے ہو شعر سناتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔ محنت کیوں نہیں کرتے۔"

مجتبیٰ حسین کے مزاحیوں کو جو وصف تخلیقی آب و رنگ بخشتا ہے وہ اظہار و بیان پر اُن کی قدرت اور مصورانہ صلاحیت ہے وہ ایسے جاندار لفظی پیکروں کی تخلیق کرتے ہیں جو قاری کے دل کو گدگداتے بھی ہیں اور اسے کسی معنی خیز حقیقت کا عرفان بھی بخشتے ہیں۔ اس سلسلہ میں موازنہ ان کا خاصہ حربہ ہے۔ وہ تشبیہ و استعارہ کا استعمال بڑے بے ساختہ اور برجستہ انداز سے کرتے ہیں:

"شام میں یہاں سائیکلیں پکڑنے اور پکڑوانے کا منظر بہت دلنشیں ہوتا ہے۔ پولیس کے سپاہی بلا قندیل سائیکلوں کو یوں پکڑتے ہیں جیسے ماہی گیر مچھلیوں کو پکڑتا ہے۔"

"پیچھے سے زندہ دلان حیدرآباد کی مزاحیہ موٹر کے اسٹارٹ ہونے کی بھیانک اور خطرناک آوازیں آنے لگیں، کبھی کانوں میں پٹاخے چھوٹنے لگے۔ کبھی بمباری کی آوازیں آنے لگیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ویٹ نام ہمارا تعاقب کر رہا ہو"

زبان کے تخلیقی استعمال میں مزاح نگار کو دوسرے ادیبوں کے مقابلے میں زیادہ آزادیاں حاصل ہوتی ہیں وہ من مانے ڈھنگ سے الفاظ اور محاوروں میں تصرف کرکے ایک نئی معنوی فضا پیدا کرسکتا ہے۔ کم سواد مزاح نگار اس میدان میں ٹھوکریں کھاتے ہیں لیکن مجتبیٰ حسین کے مزاحیوں میں یہی خوبی جان ڈال دیتی ہے۔ رعایت لفظی کی خوبصورت مثالوں کے ساتھ ساتھ محاورات میں تصرف کی بے شمار مثالیں بھی ان کے مزاحیوں میں بکھری ہوئی ہیں۔ صرف چند ملاحظہ کیجئے:

"اے ادب کے بے ادب گریجویٹ تو ہمارے نقار خانے میں اپنے طوطی کو بار بار بولنے پر کیوں مجبور کرتا ہے"

"میں آٹھوں پہر عشق کی آگ میں جلنے لگا۔"

"طلبا اپنے سر پر پاؤں اور پاؤں پر سر رکھ کر بھاگنے لگے۔"

"اس شعر کو سنتے ہی ہماری رگِ ظرافت پھڑک اٹھی اور ہم نے پہلے تو ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور ٹٹول کر ان کی دکھتی رگ پکڑلی۔"

"میں موٹر میں اونگھتے اونگھتے گھر پہنچ گیا۔ گھر پہنچ کر میں نے سارے گھوڑے بیچ دیئے اور سوگیا۔"

"پہلی نظر میں تو میں اس لڑکی پر ہزار جان سے عاشق ہوگیا لیکن دوسری نظر میں اس پر بمشکل پانچ سو جان سے عاشق ہوسکا۔"

خاکہ نگار کی حیثیت سے بھی مجتبیٰ حسین اپنی ایک الگ شناخت رکھتے ہیں۔ ظرافت چونکہ ان کے مزاج کی ایک مستقل کیفیت ہے اس لیے یہاں بھی مزاحیہ رنگ آمیزی ان کے خاکوں میں شگفتگی اور تازگی کے نئے پہلو پیدا کردیتی ہے لیکن یہ علٰحدہ موضوع ہے جس پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے ___ اردو میں اب مزاح نگاری کا قحط سا پڑ رہا ہے۔ فکر تونسوی اور احمد جمال پاشا کے بعد اردو میں دو چار ادیب ہی ایسے رہ گئے ہیں جو شائستہ لطیف اور معیاری مزاح نگاری کی قدرت رکھتے ہیں اور جن کے پاس کہنے کو بھی کچھ ہے۔ مجتبیٰ حسین اس میدان میں بڑوں کے نہ ہونے سے بڑے نہیں ہیں۔ انھیں قدرت نے بڑا مزاح نگار بننے کی صلاحیتوں سے بہرور کیا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی اور مجتبیٰ حسین میں اگر کوئی فاصلہ یا فرق ہے تو صرف زود نویسی کا ہے۔ یوسفی کا قول ہے کہ کبھی کبھی ایک جملہ لکھنے کے لیے وہ کئی کئی دن سوچتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین ایک ہی نشست میں ایک مزاحیہ مکمل کرلیتے ہیں اپنی اس 'خوبی' پر وہ جتنی جلد قابو پالیں اردو طنز و مزاح کے حق میں اتنا ہی اچھا ہوگا۔

▲▲

عمیق حنفی

جاپان چلو جاپان چلو!

ایسا نہیں ہے کہ ستمبر ۱۹۸۰ء کے پہلے جاپان کا وجود ہی نہ رہا ہو۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ اُردو والے جاپان کو جاننے کے لیے مجتبیٰ حسین کے منتظر رہے ہوں کہ کب وہ جاپان کا سفر اختیار کریں اور لوٹ کر سفرنامہ لکھیں اور جاپان اردو والوں کے ذہنی افق پر طلوع ہو۔ مزاح نگار مجتبیٰ حسین کے سفرنامے سے بہت بہت پہلے اردو کے مفکر اور سنجیدہ شاعر مشرق علامہ اقبال نے اپنے ایک مزاحیہ شعر میں جاپان کا ذکر کیا تھا۔

اپنی غفلت کی یہی حالت اگر قائم رہی ٭ آئیں گے غسال کابل سے کفن جاپان سے

طلوعِ آفتاب کا ملک جاپان، مکاڈو، ہیروہیتو کا اور دوسری عالمی جنگ کا مارشل ٹوجو کا دیس جاپان، ٹین، سیلولائڈ اور چابی کے کھلونوں اور پیاری پیاری گڑیوں کا بنانے والا جاپان، اٹم بم کی صورت میں سامراج اور سرمایہ داری کے جنون کا عذاب جھیلنے والا جاپان اور مشرق کی ہمت، حوصلے اور زندہ دلی کی مثال قائم کرنے والا اور فینکس کی طرح اپنی خاکستر سے پھر اٹھ آنے والا جاپان اردو والوں کی معلومات اور واقفیت کے دائرے سے باہر نہ تھا۔ اُردو والوں کو بھی کتابوں رسالوں، فلموں، اخباروں اور ریڈیو کے ذریعہ جاپان کی تقریب چائے نوشی کی سن گن تھی: اُمراؤ جان ادا کو مات کرنے والی گیشاؤں کی مبالغہ آمیز امیج ان کے ذہن میں بھی رقصاں تھی، ہائیکو کے تین مصرعوں کا جادو ان کے سر چڑھ کر بھی بول چکا تھا: دھیان کا زین بن کر بدھ مت کے ایک فرقے کا نام بن جانے کا چرچہ انھوں نے بھی سن رکھا تھا: نیشنل اسکول آف ڈرامہ نے کابکی تھیٹر کے تجربات کئے تھے جنھیں چاہے دیکھا نہ ہو ان کا تذکرہ اور ان پر تبصرہ پڑھ رکھا تھا۔ لیکن مجتبیٰ حسین نے علامہ اقبال کے اندیشۂ کفن کے بجائے بہت ہی دلآویز کمونو پیش کیا ہے۔ ان کا جو حق ہے ہم اسے مارنا نہیں چاہتے۔

ابنِ انشاء نے اپنی میر پرستی کی رو میں اپنے سفرنامۂ چین کا عنوان "چلتے ہو تو چین کو چلیے" رکھا تھا۔ ٹوکیو کے سفر کا تفصیلی ذکر بیگم اختر ریاض نے ایک مضمون کی صورت میں کیا تھا۔ بہرحال مجتبیٰ حسین کو سفرِ جاپان سے گدگدیاں، چائے کی چسکیاں اور اٹکھیلیاں بٹور کر لانے اور ہمیں بھی ان لذتوں اور ذائقوں میں شریک کرنے کے لیے داد تو دینی ہی پڑے گی۔ اُردو کے حوالے سے جاپان کی دریافت کرنے اور جاپان اور جاپانیوں کو اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بنائے بغیر اور بنا ان کی تضحیک و تمسخر کئے ہنسانے کے لیے ہمیں ان کا شکرگزار ہونا ہمارا اخلاقی فریضہ ہے۔

آج کل سیاسی طنز کے ذریعے مزاح پیدا کرنے کا چلن ہے اور کیوں نہ ہو کہ سیاست یا تو رُلاتی ہے یا ہنساتی ہے۔ مجتبیٰ حسین سیاست کی بیساکھی کے بغیر کامیابی اور کامرانی کے ساتھ ہنساتے ہیں اور ہنسی کے دھاروں سے بجلی کی ایک رو پیدا ہوتی ہے جو ریڑھ کی ہڈی سے ہوتی ہوئی دماغ میں پہنچتی ہے جہاں کئی قمقمے روشن ہو جاتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین کے مزاح کا سفر تکلف برطرف، قطع کلام، قصہ مختصر، بہرحال، بالآخر اور آدمی نامہ سے جاپان چلو جاپان چلو تک پھیلا ہوا ہے۔ کوئی شئے ہو، کوئی واقعہ ہو، کوئی خبر ہو، کوئی شخص ہو یا کوئی ملک ہو انھیں ہنسنے ہنسانے کے مواقع فراہم کر ہی دیتا ہے۔ سنجیدہ سے سنجیدہ اور کڑوے سے کڑوے نکتوں میں انھیں ایسے سو شئے نظر آجاتے ہیں جن میں خوش مزاجی اور زندہ دلی بھری ہوئی مل جاتی ہے اور وہ چٹکی بجاتے ہیں تو گدگدیاں اڑنے لگتی ہیں۔ تلخ سے تلخ حقیقت بھی مزاح کی شکر کے خول میں لپٹ کر اندر اُتر جاتی ہے اور کام و دہن بھی تلخ نہیں ہوتے مرحن کی الماری ہو، اہنسہ رتن کا خطاب پانے کی تقریب ہو، عمیق حنفی ہو یا ملک جاپان ہو، مجتبیٰ حسین کو جعفر زٹلی، ملّا دوپیازہ اور دادا لال بجھکڑ بنائے بغیر نہیں چھوڑتے۔ اُنھوں نے عمیق حنفی کا خاکہ اڑاتے ہوئے اپنے مطمح نظر کو اس طرح واضح کیا تھا۔ "رفتہ رفتہ مجھے ان سے مل کر خوشی ہونے لگی۔ میں یہ نہیں جانتا کہ انھیں بھی مجھ سے مل کر خوشی ہوتی ہے یا نہیں۔ یوں بھی آج کی دنیا میں خوشی کے معاملے میں آدمی کو خود غرض ہونا چاہیئے۔ دوسرے کی خوشی جائے بھاڑ میں، مجھے کیا لینا دینا۔"

مجتبیٰ حسین نے روا روی اور جذبے کے بہاؤ میں ایک ایسی بات کہہ دی جو درست نہیں ہے انھیں اپنی خوشی کے علاوہ دوسروں کی خوشی سے بھی لینا دینا رہتا ہے کیوں کہ ہنسانا ان کا مزاج ہی نہیں ان کا پیشہ بھی ہے۔

جاپان حسین ملک تو ہے ہی بڑا عجیب و غریب ملک ہے۔ بہت پرانی اور جاندار تہذیب کا ملک۔ اس کی اپنی معاشرت ہے، اپنی قدریں ہیں، اپنی معاشیات ہے۔ اس کا اپنا صنعتی اور تجارتی نظام ہے۔ روزمرہ کی زندگی کے اپنے آداب ہیں۔ مغربی لباس، مغربی سائنس اور ٹکنولوجی وغیرہ میں منتہی کا درجہ حاصل کرنے کے بعد ہر جاپانی وطن، قوم اور اس کی تہذیب پر نازاں ہے۔ جاپان کے رہنے والے بلا کے محنتی، نہایت ذہین اور بہت ہی کاروباری لوگ ہیں۔

مجتبیٰ حسین کا قیام جاپان میں ۳۵ دنوں کا ہی رہا۔ پھر بھی ان کے حساس دل اور بیدار دماغ نے جاپان اور جاپانیوں کی خوبیوں اور ہنرمندیوں کو چھانٹ چھانٹ کر ابھارا اور مشاہدات اور تجربات کو اپنی زبان میں اُتارا۔ اردو کی جماعت دکنی لہجے کی ملاحت اور اپنے مزاح کی ظرافت سے جاپان کو آشنا کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔

کرنل محمد خاں نے بجنگ آمد میں ایک فوجی کی زندگی کے تجربات اور اس کے اسفار کا بڑا ہی دلچسپ اور زندہ دلانہ خاکہ پیش کیا ہے۔ اپنی آپ بیتی ظریفانہ رنگ میں لکھی ہے۔ فوجیوں کے مخصوص مزاح کا نمونہ پیش کیا ہے۔ شفیق الرحمٰن نے سفر اندلس کا ذکر پُر لطف انداز میں کیا ہے لیکن مزاح کے دائرے میں نہیں۔ ہر چند کہ شفیق الرحمٰن اردو کے صفِ اول کے مزاح نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین بھی اپنے پیچھے آنے والوں کے لیے اگلی صف میں جگہ بناتے بناتے بھیڑ کے دھکے کھاتے کھاتے ہمارے مزاح نگاروں کی پہلی صف میں آ پہنچے ہیں۔ ان کا ایک اپنا اندازِ نظر ہے۔ اپنا طرز ہے۔ انھوں نے چٹکیاں لے لے کر گدگدی کر کر کے اور شگوفے چھوڑ چھوڑ کر اپنی انفرادیت بنائی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی قربت ہمیں اس انفرادیت کا احساس نہ ہونے دے۔ معلوم نہیں اپنے حیدرآبادی لہجے اور تلفظ کو انگریزی الفاظ پر انھوں نے

مزاح پیدا کرنے کے لیے جان بوجھ کر آزمایا ہے یا عادتاً۔ مثلاً BAG ان کے یہاں بیاگ ہے اور CALCULATOR ان کے لیے کیالکیولیٹر۔

جاپان کے لیے رخت سفر باندھنے سے پہلے جاپان کے بارے میں اپنی قیمتی معلومات سے اپنے افسر بالا کو مجتبیٰ حسین نے یوں مطلع کیا تھا:

"سنا ہے جاپان نے بہت ترقی کرلی ہے اور ترقی یافتہ ملکوں کا کوئی بھروسہ نہیں کب کدھر کو نکل جائیں۔ یوں بھی برِ اعظم ایشیا ہم جیسے ملنگوں کی سرزمین ہے جہاں پیٹ کی اہمیت کم اور روح کی زیادہ ہے۔ ہمیں غریبی میں تلم پیدا کرنے کی عادت سی ہوگئی ہے۔ ایسے براعظم میں جاپان کا کیا کام؟ اگر ہم سے جاپان کے بارے میں مزید کچھ پوچھیں تو اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ہم بہت چھوٹے تھے اور دوسری جنگ عظیم عروج پر تھی تو یوں لگتا تھا جیسے جاپان ہمارے گھر کے پچھواڑے میں واقع ہے ہمیں ہر دم بتایا جاتا تھا کہ جاپانی اب آنے ہی والے ہیں۔ جنگ ختم ہوگئی اور جاپان پھر اپنے جغرافیائی حدود میں واپس چلا گیا۔"

بہترین طنز وہ ہے جس کا ہدف طنز کرنے والا خود ہو۔ بہترین مزاح وہ ہے جس میں مزاح گویا مزاح نگار اپنا مذاق آپ اڑائے۔

مجتبیٰ نہایت ہلکے پھلکے ذہن سے اپنے وطن، اپنی سرزمین، اس کے لوگوں اور اس کے مناظر فطرت سے اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کرتے ہوئے ایسے لوگوں پر طنز کرتے ہیں جو چند دنوں کے لیے ولایت کیا ہو آتے ہیں، اپنے چاند سورج سے بھی انھیں نفرت ہو جاتی ہے۔

"ہم نے کچھ ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو دس دن کے لیے ہی سہی باہر کے کسی ملک میں جاکر آجاتے ہیں تو زندگی بھر اس ملک کے قصے اور وہ بھی من گھڑت قصے سنا کر اپنا اور اہل وطن کا وقت برباد کرتے ہیں۔ ۔ ۔ خدا نخواستہ جاپان کے دورے کے لیے ہمارا انتخاب ہوگیا تو اس ملک میں بقیہ زندگی کس طرح گزاریں گے!"

مجتبیٰ حسین ہوائی جہاز میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ تیز روشنی میں ان کی آنکھوں میں شرارت کی چمک کوئی دیکھ نہیں پارہا ہے۔ اور بے چارے مسافروں کو کیا خبر کہ ان کے درمیان کوئی ایسا بھی ہے جسے قہقہے جمع کرنے کی 'لت' پڑ گئی ہے۔ وہ ان کے عادات و اطوار، ہاؤ بھاؤ، حرکات و سکنات کو بھانپ رہا ہے۔ اگر کوئی غور کرتا تو مجتبیٰ حسین کو یا تو جاسوس سمجھ لیتا یا کسی بین الاقوامی جرائم پیشہ گروہ کا ایجنٹ۔ بہرحال مجتبیٰ کی آنکھیں اور ان کا ذہن تیزی سے کام کر رہا ہے۔ انھوں نے لیے دیئے رہنے والے، اپنی کھال میں مست، کم گو، خود پرست انگریز ہم سفر کی چپی میں مزاحیہ گوشے ڈھونڈ ہی لئے:

"قدرت کی کتاب کھل گئی تو ہم نے اپنی کتاب بند کردی اور لگے کھڑکی سے باہر جھانکنے۔ مگر انگریز بدستور اپنی کتاب میں ڈوبا رہا۔ جی میں آئی کہ اس سے کہیں کہ میاں ایک نظر ادھر بھی ڈالو۔ کیا حسین منظر ہے۔ تمہارا ایک شاعر گزرا ہے، ورڈسورتھ، وہ اگر آج ہمارا ہمسفر ہوتا تو ہمیں کھڑکی سے ہٹا کر ہماری جگہ خود بیٹھ جاتا۔ انجینئرنگ کی کتاب ہرگز نہ پڑھتا۔ تم ورڈسورتھ کو بھول گئے مگر ہم نہیں بھولے۔"

آخری فقرہ نہ صرف اس واقعے پر طنز ہے بلکہ اس کی بلاغت کا رشتہ ہماری غلامانہ ذہنیت سے ہے۔ مجتبیٰ حسین ایسے کئی پرتوں والے فقروں کا بھرپور استعمال کرتے ہیں۔

مزاح نگار غزل گو کی طرح صرف اجمال پر طائرانہ نگاہ ڈال کر خوش نہیں ہوتا۔ تفصیلات اور جزئیات کا احاطہ اس کے لیے نہایت ضروری ہے۔ مزاح ترتیب کی تبدیلی سے بھی پیدا ہوتا ہے۔ کسی بات کے واقعات یا کرداروں کے منطقی رشتے بدلنا

دیجیے یا سیدھی لکیر کو توڑ موڑ دیجیے باتوں کو اوپر نیچے، تہ وبالا کر دیجیے، لفظوں کے تعلق کو اُلٹ پلٹ دیجیے مزاح پیدا ہوجائے گا۔ دراصل کسی خلاف عادت بات یا تصویر پر یا تو ہنسی آتی ہے یا غصہ۔ دونوں اضطراری اعمال ہیں۔ دونوں فوری ردعمل سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہنسنے یا غصہ ہونے کے لیے کسی تیاری کی شرط نہیں۔

جاپانیوں کی زبان میں مہذب اور غیر مہذب کی تخصیص کا صیغہ ہماری عادت اور مزاج کے مطابق نہیں ہے۔ مہذب پانی اور غیر مہذب پانی میں تمیز کرنا ہمارے بس میں نہیں۔ جاپانیوں کے آداب بھی ہمارے لیے خلاف عادت ہیں۔ مثلاً مصافحے کے بجائے جھکے چلے جانا جتنی بار شکریہ ادا کرنا ہو اتنی ہی بار رکوع کرتے رہیے۔ چائے پینا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ ایک تہذیبی فریضہ ہے، ایک باقاعدہ رسم ہے۔ جاپانیوں کے آداب، رسم ورواج، تکلفات، لطافت، نزاکت، اور ثقافت کے تصورات سے مجتبیٰ حسین نے بغیر ان کا مذاق اڑائے مزاحیہ انداز میں ہمیں روشناس کرایا ہے۔ ان واقعات اور حالات کی سنجیدگی اور بردباری کو وہ خود جھیل گئے اور ان کے ہلکے پھلکے کو ہمارے سپرد کر دیا۔ ایک اضطراری عمل کو منصوبہ بند صورت دے کر بھی ان کی انگلیوں سے گدگدی پیدا کرنے کا ان کا ارادہ ظاہر ہوتا ہے۔

مجتبیٰ حسین نے توازن کے علاوہ تقابل کے طریقے سے بھی مزاح پیدا کیا ہے۔ کیسے کیسے تیر ان کے ترکش میں تھے۔ نمسکار کرنے کی ادا کی دلکشی ایسی کہ

خونِ زخم آہواں رہبر کند صیاد را

مجتبیٰ کا انداز کچھ اتنا پیارا ہے کہ ان کا ہدف بھی آہ آہ کے بجائے واہ واہ کرتا ہے۔

گالیاں کھا کے بدمزہ نہ ہوا

اب دیکھئے ایک جاپانی کسٹمس کلرک سے سابقہ پڑا ہے۔ کسٹمس والا کسی بیدری ورک کو دیکھ کر حیران ہو رہا ہے۔ آخر وہ کالی سی چیز کسی دھات سے بنی ہوئی ہے۔؟

"ہم نے اپنا سینہ پھُلا کر کہا "ایسی چیزیں بنانا تو ہم ہندوستانیوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ دھات سیاہ رنگ کی کیسے بن گئی تو بھیّا یہ ہمارا "ٹریڈ سیکریٹ" ہے۔ اگر آپ کو بتا دیں تو ہماری کیا انفرادیت رہ جائے گی۔ ہم نے بیدری سامان میں اس کی گہری دلچسپی کو دیکھ کر ایک ایش ٹرے اس کی خدمت میں پیش کرنے کی کوشش کی مگر اس نے لینے سے صاف انکار کر دیا۔ بہت سمجھایا کہ یہ تحفہ ہے اور ہمارے یہاں کسٹم آفیسروں کو تحفہ پیش کرنے کا رواج عام ہی نہیں لازمی مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ بھی لیجیے، وہ بولا جیسی آپ کی انفرادیت ہے ویسی ہماری بھی انفرادیت ہے؟"

یہ بات بار بار جگہ جگہ متاثر کرتی ہے کہ مجتبیٰ حسین ایسے سینکڑوں مواقع ضائع کر دیتے ہیں جن سے زبردست قہقہے برآمد کئے جا سکتے تھے لیکن جاپان یا جاپانیوں کی قیمت پر۔ وہ اپنے موضوع کی عزت آبرو اور ناموس پر حرف نہیں آنے دیتے بلکہ طنزِ معکوس سے کام لے کر اپنے آپ کو ہدف اور سرچشمہ بناتے ہیں:

"جاپانیوں کی ہر چیز چھوٹی ہوتی ہے سوائے کردار کے۔ ہم جس ہوٹل میں ٹھہرے ہیں خود اس کا حال سن لیجیے کہ جب ہم اپنے کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ اس میں ہر سہولت حاصل ہے۔ ٹیلی ویژن ہے، ٹیلی فون ہے، کمرے سے ملحق باتھ روم بھی ہے، باتھ روم میں نہانے کا ٹب بھی موجود ہے۔ پھر پورا کمرہ ایئر کنڈیشنڈ بھی ہے۔ اس میں لکھنے پڑھنے کے لیے ایک چھوٹی میز بھی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ایک کرسی بھی موجود ہے۔ بس تکلیف یہ ہے کہ جب ہم صبح اٹھ کر اپنے

بستر میں بھرپور انگڑائی لیتے ہیں (جس کی عادت ہمیں برسوں سے ہے) تو ہماری انگڑائی کبھی ٹیلی وژن سے ٹکرا جاتی ہے اور کبھی اس انگڑائی میں ٹیلی فون اٹک جاتا ہے۔"

مجتبیٰ حسین کے مزاج کی ہندوستانیت ان کی وہم پرستی کی شکل میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ مجتبیٰ توہم پرست نہیں ہیں لیکن ڈرامہ پیدا کرنے کے لیے انھوں نے توہم پرست ہونے کا کردار اپنے لیے پسند کیا ہے۔

"مسز آسانو نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ مسٹر حسین عجیب بات ہے کہ ابن انشا بھی سنگترے کے رس میں کالی مرچ اور نمک ملایا کرتے تھے۔ کیا اردو میں مزاح نگاری کرنے کے لیے سنگترے کے رس میں کالی مرچ اور نمک ملانا ضروری ہوتا ہے؟ ہم نے کہا۔ مسز آسانو! کہاں ابن انشا اور کہاں ہم مجھ میں اور ان میں ایک قدرِ مشترک یہی ہے کہ ان کی طرح ہم بھی سنگترے کے رس میں کالی مرچ اور نمک ملایا کرتے ہیں۔ اس کے سوا ہمیں کچھ نہیں آتا۔ ابن انشا اپنی تحریروں میں جتنا نمک مرچ ملاتے تھے وہ گُر ہمیں نہیں آتا۔ مسز آسانو پھر یادوں میں کھو گئیں اور بولیں۔ شاید آپ کو پتہ نہیں۔ ابن انشا پہلے پہل ٹوکیو ہی میں بیمار ہوئے تھے۔ یہیں ان کا میڈیکل چک اَپ ہوا تھا۔ پھر وہ یہاں سے گئے تو ایسے کہ کبھی نہیں آئے۔ مسز آسانو کی اس بات سے ہم اس قدر خوفزدہ ہوئے کہ ٹوکیو میں جب کبھی ہمارے سامنے سنگترے کا رس آیا تو اس میں کبھی نمک نہیں ملایا۔"

ہندوستانی اور جاپانی مزاجوں اور کرداروں کے تقابل و توازن سے مجتبیٰ حسین نے بہت کام لیا ہے لیکن ہر جگہ ان کی نیت پرخلوص اور اُبھری رہی ہے۔ ایک جگہ قدیم عمارتوں پر اپنا نام لکھ۔ یا کھود آنے والوں پر بڑا بھرپور طنز ہے جو مزاح کی چاشنی سے بھرا ہوا ہے۔

"ہم نے کہا بی بی حیدرآباد میں اپنی زندگی کے بیس برس گزارنے کے باوجود آج تک ہم چار مینار پر نہ جا سکے۔ اب آپ کی خاطر جائیں گے۔ مگر یہ آپ کو اپنا نام وہاں لکھنے کی کیا سوجھی۔ اب ہم بھی اپنا نام جوا! پہلے آپ کے ٹوکیو ٹاور پر اردو رسم خط میں لکھ کر جائیں گے۔ بولیں۔ جاپان میں یہ آپ نہ کر سکیں گے کیونکہ ہمارے ہاں تاریخی عمارتوں کو تصنیف و تالیف کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا۔ آپ کے ہاں تو یہ رواج ہے کہ جہاں کہیں کوئی تاریخی عمارت دیکھی اس پر اپنا نام لکھ دیا۔ میں نے بھی چار مینار پر اپنا نام اس لیے لکھا تھا کہ وہاں چار۔ پانچ اصحاب پہلے ہی سے اپنے ناموں کو کندہ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا کہ شاید آپ کے ہاں ایسا کرنے کا دستور ہے۔"

جاپانی اپنی کاٹھی اور چہرے مہرے کی وجہ سے سدا بہار لگتے ہیں۔ ان کی عمر بری طرح چھپی رہتی ہے۔ لکھتے ہیں:

"جاپانیوں کی عمر کا اندازہ لگانا بہت دشوار ہوتا ہے۔ ہم اپنی مترجم ساکوادا کے بارے میں یہ سمجھتے تھے کہ موصوفہ غیر شادی شدہ ہوں گی۔ جب شناسائی بڑھی تو پہلے یہ پتہ چلا کہ موصوفہ دوسری جنگِ عظیم میں ٹوکیو میں موجود تھیں۔ بعد میں ایک بار وہ ہمیں اپنے گھر لے گئیں تو دیکھا کہ گھر میں ان ہی کی عمر کی ان کی ایک بیٹی اور دو بیٹے موجود ہیں۔ جاپانی بہت عمر چور ہوتے ہیں اس لیے آدمی کو بہت محتاط رہنا چاہیے۔"

مجتبیٰ حسین کو جاپان میں جاپانیوں سے زیادہ سابقہ پڑا اور انھیں ان کی عمر کے بارے میں بڑے تلخ تجربے ہوئے۔ اسی لیے انھوں نے آنے والی نسلوں اور بس آ رہ دگان کے لیے نقوشِ قدم چھوڑ دیئے کہ وہ دھوکا نہ کھائیں۔

مجتبیٰ حسین نے جاپان میں اردو ہندی جاننے والوں کے حقیقت پسندانہ اور ادبی نقطۂ نگاہ کو سراہا ہے بظاہر جاپانیوں کا رویہ اردو اور ہندی کے لیے بہت فراخدلی اور وسیع المشربی کا لگتا ہے۔

مسٹر اناہارا بولے۔ "قبلہ یہ ہندی اردو کے جھگڑے تو آپ کے ملک کو مبارک ہوں ہمیں ان جھگڑوں سے کیا لینا دینا۔ دونوں زبانوں کی گرامر تقریباً یکساں ہے۔ تھوڑی سی سنسکرت اور تھوڑی سی فارسی عربی کو سیکھ کر ہم حسب موقع آپ کی اردو اور ہندی دونوں زبانوں پہ ہاتھ صاف کر لیتے ہیں۔ ہم جاپانی کاروباری آدمی ٹھہرے۔ ایک تیر سے دو شکار کرنے کی ہمیں عادت ہے۔ جاپان میں جو آدمی ہندی جانتا ہے وہ اردو بھی جانتا ہے اور جو اردو جانتا ہے وہ ہندی بھی جانتا ہے۔

مجتبیٰ حسین کی شوخیٔ مزاج نے جاپان کی YEN_CURRENCY کی قدر وقیمت کا اندازہ جس طرح پیش کیا ہے وہ بھی انھیں کا حق ہے۔ پھر اپنے آپ کو ہدف بنایا ہے۔

" غرض لکھ پتی بننے کی خوشی میں پہلی ہی رات کو ہم نے ایک دوست کو کھانے پر بلایا۔ ہم نے ایک جاپانی ریستوراں میں ذرا جم کے کھانا کھایا۔ جم کے کھانے سے مراد یہ ہے کہ مرغ کا گوشت منگوایا اور ساتھ میں مچھلیاں بھی منگوائیں سگرٹ کا رس تو ہر کوئی منگواتا ہی ہے۔ بل آیا تو پتہ چلا کہ ہم پانچ ہزار YEN کی بھاری رقم سے محروم ہو گئے ہیں۔ بھتہ چونکہ پندرہ دنوں کا تھا اس لیے ہم نے مستقبل کے سارے ناشتوں، لنچوں اور ڈنروں کا متوقع حساب جوڑا تو احساس ہوا کہ اگر اسی رفتار سے ہم ٹوکیو میں کھانا کھاتے رہے تو جملہ ۱۵ دنوں کے قیام میں ہمیں آخری سات دن بھوکوں مرنا پڑے گا۔"

جاپان کی بلیٹ ٹرین میں سفر کرنے سے بھی مجتبیٰ باز نہ آئے۔ اس سفر کے دوران میں وہ خاص طور سے عالمِ محویت میں رہے ہیں۔ اس سفر کے تجربے کے جبر کا اندازہ لگائیے جس نے مزاح نگار کو فلسفی بنا دیا۔

"انسان جب از سرِ نو جینے کا اہتمام کرتا ہے تو بربادیوں کے نشان خود بخود مٹ جاتے ہیں۔"

ایسے جملے پڑھ کر مزاح نگار کی امیج بدلنے لگتی ہے۔ محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس کی انگلیاں گدگدانے کے بجائے سر کھجانے لگیں اور کسی جوگی نے بھبھوت ملے ہوئے چہرے پر دو آنکھیں جھٹکے کے ساتھ کھولیں اور دھیان کے سمندر سے سیپیاں نکال کر شیر یا ہرن کی کھال پر سجا دیں۔ جاپان میں مجتبیٰ حسین ہندوستان کے خیال سے غافل نہ ہوئے۔ بلٹ ٹرین کے سفر کے اختتام پر مسٹر تاجما سے ان کا مکالمہ سنئے:

" مسٹر تاجما۔ آپ ہندوستان کی ٹرینوں میں سفر کر چکے ہیں۔ ہماری ٹرینوں میں جو سہولتیں ہوتی ہیں وہ آپ کے ہاں کہاں۔ وہ سفر ہی کیا جس میں آدمی کو دھکے نہ لگیں۔ ہم نے تین گھنٹے آپ کی ٹرین میں سفر کیا۔ کسی نے ہمارے سر پہ صندوق نہیں رکھا۔ کسی کا ہولڈال ہمارے پاؤں پر نہیں گرا۔ کسی مسافر نے نشست کے لیے دوسرے مسافر سے لڑائی نہ لڑی اور پھر وہ اسٹیشن پر "چائے لو چائے" "پان بیڑی سگریٹ" والی مانوس آوازیں سنائی نہیں دیں۔ بھلا یہ بھی کوئی ٹرین کا سفر ہے۔ تاجما نے شرم کے مارے نظریں نیچی کر لیں بولے۔ "آپ ٹھیک کہتے ہیں، ہمیں آپ سے بہت سیکھنا ہے۔ یوں بھی جاپان سے ہندوستان کا کیا مقابلہ۔ ہمارا ملک چھوٹا ہے اور آپ کا ملک عظیم۔ اور تاجما کی یہ بات سن کر ہمارا سر فخر سے اونچا ہو گیا۔"

مجتبیٰ حسین نے باتوں باتوں میں بتایا کہ جاپانی ہنسی مذاق میں اور فقرہ بازی میں وقت ضائع نہیں کرتے وہ کام کرتے رہتے ہیں یا کتابیں پڑھتے رہتے ہیں یا ناٹک بھلا یا ٹی وی دیکھتے ہیں۔ مجتبیٰ نے کسی جاپانی مزاح نگار کا ذکر بھی نہیں کیا۔ جاپانیوں میں شے لطیف یا حسِ مزاح ہوتی بھی ہے۔ اس کا اندازہ بھی مجتبیٰ حسین کی تحریر و تقریر سے نہیں ہوا۔

جاپان کی تقریب چائے نوشی سارے عالم میں مشہور ہے۔ اس تقریب کی تفصیل اگر کسی کو معلوم نہ ہو تو وہ کہے گا کہ چائے پارٹی جیسی کوئی چیز ہوگی۔ TEA-CEREMONY جاپان کی ایک تہذیبی تقریب ہے، بڑی سنجیدہ بڑی مقدس۔ مجتبیٰ بھی اس تقریب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے:

"اس تقریب کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کی عزت کرنا سیکھیں۔ ایک خاتون نے چائے بنانے اور اسے پیش کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ چائے پیش کرنے والی ایک خاص ادا سے آپ کے سامنے چائے کا پیالہ رکھی ہے اور زمین بوس ہو جاتی ہے۔ . . ۔ چائے کی تقریب میں شرکت کرنے اور چائے پینے کے خاص آداب ہوتے ہیں جن سے ٹانگوں میں خاصا درد ہوتا ہے۔"

مجتبیٰ حسین نے جاپان کو اپنی مخصوص عینک سے دیکھا۔ اپنے اس قیام سے نکالے ہوئے نتائج خالی از دلچسپی نہیں ہیں۔

"جاپان بڑا غریب اور مفلوک الحال ملک ہے۔ جاپانیوں کے پاس نہ وسائل ہیں نہ معدنیات کے ذخائر۔ کوئی خام مال ان کے پاس نہیں۔ زراعت بھی ایسی ہے کہ اپنا پیٹ بھر سکیں۔ جاپان کے غریب باشندے سارا خام مال دوسرے ممالک سے درآمد کرتے ہیں۔ ان کا کمال صرف اتنا ہے کہ اس خام مال سے دنیا جہان کی چیزیں بناتے ہیں اور دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں کو پریشان کرتے ہیں۔ جاپانیوں کے پاس ایک ہی قابلِ قدر شے ہے اور وہ ہے ان کا کردار۔ ہم اکثر سوچتے ہیں کہ یہ جو ہم جاپانی گھڑیوں، ٹرانزسٹروں، موٹروں، کیمروں اور ٹیلی وژن سیٹوں کو اپنے ملک میں قانونی اور غیر قانونی طور پر درآمد کرنے میں لگے ہوئے ہیں تو یہ غلط بات ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ کسی طرح جاپانیوں کے کردار کو درآمد کریں۔"

مجتبیٰ حسین کا طنز یہاں مزاح کی چاشنی میں تار پیدا نہیں کرتا ہمارے کردار کی خامیوں پر وار کرتا ہے۔

مجتبیٰ حسین کی شوخیٔ طبع، شرارت اور لطیفہ بازیوں نے تھائی لینڈ کی مندوبہ مس پرینیا کا برا حال کر رکھا تھا۔ وہ بھی اس قدر گھل مل گئی تھیں کہ سنجیدہ مذاکروں کے دوران میں بھی پرزوں پر فقرے بازی کرنے سے باز نہیں آتی تھیں اور ہمارا مزاح نگار بھی اپنی ظرافت کی انگلیوں سے گدگدائے بغیر چین نہیں پاتا تھا۔ مس پرینیا نے بڑا اٹھلاتا ہوا اعتراف کیا ہے۔

YOU NAUGHTY MAN, YOU MAKE ME GO TO TOILET TO LAUGH AT YOUR-
-FUNNY REMARKS.

ہم نہیں جانتے کہ مس پرینیا سے ہمارے مزاح نگار کا ربط ضبط کتنا تھا اور نہ یہ کہ ان کے بار بار TOILET میں جانے کا سبب ہنسی ضبط نہ کر پانا تھا یا اور کچھ۔ لیکن اتنا خوف ضرور ہوتا ہے کہ اگر کسی اُردو کے محقق کے ہاتھ یہ سفرنامہ پڑ گیا تو وہ مزاح اور TOILET کے حصے کو ضرور ڈھونڈ نکالے گا۔ بہرحال ہم مجتبیٰ حسین کی فقرے بازی اور مزاح نگاری سے محظوظ ہونے کے لیے TOILET کے محتاج نہیں ہیں۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ مجتبیٰ حسین کے سفرنامے میں فنِ اُردو اور انگریزی دونوں کے ہجوں میں موجود ہے۔ جاپان جیسے نستعلیق ملک کو نسخ میں تبدیل کر دینا اور اس کا سفرنامہ خطِ شکست میں لکھنا کوئی معمولی بات نہیں اور وہ بھی اس طرح کہ بے نقطہ نہ ہو پائے۔ جاپان کو کانا بھی نہیں بنایا اور اس کی آن بان اور شان پر حرف بھی نہ آنے دیا۔

سفرنامہ پڑھ کر یہی دعا لب پر آتی ہے کہ اللہ ہم سب کو NCERT میں ایڈیٹر بنا دے تاکہ ہم بھی جاپان سے لوٹ کر نعرہ لگا سکیں کہ جاپان چلو جاپان چلو۔ کسی غیر ملک کی دوست داری کا یہی تقاضہ تھا کہ اس کی تہذیب اس کی قدریں اور اس کا کردار ترغیبی انداز سے سامنے آئے۔ کتاب کی اشاعت ہم سب کو مبارک!

■ □

پروفیسر شمیم حنفی

آدمی نامہ
ایک جائزہ

مجتبیٰ حسین کی تحریروں میں مزاح اور سنجیدگی کے روایتی فرق سے لاتعلقی کا بہت خاموش اظہار سب سے زیادہ اُن کے شخصی خاکوں میں ہوا ہے۔ وہ مزاح اور سنجیدگی کے فرق سے نہ تو باضابطہ انکار کرتے ہیں نہ ہی اس سلسلے میں کسی طرح کی فلسفیانہ موشگافی سے کام لیتے ہیں۔ مگر اُن کا کوئی بھی خاکہ اٹھا لیجے، اُسے پڑھتے پڑھتے آپ کہاں، کس نقطے پر مزاح سے نکل کر سنجیدگی کے حدود میں داخل ہو گئے، اس کا احساس آپ کو اُس وقت ہوتا ہے جب اچانک آپ کا اپنے ردِ عمل میں تبدیلی کی طرف دھیان چلا جائے۔

ایسا نہیں کہ مجتبیٰ حسین رسمی نوعیت کے مزاح نگاروں سے یکسر مختلف ہیں۔ فقرے بازی، لطیفہ سازی، زبان کے پینتروں، بظاہر سیدھی سادی انسانی صورتحال میں مضحک، بے ڈول اور عجیب الوضع زاویوں کی تلاش سے مجتبیٰ حسین نے بھی بہت کام لیا ہے۔ یہ سب کے سب مزاح نگاروں کے آزمودہ بلکہ فرسودہ نسخے ہیں۔ اور ان پر ضرورت سے زیادہ انحصار کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ بعض مزاح نگاروں کے یہاں مزاح کا "عنصر" بس سُنے سنائے لطیفوں یا زبان و بیان کے فرسودہ ہتھکنڈوں کے استعمال تک ہے۔ اُردو میں مزاح کی مجموعی صورتحال ایسی نہیں جو کسی بھی لحاظ سے قابلِ قدر اور تشفی بخش کہی جا سکے، خاص طور پر ہندوستان میں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ہمارے بیشتر مزاح نگاروں کی ہر کوشش یا تو بہت مصنوعی CONTRIVED اور ازکار رفتہ ہوتی ہے یا پھر اتنی عام اور مانوس کہ اس پر کسی نئے شگفتہ لمحے کے انکشاف کا کوئی گمان نہیں ہوتا۔ اردو کے زیادہ تر مزاح نگار صرف محدود معنوں میں مزاح نگار بنے رہنے پر قانع دکھائی دیتے ہیں۔ وہ مزاح کو کبھی سنجیدہ اور متین اور ملال آمیز فکر کے کسی موثر حربے کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ آر کے لکشمن نے ایک گفتگو میں کہا تھا کہ ہندوستان کے اکثر کارٹون سازوں کی خرابی یہی ہے کہ وہ مضحکہ خیز ہیئتوں اور مسخرے پن کے ساتھ بنائی گئی شکلوں کو کارٹون کا بدل سمجھ بیٹھتے ہیں۔ اپنی خوش طبعی کے اظہار میں اُن کا یقین اتنا پختہ ہوتا ہے کہ وہ اسی کو اپنے کارٹونسٹ ہونے کی دلیل کے طور پر برتنے لگتے ہیں اور کبھی بڑے، زیادہ معنی خیز، زیادہ وسیع PERSPECTIVE کی تلاش نہیں کرتے۔

مجتبیٰ حسین کے کئی خاکوں کو پڑھتے یا سنتے وقت مجھے اپنے احساسات میں ایک حلاوت آمیز ابتری کا ادر

دھڑکنوں کی رفتار میں تیزی کا تجربہ ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ مجتبیٰ حسین بے تکلف اور بے ساختہ انداز میں کسی شخصیت کا خاکہ باندھتے باندھتے اچانک سنجیدہ ہو جاتے ہیں اور تجزیے کی اُن حدوں میں جا پہنچتے ہیں جو ہمارے مزاح نگاروں کی اکثریت کے لیے ممنوعہ علاقے کی حیثیت رکھتی ہے۔ کبھی کبھی تو مجتبیٰ حسین کے خاکوں میں قہقہوں اور آنسوؤں کی تمیز بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ تبسم کے پردے میں ایک گہرے افسوس کو چھپانے کی وہ مستقل کوشش کر رہے ہیں اور اپنے قاری کو ماورائے بیان جانے کی دعوت دے رہے ہیں۔

مجتبیٰ حسین کے خاکوں کی کتاب "آدمی نامہ" کے عنوان سے بھی افراد کی طرف اُن کے بنیادی رویّے پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ کتاب کے ابتدائیے (دو باتیں) میں اُن کا یہ اعلان شامل ہے کہ "میں نے یہ خاکے کسی کے حق میں یا خلاف بالکل نہیں لکھے۔ جس طرح دل و دماغ نے کسی شخصیت کو قبول کیا، اسے ہو بہو کاغذ پر منتقل کر دیا۔ یہ اور بات ہے کہ خاکے میں خاکہ نگار کا زاویۂ نگاہ بھی در آتا ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ خاکہ نگار جب کسی شخصیت کا خاکہ لکھتا ہے تو وہ انجانے طور پر خود اپنا خاکہ بھی لکھ ڈالتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ میں نے یہ سارے خاکے خود اپنا خاکہ لکھنے کی چاٹ میں لکھے ہیں۔" اگرچہ یہاں بھی ہنسی ہنسی میں مجتبیٰ حسین ایک گہرے رمز کی طرف اشارہ کر گئے ہیں، لیکن اُن کی خاکہ نگاری کے مسائل بس اُس ایک رمز تک محدود نہیں کہ دوسروں کے بہانے لکھنے والا آپ اپنی ہستی سے بھی کچھ پردے اُٹھا دیتا ہے، یہ تو شاید افراد کے بارے میں اظہار کا ایک مسلّمہ اصول بلکہ اٹل قانون بن چکا ہے کہ جب ہم دوسروں کی بات کرتے ہیں تو بالواسطہ طور پر ہماری اپنی شخصیت بھی کھلتی جاتی ہے۔ فرد کی اپنی ہستی کا مفہوم دوسرے افراد کی ہستی کے سیاق میں ہی متعین ہوتا ہے۔ یہاں میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ خاکوں کی اس کتاب کا نام بھی خاکہ نگار کی بنیادی سرشت، گرد و پیش کی دنیا اور دیکھے بھالے افراد کی طرف اُسی کے رویّے انسانی رشتوں اور رفاقتوں کے تئیں اُس کی فکر بلکہ اس کی مجموعی اخلاقیات، ان سب کی تفہیم میں ہماری مدد کرتا ہے۔ اس نام (آدمی نامہ) کی حیثیت ایک معروف و مانوس استعارے کی ہے جس کے معنی مقرر ہو چکے ہیں۔ ایک سلجھا اُلجھا محاورہ یا سوچا ہوا استعارہ جس کے مفہوم کا تعین نظیر اکبرآبادی نے کر دیا تھا۔ اپنی اس بے مثال نظم میں نظیر نے اندھیرے اور اُجالے، نیکی اور بدی، خیر اور شر۔ غرض کہ موجودات کی دنیا کے متضاد مظاہر کو ایک سے تماشے کی صورت میں دیکھا تھا۔ انسانیت آدمی کا جوہر ہے، اُس کا وجود نہیں۔ آدمی کا وجود تو اس کے بس آدمی ہونے سے عبارت ہے۔ محرومی اور کامرانی، خرابی اور خوبی کا ایک عجیب و غریب مجموعہ۔ نظیر نے اپنی نظم آدمی نامہ میں آدمی کو عناصر کی اُسی سطح پر دیکھنے اور سمجھنے کی جستجو کی، یہی جو اُس کی بنیادی سطح ہے۔ جہاں وہ طرح طرح کے متضاد تجربوں سے گزرتا ہے۔ ایک ناقابل تقسیم وحدت کے طور پر اُس کی اچھائیاں اور برائیاں اس کی فتوحات اور ہزیمتیں یکساں طور پر اُسے منکشف کرتی رہتی ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آدمی کا اصل سفر ایک تسلسل ہے، بیک وقت سیاہ بھی ہے اور سفید بھی۔ پتہ نہیں مجتبیٰ حسین کے ذہن میں اپنی اس کتاب کا یہ نام کسی اتفاق کا نتیجہ ہے یا سوچے سمجھے انتخاب کا۔ واقعہ جو بھی ہو، یہ بات صاف ہے کہ اُن تمام کرداروں کی طرف جو مجتبیٰ حسین کی توجہ کا نشانہ بنے ہیں، خود مجتبیٰ حسین کا رویہ بھی بڑی حد تک نظیر سے مماثل ہے۔ یہاں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ مجتبیٰ حسین کے انتہائی دلچسپ خاکوں کو بھی مختلف شخصیات کے کارٹونوں سے تعبیر کرنا غلط ہوگا کیونکہ کارٹون سازی بہر حال ایک منفی اور تضحیک آمیز عمل ہے۔ اگر کسی کارٹون کا مقصد متعلقہ شخصیت کی مداحی یا اس کے کسی کارنامے کا بیان ہو تو پھر اُس مقصد میں اور پروپیگنڈے میں زیادہ فاصلہ نہیں رہ جائیگا۔ اسی طرح مجتبیٰ حسین نے بعض خاکوں میں غیر ضروری رواداری اور رسمی [illegible] سے کام لیا ہے ......

، لیکن یہ خاکے بھی روایتی قسم کے نثری قصیدوں سے کچھ مختلف ضرور ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی کتاب میں خواجہ عبدالغفور، نریندر لوتھر اور حسن الدین احمد کے خاکے۔ البتہ اس رسمی مروّت کا نتیجہ یہ تو ہونا ہی تھا کہ ان خاکوں میں مجتبیٰ حسین کے کامیاب خاکوں کی خوبیاں دب کر رہ جائیں سو ان خاکوں میں مجتبیٰ حسین بھی غیر دلچسپ دکھائی دیتے ہیں۔ اور ان کے موضوعات بھی۔ اس کے برعکس راجندر سنگھ بیدی، مخدوم، عمیق حنفی اور باقی کے خاکے اپنے بسیط (COMPREHENSIVE) زاویۂ نظر، اپنے ذہانت آمیز تجزیے اور شخصیات کے اوصاف اور خامیوں کی یکساں قبولیت کے سبب بہت جاندار اور متحرک نظر آتے ہیں۔ اُن میں اول الذکر خاکوں جیسے ادھورے پن کا احساس نہیں ہوتا اور ان سے شخصیات کی بہت مفصل نہ سہی، مگر ایک جامع تصویر اُبھرتی ہے۔ ان میں مجتبیٰ حسین کی بصیرت بھی پڑھنے والے کو متاثر کرتی ہے اور اُن کا مشاہدہ بھی، اُن کا مزاح بھی اور اُن کی متانت بھی۔ مثلاً —

"اُن کی ذات "جھٹپٹے کا وقت" ہے۔ برسات کے موسم میں آپ نے کبھی یہ منظر دیکھا ہوگا کہ ایک طرف تو ہلکی سی پھوار پڑ رہی ہے اور دوسری طرف آسمان پر دھلا دھلایا سورج چھما چھم چمک رہا ہے۔ اس منظر کو اپنے ذہن میں تازہ کر لیجئے تو سمجھئے کہ آپ اس منظر میں نہیں، بیدی صاحب کی شخصیت میں دور تک چلے گئے ہیں۔ ان کی ذات میں ہر دم سورج اسی طرح چمکتا ہے اور اسی طرح ہلکی سی پھوار پڑ رہی ہوتی ہے۔"

[راجندر سنگھ بیدی — سو ہے وہ بھی آدمی]

"مخدوم ایک انسان نہیں تھے، جیتا جاگتا سانس لیتا ہوا شہر تھے۔ اس شہر کی ہم نے برسوں سیر کی۔ ہم سب اسی شہر میں آباد تھے۔ اس شہر میں کتنی سڑکیں تھیں۔ کتنی گلیاں تھیں۔ کتنے موڑ تھے۔ اور یہ سب راستے انسانیت اور سچائی کی طرف جاتے تھے۔"

[مخدوم محی الدین — یادوں میں بسا آدمی]

"اُن کی تصویر کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا جیسے آپ جزیرہ نمائے عرب کے نقشے کو دیکھ رہے ہوں۔ بلکہ غور سے دیکھا جائے تو اس میں کہیں کہیں عرب کا صحرا بھی صاف دکھائی دیتا ہے۔ بالکل سپاٹ سا چٹانی اور کرخت چہرہ۔ ویسے اب بھی عمیق حنفی کے چہرے کے اس صحرا میں نخلستان کے اُگ آنے کے باوجود آپ ان کے چہرے کو دیکھیں تو نہ جانے کیوں جزیرہ عرب کا خیال آجاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ داڑھی کے بغیر اُن کا چہرہ عرب کے جغرافیے سے قریب تھا اور اب داڑھی کے بعد یہ عرب کی تاریخ اور تمدن سے قریب ہو گیا ہے۔"

[عمیق حنفی — آدمی در آدمی]

"تعارف کے بعد قسمت میں اُن سے مصافحہ کرنا تو لکھا ہی تھا۔ مگر اُنھوں نے مجھ سے کچھ اس طرح مصافحہ کیا جیسے بجلی کے تار کو چھونے جا رہے ہوں۔ ایک سکنڈ میں مصافحہ کے نام پر وہ مجھے چھو کر یوں چلے گئے جیسے واش بیسن میں اُنھیں اپنے ہاتھوں کو دھونے کی جلدی ہو۔ وہ اپنی اُن چھوٹی چھوٹی ٹانگوں کی مدد سے، جو بڑی مشکل سے زمین تک پہنچ رہی تھیں، تیز تیز چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔" [ایضاً]

"اصل میں باقی کے اندر جو شاعر بیٹھا ہوا ہے، وہ ہر دم اپنی گردن اکڑائے رکھنا چاہتا ہے۔ چاہے ایسا کرنے سے اُس کی گردن میں درد ہی کیوں نہ ہونے لگے۔ باقی کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ اب واٹ کا لرڈ شاعر بھی پیدا ہونے لگے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ اردو غزل میں مقطع کی ایجاد صرف اس لیے ہوئی تھی کہ شاعر اس میں حسبِ استطاعت اپنی تعریف و توصیف کرے۔ لیکن باقی اپنی تعریف کے لیے مقطع کو ناکافی سمجھتے ہیں ؎

کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لیے

اسی لیے وہ عام نثری بات چیت میں بھی ہر دم مقطع ہی کہتے رہتے ہیں۔"

[باقی ـــ نو آدمیوں کا آدمی]

ان اقتباسات میں مجتبیٰ حسین ایک عام فوٹو گرافر کے بجائے ایک ایسے مصوّر سے مماثل ہیں جو اپنا مخصوص رنگ رکھتا ہے۔ جو شوخ اور سنجیدہ شیڈس، تیز تیکھے اور مدھم خطوط سے ایک ساتھ کام لیتا ہے، جس کا مقصد اپنے مزاح سے لوگوں کو صرف محظوظ کرنا ہی نہیں، لوگوں کی بصیرت اور اپنی بصیرت میں ایک ربط قائم کرنا بھی ہے۔ اور یہ سارا عمل مجتبیٰ حسین کے یہاں اتنا خاموش اور نیچرل ہوتا ہے کہ اُن پر کسی انہونے یا بہ ظاہر غیر معمولی ولنعے کا گمان تک نہیں ہوتا۔ یہ میں نے شروع میں ہی عرض کیا تھا کہ مجتبیٰ حسین کی تحریر کا ایک قابلِ لحاظ وصف اُس کی بے ساختگی اور اُس کا فطری بہاؤ ہے۔ اردو سے گرا نیار تحریر چاہے نثر و نظم کی کسی بھی صنف میں چل جائے مگر مزاح اور طنز کی سطح پر ایسی کوئی تحریر، دو چار قدم کی دوری بھی، پڑھنے والے کو بیزار کیے بغیر نہیں طے کر سکتی۔ ایسا نہیں کہ مجتبیٰ حسین اردو کی گرفت میں کبھی آتے ہی نہیں۔ اس ضمن میں، ایک بڑا خطرہ جو وہ اکثر مول لیتے رہتے ہیں مصرعہ طرح پر غزل کہنے کا ہے۔ میرا خیال ہے کہ زیبائش کا جبر کسی بھی نیچرل لکھنے والے کے لیے ایک سخت آزمائش ہے۔ اس آزمائش کی تکمیل میں اسے خواہ اپنی مشاقی کے بل بوتے پر بظاہر کامیابی بھی مل جائے، مگر یہ کامیابی بہت دیر تک ساتھ نہیں دیتی۔ خاص طور پر مزاح اور اسٹیریو ٹائپ میں تو اولیٰ بیر ہے۔ اردو کے اکثر مزاح نگار بالآخر اسی مرض کا شکار ہوئے۔

مجتبیٰ حسین کے بعض خاکوں میں ایک ہلکی سی پرچھائیں، کہیں کہیں، تکرار کی دکھائی دیتی ہے۔ مگر ان کے لہجے میں بے تکلفی اور ان کے تاثر کی رفتار میں تیزی اتنی ہے کہ وہ اس پرچھائیں کو رکاوٹ بننے نہیں دیتے۔ یہ محض اتفاق کی بات نہیں کہ اردو میں سب سے اچھے فن کے ان ادیبوں نے لکھے ہیں جن کے خاکوں کی تعداد بہت مختصر ہے۔ احمد ندیم نے تو خیر چار پانچ ہی خاکوں میں اس صنف کو زیر کر لیا۔ اُن کے علاوہ حامد جلال کا ایک خاکہ (منٹو پر) اور عصمت چغتائی کا بھی ایک ہی خاکہ (عظیم بیگ چغتائی پر) خاکہ نگاری کی روایت کے ناقابلِ فراموش واقعات کی حیثیت رکھتا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے اپنے بیشتر خاکوں میں مزاح کے بجائے اصل کام بہت سنبھلی ہوئی شگفتہ طبعی سے لیا ہے۔ مزاح کے جا و بے جا استعمال کا بوجھ مزاح نگار تو برداشت کر سکتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ موضوع بننے والی شخصیت بھی اس بوجھ کو سہار جائے۔ غور کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ مزاح نگاروں کے لکھے ہوئے خاکے بالعموم (GRAFFITI) بن کر رہ جاتے ہیں۔ اس طرح مزاح کا موضوع بننے والی شخصیت کے بے ڈول اور بے جوڑ خدوخال تو سامنے آ جاتے ہیں، مگر شخصیت [illegible] ہو جاتی ہے۔ ایسا شاید اس لیے ہے کہ مزاح لکھنے والوں میں اکثر [illegible]

ضرورت سے زیادہ خود نگر ہوتے ہیں اور اپنے فرض منصبی کی طرف سے پل بھر کے لیے بھی بے دھیان نہیں ہونے پاتے۔ مجتبیٰ حسین کے خاکوں کی یہ خوبی بھی بہت اہم ہے کہ ان میں بہ حیثیت "دوسرے کے بیان سے ان کے اپنے بیان" کا پہلو بھی نکلتا رہتا ہے۔ لیکن دوسروں کی ذات کو سمجھنے کے لیے وہ نہ تو اپنی ذات کو پیمانہ بناتے ہیں، نہ ہی اپنے کارِ منصبی (مزاح نگاری) سے اس درجے مغلوب ہوتے ہیں کہ اُن کی بنائی ہوئی قلمی تصویر، تصویر کی پیروڈی بن جائے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، مجتبیٰ حسین اپنے خاکوں میں حسبِ ضرورت مزاح اور سنجیدگی، دونوں سے کام لیتے ہیں اور وہ بھی اس مشاقی اور سہولت کے ساتھ کہ دونوں میں کہیں ٹکراؤ نہیں ہوتا۔

اس کتاب "آدمی نامہ" میں کم سے کم ایک خاکہ (ابراہیم جلیس کا) ایسا ہے جو تمام و کمال جذبے کی متانت اور گہرائی۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ احساسات پر ایسے زبردست کنٹرول کا پتہ دیتا ہے جس کی توقع کم سے کم کسی عام مزاح نگار سے نہیں کی جا سکتی۔ مزاح نگار اگر رسمیت کا مارا ہوا اور پیشہ ورانہ عادتوں کا شکار نہیں، تو اُس کی طبیعت کے گداز اور اُس کے ملال کی سچائی کا مقابلہ اچھے بھلے سنجیدہ لوگ ذرا مشکل ہی سے کر سکیں گے۔ مجتبیٰ حسین نے اپنے کئی خاکوں کی وساطت سے، ہمیں بالواسطہ طور پر اس حقیقت کی راہ بھی دکھائی ہے۔

۵۷

ساحر ہوشیارپوری

جاپان چلو
جاپان چلو ..... وغیرہ وغیرہ

ادارۂ زندہ دلانِ حیدرآباد ۱۹۸۷ء میں سلور جوبلی منا رہا ہے۔ حسنِ اتفاق سے مشہور و مقبول مزاح نگار مجتبیٰ حسین کے ادبی سفر کا بھی یہ پچیسواں سال ہے۔ اور ایسے اتصال کو قرآن السعدین کہا جاتا ہے۔ چنانچہ شگوفہ کے مدیر محترم اس موقع پر مجتبیٰ حسین نمبر شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

میں مزاح نویس تو کجا ناقد بھی نہیں ہوں کہ عزیز مجتبیٰ کی مزاح نگاری کے بارے میں اظہارِ خیال کر سکوں۔ ان کے متعلق صرف اتنا لکھ دیتا کہ وہ اعلیٰ پایہ کے مزاح نگار ہیں اور زیر اشاعت نمبر نکالنے پر مبارکباد کے پیغام 'یوں تو اس کی پذیرائی کے لئے دعائیہ جملے لکھ دینے سے بات بنتی نہیں۔ ہاں شاعر ہونے سے مجھے انکار نہیں، لیکن مدحیہ اشعار کو قارئین طرفداری پر محمول کریں گے اور ہجو کا اطلاق مجتبیٰ کی تحریروں پر قطعی ہوتا نہیں۔ پھر کیا کیا جائے۔ تین چار برس ہوئے کہ مجتبیٰ حسین نے مجھے اپنی ایک کتاب " جاپان چلو، جاپان چلو " عنایت فرمائی تھی۔ (حالانکہ اس سے پہلے وہ کئی کتابیں چھاپ چکے ہیں، جن کی ایک جھلک دیکھنے کو میں آج تک ترس رہا ہوں)۔ جسے میں تین چار بار پڑھ چکا ہوں۔ پہلی بار اس کا مطالعہ کیا تو بہت لطف آیا۔ دوسری اور تیسری بار اس کو اس لئے پڑھا گیا کہ قندِ مکرر بلکہ سہ مکرر سے محظوظ ہو لیا جائے۔ اور چوتھی بار اس خیال سے اس کو پڑھنا شروع کیا تھا کہ شائد کبھی جاپان جانے کا موقع نصیب ہوا تو یہ رہنمائی کا کام دے گی۔ لیکن ابھی چند ابتدائی صفحات ہی پڑھ پایا تھا کہ ایک باذوق دوست مستعار لے گئے اور مسلسل تقاضوں کے بعد جب یہ کتاب واپس ملی تو ہر صفحہ پر بے شمار سرخ روشنائی کی لکیریں جلوہ افروز تھیں۔ اللہ جانے یہ اُن کے اظہارِ توصیف و ستائش کی مظہر تھیں یا تنقیص و تحقیر کی نشانیاں۔ کتاب کی اس ہیئت کذائی نے مجھے چوتھی بار اس کے مطالعے سے محروم کر دیا۔

ان کا یہ سفرنامہ "جاپان چلو جاپان چلو" مختلف وجوہ سے صرف سفرنامہ ہی نہیں کارنامہ بھی ہے۔ اور ان کی اس کتاب کے شگفتہ اندازِ تحریر پر ؎

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

کا صحیح اطلاق بھی ہوتا ہے۔ یہ سفرنامہ ایک امتیازی شان کا حامل ہے اور اس کی خوبیوں کی فہرست کچھ اس طرح ترتیب دی جاسکتی ہے۔

(۱) اس کا سرورق شہرۂ آفاق مصور صادقین کے موقلم کا عمدہ نمونہ ہے۔

(۲) اس کے "جملہ حقوق محفوظ ہیں" لیکن کس کے حق میں، اس کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

(۳) یہ کتاب مجتبیٰ حسین کے ایک گلابی رنگ کے اسکیچ سے مزین ہے۔ حالانکہ یہ اُن کا اصلی رنگ نہیں۔ تصویر بنانے والے کا یہ کمال قابلِ داد ہے کہ اس میں مجتبیٰ حسین اپنے چہرے مہرے اور چشمے سمیت خود جاپانی دکھائی دیتے ہیں۔ تصویر میں دو مختلف دستخط جاپانی املا کے نادر نمونے ہیں۔ البتہ تاریخ انگریزی ہندسوں میں ہے۔

(۴) اس سفرنامے میں جاپان کا ذکر عنصرِ غالب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور خود مجتبیٰ حسین مغلوب نظر آتے ہیں۔

(۵) اس سفرنامے میں سچی باتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ حاشیہ آرائی کا فقدان ہے۔ لیکن سچ کے ساتھ ساتھ دروغ گوئی کا سہارا بھی لیا گیا ہے۔ مثلاً جاپان سے تحائف لانے کا ذکر گول مول الفاظ میں بیان کیا گیا ہے مثلاً اپنی شعر فہمی کی دھاک جمانے کے لئے مشہور زمانہ شعر ؎

وہ آئے بزم میں اتنا تو میرؔ نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

کو میرؔ ہی کا شعر بتایا گیا ہے۔ حالانکہ احمد ندیم قاسمی سمیت کئی نقادوں نے اس کو "الحاقی" قرار دیا ہے۔ اور یہ شعر میرؔ کے دیوان میں موجود بھی نہیں۔ مثلاً۔ ایک ریسٹورنٹ میں "لڈوں" کو بھنے ہوئے لذیذ بادام سمجھ کر وہ شکم سیر ہو چکے۔ بعد میں جب معلوم ہوا تو باتھ روم میں جاکر اسے معدے سے نکال باہر کیا۔ یہ دروغ گوئی کی بہترین مثال ہے۔ بھلا معدے میں چلے جانے کے بعد محض انگلیوں کے اشارے سے بھی کوئی شئے برآمد کی جاسکتی ہے۔

اَب ان محولہ بالا خوبیوں کی سلسلہ وار وضاحت کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مجتبیٰ حسین کے بارے میں بھی کچھ کہا جائے۔

کوئی بیس بائیس برس قبل مخمور سعیدی کے ایک شعری مجموعے کی رسم رونمائی کی تقریب میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ اور اس کے بعد ہزاروں ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ جلوت میں بھی اور خلوت میں بھی۔ وہ مشرقی تہذیب و آداب کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ دِلّی میں پنجابیوں، بہاریوں، سندھیوں، اُتر پردیشیوں، مدھیہ پردیشیوں، بنگالیوں، آسامیوں، حتیٰ کہ دلی والوں کی صحبت میں اتنے برس گذار کر بھی اُن کی اپنی پہچان بطور حیدرآبادی جوں کی توں قائم ہے۔ اندازِ گفتگو نہایت سنجیدہ ہے۔ لیکن مضمون لکھیں گے تو مزاحیہ۔ اُن کی محبوب صنف نگارش خاکہ نگاری ہے۔ اُن کے خاکوں میں انواع و اقسام کے رنگ ملتے ہیں۔ لیکن مروت کا رنگ، خلوص کا رنگ، اور وفا کا رنگ اُن کو دیگر

خاکہ نگاروں سے ممیز کرتا ہے۔ مزاح نگاری میں وہ طنز کا نشتر تو فرور چبھوتے ہیں لیکن ایسا نہیں کہ جگر کے پار ہو جائے۔ وہ اپنے موضوع سے انصاف بھی کرتے ہیں اور ایمان داری بھی برتتے ہیں۔ وہ خاکہ لکھتے ہیں، خاکہ کھینچتے ہیں، لیکن خاک افشانی نہیں کرتے۔ یہ ایک بڑا ہنر ہے۔ اور "تا نہ بخشد خدائے بخشندہ" والی بات ہے۔

آج کل پکی ملیشن کا زمانہ ہے، افسانہ نگاروں اور شاعروں میں پکی ملیشن بہت زوروں پر ہے۔ لیکن مزاح نگاروں میں بھی پکی ملیشن چل نکلا ہے۔ یہ مقامِ شکر اور مقامِ عبرت ہے کہ مجتبیٰ حسین اس میں سب سے آگے ہیں۔ وہ سالارِ کارواں ہیں۔ اور دوسرے وہ دل آزادی سے حتی الوسع پرہیز اور گریز کرتے ہیں اور اس کوشش میں اپنی اعلمی پر بھی پردہ ڈالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ آٹھ دس برس قبل ایک نجی صحبت میں انہوں نے مجھ سے سوال کیا۔ آپ کی پہلی تخلیق کب اور کس رسالے میں شائع ہوئی۔ میں نے جواب دیا کہ میری پہلی نظم "اصطخر" کے عنوان سے 'ادبی دنیا' لاہور میں ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ سنتے ہی پھڑک اٹھے۔ کہنے لگے سبحان اللہ اصطخر، واہ اصطخر، کیا کہنے اصطخر! میرا جی خوش ہو گیا کہ ایسے ذی علم، ذی شعور اور ذی فہم دوست کی رفاقت میسر ہوئی ہے کہ جو اصطخر کی تاریخی اہمیت سے بھی واقف ہے۔ لیکن صاحبو مقامِ حیرت و عبرت ہے کہ اس دس برس کی طویل مدت میں وہ مختلف حضرات سے اصطخر کے معنی پوچھتے رہے۔ لغات کھنگالتے رہے اور کامیاب نہ ہو سکے لیکن مجھ سے جب بھی ملے اپنا بھرم قائم رکھا۔ اور میری خوشنودی اور دل دہی کے لئے ہمیشہ اصطخر کی تعریف میں رطب اللسان رہے۔

مجتبیٰ حسین بظاہر بھولے بھالے اور مودب قسم کے انسان نظر آتے ہیں لیکن ان کے اندر کا حال اللہ جانتا ہے یا وہ خود ایک روز کہنے لگے۔ "ساحر بھائی دلی میں بہت کچھ دیکھا ہے۔ شاعروں، افسانہ نگاروں، ادیبوں، نقادوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ لیکن کسی "دانشور" کے دیدار نصیب نہیں ہوئے۔"

میں نے کہا "چلئے۔ دلی میں اتنی یونیورسٹیاں ہیں۔ ان میں پڑھانے والے اتنے سارے پروفیسر اور ڈاکٹر ہیں۔ کیا یہ دانشوروں کے زمرے میں نہیں آتے؟"

کہنے لگے۔ "آپ کسی سے ملا دیجئے، تو ممنون رہوں گا۔"

چنانچہ میں وقت مقرر کر کے مجتبیٰ حسین کو ایک پروفیسر کے دولت کدے پر لے گیا۔ وہ اپنے اسٹڈی روم میں ہمارے منتظر تھے۔ نہایت خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ ہماری خاطر مدارت میں کوئی کمی نہ رکھی۔ ڈیڑھ، دو گھنٹے مختلف ادبی مسائل پر گفتگو رہی۔ وہاں سے رخصت ہوئے۔ تو کہنے لگے "یہ دانشور ہیں کیا؟"

میں اُن کا منہ تکنے لگا اور عرض کیا۔ "مجتبیٰ بھائی۔ کیا اُن کی گفتگو دانشوری پر مبنی نہیں تھی۔ کیا اُن کی شیلفوں میں رکھی ہوئی ڈھیر ساری کتابیں (جن میں سے تین مختلف کتابیں آپ کے حسبِ پسند آپ کو بھی پیش کی گئی ہیں) اُن کی تصانیف نہیں ہیں۔ کیا ہندوستان اور دنیا بھر کے ممالک میں اردو کے سیمناروں اور ادبی اجتماعوں میں اُن کی شرکت اس بات کا ثبوت نہیں کہ اُن کو دانشور سمجھا جاتا ہے۔ کیا مختلف انجمنوں، اکاڈمیوں اور ادبی تنظیموں نے جو اُن کو اعزازات و انعامات سے نوازا ہے، وہ اُن کی دانشوری کا اعتراف نہیں؟"

اس پر مجتبیٰ حسین، مسکرائے اور کہا۔ "بھائی ساحر دانشور کی صحیح تعریف تو یہ ہے کہ اُسے کسی ایک فن پر مکمل دسترس اور عبور حاصل ہو۔ اور دیگر فنونِ لطیفہ کے بارے میں بھی کلی یا جزوی طور پر معلومات رکھتا ہو۔ اور اس کے اس تجزیۂ علم و عمل سے عوام و خواص بہرہ مند ہو سکیں، لیکن یہاں تو معاملہ صرف زبان، زبان، زبان ہی کا تھا۔ اور وہ جو ڈھیر ساری کتابیں

کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ وہ طبع زاد نہیں۔ یہ کتابیں تصنیف اور تخلیق کے زمرے میں نہیں آتیں۔ یہ تو محض تالیف ہیں۔ مختلف موضوعات پر سیمناروں اور ادبی جلسوں میں مقررین نے مقالے پڑھے۔ انھوں نے اُن کو یکجا کر دیا۔ ایک پیش لفظ لکھ دیا۔ اور کتاب چھپ گئی۔ رہا معاملہ ہندوستان اور دیگر ممالک میں منعقد ہونے والے سیمناروں میں مدعو کئے جانے کا تو "یہ من ترا ملا بگویم تو مرا حاجی بگو" کے ذیل میں آتا ہے۔ دانشور تو ارسطو تھا۔ افلاطون تھا، عمر خیام تھا۔ آج کل کے یہ پروفیسران تو اُن کی گرد کو نہیں پہنچتے۔

مجتبیٰ حسین کے ان خیالات کو سُن کر مجھے یہ نتیجہ اخذ کرنا پڑا ہے کہ وہ روزمرہ کی زندگی میں جس قدر بھولے بھالے نظر آتے ہیں، وہ محض ایک خول ہے۔

آج کل وہ اُردو املا والے جناب رشید حسن خاں سے بہت بے زار نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے علم میں اضافہ کرنے کی خاطر یہ کتاب کہیں سے لے آئے۔ اس میں اُن کی یہ غرض بھی شامل تھی کہ اُن کی نئی کتاب اشاعت پذیر ہو۔ تو اس میں املا کی غلطیاں نہ رہ جائیں۔ چنانچہ کتاب کا مطالعہ کرتے کرتے جب وہ لفظ "مجتبیٰ" تک پہنچے تو ہوش و حواس، ذوق و شوق، غور و فکر ــــ میں کرختگی محسوس کرنے لگے۔ یا اللہ یہ کیا؟ رشید حسن خاں نے ہماری جنس ہی تبدیل کر کے رکھ دی۔ وہ بہ ضد ہیں کہ "مجتبیٰ" کو "مجتبا" لکھا جائے۔ ہماری "ی" کو "الف" سے بدل دیا۔ اس نام ور محقق نے! اس تبدیلیِ جنس پر وہ نالاں بھی ہیں۔ اور اس کوشش میں دن رات ایک کر رہے ہیں کہ رشید حسن خاں کا خاکہ لکھ کر اُن کی اس حرکت کا بدلہ لیا جائے۔

حضرات! سفرنامہ "جاپان چلو، جاپان چلو" کی خوبیوں کی وضاحت کرنے کا منصوبہ تو دھرا رہ گیا۔ اور مجتبیٰ حسین کے متعلق بھی جو کچھ میں لکھنا چاہتا تھا۔ وہ مکمل طور پر بیان نہیں کر سکتا۔ درحقیقت یہ دونوں موضوع بسط و تشریح کے محتاج ہیں۔ لہٰذا مزید تفاصیل کو کسی آئندہ صحبت کے لئے ملتوی کر رہا ہوں۔ یہ چند سطور جو لکھ دی ہیں۔ ان کو بطورِ "اعتذار" قبول فرمائیے۔

ڈاکٹر مظفر حنفی

مجتبیٰ حسین ــــــ بحیثیت خاکہ نگار

اردو ادب میں فنکاروں کو ایک مخصوص زاویئے سے محدود صفات کی روشنی میں دیکھنے کی روش عام ہے جس کے نتیجے میں اکثر شاعروں اور ادیبوں کے دوسرے کارنامے تاریکی میں جا پڑتے ہیں اور ہم اُن کے ساتھ پورا پورا انصاف نہیں کر پاتے۔ سوداؔ کا قصیدہ اور انیسؔ کا مرثیہ اتنا مشہور ہوا کہ دونوں کی غزل تک صحیح معنوں میں ناقدین کی رسائی نہ ہو سکی۔ حالیؔ کی شاعری کے اصلاحی پہلو اور فیضؔ کی ترقی پسند کا نقارہ اتنی زوروں سے بجا کر ان کا جمالیاتی رُخ پسِ پشت جا پڑا۔ مجتبیٰ حسین کے مختلف مجموعے پڑھ کر احساس ہوا کہ یہ حضرت جن پر صرف مزاح نگاری کا الزام ہے، ایک اہم خاکہ نگار بھی ہیں لیکن چونکہ ان کے ہاں مزاحیہ مضامین کی تعداد شخصی خاکوں سے زیادہ ہے اس لیے معیار کے مقابلے میں مقدار کو زیادہ اہمیت دیتے ہوئے ہم انھیں ایک اچھا مزاح نگار کہہ کر مطمئن ہو لیتے ہیں۔ خطرہ یہ ہے کہ کہیں مجتبیٰ بھی کثرتِ رائے سے مطمئن نہ ہو جائیں اور ہمارے ہاتھ سے ایک عمدہ خاکہ نگار نہ جاتا رہے۔

بے شک اُردو نثر میں مزاح نگاروں کی کمی ہے لیکن خاکہ نگار ان سے بھی کم ہیں۔ بوالہوسوں کو شمار میں نہ لیجئے تو مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، شاہد احمد دہلوی، منٹو اور محمد طفیل جیسے چند ناموں کے بعد خاکہ نگاروں کی تلاش میں ہمیں محققین سے معاونت طلب کرنی پڑتی ہے۔ فنکار کی ایک خاص امیج بنا کر اس کے ساتھ کچھ روایات منسوب کر دینے کے لاکھ فائدے ہوں لیکن ایک بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ لکھنے والا اپنی اسی مقبول عام امیج کو برقرار رکھنے کے لیے ان مخصوص و محدود روایات کا اسیر ہو جاتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مجتبیٰ حسین ایک اچھے مزاح نگار ہیں لیکن ان کی خاکہ نگاری بھی کچھ کم اہمیت کی حامل نہیں ہے۔

ہر چند کہ طنز و مزاح میں چولی دامن کا رشتہ ہے اور طنز ایسی خطرناک کلہاڑی ہے جو اکثر اپنے ہی پاؤں پر پڑتی ہے لیکن مجتبیٰ حسین کے مزاحیہ مضامین اُن کے شخصی خاکوں کے مقابلے میں بے ضرر معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ ان میں طنز کا استعمال مزاح کی چاشنی کے ساتھ ہے اور اس طنز میں ایسی عمومیت ہے کہ قاری اس کی ضرب دوسروں پر ڈھال کر خوش ہو سکتا ہے۔ شخصی خاکوں کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہاں ایک جیتی جاگتی شخصیت کے خدوخال واضح کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اُسے فرشتہ نہیں انسان کے روپ میں پیش کیا جائے اور خوبیوں اور خامیوں کے امتزاج سے اس کے انفرادی نقوش واضح کیے جائیں اب اگر لکھنے والا ضرورت سے زیادہ لچک دار رویّہ اپناتا ہے تو خاکہ اس تصویر کی مانند ہو جاتا ہے

جو صاحبِ تصویر کی نہ ہو، دوسری جانب غیر متوازن حقیقت پسندی خاکے کو سپاٹ بھی کر دیتی ہے اور آبگینوں کو ٹھیس پہنچاتی ہے چنانچہ ایک کامیاب کیریکٹر اسکیچ تمہید سے اور ہجو کے درمیان سے کشید کیا جاتا ہے، ذرا قدم ڈگمگائے کہ جوش، شاہد احمد دہلوی سے ناراض ہو جاتے ہیں یا حالی پر سرسید کے ڈفالی ہونے کا الزام منڈھ دیا جاتا ہے۔

مجتبیٰ عام زندگی میں جتنے سادہ لوح ہیں خاکہ نگاری میں اتنے ہی چالاک۔ مدح بالذم اور تنقیص نما توصیف کے ایسے ایسے گر انھیں یاد ہیں کہ وہ آپ کے منہ پر بات کہہ جائیں اور کئی دن بعد آپ پر یہ عقدہ کھلے کہ حضرت نے آپ کی کسی خوبی نہیں خامی کو اجاگر کیا تھا۔ دراصل فی البدیہہ مزاحیہ مضامین لکھ لکھ کر وہ اتنے چابکدست ہو گئے ہیں کہ جب اُن کا چابک ممدوح پر پڑتا ہے تو وہ اسے سمندِ شوق پر تازیانہ تصور کرتا ہے۔ اس باب میں وہ کسی کے ساتھ مروّت روا نہیں رکھتے۔ لطف یہ ہے کہ بحیثیت مزاح نگار کسی شخصیت کے ناہموار پہلو پہلی ہی نگاہ میں اُن پر منکشف ہو جاتے ہیں۔ اور وہ کوشش یہ کرتے ہیں کہ ان کا قاری بھی پہلی نظر میں ہی متعلقہ شخصیت کی ناہمواری سے واقف ہو جائے۔ یہ مہم وہ بڑی معصومیت کے ساتھ خاکے کے عنوان کی مدد سے سر کرتے ہیں۔

عنوانات کچھ اس طرح واقع ہوئے ہیں :

اُردو شاعری کے ٹیڈی بوائے ــــ حکیم یوسف حسین خاں

ظ انصاری سے ظ انصاری تک

کھویا ہوا آدمی ــــ سلام مچھلی شہری

پتھر کا آدمی ــــ عزیز قیسی

آخری شریف آدمی ــــ عبادت چند کھنّہ

بھیڑ کا آدمی ــــ نکر تونسوی

مجتبیٰ سُنی سنائی کے قائل نہیں ہیں اور عام طور پر اُسی شخصیت پر قلم اُٹھاتے ہیں جسے کباب سیخ کی طرح گھما پھرا کر دیکھ چکے ہوتے ہیں۔ تاحال اُن کے جو خاکے میری نگاہ سے گزرے ہیں یہ سب ایسی شخصیتوں کو اُجاگر کرتے ہیں جن سے مجتبیٰ حسین کے بہت قریبی تعلقات رہے ہیں۔ یہ قربت انھیں ایسے بازہائے دروں پردہ سے آگاہ کرتی ہے جن کے ذکر سے خاکوں میں زندہ رنگ اُبھرتا ہے، مثلاً سلام مچھلی شہری کے بارے میں بہت سے لطیفے سُنانے کے بعد لکھتے ہیں:

"پدم شری کیا ہوتا ہے۔ ۔ ۔ سلام صاحب اپنی ماں کو سمجھاتے ہیں ــــ ماں یہ تو صرف ایک اعزاز ہے اس سے صرف میری عزّت میں اضافہ ہوگا ــــ اور ماں کہتی ہیں ــــ اتنی ساری عزّت لے کر تو کیا کرے گا اب ذرا دولت کی فکر کر تاکہ اپنی بچیوں کے ہاتھ پیلے کر سکے۔"

نکر تونسوی کی پہچان ایک صاحب کے ماموں کے بیان سے ان الفاظ کے توسط سے واضح کرتے ہیں :۔

"میاں کہیں وہ صاحب تو نکر تونسوی نہیں ہیں جو ہر روز صبح میں ملک ڈپو سے پاؤ لیٹر دودھ لے جاتے ہیں"

اور پھر مجتبیٰ اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"نکر تونسوی کی ساری تحریروں میں پانچ لیٹر دودھ والے آدمی کے خلاف پاؤ لیٹر دودھ والے آدمی کے احتجاج کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔"

اسی طرح سلیمان اریب کے خاکے میں رقمطراز ہیں :

"صفیہ" اریب صاحب کی سب سے بڑی کمزوری اور سب سے بڑی طاقت تھیں، ہر بات میں صفیہ کا بے موقع ذکر کیا کرتے تھے۔ ایک دن فراق کی شاعری پر بحث ہو رہی تھی، کسی نے کہا فراق کی شاعری کے بارے میں پروفیسر احتشام حسین کی یہ رائے ہے ۔ اس پر اریب نے فوراً کہا
— اور صفیہ کی بھی یہی رائے ہے"

ان اقتباسات کی پیش کش سے یہ نتیجہ نکالنا مناسب نہ ہوگا کہ مجتبیٰ حسین کے خاکے اشخاص کے تاریک رُخ کو ہی پیش کرتے ہیں حق تو یہ ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے وصف کو وہ کچھ ایسے سیاق و سباق میں پیش کرتے ہیں کہ وہ بہت بڑا وصف نظر آنے لگتا ہے، بلکہ کہیں کہیں تو اُن کی دریا دلی پر فضول خرچی کا شبہ ہوتا ہے۔ تمام خاکے توصیف سے شروع ہوکر توصیف پر ہی ختم ہوتے ہیں، اگر درمیان میں کہیں کہیں اُجالا داغ داغ ہوکر حقیقت کے زیادہ قریب ہو جاتا ہے تو مجتبیٰ کی نیت پر شک نہیں کرنا چاہیئے۔

مجتبیٰ حسین نے عام خاکہ نگاروں کی طرح اپنی پسند کے معیار بناکر متعلقہ شخصیتوں کو ان پر پرکھنے کی روش سے اجتناب کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ افراد، خصوصاً فنکار انفرادی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ اپنے خاکوں میں آزادہ روی کے قائل ہیں، ان کا خاکہ اپنے فطری انداز میں آگے بڑھتا اور متعلقہ شخصیت کی کم و بیش تمام بنیادی خصوصیات کا احاطہ کرتا ہے اور یہی سبب ہے کہ کوئی خاکہ کسی دوسرے خاکے سے مماثل نہیں ہے۔ ظرافت مجتبیٰ کی گھٹی میں پڑی ہے اس لیے انداز بیان کو شگفتہ ہونا ہی چاہیئے۔ عام طور پر مزاح نگار سنجیدہ مسائل کو اپنی طرزِ ادا سے سطحی بنا دیتے ہیں۔ مجتبیٰ کا معاملہ دوسرا ہے ان کی شگفتگی بات کو زیادہ پہلودار اور بلیغ بناتی ہے مثلاً:

"اریب ایک دن اچانک بیمار ہو گئے۔ کسی نے بتایا کہ ان کی آواز بیٹھ گئی ہے۔ ان دنوں ادب میں ترسیل کے مسئلہ پر رسالوں میں بڑی بحث چل رہی تھی، ایک دن اریب سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا ـــــ
"اریب صاحب! آپ تو سچ مچ ترسیل کا مسئلہ بن کر رہ گئے ہیں"

حکیم یوسف حسین خاں کی شاعری کے بارے میں اُن کی رائے ہے:

"سچ مچ حکیم صاحب کا مجموعۂ کلام بڑا مفرح اور مقوی ہے یقین نہ آئے تو پڑھ کر دیکھ لیجئے۔ بس ایک بار آزمائش شرط ہے"

ان خاکوں کے مطالعہ سے اس امر کا احساس بھی ہوتا ہے کہ مجتبیٰ سنجیدہ جذبات نگاری پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ بطورِ خاص سلیمان اریب، عزیز قیسی، نکہت لکھنوی اور سلام مچھلی شہری پر لکھے گئے خاکوں کا اختتام ایسے انداز میں کیا گیا ہے کہ روح کے تار جھنجھنا اُٹھتے ہیں۔

بحیثیت مجموعی مجتبیٰ حسین ایک ایسے خاکہ نگار ہیں کہ جی چاہتا ہے وہ ہم پر خاکے لکھیں اور ڈر لگتا ہے کہ کہیں وہ واقعی ہمارا خاکہ نہ لکھ دیں ـــ! (۱۹۷۲ء)

□□

مولانا علی ناصر سعید عبقاتی
(آغا روحی)

جاپان چلو ۔۔۔۔ میری نظر میں!

(روح الملت حضرت مولانا سید علی ناصر سعید عبقاتی المعروف بہ آغا روحی، ناصر الملت مولانا سید ناصر حسین صاحب قبلہ کے پوتے اور آقائی سعید الملت کے فرزند ہیں اس خاندان نے صدیوں سے کئی عظیم علماء، فقہا اور خطیب پیدا کئے ہیں مولانا آغا روحی صاحب عالم دین اور خطابت کی آبرو ہونے کے ساتھ ساتھ ادب سے گہرا شغف رکھتے ہیں اگرچہ مولانا عربی اور فارسی میں لکھتے رہے ہیں لیکن ممتاز مزاح نگار مجتبیٰ حسین کی کتاب "جاپان چلو جاپان چلو" کے مطالعے نے مولانا پر جو فوری ردّ عمل مرتب کیا وہ موصوف نے قلم برداشتہ تحریر فرمادیا ہے) ———————— [ادارہ]

میں نے بچپن میں عربی کی نصابی کتابوں میں سے کسی میں پڑھا تھا کہ ضحک خاصۂ انسانی ہے یعنی ہنسی وہ خصوصیت ہے جو انسان کو دوسری مخلوقات سے الگ کرتی ہے میں ذاتی طور پر اس "خاصۂ انسانی" سے بڑی محبت کرتا ہوں۔ خصوصاً جب اندر سے ٹوٹنے کا کوئی لمحہ آجائے تو پھر میرے ہنسنے کے عمل کا خلوص بڑھ جاتا ہے شاید اسی لیے میں ہر ہنسنے اور ہنسانے والے سے جلدی متاثر نہیں ہو پاتا کیونکہ میں نے اپنے طور پر ہنسی کا ایک معیار بنالیا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب روح کے زخموں کا تازہ لہو لبوں پہ سج جائے اور آنکھوں کے گوشے نم ہوتے چلیں تب ہنسی آئے تو وہ معیاری ہنسی ہے۔ غیر معیاری ہنسی تو کسی عام سی بات پر سطحی جذبات کے تحت یا اخلاقاً بھی آسکتی ہے۔ میں مجتبیٰ حسین سے اس کی مزاح نگاری کی وجہ سے متاثر نہ ہو پاتا مگر مجھے مجتبیٰ کی ہنسی بہت ہی معیاری نظر آئی اس کی روح کے ہر رخ پر کوئی پرانا زخم ہے اور جب وہ زخم مندمل ہونے لگتا ہے اور پھر وہیں چوٹ پڑتی ہے تو مجتبیٰ دل کھول کر ہنستا ہے مگر چونکہ میں اپنے اندر قید ہوں اور مجتبیٰ آزاد ہے لہٰذا جب وہ ہنستا ہے تو اپنے پڑھنے والوں کو بھی اس ہنسی میں شریک کرلیتا ہے اور یہی اس کی زخمی روح کی عظمت ہے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے نم ہوتی ہیں اور وہ ہنستا ہے۔ اس کا کرب اس کے اندر دل پر ٹھوکریں لگاتا ہے اور وہ ہنستا ہے اس کی حساس طبیعت اسے نثار چرکرتی ہے اور وہ ہنستا ہے۔ شاید اس نے ہنسنے کو پہلے ہنر سمجھا ہوگا مگر اب تو وہ اسے وظیفہ بلکہ عبادت بنا چکا ہے۔ عبادت اس لیے کہ جب اسے ہنسنے کو کوئی نہ ملے تو وہ اپنے آپ پر ہنستا ہے جو کہ دنیا کا سب سے مشکل عمل ہے۔

دلی میں قیام کے دوران میں نے مجتبیٰ حسین کا نیا کارنامہ سفرنامہ "جاپان چلو جاپان چلو" پڑھا اور پڑھتے پڑھتے خیال آیا کہ مجتبیٰ سے ملوں ایک مشترک دوست ہمایوں ظفر زیدی نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کی چہرہ شناسی بھی کروادی

کیونکہ ہم غائبانہ ایک دوسرے سے واقف تھے میں اسے صاحب قلم اور وہ مجھے خطیب کی حیثیت سے جانتا تھا ملے تو دونوں کی رائے بھی ایک دوسرے کے لیے حیرت انگیز طور پر مماثل نکلی۔ میرا خیال تھا کہ ابن انشاء کے بعد مجتبیٰ حسین نے مجھے متاثر کیا ہے۔ مجتبیٰ نے کہا کہ وہ علامہ رشید ترابی کے بعد میری خطابت سے متاثر ہوا ہے۔ ابن انشاء اور علامہ ترابی دونوں ہی پاکستانی ہیں اور انتقال کر چکے ہیں گویا کہ ہمیں فی الوقت ایک دوسرے کے لیے کسی ہندوستانی یا زندہ شخص سے متاثر ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے لہٰذا ہم دونوں اس وقت تک ایک دوسرے کی طرف سے مطمئن ہیں۔

مجتبیٰ حسین آنکھیں بند کر کے نہیں ہنستا بلکہ جتنی اس کی ہنسی بڑھتی ہے اتنی ہی زیادہ اس کی آنکھیں کھلتی جاتی ہیں اور ان میں مشاہدے کی قوت بڑھتی جاتی ہے مثلاً

"۔۔۔ ہانگ کانگ ملک کیا ہے بس ایک جزیرہ سا ہے لسے سمٹا ہوا دلِ عاشق کہہ لیجئے جب ہمارا طیارہ نیچے اُترنے لگا تو پورا جزیرہ ہماری نظروں کے سامنے تھا فلک بوس عمارتوں کو اپنی ہتھیلی پر سجائے ہوئے سمندر کی لہروں سے کھیلتا ہوا یہ جزیرہ اتنا خوبصورت لگا کہ بس کچھ نہ پوچھئے۔۔۔۔۔۔۔۔"

مجتبیٰ کا ذہن عام انسان سے مختلف ہے اس پر کبھی خوف طاری ہوتا ہے تو وہ ڈرنے کا موقع گنوانے کے بعد پہلی فرصت میں اپنا مذاق اڑاتا ہے اور اپنے پڑھنے والوں کے دلوں سے دوسروں کا خوف بھی نکالتا جاتا ہے۔

"ہانگ کانگ کے ہوائی اڈے کے بارے میں ایک بات اور عرض کر دیں کہ یہ بالکل سمندر سے متصل ہے لہٰذا جب طیارہ ہوائی اڈے پر اُترنے لگتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے طیارہ ہوائی اڈے پر نہیں اتر رہا ہے بلکہ سمندر میں گر رہا ہے۔ ہمیں بھی اس منظر سے بڑی پریشانی ہوئی تھی۔ آپ کبھی ہانگ کانگ جائیں تو ہوائی اڈے کی اس ہیئت ترکیبی سے بالکل پریشان نہ ہوں۔ اللہ نے چاہا تو آپ زمین پر ہی اتریں گے۔"

وہ ہنسی ہنسی میں دوسروں کی عظمت کردار کے اعتراف اور اپنے سماجی عیوب کی نشاندہی میں نہایت سلیقہ مند ہے وہ اپنے معاشرے کو پاک صاف دیکھنے کی خواہش کا اظہار گہرے طنز کی کاری نشتر سے نہیں شرمیلی سی مسکراہٹ سے کرتا ہے۔

"۔۔۔ ہم نے بیدری سامان میں اس کی گہری دلچسپی کو دیکھ کر ایک ایش ٹرے اس کی خدمت میں پیش کرنے کی کوشش کی مگر اس نے لینے سے صاف انکار کر دیا۔ بہت سمجھایا کہ یہ تحفہ ہے اور ہمارے ہاں کسٹم آفیسروں کو تحفے پیش کرنے کا رواج عام ہی نہیں لازمی مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ بھی لیجئے۔ وہ بولا "نہیں جیسی آپ کی انفرادیت ہے ویسی ہماری بھی انفرادیت ہے"۔ خیر ہم وہاں سے سامان اٹھا کر بھاگے۔۔۔"

ہمارے ملک میں لسانی تعصب کی جو آگ مصلحتاً دلوں میں سلگائی گئی ہے مجتبیٰ حسین کو پسند نہیں ہے وہ اپنے ذہنی اُفق کو تنگ کرنے پر آمادہ نہیں ہے وہ اچھے ادب کی تخلیق اور پھیلاؤ کی تائید میں پہلے سے خبر ہے کہ تنگ نظری کا انجام خود پرستی کی دلدل میں زندہ دفن ہو جانے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ لسانی تعصب اول اول تکلم کی چنگاری اور آخر آخر فرقہ وارانہ فسادات کی وبا بن جاتا ہے اس نے لسانی تعصب کی آگ کے خلاف ہنسی کی شبنم کو حربے کے طور پر استعمال کیا ہے۔

"پروفیسر نناکا چونکہ ہندی کے پروفیسر ہیں اس لیے ہم نے ان سے پوچھا "آپ کے ہندی وبھاگ میں کتنے ودیارتھی شکشا پراپت کر رہے ہیں؟"

بولے "میرے شعبے میں ساٹھ طلبا زیر تعلیم ہیں۔"

ان کے منہ سے فارسی آمیز ہندی سن کر ہم بھونچکے رہ گئے۔

جاپان ریڈیو کے مسٹر اکی را انا ہارا سے ہم نے پوچھا "اور مہاشے جی! آپ کے ریڈیو سے ہندی پرسارن کس لہجے ہوتا ہے۔

بولے آپ غالباً جاپان ریڈیو کی ہندی نشریات کے نظام الاوقات کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔"

ہم نے کہا جاپان ریڈیو کا نظام الاوقات تو ہم بعد میں جانتے رہیں گے پہلے یہ بتائیے کہ آپ ہندی پروگرام کے انچارج ہیں لیکن اتنی اچھی اردو کیسے بول رہے ہیں؟

مسٹر انا ہارا بولے "تیلہ! یہ ہندی اور اردو کے جھگڑے تو آپ کے ملک کو مبارک ہوں ہمیں ان جھگڑوں سے کیا لینا دینا۔ دونوں زبانوں کی گرامر تقریباً یکساں ہے۔ تھوڑی سی سنسکرت اور تھوڑی سی فارسی اور عربی سیکھ کر ہم حسب موقع آپ کی اردو اور ہندی دونوں زبانوں پر ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ ہم جاپانی کاروباری آدمی (لوگ) ٹھہرے۔ ایک تیر سے دو شکار کرنے کی ہمیں عادت ہے جاپان میں جو آدمی ہندی جانتا ہے وہ اردو بھی جانتا ہے اور جو اردو جانتا ہے وہ ہندی بھی جانتا ہے۔

"ہم نے دل میں سوچا کہ اے کاش ہمارے ملک میں بھی لوگ زبانوں کے معاملے میں کم از کم اتنے ہی کاروباری ہوتے تو ہندی اور اردو کا جھگڑا ہی نہ ہوتا۔"

مجتبیٰ بے حد فراخدل ہے۔ اس نے ٹوکیو یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر پروفیسر سوزوکی کا پتہ صرف اس لیے کتاب میں شامل کیا ہے کہ اگر اردو کے صاحبان قلم اپنے مطبوعات ٹوکیو یونیورسٹی کے کتب خانے کو بھیجنا چاہیں تو بھیج سکتے ہیں اس نے کسی ناقد، شاعر یا ادیب تک محدود رکھے بغیر اردو کے تمام صاحبان قلم سے اپیل کی ہے کہ اپنی کتابیں وہاں بھیجیں کیونکہ مجتبیٰ کو یہ بات ذرا کھل سی گئی کہ وہاں پاکستانی مطبوعات وافر مقدار میں موجود ہیں۔ مگر ہندوستانی مطبوعات افسوسناک حد تک کم ہیں یہ پاکستانی صحافی اور افسانہ نگار ابراہیم جلیس سے ہندوستانی بھائی مجتبیٰ حسین کا جذبہ حب الوطنی ہے اور فراخدل مجتبیٰ حسین کی وسیع القلبی ہے کہ وہ خود بھی جس سے واقف یا متعارف نہیں ہے انھیں جاپان میں متعارف کروانا چاہتا ہے۔ مجتبیٰ حسین کی شخصیت کا یہ پہلو انسانیت اور اردو کے تاجروں کے لیے ایک سبق ہے اور ساتھ ہی ساتھ انسانیت اور اردو کے لیے قابل فخر۔

یونیسکو کے میزبانوں نے مندوبین کی شاندار میزبانی کی جس کا سب سے ہلکا جزو وہ چھتریاں تھیں جو مندوبین میں وقتی طور پر تقسیم کی گئی تھیں اور انھیں روانگی سے پہلے واپس کرنا تھا۔ مجتبیٰ نے اپنی چھتری کو ٹوکیو میں واقع اپنے ہوٹل سے دہلی میں واقع اپنے گھر تک ایک بہت بڑے بادل کی طرح پھیلا دیا جس کے نیچے وہ خوب اچھی طرح بھیگتا رہا۔ ہنستا رہا اور ہنساتا رہا مگر جب ٹوکیو سے چلتے چلتے وہ چھتری اسے واپس کرنا پڑی تو اس کی ہنسی اچانک بہت ہی زیادہ معیاری ہوگئی یعنی اس کی پلکوں پر آنسو اور ہونٹوں پر ہنسی کی شدت نے اس کے قارئین کے دلوں کو بھی بوجھل کر دیا۔

مس جو نے ہنستے ہنستے اس چھتری پر سے گم ٹیپ کو چھیلا اور ہمارا نام نکال دیا۔ ہمارے دل پر ایک بجلی سی گری۔ تڑپ کر بولے "مس جو! اس چھتری پر سے ہمارا نام ذرا آہستہ نکالیئے۔ دل پر چوٹیں سی پڑ رہی ہیں؟" اتنا کہنے کے بعد نہ جانے کیوں ہماری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اے یونیسکو کی چھتری! ہماری ہمدم ہماری رفیق۔ اداس نہ ہونا ہم تجھے دوبارہ حاصل کرنے کے لیے پھر

آئیں گے ہماری راہوں میں آنکھیں بچھائے رکھنا۔ کیا عجب کہ اب کی بار ہم بادل بن کر تجھ پر برسنے آجائیں!"

جسے (۳۵) دن کے ساتھ کی وجہ سے ایک بے جان چھتری سے اتنا جذباتی لگاؤ ہو جائے وہ دوستوں کے سلسلے میں کتنا حساس ہوگا۔ کیا ضروری ہے کہ جب مجتبیٰ دوبارہ یونیسکو کی کانفرنس میں جائے تو اسے وہی چھتری ملے جو گذشتہ سفر میں ملی تھی مگر گداز فطرت مجتبیٰ تو ہر بچھڑنے والے سے دوبارہ ملنے کی اُمید کے سہارے جینا چاہتا ہے وہ از حد جذباتی اور حساس ہے لیکن اس نے اپنی ذات کے گرد ہنسی کا جادوئی حصار کھینچ رکھا ہے۔ اس حصار کے باہر صرف اس کی ہنسی کی آواز سنائی دیتی ہے رونے کی نہیں۔ مجتبیٰ کے رونے کی آواز صرف وہی سن سکتا ہے جو اس جادوئی حصار کے اندر پہنچ سکے جو اس کی زخمی روح کو پڑھ سکے جو اس کی کشادہ آنکھوں کو سمجھ سکے۔

"جاپان چلو جاپان چلو" پڑھنے کے بعد مجھے اپنے بارے میں یہ خوش فہمی سی ہوگئی ہے کہ میں نے مجتبیٰ حسین کو پڑھ لیا۔ وہ مجتبیٰ حسین جو کئی تہوں کے اندر بہت اندر چھپا ہوا چپکے چپکے سسکیاں لے رہا ہے اور اپنے باہر ہنس رہا ہے، ہنسا رہا ہے۔

اس سفرنامے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مجتبیٰ نے شریف مہمان کی حیثیت سے جاپان کی کوئی برائی نہیں کی اور یہ بھی اس کی بڑائی ہے۔

مجتبیٰ حسین تم اپنی تمام بڑی اور چھوٹی گہری اور سطحی حیثیتوں سمیت مجھے مل گئے لہٰذا "دوموآری گاتو گزائی مس" تمہارا بہت بہت شکریہ!

"مزاح نگاروں میں رونے بسورنے والے بھی ہیں اور بذلہ سنج بھی۔ مجتبیٰ کے یہاں مزاح فطری اور عملی دونوں صورتوں میں موجود ہے۔ مختلف واقعات جن کو انھوں نے بیان کیا ہے اُن میں عملی مزاح کے بے شمار نمونے موجود ہیں۔ مزاح کی ان دونوں خصوصیات کے علاوہ طنز کی تلخی بھی پائی جاتی ہے۔ اس حقیقت سے کون واقف نہیں کہ راشن کی دوکان سے غذائی اشیاء کا حاصل کرنا کس قدر دشوار طلب ہوتا ہے۔ اس دشواری کا اندازہ ان کے بیان سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے بطور لطیفہ پیش کیا تھا۔ ملاحظہ کیجئے۔

"ایک شخص نیچی نظر کئے راستے سے گزر رہا تھا۔ مَردوں کا سڑک پر نظر کا نیچا رکھنا خلافِ فطرت سمجھا جاتا ہے۔ لوگ متعجب ہوئے اور اُس آدمی سے دریافت کرنے لگے کہ بات کیا ہے؟ اُس نے جھنجھلا کر جواب دیا۔ دیکھتے نہیں یہاں سے چیونٹیوں کا قافلہ گزر رہا ہے۔ لوگوں کی حیرت انتہا کو پہنچ گئی کہ برسوں بعد ایک آدمی پھر سلیمانؑ کی طرح چیونٹیوں کے اس قافلہ کو کیوں اہمیت دے رہا ہے؟ اور زیادہ مضطرب ہو کر پوچھنے لگے کہ چیونٹیوں کے قافلے سے آپ کو کیا نسبت ہے۔ جواباً کہنے لگا کہ ان ہی چیونٹیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ راشن کی کون سی دوکان میں شکر موجود ہے۔"

ڈاکٹر لئیق صلاح

سوزوکی تاکیشی (جاپان)

بحیثیت مزاح نگار مجتبیٰ حسین

مجتبیٰ حسین صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۷۳ء میں نئی دہلی کے ہوٹل جن پتھ کے ایک چینی رستوران میں ہوئی تھی۔ محفل مختصر سی تھی مگر مجتبیٰ صاحب باتوں باتوں میں مجھے حیدرآباد کے بارے میں اور گلبرگہ کے بارے میں جہاں میں جارہا تھا بہت مفید ہدایات دیتے رہے۔ جب وہ واپس جانے لگے تو میں نے حسب دستور ان کی خدمت میں اپنا ایک موٹا اسمی کارڈ پیش کیا تھا۔ موٹا اس لیے کہ ہمارے ملک میں موٹے سے موٹے اسمی کارڈ کو آداب و اخلاق کے عین مطابق سمجھا جاتا ہے۔ لینے والے کم سے کم اس سے جوتے چمکانے یعنی شوہارن کا کام لے سکتے ہیں۔ مجتبیٰ صاحب نے میرے کارڈ سے کچھ اور کام لیا۔ ستمبر ۱۹۸۰ء میں ان سے زندگی میں دوبارہ ملاقات نصیب ہوئی۔ جاپان میں قیام کے ہر خوش و ناخوشگوار واقعہ کے متعلق مجتبیٰ صاحب اپنی مشہور و معروف کتاب "جاپان چلو جاپان چلو" میں دل کھول کر لکھ چکے ہیں۔ اس لیے مجھے زیادہ جسارت نہیں کرنی ہے۔ اس سفر نامے کو پڑھ کر ہم بے اختیار یہ داد دینے لگتے ہیں کہ مجتبیٰ حسین مزاح نگاری کے فن میں پورا اترتے ہیں۔ اسی کتاب کا ایک باب "بلٹ ٹرین میں کبھی نہ بیٹھو" ملاحظہ فرمائیے کہ اس میں انھوں نے ہماری بلٹ ٹرین (شین کان سین) پر بہت کچھ کہا اور سنایا ہے بلکہ یہاں تک فرماتے ہیں کہ "کبھی جاپان جاؤ تو بلٹ ٹرین میں بالکل نہ بیٹھو۔ بڑی واہیات ٹرین ہے۔" ہم خوب جانتے ہیں کہ بلٹ ٹرین جس کی رفتار ۲۴۰ کیلومیٹر فی گھنٹے سے کچھ زیادہ ہے بھارت کی وسیع، آرام دہ اور زندگی سے بھرپور ٹرین کے مقابلے میں ہیچ ہوتی ہے۔ پھر ہم مجتبیٰ صاحب کی بظاہر نکتہ چینی کو پڑھ کر ناراض بالکل نہیں ہوتے۔ کیوں؟ اس لیے کہ ہم ان کی نرم و گرم اور دردمند اور انسانیت سے بھری طبع کو اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ مجتبیٰ صاحب شاید یہ فرمائیں گے کہ تم کیا جانو میرے اندرونی غم و حسرت کو۔ خیر چھوڑیئے اس بحث کو۔

چند سال ہوئے عوامی جمہوریۂ چین کی کمیونسٹ پارٹی کے صدر یہاں بطور سرکاری مہمان تشریف لائے تھے۔ انھوں نے بھی ہماری منحوس بلٹ ٹرین میں سوار ہونے کی ہمت کی تھی۔ ٹوکیو سے کیوٹو تک ۵۱۴ کیلومیٹر کے فاصلے کو ڈھائی گھنٹے اور دس منٹ میں طے کرنے کے بعد جب ان سے سفر کے تاثرات پوچھے گئے تو منہ بناکر فرمایا کہ تیز رفتار تو ضرور ہے لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا رہا کہ پیچھے سے لگاتار چابک لگایا جارہا ہے۔ مجھے دوبارہ کبھی نہیں چاہیے۔

ایک عملی سیاستدان اور ایک اصلی مزاح نگار کے درمیان جنت سے جہنم تک کا فاصلہ جو ہونا لازمی ہے یہی تو ہے۔

مجتبیٰ صاحب ٹوکیو میں قیام کے دوران جس ہوٹل میں رہے اس کا کمرا اتنا چھوٹا تھا کہ پنجرے کا گمان ہوتا ہے۔ اتفاق سے اسی ہوٹل میں میرے ایک پاکستانی دوست کو ٹھہرنا پڑا تھا۔ آج سے کوئی دس سال پرانی بات ہے۔ وہ بدنصیب اس "تنگ کمرے" سے اتنا گھبرا گیا کہ بہت جلد اپنے آپ کو قیدی سمجھنے لگا۔ لورلی مشترکہ منڈی کے ایک معتمد صاحب نے بجا فرمایا ہے کہ جاپانیوں کے گھر خرگوش خانے کے برابر ہیں۔ کیا عجب کہ ٹوکیو کے ایک معمولی ہوٹل کے کمرے کو میرے دوست نے قید خانہ قرار دیا ہو۔ پھر اسی کمرے کی کیفیت کو مجتبیٰ صاحب اس طرح دلچسپ انداز میں پیش کرتے ہیں کہ "کمرہ اتنا چھوٹا ہے کہ اس میں کسی خواب کے داخل ہونے کی گنجائش نہیں ہے"

جہاں تک طنز و مزاح کا تعلق ہے یہ عام فہم حقیقت ہے کہ مزاح اور طنز میں بنیادی فرق ہوتا ہے۔ طنز نگاری اپنی جگہ اور مزاح نگار دوسری جگہ۔ طنز کی عمارت نفرت کی اساس پر تعمیر کی جاتی ہے ادھر مزاح نگاری میں محبت اور ہمدردی ناگزیر ہوتی ہے اور اسی لیے ایک مزاح نگار کا دل بھی محبت اور ہمدردی سے بھرا ہوا ہوتا ہے اور ہونا بھی ضروری ہے۔

یہاں ان کی ایک اور تصنیف "آدمی نامہ" کو دیکھیے۔ اس میں پندرہ ایسی شخصیتوں کے خاکے پیش کیے گئے ہیں کہ ہر ایک ہمارے لیے رہبرِ زندگی بن سکتی ہے۔ ان پندرہ خاکوں کو پڑھ کر ہمارے دل کو بڑی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اس میں طنز کی ذرہ بھر بھی بے دردی نہیں ملتی۔ اور اسی مسرت آفرینی کے فن میں مجتبیٰ حسین یکتا فنکار ہیں۔ بس مجھے افسوس ہے کہ "آدمی نامہ" میں سولہویں شخصیت کے لیے جگہ نہیں محفوظ رکھی گئی ہے۔ اصل میں وہ جگہ بحیثیت مزاحیہ آدمی" خود مجتبیٰ صاحب کے لیے ہونی چاہیئے!

مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری واقعی ان کی اپنی شخصیت کا پرتو ہے!!

ایک بار ــــــ کہ وہ اپنے گھر کے صحن میں بیٹھے تھے اور مالک مکان کی زیادتیوں کا دکھڑا رو رہے تھے کہ یکبارگی انھوں نے مکان کے در و دیوار کی جانب نظر دوڑائی۔ اک آہِ سرد کھینچی اور نہایت درد بھرے لہجے میں غالب کا شعر یوں پڑھنے لگے۔

اگ رہا ہے در و دیوار پہ "مرزا غالب"
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

اس پر ہم نے ان سے کہا "قبلہ! اب تو آپ کی جرات اتنی بڑھ گئی ہے کہ در و دیوار پر بھی مرزا غالب کو اگانے لگے۔ خدا کے لیے شعر میں مرزا غالب کی جگہ سبزہ غالب کہیئے بولے "آپ مجھے بہکانے کی کوشش نہ کیجئے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ غالب کا پورا نام "سبزہ غالب" نہیں بلکہ مرزا غالب تھا۔

مُجتبیٰ حسین۔ ہم طرفدار ہیں غالب کے، سخن فہم نہیں۔

تکلف برطرف

ڈاکٹر اشرف رفیع
ریڈر شعبۂ اردو، جامعہ عثمانیہ

مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری

غزل گوئی کی طرح خاکہ نگاری بھی ایک مشکل فن ہے۔ غزل کہنے کی کوشش میں ذرا سی بے احتیاطی اچھے خاصے شاعر کو مرثیہ گو بنا دیتی ہے، اور ذرا سی لغزش ایک خاکہ نگار کو صحافی یا سوانحی مضمون نگار کا لیبل لگا دیتی ہے۔

مائیکل انجیلو نے کہا تھا کہ مجسمہ ساز، مجسمہ سازی نہیں کرتا، مجسمہ تو پہلے ہی سے مرمر میں موجود رہتا ہے وہ صرف مرمر کی ان تہوں کو چھیل کر نکال دیتا ہے، جن کے پیچھے کوئی صورت جلوہ نمائی کی منتظر رہتی ہے۔ خاکہ نگار بھی یہی کرتا ہے۔ وہ شروع سے آخر تک "حیات اور کارناموں" کی تفصیل بیان نہیں کرتا بلکہ کسی شخص کی زندگی سے چند حالات اور واقعات کو چن لیتا ہے اور ایسا پیکر تراشتا ہے جسے خاکہ نگار نے دیکھا سمجھا اور برتا یا بھگتا ہے۔ عصری آگہی، سماجی روابط اور تہذیبی شعور خاکہ نگاری کے لیے ضروری ہے۔ زندگی کے حقائق اور انسانی نفسیات پر خاکہ نگار کی گرفت مضبوط ہو۔ زبان اور بیان پر اُسے اتنی قدرت ہو کہ وہ ایک جنبش قلم سے جسے چاہے جیسا بنا سکے۔ انشاء پردازی اور خاکہ نگاری کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ انشاء پردازی کی ریزہ کاری اور بے ساختگی خاکہ میں نگینے جڑ دیتی ہے۔ اچھے خاکے لکھنے کے لیے ضروری ہے کہ خاکہ نگار اچھے اخلاق و اوصاف کا مالک ہو تاکہ تمام تحفظات سے بالاتر ہو کر کسی شخص کا معروضی انداز میں محاسبہ کر سکے۔ معروضی انداز تحریر کو قابل قبول بنانے میں طنز و مزاح سے بڑا کام لیا جا سکتا ہے۔

مجتبیٰ حسین نے ۱۹۶۹ء سے خاکے لکھنے شروع کئے۔ ان کا پہلا خاکہ حکیم یوسف حسین خان پر تھا۔ تب سے لے کر آج تک انہوں نے ساٹھ سے زیادہ خاکے لکھے ہیں۔ اپنے خاکوں کے بارے میں مجتبیٰ کی رائے یہ ہے کہ جس طرح دل و دماغ نے کسی شخصیت کو قبول کیا اسے ہو بہو کاغذ پر منتقل کر دیا" یہی وہ اولین خصوصیت ہے جو مجتبیٰ کے خاکوں میں نظر آتی ہے۔ مجتبیٰ نے جن شخصیتوں پر خاکے لکھے ہیں ان کے پیشے، دلچسپیاں اور مشاغل مختلف ہیں ان میں ادیب شاعر، افسانہ نگار، مصور، کلرک اور عہدہ دار، شیخ و برہمن اور محتسب و مے نوش وغیرہ وغیرہ شامل ہیں ان سب میں جو مشترک بات ہے وہ یہ کہ یہ سب کے سب مجتبیٰ کے دوست ہیں۔ اپنی دوستی کے بارے میں مجتبیٰ "قصہ مختصر" میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"میں دوستوں کا رسیا اور متوالا ہوں اپنے وقت کا بڑا حصہ دوستوں میں گنواتا ہوں"۔

اس کا ثبوت مجتبیٰ کی خاکہ نگاری سے عیاں ہے ان کی دوستی ایک سالم شخص سے ہے جس میں اس کی خوبیاں اور خامیاں دونوں شامل ہیں۔ ان کی دوستی میں بے غرضی، خلوص اور محبت کا دریا موجزن معلوم ہوتا ہے ایسا شخص اپنے دوست کی خامیوں سے بھی ویسا ہی پیار کرتا ہے جیسا کہ اس کی خوبیوں سے اپنے موضوع کی خامیوں اور کوتاہیوں کا ذکر کچھ اس بے ساختگی، شوق و خلوص سے کرتے ہیں کہ سننے یا پڑھنے والا بھی ان کی طرح ان عیبوں کو عیب نہیں سمجھتا۔ مجتبیٰ کے خاکے نہ بہت طویل ہیں نہ مولوی عبدالحق کے بعض خاکوں کی طرح بہت مختصر۔ ان میں بڑا تناسب ہے اور پھر قاری ان میں کسی شئے کی کمی بھی محسوس نہیں کرپاتا۔ خاکہ نگاری کا یہ بھی ایک ہنر ہے۔

اپنے خاکوں میں مجتبیٰ ایک شخص سے تعارف کا پورا سامان مہیا کردیتے ہیں ایسا لگتا ہے اس کی صورت شکل لباس وضع قطع، اخلاق و عادات رہن سہن کے طور طریق اور ہنسنا بولنا سب کچھ مجتبیٰ کی گرفت میں ہے۔ ان میں سے منتخب یا تمام باتوں کو وہ جب چاہیں قلم بند کردیتے ہیں۔ ان میں بے ربطی ہوتی ہے لیکن اس بے ربطی کے باوجود ایک منطقی تسلسل بھی پایا جاتا ہے جو زیادہ تر ان کے اسلوب کی پیداوار ہے۔

خاکہ نگار کو یہ احساس ہے کہ "کسی کی جسمانی ساخت کا مذاق اڑانا اچھے مزاح کا شیوہ نہیں" لیکن اچھی خاکہ نویسی کا تقاضہ یہ ہے کہ شخص کے مکمل تعارف میں کوئی کمی بھی نہ رہ جائے مجتبیٰ نے ایسے بعض خاکوں میں "جسمانی ساخت" پر بھرپور تبصرہ کیا ہے اور اپنے مزاح سے عیبوں کو بھی ہنر بنادیا ہے۔ سعید بن محمد نقش کے بارے میں لکھتے ہیں:

"وہ آرٹ کے معاملے میں بڑے دیانت دار واقع ہوئے ہیں اتنے دیانت دار کہ سیلف پورٹریٹ کو بھی سیلف پورٹریٹ ہی رہنے دیتے ہیں۔ وہ چاہیں تو کینوس پر قدرت سے اپنے چہرے کا انتقام لے سکتے ہیں۔ کچھ نہیں تو کم از کم اپنے بالوں سے محروم سر پر چند بال ہی اگا سکتے ہیں! ایسا کرنے سے انہیں کون روک سکتا ہے۔ اپنا پورٹریٹ، اپنا برش، اپنا کینوس، اپنا رنگ اور پھر خود ہی آرٹسٹ، اتنی سہولتیں کسے ملتی ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ وہ سیلف پورٹریٹ میں وہی رنگ استعمال کرتے ہیں جو ان کا اصلی رنگ ہے یعنی رات کی طرح سیاہ کوئی دوسرا آرٹسٹ سعید بن محمد ہوتا تو وہ اپنی چندیا پر چند بال اگا لیتا اپنی پیشانی کو جو ناک کے اوپر سے شروع ہوکر گردن تک بڑی روانی کے ساتھ چلی گئی اسے کہیں تو بریک لگا کر روک دیتا۔ اپنی قد آدم تصویر بنا کر اپنے پانچ فٹ تین انچ کے قد کو چھ فٹ کرلیتا۔"

مجتبیٰ نے خالص عیبوں کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ ان کو حسن اور ہنر سے کچھ اس طرح جوڑ دیا ہے کہ ہنر ہی ہنر نظر آتا ہے۔ عیب نمائی کے لیے یہ ضروری نہیں کہ سچ مچ صاحب خاکہ اس میں مبتلا ہو۔ مجتبیٰ کی شوخی اور ظرافت اچھی خاصی شخصیتوں میں بھی کچھ مزاحیہ گوشے تلاش کرلیتی ہے۔ ایسی مثالیں خواجہ عبدالغفور، ڈاکٹر حسن الدین احمد، کنھیا لال کپور اور فکر تونسوی کے خاکوں میں ملتی ہیں۔ ڈاکٹر حسن الدین احمد کے خاکے سے ایک اقتباس پیش ہے۔

"ڈاکٹر حسن الدین احمد کے چہرہ بشرہ کو تفصیل سے دیکھنے کا کوئی موقع ملے تو ان کی آنکھوں کے اوپر پھیلی ہوئی تفصیلی بھنووں پر نظر جم کر رہ گئی۔ ایسی تفصیلی بھنویں میں نے بہت کم دیکھی ہیں ایسی گھنی اور گنجان بھنویں کہ لگتا ہے بھنویں نہیں مونچھیں ہیں۔"

کرشن چندر کے خاکے میں اک ذرا سی بات سے لطف پیدا کردیا ہے۔ کرشن [illegible] کے ایک ہاتھ پر ان کا نام انگریزی میں

بڑے حروف میں گدا ہوا تھا۔ جسے مجتبیٰ نے "دستی وزیٹنگ کارڈ" کا نام دیا ہے۔

جذباتی اعتبار سے ہم جن لوگوں سے جتنا قریب رہتے ہیں اتنا ہی ان کی Physical Personality سے بے نیاز رہتے ہیں۔ کبھی ان کی جسمانی ساخت کے مطالعے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ مجتبیٰ حسین بھی جن شخصیتوں سے زیادہ قریب رہے ہیں، ان کے حلیئے لکھنے کی انہوں نے کوئی ضرورت محسوس نہیں کی چنانچہ مخدوم، ابراہیم جلیس اور کرشن چندر کے خاکوں میں ان کا حلیہ نہیں ملتا۔

عام طور پر آدمی کو اپنی حماقتوں، اضطراری اور غیر شعوری حرکتوں کا احساس نہیں ہوتا اور اگر احساس ہو بھی جائے تو اسے وہ لوگ کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ خاکہ نگار ان اوصاف کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ مجتبیٰ ایسی باتوں کا ذکر اس خوبی سے کرتے ہیں کہ خود موضوع خاکہ کے لئے اپنی کمزوریاں وجہ انبساط بن جاتی ہیں اور قاری کے لئے مسکراہٹ کا سامان مہیا کرتی ہیں۔ کنہیا لال کپور کے خاکے میں اُن کی اس عادت کا کہ جب کوئی شخص اچھا فقرہ یا لطیفہ کہتا ہے تو اس آدمی سے بے ساختہ معانقہ کرتے ہیں اور اس زور سے کرتے ہیں کہ وہ شخص کرسی سے نیچے گر جاتا ہے' بڑا پُر لطف ذکر کیا ہے۔ ایسے موقعوں پر معانقہ کی عادت مخدوم میں بھی تھی جس کا ذکر مخدوم کے خاکے میں بڑے خلوص سے کیا گیا ہے۔ مجتبیٰ کا دائرہ احباب جتنا وسیع ہے اتنا ہی ان کے تجربات کا سلسلہ طویل اور نفسیات انسانی کا مطالعہ گہرا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ شاعر یا فنکار اپنے فن اور شعر کی تعریف کے لئے کس قدر بے چین رہتا ہے بظاہر اس کا رویہ تعریف و توصیف سے بے نیازی کا معلوم ہوتا ہے لیکن یہ بے نیازی بے سبب نہیں ہوتی۔ اس کے پیچھے آرزومندی پوشیدہ رہتی ہے۔ مخدوم کے بہت بڑے شاعر ہونے میں کوئی کلام نہیں، وہ بہت اچھے انسان بھی تھے۔ اپنی گفتگو میں وہ اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ "ادیب اور شاعر کو اپنے نام اور شہرت سے بے نیاز رہنا چاہیئے۔ اس کا نام یا کلام چھپے یا نہ چھپے اسے تو بے تعلق رہنا چاہیئے"۔ مجتبیٰ کو ایک دن شرارت سوجھی، اس شرارت کا حال مخدوم کے خاکے میں بڑے ہی دلچسپ انداز میں لکھا ہے۔ مخدوم سے انھوں نے جھوٹ موٹ کہہ دیا کہ ان کی ایک نظم دلی کے ایک رسالہ میں بڑے اہتمام سے چھپی ہے۔ رسالہ کا نام یاد نہیں لیکن عابد روڈ کے بس اسٹاپ والے بک اسٹال پر ابھی ابھی وہ رسالہ انہوں نے دیکھا ہے۔ مخدوم تھوڑی دیر تک تو اس اطلاع سے انجان اور بے تعلق رہے۔ پھر اچانک اٹھے اور چلے گئے مجتبیٰ جانتے تھے کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ خود بھی اپنے احباب کے ساتھ بک اسٹال پہنچے۔ مخدوم وہاں موجود تھے۔ انہیں دیکھ کر زوردار قہقہہ لگایا۔ مجتبیٰ نے ان سے کہا "مخدوم بھائی! میں تو صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ شاعر اپنے کلام سے کس حد تک بے نیاز رہ سکتا ہے۔" شاذ پر لکھے خاکے میں بھی شاعروں کی اس کمزوری کا خوب مذاق اڑایا ہے۔

ہم جس ماحول میں رہتے بستے ہیں اس میں ناہمواریاں زیادہ اور ہمواریاں کم ہیں۔ عام آدمی ان سب کو جھیلتا ان سے الجھتا اور پھر درگذر کر جاتا ہے۔ مجتبیٰ نے اپنی مزاح نگاری کا آغاز کالم نویسی سے کیا تھا۔ ایک کالم نویس معمولی باتوں کو بھی درگذر نہیں کرتا۔ بلکہ اس کی کوشش یہ رہتی ہے کہ وہ ان معمولی اور چھوٹی باتوں کو بڑا کر کے عوام کے سامنے اس طرح پیش کر سکے کہ قاری ان کی اہمیت کو سمجھے اور ان سے دلچسپی لے۔ مجتبیٰ کی نگاہِ فرض شناس خاکوں میں بھی عالمی مسائل سے لے کر فرد اور سماج کے غیر ذمہ دارانہ رویوں کے مختلف گوشوں کی نشاندہی میں کبھی کوتاہی نہیں کرتی۔ ایسے وقت وہ کبھی فرد سے ماحول کی طرف اور اطراف و اکناف سے خود کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ نہ ان کے قلم میں جھنجھلاہٹ

ہوتی ہے، نہ ان کی شخصیت مجروح اور ستم زدہ نظر آتی ہے۔ باتوں باتوں میں بڑی پھرتی اور نفاست سے نشتر لگاتے چلے جاتے ہیں۔ تلخیٔ حیات سے تسکینِ حیات کا سامان پیدا کردیتے ہیں۔ ان کی خاکہ نگاری کی اس خصوصیت کی کئی مثالیں "مرزا صاحب" میں خاص مل جاتی ہیں۔ مرزا صاحب ایک بہترین خاکہ ہے جسے مجتبیٰ نے اپنے مزاحیہ مضامین میں شامل کیا ہے۔ جس وقت مجتبیٰ "دکھتی رگوں" کو اپنی گرفت میں لیتے ہیں۔ اس وقت وہ کئی علوم و فنون سے مدد لے کر خاکوں میں جان ڈال دیتے ہیں۔ کبھی تاریخ اور جغرافیہ ان کا سہارا بنتا ہے تو کبھی طب، حکمت اور تصوف سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ عمیق حنفی کے حلیہ کی دریافت عرب کے جغرافیہ، تاریخ اور تمدن میں کس طرح کی جاتی ہے ملاحظہ ہو۔

> "آپ ان کے چہرے کو دیکھیں تو نہ جانے کیوں جزیرہ نمائے عرب کا خیال آجاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ داڑھی کے بغیر ان کا چہرہ عرب کے جغرافیہ سے قریب تھا اور اب داڑھی کے بعد یہ عرب کی تاریخ اور تمدن سے قریب ہوگیا ہے اور تاریخ و تمدن کی چونکہ جغرافیہ سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ اس لئے ان کا چہرہ اب قابلِ قبول بن گیا ہے۔"

مجتبیٰ نے اپنے خاکوں میں ان اشخاص کی ہر خوبی و خامی کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ خوبیوں کا معاملہ آتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان خوبیوں نے مجتبیٰ کو پسپا ہی کر دیا ہے اور کمزوریوں اور خامیوں کا تذکرہ کرتے ہیں تو اتنی محبت سے کہ یہ کمزوریاں، کمزوریاں نہیں معلوم ہوتیں بلکہ اس شخصیت کی شناخت کا ایک لازمی عنصر بن جاتی ہیں۔ خاکوں میں اگر یہ خوبی نہ ہو تو خاکے ادھورے اور پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ الطاف حسین حالی نے غالب کی سوانح لکھتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا ہے اور غالب کی خوبیوں کے ساتھ ان کی خامیوں پر بھی روشنی ڈالی ہے، وہ بھی ایسے زمانہ میں جبکہ "خطائے بزرگاں گرفتن خطا است" والا معاملہ تھا۔

موضوعِ خاکہ پر مجتبیٰ کی نظر بڑی گہری ہوتی ہے، تب ہی تو بعض خاکوں کے آغاز میں چند ہی کلمات میں پوری شخصیت کو سمیٹ لینے میں کامیاب رہے ہیں۔ مثلاً۔

> "ابراہیم جلیس افسانہ نگار تھے مگر میرے لئے صرف افسانہ تھے حالانکہ وہ میرے بڑے بھائی تھے۔"

کنھیا لال کپور، مخدوم، فکر تونسوی اور نریندر لوتھر کے خاکوں میں ایسے آغاز کی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔

کسی بھی فن پارہ کو فن کار کی شخصیت سے علاحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ خاکہ نگاری میں اس کی زیادہ گنجائش رہتی ہے۔ خاکہ نگار اپنی شخصیت کی جلوہ نمائی کے کئی مواقع نکال لیتا ہے۔ رشید احمد صدیقی، خاکہ نگاروں کے سرخیل ہیں۔ ان کے خاکے ذکرِ ذات اور علی گڑھ کی صفات سے خالی نہیں۔ مولوی عبدالحق جیسے متوازن خاکہ نگار بھی اپنے آپ کو اپنے مصنفہ خاکوں میں شامل کئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ اور بات ہے کہ جہاں کہیں ان کا عکس خاکوں میں نظر آتا ہے۔ موضوع اور نکھار دیتا ہے۔ خاکوں کے متعلق مجتبیٰ نے ایک بڑے پتے کی بات لکھی اور اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ :۔

"خاکہ نگار جب کسی شخصیت کا خاکہ لکھتا ہے تو وہ انجانے طور پر خود اپنا خاکہ بھی لکھ ڈالتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ میں نے یہ سارے خاکے خود اپنا خاکہ لکھنے کی چاٹ میں لکھے ہیں۔"

مجتبیٰ بڑے چپکے سے خاکوں میں در آتے ہیں۔ "شگوفہ" جولائی ۱۹۸۷ء میں اختر حسن پر ان کا ایک خاکہ شامل ہے۔ اس خاکہ میں اختر حسن صاحب کی عمر کے سن و سال کا شمار کرتے کرتے اپنی عمر کا بھی حساب کر دیا ہے۔

"۔۔۔۔ میں خود انہیں لگ بھگ تین دہوں سے دیکھ رہا ہوں اور ان دہوں سے پہلے کے دو دہوں میں ان کے بارے میں سنتا رہا ہوں۔ خود میری عمر کے پچاس برس ان کی دید و شنید میں گذر گئے۔ لیکن اس کے باوجود جانے کیوں یقین نہیں آتا کہ اختر بھائی پچھتر برس کے ہو گئے۔"

اسی خاکہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ

- ۱۹۵۵ء میں مجتبیٰ آرٹس کالج کی بزمِ اردو کے جنرل سکریٹری تھے۔
- محبوب حسین جگر اور ابراہیم جلیس کے چھوٹے بھائی ہیں۔
- "اختر بھائی" اور "ریاست بھائی" سے ان کی پہلی ملاقات کو تیس برس بیت گئے۔
- اُس زمانے میں وہ آل انڈیا اسٹوڈنٹ یونین کے فرنٹ پر کام کرتے تھے۔
- اختر حسن سے ان کی باضابطہ ملاقاتیں ۱۹۶۲ء کے بعد سے ہونے لگیں، جس وقت کہ مجتبیٰ حکومت
- آندھرا پردیش کے محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ کے اُردو شعبہ سے وابستہ ہوئے۔
- ۱۹۶۲ء کے اواخر میں انہوں نے مزاح نگاری شروع کی۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت ساری معلومات اسی ایک خاکہ سے مل جاتی ہیں۔ دیگر خاکے بھی مجتبیٰ کے وجود سے خالی نہیں۔ اس کے باوصف یہ ماننا پڑتا ہے "میں" اور اکثر "ہم"۔ بہت دیر تک قاری اور خاکے کے درمیان حائل نہیں رہتے۔ ان کی دلچسپ شخصیت گراں نہیں گزرتی بلکہ 'میں'، اور 'تو' کا آپسی خلوص اور خوش مذاقی بڑی خوشگوار معلوم ہوتی ہے۔ جہاں وہ اپنی حیات کے شب و روز کا حساب کرتے ہیں، وہیں یہ بھی بتاتے جاتے ہیں فرد اور سماج کے بارے میں ان کا زاویۂ نگاہ کیا ہے اخلاق و اقدار کا ان کے نزدیک کیا مقام ہے۔ دولت و افلاس اور ظاہری جاہ و حشم کی اہمیت کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ مجتبیٰ کے یہاں اولین اہمیت انسان کی ہے جو خوددار ہے، اپنے ضمیر کی حفاظت کرتا ہے، مخلص ہے جس میں شرافت، مروت، عاجزی، انکسار اور انسان دوستی جیسی اعلیٰ صفات ہیں۔ اپنے خاکوں میں بڑی ہی صاف گوئی اور کھلے انداز میں اپنی پسندیدہ اقدار کا اظہار کر دیتے ہیں۔

"عمیق حنفی کی ایک ادا مجھے سب سے زیادہ پسند ہے وہ یہ کہ وہ اُدب اور زندگی دونوں میں کہیں اپنے ضمیر کو بیچنا پسند نہیں کرتے۔"

"وہ ایک سچے اور مخلص آدمی ہیں۔ بعض اوقات مجھے ان کا خلوص معصومیت کی حدوں کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے۔"

"حسن الدین احمد صاحب نے بڑی الفاظ شماری کی ہے۔ ہزاروں لفظوں کو وہ شمار کر چکے مگر جب میں ان کی شخصیت کی الفاظ شماری کرنا چاہتا ہوں تو شرافت، مروت، خلوص عاجزی اور انکساری اور انسان دوستی کے سوائے مجھے کوئی اور الفاظ نہیں ملتے۔"

دوسری چیز جسے مجتبیٰ اشخاص میں تلاش کرتے اور اس سے متاثر ہوتے ہیں، وہ علم اور کمال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے عموماً ایسے اشخاص کو ہی خاکہ نگاری کے لئے منتخب کیا ہے جو کسی نہ کسی طرح علم و فن میں ایک اہم مقام کے حامل ہیں۔

"آدمی نامہ" کے تمام خاکوں کا اسلوب مزاحیہ ہے۔ ایک خاکہ "ابراہیم جلیس" ایسا ہے جس میں شروع سے آخر تک سنجیدہ فضا چھائی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس خاکہ میں کبھی کبھی تو مجتبیٰ کی آنکھوں میں آنسو اور ہونٹوں پر سسکیاں سنائی دیتی ہیں۔ خاکہ نگاری کا کمال یہ ہے کہ خاکہ نگار جس موڈ میں ہو وہی موڈ قاری پر بھی چھا جائے۔ مجتبیٰ کی خاکہ نگاری کا جادو بیاں سر چڑھ کر بولتا ہے۔ ان کے مزاحیہ خاکوں کا اختتام عام طور پر زندگی کی چند ناقابل فراموش حقیقتوں کے اظہار پر ہوتا ہے۔ اس وقت بھی ان کا لہجہ بڑا گمبھیر اور سنجیدہ ہوتا ہے۔ کرب مسلسل کی کسک قاری کو تڑپا دیتی ہے۔ یہاں مجتبیٰ کے اس بیان کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ "سچا مزاح وہ ہے جس کی حدیں سچے غم کی حدوں کے بعد شروع ہوتی ہیں:"

مجتبیٰ بنیادی طور پر طنز و مزاح نگار ہیں۔ اپنے تقریباً تمام خاکوں میں انہوں نے مزاحیہ انداز ہی سے رنگ بھرا ہے۔ ان کا مزاح بے ساختہ، شائستہ، خیالات کی توانائی اور الفاظ کی تازگی لئے ہوتا ہے۔ ان کے مزاح کا کمال ہی ہے کہ وہ سنجیدہ شخصیتوں اور موضوعات پر لکھتے وقت بھی مزاح کے پہلو نکال لیتے ہیں۔ بات بظاہر سنجیدہ ہوتی ہے لیکن مجتبیٰ کے قلم سے ایسے موقع پر ظرافت کی پھلجھڑیاں چھوٹنے لگتی ہیں۔ بیدی کے خاکہ میں لکھتے ہیں۔

"..... افسانہ سناتے سناتے اچانک رونے لگے۔ بے ساختہ ہنسی تو جگہ جگہ دیکھنے کو مل جاتی ہے مگر ایسے بے ساختہ آنسو کہیں دیکھنے کو نہ ملے۔ افسانے کے آخر میں تو یہ حالت ہوگئی تھی کہ افسانہ کم سنا رہے تھے اور رو زیادہ رہے تھے۔ میں نے کسی افسانہ نگار کو اپنے ہی افسانے پر اس طرح روتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ان کے رونے میں ایک عجیب روانی اور سلاست تھی ....."

اسی طرح کی ایک مثال اعجاز صدیقی والے خاکے میں اس وقت ملتی ہے جب وہ "شاعر" (ماہنامہ) کے آفس کی تلاش میں نکلے تھے۔

آل احمد سرور کا خیال ہے کہ معمولی ظرافت الفاظ سے پیدا کی جاتی ہے۔ ظرافت کے اچھے یا برے ہونے کا تعلق صرف الفاظ سے نہیں ہے بلکہ اس شخصیت سے بھی ہے، جو ظرافت اور مزاح کی خالق ہے۔ شخصیت اگر معمولی اور سطحی ہو تو ظرافت معمولی اور سطحی ہی ہوگی۔ آئے دن طنز و مزاح کے نام سے ایسے مضامین، خاکے اور انشائیے پڑھنے کو ملتے ہیں جن کو پڑھ کر ہنسی تو نہیں آتی، البتہ اس کاغذ اور قلم کی قسمت پر رونا آتا ہے۔

مجتبیٰ کا مطالعہ اور مشاہدۂ زندگی وسیع ہے۔ وہ زندگی کو صرف ایک ٹھہرا ہوا دریا نہیں بلکہ موجیں مارتا ہوا سمندر

سمجھتے ہیں حسن کی لہروں میں نشیب و فراز کا آنا ضروری ہے ۔ وہ زندگی کے ہچکولوں سے لطف لیتے ہیں۔ ان کی شوخ طبعی ان کی قوت متخیلہ سے ہم آہنگ ہے جس کے نتیجہ میں ان کی تحریروں اور خاکوں کے مزاحیہ اسلوب میں تشبیہ و تضاد کی بہرکیف شکلیں ملتی ہیں۔ موازنہ اور تقابل سے بھی شخصیتوں کے بعض اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ رشید احمد صدیقی، پطرس اور مشتاق احمد یوسفی نے بھی یہ طریقہ اپنایا ہے۔ پطرس کے مضمون 'کتے' اس کی بہترین مثال ہے۔ اس طریقہ کار میں طنز کی زیریں تہیں بھی ہوتی ہیں۔ نریندر لوتھر کے خاکے سے اس بیان کی تصدیق ہوسکتی ہے۔ حوالہ کسی حد تک طویل ضرور ہے لیکن اسی طوالت سے اس کی تہہ داریاں کھُل کر سامنے آتی ہیں۔

"...... لوتھر صاحب نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ بڑے عہدیدار کُتّے کو صرف اس لئے پالتے ہیں کہ وہ انھیں بھونکنا سکھا سکے۔ اس معاملے میں میری رائے یہ ہے کہ لوتھر صاحب اپنے کتے سے کم سیکھتے ہیں اور کتّا ان سے زیادہ سیکھتا ہے۔ ایک بار جب میں ان کے گھر گیا تو دیکھا کہ ان کا کتّا ایک درخت کے نیچے لیٹا بکری کی طرح جگالی کر رہا تھا۔ میں کتوں سے بہت گھبراتا ہوں، اسے دیکھ کر واپس جانا چاہتا تھا کہ لوتھر صاحب کے ملازم نے کہا۔ صاحب اس کتے سے نہ ڈریئے، یہ کتّا تو بالکل گدھا ہے، نہ بھونکتا ہے نہ کاٹتا ہے ایسا اہنساوادی کتّا آپ کو کہیں نہیں ملے گا۔ یہ چوکیداری نہیں کرتا بلکہ افسری کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چوکیداری کا کام بھی نہ صرف مجھ ہی کو کرنا پڑتا ہے بلکہ ہنگامی حالات میں دُم بھی ہلانی پڑتی ہے ......"

مجتبیٰ کے طنز میں برنارڈ شاہ کی سی لطافت اور نزاکت ہے۔ ان کا طنز اکبر الہ آبادی کی طرح جارحانہ طنز نہیں ہے۔ وہ اپنے اعصاب کی کشمکش سے نجات پانے کے لئے طنز نہیں کرتے۔ اگر ایسا ہوتا تو ان کے طنز میں کہیں نہ کہیں "چیخ" بھی سنائی دیتی۔ فکر تونسوی کے طنز کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "فکر تونسوی کو جب بھی سماج چھیڑتا ہے تو وہ ایک طنزیہ فقرہ اس کی طرف اُچھال دیتے ہیں۔ فقرے نکالتے نکالتے اب ان کا طنز ایک چیخ بن گیا ہے۔" مجتبیٰ طنز کے وسیلہ سے رشید احمد صدیقی کی طرح زخموں پر مرہم رکھتے اور درد کا درماں کرتے ہیں۔ اس لئے ان کے خاکوں میں طنز بڑا خوشگوار اور مخلصانہ معلوم ہوتا ہے۔ طنز و مزاح کا لطیف اور پُر لطف امتزاج رشید احمد صدیقی کے بعد اگر کسی کے یہاں ملتا ہے تو وہ مجتبیٰ کے خاکوں میں ملتا ہے۔

خاکوں میں گریز کی آزادی اتنی نہیں جتنی کہ انشائیوں میں ہے۔ انشائیوں میں نفسِ مضمون سے ہٹنے اور لوٹنے کا لطف بھی آتا ہے۔ خاکہ نگار جہاں کہیں نفسِ مضمون سے ہٹ جاتا ہے قاری اپنے مطالعہ کے تسلسل میں رکاوٹ محسوس کرتا ہے۔ رشید احمد صدیقی کی تحریروں میں گریز طویل اور تابڑ توڑ ہوتا ہے۔ بعض بعض وقت کئی صفحے گذر جاتے ہیں۔ یہاں وہ ابوالکلام آزاد کے پیرو معلوم ہوتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی کا کمال یہ ہے کہ طویل گریز کے باوجود بڑے سلیقہ سے نفسِ مضمون پر آجاتے ہیں اور ان کا گریز ناگوار نہیں گذرتا۔ مجتبیٰ کے خاکوں میں بھی گریز اور نفسِ مضمون سے ہٹ جانے کا رجحان ہے۔ یہ بڑی اچھی بات ہے کہ وہ یہاں طوالت سے پرہیز کرتے ہیں

اور پھر بے قدم موضوع پر آجاتے ہیں۔ خاکے کے بہاؤ میں فرق آنے نہیں دیتا۔ کبھی کبھی جب وہ بہ بانگ دہل موضوع پر واپس آتے ہیں تو کہتے ہیں "ہاں تو میں حضرت قبلہ کا ذکر کر رہا تھا"۔ "بات یہ چل رہی تھی"۔

سوائے "ابراہیم جلیس" کے مجتبیٰ کا کوئی خاکہ ایسا نہیں جس میں لطائف سے کام نہ لیا گیا ہو۔ اکثر اوقات لطائف موضوع سے کچھ اس طرح چسپاں کر دیتے ہیں کہ وہ لطیفے شخص کا عکس بن جاتے ہیں۔ نام لیجئے تو لطیفہ یاد آجاتا ہے یا لطیفہ سنیئے تو شخص کا تصور ذہن میں آجاتا ہے۔ جب لطیفے اس اعلان کے ساتھ کہ "ایک لطیفہ یاد آیا"۔ "ایک لطیفہ سنیئے" "...... وہ لطیفہ آپ کو بھی سنائے دیتا ہوں" تو طبع نازک پر لطائف کی کھتاؤنی گراں گذرتی ہے۔ بعض شخصیتوں کے تعلق سے مجتبیٰ کے تراشے ہوئے لطیفے ان کی ذہانت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان لطیفوں میں ندرت اور ادبیت ہے، یہ لطیفے ثقاہی ادب کا قیمتی سرمایہ بن سکتے ہیں۔

خاکوں میں شخصیتوں کے بعض عناصر کو اُجاگر کرنے کے لئے مجتبیٰ اشعار سے بھی بہت استفادہ کرتے ہیں۔ یہ اشعار عموماً مقبولِ عام اور مشہور ہوتے ہیں لیکن جب مجتبیٰ ان کا استعمال کرتے ہیں تو ان کے معنی میں کچھ اور وسعت پیدا ہو جاتی ہے، وہ تشبیہات اور استعاروں سے بھی اپنے اسلوب کو آب دیتے ہیں۔ اس میں ظریفانہ پہلو کے ساتھ تنوع اور معنی آفرینی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر حسن الدین احمد کی کتاب "الفاظ شماری" کی ضخامت پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں "کتاب کیا تھی اچھا خاصا چبوترہ تھی"۔ ایک دن الفاظ شماری کے بارے میں، ڈاکٹر حسن الدین احمد سے باتیں کرکے ان کے گھر سے باہر نکلے، ذہن پر بوجھ تھا، اپنے ایک دوست سے راستے میں کسی بات پر اختلاف ہوگیا۔ بات آگے بڑھی دوست نے کوئی سخت بات کہہ دی۔ اب جو مجتبیٰ کو غصہ آیا تو کہا۔ "قمر! اب چُپ رہو ورنہ میں تمہاری شان میں الفاظ شماری شروع کردوں گا"۔ الفاظ شماری کو یہ جو نئے معنی پہنائے ہیں اس کی طرف خود مجتبیٰ نے اشارہ کیا ہے۔

صحت مند مزاح کے لئے ضروری ہے کہ مزاح نگار فرد اور سماج کی خامیوں پر ہی نظر نہ رکھے بلکہ خود اپنی کوتاہیوں کا بھی وقتاً فوقتاً جائزہ لے۔ مجتبیٰ اپنی خامیوں سے آنکھیں نہیں چراتے۔ مجتبیٰ کی شخصیت کی بلندی کا یہ پہلو ان کے خاکوں میں بآسانی مل جاتا ہے۔

"آدمی نامہ" میں معنی خیز اور زندگی کے حقائق کی غمازی کرنے والے کئی فقرے ملتے ہیں جنھیں ضرب الامثال میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ صرف ایک فقرہ ملاحظہ ہو۔ "اُپلے کو چاہے آپ کتنا ہی نہلائیں وہ اُپلا ہی رہے گا"۔ مجتبیٰ کو تحریروں کا اگر اسلوبیاتی تجزیہ کیا جائے تو اس حقیقت کو ماننا پڑے گا کہ ان کی تحریروں میں کرخت اور سخت تلفظ والے الفاظ بہت کم ملتے ہیں۔ اسلوبیاتی جائزہ کے لئے "الفاظ شماری" کی ضرورت ہوگی۔ بحیثیت مجموعی ان کے نرم، دھیمے اور دلکش الفاظ اور ان کی خوبصورت نشست سے سماعت مسحور ہوتی ہے۔ اور ایک انجانا شخص بھی ان کے خاکوں میں جانا پہچانا سا لگتا ہے۔

دلیپ سنگھ (نئی دہلی)

رنگ لائے گی ہماری پیش لفظی ایک دن

کسی کتاب کا پیش لفظ لکھنا اور کسی دولہا کا سہرا لکھنا تقریباً ایک جیسے کام ہیں۔ جیسے ہر شاعر سہرا نہیں لکھ سکتا، ایسے ہی کسی کتاب کا پیش لفظ لکھنا ہر ادیب کے بس کا روگ نہیں ہے۔ جیسے کچھ شاعروں نے سہرا لکھنا اپنا پیشہ بنالیا ہے، اسی طرح کچھ ادیبوں نے پیش لفظ لکھنے میں مہارت حاصل کرلی ہے۔

طنز و مزاح کی کتابوں کے پیش لفظ لکھنے میں سرِ فہرست میرے دوست مجتبیٰ حسین صاحب کا نام ہے۔ بلکہ سچ پوچھا جائے تو وہ اِس سلطنت کے بلا شرکتِ غیرے مالک ہیں۔ اگر میں طنز و مزاح کی کوئی کتاب دیکھتا ہوں جس میں مجتبیٰ حسین کی بجائے کسی اور کا پیش لفظ ہو تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے کسی سکھ کی شادی کوئی مسلمان مولوی کروا رہا ہو اور مجھے یہی ڈر رہتا ہے کہ بعد میں اِس شادی کو تسلیم بھی کیا جائے گا یا نہیں۔

سہرا اور پیش لفظ میں بہت سی باتیں مشترک ہونے کے باوجود ایک بڑا فرق بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ جوں جوں شاعر کا رتبہ شاعری میں بڑھتا جاتا ہے اس کو سہرا لکھنے کو نہیں کہا جاتا۔ آپ کو یاد ہوگا بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے اپنے بیٹے شہزادہ جواں بخت کا سہرا غالب جیسے بڑے شاعر سے لکھوا کر ایک اچھی خاصی کنٹرو ورسی پیدا کرلی تھی۔ زمانہ مغلیہ سلطنت کے زوال کا تھا اس لیے بات غالب کے معذرت نامے پر ٹل گئی۔ ایسی ہی کنٹرو ورسی آج کے دور میں ہوتی تو اس کو حل کرنے کے لیے دو تین کمیشن بیٹھ چکے ہوتے اور مسئلہ حل ہونے کی بجائے زیادہ اُلجھ چکا ہوتا۔ سہرے کے برعکس پیش لفظ ہمیشہ بڑے ادیب سے لکھوایا جاتا ہے۔ اِس کی وجہ مجھے ٹھیک سے تو معلوم نہیں لیکن اقبال کے اس شعر میں ہلکا سا اشارہ ضرور ملتا ہے۔ ؎

سند تو بیٹے لڑکوں کے کام آئے گی ؎ وہ مہربان ہیں اب رہیں رہیں یا نہ رہیں

سہرے اور پیش لفظ میں فرق تو صرف اتنا ہی ہے۔ لیکن مشترک باتیں بہت ملی ہیں۔ سہرا لکھنے والے کو دولہا میاں کی صورت میں وہ خوبیاں تلاش کرنی پڑتی ہیں جن کا اُس کی ذات میں نام و نشان نہیں ہوتا۔ حسنِ مردانہ میں وہ یوسف ثانی ہے۔ شجاعت اس میں ٹیپو سلطان کی سی ہے۔ حوصلہ اُس میں شیر ببر کا سا ہے۔ اور تو اور اس کے ماتھے کے پسینے کو آبدار موتیوں سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ مجھے یاد ہے جب میرا سہرا پڑھا جارہا تھا تو میں نے آئینہ منگوا کر دیکھا تھا کہ یہ تغیرات میرے جسم میں کب نمودار ہوئے۔ سہرے کے پھولوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ باغِ اِرم سے

آئے ہیں اور خود بریاں انھیں لے کر آئی ہیں۔ حالانکہ یہ سب کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ نکڑ والے گُل فروش سے خریدے گئے ہیں اور اُن کی قیمت ابھی چکانا باقی ہے۔ دولہا میاں کے ہر رشتہ دار کا نام لے لے کر کہا جاتا ہے کہ وہ سہرے سے قربان ہوا جا رہا ہے۔ حالانکہ وہ سامنے بیٹھا جل بھُن کر راکھ ہو رہا ہوتا ہے کہ اتنے بدشکل ٹائروں کو پنکچر لگانے والے لڑکے کو دلہن کس بے وقوف نے دے دی۔ جب کہ میرا سرکاری دفتر میں کلرک لڑکا ابھی تک کنوارا بیٹھا ہے۔

یہی سب کچھ پیش لفظ لکھنے والے کو بھی کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کا کام اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ کیونکہ سہرا سننے اور پڑھنے والے دولہا کے رشتہ دار اور یار دوست ہوتے ہیں اور سب کو پتہ ہوتا ہے کہ سہرا نویسی میں مبالغہ آمیزی سے کام لیا جاتا ہے۔ لیکن پیش لفظ لکھنے والوں کو خطرہ یہ درپیش رہتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اس پیش لفظ کو مصنف اور اس کے رشتہ داروں کے علاوہ کوئی قاری بھی پڑھ لے۔ اس لیے کہنا تو اُسے وہی پڑتا ہے جو سہرے میں کہا جاتا ہے۔ لیکن کچھ اس طرح جیسے کہ اس پر سچ کا گمان ہو۔

مجتبیٰ حسین صاحب نے اب تک اس آرٹ میں خوب مہارت حاصل کرلی ہے۔ میں اُن کے بہت سے پیش لفظ پڑھنے کے بعد ان کی استادی کو کچھ کچھ سمجھ پایا ہوں۔ مجتبیٰ حسین صاحب کا پیش لفظ ایک ایسے گواہ کے بیان کی طرح ہوتا ہے جو گھر سے طے کر کے نکلتا ہے کہ وہ ملزم کے حق میں بیان دے گا۔ ایسے گواہ پر آپ اگر کڑی نظر رکھیں تو آپ دیکھیں گے کہ جب اُسے کہا جاتا ہے کہ قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر کہو کہ جو کچھ کہو گے سچ کہو گے اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہو گے تو وہ اپنا ہاتھ اس چابکدستی کے ساتھ مقدس کتاب کی طرف لے جاتا ہے کہ کتاب میں اور اس کے ہاتھ میں چھ انچ کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اُس کا ہاتھ کتاب پر ہے وہ جھوٹ کیسے بولے گا لیکن اُسے علم ہوتا ہے کہ کتاب اور اُس کے ہاتھ میں کتنا فاصلہ ہے۔ اور اس فاصلے کی وجہ سے وہ سچ میں جھوٹ کی کتنی آمیزش کر سکتا ہے۔

مجتبیٰ حسین صاحب نے پیش لفظ لکھنے کے جو اصول بنائے ہیں اُن میں سے پہلا یہ ہے کہ جہاں تک ہوسکے کتاب پر بات کرنے سے پرہیز کرو۔ وہ اپنے پیش لفظ میں اصل مضمون کے علاوہ اور سب باتیں کریں گے۔ ان کا طریقہ اُس عورت کا سا ہے جس سے جب پوچھا گیا کہ آپ کے کتنے بچے ہیں تو اُس نے جواب میں یہ نہیں کہا کہ چار ہیں بلکہ یوں کہا کہ اللہ کا فضل ہے۔ یہ ایک طرح سے سوال کا جواب بھی تھا اور نہیں بھی۔ اللہ کے فضل کے حساب سے آپ بچوں کی تعداد دس بھی سمجھ سکتے ہیں اور دو بھی۔

دوسرا اصول اُن کا یہ ہے کہ ادیب میں جو خوبیاں ہیں اُن کو گنواؤ، اس کے عیبوں کی طرف پیٹھ موڑ کر بیٹھ جاؤ۔ میں نے سنا ہے کہ کرناٹک کے کسی دکاندار سے اگر پوچھا جائے کہ اُس کے پاس ماش کی دال ہے اور اُس کے پاس اگر دال نہ بھی ہو تو وہ نفی میں کبھی جواب نہیں دیتا۔ آپ نے پوچھا "کیوں بھیا ماش کی دال ہے"۔ وہ کہے گا "کالے چنے ہیں"۔ آپ نے پوچھا "پتنگ کا پوڈر ہے"۔ اُس کے پاس اگر نہیں ہے تو کہے گا کہ "پسا ہوا دھنیا ہے"۔ مجتبیٰ حسین صاحب اِسی طرح کتاب کی کمیوں سے پہلو بچا کر نکل جاتے ہیں۔

تیسرا اصول اُن کا یہ ہے کہ صاحبِ کتاب کی کتاب پر تبصرہ کرنے کی بجائے وہ ادیب کے ساتھ اپنی ملاقاتوں اور تعلقات میں قاری کو اُلجھا کے رکھتے ہیں۔ اُن کی ملاقات کا میرے پاس ایک بڑا دلچسپ قصہ ہے۔ ایک بار میں نے انھیں کہا کہ آپ نے فلاں صاحب کی کتاب کا پیش لفظ لکھا ہے۔ کہنے لگے ہرگز نہیں۔ میں نے کہا میں نے خود

اپنی آنکھوں سے پڑھا ہے۔ کہنے لگے میں انھیں آج تک ملا ہی نہیں تو پیش لفظ کیسے لکھوں گا۔ میں نے جب کتاب نکال کر اُن کے سامنے رکھ دی تو کہنے لگا کہ ہاں یاد آیا۔ صاحبِ کتاب سے میری ایک ہی ملاقات ہوئی ہے، اور وہ تب جب وہ اپنی کتاب پر پیش لفظ لکھوانے کے لیے میرے ہاں آئے تھے۔ میں نے چند منٹ کے لیے اُن سے ملاقات کی اور پھر پیش لفظ لکھ دیا۔

صاحبِ کتاب سے قریبی رشتہ داری نکالنے کے لیے مجتبیٰ حسین صاحب کو کن کن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ بھی دیکھنے کی چیز ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ مجھے یہ پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ صاحبِ کتاب وہیں کے رہنے والے ہیں جہاں ایک دفعہ میں چوتھی جماعت میں داخلہ لینے گیا تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ میرے اور اُن کے تعلقات بڑے پُرانے ہیں۔ اس رشتہ داری کو پڑھ کر مجھے ایک قصّہ یاد آیا جو میرے والد صاحب سُنایا کرتے تھے۔ میرے والد کسان تھے۔ ایک دن اپنے کھیتوں کے پاس پیپل کے ایک درخت کے نیچے بیٹھے تھے کہ پاس کے گاؤں کا ایک چودری وہاں سے گزرا۔ گاؤں کے اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میرے والد نے اُسے دعوت دی کہ وہ لسی پی کر جائے۔ مسافر نے کہا کہ لسی تو پیوں گا ہی، ساتھ کھانا بھی کھاؤں گا۔ والد نے کھانا منگانے کے لیے ایک ملازم کو گھر بھیجا اور مسافر سے پوچھا کہ کھانے کی فرمائش میں اس قدر خود اعتمادی کی وجہ کیا ہے۔ مسافر کہنے لگا کہ میری آپ سے رشتہ داری ہے۔ میرے گاؤں کی ایک گدھی بک کر آپ کے گاؤں میں آئی ہے۔ دونوں نے قہقہہ لگایا اور مِل کر کھانا کھایا۔ اس کے بعد مسافر نے وطیرہ سا بنا لیا کہ وہ جب کبھی ہمارے گاؤں کے راستے سے گزرتا، گدھی والی رشتہ داری کی بنا پر ڈٹ کر کھانا کھاتا۔ اس طرح کوئی چھ مہینے گزر گئے۔ ایک بار مسافر آیا تو میرے والد نے اُسے لسّی کے لیے بھی نہ پوچھا۔ مسافر نے حیران ہو کر کہا "کیوں سردار جی" آج کھانے کو نہیں کہو گے، وہ ہماری تمہاری رشتہ داری کیا ہوئی؟" میرے والد نے جواب دیا۔ چودری اب کیسی رشتہ داری اور کہاں کی رشتہ داری۔ وہ گدھی کل مر گئی ہے۔

مجتبیٰ حسین صاحب کو میں نے ایک بار پوچھا کہ وہ پیش لفظ لکھنے کے لیے کہاں سے نئی نئی باتیں اور نئے نئے جملے ڈھونڈ لیتے ہیں۔ کہنے لگے صبح کی سیر کو جاتا ہوں تو پارک میں مکمل تنہائی ہوتی ہے موسم خوش گوار ہوتا ہے۔ میں چلتا جاتا ہوں اور جملے اپنے آپ ذہن میں آتے رہتے ہیں۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اُن پیش لفظوں میں مجتبیٰ حسین صاحب کی اچھی صحت کا راز مضمر ہے۔ انسان کوئی بھی کام کرے۔ اُس میں کچھ فائدہ تو ہونا ہی چاہیئے۔

ایک بار میں نے اُن سے پوچھا کہ یہ پیش لفظ آپ کو تو اچھی صحت بخشتے ہیں۔ لیکن صاحبِ کتاب کو بھی ان سے کچھ فائدہ ہوتا ہے کیا؟ کہنے لگے کبھی کسی سہرا لکھنے والے سے پوچھئے اُس کے سہرے کی وجہ سے کبھی کسی دولہا کی ازدواجی زندگی خوشگوار بنی ہے کہیں۔ وہ کتنا بھی خوبصورت سہرا لکھے، دولہا میاں کو شادی کا عذاب تو بھگتنا ہی پڑے گا۔ میں تو پیش لفظ لکھ کر ادبی دولہوں کو ازدواجی زندگی میں دھکیل دیتا ہوں آگے وہ جانیں اور اُن کی قسمت!

من موہن تلخ
(دہلی)

مجتبیٰ حسین

ایک بڑی آواز کی آہٹ

جملہ بازی اور لطیفہ گوئی اُردو ادب کا ایک طرۂ امتیاز رہی ہے ہمارے کلاسیکی ادب میں محرکۂ چکبست وشرر اور میاں خوجی کا کردار اس ضمن میں عمدہ مثالیں ہیں لیکن اگر میں یہ کہوں کہ طنز یا مزاح کے اس عنصر کو ایک باقاعدہ صنفِ سخن بنانے کا سہرا ہمارے کلاسیکی اساتذہ کے سر نہیں ہے بلکہ اس کا سلسلہ قریب قریب پطرس اور کنہیا لال کپور کے عہد سے شروع ہوتا ہے تو میں اُمید کروں گا کہ ہمارے کلاسیکی، نیم کلاسیکی یا جدید طنز و مزاح نگار میری گردن ناپنے پر آمادہ نہ ہوں گے۔

درحقیقت ہمارے یہاں طنز و مزاح کو پھبتی کسنے میں زیادہ استعمال کیا گیا اور بطور فن کم اور یہ رواج بھی شاعری میں زیادہ رہا نثر میں کم۔ پھر رفتہ رفتہ صورتِ حال یہ پیدا ہوگئی کہ جملہ بازی شاعروں کی ذہانت اور مقبولیت کی کسوٹی بنتی گئی اور طنز و مزاح کو ایک باقاعدہ فن کی شکل میں نثر نگاروں نے پروان چڑھایا لیکن پھر یہ ٹریجڈی بھی اُردو ادب ہی کے حصہ میں آئی کہ ذہین اور لاڈلے شعراء جملہ بازی کی معراج کو تو پہنچ گئے لیکن بطور شاعر ان کے تخلیقی سوتے سوکھ گئے، اِدھر طنز نگاری کے تخلیقی عمل میں بھی کچھ بے راہ روی آئی یعنی طنز اور مزاح آپس میں اس طرح گڈمڈ ہوگئے کہ اس وقت اُردو ادب میں یہ امتیاز کرنا قریب قریب ناممکن ہو چکا ہے کہ ہمارے یہاں طنز نگار کون ہے اور مزاح نگار کون؟ بلکہ ہر شخص اپنی اپنی سہل پسندی کے حساب سے جس کو چاہا طنز نگار یا مزاح نگار کہنے لگا۔

میں نے اچھے اچھے پڑھے لکھوں کو یہ کہتے سُنا ہے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اور مجھے ایسے ردِ عمل پر ہمیشہ حیرت ہوئی ہے۔ اُردو ادب تو خیر اتنا چھوٹا ادب ہے کہ ہر کوئی بڑا ادیب ہونے کا دعویٰ کئے بیٹھا ہے "بڑے ادیبوں" کے اس چھوٹے ادب سے قطع نظر اگر ہم عالمی ادب پر نظر ڈالیں تو تمام تر عالمی ادب میں انگریزی مزاح (ENGLISH WIT) کو جو فضیلت و برتری حاصل ہے وہ پوری دنیا کے ادب میں طنز (SATIRE) کو حاصل نہیں ہے۔ اس فرق کی اس سے زیادہ وضاحت ممکن نہیں کہ شیکسپیئر کے یہاں WIT ہے جارج برنارڈ کے یہاں SATIRE ہے اور شیکسپیئر نیز شا کے مقام و مرتبے میں جو فرق ہے اس پر کوئی بھی بحث لاحاصل ہے اور خاص طور پر اُردو ادب میں۔

ہمارے یہاں میاں خوجی میں مزاح ہے محرکۂ چکبست وشرر میں طنز ہے۔ پھر ہمیں مزاح پطرس میں ملا۔ بھرپور مزاح جس میں طنز کا عنصر کسی طرح بھی شامل نہیں۔ کنہیا لال کپور سے مزاح اور طنز کی حدیں گڈمڈ ہونا شروع ہوئیں اور پھر یہ ٹھٹھے کا ایک ایسا سمندر بن گیا کہ فکر تونسوی بہ مشکل غرق ہوتے ہوتے بچا۔

یہ ہے وہ ادبی ورثہ جسے دامن میں سمیٹے ہوئے مجتبیٰ حسین آہستہ آہستہ لیکن مستقل مزاجی کے [illegible]

بن کر سامنے آئے۔ بقول مجتبیٰ حسین "مجھے تو زبردستی طنز نگار بنا دیا گیا تھا۔ بس دے دیا گیا ایک روزانہ اخبار کا کالم کہ ہر روز ایک عدد طنزیہ (یا مزاحیہ) کالم لکھو"۔ یہاں سے اردو ادب میں طنز و مزاح نگاری کی ٹریجڈی کی ایک اور دھارا بہہ نکلتی ہے۔ اردو اخبارات نے اس نوعیت کی خامہ فرسائی کو صحافت کا ایک لازمی جزو بنا رکھا ہے۔ اب جہاں ایک طرف طنزیہ کالم ہر ایک کے بس کا روگ نہیں ہے وہاں دوسری طرف اردو کے ذہین ادیبوں کو بھی اردو ادب، ادبی رسائل اور ناشر روٹی نہ دے رہا تھا (نہ دے رہا ہے) لہذا یہ اخبارات ان ادیبوں کے لئے ذریعۂ معاش بن گئے اور مولانا ظفر علی سے لے کر مجتبیٰ حسین تک بڑے بڑے دھانسو نام اردو اخبارات کی زینت بنے۔ لیکن ان روزآنہ اردو اخبارات کے طنزیہ کالموں کا مقصد ہوتا ہی کیا ہے؟ اخبار کی پالیسی کے مطابق کسی سیاسی لیڈر یا سیاسی پارٹی پر چوٹ اور کمیٹیت مجموعی اس دلدل میں پھنسا ادیب عام طور پر اخبار کی لپیٹوں کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ اب اگر مجتبیٰ حسین کو زبردستی بھی اخباری طنز نگار بنایا گیا تو اس کے اندر کوئی ایک لو تھی، کوئی چنگاری تھی کہ وہ عامیانہ قسم کے کالم لکھنے بیٹھا اور آج ملک کا ایک ممتاز مزاح نگار ہے۔ فکر تونسوی تو خیر ملاپ میں ملازمت کرنے سے پہلے ہی نہار تی کرن بن گیا ہے مجتبیٰ کے دل میں فکر تونسوی کے لئے کس قدر عزت ہے میں یہاں اس کے لئے کوئی توقیر نامہ قلمبند نہیں کروں گا لیکن میرا اندازہ ہے کہ حیدرآباد کے روزنامہ سیاست سے وابستہ ہونے کے بعد ہی مجتبیٰ حسین بطور صحافی ملاپ کے طنز نگار فکر تونسوی سے متاثر و مرعوب ہوا ہوگا اور پھر رفتہ رفتہ یہ تعلق خط و کتابت کی شکل اختیار کر گیا جو خود مجتبیٰ کے الفاظ میں "خط فکر صاحب لکھتے تھے، کتابت میں کرتا تھا" یہ تھی میرے لئے مزاح نویس مجتبیٰ حسین کی پہلی جھلک اور اس جملے کی ایک ستم ظریفی یہ ہے کہ فکر تونسوی ادیب بننے سے پہلے خود ایک کاتب تھا۔

میں نے مجتبیٰ کو اتنا ہی پڑھا ہے جتنا کہ مجتبیٰ نے لکھا ہے اور جانا بہت ہی کم ہے کہ خود کو ـــــ یا کسی اپنے کو جان لینا یوں بھی دانشوری کی معراج ہوتی ہے ویسے میری مجتبیٰ کی ملاقات بھی ابھی چار ماہ پرانی ہے "تعلق نواز ادیب دوست" چاہیں تو ابھی سے طبع آزمائی شروع کر سکتے ہیں کیونکہ میں یہاں اپنی تمام تر ادبی ذمہ داری اور ایمانداری کے ساتھ یہ اعتراف و اعلان کر رہا ہوں کہ مجتبیٰ حسین کو میں آج کا صف اوّل کا مزاح نگار تسلیم کرتا ہوں اور مزید یہ کہ میں مزاح کو طنز سے اعلیٰ و ارفع ادب قرار دیتا ہوں۔ اسی لئے میں نے اوپر طنز اور مزاح کے بارے میں کچھ کہنے کی جسارت کی ہے جو شاید کچھ حضرات کو گراں گذری ہو

مزاح کے ڈانڈے طنز ہی سے شروع ہوتے ہیں کہ قہقہہ ہی دونوں کا مقصد ہے لیکن ایک فرق کے ساتھ کسی پر چوٹ کر کے دوسروں کو ہنسا دینا ایک الگ بات ہے اور بنا کسی کا دل دکھائے سب کو ہنسا کے رکھ دینا ایک بلند فنی تخلیق اور اعلیٰ انسانی مرتبہ ہے۔ مجتبیٰ کے مزاحیہ مضامین اسی بلند فنی تخلیق اور اعلیٰ انسانی مرتبے سے عبارت ہیں۔ مجتبیٰ کے سینے میں نہایت حساس اور درد مند دل ہے نہ صرف بطور انسان بلکہ بطور ادیب بھی۔ مجھے مجتبیٰ کی تحریروں میں کہیں کہیں ایک عجیب PATHOS کی کیفیت ملی ہے سارے مضمون میں ہنساتے ہنساتے یہ شخص دفعتاً آخری پیرے میں دو سطریں لکھ کے رُلا کے رکھ دیتا ہے جیسے "یہ رکشا والے" (قطع کلام ـــ مجتبیٰ کا دوسرا مجموعۂ مضامین) یا جیسے "سلیمان اریب" (قصہ مختصر ـــ مجتبیٰ کا تیسرا مجموعۂ مضامین) ان دو مضامین کا مجتبیٰ حسین تو اس قدر بھیگے جذبات ہیں گویا زندگی میں غم اور خوشی کے رمز و کنایہ سے پوری طرح آشنا ہو۔ مزاح نگاری وہ صنفِ سخن ہے کہ اچھے سے اچھا ادیب کبھی نہ کبھی تخلیق کی کسی نہ کسی منزل پر انمول سے انمول انسانی قدروں کو بھی قہقہے کی نذر کر دیتا ہے۔ محض ضرورتِ تخلیق یا اپنے رنگِ سخن کے پیشِ نظر ـــ اور یہیں اچھے مزاح نگار اور بلند مزاح نگار کی حدیں الگ ہو جاتی ہیں۔ اگر ہم صرف انہی دو مضامین کی بناء پر مجتبیٰ حسین کو بلند مزاح نگار تسلیم کر لیں تو میری رائے میں ہم اردو والوں کی جاگیر کوئی بٹ نہ جائے گی۔ لیکن ہمارے تسلیم کرنے یا نہ کرنے سے میرا خیال یہ نہیں کہ مجتبیٰ حسین کی تخلیق توفیق پر کوئی *

اثر پڑے گا کہ آخر اس نے یہ دو مضامین بھی تسلیم کیے جانے پیمانہ کیے جانے پر قلمبند نہ کیے تھے ۔ میں یہاں مجتبیٰ کے بارے میں لکھتے ہوئے ایک عام بات اور کہہ دوں کہ اگر ہم اُردو والے بہت اچھے کو اچھا نہیں بلکہ بہت اچھا کہنا سیکھ لیں تو شاید ہم آج کے دور کے اس اپنے چھوٹے پن سے نجات پالیں۔

ایک مرتبہ مجتبیٰ حسین اپنے پہلے مجموعۂ مضامین "قطع کلام" پر بات کرتے ہوئے بولے : " وہ میرا بہت کمزور مجموعہ ہے میں اسے DISOWN کرنے کی سوچ رہا ہوں :

میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ " میں اس رائے سے اتفاق نہیں رکھتا۔ ہاں آج کے مجتبیٰ کو دیکھتے ہوئے وہ کتاب بس ایڈیٹنگ چاہتی ہے ":

مجتبیٰ میری بات سن کر خاموش ہو گئے۔ پھر کبھی اس ضمن میں مجتبیٰ سے بات نہ ہوئی لیکن میں اندر ہی اندر اس سوال میں اُلجھ گیا کہ مجتبیٰ کو "قطع کلام" بہت کمزور کیوں لگا؟ یہ مضمون لکھتے ہوئے مجھے اس کا جواب مل گیا کہ وہ تخلیق چونکہ مجتبیٰ کے اخبار نویسی کے زمانے کی ہے، اس میں مزاح کی وہ بلند سطح نہیں جو "گھر کا ٹیلی فون" "سردی کی گرما گرمی" (قصہ مختصر) "قصہ داڑھ کے درد کا" "جناب صدر" "شاعروں کی حکومت" "خدا بچائے فلم دیکھنے سے" اور "آٹو رکشا" (بہرحال۔ چوتھا مجموعۂ مضامین) میں ہے ہو سکتا ہے کہ اہلِ قلم اسے مجتبیٰ کے شعوری بلوغت سے تعبیر کریں لیکن میں ابھی سے مجتبیٰ کو ایسے کسی بھی فکری رجحان سے آگاہ کر دینا چاہتا ہوں کہ ایسا سوچنا غلط ہے۔ ابھی ابھی تو مجتبیٰ اچھے مزاح نگار سے بلند مرتبہ مزاح نگار کی حدوں میں آئے ہیں "کالونی والے" سے بھی آگے وہ اپنے خاکوں میں نکل گئے ہیں ۔۔ "بلراج ورما نے تناظر نکالا" "باقی۔ نو آدمیوں کا آدمی" اور "کمار پاشی یہ بھی ہے آدمی"۔ ان خاکوں میں مجتبیٰ ENGLISH WIT کی جھلک جملہ بہ جملہ دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں مجتبیٰ کو نظر نہ لگے۔ لیکن۔

ع ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

بلند مرتبہ مزاح نگار سے بھی آگے مجتبیٰ حسین اُن سرحدوں کو چھونے کے کافی قریب ہیں جہاں سے ہم اُن سے بڑا ادب تخلیق کرنے کی اُمید کر رہے ہیں تو کیا اُن حدوں میں جا کر مجتبیٰ یہ موجودہ ادب پارے DISOWN کر دیں گے؟ اس سوال کا جواب دینا مجتبیٰ کا فرض ہے، میرا نہیں ۔۔ ہاں ایک سوال کا جواب دینا یقیناً میرا فرض ہے جو شاید اب تک آپ کے دماغوں میں کلبلا رہا ہو کہ میں نے مجتبیٰ کے مضامین سے مزاح کے شاہکاروں کے چیدہ چیدہ حوالے کیوں نہیں دیئے محض مضامین کے عنوانات درج کرنے پر بس کیوں کی؟ پہلے تو اس لئے کہ اقتباس کہاں سے پیش کروں اور کتنا کروں؟ کیوں نہ یہ مضامین مکمل صورت میں پڑھے جائیں؟ میں نے اپنی طرف سے مجتبیٰ کے کچھ معرکہ آرا مضامین کے عنوانات درج کر دیئے ہیں۔ ادب کے پرستار وہ مضامین پڑھیں اور اگر میں غلط ہوں تو مجھے غلط ثابت کریں اور دوسرے اس لئے کہ مجھے مجتبیٰ کا ایک اور روپ نظر آ رہا ہے ان کی انہی تخلیقات کی روشنی میں ایک احساس، درد مند اور بڑا ادیب جس کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ میں اُوپر دو مضامین "یہ رکشا والے" اور "سلیمان اریب" کے سلسلے میں کر چکا ہوں اور مجتبیٰ کی نہ صرف اب تک کی تخلیقات ان سے متوقع اس بڑے ادب کی آئینہ دار ہیں بلکہ خود مجتبیٰ بھی ان قہقہوں کی اوٹ میں بھیگی آنکھوں سے اس منزل کی جھلک دیکھ رہے ہیں "قصہ مختصر" میں مجتبیٰ "میں اور میرا مزاح" کے عنوان کے تحت رقمطراز ہیں "

" دوستوں کی محفل میں جی بھر کے ہنس لینے، دن بھر قدم قدم پر سماج کی پستیوں سے ہنستے ہنستے مفاہمت کر لینے اور اپنی حقیر سی زندگی کے لئے بڑی سے بڑی قربانیاں دینے کے بعد جب رات کے پچھلے پہر اپنے بستر پر پہنچتا ہوں اور جب سارا ماحول سو جاتا ہے میں نجانے کیوں جاگنے لگتا ہوں، تب مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ساری کائنات قدرت کی مزاح نگاری کا ایک شاہکار ہے اور اس شاہکار کے

کے بارے میں سوچتے سوچتے اچانک میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ مجھے یہ وہم سا ہوتا ہے کہ یہ آنسو میری آنکھوں سے نہیں بہہ رہے ہیں بلکہ یہ آنسو اس انسان کی آنکھوں سے میری آنکھوں میں بس یوں ہی چلے آئے ہیں جس نے شاید آج سے دو ہزار سال پہلے یا اس سے بھی کئی ہزار سال پہلے اپنی آنکھوں سے بہایا ہوگا۔ میں انہیں اپنی تاریخ اور ثقافت کی امانت سمجھ کر اپنی آنکھوں میں چھپا لیتا ہوں۔۔۔۔

فراق کا ایک مصرعہ ہے

ع ہاں دھیمے لفظوں سے ستا، یہ صدی بول رہی ہے

ایک منفرد ادیب آہستہ آہستہ عالم وجود میں آ رہا ہے۔ کیا باقی کے چھوٹے اس کا سواگت کر پائیں گے جب وہ اپنے پورے قد و قامت کے ساتھ سب کے سامنے رونما ہوگا؟ اقتباس میں نے اوپر پیش کر دیا ہے۔ ایک بڑی آواز اپنی رُوپ ریکھا صاف طور پر جھلکا رہی ہے۔ کیا یہ آواز واقعی ایک دن بڑی بن پائے گی؟

کیونکہ بقول مرزا یگانہؔ ؎ بلند ہو تو کھلے تجھ پر زور پستی کا
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا گئے ہیں کیا کیا

اس کے لئے کچھ تو مجتبیٰ کو جواب دینا ہے کہ وہ کس حد تک آواز کی دیوی کی تپسیا کر رہے ہیں اور کچھ خود ہمیں کہ کہاں تک مجتبیٰ کو خود سے بھی بلند ہونے کے لئے اپنی رفاقتوں کے جکڑتے ہوئے ذات کے بندھنوں سے رہا کر دیں گے۔ ▲▼

(نومبر ۱۹۶۹ء)

ارسطو اور مزاح ۔۔۔۔۔ نئی تحقیق

ارسطو کی "بوطیقا" کے پہلے حصے سے اسکالرز تو صدیوں سے واقف ہیں جس کے پیش لفظ ہی میں ارسطو نے واضح کر دیا تھا کہ وہ کامیڈی یا طربیہ سے اپنی کتاب کی دوسری جلد میں بحث کرے گا لیکن یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ کتاب اس نے لکھی بھی تھی یا نہیں۔ یہ بھی شبہ کیا جاتا رہا کہ قرون وسطیٰ کے عیسائی پادریوں نے اس کو تباہ بھی کر دیا ہو کہ وہ لوگ مزاح، طربیہ اور طنز کے سخت مخالف تھے حال ہی میں ایک فرانسیسی اسکالر پروفیسر رچرڈ جانکو کو پیرس کی ایک لائبریری میں ایک مخطوطے کے کچھ حصے ملے ہیں جو دسویں صدی کے ایک عیسائی راہب کی تصنیف ہے جس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ اوراق ارسطو کی شہرۂ آفاق کتاب بوطیقا کی دوسری جلد کے کچھ حصے ہیں۔ فرانسیسی اسکالر جانکو کہتا ہے کہ مخطوطے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ارسطو مزاح کو تکلف پسندی اور اقتدار کے خلاف ایک اہم ہتھیار سمجھتا تھا۔"

ڈاکٹر شیر جنگ گرگ

مجتبیٰ حسین میری نظر میں

ہندی سے ترجمہ
محمد اسلم

ہندی میں شائع ہونے والے اپنے پہلے طنزیہ مجموعے کو مجتبیٰ حسین نے "قصہ آرام کرسی کا" نام دیا ہے۔ مشہور و معروف طنز و مزاح نگار ہونے اور اپنی عادت کے مطابق تیکھے تبصرے کرنے میں ماہر ہونے کی وجہ سے وہ آرام کرسی کے ساتھ بھی چھیڑ چھاڑ کرنے سے کبھی باز نہیں آئے۔ آرام کرسی پہ آرام فرمانے کے بجائے انھوں نے آرام کرسی کے ڈھیلے ڈھالے پہلوؤں کو کسنے اور آرام طلبی کے عادیوں سے جواب طلبی کرنے کا کام شروع کر دیا۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ آرام کرسی کے اس قصے نے نہ تو مجتبیٰ حسین کو آرام سے بیٹھنے دیا اور نہ ہی اُن کے قارئین کو۔ گویا مصنف کی طعنہ بھری طنزیہ جملے اور پھبتیاں جاری رہیں اور قارئین کے پیٹ میں بل پڑتے گئے۔ مطلب یہ کہ آرام کرسی کے قصے نے آرام کے ساتھ رنج منانے والوں کا آرام حرام کر دیا۔

مجتبیٰ حسین اور ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین سے جیسے جیسے میرا تعارف ہوتا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اپنے طنز و مزاح کے ذریعہ وہ ہمیشہ ہی "آرام بڑی چیز ہے منہ ڈھک کے سوئیے" جیسے محاوروں کی ہنسی اُڑاتے رہے ہیں۔ آرام کرنے اور آرام کرنے والوں کو انھوں نے ہمیشہ دوسرے درجے کا آدمی سمجھا ہے۔ اُن کی شخصیت پر بھی یہی بات چسپاں ہوتی ہے۔ ہمیشہ تر و تازہ اور کسی بھی موضوع پر کچھ کہنے اور لکھنے کو تیار رہیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے طنزیہ مضامین میں بھی انھوں نے بے حد معمولی لگنے والے نکتوں کو چھو کر غیر معمولی بنا دیا ہے تمام معمولی پن کو غلط سلط قرار دے دیا ہے۔

پچھلے دنوں مجھے مجتبیٰ حسین کا ایک طنزیہ مضمون "مجھے میرے دھوبی سے بچاؤ" پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے اس مضمون میں اپنے دھوبی کی بھرپور دُھلائی کر ڈالی ہے۔ دھوبی نام کا شخص سامنے آتے ہی اس مضمون کے درجنوں لفظ دل و دماغ پر تیرنے لگتے ہیں۔ اور ہنسی روکے نہیں رکتی۔ اسی طرح اُن کے ایک طنزیہ مضمون کا عنوان "خُدا بچائے نا دیکھنے سے" ہے۔ اس مضمون میں فلمی دنیا کے تمام غیر فلمی لوگوں کے نمونے تو ملتے ہی ہیں ساتھ ہی مجتبیٰ حسین کی بے باک اور چبھنے والی، مزاح سے پُر، اُن کی تحریر کے انداز کی اعلیٰ جھلک بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ بات بات میں چٹکی اور چٹکی بھرتے بہت ہی گہرے مگر تیکھے اور باریکی سے طنز پیدا کرنے کی صلاحیت، مجتبیٰ حسین کو اردو میں ہی نہیں، تمام چوٹی کے ہندوستانی طنز و مزاح نگاروں کی پہلی صف میں بٹھا دیتی ہے۔

مجتبیٰ حسین کے قلم نے زیادہ تر معاشرتی برائیوں کا ہی مقابلہ کیا ہے۔ کیونکہ ان کا مقصد اور نشانہ معاشرتی

برائیوں کی صحیح ڈھنگ سے تصویر پیش کرتا ہے۔ صحیح معاشرے میں غلط سیاست کے لیے کوئی مقام نہیں ہے۔ شاید اسی لیے مجتبیٰ حسین معاشرتی برائیوں کو اُجاگر کرکے تبدیلی کا ماحول بنانے سے سروکار رکھتے ہیں۔ معاشرہ بدلے گا تو سیاست میں سدھار اپنے آپ پیدا ہوجائے گا۔ مجتبیٰ حسین کے طنز کا یہی مشن اور مقصد ہے۔

آرام کرسی کے قصہ گو۔ مجتبیٰ حسین آرام کرسی پر بھی اسی لیے بیٹھتے ہیں کہ اُس کے بے جان اور کمزور پُرزوں کی جانکاری حاصل کرسکیں۔ ایسی حالت میں اُن کے خود کے آرام کرنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ آرام و آسائش کے ہر مقام پر اُن کا یہی طریقہ رہتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہر آسائش اور ہر آرام انھیں مزاح پیدا کرنے، حملہ کرنے اور ہنسنے کا موضوع نظر آنے لگتا ہے۔ اور موقع پاتے ہی وہ اس کے پرخچے اُڑا ڈالتے ہیں۔

آرام کرسی کا یہ قصہ لمبے عرصے تک اسی طرح معاشرتی برائیوں کی نیند حرام کرتا رہے، میری یہی تمنا ہے۔

□□

اقتباسات

(سالنامہ شگوفہ، ڈسمبر جنوری ۷۲-۱۹۷۱ء)

مجتبیٰ حسین کا پہلا مقدمہ

"سائے سے جلنے کا مصنف"

"کہتے ہیں کہ معصوم اور شریف ترین آدمی سے بھی زندگی میں کبھی کبھی کوئی غلطی سرزد ہوجایا کرتی ہے۔ چنانچہ مسیح انجم جیسے شریف اور حلیم الطبع آدمی سے بھی نادانستہ طور پر دو غلطیاں سرزد ہوگئی ہیں۔ پہلی غلطی یہ کہ انھوں نے کتاب چھاپنے کا فیصلہ کیا اور دوسری غلطی یہ کہ مجھ سے اس کتاب کا مقدمہ لکھنے کی خواہش کی۔

پہلے پہل جب مجھے پہلی غلطی کا علم ہوا تو میں نے ایک دوست کی حیثیت سے انھیں ان سارے خطرات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی جو آدمی کے "اہل کتاب" بننے کے بعد نمودار ہوتے ہیں۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ "مسیح صاحب! آپ تو اچھے خاصے مزاح نگار ہیں۔ کتاب چھپوا کر اپنے آپ کو رسوا کرنا کیوں چاہتے ہیں۔ ذاتی تجربہ کی بناء پر میں یہ کہنے کے موقف میں ہوں کہ کوئی ادیب جیسے ہی "صاحب کتاب" بنتا ہے تو لوگوں کو خواہ مخواہ اس میں کئی خامیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ کچھ نہیں تو لوگوں کو زبان کی غلطیاں ہی نظر آجاتی ہیں۔ یہ بھی نہ ہوسکا تو دوستوں کو یہ شکایت کرنے کا موقع ہاتھ آجاتا ہے کہ انھیں کتاب کا اعزازی نسخہ نہیں ملا۔ اب کون کہاں تک وضاحتیں پیش کرتا پھرے۔ مسیح انجم یوں بھی خاصی پرسکون زندگی گزارنے کے عادی ہیں۔ مجھے شبہ ہے کہ وہ ان مصیبتوں کو جھیلنے کے اہل نہیں جو اہل کتاب حضرات کے حصے میں آتی ہیں۔ آپ ہی سوچئے کہ بیٹھے بٹھائے اپنے مضامین کو نقادوں کا تختۂ مشق بنانے سے کیا حاصل؟ میں اس شہرت کو بہتر سمجھتا ہوں جس کے اطراف تھوڑی سی گمنامی کی فضا بھی باقی رہے۔"

یُونس فہمی

مُجتبیٰ حسین آئینۂ فن میں!

مفکرین ادب نے طنزیہ و مزاحیہ ادب کو ایک ایسا ادب تسلیم کیا ہے جس میں مقصدیت اور افادیت کی بھرپور طاقت پوشیدہ ہوتی ہے۔ یہ ادب افراد کے خیالات و رجحانات کو نفاست اور پاکیزگی عطا کرتا ہے۔ طبائع انسانی کو پژمردگی سے نجات دلاکر شاداب فضا میں لے آتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ طنزیہ و مزاحیہ ادب جب ترقی کی منازل طے کرتا ہے تو قوم و افراد کے افکار، تصورات، رجحانات اور خیالات کو مقصدی رنگ میں رنگ کر طہارت بخشتا ہے۔ یہی وہ ادب ہے جو بود و باش کے اصول، طور طریق اور رسوم و رواج سے ہوتا ہوا سیاسی، ملکی، اقتصادی و سماجی معاملات کو حقیقی زندگی سے ہمکنار کرتا ہے۔

طنز و مزاح کے مہین پردوں میں حیاتِ انسانی کے مختلف ناپسندیدہ اعمال کی نشاندہی اس طرح کی جاسکتی ہے جیسے کڑوی دوا کو SUGAR COATED بناکر کھلایا جائے۔

سڈنی اسمتھ SYDNI SMITH کہتا ہے ؎

"CIVILIZATION IMPROVES HUMOUR, FROM HUMOUR OF THE BODY — INTO HUMOUR OF THE MIND."

کسی مفکر کا یہ قول بھی قابلِ غور ہے ؎

"طنز و مزاح کے تدریجی ارتقاء کو اس طوفانی ندی سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جو پتھروں اور چٹانوں سے سر پٹکتی، شور مچاتی اور جھاگ اڑاتی آخرش ایک وسیع کشادہ اور پرسکون دریا کی صورت اختیار کرے اور پھر سمندر میں مل کر ابدیت سے ہمکنار ہوجائے۔"

طنزیہ و مزاحیہ ادب کا یہ پہلو بھی بڑا اہم ہے کہ یہ صرف ہنسی مذاق اور ٹھٹھول ہی تک نہیں ہوتا بلکہ تفکر کی (موثر انداز میں) دعوت بھی دیتا ہے اس کے تیر کا نشانہ محض کوئی انسان ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کی مکمل شخصیت ہوتی ہے۔ مبالغہ تخیل کی اڑان یا مفروضات سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا برخلاف اس کے وہ مادی حقائق ہی پر نظر رکھتا ہے۔ اس طرح یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا کہ یہ فنکار انتہا درجہ کا RATIONAL اور قوی ارادہ کا مالک ہوتا ہے۔ اور یوں یہ ادب قوم و ملک کا قیمتی سرمایہ بن جاتا ہے۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ یہ ادب

تخیلاتی نہیں مشاہداتی ہوتا ہے۔

ظ۔ انصاری نے لکھا کہ ہے

"غور طلب ہے ہماری زبان کی یہ صفت کہ اس کا ادب کتنا کم عمر اور اس میں بھی بہت سا وقت رونے بسورنے میں نکل گیا (غزل ہو یا مثنوی، مرثیہ ہو یا داستان زیادہ تر المیہ ہے) تاہم حسِ مزاح نہایت نازک، جملوں کی کاٹ بے حد تیز دھار شفاف، نوک پلک لطیف اور ہلکے سے اشارے میں بات کی سطح بلند و پست کر دینے کی صلاحیت غیر معمولی"

ہندو پاک کے طنز و مزاح نگاروں میں ایک منفرد نام مجتبیٰ حسین کا ہے جن کی شگفتہ، چلبلی اور قہقہہ بردوش تحریروں نے طنزیہ و مزاحیہ ادب کو بڑا اعتبار بخشا ہے۔ لطیف مزاح، شائستگی، شرافت، نیکی، اعتدال پسندی، زبان کا رچاؤ، تیکھا اور دلنشیں انداز انھیں اپنے ہم عصروں میں سب سے نمایاں مقام عطا کرتا ہے۔ مفکرین ادب کی رائے ہے کہ ہنسی اور قہقہہ انسان کی تندرستی کے لیے ویسے ہی ضروری ہیں جیسے صاف ہوا اور پانی اس تناظر میں مجتبیٰ حسین کے فن کا جائزہ لیجئے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں دکھائی دے گی کہ قہقہوں کے بادل مجتبیٰ کے حکم کے منتظر رہے ہیں ادھر اشارہ کیا کہ اُدھر برسنے لگے۔

جدید دور کا انسان ہنسنے کے لیے تڑپ رہا ہے۔ ویسے ان گنت مصنوعی ذرائع اُسے ہنسنے کے مواقع فراہم کرتے ہیں لیکن صرف تفریح کے سہارے انسانیت کیونکر پروان چڑھے! فلم کا کامیڈین یا سرکس کا جوکر بھلا کب تک یہ کام انجام دے سکتے ہیں۔ اور صرف ہنسی یا خندہ ہی ہمارے درد کا درماں نہیں۔ یہ تو وہ دور ہے جس میں انسان کو دوسروں سے کہیں زیادہ خود پر ہنسنا چاہئے کیونکہ آج کا انسان اقدار، فکر اور سچائی سے متنفر ہے۔ چنانچہ یہ کام ایک طنز و مزاح کا علمبردار (خواہ وہ شاعر ہو کہ ادیب) ہی انجام دے سکتا ہے اور میری رائے میں اِس فن شریف کے تمام عناصر مجتبیٰ حسین کی شگفتہ تحریروں میں بکھرے پڑے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ راقم نے مجتبیٰ حسین کے فن اور شخصیت" کو پی۔ ایچ ڈی کا موضوع بنایا ہے۔ مرہٹواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد نے اس مقالہ کی توثیق بھی کر دی ہے۔

یہ ایک نعرہ ہی ہے کہ ہمارا معاشرہ ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہم نے ترقی کے کتنے زینے طے کئے؟ جواب بڑی دیر میں آئے گا۔ اس لیے آئیے آگے بڑھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے مزاج روایت پرستانہ ہی ہیں، ہماری فکر پر آج بھی قدامت کے اصول سایہ فگن ہیں۔ ہم جاگیرداری نظام پر آج بھی کاربند ہیں، ہم نے بے جا شیخی اور احساسِ برتری سے چھٹکارا نہیں پایا ہے، بھوک، افلاس اور بے روزگاری ہم سے لپٹی ہوئی ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ آج کا فنکار بھی انھیں حالات سے دوچار ہے جیسا کہ صدیوں پہلے تھا۔ وہ کل بھی بھوکا تھا آج بھی بھوکا ہے مشاعروں میں شاعروں کو ہوٹ کرنے کی رسم آج بھی زندہ ہے دیکھئے ایک شاعر عوام سے کیا کہہ رہا ہے

"حضرات اگر آپ لوگوں نے انڈے نہیں پھینکے تو میں غزل نہیں سناؤں گا جب دو چار انڈے پھینکے گئے تو علامہ نے غزل کا سلسلہ شروع کیا۔ علامہ نے ایک معمول سا بنا لیا کہ جب بھی کسی شاعر نکل جاتے تو لوگوں سے کہتے کہ آج مجھ پر آلو پھینکے جائیں کیونکہ آج آلو کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔

ایک بار تو انھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ "آج مجھ پر ایک پلیٹ بریانی، ایک پیالی چائے اور ایک سگریٹ کی ڈبیہ چھلکی جائے"۔ (علامہ ظ۔ انصاری کی وفات حسرت آیات پر — مجتبیٰ حسین)

یوں تو ہر فنکار مشاہدہ کے سلسلے میں عوام سے بالکل مختلف ہوتا ہے طنز و مزاح نگار کا مشاہدہ دیگر فنکاروں کے مقابلے میں صد درجہ تیز اور نظر عقابی ہوتی ہے۔ اس کے ثبوت میں مجتبیٰ حسین کا مضمون "لائبریری میں چند گھنٹے" کے دو اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔ کون نہیں جانتا کہ لائبریریاں علوم و فنون کے سمندروں کی پرورش کرتی ہیں۔ طالبانِ علم یہیں اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ لیکن جدید زمانے میں جس طرح سڑکوں کے فٹ پاتھ، اور بلند عمارتوں کے سائے غربت و افلاس کو پناہ دیتے ہیں عبادت گاہوں میں ہولناکیوں کے مناظر دکھائی دیتے ہیں تو لائبریری جیسی جگہ کیوں چھوٹ جائے ذیل کے اقتباس میں طنزیہ مناظر دیکھئے کہ آج کا انسان بنیادی ضرورتوں (BASIC NEEDS) سے محروم بھی ہے اور حصول کے ضمن میں غیر مطمئن بھی ہے۔

"میں ایک ناظر صاحب سے واقف ہوں جو صرف موسم برسات میں بڑی پابندی سے لائبریری آتے ہیں میں نے پورے ادب و احترام کے ساتھ ان سے پوچھا۔ اجی حضرت! یہ کیا بات ہے کہ آپ صرف برسات میں مطالعہ کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ اس پر وہ ٹھنڈی آہ کھینچتے ہوئے بولے بھائی! بات دراصل یہ ہے کہ برسات کے موسم میں میرے مکان کی چھت بہت ٹپکتی ہے چونکہ لائبریری کی چھت نہیں ٹپکتی اسی لیے میں موسم برسات میں مطالعہ کی طرف راغب ہوتا ہوں"

مجتبیٰ حسین کے قلم میں بڑی روانی اور مشاہدہ میں بڑی تیزی ہے۔ وہ تیکھے طنز پر قادر اور لطیف مزاح پیدا کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ لائبریری والے مضمون میں طنز و مزاح کے حسین امتزاج کی ان گنت جھلکیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ مجتبیٰ حسین نے مشاہدہ کی آنکھ سے دیکھا کہ یہاں آنے والے سبھی لوگ کتابوں سے مستفید ہونے کے لیے نہیں آتے بلکہ کوئی لائبریری کو ہوٹل کے طور پر استعمال کرتا ہے تو کوئی ڈرائنگ روم کے طور پر، کوئی سونے کے لیے آتا ہے تو کوئی معشوقہ سے ملاقات کے لیے اور کوئی صرف اپنی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے کے لیے۔ لیکن ذیل کے اقتباس میں مصنف کے انوکھے مشاہدے کو دیکھئے۔

"میں ناظرین کے چہروں کو پڑھنے کا اب اتنا ماہر ہو گیا ہوں کہ دور ہی سے کسی ناظر کے چہرے کو دیکھ کر یہ بتا سکتا ہوں کہ وہ کونسی کتاب پڑھ رہا ہے اگر کوئی قاری مسلسل اونگھ رہا ہے تو سمجھئے کہ وہ فلسفہ کی کوئی کتاب پڑھ رہا ہے اگر قاری تھوڑی دیر اونگھ رہا ہو اور تھوڑی دیر جاگ رہا ہو تو جانئے کہ وہ معاشیات کی کوئی کتاب پڑھ رہا ہے۔ اگر قاری پر رقت طاری ہو جیسے اس نے کاسٹر آئیل پی رکھا ہو تو سمجھئے کہ وہ ضرور کوئی المیہ رومانی ناول پڑھ رہا ہے۔ اگر قاری کے چہرے پر وحشت برس رہی ہو تو جانئے کہ وہ ضرور کوئی جاسوسی ناول پڑھ رہا ہے"

مجتبیٰ حسین آٹھ نہایت جاندار اور باغ و بہار قسم کی کتابوں کے مصنف ہیں ایک کتاب "مجتبیٰ حسین کے کالم" زیر طبع ہے۔ یہ اپنے مزاج کچھ لاابالی پن کی وجہ سے یا یوں کہئے بے نیازی کے باعث بکھرے ہوئے ہیں

مجھے تو یوں لگتا ہے کہ آٹھ کتابوں میں انھیں ان کے مخلصین نے محصور کر دیا ہے ورنہ ان کے بے شمار مضامین ملک کے اہم رسائل اور سرکردہ اخباروں میں چھپ کر یکجا ہونے کو ترس رہے ہیں۔ ان منتشر فن پاروں کو اگر یکجا کیا جائے تو شاید ان کی تصانیف کی تعداد موجودہ تعداد سے دوگنی ہو جائے۔ جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں آدمی نامہ اور "جاپان چلو جاپان چلو" اپنی جدت اور فنکارانہ خوبیوں کے باعث مصنف کو بقائے دوام بخشنے کے لیے کافی ہیں۔

خاکہ نگاری اُردو ادب کے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ انشاء اللہ انشاء کی دریائے لطافت، محمد حسین آزاد آبِ حیات، مرزا فرحت اللہ بیگ کے خاکے، خواجہ حسن نظامی، محمد علی جوہر، مولانا عبدالماجد دریا بادی، چکبست اور دتاتریہ کیفی کی تحریروں میں اس کے نمونے مل جاتے ہیں۔ مولوی عبدالحق کی واحد تصنیف "چند ہم عصر" اور رشید احمد صدیقی کی گنجہائے گرانمایہ، تو خاکہ نگاری کے اعلیٰ نمونے ہیں مولوی عبدالحق کی تحریر پر سنجیدگی اور گمبھیرتا چھائی ہوئی ہے اور رشید صدیقی تبسمِ زیرلب کی دعوت دے کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

برخلاف اس کے مجتبیٰ حسین کے خاکے (SKETCHES) بھرپور مزاح، معیاری خندہ، اور اعلیٰ طنز نگاری کے ارفع نمونے ہیں۔ طنز و مزاح ایک ایسا فن ہے جس کو لوہبی اکتساب کی مدد سے حاصل کرنا قطعی ناممکن ہے کیونکہ دیگر اصنافِ ادب سے ہٹ کر یہ راہ بڑی دشوار گزار ہے۔ لیکن مجتبیٰ حسین اس پر بے تکان دوڑتے ہیں ان کی کتاب آدمی نامہ، پڑھیے اور تلاش کیجیے کہ کہیں تنقید و تنقیص، پھکڑ اور بھونڈے شجرہائے ممنوعہ کے سائے کہیں نظر آتے ہیں کیا۔ برخلاف اس کے ان خاکوں نے شخصیتوں کی پہچان کو آسان بنا دیا۔ اور لطف یہ کہ فنکارانہ دیانتداری قہقہوں کی مسلسل بارش ماحول کو زعفران زار بنا دیتی ہے۔ مجتبیٰ حسین کی یہ قلمی تصویریں (PEN PORTRAITS) متعدد مقامات پر قاری سے ہمکلام ہوتی ہیں۔ اور فن کار کی چابکدستی و برق نگاہی کے قصیدے پڑھتی ہیں۔ مجتبیٰ حسین کی فراخدلی اور غیر جانبدارانہ اسلوب نے ہر شخصیت کے سراپا کو یوں پیش کیا کہ شخصیت کسی مزید تعارف کی محتاج نہیں رہی۔ ہر شخصیت کے کردار، زاویۂ نگاہ، افتادِ طبع اور خوبیاں و خامیاں کچھ ایسے پیرائے میں بیان کی گئی ہیں کہ مبالغہ، تصنع اور بناوٹ کو منہ کی کھانی پڑی۔ اور یہی دراصل طنز و مزاح نگار کا منصب ہے۔ یہی اس کے عظیم فن کار ہونے کی دلیل ہے۔ کہیں کہیں البتہ تخیل کے پنچھی اُڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کی پرواز کچھ زیادہ بلند نہیں ہے اس لیے یہ سقم نمایاں عیب نہیں بن پاتا۔

طنز و مزاح کی قدآور شخصیت کنھیا لال کپور (مرحوم) کے بارے میں صرف دو سطریں ملاحظہ کیجیے۔

"کنھیا لال کپور کو جب بھی دیکھتا ہوں قطب مینار کی یاد آتی ہے اور جب قطب مینار کو دیکھتا ہوں تو آپ جان گئے ہوں گے کس کی یاد آتی ہو گی۔"

کنھیا لال کپور کا قد بہت اونچا تھا اور وہ ایک چھریرے بدن کے مالک تھے اس اعتبار سے مجتبیٰ حسین نے انھیں قطب مینار کہہ کر اُن کی ظاہرہ شخصیت کی بھرپور تصویر کشی کی ہے۔ اسی لیے انھوں نے کپور کو "لمبا آدمی" کے زیرِ عنوان متعارف کروایا۔ اور بالکل اسی طرح شخصیت کی نہایت موزوں تصویر کشی نے مزاح نگاری میں عموماً اور خاکہ نگاری میں خصوصاً مجتبیٰ حسین بے حد کامیاب ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی کو انھوں نے "سنو ہے وہ بھی آدمی"، اعجاز صدیقی کو "اردو کا آدمی" مخدوم محی الدین کو "یادوں میں بسا آدمی" کرشن چندر کو "آدمی ہی آدمی" رضا نقوی واہی کو "منظوم آدمی" نریندر لوتھر کو "شیشہ کا آدمی" عمیق حنفی کو "آدمی در آدمی" مخمور سعیدی کو "بحیثیت مجموعی آدمی"

اور اپنے بھائی ابراہیم جلیس کو "اپنا آدمی" لکھ کر مجتبیٰ نے کمال ہی کر دیا۔

ان پندرہ خاکوں میں ہر خاکہ اپنی مثال آپ ہے یہ کہنا بڑا دشوار ہو جاتا ہے کہ ان میں سب سے اچھا خاکہ کون سا ہے جیسے لکھا جاتا ہے کہ رشید احمد صدیقی کے خاکوں میں سب سے اچھا خاکہ "ایوب عباسی" کا ہے یا عبدالحق کے خاکوں میں سب سے اچھا "نور خاں" کا خاکہ ہے۔

مجتبیٰ حسین کا ناقد جب اُن کے فن کا جائزہ لیگا تو بلاخوف یہی کہے گا کہ اس فنکار نے فنِ طنز و مزاح کا حق ادا کر دیا۔ ملک کے نامور نقاد ظ۔ انصاری رقم طراز ہیں۔

"مجتبیٰ حسین اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ شگفتہ اور بے تکلف لکھنے والے ہیں۔ حیدرآباد سے پائے تخت دلی پہنچ کر ان کا رنگ زیادہ گہرا گمبھیر یا شوخ و شریر تو نہیں ہوا البتہ چوکھا خوب۔ مثلاً ان کا چوتھا مجموعہ مضامین "آدمی نامہ" جس میں پندرہ آدمیوں کا نام مع القاب درج ہے وہ بھی اس طور سے گویا طرحی مشاعروں کی ردیف وار غزلیں ترتیب دی گئی ہوں۔ غزل گو استاد اپنی مشقِ سخن کی دھونس جمانے کے لیے جس طرح سنگلاخ زمینوں میں سلاست کلام کا جلوہ دکھایا کرتے تھے یہ عطائے القاب اسی طرح کی دلکش ہے۔ سب سے بڑی خوبی مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری میں یہ ہے کہ وہ خاکہ کھینچتے ہیں خاکہ اُڑاتے نہیں کسی سے دل میں بغض نہیں پالتے یہی خوبی ان کے دوسرے شگفتہ مضامین میں خون کی روانی نارمل رکھتی ہے۔"

اب اگر پروفیسر محمد حسن یہ لکھیں کہ "ہنسنے ہنسانے کا فن شریف ہندوستان میں عموماً اور ہندوستان کے اردو ادب میں خصوصاً مائل بہ زوال ہے۔ جو باتیں ہنسنے ہنسانے کی ہیں وہ اب ماتم کا سبب اور گریہ وزاری کا باعث بن گئی ہیں یا بنتی جاتی ہیں۔" تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اردو ادب کا یہ ناقد طنز و مزاح نگاروں سے کس قسم کی توقعات وابستہ رکھتا ہے۔ کیوں کہ طنز و مزاح نگاری ہی زندگی کی حماقتوں کا پرچہ چاک کرتا ہے اور یہ کام ہندوستان کے طنزیہ و مزاحیہ ادب میں اور خصوصیت سے مجتبیٰ حسین کے فن میں بدرجۂ کمال موجود ہے۔

ہنسنے ہنسانے کی باتیں ماتم کا سبب کیوں کر بن سکتی ہیں جب کہ ہنسی اور خندہ انسان کے قدیم ساتھی ہیں انسان جب غیر متمدن تھا اُس وقت بھی ہنستا تھا اور متمدن یافتہ ہو کر بھی ہنستا ہے۔ یعنی ہنسا اُس کے زندہ رہنے کا ثبوت ہے رنج و غم تو انسانی زندگی کے اہم ترین اجزاء ہیں پھر ہنسنا بھی اُس کے لیے لازمی ہے تو یکطرفہ طور پر کسی بات کا فیصلہ شاید نامناسب ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی دنیا کے لیے ایک سنگین مسئلہ ہے تو ہندوستان کے لیے یہ سم قاتل ہے۔ اس پر کنٹرول متمدن معاشرہ کے ہر فرد کا فریضہ ہے۔ اور اس احساس کو جگانے کا کام نہایت موثر انداز میں صرف طنز و مزاح نگاری انجام دے سکتا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے مضمون "نیا سال پرانا جال" کا ایک اقتباس پیش ہے۔

"ہم فطری طور پر لاپرواہ واقع ہوئے ہیں اسی لیے ہمیں ہر وقت نئے سال کی آمد کی خبر نہیں ہوتی ہم تو کیلنڈر کی طرف دیکھے بغیر ہی اپنی زندگی گزار لیتے ہیں یقین مانیئے کہ ہر نئے سال کی آمد کی اطلاع ہمیں اپنی بیوی سے اُس وقت ملتی ہے جب وہ ہر نئے سال میں ہمیں ایک نئے بچے کا باپ بنا دیتی ہے۔"

موجودہ دور میں طنز و مزاح کے فنکار کے لیے موضوعات کی کمی نہیں قدم قدم پر وہ نت نئے موضوعات سے متعارف ہوتا ہے۔ ایک بہت معمولی سی بات ہے لیکن اس میں چھپی ہوئی جبلی جنسی خواہش اور جنسی بے راہ روی فنکار کو اشارہ کرتی ہے کہ متمدن اور مہذب معاشرہ سے اس کا اخراج ضروری ہے مندرجہ بالا مضمون کے ایک اقتباس سے اس کا اندازہ ہو جائے گا۔

"نیا سال آتا ہے تو یقین مانئے سماج میں کیلنڈروں کا ایک سیلاب اُمڈ آتا ہے۔ سگریٹ خریدئیے اور کیلنڈر لیجئے۔ پان خریدیئے اور کیلنڈر لیجیے اور ہم نے ایسے اصحاب بھی دیکھے ہیں جو اپنا تن ڈھانکنے کے لیے تو کپڑا خرید لیتے ہیں لیکن اس کے معاوضہ میں کیلنڈر ضرور ایسی حسینہ کا منتخب کرتے ہیں جس کے بدن پر دُور دُور تک کوئی کپڑا نہیں ہوتا بلکہ ہم نے کپڑوں کی دکانوں پر ملنے والے کیلنڈروں پر ایسی حسیناؤں کی تصویریں بھی دیکھی ہیں جن کے بدن پر گھڑی کے سوائے کوئی اور لباس نہیں ہوتا۔"

نت نئے کیلنڈر حاصل کرنے کا یہ ذوق واقعی بڑا عجیب و غریب ہے اور اس ذوق میں ایسے اشخاص بھی مبتلا ہیں جن کی طلب دیکھ کر بے حد حیرانی ہوتی ہے۔ اپنے گھروں کو نیم عریاں یا عریاں کیلنڈروں سے سجانا آج کے معاشرہ میں متعدی بیماری بن کر عام ہو چکا ہے۔ مجتبیٰ حسین نے کس خوبصورتی سے اس مسئلہ کو چھیڑا ہے۔ ملاحظہ کیجئے :-

"آپ بڑی آسانی سے کسی گھر میں یہ پتہ چلا سکتے ہیں کہ شوہر کا کمرہ کونسا ہے اور بیوی کا کمرہ کونسا؟ اگر کسی کمرہ میں دلیپ کمار، راج کپور، پردیپ کمار یا اسی قسم کے کسی کمار کے کیلنڈر رہا بجا نظر آئیں تو سمجھ لیجئے یہ صاحبزادی کا کمرہ ہے، سائرہ بانو، مینا کماری، مالا سنہا کے کیلنڈر نظر آئیں تو جان لیجئے کہ یہ صاحب کا کمرہ ہے ایک گھر کے ایک کمرہ میں ہم نے نسیم بانو کا کیلنڈر بھی دیکھا تھا ہم نے بڑے اشتیاق سے اہل خانہ سے پوچھا کہ جناب والا یہ کس کا کمرہ ہے تو اہلِ خانہ نے کس قدر جھینپ کر جواب دیا "جی یہ ہمارے دادا جان کا کمرہ ہے اور ہم صرف یہ کہہ کر رہ گئے۔

"ہمہ خاندان آفتاب است"

مختصر یہ کہ مجتبیٰ حسین ایک ایسا فن کار ہے جس کا ظاہر و باطن یکساں ہے۔ اُس کا فن اُس کی شخصیت کا آئینہ دار ہے کیونکہ جب کوئی مجتبیٰ حسین سے ملتا ہے تو ایک خاص قسم کا حظ حاصل کرتا ہے اور یہی کیفیت ان کی پُر لطف شگفتہ تحریروں کا خاصہ ہے۔ وہ ایک سچا اور دیانتدار فن کار ہے جس نے طنز و مزاح نگاری کو نئی جہتوں سے روشناس کروایا۔ ان کے فن کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ابتداً وہ خوب ہنساتا ہے اور پھر ایک ماہر سرجن کی طرح طنز کے نشتر سے دل خراشیوں کے فصد کھولتا جاتا ہے۔ مجتبیٰ حسین کا یہ انوکھا اور منفرد اسٹائل نعمت خداداد ہے اور اسی انفرادیت نے اسے طنز و مزاح کی دُنیا میں نمایاں مقام عطا کیا ہے۔ اس کا فن مائل بر ترقی ہے۔ یہ ترقی اُس کی پُر کشش، پُرخلوص اور بے ریا شخصیت کی دین ہے۔ وہ ایک صداقت پسند فنکار ہے جس کے فن پاروں نے اردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کو ہندوستان سے جاپان تک پہنچا دیا۔

△ △ ______________

رشید الدین
(حیدر آباد)

جاپان چلو جاپان چلو

مجتبیٰ حسین کا سفر نامۂ جاپان

اُردو میں آج بھی طنز و مزاح نگاروں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ پطرس سے رقم الحروف تک آپ انھیں اتنی انگلیوں پر گن سکتے ہیں اس فقدان کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک مشکل اور ساتھ ہی ساتھ نازک صنف ہے طنز و مزاح لکھنا بال سے باریک اور تلوار سے تیز عمل ہے دوسرے الفاظ میں یہ دنیا ہی میں پل صراط سے گزرنا ہے کیونکہ اگر طنز و مزاح نگار ذرا سنجیدہ ہوا تو اس پر بوجھل پن کا الزام عائد ہو جاتا ہے اور اگر اس نے ذرا بھی ضرورت سے زیادہ شوخی دکھائی تو اس کی تحریر پھکڑپن کے زمرہ میں آ جاتی ہے۔ اب تک وہی طنز و مزاح نگار کامیاب گزرے ہیں جنھوں نے ان دونوں کے درمیان توازن برقرار رکھا ہے

اُردو میں ایک ایسے ہی کامیاب طنز و مزاح نگار مجتبیٰ حسین بھی ہیں بلکہ ہندوستان میں (فکر تونسوی کے انتقال کے بعد) زندہ طنز و مزاح نگاروں میں یوسف ناظم کے بعد ان ہی کا نام لیا جا سکتا ہے اور اس مقام پر پہنچنے کے لئے انھیں اپنے کئی سینئر ساتھیوں کو پھلانگنا پڑا ہے۔ کیونکہ ایک خرانٹ طنز و مزاح نگار بننے کے لئے جس عمر و تجربہ کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس تک پہنچنے سے پہلے ہی ممتاز ہو گئے۔

مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کی ابتدار کالم نگاری سے ہوئی۔ کالم نگاری سے قطع نظر ان کا پہلا مزاحیہ مضمون "غالب کے طرفدار" ہے جو ۱۹۶۲ء میں ماہنامہ "صبا" (حیدر آباد) میں چھپا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ان کے پہلے مجموعہ "تکلف برطرف" (۱۹۶۸ء) کے بارے میں کرشن چندر مرحوم نے جو رائے دی تھی وہ کتنی صحیح تھی اس کا اندازہ ہم آج ۱۹۸۷ء میں لگا سکتے ہیں۔ کرشن چندر نے لکھا تھا "مجتبیٰ حسین صحیح معنوں میں مزاح نگار ہیں جوان مزاح نگاروں میں ہیں جو نفیس اور شائستہ ادب کی تخلیق کر سکتے ہیں مزاح نگاری ایک مشکل فن ہے مجتبیٰ حسین ان مشکلات سے بخوبی واقف ہیں۔ مجتبیٰ کا فن اردو کے مزاحیہ ادب میں یقیناً ایک خوشگوار اضافہ ہے"۔

مجتبیٰ حسین کے یہاں موضوع کا تنوع ہے وہ نت نئے موضوعات پر اظہار خیال کرتے ہیں حتیٰ کہ انھوں نے ایک بیرونی ملک کا سنجیدہ سفرنامہ بھی مزاحیہ انداز میں لکھا ہے۔ اُردو میں سفرنامے ویسے بھی بہت کم ہیں اور مزاحیہ انداز میں لکھے ہوئے تو معدودے چند ہیں جن میں ابن انشار کے سفرنامے "چلتے ہو تو چین کو چلیئے" "ابن بطوطہ کے تعاقب میں" اور "دنیا گول ہے" مجھے اس وقت یاد آ رہے ہیں۔ یہاں مجتبیٰ حسین کا سفرنامہ جاپان میرے پیش نظر ہے جو انھوں نے "جاپان چلو، جاپان چلو"

کے عنوان سے ۱۹۸۰ء میں لکھا ہے اور جس کی اکثر قسطیں روزنامہ "سیاست" میں شائع ہوتی رہیں۔ ۱۹۸۳ء میں یہ کتابی صورت میں شائع ہوا۔

مجتبیٰ حسین کا جاپان جانے کا سلسلہ بہت سنجیدہ تھا۔ وہ یونیسکو کی جانب سے ٹوکیو میں منعقدہ پبلشنگ کے ایک تربیتی کورس میں شرکت کرنے گئے تھے۔ تربیتی کورس کے اجلاس اتنے سنجیدہ تھے کہ اس کے بارے میں انھوں نے کچھ نہیں لکھا۔ اس کے جاپان کے بارے میں اس کتاب میں سب کچھ موجود ہے۔ سفر کا سلسلہ کس طرح شروع ہوا وہ آپ مجتبیٰ حسین کے الفاظ ہی میں سنیئے بلکہ پڑھیئے۔

"جولائی ۱۹۸۰ء کی بات ہے۔ ایک دن ہم حسب معمول دیر سے دفتر پہنچے تو پتہ چلا کہ خلافِ معمول ہمارے افسر بالا نے ہمیں یاد کیا ہے۔ ہم ہانپتے کانپتے ان کی خدمت میں پہنچے تو فرمایا۔ "ہم تمھیں جاپان بھیجنا چاہتے ہیں کیا تم جانے تیار ہو؟" ہم نے کہا "سر! ہم جانتے ہیں کہ زمانۂ قدیم میں جب کسی شخص سے کوئی جرم سرزد ہو جاتا تو اسے سزا کے طور پر ملک بدر کر دیا جاتا تھا۔ مانا کہ ہم دفتر دیر سے آئے لیکن یہ اتنا بڑا جرم نہیں کہ آپ ہمیں جاپان بھیج دیں۔ بولے۔ تم ہر بات میں مزاح کا پہلو نکال لیتے ہو۔ ہم تمھیں سچ مچ جاپان بھیجنا چاہتے ہیں"۔

جہاں یہ سفرنامہ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے وہیں ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے:

"آخر میں یونیسکو کے ایشیائی ثقافتی مرکز کے سارے عہدیداروں کا احسان مند ہوں کہ ان کے حسن سلوک کے بغیر میری جھولی میں جاپان کی اتنی قیمتی، انمول اور ان گنت یادیں نہ ہوتیں۔ یہ سفرنامہ ہندی میں نہ صرف چھپ چکا ہے بلکہ مقبول بھی ہو چکا ہے اور ہندی کی معرفت اس کی بعض قسطیں دیگر ہندوستانی زبانوں میں بھی چھپی ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ جس زبان میں یہ سفرنامہ لکھا گیا ہے وہاں اس کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے۔ سائونارا (خدا حافظ)"

آفسیٹ کے ۲۱۰ کتابی صفحوں پر پھیلا ہوا یہ سفرنامہ اپنے اندر جاپان کے بارے میں ساری معلومات رکھتا ہے۔ اسے پڑھنے کے بعد آپ کو اس ملک کے بارے میں کوئی چیز تشنہ نہیں معلوم ہوتی۔ اور پھر لطف یہ کہ طرز بیان یکساں شگفتہ اور دلچسپ ہے۔ تحریر کہیں سنجیدہ اور بوجھل نہیں ہونے پائی ہے اس میں جاپان کے بارے میں وہ تمام باتیں اور معلومات مندرج ہیں جو کسی بھی سنجیدہ سفرنامہ میں ہو سکتی ہیں۔ جاپان کی تاریخ، ثقافت، صنعتی ترقی، ادب، آرٹ، سب کا اس میں احاطہ موجود ہے۔ پوری کتاب ۱۵ ابواب پر مشتمل ہے جن میں جاپان میں اُردو، اور جاپان میں اسلام جیسے ابواب بھی شامل ہیں۔

اس میں آپ کو بلٹ ٹرین کی تفصیل بھی ملے گی، جاپان کے بازاروں کی سیر بھی ملے گی۔ ٹوکیو یونیورسٹی کا تذکرہ بھی ملے گا اور ہوٹلوں میں کھانے کے آداب سے بھی واقفیت حاصل ہوگی۔ پیسے کی ریل پیل کی داستان ملے گی حتیٰ کہ مجتبیٰ جاپان کے گیشاؤں سے بھی آپ کی ملاقات کرائیں گے۔ گیشا جاپان میں طوائف کے مماثل کی چیز ہوتی ہے یہی نہیں وہ آپ کو ایک مسجد میں بھی لے جائیں گے جو ہندوستانی مسجد سے یکسر مختلف ہے اور جہاں نماز کے بعد تمام نمازیوں کو مفت کھانا ملتا ہے۔ مفت کھانے کی لالچ میں ان کے ایک سری لنکا کے ہندو مندوب دوست بھی نماز پڑھ لیتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

مجتبیٰ حسین نے جملہ ۳۵ دن جاپان میں گزارے لیکن وہاں سے اتنی ساری معلومات اکٹھا کر لائے کہ مانو وہ ۳۵ مہینے جاپان میں رہے۔ پھر انھوں نے باتوں ہی باتوں میں جاپان اور اس کے معاشرہ کے بارے میں ہمیں بڑی کام کی باتیں بتا دیں مثلاً

وہاں کے لاء اینڈ آرڈر کے بارے میں وہ ہمیں بتلاتے ہیں ۔

"جاپان وہ واحد ملک ہے جہاں جرائم کی تعداد سب سے کم ہے اگرچہ ہمیں پولیس نظر نہ آتی تھی مگر پھر بھی ہر طرف امن ہی امن نظر آتا تھا ہماری طرح نہیں کہ پولیس تو جگہ جگہ نظر آتی ہے لیکن امن و امان کہیں نظر نہیں آتا ۔"

جاپان کی تاریخ وہ اس طرح بیان کرتے ہیں ۔

" نارا جاپان کا قدیم دارالحکومت رہا ہے بعد میں ٹوکیو دارالحکومت بنا۔ پچھلی صدی کے آخری ربع تک جاپان کے شہنشاہ یہیں رہا کرتے تھے نارا اور کیوٹو کے پگوڈوں کو دیکھ کر ہم دم بخود رہ گئے۔ لکڑی کی ایسی عظیم الشان عمارتیں جاپانیوں ہی کا حصہ ہے ۔ ٹوکیو ہی وہ شہر ہے جہاں ۱۸۶۸ء میں توکوگاوا فوجی حکمران خاندان کے آخری سربراہ نے شہنشاہ میجی کو اقتدار سونپا تھا کہ حضرت آپ ہی اس ملک کو سنبھالیئے ۔ ہم سے یہ نہیں سنبھلتا ۔ ۱۸۶۸ء سے پہلے دنیا میں جاپان کی کوئی حیثیت تھی اور نہ اہمیت ۔ میجی حکومت نے ہی وہ انقلابی فیصلے کیے جن کی بناء پر جاپان اتنی ترقی کر چکا ہے ۔ شہنشاہ میجی نے ہی جاپان کے تعلقات امریکہ اور یورپی ممالک سے پیدا کیے ورنہ اس سے پہلے جاپان گوشہ نشین ملک تھا جاپانیوں نے صرف ایک صدی کے اندر مغربی ممالک کی سائنس اور ٹکنالوجی سے کچھ اس طرح استفادہ کیا کہ آج ترقی کے میدان میں مغربی ممالک سے آگے نکل گئے ۔"

جاپانیوں کے مطالعہ کی عادت کے بارے میں یہ عبارت پڑھیئے ۔

"صاحبو ! اگر ہم نے اس سیمینار کا تفصیل سے ذکر نہیں کیا تو اس کی وجہ صرف اتنی تھی کہ ہم اپنے احساس کمتری پر قابو نہیں پاسکے۔ سارے ایشیاء میں جاپانی سب سے زیادہ پڑھاکو قوم ہے اور دنیا بھر میں ان کے اشاعتی کاروبار کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے ہم نے محسوس کیا کہ جاپانی یا تو لکھتا ہے یا پڑھتا ہے۔ باتیں بہت کم کرتا ہے ۔ جہاں جائیے لوگ کتابیں خریدنے اور پڑھنے میں مصروف رہتے ہیں ۔ ٹوکیو میں ایک محلہ ہے کندا جو شہنشاہ جاپان کے محل سے متصل ہے اس میں ہر طرف کتابیں ہی کتابیں فروخت ہوتی ہیں کتابوں کی اتنی بڑی دوکانیں ہم نے کہیں نہیں دیکھیں ۔ ہوٹلوں اور تفریح گاہوں میں بھی کتابوں کی فروخت کا انتظام ہے چار پانچ سال کی عمر کے بچے بھی نہ صرف کتابیں خریدتے ہیں بلکہ انھیں پڑھتے بھی ہیں ۔ جاپان کی آبادی تقریباً ½۱۲ کروڑ ہے اور سال بھر میں تقریباً ۸۰ کروڑ کتابیں فروخت ہوتی ہیں گویا ہر جاپانی سال بھر میں ساڑھے چھ کتابیں ضرور خریدتا ہے ۔"

پڑھنے پڑھانے کے بعد آئیے اب جاپان کے بازاروں کی سیر کریں ۔

" ٹوکیو کے بازار دنیا بھر کی چیزوں سے بھرے پڑے ہیں بہت سی چیزوں کے بارے میں ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ کس کام میں آتی ہیں اور ان کے خریدار کون ہیں ۔ یوں بھی ہمیں ٹوکیو میں جاپانیوں کی محبت اور خلوص کے سوائے کچھ نہیں خریدنا تھا۔ کیونکہ یہی وہ چیز ہے جس پر وطن عزیز میں کسٹم والے کوئی ڈیوٹی نہیں لگاتے ۔ وہ لاکھ تلاشی لیں مگر ہمارے دل میں چھپی ہوئی محبت کی دولت کو کہاں پکڑ سکتے ہیں ۔"

لگے ہاتھوں بلٹ ٹرین کے بارے میں بھی کچھ معلومات حاصل کر لیجئے ۔

" بلٹ ٹرین کا انجن بالکل طیارہ کی شکل کا ہوتا ہے ۔ دیکھنے میں بہت خوبصورت ہوتی ہے ۔ اس میں ۱۶ ڈبے لگے ہوتے ہیں ۔ ساری ٹرین ایر کنڈیشنڈ ہوتی ہے ہم ٹرین میں داخل ہوئے تو ایسا لگا جیسے ہم طیارے میں پہنچے ہیں ۔ نشستوں کا انتظام اس طرح کا ہوتا ہے یہ ٹرین ہانشو جزیرہ میں واقع ٹوکیو سے کیوشو جزیرہ میں واقع ہکاتا تک ایک

ہزار ستر کیلومیٹر کا فاصلہ تقریباً چھ گھنٹوں میں طئے کرتی ہے یہ دنیا کی سب سے تیز رفتار ٹرین سمجھی جاتی ہے کیونکہ یہ ایک گھنٹہ میں ۲۱۰ کیلومیٹر کا فاصلہ طئے کرتی ہے"۔

کچھ جاپان میں اُردو کا حال بھی پڑھ لیجئے۔

" بفضلِ تعالیٰ جاپان میں اچھی خاصی اُردو موجود ہے اتنی اُردو موجود ہے کہ ہمیں وہاں اُردو کو تلاش نہیں کرنا پڑا بلکہ اُردو نے خود ہمیں تلاش کر لیا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب جاپانی اُردو کے کرتا دھرتاؤں کو پتہ چلا کہ ہم جاپان آئے ہوئے ہیں تو انھوں نے ہمارے ساتھ وہی سلوک کیا جو ایک اُردو والا دوسرے اُردو والے کے ساتھ کرتا ہے یعنی فوراً ہمارے خیر مقدمی جلسہ کا اہتمام ہو گیا اس کے ذمہ دار ہمارے دوست سوزوکی تاکشی تھے جو ٹوکیو یونیورسٹی میں برائے بیرونی مطالعات میں اُردو کے پروفیسر اور صدر شعبہ ہیں۔ اُردو ماحول اور اُردو تہذیب میں اس قدر ڈوبے ہوئے ہیں کہ انھیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کاش ہم بھی اُردو کے لئے اتنا کچھ کر سکتے۔"

تو صاحبو (یہ مجتبیٰ صاحب کا اسٹائل ہے) کہاں تک اقتباسات دیئے جائیں۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ مجتبیٰ حسین نے ہم اُردو والوں (بلکہ ہندوستانیوں کے لئے) کو گھر بیٹھے جاپان کے بارے میں اچھی خاصی معلومات فراہم کر دیں۔ جسے پڑھ کر ایک شاعر کا شعر یاد آگیا ہے ؎

بیٹھ کر گھر میں سیر دنیا کی ٭ یہ تماشہ کتاب میں دیکھا

قرآن شریف کی ایک آیت بھی یاد آگئی " زمین کی سیر کرو اور اس پر ہماری نشانیوں کے گواہ بنو" البتہ یہ احتمال ہے کہ مجتبیٰ حسین نے اپنے آپ کو زیادہ نمایاں کر کے پیش کیا۔ جب میں نے تفصیل کے ساتھ اس کتاب کو پڑھا (چند قسطیں تو میں "سیاست" میں پڑھ چکا تھا) تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ وہی شخص ہے جو ہمیں جاپان کی سیر کرا رہا ہے تو پھر وہ وہاں تو موجود ہو گا ہی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ انگلی سے آپ کو جاپان بتا دے اور باز و ہٹ جائے۔ اب اگر کہیں مبالغہ آگیا ہے تو ظاہر ہے یہ سفرنامہ مزاحیہ انداز میں لکھا گیا ہے لوگ سنجیدہ سفرناموں میں غلو کی انتہا کر دیتے ہیں اس لئے اگر مجتبیٰ حسین نے زیبِ داستاں کے لئے کچھ بڑھایا ہے تو اس کا میں انھیں حق دیتا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ وہ میرے دوست، ہم عصر اور ہم صنف ہیں بلکہ اس لئے کہ ایسے موقعوں پر اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوٹ ہی جاتا ہے۔

انیسہ سلطانہ ریسرچ اسکالر
(حیدرآباد)

مجتبیٰ حسین
بحیثیت مزاح نگار

مجتبیٰ حسین نے اپنے مزاح نگار بننے کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ اس کی شروعات انھوں نے ایک لطیفہ سے کی۔ جب کبھی یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ وہ مزاح نگار کیسے بنے تو انھیں اس شخص کی یاد آتی ہے جو ایک دریا کے پل پر سے گذر رہا تھا، اچانک ایک بچے کے دریا میں گرنے کی آواز آئی اور اس ڈوبتے ہوئے بچے کو دیکھنے کے لئے مجمع جمع ہوگیا۔ یہ شخص بھی وہاں پہنچ گیا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ یہ شخص اپنے سوٹ سمیت دریا میں کود پڑا۔ مشکل سے اس نے بچے کو دریا سے باہر نکالا۔ لوگ اس کی بہادری اور شجاعت کی تعریف کرنے لگے۔ ایک منچلے نے اس شخص سے پوچھا۔

"یہ بتائیے وہ کون سا جذبہ تھا جس نے آپ کو اتنے قیمتی کپڑوں کا خیال کئے بغیر محض ایک بچے کی جان بچانے کی خاطر آپ کو دریا میں کودنے پر مجبور کیا۔"

اس پر اس شخص کا چہرہ تمتا اُٹھا اور اس نے بڑے غصہ سے کہا۔

"اس سوال کا جواب میں بعد میں دوں گا، پہلے یہ بتاؤ کہ کس نے مجھے دریا میں ڈھکیلا تھا۔"

میری مزاح نگاری کے تعلق سے جب کبھی مجھ سے اس قسم کا سوال پوچھا جاتا ہے تو میرا چہرہ بھی تمتما اُٹھتا ہے اور میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ۔

"بتاؤ کس نے مزاح نگاری کے دریا میں ڈھکیلا۔"

جب ہم مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کا جائزہ لیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں کسی نے ڈھکیلا نہیں بلکہ وہ اس دریا میں پوری تیاری کے ساتھ اُترے۔ نہ صرف ایک مزاحیہ کالم کو ڈوبنے سے بچایا بلکہ دریا کی تہہ سے قیمتی و نایاب گہر بھی نکالے۔ جن کے نام یہ ہیں۔

تکلف برطرف، قطع کلام، قصہ مختصر، بالآخر مزاحیہ مضامین کے مجموعے ہیں۔ جاپان چلو، جاپان چلو سفرنامہ ہے۔ شاہد صدیقی کے کالموں کا انتخاب کرکے بھی شائع کروایا ہے۔ آدمی نامہ مختلف مرقعوں کا مجموعہ ہے۔ ان کی کامیابی کا راز گہرا مشاہدہ اور دلچسپ تجزیہ ہے۔ ان کا سارا مزاح انسان کے شخصی اور نفسیاتی

رجحانات کے گرد گھومتا ہے۔ وہ اپنے تجربہ اور مشاہدہ کی مدد سے ان رجحانات کا تجزیہ اس مہارت سے کرتے ہیں کہ قاری خود بھی جلدی سے اپنے دل کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے چور کو ٹٹولنے لگتا ہے۔

موجودہ زمانے میں ہر شخص مصائب و آلام میں گرفتار ہے، غمِ جاناں سے زیادہ غمِ دوراں کی فکر اس کو کھائے جاتی ہے۔ ایسے میں مجتبیٰ کے مضامین اپنے قاری کو تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی مسکرانے اور بعض وقت قہقہہ لگانے پر مجبور کر دیتے ہیں اور یہ ان کی مزاح نگاری کا ایک بہت بڑا کمال ہے۔ مزاح کو پُراثر اور کامیاب بنانے میں ان کی شگفتہ بیانی کو بہت دخل ہے۔ وہ ہنسنے ہنسانے کو دنیا کا سب سے بڑا اڈونچر سمجھتے ہیں۔ ہنسنے کی اہمیت ان کے یہاں ایورسٹ سر کرنے سے بھی زیادہ ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں :-

> " سچ پوچھئے تو موجودہ حالات میں ہنسنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ جب بھی دنیا کے کسی حصّہ میں قتل و غارت گری کی خبریں پڑھتا ہوں، نسلی اور فرقہ وارانہ فسادات کا ذکر سنتا ہوں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے صدیوں کا ذہنی سفر کرنے کے باوجود انسان ابھی تک ہنسنے کا اہل نہیں بن سکا، اگر وہ ہنستا بھی ہے تو اس کی ہنسی بڑی پُرآشوب ہے۔ بڑی بھیانک ... لیکن اس کے باوجود میں ہنسنے کا قائل ہوں ... "

مجتبیٰ حسین۔ قطع کلام۔ صفحہ ۹

یہی وجہ ہے ان کی تصانیف کا ہر صفحہ قہقہے بکھیرتا ہے اور قاری کو محظوظ کرتا ہے۔ صرف ہنسنا ہنسانا ہی ان کا مقصد نہیں بلکہ اس کے پیچھے اصلاحی مقصد بھی کارفرما ہے۔ ان کی تحریروں میں صرف مزاح ہی نہیں بلکہ گہرا طنز بھی ہے۔ اس طنز کا نشانہ مختلف سماجی اور سیاسی حالات ہیں۔ ان کے یہاں گہرا سماجی شعور ہے۔ ایسا سماجی شعور جو صرف کتابی علم کا رہینِ منت نہیں۔ انھوں نے خود ان حالات کا بغور مطالعہ کیا ہے۔

محمد حسین آزاد نے ظرافت کی تین خوبیاں بتائی ہیں۔ خوش طبعی، ذہانت اور مبالغہ، یہ تینوں خوبیاں مجتبیٰ حسین کی تحریروں میں ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ شوخی، ذہانت اور مبالغہ ان کی ظریفانہ تخلیقات کو سنوارنے میں مدد دیتی ہیں۔

" تکلف برطرف "، مجتبیٰ حسین کا پہلا مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے جو ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ اس میں تیرہ مضامین اور ایک رپورتاژ " ایک پلیٹ تخلص بھوپالی " بھی شامل ہے۔ مجھ سے ملئے، تکیہ کلام، ہم طرفدار ہیں غالب کے سخن فہم نہیں، قصہ داڑھ کے درد کا، شاعروں کی حکومت۔ ایسے مضامین ہیں جنھیں ہم اعلیٰ ترین مزاحیہ ادب کا نمونہ کہہ سکتے ہیں۔

" ہم طرفدار ہیں غالب کے سخن فہم نہیں " یہ مجتبیٰ حسین کا پہلا مزاحیہ مضمون ہے۔ اس میں ان لوگوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو غالب کا ایک شعر بھی نہیں سمجھ سکتے لیکن غالب کی طرفداری ضرور کرتے ہیں۔

" حیدرآباد نائٹ بائی نائٹ " میں حیدرآبادی تہذیب کے ساتھ ساتھ یہاں کی غربت و افلاس کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ پیرس اور حیدرآباد کی راتوں میں یہ فرق ہے کہ پیرس کے نائٹ کلبوں میں عریانی کے مظاہرے تفریح اور فیشن کی خاطر ہوتے ہیں۔ یہ عریانی " امارت کی عریانی " ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف حیدرآباد میں غربت اور تنگدستی کی وجہ سے لوگوں کو پہننے کے لئے کپڑے۔ بہ نصیب نہیں وہ اپنے پھٹے پرانے کپڑوں کی وجہ سے عریاں ہیں یہ " غربت کی عریانی " ہے۔

گویا حیدرآبادیوں کے لئے عریانی ایک مجبوری اور اہل پیرس کے لئے ایک فیشن ہے۔

"قصہ پہلے گریجویٹ کا" میں تعلیم یافتہ بے روزگاروں کے مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ مزاحیہ انداز میں اسٹابلشمنٹ کی کارکردگی کو نشانہ بنایا گیا ہے۔

"ایک پلیٹ تخلص بھوپالی" مزاح نگاروں کی کانفرنس کا رپورتاژ ہے۔ اس میں ساری کانفرنس کی روئداد سماگئی ہے یہ رپورتاژ کرشن چندر کے "پودے" سے مماثلت رکھتا ہے۔ مجتبیٰ حسین نے اس کو اپنی ذہانت، جدت، جودت کی مدد سے درجۂ کمال پر پہنچایا ہے۔

مجتبیٰ حسین نے اپنے پیش رو مزاح نگاروں کے چراغ سے چراغ جلانے کی کوشش کی ہے۔ "مجھے میرے دھوبی سے بچاؤ" کا عنوان بے اختیار یلدرم کے شہرۂ آفاق مضمون "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" کی یاد دلاتا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے بھی اس موضوع یعنی "دھوبی" پر ایک مزاحیہ مضمون لکھ کر قارئین سے داد تحسین حاصل کی تھی۔

"قطع کلام" ۱۹۷۰ء میں چھپا۔ اس میں پندرہ مضامین ہیں۔ اس میں تین خاکے بھی شامل کئے گئے ہیں۔ اس میں مصنف کا سماجی اور سیاسی شعور کچھ اور ترقی کر گیا۔ مزاح نگار اپنے موضوع اور نقطہ نظر کو پیش کرنے کے لئے فنی سانچے تلاش کرتا ہے، کبھی افسانے کی بیساکھی کا سہارا لیتا ہے۔ مجتبیٰ حسین نے صحافت میں رہ کر فیچرس بھی لکھے ہیں اور مزاحیہ کالم بھی۔ افسانے اور ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ "قطع کلام" کے بعض مضامین جیسے "مرزا غالب کی پریس کانفرنس" "یہ رکشے والے" "سندباد جہازی کا سفرنامہ" اور "نیا سال پرانا جال" اچھے مزاحیہ ادب میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔

"یہ رکشے والے" میں رکشے چلانے والوں کی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ یہ لوگ تنہائی کسمپرسی کی زندگی گذارتے ہیں سارا دن محنت کرنے کے بعد بھی انھیں پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا۔ ایک پارسی صاحب نے رکشے والے سے کرایہ پوچھا تو رکشے والے نے آٹھ آنے بتایا۔ وہ صاحب کہنے لگے بس کا کرایہ تو صرف دس پیسے ہوتا ہے۔ اس پر رکشے والا جواب دیتا ہے۔

"جی دس پیسے ہوتا ہے مگر آپ نے یہ غور نہیں فرمایا کہ بس پٹرول سے چلتی ہے، رکشہ خون سے چلتا ہے! خون سے۔۔!"

رکشہ والے کے یہ الفاظ خون کے آنسو رُلانے کے لئے کافی ہیں۔

"سندباد جہازی کا سفرنامہ" ہندوستان کے فسادات پر بھرپور طنز ہے۔ سندباد جہازی کا کام سفر کرنا ہے اور سفرنامہ مرتب کرنا۔ اس کے دوست ایک بار مشورہ دیتے ہیں کہ اب کے ہندوستان کا سفر کیا جائے کیونکہ یہاں کے فسادات دیکھنے کو ملیں گے جو بالکل "خالص" ہوتے ہیں۔ دوستوں کا مشورہ ملاحظہ کیجئے۔

"اگر آپ خالص فسادات دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر ہندوستان ہی چلے جائیے۔ یہاں کے فسادات اتنے خالص ہوتے ہیں کہ ان میں کہیں بھی انسانیت کی ملاوٹ نہیں ہوتی!"

سندباد ہندوستان آکر یہاں کے لیڈروں سے فسادات دیکھنے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ یہاں کے لیڈر سندباد سے تیس ہزار روپے لے کر اس کی خواہش پوری کر دیتے ہیں۔ دوسرے دن وہی لیڈر جس نے فساد کروایا تھا، امن کمیٹی کا صدر بن کر ریلیف فنڈ میں دس ہزار روپے کا عطیہ دیتا ہے۔

"قصہ مختصر" مجتبیٰ حسین کا تیسرا مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے، جو اپریل ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا۔ اس میں نو مضامین اور تین خاکے ہیں۔ اس مجموعے میں مجتبیٰ حسین کا مزاح تھوڑی سی سنجیدگی اختیار کر گیا ہے جو ان کے مزاج سے میل نہیں کھاتا۔ "ریلوے منتری مسافر بن گئے" محکمہ ریلوے پر بہت گہرا طنز ہے اور واقعاتی اور حرکیاتی مزاح کی اچھی مثال ہے۔ مجتبیٰ حسین نے اپنے مضامین میں جو زبان استعمال کی وہ روزمرہ کی سادہ، سلیس، پُراثر اور عام فہم ہے۔ اس میں جو خاکے ہیں وہ خاکہ نگاری کے فن پر پورے نہیں اُترتے انھیں منزل پر پہنچنے کے لئے ایک طویل مسافت طے کرنی ہے۔

"بہر حال" میں نو مضامین اور چار خاکے ہیں۔ یہ خاکے سلام مچھلی شہری، عزیز قیسی، بھارت چند کھنہ اور فکر تونسوی کے ہیں۔ قصہ داڑھ کے درد کا، چینی ایلشن ٹرے کی یاد میں، انتخابی نعرے اور شاعروں کی حکومت، اچھے مضامین ہیں جن میں طنز و مزاح کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ ان کے یہاں موضوعات کی رنگا رنگی ہے۔ انھوں نے کبھی سیاسی موضوعات پر طبع آزمائی کی۔ کبھی معاشرتی اور سماجی تو کبھی گھریلو مسائل کو بھی انھوں نے اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان کی تحریروں میں طنز کی تلخی نہیں ہے بلکہ مزاح کی چاشنی ملتی ہے۔

"آدمی نامہ" کے عنوان سے مجتبیٰ حسین کے خاکوں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ اس میں پندرہ شخصیتوں کے مرقعے ہیں۔ یہ شوکت تھانوی کے "شیش محل" کے طرز پر لکھا گیا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے اندازِ بیان میں شگفتگی اور تازگی ہے۔ "آدمی نامہ" کے خاکے مجتبیٰ حسین کی اعلیٰ صلاحیت کی غمازی کرتے ہیں۔ اس میں خاکہ نگاری کے ساتھ مزاح نگاری کا امتزاج ملتا ہے۔

یوسف ناظم نے ظرافت کے تعلق سے لکھا ہے۔ ظرافت فطرتِ انسانی پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہے۔ صحیح و صالح ظرافت افراد کے خیالات کو پاکیزگی اور نفاست بخشتی ہے۔ طبیعتِ انسانی کو شگفتہ کر دینا اس کا ایک معمولی عمل ہے اور جب وہ ایک قدم بڑھتی ہے تو افراد کے خیالات کو اپنے سانچے میں ڈھالتی ہوئی قوموں کے رجحانات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ معاشرے کے طریقوں، رسوم و رواج اور روایتی بندشوں کے مراحل سے آگے نکل کر سیاسی و ملکی معاملات کو زندگی سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ایسی ظرافت درحقیقت تہذیب اور شائستگی کی دین ہوتی ہے اور یہی اعلیٰ اور معیاری کہلاتی ہے۔ مجتبیٰ حسین اسی قسم کی ظرافت کے علمبردار ہیں۔

انوار انصاری
(کراچی)

مجتبیٰ حسین

میرا حصہ دُور کا جلوہ

عام طور سے یہ دیکھا جاتا ہے کہ انسان دوسروں کے اوصاف حمیدہ پر پردہ ڈالنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ زندگی میں اس کی تعریف نہیں کرتا نہ ہی اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور مرنے کے بعد اس کی تعریف میں زمین اور آسمان کے پل باندھتا ہے۔ اس کی یاد میں مجلسیں منعقد کرتا ہے مگر مجتبیٰ حسین میں ایسی بات نہیں ہے۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ زندہ رہنے والوں کی تعریف کھل کر کرتے ہیں۔ اس کے اوصاف کی پردہ پوشی نہیں کرتے ہیں بلکہ خوبیوں اور اچھائیوں کا تذکرہ نت نئے ڈھنگ سے کرتے ہیں مجتبیٰ حسین ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے دوستوں، عزیزوں، بزرگوں، قرابت داروں، ادیبوں، آرٹسٹ اور فن کار دوستوں اور شاعر بھائیوں کی خوبیوں کو اُجاگر کرتے ہیں اور دل کھول کر ان کی پذیرائی کرتے ہیں۔ اپنے حالیہ خاکہ "اختر بھائی" میں اختر بھائی کے لئے یوں رقم طراز ہیں :-

"میں نے بھی بہت سی سدا بہار شخصیتیں دیکھی ہیں لیکن اختر بھائی کی بات ہی الگ ہے بعض شخصیتیں جسمانی طور پر ضرور سدا بہار دکھائی دیتی ہیں لیکن ذہنی طور پر یا تو خزاں رسیدہ ہوتی ہیں یا پیدا ہی نہیں ہونے پاتیں۔ دل، دماغ اور جسم کی سدا بہاری کا امتزاج مجھے اختر بھائی کی ذات ہی میں دکھائی دیا۔"

"اختر بھائی آج بھی بڑی بھرپور زندگی گذار رہے ہیں۔ حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے مسائل سے نمٹتے ہیں اور نت نئی آزمائشوں سے گذرتے ہیں۔"

"میں نے اختر بھائی کو ڈسپلن کے مقابلے میں نہایت سخت گیر پایا۔" بہت کم لوگوں کو پتہ ہوگا کہ اختر بھائی پکوان کے نہ صرف شوقین ہیں بلکہ ماہر بھی ہیں"۔

"اختر بھائی جہاں بلند پایہ صحافی ہیں وہیں ایک معتبر نقاد اور شاعر بھی ہیں۔ کلاسیکی ادب کا جتنا مطالعہ ان کا ہے شاید ہی کسی کا ہو۔ نوجوانوں کی ہمت افزائی میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں ہمارے درمیان اختر بھائی جیسی محترم اور باکمال شخصیت کی موجودگی ایک نعمتِ غیر متوقع سے کم نہیں۔"

مجتبیٰ حسین نے کس خوبصورتی سے اور دریا دلی سے اختر بھائی کی خوبیوں کا ذکرِ خیر کیا ہے۔ یہی خوبی مجتبیٰ حسین کو دوسرے ادیبوں سے ممتاز کرتی ہے

مجتبیٰ حسین کا اندازِ بیان سادہ، دلکش، سلاست سے لبریز، رواں دواں اور عام فہم ہے ان کے خاکوں اور انشائیوں کو پڑھ کر کبھی ہم زیرِ لب مسکراتے ہیں اور کبھی ان کے طنز کے ہلکے نشتر سے جگر تھام کر بیٹھ جاتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین اپنے

بھی خاکہ "مجھ سے ملیئے" میں کتنی سادہ لوحی سے اپنے متعلق تحریر فرماتے ہیں ۔ ان کی سادگی اور معصومیت سے آپ بھی لطف اندوز ہوں۔

"مجھ سے ملیئے۔ مجھے مجتبیٰ حسین کہتے ہیں۔ مجھ سے مل کر آپ کو واقعی خوشی ہوگی یا نہیں یہ تو میں جانتا نہیں لیکن چونکہ آپ رسماً یہ جملہ کہنے کے عادی ہیں "کہ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی" اس لیئے مجھے یقین ہے کہ آپ کو مجھ سے مل کر خوشی ہی ہوگی۔ میری زندگی کے دیگر احوال یہ ہیں کہ میں ۱۵ر جولائی ۱۹۳۶ء کو اس دنیا میں پہلی بار پیدا ہوا۔ اس کے بعد سے اب تک مسلسل زندہ ہوں اور اندیشہ ہے کہ آئندہ بھی کئی برس تک زندہ رہوں گا۔"

اپنی مزاح نگاری کے متعلق یوں بیان فرماتے ہیں۔

"مجھ جیسے سنجیدہ مزاج آدمی کو خواہ مخواہ مزاح نگار بنانے کی ذمہ داری میرے بڑے بھائی محبوب حسین جگر اور ایڈیٹر "سیاست" جناب میر عابد علی خاں پر عائد ہوتی ہے۔ انہی بزرگوں اور سرپرستوں کے حکم کی تعمیل میں، میں نے ۱۲ر اگست ۱۹۶۲ء کو دن کے ٹھیک ساڑھے دس بجے سے مزاح نگاری کا آغاز کیا اور نان اسٹاپ یہ سلسلہ تادم تحریر جاری ہے۔"

اب ذرا ان کے نشتر کو ملاحظہ کیجئے۔

"لوگ پیٹ کے لئے روتے ہیں اور میں پیٹ کے لئے ہنسنے لگا ہوں اور اب تک ہنستا جا رہا ہوں۔"

یہ حقیقت ہے کہ انشائیہ نگار اپنے خیال کی ترنگ میں آزاد ہوتا ہے۔ وہ ادب کے ہر شعبے اور زندگی کے ہر گوشے میں قدم رکھ سکتا ہے۔ اسے کہیں روک ٹوک نہیں ہے۔ وہ آزاد اور خود مختار ہے۔ مجتبیٰ حسین کی پرواز بھی انوکھی اور جادوئی ہے۔ وہ غیر سنجیدہ بات کہہ کر یکایک سنجیدہ لب و لہجہ اختیار کر لیتے ہیں۔ تکیئے کے شعر میں ان کی ترنگ ملاحظہ کیجئے۔

"ہمارے ایک دوست کا قصہ ہے کہ انہیں عرصے سے بلڈ پریشر کی شکایت تھی۔ جب وہ بستر پر سو جاتے تو ان کا بلڈ پریشر آسمان سے باتیں کرنے لگتا۔ جب ایلوپیتھی سے فائدہ نہ ہوا تو ایک حکیم صاحب کی خدمات حاصل کیں۔ حکیم صاحب نے ان کا بغور معائنہ کیا زبان اتنی بار باہر نکلوائی کہ وہ ہانپنے لگے مگر اسی اثناء میں حکیم صاحب کی نظر تکیئے پر پڑی اور وہ تکیئے کی جانب لپکے۔ شعر کو غور سے پڑھا اور ٹھٹک کر بولے۔

" اس تکیئے کو ابھی یہاں سے ہٹائیے ۔ بلڈ پریشر کی اصل جڑ تو تکیہ ہے۔ واہ صاحب واہ کمال کر دیا آپ نے۔ آپ کو بلڈ پریشر کی شکایت ہے اور آپ نے شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کا شعر تکیئے پر طبع کروا رکھا ہے۔ جانتے ہو جوش کی شاعری میں کتنا جوش ہوتا ہے۔ جوش کے شعر پر آپ سو جائیں گے تو دوران خون نہیں بڑھے گا تو اور کیا ہوگا؟ اس تکیئے کو اسی وقت یہاں سے ہٹائیے۔ خبردار جو آئندہ سے آپ نے جوش کے تکیئے پر سر رکھا۔ اگر شعروں پر سونا ایسا ہی ضروری ہے تو داغ کے غلاف پر سو جائیے۔ جگر کے غلاف کو اپنے سر کے نیچے رکھیئے۔ ان شعراء کا کلام بلڈ پریشر کو کم کر دے گا۔ آپ کو فرحت ملے گی۔ بھوک زیادہ لگے گی۔ آپ کے جسم میں خون کی مقدار میں اضافہ ہوگا وغیرہ وغیرہ۔"

حکیم صاحب کے اس مشورے کے بعد ہمارے دوست نے نہ صرف "جوش کا غلاف" بدل دیا بلکہ اب وہ جوش کے کلام کو ہاتھ لگاتے ہوئے بھی خوف محسوس کرتے ہیں کہ کہیں پھر بلڈ پریشر کا عارضہ لاحق نہ ہو جائے۔"

مجتبیٰ حسین کبھی پابند موضوع نہیں رہے بلکہ ان کے یہاں تنوع ہے۔ جدت ہے۔ نیاپن ہے، رنگا رنگی ہے۔ یہی ان کی انفرادی شان اور قلندرانہ آن بان ہے۔ وہ چلتی پھرتی زندگی کی ہر بات، ہر ادا، ہر بانکپن اور ہر کیفیت کو اپنے زد میں لے لیتے ہیں اور بات سے بات پیدا کرتے ہیں۔ ان کے انشائیے ایک بہتے ہوئے آبشار کی مانند ہیں رواں دواں اور جولاں۔

ملاحظہ ہو چار کیلو غزلیں سے ایک اقتباس۔

"ادھر جب سے دنیا تجارت کے چنگل میں پھنس گئی ہے اس وقت سے ہر شئے ترازو میں تُلنے اور تجارت کے سانچے میں ڈھلنے لگی ہے۔ ہمیں اس نوجوان کی بات اب بھی یاد ہے جس نے ایک کتب فروش کی دوکان پر کھڑے ہو کر کتب فروش سے کہا تھا:

"جناب والا مجھے کرشن چندر کے دو کیلو افسانے، راجندر سنگھ بیدی کی ڈیڑھ کیلو کہانیاں اور فیض کی چار کیلو غزلیں دیجئے" اس پر کتب فروش نے ہماری آنکھوں کے سامنے کرشن چندر اور بیدی کی کہانیوں کے مجموعے ترازو میں تول کر دیئے اور فیض کی غزلوں کے بارے میں فرمایا۔ "حضور والا۔ میں آپ کو فیض احمد فیض کی چار کیلو غزلیں دینے کے موقف میں نہیں ہوں۔ کیونکہ فیض کا سارا ادبی سرمایہ صرف دو کیلو غزلوں پر مشتمل ہے۔ یقین نہ آئے تو دستِ صبا، نقشِ فریادی اور زنداں نامہ کو تول کر دیکھ لیجئے۔"

یہ سچ ہے کہ رشید احمد صدیقی اور پطرس انشائیہ نگاری کے قبلہ و کعبہ ہیں کیونکہ ان بزرگوں کی شمولیت کے بغیر اردو ادب کے طنز و مزاح کی تواریخ مکمل نہیں کی جا سکتی۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ موجودہ انشائیہ نگاری کے امام مجتبیٰ حسین ہیں۔ مجتبیٰ حسین کے انشائیوں کو پڑھ کر کبھی ان کے اسلوب میں رشید احمد صدیقی کی جھلک ملتی ہے تو کبھی وہ کنہیا لال کپور کا روپ دھار لیتے ہیں۔ کبھی وہ پطرس کے قریب نظر آتے ہیں اور کبھی مرزا فرحت اللہ بیگ کے دستِ راست بن جاتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین معمولی موضوعات سے علم و حکمت، دانش و فراست، تصوف و معرفت کے نکتے بیان کرتے ہیں اور قاری ان کے انشائیوں کو پڑھ کر فکر کے سمندر میں غوطے لگانے لگتا ہے۔

ڈاکٹر جیمس کے مطابق "ہنسنا ایک طرح کی مالش ہے جس سے پھیپھڑے، دل، جگر، آنت وغیرہ سب متاثر و متحرک ہو جاتے ہیں چنانچہ اکثر ادھیڑ عمر کے آدمی کم ہنستے ہیں اس لئے بھی ان کی صحت خراب رہتی ہے" مجتبیٰ حسین کی برابر کوشش رہتی ہے کہ وہ ادھیڑ عمر کے آدمیوں کو ہنساتے رہیں کیونکہ وہ خود اسی عمر طبعی کو پہونچ چکے ہیں "میرے ہنسنے سے لوگوں کو" سے ایک اقتباس ذیل میں درج ہے۔

"ادھر جب سے آدمی بڑی بڑی کالونیوں میں ایک ہی صورت شکل والے مکانوں میں رہنے لگا ہے تب سے اس کا پتہ سیکٹروں، بلاکوں اور نمبروں میں بٹ گیا ہے۔ ایسے مکانوں کے ساتھ مشکل یہ ہوتی ہے کہ ہر مکان پر اپنے مکان کا گمان ہوتا ہے ہمیں ایک بار کچھ عرصے کے لئے ایسی ہی کالونی میں رہنے کا موقع ملا تھا۔ ہماری کمزوری یہ ہے کہ ہمیں نمبر بالکل یاد نہیں رہتے ان دنوں ہماری حالت یہ تھی کہ ہم کالونی کے ہر گھر میں بے دھڑک گھس جاتے تھے اور بعد میں بڑی بے عزتی کے ساتھ بری ہوتے تھے۔ ایک بار تو یوں بھی ہوا کہ ایک گھر میں پہونچ کر ہم نے اپنا لباس تبدیل کر دیا۔ غسل خانہ میں غسل کیا۔ پھر جب بیگم کو چائے لانے کے لئے آواز دی تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہماری بیگم کی جگہ ایک خوبصورت اور حسین و جمیل عورت ہاتھ میں چائے کی ٹرے لئے چلی آرہی ہے یوں لگا جیسے ہماری بیگم کی "اوور ہالنگ" کر دی گئی ہو۔ جی تو بہت چاہا کہ ان خوبصورت ہاتھوں کی بنائی ہوئی چائے پی لی جائے مگر عاقبت کا خیال آڑے آگیا۔ اور وہاں سے ہم بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس کے بعد سے ہمارا یہ حال ہو گیا کہ خود اپنے ہی گھر پہنچ کر پہلے باہر سے آواز لگاتے تھے "بھئی سننا! کیا مجتبیٰ حسین صاحب یہیں رہتے ہیں" اندر سے آواز آئی جی ہاں یہیں رہتے ہیں۔ مگر اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔ آپ بعد میں آئیے۔" اس پر ہم کہتے "بیگم سننا" ہم آگئے ہیں۔ خدا کے لئے دروازہ کھولو۔"

دیکھا آپ نے یہی مجتبیٰ حسین کا جادوئی اندازِ بیان ہے ادھیڑ عمر شخص کو جانے دیجئے اس کو پڑھ کر بوڑھے بھی مسکرائے بنا نہیں رہ پائیں گے اور نوجوان تو بے تحاشہ ہنسنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

مجتبیٰ حسین زبان کی چاشنی۔ اسلوب کی دلآویزی، فقروں کی لطافت اور دلکش تحریر سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو "اشعار نثر مزاح میں" ایک مختصر اقتباس۔

"گھبراہٹ میں ہمارے منہ سے یہ جملہ نکل گیا "آپ واقعی بہت خوبصورت ہیں" یہ سنتے ہی انہوں نے شرم سے اپنی نگاہیں جھکائیں اور بولیں "ہائے اللہ۔ آپ بھی کبھی کبھی سچ بول لیتے ہیں" یہ سچ بعد میں اتنا آگے بڑھا کر بالآخر اس حسینہ سے ہماری شادی ہو گئی اور پچھلے پچیس برسوں سے ہماری یہ کوشش رہی ہے کہ ہم سچ بولیں اور سچ کے سوا کچھ نہ بولیں۔

مجتبیٰ حسین سے میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی ہے ہاں ان کی تحریروں سے میری ملاقات اکثر و بیشتر ہوتی رہتی ہے۔ میں بے چینی سے اس دن کا انتظار کر رہا ہوں جب دو بدو مجتبیٰ حسین سے ملنے کا موقع ملے گا۔ ان سے باتیں ہوں گی۔ میں ان سے ضرور پوچھوں گا کہ آخر آپ اتنی دلکش اور حسین تحریر کیسے صفحہ قرطاس پر بکھیرتے ہیں کس طرح طنز و مزاح کی وادی کو سرسبز بناتے ہیں۔

جس طرح ہر انسان میں اچھائیاں اور برائیاں پائی جاتی ہیں اسی طرح مجتبیٰ حسین میں بھی اچھائیوں کے ساتھ کچھ برائیاں بھی ہیں مثلاً مجتبیٰ حسین کی پہلی کمزوری "حیدرآباد" ہے وہ دلی میں رہ کر "حیدرآباد" کو نہیں بھول سکتے ہیں۔ ان کی دوسری کمزوری "شگوفہ" ہے جس کے لئے وہ اپنا تن من دھن لگانے کو ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کی تیسری کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنے سے کم تر ادیبوں کے خطوں کا جواب نہیں دیتے ہیں اس سلسلے میں خاکسار کو دو مرتبہ تجربہ ہو چکا ہے۔ مجتبیٰ حسین کی چوتھی کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنے دوستوں کی محفل میں "شمع محفل" بن جاتے ہیں اور محفل پر چھا جاتے ہیں۔ ان کی پانچویں کمزوری یہ ہے کہ اس تجارت پیشہ دنیا میں وہ شرافت اور انسانیت کی باتیں کرتے ہیں اور سادہ لوحی اتنی ہے کہ ٹرین میں ساتھ چلنے والے یعنی سفر کرنے والے ہمراہی کی ہر بات صحیح مان لیتے ہیں۔

• اچھائیاں اور برائیاں اپنی جگہ درست ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مجتبیٰ حسین اردو کے "طنز و مزاح" کے موجودہ امام کی حیثیت رکھتے ہیں میرا خیال ہے کہ طنز و مزاح کے خزانے کو مالامال کرنے میں مجتبیٰ حسین کے کارنامے کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اب وہ طنز و مزاح کے بے تاج امام بن گئے ہیں۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

مجتبیٰ حسین

سانولا سلونا رنگ، متبسم چہرہ۔ مناسب قد۔ لب و لہجہ میں کبھی کبھی حیدرآبادی جھلک، یہ ہیں مجتبیٰ حسین جنھیں میں پچھلے کئی برس سے جانتا ہوں لیکن کسی کو طویل عرصہ تک جان لینا ہی اس پر کچھ لکھنے کے لئے کافی نہیں ہوتا۔ یہ میں اپنی بات کر رہا ہوں۔ مجتبیٰ حسین اس شرط کے پابند نہیں۔ وہ جن کو جانتے ہیں ان کے خاکے تو لکھتے ہی ہیں، جن کو نہیں جانتے ان کے خاکے بھی لکھ مارتے ہیں اور اس طرح لکھتے ہیں جیسے مدت سے ان کے ہم پیالہ و ہم نوالہ ہیں۔

پہلے تو میرے جی میں آئی کہ جب یہ خاکہ نویس اور مزاح کار کسی کو نہیں بخشتے تو پھر میں یہ موقع ہاتھ سے کیوں جانے دوں۔ کیوں نہ ان کے رازہائے مخفی کو آشکار کروں۔ چنانچہ کئی دن تک سوچتا رہا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان کے راز میرے لئے راز ہی رہیں گے تو میں آشکار کیا کروں۔ مزید غور کرنے پر ایسا بھی محسوس ہوا کہ مجتبیٰ حسین تو میرے فطرتاً ہمراز بھی ہیں۔

ان سے میری پہلی ملاقات حیدرآباد میں جشنِ ظرافت کے موقع پر ہوئی۔ بیس پچیس برس کی بات ہے۔ زندہ دلانِ حیدرآباد نے سہ روزہ جشنِ ظرافت کا انعقاد کیا اور مجھے بھی دعوت دی کہ میں ان کے سہ روزہ جشن میں ایک جشن کی صدارت کروں۔ میں نے بخوشی یہ دعوت قبول کرلی۔ اس جشن کی ایک نشست کے صدر آنجہانی راجندر سنگھ بیدی تھے اور دوسری نشست کے صدر آنجہانی وی۔ شنکر تھے (خدا کے فضل سے میں ابھی ابھی جہانی ہوں)۔ جشن بہت ہی کامیاب رہا اور اس کے بعد غالباً اسی جشن کی بناء پر میرے حیدرآباد آنے جانے کا آغاز ہوا۔ درجنوں مشاعروں میں بھی حصہ لیا اور کئی کانفرنسوں میں بھی شرکت کی۔ مجتبیٰ حسین کو میں نے ہر موقعہ پر پیش پیش پایا۔ حیدرآباد کی ادبی زندگی ان کے اردگرد گھومتی ہوئی دکھائی دی حالانکہ یہ خود حیدرآباد سے باہر گھومتے رہتے ہیں۔

خاکے لکھنے میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ خدا جانے انہوں نے کتنے خاکے لکھ ڈالے ہوں گے۔ اور کچھ لوگ اگر بچ بھی نکلے ہیں تو برس دو برس میں ان کے بھی خاکے لکھ ماریں گے۔ اور ایک دن ایسا بھی جلد ہی آئے گا جب گلی گلی، کوچے کوچے میں ان کے فرستادہ آوازیں لگاتے پھریں گے : ہے کوئی خاکہ لکھوانے والا؟

خاکہ لکھنے اور خاک اُڑانے میں بہت ہی لطیف سا فرق ہوتا ہے۔ اگر احتیاط نہ برتی جائے تو نتائج برعکس برآمد ہوتے ہیں۔ مگر یہی ان کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ جہاں کسی کو کچھ بھی نظر نہیں آتا، یہ وہاں کیا کیا نہیں دیکھ لیتے۔ اب میری ہی بات دیکھ لیجئے۔ ایک روز میں انہیں ان کے ساتھ چلا گیا۔ ہمیں ایک عمارت میں ساتویں منزل پر جانا تھا۔ لیکن اتفاق سے اس روز بجلی بند تھی۔ مجتبیٰ حسین کہنے لگے کہ بیدی صاحب آپ کے لئے ساتویں منزل تک پیدل جانا تکلیف دہ تو نہیں ہوگا۔ میں نے کہا کہ ایسی کیا بات ہے۔ چنانچہ ہم دونوں سیڑھیوں پر چڑھنے لگتے ہیں۔ میں ان سے دو چار قدم بڑھ گیا ہونگا اور غلطی سے ساتویں کے بجائے آٹھویں منزل پر پہنچ گیا ہوں گا۔ بس اس بات کا انہوں نے بتنگڑ بنا لیا اور میرے خاکے میں لکھ مارا کہ میں ابھی جوان ہی نہیں نوجوان ہوں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ لکھ مارا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے پاس ہندوستان کے مختلف شہروں سے ان گنت خطوط آنے لگے کہ میں کیا کھاتا ہوں۔ کیا پیتا ہوں اور صحت کو قائم رکھنے کے لئے اور کیا کیا حربے استعمال کرتا ہوں۔ بلکہ ایک دواخانے نے تو اپنے تازہ ترین معجونِ شباب آور کی بوتل کے لیبل پر مجھ سے میری تصویر چھاپنے کی اجازت چاہی۔ اس سے ہماری کچھ مشتہری تو ہوئی لیکن ایسا بھی ہوا کہ چند خوش جمال جو پہلے ہم کو بے ضرر سمجھتے تھے ہم سے کترا کے نکلنے لگے۔ کچھ پردہ نشیں مائل بہ کرم بھی نظر آئے لیکن اس میں میں بے خطا تھا، قصور وار دراصل مجتبیٰ حسین تھے۔

آپ نے اکثر دلی کے طبیبوں کو دیکھا ہوگا جو سوائے نبض دیکھنے کے مریض کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ لیکن ان کے پہلو میں ایک نسخہ نویس بیٹھا رہتا ہے جو ہمہ وقت خاموش رہتا ہے۔ لیکن حکیم صاحب کی تشخیص سے پہلے ہی خود نسخہ لکھ کر مریض کے خالی ہاتھ میں تھما دیتا ہے۔ میں جب مجتبیٰ حسین کو اپنے پاس بیٹھا دیکھتا ہوں تو مجھے دہلی کے نسخہ نویس یاد آتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین کی ایک خاص بات جو مجھے بے حد بھلی لگی وہ یہ ہے کہ میں نے ان کے منہ سے کسی کی برائی نہیں سنی۔ انہوں نے کبھی دشمن کو بھی بُرا نہیں کہا۔ ہر ایک کا بھلا مانگتے ہیں۔ اہلِ قلم حضرات میں یہ صفت بہت کم پائی جاتی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ان کو غالب ایوارڈ برائے مزاح ملا تو یہ میرے پاس رونی سی صورت لے کر آئے اور کہنے لگے کہ غالب انسٹی ٹیوٹ نے اچھا نہیں کیا۔ اس ایوارڈ کے حقدار فکر تونسوی تھے۔

دوستوں اور دشمنوں کی مدد کرنا ان کی فطرت سی بن گئی ہے۔ خدا کرے کہ ان کی یہ فطرت دوسرے ادیب اور شاعر بھی اپنائیں۔

مجتبیٰ حسین کی درجنوں کتابیں شائع ہو کر شرفِ قبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ لیکن ابھی ان کے قلم کا سفر جاری ہے اور انشاء اللہ جاری رہے گا۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ ••

فکر تونسوی

مُجتبیٰ بھائی فِکر بھائی

ـــــــــ مِزاح والے

ایک دن جب میں خدا کی اس پالیسی پر غور کر رہا تھا۔ کہ اُس نے بدصورت انسان کیوں پیدا کئے اور میرے علاوہ کس کس کو بدصورت پیدا کیا ہے کہ میری اکلوتی بیوی نے جو میری بدصورتی کو بھی پتی برت دھرم کا ایک حصہ مانتی ہے۔ مجھے ڈاک سے آیا ہوا ایک لفافہ لاکر دیا۔ وہ میری ڈاک میں آئے ہوئے ہر لفافے کو اپنے بھائی کا لفافہ سمجھتی ہے۔ اور کوئی لفافہ اگر واقعی اس کے بھائی کا نکل آئے تو مجھے بوسہ دینے پر بھی آمادہ ہوجاتی ہے۔

میں نے لفافہ کھولا۔ اور کہا۔ "سوری میڈم! یہ تو کسی مجتبیٰ حسین نامی شخص کا خط ہے"

وہ بولی۔ "جبھی اتنا بدصورت خط ہے!" اور وہ منہ بنا کر بغیر بوسہ عطا کئے چلی گئی۔ میرے کئی بوسے اسی طرح ملتوی ہوچکے ہیں۔ خدا ہر بوسے کو ہر مجتبیٰ حسین سے بچائے۔

خط پڑھ کر فوری تاثر یہ ہوا کہ ان صاحب کا ہینڈ رائٹنگ تو میری صورت سے بھی بھدّا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا، کہ مجھ سے بھی زیادہ بدصورت دنیا میں موجود ہیں۔ خط اتنا بدشکل تھا کہ مشکل سے پڑھا اور اس سے بھی مشکل سے سمجھا جاتا تھا۔ میں نے سوچا، اگر ایسا بدشکل خط لکھنے والا خود بھی بدصورت نکلا تو اللہ کے فضل و کرم کا اعتراف کرنا ہی پڑے گا۔ اور میں اتنا خوش ہوا کہ فرطِ مسرت میں اپنی بیوی کو پھر بلا لیا اور کہا "محترمہ: یہ تو میرا بھائی نکلا۔ تمہارا نہیں۔ اور وہ اس گھر میں آرہا ہے۔"

وہ چڑ کر بولی۔ "ہاں ہاں، زندگی بھر آپ اس گھر میں کوئی کام کی چیز بھی لائے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "کیوں نہیں، مثلاً تمہیں لایا تھا"

اس پر وہ انکار کی ہمت نہ کرسکی۔ مگر کنفیوز ضرور ہوگئی، اتنی زیادہ کہ اب جب بھی مجتبیٰ میرے گھر آتا ہے۔ وہ سمجھتی ہے، رقیب روسیاہ آیا ہے۔ اور دو برس بعد جب دہلی میں مجتبیٰ سے پہلی ملاقات ہوئی تو اس کے منہ سے واقعی جو پہلا لفظ نکلا وہ تھا "فکر بھائی"

فکر بھائی ـــــــ کی حد تک کہنے میں تو کوئی بُرائی نہیں تھی۔ لیکن اس کے خدوخال دیکھ کر مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ کیوں کہ وہ کم بخت اتنا بدصورت نہیں تھا جتنا میرا بھائی بننے کے لئے اسے ہونا چاہیئے تھا اور پھر وہ اس دوران میں مجھے اتنے پیارے پیارے خط لکھ چکا تھا کہ میرے ذہن میں اُس کے ہینڈ رائٹنگ کی بدصورتی غائب

ہوچکی تھی۔ اور وہ حسن اُبھر آیا تھا۔ جو ہینڈرائٹنگ کے اندر چھپا ہوا تھا۔ عرفِ عام میں اُسے روح کا حُسن کہتے ہیں لہٰذا میں نے روح کے ہاتھوں مجبور ہوکر ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہا "مجتبیٰ بھائی"۔

اور یوں مجتبیٰ بھائی فکر بھائی ـــــــ وجود میں آگئے۔ اور ہم دونوں کی بدصورتیوں پر پانی پھر گیا۔ ہر بدصورتی کی یہی ٹریجڈی ہے کہ جب عشق درمیان میں آجائے تو بدصورتی کا انجام اس خدا کی طرح ہوجاتا ہے کہ ؏

ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

ویسے دل ہی دل میں، میں نے یہ شکایت ضرور کی۔ "مجتبیٰ مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی"۔

مگر عشق کی ایک ٹریجڈی بھی ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ میں نے مجتبیٰ حسین سے کہیں کہہ دیا۔

"مجتبیٰ بھائی! تم بہت نفیس لکھتے ہو"۔

مجتبیٰ کا منہ فق ہوگیا۔ اُسے بھی مجھ سے یہ توقع نہیں تھی۔ کیوں کہ ادیبوں میں یہ رواج ہی نہیں ہے کہ وہ ہمعصروں کی تحسین کریں۔ چنانچہ مجتبیٰ نے مجھے لاکھ سمجھایا کہ فکر بھائی! آپ کے منہ سے یہ سہواً نکل گیا ہے۔ لیکن میں نے کہا اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ میں نسلاً راجپوت ہوں، جو منہ سے نکل گیا۔ اسی پر ستی ہو جاؤں گا"۔

مجتبیٰ بولے۔ "مگر اب تو آپ ادیب ہو گئے ہیں۔ راجپوت نہیں رہے"۔

میں نے کہا "نہیں! میرے دادا جان نے فرمایا تھا کہ ہم راجپوت نسل سے ہیں۔ ہوسکتا ہے انہوں نے یہ بات بھی سہواً ہی کہی ہو۔ مگر سہواً کے باوجود ہم تین نسلوں سے اپنے آپ کو راجپوت ہی کہے جارہے ہیں۔ حالانکہ میرے والد صاحب نے تلوار کی شکل تک نہیں دیکھی، عمر بھر اُن کے ہاتھ میں ترازو رہا۔ اور میں؟ میں نے ترازو چھوڑ کر قلم پکڑ لیا ہے"۔

چنانچہ اس کے بعد مجتبیٰ اپنے مزاحیہ مضامین کے بارے میں مجھ سے کچھ نہیں پوچھتا۔ اور میں اس کے مزاحیہ ادب کے بارے میں اس ڈر سے خاموش رہتا ہوں کہ کہیں ستی نہ ہونا پڑے لیکن جب بھی کوئی تخلیق پڑھتا یا سنتا ہوں تو سب کی نظر بچا کر کہہ اٹھتا ہوں "میری وہ بات سہواً تو نہیں تھی۔ راجپوت کبھی سہو نہیں کرتے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ مجتبیٰ ہی سہواً نفیس لکھ دیتا ہو"۔

اور ویسے بھی کسی کے ادبی مرتبے کے بارے میں فیصلہ دینے سے گریز ہی کرنا چاہئے۔ کیونکہ اس میں منہ پر تعریف اور پیٹھ پیچھے گالیاں دینا پڑتی ہیں اور میرا پروگرام یہ ہے کہ اس جنم میں صرف سچ بولوں گا اور جھوٹ بولنے کے لئے کسی اور موزوں جنم کا انتظار کروں گا۔ سچ بولنے سے خاموشی کئی درجہ بہتر رہتی ہے۔

ایک صاحب جو انسان کم اور انٹلکچول اس سے بھی کم تھے اور مجتبیٰ کو انسان کم، مزاح نگار اس سے بھی کم مانتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھ سے کہنے لگے۔ "ایمان سے بتائیے، مجتبیٰ کے مزاح کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

میں نے کہا۔ "ادب پر لعنت بھیجئے، یہ بتائیے آپ کے داڑھ درد کی کیا حالت ہے؟" انہیں کئی دنوں سے داڑھ درد کی شکایت تھی۔ ایک دم اپنے بائیں گال کو زور سے دبایا اور داڑھ کے بجائے ہاتھ سے چیخ کر بولے "ہائے میں مرا جارہا ہوں"۔

"کوئی علاج کیا؟"

بولے "ہاں"۔ ایک خدا رسیدہ درویش نے مشورہ دیا تھا کہ کسی کنواری بھنگن کو سینے سے لگالو، درد کافور ہوجائے

گا، لیکن بھنگن کو بھی آزما کے دیکھ لیا۔"

میں نے کہا " یعنی نتیجہ ۔ ڈھاک کی ایک بھنگن ہی نکلی۔"

میں نے فوراً مجتبیٰ کو ٹیلی فون کیا۔ " مجتبیٰ بھائی ! اس وقت کون سا ادبی کام کررہے ہو ؟"

جواب آیا ۔ " پڑوسی شام سنگھ کا ریڈیو سیٹ ٹھیک کررہا ہوں "

گویا یہ ادبی کام تھا۔ سنا تھا، ادب کا ریڈیو سے تعلق ہے۔ مگر صرف سنا تھا، پرکھا کبھی نہیں تھا۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ ادب کا ریڈیو کی مرمت سے بھی تعلق ہے "

پوچھا۔ " سمسیا کیا ہے ؟"

بولا : بمبئی اسٹیشن پر سوئی گھماؤ تو پیکنگ ریڈیو نکل اٹھتا ہے۔ سوچ رہا ہوں اس سیٹ کو رحیم بخش میکانک کے ہاں لے جاؤں۔ مگر فکر بھائی ! آج آپ نے مجھے کیسے یاد کیا ؟"

میں نے کہا۔ " بس، جی چاہا ۔ آپ سے ملوں ، ویسے کام تو کوئی نہیں تھا۔ آپ نہ ملیں تو بھی زندگی اچھی خاصی گذر رہی ہے، لیکن ہمارے فلاں انٹلکچول دوست کی داڑھ میں سخت درد ہورہا ہے آسکو تو آجاؤ۔"

مجتبیٰ نے جواب دیا۔ " میں میکانک کے ہاں ریڈیو سیٹ چھوڑ کر ابھی دس منٹ میں حاضر ہوتا ہوں۔ کیوں کہ پیکنگ ریڈیو سننا بھی تو داڑھ سے کم نہیں ہے۔ وہ چینی زبان میں ہندی بولتے ہیں تو بیچارہ شام سنگھ اپنی ہندی کو بھی چینی زبان میں بولنے لگتا ہے۔ مگر میں ابھی آتا ہوں۔ آپ خواہ مخواہ پریشان ہورہے ہیں ۔ بھلا داڑھ درد بھی کوئی بات ہے۔ انھیں کہئے داڑھ درد کو صرف منٹ پینڈنگ رکھیں۔"

اور گیارھویں منٹ پر مجتبیٰ اس انٹلکچول کو اپنی آٹو سیکل پر بٹھا کر ڈاکٹر دھرم ویر ڈینٹل سرجن کے پاس بیٹھا تھا اور کہہ رہا تھا۔ " ڈاکٹر صاحب ! دس منٹ میں یہ داڑھ درد دور کر دیجئے۔ آپ نہیں جانتے کہ داڑھ درد کے باعث اُردو کی کئی غزلیں بے وزن ہوگئی ہیں۔"

اس مجتبیٰ کم بخت کے لہجے میں بھی جادو ہے، کردار میں بھی ۔ ڈاکٹر جانتا تھا کہ کس طرح مجھے ٹیلیفون کنکشن دلانے کے لئے مجتبیٰ بھاگتا پھرتا رہا۔ ٹیلی فون فارم تک خود بھرا اور اُسے ٹیلی فون آفس میں یوں دے آیا جیسے کبوتر بام یار پر خط لے جاتا ہے اور حیرت یہ ہے کہ لوگ بھی اس کا کام یوں کر دیتے ہیں جیسے اس کام کو پتی برتا دھرم سمجھتے ہوں۔ جس محاذ پر بھنگن کا سینہ ناکام ہوجاتا ہے۔ مجتبیٰ کا سینہ کام آجاتا ہے۔ لگتا ہے اس کے سینے میں مجرّب قسم کی بھنگن موجود ہے اور خدا رسیدہ درویش کا لمس بھی جس سے وہ بڑے سے بڑوں کے زہر کو شیوجی کی طرح چوس لیتا ہے۔

اور پھر میں نے دیکھا، ایک دن وہی انٹلکچول مجتبیٰ حسین کا ایک مزاحیہ مضمون " داڑھ کا درد " پڑھ کر کھلکھلا رہا ہے اور کہہ رہا ہے۔ " سالا خوب لکھتا ہے "

مجتبیٰ کی عادت ہے کہ وہ داڑھ درد کا کنکشن ٹیلی فون سے کردیتا ہے۔ " فکر بھائی ! دنیا کی ہر شئے ایک دوسرے سے جُڑی ہوئی ہے۔ صرف جوڑنے والی نگاہ چاہئیے "

میں نے کہا : عرفِ عام میں اِسے نگاہِ مردِ مومن کہتے ہیں "

وہ بولا۔ " آپ مجھے شرمندہ کررہے ہیں "

میں نے کہا "شرمندہ تو وہ ہوں گے جو دال، دودھ سے اپنی تقدیریں بدل رہے ہیں، تم کیوں شرمندہ ہوتے ہو؟"
مگر وہ شرمندہ ہو جاتا ہے۔ ایسے جیسے، کنواری لڑکیوں کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ جائے۔ یہ سرخی اسے پرکشش بنا دیتی ہے ورنہ بظاہر تو اس میں اتنی کشش بھی نہیں ہے جو کنجڑے کی دکان پر رکھے ہوئے کالے لمبوترے بینگن میں ہوتی ہے۔ اور گاہک اس کا ریٹ تک پوچھنا پسند نہیں کرتا۔ اور آگے بڑھ جاتا ہے۔
ایک مرتبہ گیس کے چولھے کی بے حد قلت ہوگئی۔ میرے ایک دوست کو وہ ضرور چاہیئے تھا۔ میں نے مجتبیٰ سے ذکر کیا تو حسب معمول بولا۔ "چولھا؟ ——— چولھا بھی کوئی بات ہے، آج کیا تاریخ ہے، ۵ اکتوبر۔ دس اکتوبر کو چولھا آپ کے دوست کے گھر پہنچ جائے گا۔ آپ صرف اس فارم پر دوست کے دستخط کروا دیجئے۔"
"مگر کیسے پہونچے گا چولھا؟"
"یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ اور میں اس وزیر پر چھوڑ دوں گا۔ جس کے اشارے پر پورا انڈین آئیل چل رہا ہے۔ فکر بھائی! آپ نہیں جانتے۔ ہر شئے کا ایک دوسرے سے کنکشن ہے۔ مجتبیٰ کا فکر سے اور چولھے کا وزیر سے۔"
اور پھر میں نہیں جانتا اس خدا رسیدہ درویش نے کس طرح گیس کے چولھے کو بنی نوع انسان کا سب سے اہم مسئلہ سمجھ لیا۔ مسئلہ کا تعاقب اسکوٹر پر کیا۔ اسکوٹر کا تعاقب مسئلے نے کیا۔ اور مسٹر بشیر احمد اکسائز انسپکٹر سے کہا: قبلہ! میں نے ایک بار آپ کی ناک کی تعریف کی۔"
وہ بولا۔ "ہاں! کی تھی۔"
"تو اب میری اپنی ناک، دردناک ہوگئی ہے۔ آپ کے سالے کریم خاں کا سسر انڈین آئیل میں سپرنٹنڈنٹ ہے۔ ان سے اسپیشل کوٹے میں ایک چولھا الاٹ کرا دیجئے۔"
اور میں نے دیکھا دس اکتوبر کو میرے دوست کے گھر چولھا جل رہا تھا۔ میں نے پوچھا "مگر مجتبیٰ اس میں وزیر کا چولھے سے تعلق تو پیدا ہوا ہی نہیں؟"
بولا۔ "فکر بھائی! اس سپرنٹنڈنٹ کا چچا زاد بھائی ہفتے بھر تک ڈپٹی وزیر بننے والا ہے؟" مجتبیٰ نے اعلان کر رکھا ہے کہ وہ وزیر نہیں بنے گا، کیونکہ وزیر دفتر میں ملتا ہے، میں سڑکوں پر ملتا ہوں بلکہ وزیر بھی نہیں ملتا۔ اس کا پی اے ہی ملتا ہے جو اکثر کہتا ہے کہ صاحب باتھ روم میں ہیں مگر میں ....
میں نے کہا: مگر مجتبیٰ بھائی اگر تم اسی طرح خدمتِ خلق کرتے رہے تو خطرہ ہے، وزیر بنا جاؤ گے۔"
بولا: "میں اپنی عاقبت خراب کرنا نہیں چاہتا۔"
میں نے کہا: "عاقبت کی خبر خدا جانے۔ تم نہیں جان سکتے۔"
ایک مرتبہ میرے رشتے کی محترمہ میرے گھر تشریف لائیں۔ اس کا شیرخوار بچہ اکڑ گیا کہ بوتل سے دودھ نہیں پیوں گا۔ اس نے اتنا اودھم مچایا کہ میں اس محترمہ سے کہنے ہی والا تھا کہ۔ آپ نے خواہ مخواہ یہ بچہ پیدا کر ڈالا۔ کہ اچانک میرے ذہن میں مجتبیٰ ابھرا۔ فوراً ٹیلی فون کیا۔ "مجتبیٰ بھائی! بوتل"
وہ بولا۔ "وہسکی کی؟"
"نہیں، دودھ کی۔ یہاں ایک بچہ بوتل سے دودھ نہیں پی رہا۔ فوراً آؤ!"

اب پوزیشن یہ تھی کہ بمبئی سے ایک رائٹر صاحب تشریف لائے ہوئے تھے۔ ان کی واپسی کے لئے ٹکٹ ریزرو کرانا تھی۔ یہ ٹکٹ ایک طرح کی بوتل تھی جو اس رائٹر کے اندر بیٹھے ہوئے شیر خوار بچے کو چپ کرا سکتی تھی۔ چنانچہ مجتبیٰ اس کی ٹکٹ ریزرو کرواکر چند ہی منٹ میں اپنی اسکوٹر پر نمودار ہوگیا۔ وہ جب اسکوٹر پر بیٹھتا ہے تو اسکوٹر سے پہلے پہنچ جاتا ہے۔ آتے ہی بولا۔ "یہاں ہے وہ ننھا فکر بھائی؟ مجھے فوراً واپس بھاگنا ہے۔ پریس میں ایک ادبی سمینار کے دعوتی کارڈ چھپوانا ہیں۔"

اور اس نے وہی بوتل اٹھائی، ننھے کو گود میں لیا۔ کم بخت ننھا اس کی گود میں جاتے ہی خاموش ہوگیا۔ اور یوں مزے مزے سے دودھ پینے لگا جیسے جنت سے منگوایا ہوا دودھ ہو۔ اور میں نے دیکھا بچے کی ماں مجتبیٰ کو کنکھیوں سے دیکھ کر یوں رال ٹپکا رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو "یہ جنم تو اکارت گیا۔ اگلے جنم میں تمہیں ہی اپنا عاشق بناؤں گی"

مگر مجتبیٰ حسین کو جلدی تھی۔ اسے ایک ابھرتے ہوئے شاعر کی کتاب کا جشن اجراء کرانا تھا۔ اس لئے وہ محترمہ کی رال کو پینڈنگ رکھ کر چلا گیا۔ لیکن اس کے بعد محترمہ کا بیان ہے کہ ننھا جب بھی دودھ نہ پینے کے لئے اڑتا ہے میں جھٹ دھمکی دے دیتی ہوں۔ "بلاؤں مجتبیٰ کو؟"

غرض میں نے جب بھی مجتبیٰ بھائی کو دیکھا ہے۔ دوڑتے، اُڑتے اور پھلانگتے ہی دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے اُسے دیکھا کسی کے ننھے بچے کو لئے سڑک پر کھڑا لوریاں دے رہا ہے۔ کہنے لگا۔ "فکر بھائی! اس کی ماں کہانی لکھنے میں مصروف ہے۔ اگر کہانی نہ لکھی گئی تو اردو ادب کا مستقبل جو پہلے ہی تاریک ہے اور بھی تاریک ہو جائے گا" دوسری مرتبہ اسے ایک گورنر کے پاس بیٹھے مزاحیہ کانفرنس کا پلان بناتے دیکھا۔ اور تیسری مرتبہ وہ مجھے کہہ رہا تھا "فکر بھائی! بھوپال چلئے دو دن کا مزاحیہ سمینار ہے۔ بھوپال میں طعام کے لئے باورچی عام پائے جاتے ہیں اور قیام کے لئے ایک ریٹائرڈ فوجی میجر نے وعدہ کرلیا ہے۔ آپ تشریف نہ لائے تو ہندوستانی مزاح کی آبرو خطرے میں پڑ جائے گی"

اور میں نے سوچا، مزاح کی آبرو جائے بھاڑ میں، مجھے تو مجتبیٰ کی آبرو مقصود ہے۔ ورنہ جہنم میں جائے ہندوستان اور ہندوستان سے زیادہ اس کا مزاحیہ ادب ـــــ لہٰذا میں دل میں گالیاں اور کندھے پر بستر رکھے ایک دن بھوپال اسٹیشن پر اُتر رہا تھا۔

ہاں میں نے اسے ہمیشہ لپکتے جھپکتے دیکھا ہے۔ نجانے یہ لکھتا کب ہے۔ میں نے تو اُسے ہمیشہ یا تو خطوط لکھتے دیکھا ہے یا حاجت مندوں کی فہرست لکھتے یا احباب کے ٹیلی فون نمبر اور اڈریس لکھتے۔

ایک بار میں نے اس سے پوچھا "کیا تم نے کسی سے عشق بھی کیا؟ چلو کوئی حسین نہ سہی، آبنوسی محبوبہ ہی سہی۔ اور ویسے تم اتنے مرنجان مرنج ہو۔ کہ تمھاری بھی چل سکتی ہے"

وہ مسکراتی ہوئی آہ بھر کر بولا "فکر بھائی! ایک، دو، تین، نہیں گنتی صحیح ہونی چاہئے، چار حسینائیں میرے تعاقب میں تھیں اور...."

"اور ان کا حشر ـــــ؟"

"حشر؟ کوئی یہاں گری کوئی وہاں گری۔ مایوس ہوگئیں۔ میرے پاس ٹائم ہی نہ تھا۔ آخر کب تک انتظار کرتیں، بھاگ کر کسی دکسی شوہر کے سائے میں پناہ لے لی"

میں نے کہا۔ "خدمتِ خلق کرتے رہوگے تو شوہر تمہاری محبوباؤں کو لے ہی جائیں گے۔ پیارے یہ زمانہ تو کاریں اور بنگلے بنانے کا ہے، خدمتِ خلق کا نہیں۔"

مگر وہ خدمتِ خلق کے اس ماڈرن مقصد کو نہیں سمجھ سکا۔ کافی جاہل ہے۔ اور اپنی آٹو سائیکل لئے دوڑتا پھرتا ہے اور مجھے یوں لگتا ہے جیسے ہر عاشق کا انجام آٹو سائیکل ہے۔ اس کی آٹو سائیکل دہلی میں اتنی مشہور ہوگئی تھی جیسے چارلی چپلن کی مونچھیں اور یورپ کی بینیس۔ جدھر سے گذر جاتی لوگ انگلیاں اٹھا کر کہہ اُٹھتے۔ ؏

وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

کبھی داڑھ درد دور کرانے، کبھی ننھے کو چپ کرانے، کبھی سیمینار کرانے۔ اور ایک دن تو میں نے دیکھا وہ سعودی عرب کے سفارت خانے کے باہر کھڑا تھا۔ پوچھا۔ "مجتبیٰ بھائی! انڈو عرب اتحاد پر کوئی سیمینار کروا رہے ہو؟"

وہ بولا۔ "نہیں! یہاں کے ایک چپراسی بے چارے کو کھانسی کی گولیاں دینے آیا تھا۔ ہفتے بھر سے کھانسے ہی جا رہا ہے۔ اس کھانسی میں بھلا انڈو عرب اتحاد کہاں ممکن ہے۔" مگر پھر ایک دن اچانک دیکھا وہ آٹو سائیکل کی بجائے اسکوٹر پر نمودار ہوگیا۔

میں نے کہا۔ "مجتبیٰ بھائی! آٹو سائیکل سے اسکوٹر تک؟ کیا فلسفۂ ارتقا کے قائل ہو گئے ہیں۔"

وہ بولا۔ "نہیں فکر بھائی! دراصل محبوباؤں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ ابھی ابھی فرینڈر لوتم صاحب کو ہوائی جہاز پر سوار کرا کے آرہا ہوں، بڑی محبوبہ طناز قسم کی چیز ہے ظالم! اور اب عابد علی صاحب کی زیارت کے لئے امپریل ہوٹل جا رہا ہوں۔ آٹو سائیکل اور ہوائی جہاز میں فاصلہ کچھ زیادہ تھا۔ اسکوٹر سے قدرے کم ہوگیا ہے۔"

اور میں نے کہا۔ "مجتبیٰ! مجھے خطرہ ہے، ایک دن ایسا آجائے گا جب تم اپنے ہوائی جہاز پر سوار ہوکر ہمدرد دواخانے میں جا اُترو گے اور کہو گے، "جوشاندے کی ایک پڑیا دینا۔ فکر بھائی کو بلغم ستا رہا ہے۔"

بھارت چند کھنہ

تکلّف برطرف

زباں پہ کس کا نام آیا ؟

جب مجھ سے مجتبیٰ حسین صاحب کے فن اور شخصیت پر ایک مضمون، ان کی کتاب "تکلّف برطرف" کے رسم اجرا کے موقع پر لکھنے کے لئے کہا گیا تو میں فوراً تعمیل حکم کے لئے تیار ہو گیا۔ دراصل حکم کی تعمیل بخوڑ ہے ملازم پیشہ طبقہ کے تجربے کا۔ اگر میں ذرا غور کرتا تو یہ بات مجھ پر فوراً واضح ہو جاتی کہ کسی ادیب کی شخصیت پر مقالہ لکھنے کے لئے انسان کا کہنہ مشق نقاد ہونا ضروری ہے اور اس کے فن پر بحث کرنا بجائے خود ایک فن ہے جس میں یہ خاکسار بالکل کچا ہے۔ اس لئے ایک ایسے آدمی کے لئے جس کے پاس سوائے عمر کے اور کوئی پختہ چیز نہ ہو، ایسا مضمون لکھنا جوئے شیر لانا سے کم نہیں۔ اور یہی وجہ ہے میرے اس مضمون میں نہ تو آپ کو کہیں غوطے کھلانے والی گہرائی نظر آئے گی اور نہ دوربین سے نظر آنے والی وسیع النظری اور نہ مشینی ڈرل سے کھود کر دیکھی جانے والی ٹھوسیت۔ ممکن ہے آپ یہ بھی سمجھنے لگیں کہ مضمون سے کوسوں دور بھاگ رہا ہے مگر ایسا کرتے ہوئے نہ تو مجھے کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی ہے اور نہ میں اس کو باعث شرم سمجھتا ہوں کہ فی زمانہ غیر متعلق باتیں کرنا ہی اس ملک کا فیشن بن گیا ہے۔ مثلاً آپ ریاستوں کی اسمبلیوں کے مباحث کو دیکھیئے۔ اگر موضوع تعلیم یافتہ لوگوں کی بیکاری کا ہو تو بحث کی جاتی ہے کہ تعلیم کے فروغ کے لئے کافی روپیہ صرف نہیں ہو رہا ہے یا پھر اگر معاملہ زیر غور یہ ہو کہ موجودہ صنعتی کارخانوں کے لئے برقی سپلائی ناکافی ہے تو تحریک یہ کی جائے گی کہ نئی فیکٹریاں قائم کی جائیں تاکہ ملک کی صنعتی پیداوار بڑھے وغیرہ وغیرہ۔

اس لئے معزز حاضرین! میری خامیوں کو براہ کرم نظر انداز فرما دیجئے کہ میں نے اس مضمون میں چند واقعات کو جس طرح وہ پیش آئے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

مجتبیٰ حسین صاحب کو میں پچھلے تین چار برس سے جانتا ہوں۔ جس دن ان سے پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی وہ دن، مطلب ہے کہ رات مجھے کبھی نہیں بھولے گی۔ تفصیل اس واقعہ کی یہ ہے کہ اس دن انجمن ترقی اردو کی جانب سے ایک ادبی محفل اسی ہال میں مرزا شکور بیگ صاحب کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی، مجھے بھی شرکت کے لئے بلایا گیا تھا اس لئے میں دفتری دھندوں سے فارغ ہو کر اردو ہال پہنچ گیا۔ اس ادبی اجلاس میں مجتبیٰ حسین صاحب نے اپنا مضمون، قصہ پہلے گریجویٹ درویش، کا پڑھ کر سنایا جس کو بھرے ہال کے سامعین نے خوب خوب سراہا۔ جب تک وہ مضمون پڑھتے رہے

قہقہے بلند ہوتے رہے اور تمام حاضرین اپنی اپنی کلفتوں کو بلا شرکت غیرے یکسر بھلا بیٹھے۔ مرزا شکور بیگ صاحب نے کرسیٔ صدارت سے اس ذہن ابھرتے ہوئے مزاح نگار کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

بہرحال یہ محفل ختم ہوئی اور خاکسار، رات کے آٹھ بجے کے لگ بھگ گھر پہنچا آتشِ شکم مسلسل قہقہے لگانے سے بھڑک اٹھی تھی۔ بیوی ایک کرسی پر برآمدہ میں بیٹھی میری واپسی کا انتظار ایسے انہماک سے کر رہی تھیں جس طرح کوئی ماہی گیر پانی میں گل ڈالے مچھلی پھنسنے کے انتظار میں بیٹھا ہو۔

میں بیوی کو کھانے پر قصہ پہلے گریجویٹ درویش کا سنانا چاہتا تھا کہ انھوں نے نہایت دھیمی مگر بے حد موثر آواز میں پوچھا۔

"کیروسین تیل کا ڈبہ کہاں ہے"؟

کیروسین تیل کے ڈبے کا ذکر سنتے ہی میری آتشِ شکم پر گھڑوں پانی پھر گیا اور نتیجہ اس آب پاشی کا یہ ہوا کہ پانی جسم کے مختلف حصوں پر پسینہ بن کر نکل پڑا۔ اور ماتھے پر سے ٹپکنے لگا۔

کیروسین تیل کی کیفیت یہ ہے کہ بیوی نے اس دن مجھے دفتر میں ٹیلی فون کیا تھا کہ گھر میں کیروسین تیل کی اک بوند بھی نہیں ہے اور چولھے ٹھنڈے پڑے ہیں۔ ہدایت یہ دی گئی تھی کہ دفتر سے بروقت اٹھوں، کیروسین تیل حاصل کروں اور ایک ڈبہ بھر لے کر بدکے ہوئے آہو کی طرح سیدھا گھر واپس آجاؤں تاکہ رات کا کھانا بن سکے۔

یہ کم بخت ہدایت خاکسار کو پانچ بجے تک تو یاد رہی مگر جوں ہی اردو ہال پہنچا اور قصہ پہلے گریجویٹ درویش کا کہ جس کا نام ایس لے غلام بخت تھا سنا تو اس بدبخت کی طرح اپنا ذہن بھی یکلخت خالی ہو گیا۔

اور جب خاکسار سے بیوی کے سوال کا جواب نہ بن پڑا تو صاحبو! وہاں سے قصہ اس پانچویں درویش کا شروع ہوتا ہے، جس کا ذکر راویانِ خوش بیان، بموجب اعلان کرنا بھول گئے تھے۔ یہ قصہ بھی پہلے گریجویٹ درویش کے قصہ کی طرح بہت طولانی ہے کہ اس میں بیوی کے غم و غصہ کی کہانی ہے مکالمہ کی حد تک یک طرفہ زبان کی روانی اور اس آپ کے پانچویں درویش کی پریشانی اور پشیمانی ہے، اور چونکہ زندگی آنی جانی ہے اور یہ جہانِ فانی ہے، یہ درویش اپنا قصور مان کر متاسف تھا کہ وہ کر گیا تھا اس دن اپنی من مانی۔

اور اس کے بعد قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ بزرگوں کے قول کے مطابق یہ درویش پنجم اپنے قہر کو اپنی جانِ حزیں کی ملین سیٹ پر بٹھا کر اس رات کھانا کھائے اور پانی پیئے بغیر بستر جاناں سے دور بہت دور سر و پیر پہ چادر تان کر لیٹ گیا۔

اور پھر کیا ہوا دوستو!
بقول سلیمان خطیب صاحب
اک لطیفہ ہوا!
اک تماشہ ہوا
اک شگوفہ کھلا

یعنی یہ کہ گھر کے مچھر جو ہر رات اس درویش کا خون پیا کرتے تھے اپنے محبوب شکار کو اس جگہ نہ پا کر پریشان ہو گئے اور فوراً اپنے سردار کے پاس جا کر کیفیت بیان کی۔ مچھروں کا سردار کہ بڑا عقلمند اور تجربہ کار تھا کہنے لگا کسی وجہ سے گھوڑا اپنے تھان پر واپس نہ آیا ہو گا، اس لئے اے عزیزو! اس نازنین کی طرف بڑھو جو بازو کے بستر پر بصد ناز لیٹی ہوئی ہے اس پر

چند مچھروں نے اعتراض کیا کہ حضور! ہم آپ کے حکم کی قدر کرتے ہیں مگر ہم نمبروں کو الٹی خون پینے کے عادی ہیں، اس دو نمبر کے خون کو کیونکر گوارا کر سکیں گے؟ یہ سن کر سردار کو جو سردار پٹیل کا سا مزاج رکھتا تھا بہت غصہ آیا۔ کہنے لگا تم لوگ بھی ہندوستانیوں کی طرح بات بات پر اعتراض کرتے ہو اور روڑے اٹکاتے ہو چلو ہٹو اور جو کچھ راشن میں مل سکتا ہے اسے قبول کرو اور خدا کا شکر بجا لاؤ۔ الغرض مچھر اس غم و غصہ سے بھری حسینہ کی طرف بڑھے جو اس درویش کی بھول کو بھولے سے بھی نہیں بھولنا چاہتی تھی، چادر اوڑھنا بھول گئی تھی۔

اور ان مچھروں نے حسبِ روایات سیاستدانانِ ہندوستان اس بھول سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے بیوی صاحبہ پر یلغار کر دی اور یہ حملہ رستم و سہراب اور افراسیاب کے مل کر کئے ہوئے، بیان کردہ وغیر بیان کردہ حملوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھا۔ پری وش ان حملوں کی تاب نہ لا سکیں اور اٹھ بیٹھیں اور یہی وہ وقت تھا جب کہ آپ کا یہ درویش بے ہنگام اپنی زبانِ بے لگام کو دانتوں میں دابے، اپنے کئے پر پژمردہ اور اپنے نہ کئے پر افسردہ، مصنوعی خراٹے بڑی کر و فر سے بھر رہا تھا

جب سوئچ آن کیا گیا تو جانتے ہیں آپ کہ اس مہ لقا کو کیا نظر آیا۔

ایک موش قبیح صورت و سیاہ فام کو جس کی مونچھیں اور دم تھی، دراز مانند لگام، الماری کے کواڑوں تلے بیٹھا کسی مردِ بے حیا کی طرح دیدے پھاڑے اور ٹکٹکی باندھے اس حسینہ کا فرجمال کو جس کو اب پسینہ چھوٹنے لگا تھا، دیکھ رہا تھا۔

اور یہ پری زاد گل فام گو لرزہ بر اندام بڑے حوصلے اور قابلِ قدر شجاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پکار اٹھیں ؎

یہ بتا چارہ گر تیری زنبیل میں ٭ کچھ مداوائے دہشتِ چوہا بھی ہے ؟

اور کرنی اس قادرِ مطلق کی یہ ہوئی کہ عین اس موقعہ پر مولوی چارہ گر صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ بات یہ تھی کہ یہ صاحب مولائی ٹائپ کے انسان تھے اور اپنے خالق مخدوم صاحب سے اکثر رخصتِ اتفاقی لے کر چوری چھپے پرائیوٹ پریکٹس کرنے کے خالی تھے، میرے گھر پہنچ گئے تھے بغل میں زنبیل اور سلگتے ہوئے ہونٹوں میں بجھی ہوئی بیڑی دبائے ایک طرف کھڑے تھے۔ مخفی مباد کہ ابھی حال حال تک تو چار مینار سگریٹ ہی پیتے تھے مگر جب سے تمباکو پر نئے ٹیکس عاید ہوئے ہیں بیڑیوں پر اتر آئے ہیں۔

بہرحال حسینہ کا یہ سوال جو کہ نہ صرف اس چارہ گر کے نصابِ تعلیم میں شامل تھا بلکہ دورانِ تعلیم ان سے بار بار پوچھا جایا کرتا تھا اور گو یہ اس سوال سے اب تک بڑی حد تک مانوس بھی ہو چکے تھے، تاہم یہ سوال ایسا تھا کہ میاں چارہ گر کا ایک ہاتھ زنبیل میں تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ اپنا سر کھجائے جا رہے تھے اور یہ کھجانا کچھ ایسی شدت کا تھا کہ اس سے ان کے سر کو تو کچھ نہیں ہوا البتہ انگلیاں چھل گئیں۔ مولوی چارہ گر صاحب سوچ رہے تھے کہ یہ مخدوم صاحب بھی بڑے بخشے ہوئے ہیں۔ مجھ کو صرف دو بدنوں کی آگ کے متعلق کچھ تھوڑا بہت سکھا کر چھوڑ دیا ہے اور اس وسیع و بسیط کائنات میں کبھی کوئی سرپھرا فاقے کا علاج کرنا چاہتا ہے تو کوئی چوہے کو دیکھ کر پیدا ہونے والے خوف کو دور کرنے کا دارو مانگتی ہے۔ اس لئے اس نے تہیہ کر لیا کہ اپنی اولین فرصت میں مخدوم صاحب سے مل کر ان بیماریوں کا بھی علاج دریافت کر لوں گا ورنہ یہ چوری چھپے کی پریکٹس کبھی کامیاب نہیں ہو گی۔

ادھر چارہ گر صاحب ان خیالوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ ادھر وہ نازک جان حسینہ چوہے کی مقناطیسی نظر سے خود بے بس و مجبور ہو چکی تھی۔ غرض اس غنچہ دہن نے ایک چیخ ماری اور بے اختیار ہو کر دوڑیں۔

تو اس نوبت پر اے پیرانِ پارسا، جوانانِ بے وفا، طفلانِ بے حیا، دوشیزگانِ نارسا، مستوراتِ باحیاو

ادیبانِ ہردم خطا یہ درویش بحالتِ مجبوری اور بالکل فوری یہ قصہ ختم کرتے ہوئے دفع ہوتا ہے کہ یہی موقعہ تھا جبکہ سنسر کے عہدہ داران، اپنی نفسِ مردہ کی لاشیں اپنے کندھوں پر لادے اپنی ملازمت کے تحفظ کی خاطر، بڑی بڑی تیز اور چمکدار قینچیاں ہاتھوں میں تھامے کسی بھوت بلا کی طرح کہیں سے یک دم نمودار ہوئے اور اس افسانۂ لازوال کے تسلسل کو آنِ واحد میں ہمیشہ کے لئے کٹ کر دیا۔

معزز خواتین و حضرات! مجھے ڈر اس بات کا ہے کہ سنسر والوں کی اس حرکتِ نامعقول پر نوجوانانِ وطن کہ جن کے پاس وقت کے استعمالِ بے جا کے لئے فراوانی ہی فراوانی رہتی ہے، ہڑتال نہ رچا بیٹھیں۔

سامعینِ ذی احترام! یہ تھا نتیجہ مجتبیٰ حسین صاحب سے میری پہلی ملاقات کا۔

اس ملاقات کے بعد یا یوں کہیئے کہ "قصہ پہلے گنہ گار بھٹ درویش کا" سے لے کر "ناز اُٹھانے کو ہم رہ گئے" ڈاکٹروں کے" تک ان سے بہت سی ملاقاتیں ہوئیں۔

پہلے زندہ دلانِ حیدرآباد اور حلقۂ اربابِ ذوق کے جشنِ مزاح کے انتظامات کے سلسلہ میں اور پھر حلقۂ اربابِ ذوق کے جشنِ مزاح کے انتظامات کے تعلق سے ملتے رہے۔ موصوف ان دونوں کانفرنسوں کے معتمدِ عمومی تھے، حسبِ ضرورت یہ ملاقاتیں طویل یا انٹرکلاس کی ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے مسرت ہوتی ہے کہ مجتبیٰ حسین نے بحیثیتِ معتمدِ عمومی اپنے فرائض کو بڑی محنت اور انتہائی ذمہ داری سے انجام دیا۔ یہ کہنا کہ انھوں نے ان کانفرنسوں کی کامیابی کے لئے دن رات کام کیا مبالغہ نہ ہوگا۔ اگرچہ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے کام میں عہدہ دارانِ حلقۂ اربابِ ذوق اور زندہ دلانِ حیدرآباد نے موصوف کو ممکنہ مدد دی مگر بحیثیتِ معتمدِ عمومی مجتبیٰ حسین صاحب ان کانفرنسوں کی مرکزی اور اہم ترین شخصیت تھے۔ پوری خط و کتابت، مہمان ادیبوں کو شرکت کے لئے پابند کرنا اور وقت اور تاریخ کی پابندی سے ان کے حیدرآباد پہنچ جانے کی ترکیبیں، سوونیر کی ترتیب، اپنی رپورٹ لکھنا، دعوت ناموں کی اجرائی۔ مقامِ کانفرنس کے انتظامات، مہمان ادیبوں اور شاعروں کے قیام، طعام اور ٹرانسپورٹ کی دیکھ بھال، ادیبوں اور خصوصاً شاعروں کو مشاعرے میں گھسیٹ کر لانا وغیرہ وغیرہ ایسے کام ہیں جن کو کرنے کے لئے وقت، بے حد صبر اور ایثار کی ضرورت ہوتی ہے۔ مختصراً میں یہ کہوں گا کہ مجتبیٰ حسین صاحب نے ان کانفرنسوں کی کامیابی کے لئے بہت ٹھوس کام کیا جس کے لئے وہ اور دیگر حضرات جنھوں نے مختلف نوعیت کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹایا قابلِ مبارکباد ہیں۔

پہلی کانفرنس کے موقعہ پر مجتبیٰ حسین صاحب ہر اچھے ادیب کی طرح علیل ہو گئے تھے مگر انھوں نے بسترِ علالت سے لیٹے لیٹے کنہیا لال کپور کو شرکت اور صدارت کی دعوت دی جس کا جواب قافیہ اور ردیف قائم رکھنے کی غرض سے کنہیا لال کپور نے بھی لیٹے لیٹے ہی لکھا اور بتلایا کہ وہ عارضۂ دل کو دل دے بیٹھے ہیں۔ ڈائس پر لیٹ کر صدارت وہ اس لئے نہیں کرنا چاہتے تھے کہ کہیں خود مجسم مزاح نہ بن جائیں اور طنز کے نشتر ان کو چبھنے لگیں۔

اس مزاح کی معراج یہ ہے کہ جب مجتبیٰ حسین صاحب نے کرشن چندر کو اپنی کتاب "تکلف برطرف" کے لئے پیش لفظ لکھنے کے لئے آمادہ کر لیا تو یہ حضرت بھی ان کی خواہش کی تاب نہ لا سکے اور پیش لفظ لکھنے سے پیشتر ہی ان کو بھی دل کا دورہ پڑ گیا۔ اس لئے بحالتِ مجبوری موصوف کو خود اپنا تعارف آپ کرانا پڑا! کیونکہ دوسرا ادیب جو پیش لفظ لکھ سکتے تھے وہ دل کے مرض میں مبتلا نہیں ہونا چاہتے تھے۔

میں نہیں جانتا کہ مجتبیٰ حسین صاحب کا مزاحیہ کانفرنسوں اور مشاعروں کے انتظامات اور مزاحیہ مضامین پڑھنے کے علاوہ

اپنا وقت کس طرح گزارتے ہیں اس لیئے اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آپ ان سے جب "تکلف برطرف" میں ملیں گے تو آپ کو ان کے متعلق کافی معلومات حاصل ہو جائیں گی۔ میں تو صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ مجتبیٰ حسین صاحب قلم تراش قلم کے تیز انسان ہیں زندگی میں مزاح کی قاشیں تراشنے میں خود کو ہمہ تن مصروف رکھتے ہیں' یہی وجہ ہے کہ نوجوانی میں اور کھاتے پیتے خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئے ہیں

اس میں شک نہیں کہ اگر ان کے بالوں کو بری طرح بکھیر کر ترتیب دیا جائے تو ان بالوں میں دلیپ کمار کے بال بننے کی صلاحیت ہے مگر ہندوستانی فلم کے ایک ہیرو کو بنانے کے لیئے دو تین مجتبیٰ حسین درکار ہوں گے اور پھر اگر جنوبی ہند کے اسکرین کی ٹھوس ہیروئین کا جسم و جثہ مقصود ہو تو کم از کم چار پانچ مجتبیٰ حسینوں کی حاصل جمع سے دیسی حسینہ مرتب ہو سکے گی۔

میں مجتبیٰ حسین صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ ان کے مضامین کا پہلا مجموعہ چھپ چکا ہے میرا خیال ہے کہ موصوف گنتی کے ان چند ادیبوں میں سے ہیں جن کی کتابوں کی مانگ رہے گی ورنہ خاکسار کی جس کی تین کتابیں چھپ چکی ہیں ان کی نکاسی کی واحد ترکیب یہ رہی ہے کہ خاکسار ہی ان کو خریدتا ہے اور تحفتہً دوستوں اور ہمدردوں کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا رہتا ہے۔

ہر ایک شخص کو جو آج کل زندہ رہنے کی دشواریوں کو کچھ دیر کے لیئے بھلا دینا چاہتا ہو میرا مشورہ یہ ہے کہ مجتبیٰ حسین صاحب کی "تکلف برطرف" پڑھے بلکہ زیادہ مناسب یہ ہوگا کہ اگر وہ اس کتاب کو اپنے پاس ہی رکھے اور جب کبھی زندگی کمزور ہونے لگے یا کسی قسم کا درد سر سے پالا پڑ جائے تو فوراً موصوف کا لکھا ہوا کوئی مضمون پڑھنا شروع کر دے ضرور افاقہ ہوگا میں اپنی حد تک میں ان کے مضامین کو اسپرو کی ٹکیہ کی جگہ استعمال کرتا ہوں۔

"تکلف برطرف" موصوف کے تیرہ مضامین' اپنا تعارف جو بجائے خود ایک اعلیٰ درجہ کا مضمون ہے پر مشتمل ایک ہلکی پھلکی کتاب ہے اور اس کا ہر ایک مضمون مزاح نگاری کا شہ پارہ ہے۔ ہم کو حیدرآباد پر ناز ہے جس نے مجتبیٰ حسین جیسا مزاح نگار پیدا کیا۔ میں دعا کرتا ہوں کہ خدا انھیں اور زیادہ زور قلم عطا کرے اور کوئی انھیں مزاح کے میدان سے اغوا کر کے کہیں اور نہ لے جائے

☆ ☆ ☆

" اپنی تعلیم کے بارے میں یہ عرض کردوں کہ پرائمری اسکول میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلتا رہا۔ مڈل اسکول میں فٹ بال کھیلتا رہا' ہائی اسکول میں پنگ پانگ اور اسی قسم کے دوسرے کھیلوں میں نام کماتا رہا۔ البتہ کالج میں پہنچ کر اسپورٹس سے میری دلچسپی اس لیئے کم ہوئی کہ سینما بینی اور رومانس نے مجھے اسپورٹس کی طرف توجہ دینے کی مہلت ہی نہ دی۔ غرض زمانۂ طالب علمی میں ہر ایسی سرگرمی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا رہا جو "خارج از نصاب" ہو۔ مجھے "داخل در نصاب" سرگرمیوں سے ہمیشہ چڑ رہی۔

مجتبیٰ حسین

"مجموعہ لطیفے" "تکلف برطرف"

یوسف ناظم (بمبئی)

پختہ اعتقاد کا مرکزی ادیب

مجتبیٰ حسین جب تک حیدرآباد میں رہے صرف میں ہی نہیں سبھی لوگ انھیں خورد سمجھتے رہے (حیدرآباد میں آدمی کو اپنے صحیح قد و قامت تک پہنچنے میں دیر لگتی ہے)۔ لیکن جب سے وہ ہندوستان کی راجدھانی دلّی میں منتقل ہوئے ہیں۔ نہ صرف مجھے سبھی کو اندازہ ہوگیا کہ مجتبیٰ کو سمجھنے میں ان سے تسامح ہوا تھا۔ دلّی پہنچتے ہی مجتبیٰ کلاں ہو گئے۔ اُن کی یہ کلاں رسیدگی اُن کا صرف جغرافیائی مقام نہیں ادبی مقام بھی ہے۔ اہلِ دلی کو ایک اچھے مزاح نگار کی ضرورت تھی۔ ویسے فکر تونسوی وہاں موجود ہیں لیکن اول تو وہ مزاح نگار سے زیادہ طنز نگار ہیں، دوسرے اُن کے دِلّی میں رہنے کا فائدہ ہی کیا ہے۔ وہ گھر سے باہر نکلتے نہیں (جب کہ مجتبیٰ حسین کو یاد دلانا پڑتا ہے کہ اُن کا ایک گھر بھی ہے) فرقت کاکوروی بھی دِلّی ہی میں رہا کرتے تھے لیکن انھیں بھی گذرے ہوئے کافی دن ہو گئے تھے اور دلّی بھی دِلّی معلوم ہونے لگی تھی جس کے بارے میں میرؔ نے "اُجڑے دیار" کے سخت الفاظ استعمال کئے تھے۔ ایسے نازک بلکہ ناگفتہ بہ حالات، میں مجتبیٰ حسین کا دِلّی جانا بہت ضروری تھا۔ وہ بالکل صحیح وقت پر دلّی گئے ورنہ عموماً ہمارے یہاں کوئی کام صحیح وقت پر ہوتا نہیں ہے۔ ادیب اور شاعر یا تو اپنے وقت سے بہت پہلے پیدا ہو جاتے ہیں یا پھر نرگس اپنی بے نوری پر سالہا سال روتی رہتی ہے۔ (ہزاروں سال کے الفاظ ظاہر ہے بے حد مبالغہ آمیز ہیں)۔ یوں بھی شمالی ہند سے تو ادیب اور شاعر بکثرت، حیدرآباد آتے رہے (اس زمانے میں یہی ایک سفر سب سے زیادہ آسان تھا)۔ یہاں آنے والوں میں کچھ تو بلانے پر آئے اور کچھ تو جیسا کہ قاعدہ رہا ہے بن بُلائے آئے اور کچھ کو تو زبردستی واپس بھی کرنا پڑا لیکن دکھن سے کسی ادیب کا دلّی جا کر بس جانے کا تاریخ ادب اُردو میں یہ پہلا واقعہ ہے۔ اس میں شک نہیں اُردو کے شروع شروع کے دنوں میں ولیؔ دکھنی شمالی ہند گئے تھے لیکن وہ خالص دکھنی تھے، یہ بات اہل گجرات آج تک نہیں مانتے (گجرات اُردو اکاڈمی نے جو حال ہی میں پیدا ہوئی ہے، اپنے اس دعوے کی تائید میں تو ایک ولیؔ گجراتی ایوارڈ بھی قائم کر دیا ہے۔ ڈاکٹر زورؔ یا نصیر الدین ہاشمی زندہ ہوتے تو آندھرا پردیش اُردو اکاڈمی کا ولیؔ دکھنی ایوارڈ قائم کروا کے ہی رہتے)۔ ولیؔ دکھنی کے دِلّی کے سفر میں ایک قباحت یہ بھی تھی کہ وہ نثر نگار نہیں تھے اور مزاح سے تو انھیں ذرا سی بھی دلچسپی نہیں تھی۔ اس لئے مجتبیٰ حسین کے دلّی جانے کے واقعے کو "یونیک" (اپنی مثال آپ) قرار دیا جائے تو اس میں کوئی تسامح نہیں ہوگا۔ (اُردو ادب میں تسامح کے سانحات، حقیقی واقعات سے زیادہ ہیں بلکہ ایک لحاظ سے تسامح اُردو ادب کا بڑا سرمایہ ہے۔)

مجتبیٰ حسین کا وطن گلبرگہ ہے اور اتفاق دیکھئے کہ مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی برسوں گلبرگہ میں رہے۔ اس لحاظ سے شخصی طور پر مجتبیٰ اُن کے مقروض تھے۔ مجتبیٰ نے دِلّی جاکر یہ پُرانا قرض ادا کردیا۔ (ہم سب سبکدوش ہوئے)۔ مجتبیٰ حسین، محبوب حسین جگر اور ابراہیم جلیس کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ابراہیم جلیس کا قیام تو حیدرآباد میں زیادہ نہیں رہا لیکن محبوب حسین جگر تو ایک مرتبہ حیدرآباد آگئے تو پھر کہیں گئے ہی نہیں۔ اُن کا حیدرآباد میں مستقل قیام اور اس پر مستزاد حیدرآباد کی تہذیب (جس کا پنڈت نہرو بھی بار بار اپنی تقریروں میں ذکر کیا کرتے تھے) ان دونوں باتوں کی وجہ سے مجتبیٰ حسین جب تک شہر حیدرآباد میں رہے اُن کا زیادہ وقت لوگوں کا ادب کرنے اور انھیں مودبانہ طور پر آداب عرض کرنے میں گذر گیا۔ وہ چھُپ کر کسی گلی کوچے سے بھی گذرنا چاہتے تو وہاں بھی محبوب حسین جگر کا کوئی نہ کوئی شناسا انھیں ضرور مل جاتا۔ حیدرآباد میں اُن دنوں سلام کی۔ بجائے کسی کی طرف مسکرا کر دیکھنا یا ہاتھ ملا کر ہائی کہنا بہت معیوب تھا۔ سلام بھی۔ بحر طویل میں ہوا کرتے تھے۔
(حوالے کے لئے ملاحظہ ہو مخدوم محی الدین کا مصرع!)

تری نگاہ نے جُھک کر میرے سلام لئے (بصیغۂ جمع)

مجتبیٰ حسین جب تک حیدرآباد میں رہے اُن کی زندگی میں ایسے سخت مقامات قدم قدم پر آتے رہے اور غالبؔ۔ غالبؔ کیوں یقیناً۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے اندر کا مزاح نگار ۱۹۶۲ء تک باہر نہیں آسکا۔ (میرے حساب سے مجتبیٰ حسین ۱۹۶۲ء تک پردہ نشین اور دِلّی جانے تک صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں کا مرقع رہے۔ ۱۹۶۲ء میں اُن کے محمد علی جوہر اُس وقت کھُلے جب اُنھوں نے روزنامہ سیاست کے لئے شیشہ و تیشہ لکھنا شروع کیا۔ شاہد صدیقی کے بعد مشہود اور مشاہدے سے وہی نبرد آزما ہوئے اور اس راہ میں شہید ہوتے ہوتے بچے۔ مطلب یہ کہ اگر وہ کالم نگاری سے ادب نگاری کی طرف نہ آتے تو چھوٹی پٹری پر ہی رہتے۔ نقصان ان کا نہیں بڑی پٹری کا ہوتا۔ اور ایک مرتبہ انھوں نے مزاح نگاری شروع کردی تو پھر انھوں نے پلٹ کر پیچھے کی طرف نہیں دیکھا۔ پیچھے تو وہ لوگ دیکھتے ہیں جنھیں آگے بڑھنے میں کچھ تکلف ہوتا ہے۔ اُن کی (مبینہ) گذشتہ پردہ نشینی سے موجودہ شہ نشینی تک میں چشم دید گواہ رہا ہوں۔ مجتبیٰ نے اختر بھائی کے خاکے میں غالبؔ یہ لکھا ہے کہ جب وہ حیدرآباد چھوڑ کر دلّی جارہے تھے تو سب سے زیادہ خوشی اختر بھائی کو ہوئی تھی۔ یہ غلط ہے۔ سب سے زیادہ خوشی تو کنول پرشاد کنولؔ کو ہوئی ہوگی جن کے "سرکاری راز" مجتبیٰ ہی کی زبانی شہر میں مشتہر ہوتے تھے۔ آج اپنے دفتر میں کنول پرشاد کنولؔ نے اپنے کتنے ملاقاتیوں کو کتنی دیر کلام سنایا، شام کو ... میں مجتبیٰ اس کی تفصیل ضرور سُناتے تھے اور یہی وہ سرکاری راز تھے جس کے افشاء ہونے سے شاعر کو دلی صدمہ پہنچتا تھا۔ یہ بات صحیح تھی یا نہیں مجھے نہیں معلوم لیکن یہ میں ضرور کہہ سکتا ہوں کہ مجتبیٰ کے یہاں سے جانے کے بعد دفتر اطلاعات و تعلقات عامہ میں بڑا سکون ہوگیا۔

جس طرح تنقید کے شعبے میں کئی شاخیں ہیں (جنھیں شاخسانہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا) جیسے متنی تنقید، عملی تنقید وغیرہ۔ مجتبیٰ مزاح کے معاملے میں 'عملی مزاح' کے پائینیر ہیں۔ اسی لئے وہ دلّی میں بھی کبھی نچلے نہیں بیٹھے۔ مجھے معلوم ہے کہ پٹنہ میں جشن ظرافت کے محرک مجتبیٰ رہے ہیں۔ شفیع مشہدی نے تو صرف اپنا کاندھا استعمال کرنے کی اجازت دی تھی۔ چندی گڑھ اور فرید پور کے علاقے بھی مجتبیٰ کی دستبرد سے محفوظ نہیں رہے اور دلّی تو خیر ان کا مستقر ہی ہے۔ دلّی میں انھوں نے طنز و مزاح کو بُری طرح پھیلایا، اب وہاں جگہ جگہ مزاح نظر آتا ہے۔

دلی کے معروف ترین لوگوں کی فہرست میں مجتبیٰ کا نام شروع کے ناموں میں آتا ہے۔ کسی نہ کسی کے کام سے دلی کی سڑکوں کی پیمائش اُن کے لئے ضروری ہے۔ دلی کے جغرافیے سے اگر کوئی شخص پوری طرح واقف ہے تو وہ مجتبیٰ ہیں۔ مشہور تو یہ ہے کہ خود دلی کے باشندے اب مجتبیٰ سے پوچھنے لگے ہیں کہ یہ گھٹا مسجد روڈ کہاں واقع ہے اور چتلی قبر جانے کا راستہ کون سا ہے اور مجتبیٰ چتلی قبر کا راستہ بتانے میں بڑی مسرت محسوس کرتے ہیں۔ دلی میں پہلے ایک حیدرآباد ہاؤز ہوا کرتا تھا جو حیدرآباد دکن کے ایک اندرونی سفیر دہلی کی قیام گاہ تھا۔ اب ریاستوں کے اندرونی 'سفرا' کا سلسلہ منقطع ہوگیا ہے۔ سرکاری سطح پر تو حیدرآباد ہاؤز وہاں نہیں رہا لیکن ادبی سطح پر ایک چھوٹا موٹا ہاؤز این سی ای آر ٹی کیمپس میں قائم ہوگیا جس پر اکثر "ہاؤزفل" کی تختی آویزاں رہتی ہے۔ وٹھل راؤ کی موسیقی بھی یہاں ہوتی ہے اند زندہ دلان حیدرآباد کی ہنگامی میٹنگ بھی، لیکن شرط یہ ہے کہ خود مجتبیٰ گھر پر موجود ہوں اور ایسے مواقع شاذ و نادر ہی آتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری نے ایسے ایسے لوگوں کو مزاح پڑھنے اور سمجھنے پر مائل کیا جن سے کبھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ یہ شریفانہ رویہ اختیار کرسکیں گے۔ اب انھیں اندازہ ہوا ہے کہ وہ سابق میں کتنا نقصان اُٹھاتے رہے ہیں۔

طنز و مزاح کا معاملہ ذرا نازک ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ فرمائشی پروگرام کی طرح کی کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی۔ تاہم مجتبیٰ کی مزاح نگاری کے زخمیوں کی تعداد کم نہیں ہے (طنز و مزاح سے آدمی زخمی ہی ہوتا ہے، یہ اور بات ہے کہ اُسے پتہ نہیں چلتا) بلکہ ان میں آبادی کے تناسب سے دن بہ دن اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے اور اُردو کے آخری قاری' اب بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کا جب بھی جی چاہتا ہے اور انھیں اپنے زخمیوں کو دیکھ آنا منظور ہوتا ہے تو وہ "سیرگل" کے بہانے باہر نکل پڑتے ہیں اور اب تو وہ اس سلسلے میں دور دور کا سفر کرنے لگے ہیں۔ ملک اب ایک دوسرے کے اتنے نزدیک آگئے ہیں کہ سیر اور سفر میں کوئی فرق نہیں رہا ہے۔

مجتبیٰ کے دلی میں رہنے کا فائدہ یہ ہوا کہ اب اُردو کا ہر مزاح نگار اپنے آپ کو مرکز سے بالکل قریب بلکہ مرکز کا ہی آدمی سمجھنے لگا ہے۔ مرکز مزاح کے میدان میں اتنا مقبول ہو جائے گا۔ یہ بات کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ مجھے خود بار بار دلی جانے کی تحریک ہوتی رہتی ہے۔ ایسا پہلے نہیں ہوتا تھا۔ بہرحال خوشی اس بات کی ہے کہ مجتبیٰ حسین اب ایک مرکزی ادیب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مرکزی ادیب کا تقرر نہیں ہوتا خود بننا پڑتا ہے اور اگر دانت اصلی ہوں تو دانتوں پسینہ آجاتا ہے۔

مجتبیٰ حسین دلی جاکر ذرا ضخیم ہو گئے ہیں اور اس کی اطلاع خود انھیں بھی ہے۔ کہتے ہیں 'میں پابندی سے روزانہ دو گھنٹے 'واک' کرتا ہوں' لیکن اس واک سے کیا فائدہ جس سے خود واک کنندہ کی ذات کو فائدہ پہنچے۔ یوں مجتبیٰ نے دلی جاکر سگریٹ نوشی ترک کردی ہے اور اب وہ دن میں صرف ۳۰ سگریٹیں پیتے ہیں اور انہی فگار انگلیوں سے مزاح لکھتے ہیں۔ ان کی تحریر میں جو 'مرغولے' ہوتے ہیں، قاری اُن میں دیر تک گم رہتا ہے۔ "حلقہ بگوش" بھی اسی طرح پیدا ہوتے ہیں۔

۱۹۸۷ء مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کا پچیسواں سال ہے۔ میں نے غلطی سے ۱۹۸۷ کے اعداد جمع کئے تو حاصل جمع ۲۵ ہی نکلا۔ اسے عام زبان میں حسنِ اتفاق کہا جاتا ہے۔ ۲۵ سال کی اس نقرئی مدت میں مجتبیٰ حسین نے جو لکھا وہ چاندی نہیں سونا ہے کیونکہ میں مزاح کو سونا ہی سمجھتا ہوں اور وہ سونا بھی نہیں جو طلائی تمغوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ ۲۴ قیراطی سونا ہوتا ہے۔ مزاح اصل میں تفریح کی نہیں اعتقاد کی چیز ہے اور مجتبیٰ حسین کا اعتقاد پختہ ہے۔ ■ ■

مرزا ظفر الحسنؒ

۳ بھائی
— تینوں ادیب!
— تینوں صحافی!!

ہندوستان، پاکستان میں ایسے دو سگے بھائی اکثر ملتے ہیں جن کا رجحان طبع یکساں اور میلان ہنر ایک جیسا ہو۔ مگر کم خاندان ملیں گے جن کے تین افراد اور تینوں بھائی ایک ہی راستہ پر گامزن ہوں۔ اور وہ راستہ بھی علم و ادب اور صحافت کا ہو۔ ایسے ہی تین بھائی جگر، جلیس اور مجتبیٰ ہیں۔

سابق ریاست حیدرآباد دکن کا ایک صوبہ گلبرگہ تھا جہاں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کا مزار ہے۔ ہر سال آپ کا عرس عقیدت اور جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔ ہر سال اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں مرحوم نے بھی عرس میں شرکت کی سعادت حاصل کی۔ نظام دکن جو اُن دنوں دنیا کے متمول ترین شخص مانے جاتے تھے اپنے سر پر ایک کشتی اٹھائے اور اس میں صندل، پھولوں کی چادر اور عقیدت کے دوسرے نذرانے رکھے اپنی جائے رہائش سے پیدل چلتے ہوئے حضرت گیسو دراز کی درگاہ میں حاضری دی۔

جلیس کا وطن یہی گلبرگہ تھا اور ان کے بڑے بھائی محبوب حسین گلبرگہ اور برادر خورد مجتبیٰ حسین کا خمیر بھی اسی سرزمین سے اٹھا تھا۔ جگر اور جلیس کو میں مدت سے جانتا تھا مگر مجتبیٰ حسین سے میری اولین ملاقات اپنے حالیہ سفر ہند (فروری ۱۹۷۸ء) میں ہوئی۔ جگر اور میں ایک ساتھ جامعہ عثمانیہ میں تعلیم پا چکے ہیں۔ میں نے جب انجمن اتحاد طلباء جامعہ عثمانیہ کا صدارتی انتخاب لڑا تو وہ ہماری پارٹی کے نہایت فعال کارکن تھے۔

جگر نے بہت کم لکھا مگر علم و ادب کا چسکا انھیں طالب علمی ہی کے زمانے سے پڑ چکا تھا۔ ابھی بی۔ اے کی ڈگری نہ لی تھی کہ مخدوم محی الدین کی شاعری پر ان کا تنقیدی جائزہ نگار لکھنؤ جیسے موقر جریدے میں شائع ہوا جو میری معلومات کے مطابق مخدوم کی شاعری پر اولین مضمون تھا۔ میں تو اس حد تک کہنے کو تیار ہوں کہ نثر کے ذریعہ مخدوم کا نام ہندھیاچل کے پار سب سے پہلے جگر نے پہنچایا۔ علامہ نیاز فتح پوری نوجوان قلم کاروں کی بڑی حوصلہ افزائی کرتے تھے مگر اس کی خاطر مرحوم نے کبھی نگار کے معیار کو مجروح نہیں ہونے دیا اس وقت کے نوجوان شاعر مخدوم پر نوعمر قلمکار جگر کے مضمون کی اشاعت ایک چونکا دینے والی ادبی حقیقت تھی۔ جگر گزشتہ تیس سال سے اپنے ہمدم دیرینہ عابد علی خاں کے روزنامہ "سیاست" کا سارا صحافتی بوجھ سنبھالے ہوئے ہیں۔

میرے ایک اور رفیق جامعہ عثمانیہ — مجتبیٰ حسین مزاح نگار ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی تحریر دل کو بڑی بانگ ہے مجھے مجتبیٰ کو بالکل پہلی

مرتبہ ادبی ٹرسٹ حیدرآباد کی جانب سے منعقد کئے جانے والے ایک حالیہ مذاکرے میں سننے کا موقع ملا۔ مذاکرے کا موضوع ایک مزاح نگار کے نقطۂ نگاہ سے کوئی خاص جاندار نہ تھا۔ یعنی کتابوں کی فروخت کے مسائل۔ حیدرآباد کا اردو ہال حاضرین سے بھرا ہوا تھا جس کا سبب مجھے یہ بتایا گیا کہ مجتبیٰ حسین مضمون پڑھنے والے ہیں۔ جب مجتبیٰ حسین مضمون سنا رہے تھے۔ میں نے کئی بار پلٹ کر حاضرین کو دیکھا اور انھیں ہمہ تن شوق پایا۔ حاضرین انتظار میں ہوتے کہ مجتبیٰ کی زبان سے کوئی جملہ ادا ہو اور وہ تحسین کے ڈونگرے برسائیں۔ از اول تا آخر مجتبیٰ نے اتنی داد سمیٹی کہ اسے قلم کی جادوگری کے سوا کوئی اور نام نہیں دیا جا سکتا۔ مجتبیٰ مزاح نگار ہونے کے علاوہ اخباری کالم نویس بھی ہیں اس بنا پر اُن کا رشتہ صحافت سے بھی ہے۔

جلیس کو میں اس وقت سے جانتا تھا جب وہ علی گڑھ سے فراغت علم کے بعد دکن لوٹے اور اُن کے رخت سفر میں شہرت شامل تھی۔ آزادی سے پہلے جلیس نے بحیثیت افسانہ نگار خاصا مقام حاصل کرلیا تھا اور صاف نظر آرہا تھا کہ یہ لحیم شحیم نوجوان ادبی دنیا میں بھی بہت قدآور ہوگا۔ مشرقی ممالک کے معاشروں کی یہ بدنصیبی رہی ہے کہ ادیب و شاعر ادب میں اونچا درجہ حاصل کرلینے کے باوجود معاشی اعتبار سے اتنا بدحال رہتا ہے کہ اسے مجبوراً کوئی دوسرا پیشہ اختیار کرکے اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ پالنا پڑتا ہے۔ ادب کی دکان بند کرکے جلیس کو صحافت کے میدان میں آنا پڑا۔ یہی لمحات تھے جب اُن کے مداحوں نے سوچنا شروع کیا کہ وہ ادب کی طرف لوٹیں گے۔ یا نہیں؟ وہ کس برتے پر لوٹتے۔ انھیں ادب کے کس گوشے سے آواز آئی۔ کس نے بلایا اور بلاتا تو انھیں کیا خاک دیتا؟

جلیس کی قیام پاکستان کے بعد کی تحریروں کا ناقدانہ تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ کہ ان کی ادبی تحریروں میں صحافیانہ رنگ کتنا ہے۔ اور ان کی صحیفہ نگاری میں کہاں کہاں ادب کی جھلک نظر آتی ہے۔ ایک صحافی کی تخلیقات میں ہمیشہ ادب کی چاشنی ملے یہ کوئی ضروری نہیں مگر ایک اچھا ادیب اپنے صحافیانہ نگارشات میں ادب کی ملاوٹ سے گریز کرنا بھی چاہے تو نہیں کرسکتا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خاں سے لے کر ابن انشا مرحوم اور انتظار حسین تک کی اخباری تحریریں میرے اس دعویٰ کے ثبوت میں موجود ہیں جلیس بھی ایسے قلمکاروں میں شامل ہیں۔

جلیس نے آزادی سے پہلے جس قدر و قیمت کی تحریروں سے ادب کو نوازا ایسی تحریریں صحافت میں داخل ہونے کے بعد نہیں عطا کیں جو یقیناً ایک نقصان ہے۔ مگر ادب کے اس نقصان کی تلافی انھوں نے صحافت کے فائدے سے کردی ہے۔ مجید لاہوری اور شوکت تھانوی جیسے محترم اور مقبول کالم نویسوں کی جگہ لے کر روزنامہ جنگ کراچی کے روزانہ کالم "وغیرہ وغیرہ" میں جلیس نے یہ محسوس ہی نہ ہونے دیا کہ مجید لاہوری اور شوکت تھانوی کی وفات سے پیدا شدہ خلاء باقی ہے۔ روزنامہ جنگ کو نہ دوسرا مجید لاہوری ملا نہ دوسرا شوکت تھانوی اور نہ آج تک دوسرا ابراہیم جلیس ملا ہے۔

ادب اور صحافت سے قطع نظر بھی جلیس کی شخصیت پرکشش تھی۔ جس محفل میں جاتے جاذبِ نظر ہو جاتے۔ زرخیز دماغ اور حافظہ پایا تھا۔ لطائف کا اگر کارخانہ کہہ سکتے ہیں تو وہ جلیس کی ذات میں تھا۔ جس محفل میں بیٹھتے دس بیس لطائف سُنا کر اٹھتے، آواز ایسی گھمبیر کہ دُور سے پتہ چل جائے کہ یہاں جلیس موجود ہیں۔ ان کا قہقہہ ان کے قد سے زیادہ بلند ہوتا۔ مشرقی اقدار کا یہ قدردان ان بزرگوں کا پورا پورا احترام کرتا۔ اگر کسی بزرگ سے کوئی نظریاتی اختلاف ہوتا۔ (اور یہ میں اپنے ذاتی تجربے کی بناء پر کہہ رہا ہوں) تو جلیس کی اختلافی گفتگو

دائرہ ادب سے باہر کبھی نہ ہوتی۔ ایک مرتبہ کسی نے جلیس سے کہہ دیا کہ سید سبط حسن ان سے ناراض ہیں انھیں ترقی پسند نہیں مانتے اور رجعت پسند کہتے ہیں کیونکہ انھوں نے خود کو زمینداروں اور سرمایہ داروں کی جماعت پاکستان پیپلز پارٹی سے وابستہ کر رکھا ہے۔ جلیس نے مجھ سے کہا "ظفر بھائی بزرگی اور خوردی حائل ہے۔ اور ادب مجھے روکے ہے ورنہ سبطے بھائی کو جنھوں نے مجھے رجعت پسند کہا ہے۔ میں بھی ترقی پسند ماننے سے انکار کر دیتا کہ خود وہ بھی تو سیٹھ روشن علی بھیم جی کے تنخواہ یاب ملازم ہیں"۔

حیدرآباد دکن سے پاکستان آنے والوں میں خواجہ معین الدین مرحوم اور ابراہیم جلیس مرحوم نے جو ممتاز مقام حاصل کیا کسی اور سابق حیدرآبادی کا مقدر نہ بن سکا۔ دونوں ہمدم دیرینہ اور ایک دوسرے کے یار غار تھے۔ ڈرامہ نگار معین محفل سجانے میں یکتا تھے جلیس محفل کو رنگ پہ لاتے ہیں یگانہ دونوں کے درمیان ہمیشہ نوک جھونک خاصے کی چیز ہوتی۔ ایک مرتبہ معین مرحوم نے دعوت کی۔ ہم سب احباب بیٹھے الا دو فقرے بازوں کی گفتگو سے محظوظ ہو رہے تھے۔ کبھی معین بھرپور وار کرتے کبھی جلیس دونوں شانے چت کرتے اتنے میں بلاوا آیا کہ دستر خوان لگ گیا ہے کسی نے پوچھ لیا نہیں معلوم آج معین نے کیا کیا پکوایا ہے جلیس نے کہا "ہمیشہ کی طرح بغیر گوشت کی یا یک کھلا کر امرار کے ساتھ خلال پیش کریں گے کہ دانت صاف کر لیجئے"۔

آئندہ نسلوں کو ابراہیم جلیس سے بڑے بڑے افسانہ نگار، بڑے صحافی، زندہ دل اور شگفتہ مزاج انسان مل سکتے ہیں۔ مگر میری پشت کے لوگوں کو ہمارے جیتے جی کوئی دوسرا ابراہیم جلیس شاید ہی نصیب ہو۔

[یہ مضمون ۲۸ جون ۱۹۷۰ء کو ابراہیم جلیس کی دو کتابوں کی رسم اجراء کے موقع پر آرٹس کونسل کراچی میں پڑھا گیا]

ہمیں یاد ہے کہ ہمارے ایک دوست کو ادھورے خواب دیکھنے کی بیماری تھی۔ وہ تھوڑا سا خواب دیکھتے کہ بجلی فیل ہو جاتی اور وہ نیند سے چونک پڑتے۔ ایک دن ہم سے بولے "بھئی عجیب بات ہے کہ مجھے ادھورے خواب نظر آتے ہیں۔ آخر پورے خواب کیوں نظر نہیں آتے۔ میں خوابوں کے "ٹریلر" دیکھتے دیکھتے عاجز آ گیا ہوں"۔ ہم نے ان کے بستر کا معائنہ کیا تو دیکھا کہ تکیہ پر ایسا شعر لکھا ہوا ہے جو بحر سے خارج ہے۔ اس پر ہم نے کہا:

بھئی اس کا اصل راز یہ ہے کہ تم ایسے تکیے پر سوتے ہو جس پر بے بحر شعر لکھا ہوا ہے۔ اور اس تکیہ کی کرامت سے تمہارے خواب بھی بحر سے خارج ہو جاتے ہیں۔ اس شعر کو بدلو تو تمہارے خوابوں کی صحت بھی بہتر ہو جائے گی۔

مجتبیٰ حسین ۔ تکیہ کلام ۔ تکلف برطرف

رشید قریشی

آفتابِ مزاح ــــ مجتبیٰ حسین

"مزاحِ لطیف کے اوراق جہاں جہاں بھی روشن ہیں، ان کا مبداءِ نور آسمانِ مزاح کا وہ درخشاں آفتاب ہے۔ جس کا نام مجتبیٰ حسین ہے۔"
یہ میرے مزاحیہ مضامین کے دوسرے مجموعے "مزاحِ لطیف" کا مطلعِ منوّر ہے۔

مزاح پسند، مزاح نگار کو ایک پڑھا لکھا اور مہذب ہنسانے والا یا زیادہ سے زیادہ ایک فن کار مانتے ہیں میں نے مجتبیٰ حسین کو مزاح کے آسمان پر آفتاب کا ہم شبیہ ٹھیرایا تو میرے چند کٹّر ساتھیوں کی عینکیں پھسل کر ناک کی پھننگ پر آٹکیں۔ سرزنش کے انداز میں مجھے ٹوکا گیا۔ "بھائی بُرا نہ ماننا مبالغہ شاعروں کے لیے جائز ہے ادیبوں کے لیے نہیں۔" میں نے جواباً اُن سے شکایت کی "آپ لوگ مزاح نگار کو سُنتے ہیں پڑھتے نہیں اور مزاح نگار کو اس کا مستحقہ مقام دیتے نہیں۔" کہا گیا "مزاح کا لطف تو سُننے میں ہے پڑھنے میں تو وہ رس کشیدہ اناس کا بگڑا ہی تو ہے۔" میں نے مستحکم لہجہ میں کہا "مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری آتشبازی کا شعلۂ مستعجل نہیں۔ ایک صاحبِ جوہر کی انشا پردازی کا نقشِ لازوال ہے۔" تیوری پر بل پڑے تو ایک سوال بنا "آپ مجتبیٰ حسین کو کب سے جانتے ہیں؟" اس سوال نے میرے ذہن کو، ماضی کے راستوں اور پگڈنڈیوں پر ڈال دیا۔

... ...

میں 'سیاست' کے دفتر میں ہوں۔ میر حسن صاحب مجھ سے مخاطب ہیں "اب تم اپنے مزاح کا بوریہ بستر لپیٹو، مزاح کے اُفق پر ایک نیا ستارہ جگمگا اُٹھا ہے۔" میں نے پوچھا "کون ہے وہ" جواب ملا "مشتبہ"۔ میری حیرانی نے اُن سے وضاحت چاہی تو انھوں نے کہا "اپنا مجتبیٰ ــــ میں اُسے مشتبہ پکارتا ہوں، کیوں کہ یہ بات ابھی پایۂ تحقیق کو نہیں پہنچی ہے کہ وہ صحافی بننے والا ہے یا مزاح نگار۔"
اس غائبانہ تعارف کے بعد، میں نے ایک جلسہ میں مجتبیٰ حسین سے اس کا مضمون "تکیۂ کلام" سُنا تو میں نے اپنے

بارے میں فیصلہ کرلیا۔ آفتاب طلوع ہوچکا ہے۔ چراغ کو بجھ جانا چاہیئے۔ میں مزاحیہ مضمون مانگنے والوں سے دو ٹوک کہنے لگا "میں تارکِ المزاح ہوگیا ہوں۔ مجھ سے اب مزاحیہ مضمون مت مانگو۔ کسی نے پوچھا " پھر آپ، اب کیا کریں گے؟" میں نے جواب دیا ریڈیو کے لیے بچوں اور عورتوں کے لیے مضامین اور مکالمے لکھوں گا اور کیا کروں گا"

دوسرے ہی دن، خود مجتبیٰ حسین میرے گھر آیا "رشید بھائی! کل نظام کالج میں ایک جلسہ ہے، آپ کو بھی مضمون پڑھنا ہے۔ میں نے کہا "مجتبیٰ میں اب ایک مزاح رفتہ آدمی ہوں۔ مجھے جلسوں میں پڑھواکر میری ہنسی نہ اڑوائیے" کہنے لگا "اپنے اس انکسار کو آپ یہیں رہنے دیجئے۔ آپ کی زبان، مزاحیہ شوشوں اور سب سے بڑھ کر، آپ کے پڑھنے کے انداز کے قدر دان، اب بھی میرے سر کے بالوں سے زیادہ ہیں۔ آپ چلئے تو سہی، دیکھئے کیسی دھوم مچتی ہے۔" میں نے التجا کی "مجتبیٰ، مزاح نگار سب کچھ ہوسکتا ہے۔ ظالم نہیں ہوسکتا۔ تم بھی مزاح نگار ہی ہو، کم از کم میرے حق میں" لیکن اس کے اصرار کے آگے میرا کوئی عذر نہ چلا اور مجھے نظام کالج جانا ہی پڑا۔ وہاں میں نے مضمون سنایا تو ہر صف سے داد کا تڑاپڑا اُٹھا اور سب میں پیش پیش مجتبیٰ حسین تھا۔ اس ردِّ عمل سے میرا دل بڑھا۔ ذہن بھی روشن ہوا اور میں نے تہیہ کرلیا۔ مزاح نگاری جاری رکھوں گا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ یہ داد اہتمامی تھی اور فی البدیہہ نہ تھی لیکن اس وقت تک کافی دیر ہوچکی تھی۔ بیل دلدل کی گرفت میں کافی اندر اتر چکا تھا۔ ایک گفتگو میں، میں نے اختر حسن صاحب سے مجتبیٰ کے بارے میں کہا "حیدرآباد میں اس کا کردار ایک سپہ سالار کا تھا جو ایک بڑی مہم کے لیے، اپنے سپاہیوں کی بھرتی کررہا ہو۔ یہ بھرتی اب موقوف ہوگئی ہے لیکن پرانے سپاہیوں کی سبکدوشی ابھی عمل میں نہیں آئی ہے۔"

اختر حسن صاحب کا خیال تھا کہ "یہ کمال تو اُسے خوب آتا ہے اور حیدرآباد ہی پر کیا منحصر ہے، وہ جہاں جاتا ہے، اس کے کرشمے دکھاتا رہتا ہے۔"

... ...

اس کے بعد میں نے دیکھا مجتبیٰ حسین میرے گھر میں ناشتہ اُڑا رہا ہے "رشید بھائی! صرف آپ کی خاطر میں نے ناشتہ کی دعوت قبول کی۔ ورنہ یہ وقت تو میرے سونے کا ہے۔" دوسری چکر میں بھی میں نے اُسے ناشتہ پر بُلایا لیکن لوازمات دوپہر کے کھانے کے رکھے۔ وہ بارہ کے بعد آیا۔ اور دوپہر کے کھانے کے لوازمات دیکھ کر میری دُور اندیشی کی تعریف کرنے لگا۔ میں نے رات کے کھانے کی بات چھیڑی تو اُس نے کہا "میں رات کا کھانا گھر پر نہیں کھاتا۔" میں نے کہا "میرا خود بھی یہی عملدرآمد ہے۔ لیکن اس رات کے کھانے کا پس منظر یہ ہے کہ یہ میرے ایک ماتحت کے لڑکے کا ولیمہ ہے اور میں نے تمہارے اور تمہارے تین دوستوں کے لیے یہ چار رقعے منگوالیے ہیں۔" مجتبیٰ حسین نے رقعے رکھ لیے اور کہا "ناشتہ میں دیر تو رات کے کھانے پر بھی دیر۔" میں نے کہا "تم چاہو جتنی دیر لگاؤ، میں تمہارے انتظار میں، کھانا نہیں کھاؤں گا۔" مجتبیٰ اور اس کے دوست، رات میں گیارہ بجے آئے، اور کھانے پر ٹوٹ پڑے، دولہا کو جب معلوم ہوا کہ مجتبیٰ حسین بھی شریک دعوت ہے تو وہی میزبان خصوصی بن گیا۔

مجتبیٰ حسین، جاپان، تاشقند، لندن اور امریکہ کے سفر سے واپس آیا تو ابھی تک اس کا جہاز ملک پیٹ قدیم پر نہیں اترا۔ کیوں کہ ناشتے، دوپہر کے کھانے یا ڈنر کے کسی دسترخوان میں اُسے اپنی طرف کھینچنے کی سکت نہیں بشکل شاید یہ آن پڑی ہے کہ بلندی پکارتی ہے۔ اوپر آؤ اور ناشتہ، دوپہر کا کھانا اور ڈنر۔ جواب دیتے ہیں کہ یہ اُڑان

ہمارے بس کی نہیں۔ اب کوئی سیڑھی بیچ میں آئے تو یہ مشکل آسان ہو۔

مجتبیٰ اور اس کی پارٹی (بشمول راقم الحروف) مینار ایکسپریس میں، بمبئی کی طرف رواں دواں ہے۔ خواجہ عبدالغفور نے بڑے اصرار سے بمبئی بلایا تھا۔ مزاح نگاروں کا ایسا قدردان اُٹھ گیا ہے کہ اب کوئی ان کا پرسانِ حال نہیں رہا۔ میں اپنی حد تک یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ خواجہ عبدالغفور اگر اپنی موجودہ قیام گاہ سے بھی میرے نام بلاوا بھیجیں اور آمدورفت کا انتظام کردیں تو میں بخوشی چلا جاؤں اور واپس آؤں، تو مینار ایکسپریس ہمیں بمبئی لے بھاگ رہی ہے۔ وقار آباد کے قریب، ہم کپڑے بدل کر، اپنے اپنے بستروں پر جم گئے۔ اتنے میں، ٹکٹ چیکر نازل ہوا۔ میں نے پکارا "کیوں بھائی مجتبیٰ تم تو کہہ رہے تھے نا کہ ٹکٹ لینے کی ضرورت نہیں۔ لو، اب ان سے نمٹو" میں نے اپنا ٹکٹ نکالا اور ٹکٹ چیکر کی طرف بڑھنے ہی کو تھا کہ رُک گیا۔ ٹکٹ چیکر اس خضوع و خشوع سے، مجتبیٰ کے سامنے دست بستہ گوش بر آواز کھڑا تھا جیسے کسی مرشد کے سامنے، خوش عقیدہ مُرید کھڑا ہو۔ میں نے پوچھا "کیوں بھائی، یہ اس دفعہ بلا ٹکٹ چھوڑنے کے لیے رضامند نہیں ہیں کیا؟" مجتبیٰ ہنس پڑا "جی نہیں، یہ بات نہیں۔ یہ بھی ہمارے پرستار نکلے۔ آپ آرام کیجئے۔ میں ان سے کچھ باتیں کروں!" بستر پر لیٹتے ہوئے میں نے سوچا "کس غضب کی مقبولیت ہے اس ظالم کی، کہ جس ٹکٹ چیکر کو دیکھ کر جانِ عزیز آمادۂ سفر ہو جاتی ہے۔ وہ بھی کم بخت اس کا چاہنے والا نکلتا ہے" اگلے اسٹیشن پر گاڑی رُکی تو ٹکٹ چیکر نیچے اُترا۔ اور چائے کی دو پیالیاں لیتا آیا۔ بڑی خوشامد سے اس نے مجتبیٰ کو اور مجھے چائے پلائی۔ اور ٹکٹ کا کوئی تذکرہ ہی نہ ہوا۔ جیسے ہم بہت اہم مسافر ہیں اور ہمیں ٹکٹ چیکروں سے چائے اور دوسری سہولتوں سے استفادہ کا حق حاصل ہے۔

بمبئی پہنچ کر دوسرے دن ہم نے کرشن چندر اور سلمیٰ باجی سے ملاقات کا پروگرام بنایا، رمضان کا مہینہ تھا، اس لیے میں تو روزہ دار رہا۔ مجتبیٰ، البتہ سلمیٰ باجی کے ساتھ ناشتہ کرنا چاہتا تھا۔ کرشن چندر جی کا گھر مجتبیٰ کا جانا پہچانا تھا۔ لیکن اس صبح نہ جانے کیا بات ہوگئی کہ مجتبیٰ گھر کی اسٹریٹ میں تو پہنچ گیا لیکن گھر کی شناخت نہ کرسکا۔ ایک نوجوان پری پارسی لڑکی سفید براق فراک پہنے، سنہرے بالوں کو ہوا کے جھونکوں سے سنبھالتی اپنے گھر کے سامنے کھڑی نظر آئی۔ مجتبیٰ اس لڑکی کی طرف اس طرح بڑھا جیسے اس کو اُسی کی تلاش تھی۔ کچھ تو روزہ کے احترام میں اور کچھ، مجتبیٰ کو ایک لڑکی سے انگریزی میں گفتگو کا موقع دینے کی خاطر، میں اپنی جگہ ٹھیرا رہا۔ اس لڑکی نے، سامنے کے گھر کی طرف ایسا تیز اشارہ کیا، جیسے کوئی ہنس کماری، کنول تال میں، کسی چنچل مچھلی کو سزا دے گئی۔ مجتبیٰ لڑکی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میری طرف آیا۔ "رشید بھائی! لڑکی شریف نکلی، ورنہ، میری انگریزی نہ جانے کیا ہنگامہ کھڑا کردیتی۔ اور لُطف دیکھئے کرشن جی کا، گھر سامنے ہے اور ہم اس کا پتہ پوچھتے پھر رہے ہیں۔ وہی بات ہوئی کہ، تیری گلی کا رستہ پوچھا تیری گلی میں"

کرشن جی کے گھر پہنچے تو سامنے کے نل پر ان کا ملازم نہاتا نظر آیا۔ مجتبیٰ نے پُوچھا کیوں بھئی! کرشن جی گھر میں ہیں؟" ملازم نے نہانا جاری رکھتے ہوئے کہا "اب اُن اوٹل میں کام کریلا" بات ہم دونوں کی سمجھ میں نہیں آئی تو مجتبیٰ نے دوسرا سوال کیا "مسز اندر ہیلا؟" ملازم نے اثبات میں گردن ہلادی، اور ہم سیڑھیاں طے کرتے ہوئے سلمیٰ باجی کے حصّۂ مکان میں داخل ہوگئے۔ سلمیٰ باجی کسی پکوان کی تیاری میں تھیں، ہمیں دیکھا تو سب چھوڑ چھاڑ کر بیٹھک میں آگئیں۔ مجتبیٰ نے گفتگو چھیڑی "سلمیٰ باجی! بڑی پریشانی ہوگئی، میں آپ کا گھر ہی بھول گیا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ سامنے کے گھر کی ایک لڑکی باہر آئی اور اُس نے آپ کے گھر کا پتہ بتادیا۔"

سلمیٰ باجی، مسکرانے لگیں۔ "کرشن جی بھی، کبھی کبھی، اپنے گھر کا پتہ اسی لڑکی سے پوچھ لیتے ہیں۔" مجتبیٰ نے ایک زوردار قہقہہ بلند کیا۔ اسی طرح جیسے حالات کا رُخ بدلنے کے لیے کوئی دہشت پسند بم پھینکتا ہے۔ میں نے پوچھا "سلمیٰ باجی۔ آپ کا ملازم کہہ رہا تھا، کرشن جی اب ہوٹل میں کام کرتے ہیں۔ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔" سلمیٰ باجی نے کہا "اچھا کیا آپ نے یاد دلایا "کرشن جی کہہ گئے تھے، مجتبیٰ آجائے تو انہیں اطلاع دی جائے۔" سلمیٰ باجی نے ٹیلی فون پر کرشن جی کو ہمارے آنے کی اطلاع دے دی اور مجھ سے مخاطب ہوئیں "وہ جو ہمارا ملازم ہے۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا، کرشن جی ایک نئی فلم پر کام کر رہے ہیں اور یکسوئی اور سکون کے لیے ہوٹل کا ایک کمرہ انھوں نے اپنے لیے ریزرو کروالیا ہے۔" دس منٹ کے اندر ہی کرشن چندر آگئے۔ مُسکراتا خیر مقدم! نعرہ زن استقبال۔ مجتبیٰ کا نہیں۔ اس کے ہنر کے آفتاب کا جو اس کے اندر روشن تھا۔

ناشتہ چنا گیا تو کرشن چندر نے میری طرف دیکھا، مجتبیٰ نے کہا "رشید بھائی روزہ دار ہیں۔"

کرشن چندر نے کہا "بھائی قریشی خود روزہ رکھ لینا آسان ہے۔ اس مجتبیٰ کو روزہ رکھواؤ تو جانوں۔"

مجتبیٰ نے شوخ لہجہ میں جواب دیا "کرشن جی، اگر میں نے روزہ رکھا تو پھر سونے والوں کو سحری کے لیے کون اٹھائے گا؟"

میں مجتبیٰ کو دہلی میں آندھرا پردیش بھون میں دیکھ رہا ہوں۔

منتظم، بٹلر، مہمان سب ہی مسکراتے ہوئے اس کا خیر مقدم کرتے نظر آئے۔ ناشتہ کی میز پر تو میں نے اُسے احکامات صادر کرتے ہوئے بھی دیکھا۔ ایک بٹلر سے میں نے پوچھا "کیوں بھائی، یہ صاحب کیا کمشنر ہیں یہاں کے؟" کہنے لگا "کمشنر تو نہیں ہیں، مجتبیٰ حسین ہیں اور کمشنر صاحب بھی ان کی بات سنتے ہیں۔" دِلّی کے ادبی، سماجی، سیاسی تفریحی کسی نوعیت کے بھی اجتماع کے لیے، مجتبیٰ حسین کی خدمات ناگزیر ہوتی ہیں۔ یہی اس کی ہمدردانہ اور کارفرمایانہ روش اس کو ہر دل کا دلنشین بناتی ہے اور میں تو سمجھتا ہوں اس کی شریفانہ دلداری ہی اس کی تحریروں کو پر لگا کر اس طرح اڑاتی ہے کہ وہ دلوں میں گھوم کر، فضاؤں میں دور دور تک پھیل جاتی ہیں۔

--- --- --- --- --- --- ---

مجتبیٰ حسین کی ایک کتاب کی رسم اجراء کی تقریب میں، میں حاضرین سے مخاطب ہوں۔

مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کا سب سے زیادہ فائدہ خود مزاح کو پہنچا ہے کہ، اس کی تحریروں نے اس کو ایک 'صنف ادب' کا درجہ دلا دیا ہے۔

اس کا مضمون پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ایک بلند پہاڑ کی چوٹی سے ہنستے کھلکھلاتے پھولوں کا آبشار گر رہا ہے۔

اس کے قلم نے معمولی سے مضمون کو بھی چھوا تو وہ غیر معمولی ہوگیا۔

اس نے کسی کا خاکہ لکھا تو اُسے اپنے آپ سے محبت یا ...... ہوگئی۔ کیونکہ مزاح نگار کا قلم نشتر بستہ ہوتا ہے جو زخم بھی ڈالتا ہے اور راحت بھی پہنچاتا ہے۔

مجتبیٰ حسین، ایک فطری مزاح نگار ہے اور اسے وجدان کے ایسے خزانے سونپے گئے ہیں جو جتنے خرچ ہوتے ہیں، اتنے ہی زیادہ ہوتے ہیں۔

اس کی کتابیں لوگ خرید خرید کر پڑھتے ہیں۔

وہ اپنے مزاح میں ناصحانہ انداز نہیں اختیار کرتا۔ البتہ طنز کے تیر ضرور جوڑتا ہے اور ادب کی گلکاریاں بھی کرتا ہے۔

اب اس کے مزاح میں فلسفیانہ سنجیدگی آتی جارہی ہے اور یہ رجحان عمر کے زیر اثر ہے۔
میری اپیل ہے مجتبیٰ حسین کو بڑھا ہونے سے روکا جائے کیوں کہ اس کا بڑھاپا مزاح کو مُردہ کردے گا۔
میں ماضی پرست نہیں ہوں۔ ماضی کے کھنڈر میرا مسکن نہیں۔ میں حال کا پرستار اور مستقبل کا امیدوار ہوں ـــــ میں ماضی کے دھندلکوں سے حال کے اُجالوں میں آگیا ہوں۔

--- --- --- --- --- ---

میں مجتبیٰ حسین کا خط پڑھ رہا ہوں۔
'مزاح لطیف'، کا شکریہ لیکن طباعت نے خوش نہیں کیا۔ اس جانب بھی آپ نے توجہ کی ہوتی "قصہ مقدمہ لکھنے والوں کا" بہت دلچسپ ہے۔ میں نے ہاشم علی اختر صاحب سے اس قصہ کی تصدیق چاہی ـــــ الحمدللہ انھوں نے تصدیق کردی۔ قصہ کی زیبائش کا جو اہتمام آپ نے کیا ہے ماشاءاللہ اس کی تصدیق میں کرتا ہوں۔
'اعتراف' آپ نے مجھے شرمندہ کرنے کے لیے لکھا ہے تو میں واقعی شرمندہ ہورہا ہوں' یہ یقیناً آپ کی ذرہ نوازی ہے اور اس کا سلسلہ چونکہ ایک عرصہ دراز سے جاری ہے۔ اس لیے میری شرمندگی میں شکر گزاری بھی شامل ہورہی ہے اور مجھے خوشی ہے کہ آپ مجھے اس قابل سمجھتے ہیں۔

--- --- --- --- --- --- ---

مجتبیٰ حسین ـــــ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ میں نے تمھیں آفتابِ مزاح کہا ہے تو کون سا مبالغہ کیا ہے۔ آسمانِ مزاح پر درخشاں رہو، اور اپنی روشنی میں مسکراہٹوں کے پھول کھلاتے رہو، دل کے اندھیروں کو دور کرتے رہو۔ دُنیا میں جہاں جہاں بھی اندھیرے ہوں۔ کیونکہ اب تم آفتاب کی طرح عالمگیر ہوگئے ہو۔ ۸۸

وجاہت علی سندیلوی

ہم طرفدار ہیں غالبؔ کے سخن فہم نہیں

آزادی کے بعد ہمارے علم میں جنوبی ہند کے جن باشعور لوگوں نے شمالی ہند کی طرف رُخ کیا اُن میں زیادہ تر تو صدرِ جمہوریہ ہند بنا دیے گئے ہیں جیسے رادھا کرشنن، ڈاکٹر ذاکر حسین (ایک غیر مصدقہ خبر کے تحت اُن کا ابتدائی آبائی وطن جنوب ہی میں تھا) وی۔ وی گیری، سنجیوا ریڈی اور اب وینکٹ رامن ایئر اور باقی از خود مزاح نگار بن بیٹھے جیسے مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، خواجہ عبدالغفور مرحوم، پرویز یداللہ مہدی اور ماشاء اللہ بہت سے اور۔ ان دونوں ہی قسموں کے لوگ ہنسنے ہنسانے کے وافر موقعے فراہم کرتے ہیں اور قومی یک جہتی کے نام پر ہم شمالی ہند والے انہیں ہنسی خوشی برداشت کر رہے ہیں۔ البتہ ابھی ان میں سے کسی کو پردھان منتری نہیں بنایا گیا ہے کیونکہ اس کے لئے ہمارے اُتر پردیش کے جملہ حقوق محفوظ ہیں اور اس جلیل القدر عہدے پر فائض ہونے کے لئے بڑی خاندانی منصوبہ بندی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ پرانے زمانے میں شمالی ہند سے جو صاحبِ سیف گئے تھے وہ تو جنوبی ہند کا کچھ بگاڑ نہیں پائے البتہ اب اُدھر سے جو صاحبِ قلمدان اور صاحبِ قلم حضرات اِدھر آ رہے ہیں۔ انہوں نے ہم کو ضرور تسخیر کر لیا ہے۔

شمالی ہند اور جنوبی ہند والی بات تو محض ایک جملہ معترضہ ہے۔ پورا ہندستان ہمارا دیس ہے اور جس طرح ہم اپنے گھر میں محض سمتوں سے کوئی تخصیص نہیں کر سکتے۔ اسی طرح اپنے ملک میں بھی نہیں۔ لیکن اس حُسن اتفاق سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ جس طرح ہمارے اُتر پردیش کو پردھان منتری، اسی طرح آندھرا پردیش کو مزاح نگار پیدا کرنے میں ایک خاص مہارت حاصل ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ جن لوگوں کو آئندہ پردھان منتری بننے کی تمنا ہو وہ ایک مرتبہ الہ آباد کے سنگم پر اشنان کر کے امرود ضرور کھا جائیں۔ اسی طرح جو تازہ واردانِ بساطِ ادب مزاح نگار بننے پر تلے ہوئے ہیں وہ حیدرآباد کے بجرد گاہ میں حاضر ہو کر (کہ یہی چار درویشوں کا نہیں بلکہ چہاردہ درویشوں کا تکیہ ہے) چارمینار سگریٹ کے دو چار کش ضرور لگا آئیں۔

ایک مدت ہوئی (غالباً ۴۰ء اور ۴۵ء کے درمیان) جب ابراہیم جلیس مرحوم کے کچھ افسانے ماہنامہ ساقی دہلی میں شائع ہوئے تھے۔ اُسی زمانے میں میرے بھی کچھ مضامین اسی ماہنامے میں نکلے تھے۔ اسی توسل سے میرے اور اُن کے درمیان کچھ خط و کتابت بھی ہوئی تھی اور ابراہیم جلیس نے کسی رسالے کیلئے مجھ سے فرمائش کر کے ایک خاکہ

بھی لکھوایا تھا۔ میں ان کا بڑا مداح اور قدرداں تھا۔ میں نے اُن کے جیسے ذہین، نکتہ رس اور مّراک، صحافی، انشاپرداز، افسانہ نگار، اور چلبلا کر طنز لکھنے والے جس کی کاٹ بے پناہ ہوتی، کم دیکھے ہیں۔ وہ صحیح معنوں میں قلم کے سپاہی تھے۔ ظلم، مکاری اور ناانصافی کے خلاف وہ عموماً قلم سے تلوار کا کام لیا کرتے۔ وہ مجاہدانہ انداز سے لکھتے۔ مظلوموں اور پیچھے رہ جانے والوں کے لئے اُن کے دل میں بے انتہا دردمندی تھی۔ انہوں نے اپنے قلم کو کمائی کا ذریعہ نہیں بلکہ لڑائی کا ہتھیار بنا لیا تھا۔ حیف صد حیف زمانے نے انہیں پہچانا نہیں۔ اُن کے خلوص کی گہرائی اور فن کی پختگی کو سمجھا نہیں، اور اُن کی وہ قدر و منزلت نہیں ہوئی جس کے کہ وہ ہر حیثیت سے مستحق تھے۔ بہرکیف میرے جیسے ان کے نیازمندوں کے یہی سوچ کر کچھ آنسو پنچھ جاتے ہیں کہ ہندستان اور پاکستان دونوں ہی ملکوں کی کوئی ادبی تاریخ ابراہیم جلیس کا نام جلی حرفوں سے لکھے بغیر مکمل نہیں سمجھی جا سکتی ہے

زندگی میں پتھروں کی بوچھاڑیں اس پر رہیں
آج عزت سے مگر لیتے ہیں دیوانے کا نام

میں نے ابراہیم جلیس کا نام یوں ہی نہیں لے لیا۔ میں نے مجتبیٰ حسین کا جب پہلا مضمون پڑھا تو مجھے بہت پسند آیا اور میں نے سوچا کہ مزاحیہ ادب کے اُفق پر ایک نیا روشن ستارہ نمودار ہوا ہے لیکن جب مجھے پتہ چلا کہ یہ ابراہیم جلیس کے چھوٹے بھائی کا لکھا ہوا ہے تو میں نے اُسے دوبارہ پڑھا اور مجھے اس سے ایک نیا لطف و انبساط حاصل ہوا۔ مجتبیٰ حسین کوئی حادثہ نہیں بلکہ علامات کا ایک تسلسل ہے۔ اس کے پس پشت تابندہ ادبی روایات اور نظریاتی اقدار بھی ہیں۔ وہ ایک گلِ سرسبد ہے جس نے اپنا جداگانہ رنگ و بو رکھتے ہوئے بھی، اپنے چمن سے اپنا رشتہ نہیں توڑا ہے۔ یہ ایک صحتمند علامت اور مجتبیٰ حسین کی راست بینی کی دلیل ہے۔

مجتبیٰ حسین کو میں پسند کرتا ہوں، اسے چاہتا ہوں اُس کی عزت کرتا ہوں۔ اگر وہ محبوب حسین جگر کا چھوٹا بھائی ہے تو میرا بھی محبوب ہے۔ مجھے اُس سے اگر کوئی شکایت ہے تو بس یہی کہ اپنی پوری زندگی میں، اس سے میں چند ہی بار مل پایا ہوں۔ یعنی صرف آٹھ دس مرتبہ لکھنؤ، بھوپال، دہلی، پٹنہ، بمبئی میں مزاحیہ کانفرنسوں اور سیمیناروں کے سلسلے میں اور ہر مرتبہ مجھے یہی شکوہ رہا ؏

سیرِ گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

مجتبیٰ حسین میں حیدرآبادی تہذیب، شائستگی اور علم مجلس کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ ان کی گفتگو کی شگفتگی اور دلآویزی اُن کی تحریر سے کسی صورت کم نہیں۔ مجتبیٰ حسین کے خطوط بھی بڑے پرخلوص اور دلچسپ ہوتے ہیں۔

اُسے حُسنِ اتفاق ہی سمجھئے کہ مجتبیٰ حسین جب بھی ملے کسی ریاست کے صدر مقام پر اور جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے۔ ہر مرتبہ اُن سے صدر مقام پر ملاقات کے کچھ دنوں بعد اُس ریاست کا قلمدان وزارت یک بیک پلٹ گیا۔ اس میں اگر کی ابن بطوطہ قسم کی طویل غیر ملکی سیاحتوں کا نمک مرچ چھڑک دیجئے تو جی بنائی چیزوں کے بگاڑنے (DE-STABILISATION) کے الزام میں مجتبیٰ حسین کے خلاف بوفورس جیسا ہنگامہ خیز نہ سہی کوئی چھوٹا موٹا کمیشن تو بٹھایا ہی جا سکتا ہے اور اگر اس کے اراکین سیاسی کلاکار کے بجائے صرف مزاح نگار ہوں تو اس سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ بھی برآمد ہو سکتا ہے۔

شکر ہے کہ نہ میں ناقد ہوں نہ پیشہ ور تبصرہ نگار۔ میری حیثیت صرف ایک عام قاری کی ہے۔ مجتبیٰ حسین کے فکروفن کا تنقید اور تجزیہ کرنے والے بہت سے دوسرے لوگ ہوں گے۔ مجھے مجتبیٰ حسین کی نگارشات میں جو بات سب سے زیادہ دلکش محسوس ہوتی ہے وہ اُن کا سیدھی بات کا سیدھے انداز میں کچھ اس طور سے کہنا کہ اس سے خودبخود مزاح اور خوش طبعی پیدا ہوجائے۔ اُن کے یہاں آمد ہی آمد ہے اور آورد کا کہیں دور تک پتہ نہیں۔ وہ الفاظ کے پھندوں میں مزاح کو پھانسنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ اپنے دلچسپ خیالوں اور اچھوتے جملوں سے ایک پرلطف اور مزاحیہ فضاء پیدا کردیتے ہیں اور اس طرح بہت معمولی باتوں کو بھی غیر معمولی بنادیتے ہیں۔ ؏

بے جان بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں

جہاں تک مجتبیٰ حسین کے مزاحیہ خاکوں اور انشائیوں کا تعلق ہے وہ اُسی وقت قلم اٹھاتے ہیں جب انھیں واقعی کچھ کہنا ہوتا ہے۔ ان کی تحریر سے اکتاہٹ کبھی نہیں ہوتی۔ ابتدائی شگفتگی اور خوش دلی آخر تک قائم رہتی ہے۔ ان کے موضوعات میں تنوع اور بوقلمونی ہے اور ان کو پڑھ کر مسکرانے کے بعد اکثر غور وفکر بھی کرنا پڑتا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے بعض مزاحیہ خاکوں میں درد کی ایک ہلکی سی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہاں اُن کا فن اپنے نقطۂ کمال پر ہوتا ہے۔ قاری کی سمجھ میں نہیں آتا کہ جو باتیں کہی گئی ہیں اُن پر وہ ہنسے یا جو نہیں کہی گئی ہیں لیکن بین السطور یا پس منظر میں صاف دکھائی دے رہی ہیں اُن پر روئے۔

غالباً کسی شخص میں کوئی مخصوص برائی نہ ہونا اس کی کوئی مثبت اچھائی نہیں شمار کی جاتی۔ مثلاً اگر میں کہوں کہ میں سگریٹ نہیں پیتا۔ شام کو زیادہ نہیں گھومتا۔ مانگ کر اخبار نہیں پڑھتا۔ تھانیدار سے نہیں (صرف بیوی سے) ڈرتا ہوں۔ تو میری یہ منفی خصوصیات لائق اعتنا نہیں سمجھی جائیں گی۔ لیکن اگر کوئی برائی کسی متعدی بیماری کی طرح قریب قریب میرے ہم پیشہ سب ہی ایڈوکیٹوں کو ہوجائے، جیسے موکل سے فیس وصول کرنے کے بعد عدالت جانے کے بجائے میٹنی شو دیکھنے چلا جانا، اور میں اس سے بچا رہا ہوں تو یقیناً اس کو میری مثبت تعریف میں شامل کیا جانا چاہیئے۔ اسی اصول کے تحت مجتبیٰ حسین میں بعض مروجہ کمزوریاں نہ ہونا اُن کی منہ زوریوں میں شامل کی جانی چاہییں مثلاً وہ اپنے آپ کو بہت شاذ ونادر ہی دہراتے ہیں، وہ گفتگوں میں زیادہ گرد ڈالنے کے ایک سرے سے قائل ہی نہیں۔ لہٰذا اُن کے یہاں ابتذال اور مسخرے پن کا کہیں نام ونشان تک نہیں اور لاکھ بات کی ایک بات، اُن کے یہاں کیمیو ٹریٹ کہیں تلاش کرنے سے بھی نہیں ملتی۔

آپ پوچھیں گے مزاح نگاری میں یہ کیمیوٹریٹ کیا ہوتی ہے؟ میں ایجاد بندہ قسم کے اس لفظ کے صرف معنی بتاکر اس سلسلے میں خاموش ہوجاؤں گا۔ تھوڑے کا بہت آپ خود سمجھ لیں گے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں ایسا مزاح کار یا مسخرا بن جانا جو مزاح کو بجائے چٹنی بطور کھانا استعمال کرے۔ جو بغیر کوئی 'مسخری' کئے نوالہ ہی نہ توڑے اور جو دنیا کے ہر موضوع کو ظرافت کا ہدف سمجھے اور اُس کی زبان یا قلم سے جو بھی نکل جائے اُسے وہ طنز ومزاح جانے۔

مجتبیٰ حسین اپنے سفرناموں اور خاکوں میں بھی اپنے مزاح پاروں ہی کی طرح بڑی شانِ دلربائی سے جلوہ گر ہیں۔ ؏

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

ان کے خاکے شوکت تھانوی مرحوم کے شیشش محل کی یاد دلاتے ہیں اور ایک طرح سے ان پر اضافہ نہیں ۔۔ خاکوں میں

بعض بڑے بے پناہ جملے اور اشارے ملتے ہیں۔ رمز و کنایہ انہیں اکثر پُراسرار بھی بنا دیتا ہے۔ بسا اوقات چند لفظوں کا چھوٹا سا جملہ اس قدر بلیغ ہوتا ہے اور اشاروں ہی اشاروں میں اس قدر مطلب ادا کر دیتا ہے کہ اُس کو بیان کرنے کے لئے صفحے کے صفحے بے ضرورت معلوم ہوتے ہیں۔ آج کل وہ بہت خاکے لکھ رہے ہیں۔ انہیں اس سلسلے میں غالب کے قصیدوں کا حشر پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ اُن بیچارے کا ہر ممدوح یا مرحوم ہوجاتا یا معزول اور کچھ نہیں تو مفرور ! ..

مجتبیٰ حسین سجاد ظہیر کے بارے میں لکھتے ہیں۔

" مونا لیزا کی شہرۂ آفاق مسکراہٹ کے بعد اگر کسی مسکراہٹ نے مجھے مسحور کیا تو یہ بنّے بھائی کی مسکراہٹ تھی۔ ان دونوں مسکراہٹوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ لیونارڈو ڈاونسی نے مونالیزا کی مسکراہٹ کو کینوس پر قید کر لیا تھا جب کہ بنّے بھائی کی مسکراہٹ پھیل کر ایک عقیدہ، ایک نظریہ اور ایک تحریک بن گئی اور پھر یہ مسکراہٹ ہمارے ادب، ہمارے ذہن، ہمارے احساس اور ہماری فکر کا ایک اٹوٹ حصہ بن گئی۔ مجھے تو بعض اوقات پوری ترقی پسند تحریک کے پیچھے بنّے بھائی کی مسکراہٹ کی کارفرمائی جلوہ گر دکھائی دیتی ہے۔ "

———— (ادبی نامہ)

اختر حسن
(حیدرآباد)

کچھ مجتبیٰ حسین کے بارے میں

صبح کے سورج نے ابھی پہلی انگڑائی بھی نہیں لی تھی کہ وہ آدھمکے۔

"مضمون کب ملے گا؟" پہلا دھماکہ۔ دل دہل گیا۔ ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے میں نے کہا۔

"پرسوں شام کو مل جائے گا۔" فرمایا "تو پرسوں شام کو خبر لینے آؤں گا۔" دوسرا دھماکہ۔

اور پھر پلک جھپکتے میں اپنا منہ پیٹھ کی طرف پھیر کر یہ جا وہ جا۔

میں دم بخود، وہ فرار اور اب پرسوں شام کو میری خبر لینے آئیں گے۔ خدا خیر کرے۔ جل تو جلال تو، آنے والی بلا کو ٹال تو۔۔۔

آخر وہ بلا ہے کیا۔۔۔ کچھ اُس کا اَتا پتا۔۔۔؟

ارے وہی ہمارے آشفتہ حال۔۔۔ مصطفیٰ کمال۔۔۔ اَتا اُن کا انوارالعلوم کالج اور پتا مجرد گاہ نمبر (۳۱) کالج میں اُردو پڑھاتے ہیں اور مجرد گاہ سے "شگوفہ" نکالتے ہیں۔ بیس برس سے اسی کاروبار میں مبتلا ہیں۔ اور ان دنوں "شگوفہ" کا ایک خاص الخاص شمارہ مرتب کرنے کی دُھن میں آتش زیر پا ہیں۔

مجتبیٰ کی پچیس سالہ ادبی زندگی کا جشن بھی تو منایا جانے والا ہے۔

خوب خوب۔۔۔ پھر تو۔۔۔ بارے ہوجائے مجتبیٰ کا بیاں!

ہاں میاں۔۔۔ سُنو! مجتبیٰ بڑے تاریخی آدمی ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں جس وقت لکھنؤ میں پریم چند انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کا خطبۂ صدارت پڑھ رہے تھے، گلبرگہ میں مجتبیٰ حسین پیدا ہو رہے تھے۔

ہوئے نا تاریخی آدمی۔۔۔ اور جس سمے گلبرگہ کو ریاست حیدرآباد سے کاٹ کر کرناٹک میں جوڑا جارہا تھا، مجتبیٰ حسین اپنی ڈگریوں میں بی۔اے کی آخری ڈگری جوڑ رہے تھے پھر جب دو برس بعد پبلک ایڈمنسٹریشن کا ڈپلوما بھی ان کے ہاتھ آگیا تو وہ اپنے برادر بزرگ محبوب حسین جگر کے ہتھے چڑھ گئے۔۔۔ اس لیے تو کہا گیا ہے کہ.....

برادرِ خورد مباش۔ لیکن عصری تاریخ کا شاید یہ پہلا واقعہ ہے کہ برادر بزرگ نے برادرِ خورد کے ساتھ مشفقانہ سلوک

'مجتبیانہ' سلوک روا رکھا۔ اجمال اس تفصیل کی ملاحظہ ہو پہلے تو مجتبیٰ کو انھوں نے راہِ طباعت کا مسالک بنایا پھر مسلکِ صحافت وسیاست کے رموز ونکات کو سمجھایا اور بالآخر "شیشہ وتیشہ" کے دمِ شمشیر پہ چلنے کی ہدایت فرماکر منزل سلوک پر پہنچایا ــــ روز روز مزاحیہ کالم لکھنے کی مشقت و ریاضت، اکارت نہیں گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے عرصۂ حیات کا وہ پیادہ مسافر اشہبِ قلم کا شہسوار بن گیا۔

یوں تو اُردو کا یہ نوخیز قلم کار پہلے بھی چھپ چھپ کر موت کی کہانیاں لکھا کرتا تھا لیکن اب وہ زندگی کے افسانے لکھنے لگا تاہم، حیات واجل کے حریرِ دو رنگ سے اس کا ذہنی رشتہ کبھی بھی منقطع نہیں ہوا۔ اُس کی ظرافت کے رگ وپے میں اِسی صداقت کا لہو دوڑتا نظر آتا ہے ــــ دلِ محیطِ گریہ لب آشنائے خندہ۔ یہی امتزاج تو فرد کو ایک مکمل فرد اور ذات کو ایک منفرد ذات بناتا ہے ــــ مجتبیٰ کی نگارشات میں جو انفرادیت پائی جاتی ہے وہ اُن کے اسی باشعور ذہن کی دین ہے۔ دلِ پُرخوں کی گلابی سے ــــ وہ طنز ومزاح کی شفق رنگ پچکاریاں چھوڑتے ہیں اور زندگی کی نقاب پوش حقیقتوں کے چہرے سے بڑی چابکدستی کے ساتھ نقاب اُٹھاتے ہیں۔

ان کی تخلیقات کو غور سے پڑھیئے تو ان کے فن کی یہ سچائی برملا ہوجائے گی کہ

'ہے عکسِ مئے سے شیشہ گلابی'

خود اُنھوں نے کہا ہے کہ مزاح نگار کبھی خود غرض نہیں ہوسکتا۔ بیشک مزاح نگار ہو یا ادب کے کسی اور شعبے کا راہرو ــــ بے غرض ہوتا ہے بہ شرط یہ کہ اس کے دل میں انسانی دردمندی کی کیمیا' پائی جاتی ہے۔

مجتبیٰ کا فن اُن کے دِل کے اِسی سوز وساز کا آئینہ دار ہے۔ اور انسان دوستی کی اِس کیمیا سے وہ سنگریزوں کو بھی سونا بنانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔

مجتبیٰ کا پہلا مضمون "ہم طرفدار ہیں غالب کے سخن فہم نہیں" سلیمان اریب کے پرچے "صبا" میں چھپا تو ــــ "انگلیاں اُٹھنے لگیں دوُر سے وہ آپہنچا" ــــ مجتبیٰ، اس مضمون کے ساتھ ہی حیدرآباد کے اہلِ قلم کی صفِ اوّل میں پہنچ گئے ایک صاحب طرز قلم کار کی حیثیت سے ادب کے اُفق پر طلوع ہونے اور منظرعام پہ آنے سے پہلے ہی اُن کی زندگی میں ایسا واقعہ بھی وقوع پذیر ہوچکا تھا جس نے ان کے ادبی مستقبل کی راہوں کو ہموار بنادیا تھا۔ زندہ دلان حیدرآباد کے پرچم تلے ۱۹۶۶ء میں اُردو کے مزاح نگاروں کی ایک کل ہند کانفرنس حیدرآباد میں منعقد ہوئی تھی۔ مُلک کے گوشے گوشے سے اُردو کے جانے پہچانے مزاح نگار اس کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے تھے اور کرشن چندر جیسے دھانسو ادیب نے، اس تاریخ ساز اجتماع کی صدارت فرمائی تھی۔ مجتبیٰ اِس ادبی میلے کے رُوحِ رواں تھے۔ تین دن تک یہ ہنگامہ برپا رہا۔ مجتبیٰ نے اس کانفرنس کا ایک دلچسپ و دلآویز رپورتاژ لکھا ــــ "ایک پلیٹ تخلص بھوپالی" نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ تخلص بھوپالی تو بھوپال واپس چلے گئے لیکن حیدرآباد میں مجتبیٰ حسین کا 'تشخص' مستند و معتبر بن گیا اور پھر جب دوچار سال تک ہر سال ایسی ہی مزاحیہ کانفرنسیں ہوتی رہیں تو مزاح نگاروں کی ایک 'نئی اُمت' پیدا ہوگئی ـ جس کی 'تہمت' کا سہرا مجتبیٰ اور صرف مجتبیٰ کے سر ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ اپنی اُمت کی یہ بڑھتی ہوئی آبادی خود ان کے لیے وبالِ جان بن گئی اور ایک روز چپکے سے قبلہ مجتبیٰ حسین طنز ومزاح کی تبلیغ کے لیے اپنے نوشتے مسیحِ مجسم کو سونپ کر حیدرآباد سے دہلی ہجرت کرگئے۔ یہ ہجرت ان کے حق میں تو موجب نصرت وسعادت ثابت ہوئی لیکن (خارجاً مسموع ہوا ہے کہ) حیدرآباد

کے نومولود مزاح نگاروں کے لیے موجب ندامت و خجالت بن گئی۔

دہلی کی آب و ہوا مجتبیٰ کو بھی راس آئی اور اُن کے فن کو بھی۔ دہلی ہی نے اُنھیں جاپان بھیجا۔ روس بھیجا۔ فرانس بھیجا۔ کثرت نظارہ سے اُن کی چشم تماشا میں وسعت اور ان کے ذہن رسا میں آفاقیت پیدا ہوئی۔ فکر و نظر کے نئے نئے افق اُبھرے اور رہوارِ قلم کو تگ و تاز کے لیے نئے نئے میدان میسّر آئے۔

جاپان سے لوٹنے کے بعد مجتبیٰ نے جاپان کا سفرنامہ لکھا "جاپان چلو، جاپان چلو" میری رائے میں یہ کتاب مجتبیٰ کی شاہکار تصنیف ہے۔

ابنِ انشاء نے بھی کچھ اس قسم کا ایک سفرنامہ لکھا تھا "چلتے ہو تو چین کو چلیے"۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ ابنِ انشاء کا سفرنامہ پڑھ کر چین ـــ چیں بہ جبیں نظر آنے لگتا ہے اور مجتبیٰ کے سفرنامے کا مطالعہ پڑھنے والے کو، جاپان کا خوشہ چیں بنا دیتا ہے۔ یہ دونوں سفرنامے بلاشبہ اپنی اپنی جگہ پر لاجواب ہیں۔ تقابلی مطالعہ منظور نہیں۔ لیکن اسے کیا کیا جائے کہ جاپان کی "چھتری" چین میں نہیں ملتی۔ مجتبیٰ کی حسِ مزاح بہت تیز ہے۔ 'آدمی نامہ' کے بیشتر خاکے اور مجتبیٰ کے دوسرے متعدد انشائیے اس ادّعا کے شاہدِ عادل ہیں۔ مجتبیٰ کی یہ ایک اور اہم کتاب ہے۔ جس میں طرح طرح کے کرداروں کو مجتبیٰ کے قلم نے زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ، مجتبیٰ کے خاکوں سے جھانکنے والے 'آدمی' قاری کے ذہن کا اٹوٹ حصّہ بن کر رہ جاتے ہیں ـــ اور کمال یہ ہے کہ پھر بھی وہ آدمی ہی رہتے ہیں۔ "آدمی نامہ" کے خاکوں سے پیشتر بھی، مجتبیٰ نے کئی خاکے لکھے تھے، حکیم یوسف حسین خاں کا خاکہ ـــ سعید بن محمد نقش کا خاکہ ـــ ایم۔ ایف حسین کا خاکہ ـــ قصّہ مختصر، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ خاکہ نگاری میں بھی مجتبیٰ ایک منفرد مرتبہ و مقام کے حامل ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجتبیٰ اُردو کے واحد خاکہ نگار ہیں۔ لیکن وہ جمع واحد ضرور ہیں۔ مجتبیٰ کے آگے پیچھے اُردو کے مزاح نگاروں اور مرقع کاروں کی ایک بہت بڑی فوج ظفر موج موجود ہے لیکن میں تو سر دست مجتبیٰ کے "وجود" کی بات کر رہا ہوں جو موجود بالشہود ہے

مجتبیٰ کی دوسری کتابوں میں "تکلف برطرف" "قطع کلام" "قصّہ مختصر" "بہرحال" اور "بالآخر" میں جتنے مضامین شامل ہیں اُن سب کا جائزہ لینا اور ان کی خصوصیات پر گفتگو کرنا بہت دلچسپ مشغلہ ہو سکتا ہے اور میرا خیال ہے کہ دوسرے لکھنے والوں نے یقیناً اس موضوع کو اپنا محبوب مشغلہ بنایا ہوگا ـــ پس یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حیدرآباد کے اِس ادیبِ طنز و ظرافت پرداز کی شخصیت اور فن کے بارے میں کچھ برملا اور کچھ خفیہ اشاروں پر اکتفا کیا جائے۔

- مجتبیٰ حسین جو کچھ لکھتے ہیں ایک ہی نشست میں لکھتے ہیں یعنی جب پورا مضمون لکھ چکتے ہیں تبھی برخواست ہوتے ہیں۔
- مجتبیٰ حسین طنز و مزاح کی ایک چلتی پھرتی انسائیکلوپیڈیا ہیں۔
- مجتبیٰ حسین طنز و مزاح لکھتے بھی ہیں اور بولتے بھی ہیں یعنی خلوت میں لکھتے ہیں اور جلوت میں بولتے ہیں۔
- مجتبیٰ حسین کو صحت سے زیادہ صحبت عزیز ہے۔ اسی وجہ سے اب تک انھوں نے سورج کو نکلتے اور چاند کو ڈوبتے نہیں دیکھا ہے۔
- مجتبیٰ حسین کی تحریروں میں واماندگی نہیں ہوتی ہے وارفتگی ہوتی ہے۔
- مجتبیٰ حسین کی زبان پہلے صرف صاف ستھری ہوتی تھی اب دُھلی ہوئی ہوتی ہے اور اُس پر وہ اِستری بھی پھیر دیتے ہیں۔

- وہ زبان کے تمام حربوں سے کام لینا سیکھ گئے ہیں۔ اندیشہ اس بات کا پیدا ہوگیا ہے کہ اگر وہ بکثرت، اس طرف راغب ہوجائیں تو بھینس کے انڈے سے روغن گل نکالنے کی طرف نہ چلے جائیں۔
- لیکن مجتبیٰ حسین کی سلامت روی سے یہ اُمید کی جاسکتی ہے کہ اس وادیٔ پُرپیچ سے بھی وہ صحیح سلامت گزر جائیں گے۔
- مجتبیٰ حسین کو اُردو کے محاوروں اور روزمروں پر بھی خاصی قدرت حاصل ہوگئی ہے۔ جن کے برمحل استعمال سے وہ اپنے "مزاح" میں چارچاند اور اپنے "طنز" میں آٹھ ستارے ٹانک دیتے ہیں۔
- مجتبیٰ حسین، تشبیہہ، استعارہ، اشارہ، کنایہ، تلمیح، تمثیل اور تمام صنائع لفظی و معنوی کو برتنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ اور اسی سلیقے کی بدولت 'مزاح نگاری' میں اُن کی رنجھ رہی ہے۔
- مجتبیٰ حسین کا اسلوبِ نگارش سادہ پُرکار ہوتا ہے۔۔۔ بالکل خوبانِ غالبؔ کے مانند۔
- داستانی طرز کی نثر لکھنے میں بھی انہیں کمال حاصل ہے۔

بعبارتِ مختصر! دکن کے اس سانولے سلونے، خوش مزاج و خوش گفتار و خوش افکار' ادیب کی نگارشات' اُردو کے عصری ادب کا ایسا قیمتی تحفہ ہیں جسے اُن کی ادبی زندگی کے پچیسویں جشن کے موقع پر' بہ صد افتخار اُن کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ گر قبول اُفتد ....

" ہمیں یاد ہے کہ ایک محفل میں حضرت جگرؔ مرادآبادی کا تعارف ایک لکھ پتی تاجر سے کرایا گیا کہ ان سے ملیے یہ حضرت جگرؔ مرادآبادی ہیں تو انھوں نے فرطِ مسرت کے ساتھ کہا تھا " آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ اچھا تو آپ مرادآباد کے رہنے والے ہیں جہاں کے لوٹے بہت مشہور ہیں "

(الغرض ـــــ " لوٹے ہی لوٹے ")

○

زبیر رضوی

مجتبیٰ حسین

سایہ دار آدمی !

آزادی کے بعد جب دلی دوبارہ بن سنور کر ادا فروش ہوئی تو بیشتر اُردو ادیبوں نے اس شہر کی جانب کوچ کیا کہ اس بستی سے ہجرت کرنے والے اپنے پیچھے شہرت، عزت اور سماجی پذیرائیوں کے سنہری مواقع چھوڑ گئے تھے۔ یہی وہ وقت تھا جب صفوں میں ایک کھلبلی سی مچی تھی اور ادبی بساط اس کھلبلی کے بعد بہت دنوں تک ایسے جمی رہی کہ پچھلی صفوں کے، اگلی صف میں کھڑے تھے۔ ادبی شناخت اور پذیرائی کا یہ باغ وبہار موسم جب بہت دنوں تک ہرے پتوں کو شاخوں میں گوندھے نہ رکھ سکا تو پھر زور کی ہوا چلی، نیا موسم آیا تو اپنے ساتھ نئے پتے بھی لایا، دلی کی ادبی زندگی ۶۰، اور ۷۰ کی دہائیوں میں ان ہی نئے پتوں کی شاخ شاخ آمد سے عبارت ہے، ایسے تازہ واردان شہر میں مجتبیٰ حسین بھی تھے۔ جب مجھے اچانک ایک صبح ان کے دلی آنے کی اطلاع ملی تو مجھے تعجب ہوا کہ حیدرآباد والے تو اپنے کسی ضلع کو بھی اپنا عارضی مستقر بنانے کو عذاب الٰہی تصور کرتے ہیں، یہ معظم جاہی مارکٹ کا شیدائی چاندنی چوک کی بھیڑ میں کہاں آ نکلا۔ مجتبیٰ حسین سے ملاقات ہوئی تو ان سے ہاتھ ملانے کے بجائے میں نے ان کے دونوں بازوؤں کو ٹٹولنا شروع کر دیا، مجتبیٰ بولے، یار! آپ دلی آ کر ملنے ملانے کے حیدرآبادی آداب بھی بھول گئے۔ نہ مصافحہ، نہ معانقہ، نہ آداب نہ سلام، یہ تم بازوؤں پر کیا تلاش کر رہے ہو۔ میں نے کہا "دلی آتے ہوئے تمہارے بازوؤں پر کتنے امام ضامن باندھے گئے۔ مجتبیٰ نے زوردار قہقہہ لگایا، بولے' وہ سارے امام ضامن تو میں نامپلی اسٹیشن پر ہی زندہ دلان حیدرآباد اور فائن آرٹس اکاڈمی والوں کے بازوؤں پر باندھ آیا تھا کہ میرے دلی ہجرت کرنے سے انھیں اپنے عدم تحفظ کا شدید احساس تھا۔

مجتبیٰ حسین جب دلی آئے تو طنز و مزاح کا وہ زرہ بکتر پہنے ہوئے تھے جو فکر تونسوی کے علاوہ دلی میں کسی اور کو میسر نہ تھا، یہ زرہ بکتر پہن کر جب مجتبیٰ نے حیدرآباد میں کئی معرکے سر کر لیے تو انھیں دلی فتح کرنے کا خیال آیا جس کے خوابوں سے تو ہماری تاریخ بھری پڑی ہے۔ مجتبیٰ دلی وارد ہوئے تو میری طرح اور لوگوں نے بھی اسے دیوانے کا خواب کہہ کر ٹال دیا۔

کچھ دنوں تک تو دلی کی ادبی بساط پر مجتبیٰ حسین کو اپنے پیر ٹکانے کی بھی جگہ نہیں ملی، اس بیچ بدھیا چل کے اس پار سے ان کے نام بھرپور فتوں کے بلاوے آتے رہے، ان کی جیبوں کی تلاشی لینے پر ایک

جیب سے چار مینار اور دوسری جیب سے قطب مینار کے ماڈل برآمد ہوتے، مجتبیٰ اپنی اس بٹی ہوئی شخصیت کے ساتھ حیدرآبادیوں اور دلّی والوں میں گھلتے ملتے رہے، ان کی باتوں کا خوش ذائقہ نمک بہت جلد دلّی والوں کو چٹخارہ دینے لگا، اور وہ دن بھی آیا جب ادبی محفلوں اور مجلسوں میں مجتبیٰ کے داخل ہوتے ہی بے شمار ہاتھ گرمجوشی کے ساتھ ان کی طرف بڑھنے لگے، اردو کی وہ محفلیں جو سپاٹ اور بے روح تقریروں اور بے جان حاشیہ آرائیوں کی بنیاد پر اردو کے کج کلاہوں اور طرحداروں کو اپنی طرف متوجہ نہ کرپاتی تھیں وہ مجتبیٰ حسین کی موجودگی اور خاکہ نگاریوں کی دھوم سے جاگ سی اٹھیں، ادھر دس برسوں میں دلّی میں نئی کتابوں کی رونمائی انفرادی ادیبوں کے جشن اور سیمیناروں کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا ہے، جس طرح روایتی زرق برق والے نوشاہی لباس کے بغیر کسی دولہا کی بارات عروسی فضاء نہیں بناتی اسی طرح کسی کتاب کی رونمائی، کسی شاعر کا جشن، مجتبیٰ حسین کے خاکے کے بغیر مزہ نہیں دیتا۔ محفل کے ختم پر لوگ کتاب کا نام اور صاحبِ جشن کا نام تو بھول جاتے ہیں مگر مجتبیٰ حسین کا خاکہ اور نام کئی دن تک چائے خانوں کی ادبی صحبتوں میں چٹکیاں لیتا رہتا ہے، ان کے گھر اور دفتر کے ٹیلی فون کی زیادہ تر گھنٹیاں وہ ہوتی ہیں جو خاکہ لکھنے کی فرمائش یا صاحبِ خاکہ کو خاکہ لکھے جانے کی خوش خبری سے تعلق رکھتی ہیں۔

میں نے ایک بار مجتبیٰ حسین سے ملامت کے لہجے میں کہا،

بھائی ہر شخص خاکے کے لائق کب ہوتا ہے تم تو سب ہی کے سر پہ خاکے کی ٹوپی فٹ کردیتے ہو؟" بولے "کیا کروں جس طرح مشاعروں میں تمہاری شاعری سے زیادہ تمہاری نظامت کا چسکا لوگوں کو پڑ گیا ہے اسی طرح لوگ میری خاکہ سازی (خاکہ نگاری نہیں) کے رسیا ہو گئے ہیں۔

ایک دن میں نے مجتبیٰ حسین کو اسی طرح کریدا۔

"یہ کیا بات ہے کہ تم نے صرف مرد ادیبوں کے ہی سراپے لکھے ہیں :

مجتبیٰ فوراً بولے،

" دوسرے سراپے کے لیے غزل جو موجود ہے "؟

دلّی کے ٹیلی فون ڈپارٹمنٹ نے ایک زمانے میں خصوصی معلومات کی سروس شروع کی تھی جو آپریٹروں کی کم علمیت کی بنا پر ٹھپ ہوگئی" اردو کی حد تک مجتبیٰ حسین اس سروس کا نعم البدل ثابت ہوئے ہیں۔ انھیں اردو کا ٹائمز آف انڈیا کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ کس ادبی محاذ پر کیا ہو رہا ہے، کیا ادبی سازشیں ہیں، کون کیا کر رہا ہے، دلّی میں کون ادیب وارد ہوا، کون چلا گیا، ادیبوں کی نجی زندگی کے راز سربستہ اور ان کا پوشیدہ احوال بھی مجتبیٰ حسین سے مل جائے گا، آپ فون کریں گے اور ادھر سے مجتبیٰ کی آواز آئے گی،

یوسف ناظم دلّی آئے تھے، انھوں نے اب بالوں کو رنگنا چھوڑ دیا ہے، کمار پاشی نے بیوی کے نام جو نظمیں لکھی ہیں وہ اردو میں نہیں ہندی میں شائع ہو رہی ہیں، مغنی تبسم اپنی نہیں، اپنے بیٹے کی شادی کرنے امریکہ گئے ہیں، شہریار پیرس سے لوٹ آئے ہیں مگر اپنا سوٹ کیس پیرس ایرپورٹ پر چھوڑ آئے، عمیق حنفی ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل کا پروموشن نہ ملنے پر کورٹ جانے کی تیاری کر رہے ہیں، کل رات مخمور سعیدی نے پی کر جن پتھ ہوٹل کے فرش پر مسلسل محو رقص رہنے کا ریکارڈ قائم کر دیا، ڈی سی ایم کے مشاعرے میں جمیل الدین عالی کی شرکت کے خلاف پُرانے

شہر میں بڑے بڑے پوسٹر لگائے گئے ہیں، زبیر رضوی ایک روسی لڑکی کو اردو کہانیوں کا انتخاب روسی زبان میں شائع کرنے کے لیے ورغلا رہے ہیں۔

مجتبیٰ حسین کو اس وقت سخت مایوسی اور افسوس ہوتا ہے جب انھیں یہ پتہ چلتا ہے کہ فلاں واقعہ یا حادثہ آپ کے علم میں نہیں ہے، ادب، ادیب اور ان دونوں سے جڑی ہوئی ہر سرگرمی، ہر واقعہ، ہر الجھن اور پریشانی مجتبیٰ کی اپنی ہے۔ ان کی ملاقاتوں اور دوستیوں کے ان گنت سرکل ہیں، ادیبوں کے علاوہ پارلیمنٹ کے ممبروں، وزیروں، اعلیٰ افسروں، اخبار والوں، تجارتی کمپنیوں کے سربراہوں، ڈاکٹروں، وکیلوں پبلشروں اور پولیس والوں سے بھی ان کے معتبر رابطے ہیں، وہ اپنے ان سب رابطوں کو ایک عجیب تسلسل کے ساتھ اپنی ذات سے باندھے رکھتے ہیں، اس خیال سے کہ نہ جانے کب کس رابطے کی کس دوست کے لیے ضرورت پڑ جائے ان کے اسکوٹر کا زیادہ تر پٹرول ان کاموں کی انجام دہی میں خرچ ہوتا ہے جو دوسروں کی طرف سے سونپے جاتے ہیں گھر جاتے جاتے وہ اس خیال سے اسکوٹر میں پٹرول بھروا لیتے ہیں کہ خدا جانے رات کو کس لمحے میں کس کا فون آ جائے اور کہیں جانا پڑے، شاذ تمکنت کی موت کی خبر ملی تو مجتبیٰ کھانا پینا بھول گئے جہاں جہاں ممکن ہوا دست سوال پھیلایا، ہر حلقے کے ادیبوں کو متوجہ کیا، حمایت علی شاعر پاکستان سے آئے تو ان کی مصروفیات کا تمام انتظام مجتبیٰ سنبھالے ہوئے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی، سرور صاحب کے اعزاز میں جلسہ کرنا چاہتے ہیں تو مجتبیٰ آڈیٹوریم کے انتظام سے لے کر بروشر شائع کرنے تک آگے آگے ہیں، پٹنہ، حیدرآباد، دلی، لکھنؤ ہر چھوٹے بڑے شہر میں مشاعروں کے انداز پر طنز و مزاح کی شامیں منعقد کرنے میں دن رات ایک کیے ہوئے ہیں، فکر تونسوی، یوسف ناظم، نریندر لوتھر، احمد جمال پاشا، رضا نقوی واہی، سب ہی کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے مجتبیٰ کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو جاتی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں قاضی سلیم نے اورنگ آباد میں سراج اورنگ آبادی کا تین سو سالہ جشن منایا، میں اور مجتبیٰ دلی سے اورنگ آباد پہنچے، بیگم مجتبیٰ، مجتبیٰ کی بیٹی نجیبہ اور میرا بیٹا سلمان بھی ساتھ تھے، ان لوگوں کو ساتھ لے جانے کا سبب ان کی ایلورہ اجنتا دیکھنے کی شدید خواہش تھی، اورنگ آباد پہنچ کے بعد مجتبیٰ نے بھابی اور بیٹی کو اپنے ایک دوست کے افراد خاندان کے حوالے کیا اور خود آ بیل مجھے مار کے مصداق جشن سراج کو کامیاب بنانے کی کوششوں میں قاضی سلیم کے ساتھ جٹ گئے، بے حد تلاش کے بعد میرے ہاتھ لگے تو میں نے کہا، بندۂ خدا، بھابی اور نجو کو ایلورہ اجنتا تو دکھا دو، جشن تو ہو ہی جائے گا، مجتبیٰ کا چہرہ دیکھا تو یوں لگا جیسے کسی نمازی کو نماز کی حالت میں آواز دے دی ہو!

کبھی کبھی مجتبیٰ کا یہ دلِ درد مند، بے درد بھی بن جاتا ہے اور یہ تب ہوتا ہے جب مجتبیٰ پر کسی روز شرارتوں کا دورہ پڑتا ہے ان کی شرارت کا تیر جب جب اپنے نشانے پر پہنچتا ہے تو وہ دیر تک اس کا مزہ لیتے ہیں اور اپنی نشانے بازی کی مہارت کو دوستوں کے ساتھ SHARE کرتے ہیں، ان کی ایک عادت یہ بھی ہے کہ وہ کسی واقعے یا حادثے کی ترسیل میں جب تک مبالغے کا نمک مرچ نہ ملا دیں انھیں مزہ نہیں آتا۔ مجتبیٰ کے حوالے سے پھیلنے والے واقعات یا حادثات کی رپورٹنگ کا اصل ست نکالنے کا فارمولا یہ ہے کہ ان کی رپورٹنگ کو آپ آفسیٹ کے لیے کی گئی کتابت کی طرح R E D U E C کریں۔

حیدرآباد اور حیدرآبادی مجتبیٰ حسین کی دکھتی رگ ہیں، فائن آرٹس اکاڈمی اور زندہ دلان حیدرآباد کے

بیشتر ذہین فنکاروں کو باہر کی دنیا سے متعارف کرانے میں مجتبیٰ کا بڑا ہاتھ ہے، ٹوکیو، لندن، پیرس ہر جگہ چارمینار کا ماڈل مجتبیٰ کی جیب میں رہتا ہے لیکن حیدرآباد جا کر ان کی جیب میں رکھا چارمینار کا ماڈل ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے، حیدرآباد کی سڑکوں پر مجتبیٰ کو بس اپنے ہی قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے وہ تنہا سے ہو جاتے ہیں انھیں اس حیدرآباد کے گم ہو جانے کا بڑا دکھ ہے جو مخدوم، اریب، سرور ڈنڈا اور ان کے بھائی ابراہیم جلیس کا حیدرآباد تھا۔ مجتبیٰ کی تحریروں میں حیدرآباد اور اس کی سانولی سلونی تہذیبی زندگی کو وہی مقام حاصل ہے جو رشید احمد صدیقی کی تحریروں میں علی گڑھ کو۔ لیکن دلّی کے قیام بعد بیرونی ملکوں کے مختلف دوروں نے ان کے تخلیقی ویژن کو ایک نیا رُخ دیا ہے۔ اپنے موضوع کو زبان و بیان کے بے حد لطیف اور ذائقہ دار چٹخارے کے ساتھ اپنے پڑھنے والوں تک پہنچانے کے ہنر میں مجتبیٰ کو یکتائی حاصل ہے ان کی تحریروں میں پھولوں کی مہک کے ساتھ نوکِ خار کی وہ چبھن بھی ہے جو پھول چننے والی انگلیوں کو زخمی ہو جانے کی لذت سے مالا مال کر دیتی ہے۔

جاپان چلو کسی اردو مزاح نگار کا وہ پہلا سفرنامہ ہے جو کسی غیر ملکی زبان (جاپانی) میں پورا ہی ترجمہ ہوا ہے، میں جب بھی مجتبیٰ حسین سے یہ کہتا ہوں کہ وہ ہندوستان کا مشتاق احمد یوسفی ہے تو وہ اپنی مخصوص خاکساری کے ساتھ سگریٹ جھٹکتے ہوئے کہتے ہیں،

کیا باتاں کر رئیں حضرت !!

■□

شگوفہ کے خصوصی نمبر

ظریف غالب نمبر	فروری مارچ	۶۹ء
ڈیڑھ سالہ سالگرہ نمبر	جولائی اگست	۷۰ء
بھارت چند کھنہ نمبر	جنوری، فروری	۷۲ء
نریندر لوتھر نمبر	ستمبر	۷۳ء
سلیمان خطیب نمبر	ڈسمبر	۷۵ء
پیروڈی نمبر	ستمبر	۷۶ء
تخلص بھوپالی نمبر	نومبر	۷۷ء
ابراہیم جلیس نمبر	مئی	۷۸ء
بیادِ سلیمان خطیب	نومبر	۷۸ء
ڈرامہ نمبر	جولائی	۷۹ء
کنھیا لال کپور نمبر	جنوری	۸۱ء
خواجہ عبدالغفور نمبر	جون	۸۴ء
ہندوستانی مزاح نمبر		۸۵ء

نریندر لوتھر
(حیدرآباد)

اَنڈرا کلیس حُسَین

کوئی بھی مصنف جب اپنی کتاب چھپواتا ہے تو اپنا تعارف کسی مشہور و معروف سینئر ادیب یا وزیر یا کسی وی آئی پی سے لکھواتا ہے۔ مجتبیٰ حسین کی یہ حسرت ادھوری سی رہ گئی۔ جب اس کی پہلی کتاب "تکلف برطرف" شائع ہوئی تو اُس کی یہ خواہش تھی کہ کرشن چندر اُس کے "درمیانی آدمی" کے فرائض انجام دیں۔ کرشن چندر تیار بھی ہو گئے لیکن اس غلطی کی پاداش میں ان کو ہارٹ اٹیک ہوگیا۔ اس طرح مجتبیٰ ادبی تعارف سے محروم ہی رہا۔

اُس کے بعد مجتبیٰ نے بہت کچھ لکھا اور اب اُسے کسی تعارف کی ضرورت نہیں رہی۔ لیکن حسرت حسرت ہی ہوتی ہے اور اگر اُسے پورا نہ کیا جائے تو اُس کے کئی نقصان دہ نفسیاتی نتیجے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اب مجتبیٰ ہر ادیب کا تعارف کرواتا پھرتا ہے۔ ان پر خاکے لکھتا ہے تاکہ جس محرومی کا اُسے تجربہ ہوا وہ اُس سے بچ جائے اور پھر دوست کس لئے ہوتے ہیں؟ اگر وہ کوئی حسرت پوری نہ کرسکیں؟ اس لئے میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں مجتبیٰ کے قریبی دوست کا مرتبہ چھوڑ کر کچھ دیر کے لئے "درمیانی آدمی" بن جاؤں۔

مجتبیٰ کا خاکہ اُڑانے کا خیال اکثر میرے دل میں آیا۔ لیکن اس مضمون کی ناقابلِ برداشت تحریک اس وقت ملی جب زندہ دلانِ حیدرآباد کا خط آیا کہ اس سال پھر اپریل میں مجھے ان کے ادبی اجلاس میں شریک ہونا ہے۔ دعوت نامہ دیکھا۔ وہی پرانے گھسے پٹے نام۔ کوئی نیا لکھنے والا نہیں۔ یہ اُردو طنز و مزاح کو کیا ہوگیا؟ نئے لکھنے والے کیوں نہیں اُبھرتے؟ اگر ایک بار اُبھرتے بھی ہیں تو پھر ایسا غوطہ لگاتے ہیں کہ ڈھونڈے سے نہیں ملتے۔ خیر، فہرست میں بقولِ شاعر

"میرا نام تیرے نام کے ساتھ"

ایسے موقعوں پر مجتبیٰ اکثر مجھے فون کرتا ہے۔ اس بار جو فون کیا تو کہنے لگا "میرا جانا تو شاید مشکل ہو۔ ابھی ابھی حیدرآباد سے لوٹا ہوں۔ اتنی جلدی دوبارہ جا نہیں پاؤں گا۔ حکومت، اُردو پر کتنی ہی مہربان کیوں نہ ہو۔ کب تک دفتر سے میری غیر حاضری کو معاف کرے گی؟"

دلیل معقول تھی۔ اس سے مجھے احساس ہوا کہ مجتبیٰ لکھنے کے علاوہ بھی کوئی کام کرتا ہے۔ ویسے یہ بات بھول بھی کیسے سکتا تھا؟ ایسا شخص صرف سرکاری دفتر میں ہی کام کرسکتا ہے۔ سرکار اُردو ادیبوں کے تعلق سے بڑی وسیع القلب واقع ہوئی ہے۔ دیکھئے نا۔ یوسف ناظم، رشید قریشی، خواجہ عبدالغفور، بھارت چند کھنہ، نریندر لوتھر اور

مجتبیٰ حسین کو اگر سرکاری نوکری نہ ملتی تو وہ اُردو ادب کی کیا خاک خدمت کر سکتے ! ان کو خاک میں ڈھونڈنا پڑتا کہ کیسی کیسی صورتیں روزی نہ ملنے کی وجہ سے اس میں پنہاں ہوجاتی ہیں۔ پرائیوٹ سکٹر میں وہ بات کہاں !

اب پچھلے چند سالوں سے فکر تونسوی، مجتبیٰ حسین اور مجھے تینوں کو محفلوں میں اکٹھے جانے اور مضامین پڑھنے کی عادت اتنی ہوگئی ہے کہ کسی محفل میں کسی ایک کا اکیلے جانا ممکن ہی نہیں لگتا۔ تینوں میں سے کم ازکم دو کا "کورم" ہوتا ہے اور اس "کورم کے بغیر قومی سطح پر طنز و مزاح کی کوئی محفل منعقد نہیں ہوسکتی۔ ادبی جلسوں میں اکٹھے جاتے جاتے اور پڑھتے پڑھتے اب یہ عالم ہوگیا ہے کہ ہم کو ایک دوسرے کے بیشتر مضامین زبانی یاد ہوگئے ہیں۔ چند ہفتوں کی ہی بات ہے کہ ہماری مزاحیہ تکون امروہہ میں مجموعی طور پر مدعو تھی۔ میں پہلے فکر صاحب کے گھر پہنچا اور اُن کو لے کر ہم مجتبیٰ کے گھر کی طرف چلے۔ راستے میں اچانک فکر صاحب گویا ہوئے :

"اوہو ! ذرا واپس چلئے، میں مضمون لانا تو بھول ہی گیا۔"

میں نے کہا "پہلے ہی بہت دیر ہوگئی ہے۔ اب واپس نہیں جاسکتے۔ آپ یا تو جیسا عموماً کرتے ہیں، میرا ہی کوئی مضمون پڑھ ڈالئے یا مجھے بتا دیجئے کون سا مضمون سنانا چاہتے ہیں، میں زبانی سنا دوں گا۔" نتیجتاً فکر صاحب نے اپنے نام سے میرا ہی لکھا ہوا مضمون وہاں سنایا۔ بہت داد ملی۔ ہم تینوں بہت خوش ہوئے۔ فکر صاحب ایکٹر کی حیثیت سے، میں پلے بیک کی حیثیت سے اور مجتبیٰ ڈائرکٹر کی حیثیت سے۔

خیر۔ میرے کہنے کا مدعا یہ تھا کہ مجھے یہ گوارا نہیں تھا کہ حیدرآباد کے جلسے میں جو ہماری دانست میں، ہندوستان بلکہ برصغیر کا سب سے بڑا طنز و مزاح کا فنکشن ہے، وہاں "کورم" نہ ہو۔ میں نے اصرار کیا۔ مجتبیٰ نے روایتی ہوں ہاں کی۔ اصرار میں ابھی ڈھیل ہے اس کا جواب سطحی حیل و حجت میں ملتا ہے۔ پھر میں نے فوراً کہا۔ "دیکھو میں تم پر ایک خاکہ پڑھنا چاہتا تھا۔ اگر نہیں آؤ گے تو پھر کوئی اور مضمون لکھوں گا۔" یہ سنتے ہی مجتبیٰ نے جواب دیا۔ اگر یہ وعدہ ہے تو پھر حیدرآباد چلتا ہوں، اُس کے بعد اب مجتبیٰ نے مجھے روز فون کرنا شروع کردیا۔ کسی نہ کسی بہانے بظاہر میرا حال پوچھنے، خیر و عافیت دریافت کرنے۔ "حیدرآباد کب جانا ہے"۔ پروگرام تو پکا ہے۔ کہیں منسوخ تو نہیں ہوجائے گا ؟" اور بہت ہی ضمنی طور پر ــــ "وہ خاکے والی بات کا کچھ ہوا ؟"

تو صاحبان۔ دوستو۔ خواتین و حضرات۔ عزیزو آج اگر مجتبیٰ حسین یہاں موجود ہے تو اس کے لئے آپ کا پیار اور خلوص اور کشش ذمہ دار نہیں۔ اس کارنامہ کا سہرا میرے سر ہے۔ آج میں اپنے آپ کو سرخرو محسوس کر رہا ہوں۔ مجتبیٰ مجھے کتنی بار کھینچ کے گھر سے باہر لے گیا۔ آج میں اُسے گھسیٹ کے واپس لایا ہوں۔ مرحبا اُردو ادب کی تاریخ میں پہلی بار کسی ادیب نے اپنے پرخچے اڑانے کا تماشہ دیکھنے کے لئے ڈیڑھ ہزار کیلو میٹر کی مسافت طے کی ہے۔ بے چارہ غالب اگرچہ دہلی کی گلیوں میں ہی گھومتا رہا لیکن ہر بار "پاور کٹ" کی وجہ سے شو کینسل ہوگیا۔

مجتبیٰ اور میں پانچ سال ایک ہی محکمہ میں کام کرتے رہے (کم ازکم میں تو کام کرتا تھا) پہلے دو سال بقول خود وہ مجھے میرا بیٹا سمجھتا رہا۔ بعد میں کسی نے سمجھایا کہ دراصل میں اُس بیٹے کا باپ ہوں۔ اُس دوران میں، میں مجتبیٰ کو اُس کا بھوت سمجھتا رہا۔ اُس وقت مجھے اُردو طنز و مزاح کی طرف گھسیٹنے کی کافی کوشش کی جارہی تھی اور میں اُسے محض تکلف اور رکھ رکھاؤ پر محمول کرکے گریز کرتا رہا۔ یعنی میں نے خود اپنے آپ کو پہچانا۔ جب میں نے وہ محکمہ چھوڑا تو انگلینڈ چلا گیا۔ میری جدائی کے صدمے سے نظام سابع کا انتقال ہوگیا۔ کسی جرنلسٹ نے انتقال کے فوراً بعد ان کے کمرے کا آنکھوں دیکھا حال قلمبند کیا جو "سیاست" میں چھپا۔ اُس میں یہ کہا گیا تھا کہ

مرحوم کے کمرے میں جا بجا ادھ جلی سگریٹوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے اور اُن کے بستر کے بازو والی تپائی پر میری پہلی کتاب "بنگوارڈہ" کی ایک کاپی موجود تھی۔ اس مضمون کا تراشہ مجھے کسی نے انگلینڈ بھیجا حالانکہ خط کی عبارت زیادہ لمبی نہیں تھی پھر بھی پڑھنے میں کافی مشکل ہوئی۔ ایسا لگتا تھا زبان اُردو یا فارسی ہے لیکن لپی اڑیا۔ خط نویس تھا مجتبیٰ حسین۔ نام ذہن میں محفوظ ہو گیا۔ "بدخطی" کے لحاظ سے میں نے سمجھا یہ شخص یا تو بنک کا ملازم ہوگا یا کامیاب ڈاکٹر۔

انگلینڈ سے آنے کے بعد میں دہلی چلا گیا اور ڈیڑھ سال تک وہیں رہا۔ اُس دوران مجتبیٰ کے کچھ مضامین پڑھے۔ بھوت آہستہ آہستہ انسان بنتا گیا۔ پھر ایک بار جو حیدرآباد آنا ہوا تو مجتبیٰ نے اپنی پہلی کتاب "تکلف برطرف" کی ایک کاپی مجھے دی۔ برسوں بعد میں نے اُردو کی کسی مفت ملی ہوئی کتاب کو ایک ہی اُڑان میں یعنی دو گھنٹے میں ختم کر دیا۔ اور پھر دیکھنے لگا کہ کہیں اور صفحے تو نہیں ہیں جو میں نہ پڑھ پایا ہوں۔ وقت کے گذرنے کا احساس تبھی ہوا جب ہوائی حسینہ نے کمر کس لینے کو کہا۔ ہوائی حسینہ نے مجھے اپنے میں آپ ہنستے دیکھا تو گھبرا کر پائلٹ کے پاس گئی۔ اُس نے فوراً اعلان کر دیا کہ جہاز اب نیچے جا رہا ہے اور تمام مسافر اپنی کمر کی پٹی باندھ لیں۔ "تکلف برطرف" کے مطالعے کے بعد مجھے تسلی ہو گئی کہ اگر میں لکھنا بند بھی کر دوں تو اُردو طنز و مزاح زندہ رہ سکتا ہے۔ ایک بوجھ جو میں خواہ مخواہ اپنے سر پر لیے پھرتا تھا، گویا خود بخود اُتر گیا۔ اب جب بھی کبھی لکھنے کا خیال آتا ہے تو اپنے آپ سے کہتا ہوں، کیا ضرورت ہے تکلیف کرنے یا دینے کی۔ مجتبیٰ جو لکھ رہا ہے، لیکن قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ہمیں عموماً اکٹھے ہی پڑھنے کے لیے مضمون لکھنے پڑھتے ہیں۔ اس کو کہتے ہیں موم بتی کو دونوں سروں سے جلانا۔ اُردو قارئین کفایت شعاری کب سیکھیں گے ؟

خیر، اس کے لیے میں مجتبیٰ حسین کو ہی موردِ الزام ٹھہراتا ہوں، جو جا بجا جلسے منعقد کرواتا پھرتا۔ اور اس طرح مجاہدانہ طور پر اُردو کی خدمت میں جُٹا رہتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ اپنی خدمات کا ڈھنڈورہ نہیں پٹواتا اور بقول خود یہ بھی حقیقت ہے کہ مُعدہ ادب نے مجتبیٰ کی زیادہ خدمت کی ہے بلکہ اب دیکھا دیکھی دوسری زبانوں نے بھی مجتبیٰ کی خدمت کرنا شروع کر دی ہے کیونکہ کہتے ہیں بیچاری اُردو زبان میں اتنی سکت نہیں کہ بیک وقت اتنے ادیبوں کی خدمت کر سکے۔ خیر زبان ادیب کی خدمت کرتی ہے یا ادیب زبان کی۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر بحث کی جا سکتی ہے لیکن میری رائے میں یہ رشتہ تو ایسا ہے جس کے بارے میں چترا جگجیت سنگھ نے ایک گانے میں کہا ہے ؎

پاس رہنا کسی کا رات کی رات
میزبانی بھی ہے مہمانی بھی

اُردو مزاح کے نثریہ مشاعروں کا کامیاب تجربہ حیدرآباد میں زندہ دلان نے شروع کیا تو مجتبیٰ نے اسے ہندوستان کے دوسرے شہروں میں پھیلایا۔ کنہیا لال کپور تونسوی جب پہلی بار زندہ دلانِ حیدرآباد کی ادبی محفل میں آئے تو وہ بہت حیران ہوئے۔ نثر کے لئے انھوں نے اتنا بڑا مجمع کہیں نہیں دیکھا تھا۔ حتیٰ کہ "لہور" (لاہور) میں بھی نہیں۔ پھر اسی طرح کے اجتماع پٹنہ میں ہوئے بھنڈی گڑھ میں، لکھنؤ میں، امروہہ میں اور کئی جگہ اور جہاں مجھے جانے کا اتفاق نہیں ہوا اس لیے صرف سُنی سنائی یا چھلائی بات ہی کہہ سکتا ہوں۔

جب ۱۹۷۴ء میں دہلی کے ایوانِ غالب میں مجھے ایک ریسیپشن دی گئی تو اس کے پیچھے بھی مجتبیٰ کا ہاتھ تھا۔ میں نے وہاں دہلی والوں سے کہا تھا کہ آپ نے پنجابیوں کو خواہ مخواہ ایک کامپلیکس میں مبتلا کر رکھا ہے کہ ہمارا تلفظ ٹھیک نہیں۔ حالانکہ ہمارا قصور صرف اتنا ہے کہ اچھی صحت رکھنے کی وجہ سے ہم دو نقطہ قاف کا تلفظ کھنکار نکال کر پھینکنے والے عمل کی آواز کے ساتھ

نہیں کرتے۔ بہرحال وہ کامپلکس حیدرآباد جاکر دور ہوجاتا ہے جہاں اسی ق کو خ کہہ کر بولتے ہیں۔ اس لئے ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ دہلی والوں کو ٹھیک اور ان کے تلفظ کو غلط کرنے کے لیے ایک حیدرآبادی کو دہلی بھیجا جائے۔ اب مجتبیٰ دہلی میں بس گیا ہے۔ نسل بانسل سے جاری کامپلکس دور ہوجائیں گے۔ دہلی والوں کی اُردو درست ہوجائے گی اور ان کا ذوقِ مزاح اتنا بڑھ جائے گا کہ وہ ایک حرف کے تلفظ جیسی سطحی باتوں کو بھول جائیں گے اور چنانچہ ہوا بھی ایسا ہی۔

آج مجتبیٰ کے بچے اپنے ہمسایوں کے ساتھ پنجابی میں بات چیت کرتے ہیں اور مجتبیٰ خود بھی اپنی روزمرہ کی زبان میں پنجابی کا استعمال کرنے لگا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ حیدرآبادی باہر جاکر سُدھر جاتے ہیں۔

لیکن دہلی میں رہتے ہوئے اور پنجابی بولتے ہوئے بھی مجتبیٰ پکا حیدرآبادی ہے یعنی وہ مہذب انسان ہے۔ اُس کا دل انسانی دوستی سے معمور ہے۔ ایک سچے حیدرآبادی کی طرح لحاظ و مروّت اس کی طبیعت کا خاصّہ ہے۔ وہ کسی کو "نا" نہیں کہہ سکتا۔ کسی کی کوئی ضرورت ہو۔ کسی کا کوئی کام اٹکا ہوا ہو، مجتبیٰ فوراً مدد کے لئے تیار ہوجاتا ہے۔ کئی بار میں نے دیکھا ہے کہ وہ ان لوگوں کے منع کرنے کے باوجود بھی ان کی مدد کئے جاتا ہے۔ نوکری کے لیے، پاسپورٹ کے لیے، ازدواجی تعلقات کے لیے، سوشل کام کے لیے، جلسے منعقد کروانے کے لیے۔ کسی بھی قسم کا کام ہو وہ سفارش کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ اِدھر کی سفارش اُدھر، اُدھر کی سفارش اِدھر۔ گویا سفارش کے امپورٹ ایکسپورٹ کا کام کرتا ہے۔ بس دُنیا میں خیرسگالی اور مفاہمت پھیلاتا رہتا ہے۔ میں اکثر بہت حیران ہوتا ہوں کہ وہ مختلف شعبوں میں، محکموں میں اور اتنی سطحوں پر اتنے بارسوخ لوگوں کو ایسی بے تکلفی سے کیسے جانتا ہے۔ بے شمار ادیبوں، صنعت کاروں، افسروں، سیاستدانوں اور وزیروں کو وہ جانتا ہے۔ اگر وہ کسی وزیر کو شخصی طور پر نہیں جانتا تو کسی ایسے مرد یا عورت کو جانتا ہے جو اُس کو جانتا یا جانتی ہے اور جس کی وساطت سے کام ہوسکتا ہے۔ وہ کئی بار بڑے لوگوں کو یاددہانی کرواتا ہے کہ وہ تو فلاں صاحب کو جانتے ہیں یا فلاں صاحب اُن سے بخوبی واقف ہیں، اس لئے سفارش کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہیئے۔ مجتبیٰ کی جیبیں ایسے خطوط اور چٹھیوں سے بھری رہتی ہیں جن میں سفارشیوں اور سفارش الیہ کے نام ہوتے ہیں۔ اب تو ان خطوط اور چٹھیوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے کہ وہ جیبوں میں نہیں سما سکتے۔ اس لیے وہ اب ایک بریف کیس بھی اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ سُنا ہے کہ دوچار بار اسی تعلق سے مجتبیٰ کی اپنی بیگم کے ساتھ غلط فہمی بھی ہوگئی تھی کیونکہ اُس کی جیب سے چند ایسی "بیچاریوں" کے خطوط نکلے جو اُس نے صرف ان کی سفارش کی یاد دہانی کے لئے رکھے ہوئے تھے۔

اب ان کی بیگم کا کہنا ہے کہ مجتبیٰ نے عورتوں کے تعلق سے سفارش کرنا چھوڑ دیا ہے۔ کئی اور دوستوں کا خیال ہے کہ پالیسی میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوئی۔ صرف مجتبیٰ نے اپنا حافظہ تیز کرلیا ہے اور وہ ضرورت مند خواتین کے نام اب زبانی یاد رکھتا ہے

اب اُس کی بیگم کا ذکر آیا ہے تو ایک اور بات بھی عرض کردوں، بیوی کے بارے میں مجتبیٰ کا نقطۂ نظر کلاسیکی ہے۔ جس کے بموجب گھر کی چار دیواری ہی بیوی کی مناسب جگہ ہے۔ اُس نے دہلی T.V پر جب ہم بیویوں پر پروگرام کررہے تھے علانیہ کہہ دیا تھا کہ اُس کا اپنی بیوی کے ساتھ واسطہ مہینے میں ایک بار پڑتا ہے اور اُس شام کو جب وہ تنخواہ لے کر گھر آتا ہے جو بیوی کی جھولی میں ڈال دی جاتی ہے۔ اس کی باقی ماندہ حرکات وسکنات اور نقل و حمل کا پتہ بیگم کو رسالوں، اخباروں، ریڈیو، ٹی وی اور افواہوں سے ملتا رہتا ہے۔ ویسے میں اس تھیوری کو نہیں مانتا، میرا خیال ہے کہ وہ چوری چھپے مہینے میں ایک بار سے زیادہ اپنی بیوی سے مل لیتا ہے۔ ایک مہینے میں کم از کم دو بار تو میں نے بھی اُسے اس کے گھر میں ہی پکڑا ہے۔ ویسے یہ آسان کام نہیں کیونکہ وہ "علی الصبح گھر واپس آتا ہے اور علی الصبح گھر سے نکل پڑتا ہے"۔ میں اس معاملے میں مجتبیٰ سے رشک کرتا ہوں

کیونکہ مجھے تو اپنی بیوی کو نہ صرف کمائے ہوئے پیسے پیسے کا بلکہ گنوائے ہوئے وقت کے پل پل کا حساب دینا پڑتا ہے۔ اگر اس سے اس کامیاب پالیسی کا راز پوچھا جائے تو اس کا جواب فارسی میں دیتا ہے "گربہ کشتن روزِ اوّل"

جن بڑے لوگوں اور وزیروں کو وہ شخصی طور پر جانتا ہے، ان کے بارے میں اس کا کہنا ہے کہ وہ انہیں اس وقت سے جانتا ہے، ان کے بارے میں اس کا کہنا ہے کہ وہ انہیں اس وقت سے جانتا ہے۔ جب وہ ابھی بڑپّن کی راہ پر گامزن نہیں ہوئے تھے اور وہ اکثر اورینٹ ہوٹل کے آزو بازو اور کبھی کبھی اس کے اندر آکر اپنی زندگی کا نصب العین ڈھونڈتے تھے۔ افسوس اب تو اورینٹ ہوٹل ہی نہیں رہا۔ ہمارے لیڈر کہاں سے اُبھریں گے؟

مجتبیٰ کا سفارش کا ریپوٹیشن اتنا پھیل گیا ہے کہ اکثر راہ چلتے لوگ اس کو پکڑ کر سفارش کے لئے درخواست کر دیتے ہیں۔ ایک دو بار میرے دفتر میں وہ مجھ سے ملنے آیا تو میرے ہی ماتحتین کی سفارشیں اس کے توسط سے آنا شروع ہو گئیں۔ میری بیوی کبھی مجھ سے کسی کی سفارش نہیں کرتی۔ ایک شخص کے بارے میں مجھ سے دو چار بار کہا بھی لیکن میں نے اُصولاً اُس پر کوئی توجہ نہ دی۔ ایک دن اسی شخص کے بارے میں مجتبیٰ نے بھی سفارش کی اور پھر قدرے تامل کے ساتھ یہ بھی کہا کہ شائد مسز لوتھر نے بھی اس کے بارے میں ذکر کیا ہوگا۔

میں نے مجتبیٰ کی طرف تاسف بھرے انداز میں یوں دیکھا جیسے جولیس سیزر نے بروٹس کو دیکھا تھا اور وہی کہا جو اس نے کہا تھا "سفارش تو تم راست کر سکتے تھے۔ مسز لوتھر کی وساطت کی کیا ضرورت تھی؟"

مجتبیٰ ذرا جھینپا اور پھر قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ گویا ہوا "نہیں اصل میں سفارش مجھے نہیں کرنا تھی۔ یہ مسز لوتھر کی ہی سفارش ہے۔ انھوں نے ہی مجھ سے آپ کو کہنے کے لیے کہا تھا!"

میں سمجھتا ہوں کہ مجتبیٰ سفارش کرنے کے لیے اس لیے نہیں جھجکتا کہ وہ فطرتاً ہر انسان کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ اس سے کسی کی بے بسی، کسی کا دُکھ نہیں دیکھا جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے چلو کسی غریب کی مدد ہو جائے گی۔ اس سے انسان ثواب کا حقدار بنتا ہے جو ـــــ کام کرنے والے کو نہیں بلکہ کام کروانے والے کو ملتا ہے۔

اور مسلمانوں کے ثواب میں تو بہت سی ایسی چیزیں شامل ہیں کہ کافر بھی پھسل جاتے ہیں۔ مدد کر کے وہ مجبور انسانوں کے لئے اس فرش پر جنّت بنانا چاہتا ہے اور فوراً اپنے لئے عرشی جنّت میں ایک برتھ محفوظ کروانا چاہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جنّت میں بھی مجتبیٰ حوروں کی سفارشیں کرتا پھرے گا۔ نہ جانے کس کس معاملے میں!

میں نے مجتبیٰ کو کبھی کسی شخص یا ادیب کے خلاف بات کرتے نہیں سُنا۔ میں نے نوٹ کیا ہے کہ وہ دوسرے ادیبوں کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسی ذہنیت بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے اور یہ رویّہ صرف وہی لوگ اپنا سکتے ہیں جنھیں دوسروں سے کوئی خطرہ نہ ہو۔ طنز و مزاح میں مجتبیٰ کا نام اب اُس مقام پر ہے کہ اس کو کوئی گرا نہیں سکتا، کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ شائد اسی لئے اس میں خوشحالی سے پیدا ہونے والا خیر سگالی کا جذبہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجتبیٰ کا کوئی دشمن نہیں۔ اگر خدانخواستہ کوئی ایسا موقع بن جائے کہ اس کو سنگسار کئے جانے کا حکم ہو جائے تو کوئی شخص پہلا پتھر مارنے کو تیار نہ ہوگا۔ آپ نے تاریخ میں پڑھا ہوگا کہ سلطنت روما کے زمانے میں مجرموں اور عیسائیوں کو ایک اکھاڑے میں ڈال دیا جاتا تھا اور پھر بھوکے شیر ان پر چھوڑ دیئے جاتے تھے جو انہیں آن کی آن میں ختم کر دیتے تھے۔ ہزاروں لوگ یہ تماشے دیکھتے تھے۔ ایک بار ایک عیسائی قیدی کو ایسے اکھاڑے میں ڈالا گیا اور اُس پر شیر چھوڑ دیا گیا۔ وہ بھوکا شیر اُس پر لپکا، ایک لقمے کے لئے رُکا اور پھر اس کو نوالہ بنانے کی

بجائے ایک کتّے کی طرح اس کو چاٹنا شروع کر دیا۔ روایت کے مطابق شیر نے بتایا کہ (اس زمانے میں شیر بول سکتے تھے) ایک بار جنگل میں جب شیر اور قیدی دونوں آزاد تھے تو قیدی نے جس کا نام انڈراکلیس تھا، اس کے پنجے میں چبھا ہوا کانٹا نکال کر اس کی تکلیف دور کی تھی اور اب وہ احسان فراموشی کیسے کر سکتا ہے۔ اگر ویسا ہی تماشہ حیدرآباد کے فتح میدان اسٹیڈیم میں بھی ہو تو مجتبیٰ یقیناً زندہ بچ نکلے گا۔

اسی لئے آج میں اُسے انڈراکلیس حسین کا نام دیتا ہوں۔ سات سال پہلے اُس نے مجھے اور فکر تونسوی کو آپس میں ملایا تھا تو میں نے اُسے ہنری کسنجر کا نام دیا۔ وہ اس لیے کہ ہنری کی طرح مجتبیٰ بھی ایسے لوگوں کو آپس میں ملاتا ہے جن کو بہت پہلے ملنا چاہیے تھا۔ یہ بات آج بھی سچ ہے لیکن سات سال کے غور و خوض کے بعد اور ہنری کسنجر کا حشر دیکھ کر میں نے اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کر کے اُس کے لئے "انڈراکلیس حسین" کا نام زیادہ مناسب سمجھا ہے۔ ویسے بھی مجتبیٰ کو اپنے نام کے معنی معلوم نہیں۔ اکثر لوگ اُس کو مصطفیٰ سے کنفیوز کرتے ہیں۔ ہمارے گھر میں بھی کبھی یہ نہیں پتہ چلتا کہ ہمارے کس دوست کا فون آیا ہے۔ "شگوفہ" کے مدیر کا یا اُس کے مشیر کا۔ ایسے نام کا کیا فائدہ جس کے معنی کا ہی پتہ نہ چل سکے اور جس کا تلفظ ایسا ہو جیسے کوئی شرابی مصطفیٰ کا نام لے رہا ہو۔

مجتبیٰ کے فن اور شخصیت دونوں میں ہم آہنگی ہے۔ وہ فطرتاً مزاح نگار واقع ہوا ہے۔ وہ لفظوں کے ہیر پھیر سے مزاحیہ کیفیت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتا، جو لطافت اُس کے مزاج میں ہے وہی اُس کے مزاح میں پائی جاتی ہے۔ زندگی میں اس کا کام صرف دوست بنانا اور ہنسنا ہنسانا ہے، اپنے دوست، دوستوں کے دوست، دشمنوں کے دوست، دوستوں کے دشمن، سب کو دوست بنانا رہتا ہے۔ دوستی کی بنیاد GOOD WILL پر ہوتی ہے۔ اُس کے دل میں دنیا کے لئے جنرل گڈول ہے، وہی گڈول اُس کی اَدبی تخلیقوں کا منبع ہے۔ میں اُسے بنیادی طور پر مزاح نگار مانتا ہوں، اُس کے مزاح میں طنز کا عنصر مقابلتاً کم ہے اس لئے زیادہ موثر ہے۔ اس کی طرز تحریر کے ساتھ اُس کی شخصیت اور آواز میں بھی تاثر ہے، اسی لئے وہ نثر پڑھتے وقت اتنا کامیاب ہوتا ہے جتنا کہ ترنم سے پڑھنے والے چند شاعر۔ اور انھیں کی طرح وہ عورتوں میں خاص طور پر مقبول ہے۔ مجھے اس بات کا شخصی تجربہ ہے کیونکہ کئی بار جب میں نے خواتین کو اُن محفلوں میں مدعو کیا جس میں مجھے مضمون پڑھنا ہوتا ہے تو ان کا اکثر سوال ہوتا ہے کہ کیا مجتبیٰ بھی آئے گا۔ خود میرے گھر میں دو خواتین ہیں یعنی میری بیوی اور بیٹی اور دونوں مجتبیٰ کو سُننے کیلئے میرا مضمون بھی سننا گوارا کر لیتی ہیں۔ میرا یہ بھی مشاہدہ ہے کہ جتنا کسی کو کم اُردو آتی ہے اتنا ہی وہ مجتبیٰ کے مضامین پسند کرتی ہے۔ اس لئے مجتبیٰ کے مضامین اب نصاب میں شامل کئے جانے لگے ہیں۔

مجتبیٰ کے مشاہدات جب اس کے قلم سے ہو کر کاغذ پر آتے ہیں تو دیکھی ہوئی چیز، گھڑا ہوا واقعہ، سُنی ہوئی بات، ایک نئی سی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ حال ہی میں مجتبیٰ جاپان گیا تھا۔ وہ اس نام کا واحد شخص، دکن کا پہلا ادیب اور اردو کا پہلا مزاح نگار تھا جسے یہ موقع ملا۔ حکومت نے اُسے بھیجا تو کچھ سیکھنے کے لئے تھا لیکن وہ وہاں جاپانیوں کو اُردو مزاح سکھا گیا۔ اَب اُس نے جاپان کا سفرنامہ لکھنا شروع کیا ہے۔ اُس کو رائی کا پہاڑ بنانا تو آتا ہی ہے۔ ایک چھوٹے سے ملک کو اس نے اتنا بڑا کر کے دکھایا ہے کہ اُس کے سفرنامہ کو پڑھ کر جاپانیوں کو اپنی عظمت کا احساس ہو رہا ہے۔ اب جاپان کے وزیراعظم ہندوستان آنے والے ہیں۔ ہندوستان کی وزارتِ خارجہ نے مجتبیٰ کے مضامین کا خلاصہ بنوایا ہے اور وزارت کے سب افسروں کو حکم ہوا کہ وہ ان مضامین کا مطالعہ کریں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہند جاپان تعلقات پر مجتبیٰ کے سفرنامہ کا کیا اثر پڑتا ہے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جس پر مجتبیٰ کا اور اردو طنز و مزاح کے مستقبل کا انحصار ہے۔

ہم آج دعا کرتے ہیں کہ ایک زندہ باد ہو اور دوسرا پائندہ باد ——

-۰-

[زندہ دلانِ حیدرآباد کے سالانہ اجلاس منعقدہ اپریل ۱۹۸۱ء میں پڑھا گیا۔ م ح]

بلراج ورما

(دہلی)

مجتبیٰ حسین میرا دلدار

دلدار گنداں والے دا اگ سینے تیر تنگ جاندا
ٹٹ جاندے مال حسیناں دے
جس راہ دی سوہنا لنگ جاندا

یہ ایک پنجابی گیت ہے جس کے خالق کے بارے میں کئی رائیں ہیں یہاں تک کہ اب کسی دلچسپ فنکار کی رچنا کے بجائے پنجابیوں نے اسے لوگ گیت (یعنی جنتا جناردھن کی تخلیق) کے طور پر مان لیا ہے۔ پنجاب کے لوگ بڑے دلدار قسم کی چیز ہوتے ہیں۔ خوب کھانے پینے اور کام کرنے والی مخلوق جو خالی وقت میں عشق کرتی ہے یا عاشقی معشوقی کے خواب دیکھتی ہے۔ سوتے میں تو ہر کوئی خواب دیکھتا ہے یہ لوگ جاگتے جاگتے بھی خواب دیکھتے ہیں۔ خواب دیکھنے، بننے اور یادوں میں سمیٹ کر ذاتی تجربہ بنا لینے کا سلیقہ وطنِ عزیز کی دوسری ریاستوں کی مخلوق کو بھی آتا ہوگا مگر پنجابیوں کی بات ہی دوسری ہے۔

کہتے ہیں اردو زبان پر پنجابی اور ہریانوی کا اثر سب سے زیادہ ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ دکنی اردو جو آندھرا پردیش کے خاصے طویل و عریض خطے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے بولنے والوں کے طور طریقوں خاص کر ان کے قہقہوں اور چہچہوں میں اکثر خالص پنجابی رنگ نمایاں ہوتا ہے۔ زندہ دلانِ لاہور سے تقسیمِ وطن کے بعد حیدرآباد میں منتقل ہو جانے کی وجہ بھی غالباً یہی ہے۔ ایک نریندر لوتھر اور ایک بھارت چند کھنہ حیدرآباد کیا جا بسے کہ لاہور کا ماڈل ٹاؤن اپنی ساری نزاکتوں اور شوخیوں کے ساتھ آصف جاہی تہذیب پر غالب آ گیا۔

بات چلی تھی دل دار سے تو صاحبو آپ کی جانکاری کے لیے بتا دوں کہ دلدار کیا ہوتا ہے۔ دلدار وہ ہوتا ہے جس کے دل کو ہر دل سے راہ یعنی الفت ہو اور جو اپنے دلکش و دلفریب طور طریقوں سے دھڑکتے دلوں کو دل تھام کر بیٹھنے کا درس دیتا ہے۔ دل جلوں کو آبِ حیات پلاتا ہے اور ہر برداشتہ دل کو بڑھاوا، بہلانا اور اپنی کرنی کے راستے یعنی وسیلے سے اس دوزخی دنیا سے اس جنتی دنیا راستے کی دوزخوں سے نظر چرا کر اور جسم و جان بچا کر یعنی دورانِ سفر زخمی کیے بغیر پہنچا دیتا ہے۔

دلدار کی دلداری کا مطلب ہے باغ و بہار گفتگو سے دلوں کو باغ باغ کر دینا۔ میری اس تفسیر لغتی تشریح کو سمجھنے کے لیے آپ کو اس شخص کو جاننا اور سمجھنا ہوگا۔ جو لغت تو نہیں مگر جس کی ذات اسی گیت کا مرکز ہے

جیسے میں نے اوپر یعنی اس کے شروع میں لکھا ہے۔ میرا مطلب ہے مجتبیٰ حسین حیدرآبادی سے جو دلّی میں اپنے دس پندرہ سالہ قیام میں ہی اس شہر کی ثقافتی فضا پر کچھ اس طرح چھائے جا رہے ہیں کہ دلّی کے لوگ بھول گئے ہیں کہ وہ ایک امپورٹیڈ شئے لطیف بئے مقامی یعنی دلّی والا نہیں ہے۔ مجتبیٰ حسین دہلوی کیسا لگتا ہے آپ کو۔ مجتبیٰ حسین کو یقیناً اچھا لگتا ہوگا مگر وہ اعتراف نہیں کرے گا کیونکہ اگر وہ اس مضمون میں درج اس ایک بات کو مان لیتا ہے تو اسے باقی باتوں کو بھی تسلیم کر لینا اس کے لیے ضروری ہو جاتے گا۔

حیدرآباد میں دہلوی اور دلّی میں حیدرآبادی کہلانے والا یہ شوخ بیان اور برجستہ گو ظریف یعنی ملدر ازان فیکٹ اے ٹیل آف ٹو سٹیز (A tale of two cities)۔

مجتبیٰ حسین حکومت ہند کے تعلیمی ادارے این سی۔ ای آر۔ ٹی کے شعبۂ اردو کے سربراہ کی حیثیت سے ملک بھر کے ان تمام اسکولوں اور مدرسوں سے وابستہ ہے۔ جہاں اس مرکزی ادارے کے زیر اہتمام تیار کی ہوئی کتابیں بطور نصاب پڑھائی جاتی ہیں مگر اس کی ملک گیر شہرت کی وجہ یہ علمی ادارہ نہیں' اس کی گوناگوں ذات ہے یا پھر سرگرمیوں کا وہ غیر معمولی بلکہ حیرت انگیز سلسلہ ہے جو اسے دل کی ادبی اور تہذیبی دنیا میں تقریباً "سرود یا یک" بنائے ہوئے ہے۔ رابطوں کی یہ اٹوٹ زنجیر مجتبیٰ حسین کو دارالخلافۂ ہند کے ہر اہم شخص سے جوڑے ہوئے ہے جو علم و ادب یا ثقافت کی دنیا میں اپنا مقام بنا چکا ہے یا بنانے کی فکر میں ہے۔ ان حضرات میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنہیں مرحوم فکر تونسوی کلچر و لیچر کے القاب سے پکارا کرتے تھے۔ یہ حضرات علم و ادب و ثقافت کے لیے ازبس ضروری ہوتے ہیں فنکاروں کی دنیا کے محافظ یہ ادب اور ادیب نواز حضرات نہ ہوں تو فنکار فاقوں مر جائیں۔ ان لوگوں کو شاعروں' مصوّروں' موسیقاروں اور رقاصاؤں سے کیا ملتا ہے یہ تو وہی جانیں مگر یہ کہاں ہیں اور کون کتنے پانی میں ہے اس کی سوجھ بوجھ مجتبیٰ حسین نے پوری طرح سے حاصل کر رکھی ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ہر آرٹسٹ کو ایک تجمل حسین کی ضرورت ہوتی ہے اور آرٹسٹ اور تجمل حسین کے مابین کی گہری کھائی کو پاٹنے اور ایک کو دوسرے تک پہنچانے کے لیے جس قسم کے پل کی ضرورت ہوتی ہے وہ صرف ایک کامیاب پی۔ آر۔ او ہی مہیّا کر سکتا ہے۔ ایسے ہیومن انجینئرنگ بھی کہتے ہیں۔

ہر فنکار کے لیے قارئین اور سامعین کے علاوہ مقامی امراء کے طبقے کے کسی ایسے مربّی اور سرپرست کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو اس کا مستقل خریدار رہے یا نہ ہو مگر وقتاً فوقتاً اس کی مالی امداد کرتا رہے اور اس کی خارش کے ازالے کے طور پر چند ایسی محفلوں کا انتظام بھی کرتا رہے جہاں اس کے فن کے چند اصلی کھرے اور سچے پارکھ موجود رہیں۔

ایسے فنکاروں' امراء اور پارکھیوں کو نظر میں رکھنا اور کون کہاں اور کس حد تک جچے گا اس کی پوری آگاہی بھی رکھنا کسی معمولی آدمی کا کام نہیں۔ یہ ایک ہنر مند پی۔ آر۔ او کا کام ہے جو بقول آسکر وائلڈ (Can put genius into office.) دلّی کی ادبی اور ثقافتی دنیا میں اور بھی جینئس ہوں گے مگر اردو کی سمٹی سکڑی اور روز بروز مزید تنگ ہوتی دنیا میں غالباً سب سے اہم اور ہر اعتبار سے قابل

قبول نام آج کی تاریخ میں ایک ہی ہے اور وہ ہے میرے دلدار یعنی مجتبیٰ حسین کا۔

سو صرف یہ تھا دکن نے شمال کی اردو کے رنگ و روپ کو سنوارنے کے لیے ایک دلّی کو بھیجا تھا جس نے دلّی والوں کو بتایا اور سکھایا تھا کہ اردو صرف بول چال کی زبان نہیں اس میں علم و ادب کی یعنی تخلیقی زبان بننے کی بھی پوری اہلیت ہے۔ دکن کا احسان دلّی والے آج بھی مانتے ہیں۔ نئی دلّی والوں نے جو دلّی کو تقریباً بھول گئے تھے (اور حالاتِ حاضرہ نے جن سے جینے، مسکرانے اور ہنسنے ہنسانے کا سلیقہ چھین لیا تھا) حیدرآباد سے دوسرے دلّی کو بلوالیا تاکہ وہ زندہ دلی جو تقسیمِ وطن سے پہلے لاہور کے ماڈل ٹاؤن میں جنمی پلی تھی اور بعد میں حیدرآباد میں منتقل ہو گئی تھی دلّی میں بھی لے آئی جائے۔ زندہ دلانِ لاہور ایک غیر رسمی مگر بے حد جاندار ادارہ تھا۔ شاید اب بھی ہو کیوں کہ جس علاقے وہ جنما اور پروان چڑھا تھا اس کا صرف نام ہی بدلا ہے چلن نہیں۔ پنجابی کہیں بھی چلا جائے پنجابی یعنی خوب کھانے پینے اور خوب کام کرنے والا ہی رہے گا۔

"رج کے کھا، رج کے پی اور جم کر کام کر تاکہ جب تھک کر تو گھر لوٹے تو ہارا ہارا محسوس کرنے کی بجائے رج کر موج بھی مار سکے ہیر یا مرزا گا سکے"

زندہ دلانِ حیدرآباد کا کیا نعرہ ہے میں نہیں جانتا۔ وہ لوگ بھی پنجابیوں کی طرح کھاتے پیتے اور ناچتے گاتے رہتے ہوں گے۔ یہ البتہ میں نہیں مانتا کیونکہ نریندر لوتھر جو زندہ دلانِ حیدرآباد کے سربراہ اور النبی ریشن تھے اور غالباً اب بھی ہیں پنجابی ہوتے ہوئے بھی پنجابی نہیں رہے۔ وہ برنارڈشاہ جیسے سنجیدہ مزاح نگار ہو تو شاید ایک حد تک ہیں، آسکر وائلڈ جیسے بے فکرے مزاح نگار نہیں۔ وہ زندہ دل ہوتے تو دل کا روگ نہ لگا بیٹھتے۔ ایسا خوبصورت، ہر اعتبار سے کامیاب اور ذہین آدمی اور ایسی نامراد بیماری۔ لوتھر کو حیدرآباد پھر بھی پسند ہے اتنا کہ اس نے اسی کو اپنا مستقل گھر بنالیا ہے۔ فکر تونسوی کے جملے بار بار یاد آتے ہیں "نریندر جی نے اپنی ساری زندہ دلی حیدرآبادیوں میں لٹادی کیونکہ پنجابی گھر پھونک تماشا دیکھنے والے کو بھی کہتے ہیں"

مجتبیٰ حسین کو دلّی لانے کی ذمہ داری بھی ایک اہم پنجابی کی مرہونِ منت ہے جسے ہم سب اندر کمار گجرال کے نام سے جانتے ہیں۔ اندر جی زندہ دلانِ لاہور کے مقامی نمائندے اور دلّی کے شرفاء کی سرفہرست شخصیت ہیں۔ گجرال صاحب نے مجتبیٰ حسین کو دیکھا، جانچا، پرکھا، اور مشہور پنجابی دعا دے ڈالی، "جا بیٹا چڑھ جا سولی" یعنی وہ ہستی گاتی ناچتی تہذیب جو میں لاہور چھوڑ آیا تھا اور تم حیدرآباد میں دلّی والوں کے بڑے کام کی چیز ہے کیونکہ دلّی والوں پہ جس قسم کی آفتیں نازل ہوتی رہتی ہیں ان کی وجہ سے ان بے چاروں سے ہنسنے ہنسانے کا فن چھن گیا ہے باوجودیکہ یہ غالب کی نگری ہے جو پھٹے حال ہوتے ہوئے بھی سوچ اور مستی کا شہنشاہ تھا اور اس کا آخری حکمران فقیر بادشاہ ظفر تھا۔

دکن کے اس دوسرے دلّی نے پیر و مرشد کی تھپکی پاتے ہی ایک تیز گام ریس ہارس (Race Horse) کی مانند دلّی کے گلی کوچوں اور بازاروں میں سرپٹ اور بے لگام دوڑنا شروع کر دیا اور چند ہی برسوں میں ان لوگوں سے بھی بڑا دہلوی ہو گیا جو اس شہر بد حال میں جنمے پلے اور بڑے ہوئے تھے۔

میں دلی میں پورے چار دہوں سے جھک مار رہا ہوں مگر جانتا ہوں کہ اگر میں دس آدمیوں کو جانتا ہوں تو وہ دس ہزار سے واقف ہے۔ دلی میں کسی کا کہیں کوئی کام اٹکا ہو یا کوئی کسی قسم کی الجھن میں مبتلا ہو تو مجتبیٰ حسین ہی اس کی رُکی گاڑی ڈھکیل سکتا ہے اور وہی اس کی الجھن سلجھا سکتا ہے بھلے ہی ایک ذریعہ کبھی میں بھی رہا ہوں، ایسے موقعوں اور آدمیوں کی حدود کی جو پہچان خداوند نے اس شخص کو بخش رکھی ہے وہ ہر کسی کا مقدر نہیں خود میں نے اس ولی دکنی کے سیکڑوں ایسے کام کیے ہیں جو کسی دوسرے کے کہنے پر شاید نہ کرتا اور ایسے لوگوں میں ظاہر ہے کہ ایسے بہت سے لوگ بھی ہیں جنھیں میں نسبتاً زیادہ دیر سے جانتا ہوں۔ مجتبیٰ حسین میرے پریوار کے ہر فرد سے واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ انھیں اس گھر کے ہر فرد کا اعتماد حاصل ہے۔ بیگم دسلانے اکثر شکایت کی ہے کہ یہی کام یعنی وہ کام جو میں نے مجتبیٰ حسین کے صرف ایک بار سرسری طور پر کہنے سے ہی کر دیا ان کے اصرار پر بھی شاید نہ کرتا۔ مگر جواب میں جب میں انھیں کسی ایسے کام کی یاد دلاتا ہوں جو مجتبیٰ حسین نے میرے لیے یا میری خاطر کیا تھا تو وہ لاجواب ہو کر محض مسکرا دیتی ہیں۔

مجتبیٰ حسین نے اپنے معروف خاکے 'مزاج درمانے تناظر دکالا' میں میری بیگم کو غیر معمولی طور پر مولی عورت جیسی گالی دے ڈالی تھی۔ کوئی اور عورت ہوتی اور اس قسم کی گالی دینے والا ان کا یہ چھوٹا نٹ کھٹ دیوانہ ہوتا تو یقیناً خاصا بُرا مان جاتیں مگر انھوں نے مجتبیٰ حسین کے اس لطیف سہ جہتی مزاح کو اسی اسپرٹ میں لیا جس میں وہ پیش ہوا تھا۔

مجتبیٰ حسین ہر آدمی اور ہر چیز کی مارکٹ پرائس اور ویلیو جانتا ہے جو ظاہر ہے کہ بہت مشکل کام ہے قدر اور قیمت کے باریک فرق کو سمجھنے کی اہلیت۔ ہر کسی میں نہیں ہوتی۔ اکثر میں تو اکثر نہیں ہوتی۔

حکومت ہند کی ملازمت کے دوران کستوربا گاندھی مارگ پر واقع الیشیا ہاؤس کی آٹھویں منزل کے ایک فلیٹ میں دو ڈھائی سال اور پنڈارہ روڈ کے ایک گورنمنٹ کوارٹر میں تقریباً چار سو ہفتوں اور تین ہزار دنوں میں ہم نے کم از کم تین چار سو بار دل کو ... یا ہوگا۔ محفلیں سجائی ہوں گی۔ یہ دن میرے لیے ہی نہیں میرے گھر والوں کے لیے بھی بے حد خوشگوار دن ہوتے تھے کیونکہ وہ اپنی ہر وزٹ میں اتنی مسکراہٹیں اور مسرتیں بکھیر جاتا تھا کہ ہمارے گھر کی فضا دیر تک مہکتی رہتی اور ہر کوئی اس کی اگلی آمد کے انتظار میں رہتا۔

وہ اکثر کہہ کر جاتا کہ ابھی حاضر ہوتا ہوں مگر یہ ابھی ابھی بہت کم ہوتی تھی۔ دکنی اردو میں ابھی کا مطلب غالباً کبھی ہے۔ انسائیکلو پیڈیا آف انڈین لٹریچر (جو ساہتیہ اکادمی نے مرتب کیا ہے) میں دکنی اردو پر انٹری (ENTRY) میں نے لکھی ہے پھر بھی میں ان دکن والوں کی زبان کی باریکیاں نہیں سمجھ سکا مگر میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ۔

"دلوں کو جیتنے کا فن جو تجھ میں ہے کہیں نہیں"

جانے کیا جادو ہے اس شخص میں اور وہ کیوں دوسروں سے اس قدر مختلف ہے۔ ایک فرق تو میری بڑی بیٹی ہی نے واضح کر دیا ہے: مجتبیٰ انکل اور ایک عام مگر اچھے آدمی میں وہی فرق ہے جو ایک بھرپور فلمی

کا میڈی اور ایک آدھی ادھوری یعنی ناقص ٹریجک نظم میں ہوتا ہے!

میں برادرِ راج کپور کی زبان میں تو نہیں کہوں گا کہ میں زندگی میں ہر دم روتا ہی رہا ہوں مگر یہ واقعی ایک جانی مانی حقیقت ہے کہ زندگی میں مسکراہٹیں کم اور آنسو زیادہ ہوتے ہیں اور میرے اپنے گھر کی اچھی خاصی اور پُر درد و مطمئن فضا میں بھی کھلے کشادہ قہقہے تبھی سنائی دیتے تھے جب مجتبیٰ حسین یا مرحوم فکر تونسوی میں سے کوئی ایک ہمارا مہمان ہوتا تھا۔ جب کبھی یہ دونوں ہوتے اور ایسا اکثر ہوتا تھا تو قہقہوں کے علاوہ چہچہے بھی گونجنے لگتے۔ فکر تونسوی خرابیٔ صحت کی وجہ سے کبھی زیادہ نہیں بیٹھتے تھے اور مجتبیٰ حسین اپنی غیر معمولی صحت کی وجہ سے کبھی جلدی نہ اٹھتے تھے۔

دونوں حضرات ظرافت، شوخ بیانی، بذلہ سنجی اور خود بر داشتہ سہ جہتی مزاح کے شہزادے تو تھے ہی وہ چٹکلوں اور لطیفوں کے ایسے خزانوں پہ بھی قابض تھے جو کبھی ختم نہیں ہوتے۔ شراب میں نے اپنی نیم فوجی زندگی کے آٹھ سالوں میں تقریباً ہر روز پی تھی مگر اس روحانی مشروب کا جو لطف مجھے ان دو حضرات کی صحبت میں ملا اور کہیں نصیب نہیں ہوا۔ نتیجتاً اگرچہ شراب میرے گھر اب بھی رکھی رہتی ہے میں پیتا کبھی کبھار ہی ہوں اور یہ پینا نہ غم غلط کرنے کے لیے ہوتا ہے نہ جشن منانے کے لیے۔

جمنا پار کوئی نہیں آتا جب کہ پنڈارہ روڈ اور ایشیا ہاؤس میں میرے قیام کے دوران کبھی ہی ایسا منحوس دن ہوگا جب گھر میں کوئی مقامی یا باہر کا مہمان نہ آیا ہو۔ اپنے قلیل ذرائع کے باوجود میں فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ میرا گھر میرے احباب کے لیے ہمیشہ ہی سے کھلا اور کشادہ رہا ہے اور انشاء اللہ رہے گا بھی (خدا توفیق دے)

مجتبیٰ حسین نے اکثر اعتراف کیا ہے کہ مرحوم فکر تونسوی تاحیات (کم از کم دلّی کی حدود میں) ان کی سب سے بڑی کمزوری تھے۔ یہاں پھر دکنی اردو اور شمال کی اردو کا تضاد ابھر آتا ہے اور لفظ کمزوری کا اصلی مطلب طاقت نکلتا ہے۔ اس کی دوسری کمزوری (یا طاقت) معروف افسانہ نگار محترمہ آمنہ ابوالحسن صاحبہ ہیں۔ محترمہ چونکہ حیات ہیں لہذا میں مجتبیٰ حسین کا یہ دوسرا اعتراف احتراماً سچائی پر مبنی مان لیتا ہوں مگر ان کا پہلا دعویٰ سراسر جھوٹ ہے اور چونکہ جھوٹ ہے لہذا غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجتبیٰ حسین کی سب سے بڑی کمزوری یا طاقت مجتبیٰ حسین خود ہے۔ میں نے زندگی کو پورے چونسٹھ برسوں جھیلا ہے اور خدا جھوٹ نہ بلوائے اس خاصے لمبے عرصے میں تقریباً اتنے ہزار لوگوں سے ملا بھی ہوں گا مگر آج تک ایسا کوئی دوسرا آدمی نہیں دیکھا جو اپنی ذات اپنے کام اور اپنی فتوحات سے اس قدر مطمئن اور متاثر ہو جتنا کہ مجتبیٰ حسین۔

مجتبیٰ حسین تھرڈ کلاس گریجویٹ ہے وہ بھی ایک ایسی یونیورسٹی سے جس کا فرسٹ کلاس ہونا بھی کوئی بڑا کارنامہ نہیں، باوجود کہ مرحوم عبدالحق اس یونی ورسٹی کے طالب علموں کو کلکتہ ایسی نسبتاً سینیر

اور مشہور یونی ورسٹیوں کے طلبا سے زیادہ تربیت یافتہ اور ذہین مانتے تھے۔ جہاں تک تربیت اور ذہانت کا تعلق ہے بابائے اردو کی بہت سی دوسری دانش ورانہ باتوں کی طرح ان کے اس قول سے بھی متفق ہوں کیوں کہ ان کا ہر قول گہرے مشاہدے پر مبنی ہوتا تھا۔ میں حیدرآباد کے درجنوں ایسے — حضرات سے واقف ہوں جو ہر اعتبار سے ناکارہ ہوتے ہوئے بھی اپنی اپنی جگہ (جو اکثر غیر مناسب طور طریقوں سے حاصل کی ہوئی ہوتی ہے) خاصی کامیابی سے بغیر کچھ کیے ہوئے سنبھالے ہوئے ہیں۔ حیدرآباد درباروں کا شہر رہا ہے اور دربار کے طور طریقوں سے جو ایک بار واقف ہو گیا سمجھو کہ ہر لحاظ سے ہر جگہ اور ہر موقع محل پر کامیاب و کامران رہا۔ درباری زندگی کو میں غلامی نہیں ایک قسم کا کلچر سمجھتا ہوں جس کا رنگ کسی پر بھی چڑھایا جا سکتا ہے۔ اس کی خوش بو کا دائرہ اتنا طویل و عریض ہوتا ہے کہ اس میں جو بھی قدم رکھتا ہے اس کا گرویدہ اور اس کے بے پناہ جادو کا شکار ہو جاتا ہے۔ درباری کلچر کی سب سے اہم اور قابل احترام ہستی امیر خسرو تھے جو ہر دربار میں نہ صرف قبول کیے گئے بلکہ انھوں نے اکثر چند ایک ایسے حکمرانوں کا اعتماد اور احترام بھی حاصل کیا جو ان کے دوسرے محافظوں اور سرپرستوں کے جانی دشمن تھے۔ میں نے ایک بہت بڑے آدمی کا نام لے لیا مگر میں اس کے لیے شرمندہ ہوں نہ نادم کیوں کہ میں مجتبیٰ حسین کو کمپازٹ کلچر کے اس سب سے اہم، عاقل و عالم کا ایک علم بردار سمجھتا ہوں جو حضرت امیر خسرو کو بھی آج (وہ بقید حیات ہوتے تو) اتنا ہی عزیز ہوتا جتنا ہم سب کو ہے۔

مجتبیٰ حسین کو اکثر لوگ محض ایک اچھا خاکہ نویس سمجھتے ہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ ہر کوئی چاہتا ہے کہ وہ اس کا خاکہ کھینچے پہلے ہی اس کی اس دل لگی میں کچھ ایسے انکشافات مظہر ہو جائیں جن کا پردے میں رہنا ہی ان کے حق میں مناسب ہے۔ ایک ماہر حجام کی طرح وہ آپ کو تراشتا جاتا ہے اور اس دوران آپ کے آگے پیچھے اور آس پاس ایسے شیشے لگا دیتا ہے کہ آپ کو اپنے چہرے کی ساری ڈائی مینشنز (DIMENSIONS) ایک ساتھ دکھائی دینے لگتی ہیں۔ وہ آپ کو بے وقوف نہیں بناتا آپ کی تمام تر حماقتوں کو کچھ ایسے رنگ ڈھنگ سے پیش کرتا ہے کہ آپ کو اپنی ساری کمزوریاں ساری خوبیاں ایک ساتھ نظر آنے لگتی ہیں اور اس طرح آپ اپنی کئی کمزوریوں پر غالب آ سکتے ہیں۔ جو دوسرے تو ہر روز ہی دیکھتے ہیں مگر خود آپ ان سے اکثر بے بہرہ رہتے ہیں۔ اس فن کو آپ ہجو یا ہزل کی بجائے بلمرک کے زمرے میں لیں تو آپ کو پتہ چل جائے گا کہ خاکہ نویسی کا مقصد آپ کی تضحیک یا دل آزاری نہ تھا بلکہ ایک سچے دوست کی طرح چھوٹے چھوٹے جھٹکوں سے آپ کو خود فراموشی کی اس نیند سے بیدار کرنا تھا جس سے بیدار ہونا زندگی کے لیے ضروری ہے۔ شگفتہ مذاق ایک زیر لب تبسم ہے وہ قہقہہ نہیں جسے خلیل جبران نے ظلم اور غصہ کی پیداوار بتایا ہے۔

مجتبیٰ حسین کی ہر محفل میں غیر معمولی کامیابی کا راز اس کی پاٹ دار آواز اور ڈرامائی انداز ہی نہیں

بلکہ درباری تہذیب کی وہ لہلہاتی چھپر کھانیاں ہیں جنھیں وہ علاقائی لہجے اور تلفظ کی ہم آہنگی سے سجا سنوار کر ایک ضرب المثل انشائیے کا جامہ پہنا دیتا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ انشائیہ جدید ترین چیز ہے۔ کہانی پڑھنے کی چیز جب کہ انشائیہ پڑھا بھی جا سکتا ہے اور سنا بھی۔ بشرطیکہ سنانے والا کوئی مجتبیٰ حسین ہو۔ یہ خوبی کہاں سے آئی ہے۔ اسے آپ حیدرآباد کی دین کہہ سکتے ہیں کیوں کہ درباری کلچر کی بہترین مثال حیدرآباد ہی کو مانا جاتا ہے جبکہ یہ ہر اس چھوٹی بڑی ریاست کی علاقائی تہذیب کا حصہ تھا جو تقسیم وطن سے پہلے برّصغیر کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی تھیں۔

مجتبیٰ حسین بچوں میں اتنے ہی ہر دل عزیز ہیں جتنے چاچا نہرو تھے۔ خواتین میں ان کی غیر معمولی مقبولیت کا راز وہ بے معنی مزاح ہے جو ہر مضحک صورتِ حال میں خالص بلکہ سہ جہتی مزاح بن جاتا ہے۔ ان کی شوخ بیانی، طبعی بذلہ سنجی، تحریف نگاری، حاضر دماغی اور حاضر جوابی اور فی البدیہہ قلقاریاں اس مقبولیت کے دوسرے عناصر ہیں۔ آپ ان کو اسٹیج پر سیدھے سپاٹ انداز میں اِدھر اُدھر جھانکے بغیر خوش گپیاں برساتے دیکھیے اور ساتھ میں بیٹھی نوجوان یا جوانی کی حدود پار کر چکی خواتین کی آنکھوں میں چوری سے جھانکتے رہیے، میری بات آپ کی سمجھ میں آجائے گی۔

نریندر لوتھر، مجتبیٰ حسین کے مربی اور ایک ایسے دوست ہیں جو اس کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ خواتین کے معاملے میں مجتبیٰ کو وہ "کاسانووا" کا ہم پلّہ مانتے ہیں ـــــــ وہ دراز قد، سڈول بدن، کسی قدر سیاہ سیاہ رنگ اور بظاہر عام قسم کے خدوخال والا ایک معمولی آدمی ہے مگر نہ جانے کیوں وہ عورتوں کی پرکھنے والی کسوٹی پر ہمیشہ پورا اور کھرا اترتا ہے ـــــــ ڈارک اینڈ ہینڈسم ـــــــ یہ نریندر لوتھر کے الفاظ ہیں جن سے میں صد فی صد متفق ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ مجتبیٰ حسین کی زندگی میں تکون کی بہت اہمیت ہے جس کا اہم ترین نقطہ یا زاویہ تو ظاہر ہے کہ وہ خود ہیں اور باقی کے دو زاویے دو عورتیں ہوتی ہیں۔ ایک عورت جو ان کی اہلیہ محترمہ ہیں اس تکون کا دوسرا یعنی مستقل زاویہ ہیں اور دوسری عورت یعنی تکون کا تیسرا زاویہ ایک دوسری عورت ہوتی ہے جو بے چاری آتی جاتی رہتی ہے۔

مجتبیٰ حسین کو دلی میں وارد ہوئے ابھی بیس سال بھی نہیں ہوئے مگر وہ جہاں کے کم و بیش بیس ہزار لوگوں سے متعارف ہیں۔ مجتبیٰ حسین ان سب حضرات کے اسم گرامی سے بھلے ہی واقف نہ ہوں مگر ان تمام حضرات کو ضرور جانتا ہے جو برسر اقتدار ہیں یا رہ چکے ہیں۔ وہ ان سب کو بھی جانتا ہے جو اقتدار کے اتنے قریب ہیں کہ کبھی بھی کچھ بن سکتے ہیں۔ وہ گجرال کمیٹی کے دفتر میں ایک معمولی کارندے کی حیثیت سے داخل ہوا تھا مگر آج کل اندر کمار گجرال صاحب کے ان چند قریبی لوگوں میں سے ہے جن کے لیے یہ شاہ دل پنجابی کچھ بھی کرنے کو ہر وقت تیار رہتا ہے۔

اکثر ادیب بے فکرے مفلوج یعنی بے کار قسم کی چھپکلیاں ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ چونکہ وہ قوم کا سرمایہ ہیں لہٰذا یہ ان کا حق اور بے چاری قوم کا فرض ہے کہ ان کی بقا کے لیے وہ سب کرے ان کے لیے جو نہ ان کے بال بچوں کے لیے بھی مفید اور ضروری ہے۔ مجتبیٰ حسین نے جم کر محنت کی ہے اور اپنی بیگم صاحبہ اور

اپنے بچوں کو قوم کا نہیں ہمیشہ اپنا فرض سمجھا ہے اور ان کو ایسے اہتمام سے پالا پوسا اور بڑا کیا ہے کہ آج یہ بچے کسی بھی ماں باپ کے لیے باعثِ فخر کہے جاسکتے ہیں۔

اس نے عشق کیا ہے اور بدستور کیے جارہا ہے مگر اس کا ملال نہ ان کی اہلیہ محترمہ کو ہے نہ ان کے بچوں کو۔ ہزاروں مسلم گھرانوں میں میرا آنا جانا ہے اور میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے بیگم مجتبیٰ حسین جیسی نیک سیرت معاملہ فہم، متحمل اور بے تعصب عورت کہیں نہیں دیکھی۔ یہ عورت اپنے خاوند کو اپنا پیر و مرشد اور خدا وند سمجھتی ہے اور جانتی ہے کہ کنہیا کی رانیاں چاہے ہزاروں رہی ہوں، رکمنی ایک ہی تھی اور اس اعزاز کی حقدار صرف وہی ہیں۔ مجتبیٰ نے کبھی کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس سے اس بھولی بھالی شریف زادی کا یہ بھرم ٹوٹ جائے۔

اب تک میں نے جو چند لکھا ہے اس کے دو معنی نکل سکتے ہیں۔ ہر تخلیق کو اچھی اور بری نظر سے دیکھا جاسکتا ہے اور دیکھا جاتا بھی ہے۔ کچھ لوگوں کو خوب صورت باتوں میں بھی گندے معنی نکالنے کی عادت ہوتی ہے۔ میرے ان چند الفاظ سے جو تصویر آپ کے ذہن میں ابھرتی ہے وہ ایک اچھے انسان کی تصویر ہے تو میں کہوں گا آپ نے تصویر کو اچھی نظر سے دیکھا ہے یعنی کہ آپ خود بھی اچھے ہیں ورنہ۔ . . . . .

میں نے مجتبیٰ حسین سے عشق کیا ہے مگر میرے جمنا پار یعنی ادھر میور وہار میں منتقل ہوجانے کے بعد اس عشق کے اظہار میں خاصی کمی آگئی ہے۔ ان پچھلے چھ سالوں میں میں نے اسے بہت کم دیکھا ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ دیکھا ہی نہیں ——— - ——— دلی کی ادبی محفلوں میں کبھی کبھار آتے سامنے آجانے کی وجہ سے دو چار سکی باتیں کر لینا ظاہر ہے کہ ملنا نہیں ہوتا۔ اس دوران وہ صرف ایک بار میرے غریب خانے پر آیا ہے۔ نئی دلی کے مصنوعی کلچر نے اُسے جس رنگ میں رنگ دیا ہے وہ ایک بہروپیے کا رنگ ہے آج کل وہ اپنے اصلی رنگ روپ میں دکھائی نہیں دیتا مگر پہلے سے کہیں زیادہ مصروف اور ہر دل عزیز ہوگیا ہے۔ وہ ساری حدیں اب ٹوٹ گئی ہیں جن میں رہ کر وہ مطمئن اور میں سمجھتا ہوں غالباً خوش بھی تھا۔

اس کی باتوں میں تو اور بھی شگفتگی آگئی ہے مگر اس کے چہرے کی تازگی پہلے جیسی نہیں رہی۔ اگر وہ آج بھی شگفتہ اور تر و تازہ بلکہ شاید پہلے سے بھی اچھی زبان لکھتا اور بولتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ الفاظ کی یہ نفاست اس کی وراثت ہے جو اسے غالباً ماں کے دودھ کے ساتھ ملی تھی اور ہم جانتے ہیں کہ ماں کا دودھ آدمی کی رگوں میں تب تک دوڑتا رہتا ہے جب تک کہ وہ اللہ کو پیارا نہیں ہوجاتا۔ آج کل دلی کی کوئی ادبی محفل اس کی شمولیت کے بغیر کامیاب نہیں ہوتی کیوں کہ ہم لوگ ہنسنا ہنسانا بھول گئے ہیں اور اب ہمیں وہی آدمی اچھا لگتا ہے جو ہمارے مرجھائے ہوئے اور جھریوں بھرے چہروں پر مسکراہٹوں کا غازہ مل کر انھیں چند لمحوں کے لیے قبول صورت بنادے۔

مجھے غم صرف اتنا ہے کہ سلیمان اریب کا خاکہ لکھنے والا مجتبیٰ حسین اب اس قسم کے خاکے نہیں لکھتا۔ اب تو وہ صرف زندہ بلکہ عین سامنے یا بالمقابل بیٹھے آدمی کا خاکہ اڑا کر داد وصول کرتا ہے۔ ہنر یہ بھی ہے اور خاصا بڑا ہنر ہے مگر یہ ویسی فن کاری نہیں جو اریب اور کرشن کے خاکوں میں سے جھانکتی تھی۔

فکر تونسوی پر اس نے غالباً تین خاکے لکھے ہیں۔ فکر کو یقین تھا کہ اس کا اصلی خاکہ مجتبیٰ حسین اس کے

اس جہانِ فانی سے کوچ کرنے کے بعد ہی لکھ پائے گا کیوں کہ آدمی نہ رہے تو اس کے بارے میں وہی کہا جاتا ہے جو اچھا اور مناسب ہے۔

ایک خاکہ اس نے میرے تہنیتی ظرف نکالنے کے موقعہ پر بھی لکھا تھا مگر وہ ایک متحرک تصویر تھی۔ میری موت کے بعد وہ جو خاکہ لکھے گا وہ اس کے دل و دماغ کی مشترکہ صلاحیتوں کی پیداوار ہوگا اور ایک ایسا پاکیزہ مزاح ہوگا جو مجھے اس دوسری دنیا میں بھی قہقہہ زن ہونے پر مجبور کر دے۔

کنہیا لال کپور اور فکر تونسوی کے بعد ہندوستان میں اب ان کے پائے کا ایک ہی مزاح نگار ہمارے درمیان ہے۔ سچے اور پاکیزہ مزاح کا کام آپ کو شیشے میں اپنی تمام تر بدصورتی دکھا کر بھی اپنے سے محبت کرنا سکھانا ہے تاکہ آپ زندگی سے بیزار نہ ہوں۔

مجتبیٰ حسین کو مزاح نگاری کے سارے عناصر حفظ ہیں مگر ابھی وہ طنز یعنی مزاحیہ تنقید کے میدان میں پورے طور پر نہیں اترا۔ وہ حکومت وقت کا ایک زر خرید غلام ہے یعنی چند سکوں کے عوض بکا ہوا آدمی مگر جیسے ہی وہ اس چکر ویو سے باہر نکلتا ہے وہ ساری حد بندیاں ٹوٹ جائیں گی جن سے فکر تونسوی آزاد تھے مگر ابھی وہ نہیں ہے۔ احمد آباد کے دنگے فساد کے بارے میں آپ اس کا مقالہ پڑھ جائیے اور مجھے بتائیے کہ ایسے مقالے کس کس نے لکھے ہیں۔

میرا مشورہ ہے کہ وہ ملازمت سے رہائی کے دن گننا چھوڑ دے اور طنز کے وہ سارے تیر اپنے ترکش میں جمع کرے جو خدائے بزرگ و برتر ایک بار مانگنے سے ہی اسے مہیا کر دے گا اور میدانِ کارزار میں اتر آئے۔

مجتبیٰ۔ میرے دلدار! خاکے بھی لکھو اور خاکے اڑاؤ بھی کیوں کہ یہ اب تمہاری پہچان بن گئے ہیں مگر اپنے چاروں طرف دیکھ کر ان حالات کے بھی خاکے اڑاؤ جو ایک نوجوان عورت کو زبردستی ستی بنا دیتے ہیں جو آئے دن ہماری بیٹیوں کو جہیز کے لالچ میں جلاتے رہتے ہیں جو آدمی کو گمراہ کر کے یہی یقین دلاتے رہتے ہیں کہ صرف اسی کا دھرم سچا اور اونچا دھرم ہے اور باقی کے دھرم جھوٹے، جھوٹے اور نکمے ہیں جو غریب کو پاتال کے اندھیروں میں بھٹکاتے رہتے ہیں اور امیروں کے خزانوں میں ہر قسم کے ناواجب ہتھکنڈوں سے اضافے کرتے رہتے ہیں۔

جب تم اس طرح کی چھوٹی بڑی لڑائیوں کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کر لوگے تو تمہارے بیوی بچوں کے سر فخر سے اونچے ہو جائیں گے۔ تمہارے دوست جو واقعی تمہارے دوست ہیں، تمہیں اور بھی زیادہ پیار دیں گے اور میرے اللہ میاں بھی خوش ہوں گے کہ تم نے ان تمام صلاحیتوں کا واجب اور بھرپور استعمال کیا ہے جن سے سنوار کر انھوں نے تمہیں اس میں بھیجا تھا۔

○○

رضا نقوی واہی
(پٹنہ)

مُجتبیٰ حُسین

کچھ مُفتیانِ تنگ نظر کا تھا یہ خیال   طنز و مزاح ' اُردو ادب کا ہے خام مال
یہ بھی کہا گیا کہ' ہے "دو نمبری یہ صنف"   تنقید کا جو زور سے آیا کبھی اُبال
ترچھی نظر سے دیکھ کے اہلِ مزاح کو   شجرے سے' اُن کو شعر و ادب کے' دیا نکال
نقال اور بھانڈ کبھی کہہ دیا گیا   سرکس کے مسخروں سے کبھی دی گئی مثال
لیکن خود اپنے قول کی ترسیل کے لئے   پھلنِ حصار' توڑ کے نقادِ باکمال
"دو نمبری" ہی صنف کی لیتے رہے مدد   طنز و مزاح کو ہی بناتے رہے وہ ڈھال
فرمایا' "نیم وحشی" ہے پیمانۂ غزل   نس بندی کے لئے اُسے لے جاؤ ہسپتال
"تنقید کے وجود کو فرضی" کہا گیا   "معشوق کی کمر" سے اُسے دی گئی مثال

تنقیص کا یہ دور ہوا آخرش تمام
کُٹھ مجتبیٰ کی ٹوٹ گئی بیچ سے کدال

غالب، رشید احمد و پطرس کی نثر نے   کی بند' مُفتیانِ ادب کی یہ قیل و قال
آئی سمجھ میں بات کہ تنقید میں' مٹھاس   گھل جائے تو' ہو طنز حلاوت میں فیرمال
طنز و مزاح کرتا ہے اس کا محاسبہ   جب بھی سماج چھوڑتا ہے راہِ اعتدال
فرما گئے ہیں حضرتِ اکبر بھی کیا ہی خوب   "تھوکیں خلافِ شرع کبھی شیخ"! کیا مجال
"موقع مگر اندھیرے اُجالے میں جب ملے"   "چوکیں وہ تاک جھانک سے"! یہ امر ہے محال

موجودہ دور طنز و ظرافت کا دور ہے
ایک اک سے بڑھ کے آج ہیں طنّازِ باکمال

یوسف، مسیح' لوتر' و کھنہ و موسوی   سندیلوی' خوش نظر و فکرِ خوش مقال
ان سب کے بیچ یوں ہیں کھڑے مجتبیٰ حسین   جیسے ہو بر دکھاوے میں دولھا میاں کا حال
پچیسواں ۲۵ برس' قلم رکھ کے لکھنے کا ہے   عمر آگئی ہے اب کہ ہتھیلی ہو لال لال
زندہ دلانِ شہر' براتی بنے ہیں آج   "شہ بالا" کے لباس میں ہیں مصطفیٰ کمال
بخشا ہے جس نے صنفِ ظرافت کو اعتبار   ہے مجتبیٰ حسین وہ طنّازِ خوش خصال
مضمون جو بھی آئے قلم کی گرفت میں   ابلاغ بے نظیر ہو' ترسیل بے مثال
"جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی"   انشائیہ نگاری میں دکھلا دیا کمال

"پاپوش میں لگادی کرن آفتاب کی" آیا کسی کی خاکہ نگاری کا جب خیال
فنکار کے علاوہ، وہ یاروں کا یار ہے دل اس کا ہے خلوص و محبت سے مالا مال
واحدی کی ہے دعا کہ ظرافت کا یہ سفیر
عمر دراز پائے، فن اس کا ہو لازوال

رؤف رحیم ایم۔اے
حیدرآباد

طنازِ وقت ہے مجتبیٰ حسین

خالص مزاح و طنز کے مینار مجتبیٰ
مضبوط جیسے چین کی دیوار مجتبیٰ

ہر غمزدہ کے مونس و غمخوار مجتبیٰ
مخلص، شریف، صاحبِ کردار مجتبیٰ

صنفِ مزاح و طنز کے معمار مجتبیٰ
زندہ دلوں کے قافلہ سالار مجتبیٰ

ارضِ دکن کو ناز ہے جس باکمال پر
ہیں کیا زمانہ خود کہے سَو بار مجتبیٰ

مخمور ہوگیا ہوں میں پی کر شرابِ طنز
مجھ کو دکھائی دیتے ہیں اب چار مجتبیٰ

حاضر جواب، قہقہہ بردوش، بذلہ سنج
طنازِ وقت، صاحبِ افکار مجتبیٰ

خاکہ نگاری ایسی کہ چمڑی ادھیڑ دیں
ہیں شاخِ گل کہیں، کہیں تلوار مجتبیٰ

آنسو نکل پڑیں وہ ہنسائیں کچھ اس قدر
ہیں کتنے باکمال قلمکار مجتبیٰ

فن کا تمہارے ایک زمانہ ہے معترف
ہم تو ہیں شخصیت کے پرستار مجتبیٰ

کمپیوٹرائزڈ ہوگئے "جاپان" جا کے وہ
"تکیۂ کلام" کرتے ہیں ہر بار مجتبیٰ

"القصہ مختصر" کہ "تکلف ہو برطرف"
ہیں تلخیوں سے برسرِ پیکار مجتبیٰ

ہیں میکشوں کے دوست تو ہیں صوفیوں کے یار
کرتے ہیں سحر سب پہ فسوں کار مجتبیٰ

دردِ الم چھپا کے ہنستے ہیں وہ رحیم
کتنے ہیں عالی ظرف و طرحدار مجتبیٰ

ڈاکٹر شہریار (علی گڑھ)

اُردو اَدب کا سُپرمَین

مجتبیٰ حسین!

کئی سال پہلے کی بات ہے۔ رات کے نو بجے ناصرالدین اسٹاف کلب کے کمرے میں داخل ہوئے ان کے پیچھے ایک اور صاحب تھے ہاتھ میں ہیلمٹ تھا۔ ناصر نے تعارف کرایا کہ یہ مجتبیٰ حسین ہیں۔ اور دہلی سے اسکوٹر پر آپ سے ملنے آئے ہیں۔ میں نے غور سے دیکھا، آنکھوں کے بہت پیچھے سے ایک معصوم لیکن شریر چہرہ دکھائی دیا۔ ہم تینوں مل کر حسن عسکری (جو اس وقت سوشیالوجی کے صدر تھے اور آج کل انگلستان میں ہیں) کی کھوج میں نکل پڑے ... ملے تو ہم چار ہو گئے۔ ہم چاروں گھر آئے۔ میری بیوی نجمہ مجھے اس وقت گھر پر دیکھ کر حیران ہوئیں لیکن باقی لوگوں سے ملیں تو ہمارے ارادوں کو سمجھ گئیں اور اپنے حصے کا کام کرنا شروع کر دیا۔ میں اپنے حصے کی محنت میں لگ گیا۔ تادیر محفل جمی۔ مجتبیٰ اور ناصر واپس چلے گئے۔ مجھ میں پھر ملنے بلکہ بار بار ملنے کی خواہش چھوڑ کر۔

کچھ دنوں بعد کسی کام سے دہلی پہنچا این سی ای آر ٹی کے گیسٹ ہاؤس میں ناصر کا مہمان ہوا۔ میزبان مجتبیٰ ہوئے۔ میں حیدرآبادیوں کا پہلے ہی سے اسیر تھا مجتبیٰ کے خلوص نے ایک گرہ اور بڑھا دی۔ دہلی میں دھیرے دھیرے یہ بات بھی کھلی کہ مجتبیٰ بھی نارنگ صاحب کے قریب ہیں۔ یہ قربت بڑھتے بڑھتے قرابت کی صورت اختیار کر گئی۔ اب میرے اور مجتبیٰ کے بیچ سے ناصر غائب ہو گئے یعنی اب ہمارا عشق نِنھے پیامبر کا محتاج نہ رہا۔ میرے احباب کا حلقہ بہت محدود ہے۔ دہلی میں دو ڈھائی آدمی میرے لیے سب کچھ تھے اور ہیں۔ ان سے ملنے کے بعد میں خود کو مجتبیٰ کے حوالے کر دیتا ہوں اور وہ ہر سفر میں کم سے کم تین نئے آدمیوں سے مجھے ملواتے ہیں۔ ان سے میری خاطر کرواتے اور ان کو میرے شعر بھی سنواتے ہیں ان ملنے والوں میں ادیب شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں۔ اس لیے ان سے میرے تعارف میں پہلے "گمن" اور پھر "امراؤ جان" کی غزلوں کی طرف اشارہ ضرور کرتے ہیں۔

مزاح نگاری کی وجہ سے ان کے مزاج میں مبالغہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ (یا یوں کہیئے کہ مزاج کے مبالغے لے مزاح نگاری کی طرف انھیں لگایا ہے) اس لیے وہ دوستوں کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ یہ پتا نہیں چلتا کہ تعریف کہاں ختم ہوئی اور کھنچائی کہاں شروع ہوئی۔ کچھ لوگوں کی تعریف میں البتہ احتیاط برتتے ہیں۔ میں ان میں سے ایک ہوں۔ اس کے باوجود ان کی صحبت میں ہر آن چوکنا رہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اُردو کا شاید ہی کوئی ادیب ایسا ہو جو دہلی آئے اور مجتبیٰ سے بغیر ملے واپس چلا جائے۔ یعنی انھوں نے ادیبوں کی پولس چوکی

کھول رکھی ہے جہاں آمد اور روانگی دونوں درج ہوتی ہیں۔ مجھے اب عادت سی پڑ گئی ہے۔ پہنچتے ہی اور اب ٹیلی فون کی آسانی کی وجہ سے پہنچنے سے پہلے ان کو اطلاع کر دیتا ہوں اور واپسی سے پہلے اجازت لے لیتا ہوں۔ میں کس سے ملوں گا، کیا کھاؤں گا، کیا پیوں گا، کب تک رہوں گا۔ یہ سب کچھ مجتبیٰ طے کرتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے خود پر غصہ آنے لگتا ہے۔ وہ شخص جو آج تک زن مرید نہیں ہوا مجتبیٰ مرید کیونکر ہو گیا۔

موصوف صرف باتیں نہیں کرتے کام بھی کرتے ہیں۔ یعنی بڑے کام کے آدمی ہیں۔ دہلی بلکہ ہندوستان میں کوئی جائز کام اور ضرورت پڑنے پہ ناجائز کام بھی آپ کو کرانا ہو تو مجتبیٰ سے رجوع کیجیے۔ شرط یہ ہے کہ وہ آپ کو اپنا دوست سمجھتے ہوں۔ وہ اور ان کا اسکوٹر اس وقت تک دم نہیں لیتے جب تک کام مکمل نہ ہو جائے۔ ان کے معمولات کا اندازہ ان کے اس قول سے کیا جا سکتا ہے کہ دن اور رات کہیں بھی گزارو صبح کو اپنے بستر سے اٹھو۔ ان کی بیوی یعنی میری بھابی ان کی اسی ادا پر جان دیتی ہیں۔ کہتی ہیں کہ انھوں نے یہ بات شادی کی پہلی رات کو مجھ سے کہی تھی۔ زبان کے بڑے پکے ہیں آج تک اس بات پر قائم ہیں۔ این سی ای آر ٹی کی کتابوں کو چھپوانے اور ٹھکانے لگانے کے علاوہ ان کا کام دوسروں کے لیے روزی ڈھونڈنا، مکان تلاش کرنا، دوستیاں کرانا، مزدور تنظیموں کو منسٹروں سے ملوانا، الیکشن کے ٹکٹ دلوانا، اخباروں میں لوگوں کے فوٹو اور ان کے کارناموں کی خبریں چھپوانا، کتابوں کی رسم اجراء، پرادیسیوں کے خاکے ہی نہیں لکھنا بلکہ پیسوں کی فراہمی کا انتظام کرنا، پاسپورٹ اور ویزا بنوانا، شوہر اور بیوی کے خراب تعلقات کو درست کرنا اور تعلقات کی خرابی کے قانونی اور کبھی کبھی طبی نکات پر روشنی ڈالنا۔ میں کہاں تک گنواؤں موصوف کا دائرہ عمل۔ بس یوں سمجھ لیجیے اردو میں یہ پہلے اور آخری سپرمین ہیں، خود ان کا کہنا ہے کہ TOO MUCH تک سب جا سکتے ہیں ہم THREE MUCH ہیں اور مرتے دم تک اس پر قائم رہیں گے۔

کبھی کبھی ہم دبی زبان سے بچوں اور بیوی کے حقوق کا ذکر کرتے ہیں لیکن بہت جلد کسی دوسرے اہم حق اور فرض کو یاد کر کے اپنے اوپر گھڑوں پانی ڈال لیتے ہیں۔ ہندوستان کی سیاحت سے تھک جاتے ہیں تو بیرون ملک نکل جاتے ہیں۔ کبھی مشرق کی طرف تو کبھی مغرب کی طرف۔ میں جب فرانس اور انگلستان کے سفر پر جا رہا تھا تو اپنے آشناؤں کے اتنے ڈھیر سارے پتے اور فون نمبر دیے تھے کہ مجھے ہینڈ بیگ کے سامان کو سوٹ کیس میں منتقل کرنا پڑا۔ پردیس میں ان میں سے کئی پتے اور ٹیلیفون نمبر میں نے استعمال کیے اور مجتبیٰ کا قائل ہوا۔ پتا نہیں وہ کون سا خلوص ہے جو مجتبیٰ استعمال کرتے ہیں کہ آدمی ان کا اسیر ہو جاتا ہے، میں نے کئی بار اس کا برانڈ جاننا چاہا لیکن انھوں نے کبھی بتا کر نہیں دیا۔

علی گڑھ میں جب سے ہاشم علی صاحب وائس چانسلر ہو کر آئے مجتبیٰ کی آمد و رفت بڑھ گئی ہے۔ وہ عام طور سے کسی کی سفارش لے کر آتے ہیں۔ ہاشم علی صاحب کے کہنے کے باوجود وہ ٹھہرتے میرے ہی یہاں ہیں۔ علی گڑھ کے کئی بغیر مجھے بتائے ہوئے لوگ میرے حوالے سے ان سے مل چکے ہیں اور ان سے اپنا کام کرا چکے ہیں۔— عابد علی خاں ان کی سب سے بڑی کمزوری ہیں۔ وہ جب دہلی آتے ہیں تو مجتبیٰ کا پروگرام ان کے پروگرام کے تابع ہو جاتا ہے۔ جب تک ہوائی جہاز ایئرپورٹ سے اڑ نہیں جاتا مجتبیٰ اپنے میں واپس نہیں آتے۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کے تمام اراکین پر وہ جان چھڑکتے ہیں۔ اقبال سمینار کے دوران ان لوگوں سے اجتماعی طور پر ملا۔ فرداً فرداً تو پہلے بھی مل چکا تھا۔ واقعی زندہ دل لوگ ہیں۔

حیدرآباد کو اپنے پورے جمال میں مجتبیٰ کے ساتھ ہی دیکھا جا سکتا ہے یہ میرا کئی بار کا تجربہ ہے حیدرآباد کا کوئی قابلِ ذکر شخص ایسا نہیں ہے جو مجتبیٰ کو نہ جانتا ہو۔ دہلی میں حیدرآباد کی سفارت کا کام مجتبیٰ کرتے ہیں۔ آندھرا پردیش گیسٹ ہاؤس کا ایک حکمران کے روزمرہ کے معمول میں ہے۔ حسینی صاحب اور مجتبیٰ جب مخصوص حیدرآبادی لہجے میں حیدرآباد سے آنے اور حیدرآباد کو جانے والے اشخاص کا ذکر کرتے ہیں تو بڑا اچھا لگتا ہے۔

مجتبیٰ میں احتجاجی قوت بے پناہ ہے۔ جو اس قوت کی زد میں آیا رُسوا ہوا۔ وہ ذرا سی بلکہ معمولی سی بات میں ایسی نمک مرچ لگاتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ ان دنوں ان کو ایک غم بہت ستا رہا ہے میں ان کے غم کو کم کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں لیکن یہ مرض بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ میں کہاں کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ کے مصداق عجیب مخمصے میں ہوں۔

مجتبیٰ اردو کے ادیبوں اور شاعروں کی رگ رگ سے واقف ہیں ان کی فطری کمزوریوں کو وہ خوب خوب ہوا دیتے ہیں اور پھر اپنے قلم سے ان کو زندہ جاوید کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے بعض کمزور خاکوں کی طرف جب میں نے اشارہ کیا تو ان کا برجستہ جواب یہ تھا کہ جس ادیب کی کوئی شخصیت نہ ہو، میں اس کا اچھا خاکہ کیوں کر لکھ سکتا ہوں۔ فرمائشی کام تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ میں اور مجتبیٰ کئی بار مرتب زندگی گزارنے کا میلان بنا چکے ہیں۔ لیکن جس طرح ہندوستان کا کوئی پنج سالہ منصوبہ کامیاب نہیں ہوا، ہمارا منصوبہ بھی ناکام رہا ہے۔ شاید ہم لوگوں کی بنیادوں میں کچھ کجی ہے۔ مجتبیٰ میں کئی کمزوریاں ہیں جو ان کی شخصیت کی دلنوازی کی وجہ سے کسی کو نظر نہیں آتیں یہ لوگوں کا کہنا ہے۔ مجھ میں ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ میں کسی دوست کی کمزوری کو دیکھ ہی نہیں سکتا۔ بلکہ کمزوری کو اس کی طاقت تصوّر کرتا ہوں اور اس بات پر لڑ جاتا ہوں۔ مجتبیٰ سے ایسی لڑائیاں کئی بار ہو چکی ہیں۔

چند سالوں پہلے مجتبیٰ کے تعارف میں ان کے بڑے بھائی ابراہیم جلیس کا ذکر ضرور شامل ہوتا تھا لیکن دھیرے دھیرے مجتبیٰ نے ادبی میدان میں ایک ایسا مقام بنا لیا ہے کہ خود مکتفی ہو گئے ہیں۔ یہ ایک بڑی بات ہے۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ مجتبیٰ میرے بہت قریبی دوست ہیں۔ خدا اُن کو اور بھی بلندیوں تک لے جائے۔ سلور جبلی کے بعد ان کی گولڈن جبلی ہو۔ ☐☐

اکثر لائبریریوں میں یہ عبارت درج ہوتی ہے "براہ کرم خاموشی سے مطالعہ کیجئے" لیکن سونے والے ناظرین کے آرام کی خاطر میرا جی اس عبارت میں ترمیم کر کے یوں لکھنے کو چاہتا ہے "براہ کرم خاموشی سے مطالعہ کیجئے ورنہ ناظرین کی نیند میں خلل پڑے گا"

مجتبیٰ حسین۔ لائبریری میں چند گھنٹے "تکلف برطرف"

حیدرآباد میں ابھی تک ایسے جہلا اور غیر مہذب انسانوں کی اکثریت ہے جو رات کو صرف سونے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور دن کو کام کرنے کے استعمال میں لاتے ہیں۔ ابھی اہلِ حیدرآباد نے دُنیا کے دیگر شہروں کے باشندوں کی طرح اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ وہ دن میں سو جائیں اور رات بھر الّو کی طرح جاگتے رہیں۔ اس معاملے میں الّوؤں اور اہلِ حیدرآباد کے ڈانڈے کبھی نہیں ملتے۔

مجتبیٰ حسین۔ حیدرآباد بائی نائٹ۔ "تکلف برطرف"

پرویز یداللہ مہدی
(بمبئی)

فیملی مزاح نگار

پچھلے پچیس برسوں میں اُردو کے "طنزیہ و مزاحیہ" ادب نے زیادہ ترقی کی یا مجتبیٰ حسین نے، اس بات کا فیصلہ صرف نقاد حضرات ہی کر سکتے ہیں، البتہ ادب کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے میں پورے وثوق کے ساتھ اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ان پچیس برسوں میں مجتبیٰ حسین اور طنز و مزاح ایک دوسرے کے لئے اس قدر لازم و ملزوم ہو گئے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنا ویسی ہی حماقت آمیز کوشش ہوگی جیسی کہ پچھلے کچھ عرصے سے بعض متعصب اور فرقہ پرست مورخین تاج محل کو شاہجہاں کے بجائے کسی اور راجہ کا کارنامہ بتا کر تاریخ کے طالب علموں کو گمراہ کرنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ یوں تو ملک کے ہر گوشے کے اُردو داں عوام مجتبیٰ کے مضامین سُننے کے لئے گوش برآواز رہتے ہیں لیکن حیدرآباد کے اُردو داں طبقے کی مجتبیٰ سے محبت یقیناً سب سے جداگانہ ہے بلکہ بیشتر حیدرآبادی خاندانوں میں فیملی ڈاکٹر اور فیملی دھوبی کی طرح مجتبیٰ حسین کو "فیملی مزاح نگار" کی حیثیت حاصل ہے چنانچہ جس اجلاس، جس محفل میں مجتبیٰ مدعو ہوتے ہیں، ان کے مداح انہیں سُننے کے لئے معہ اہل و عیال کے تشریف لاتے ہیں۔ اگر آپ اسے مبالغہ نہ سمجھیں تو عرض کروں کہ میں نے اپنی چشم گنہ گار سے بعض ادب نواز حیدرآبادیوں کو اس قدر شوق اور اہتمام کے ساتھ معہ فیملی کے یا تو چوتھی ولیمے کی دعوتوں میں جاتے دیکھا ہے یا پھر مجتبیٰ حسین کو سُننے کے لئے ادبی محفلوں میں آتے دیکھا ہے۔ ظرافت کو چوتھی، ولیمے کی پر تکلف ضیافت کا نعم البدل بنا دینا، بخدا ظرافت نہیں کرامت ہے اور اس کرامت کا کریڈٹ بلا شرکت غیرے مجتبیٰ کی ظرافت کو جاتا ہے۔ دراصل پچھلی ربع صدی میں مجتبیٰ نے اُردو والوں میں اس قدر قہقہے بانٹے ہیں کہ اب ان کی ظرافت، قہقہوں کی ضمانت بن گئی ہے۔

مجتبیٰ کی بے پناہ مقبولیت اور شہرت میں ان کی منفرد ظرافت کے علاوہ "سیاست" کا بھی بڑا ہاتھ ہے، سیاست سے میری مراد "عملی سیاست" نہیں، روزنامہ "سیاست" سے ہے، اسی اخبار نے انہیں بحیثیت مزاحیہ کالم نگار کے پہلا "بریک" دیا۔ جس کا مجتبیٰ نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور دیکھتے ہی دیکھتے حیدرآباد کے ادبی ماحول میں اخبار "سیاست" ہی کی طرح ہاتھوں ہاتھ لئے جانے لگے۔ اس سلسلے میں بعض معتبر راویوں کا بیان ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں، خود مجتبیٰ حسین کا "سرکولیشن" روزنامہ "سیاست" کے سرکولیشن سے آگے بڑھ گیا۔ میں نے جس وقت مجتبیٰ حسین کو پہلے پہل دیکھا تھا، یہ حیدرآباد کی بلدی حدود میں تو کافی "سرکولیٹ" (Circulate) ہو چکے تھے، لیکن ملک کے دیگر شہروں میں ابھی ان کے "سرکولیشن"

کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ کوئی بیس سال اُدھر کی بات ہے "سُر سنگار سمسد" کے زیرِ اہتمام منعقدہ "شبِ قہقہہ" پروگرام میں شرکت کی غرض سے مجتبیٰ غالباً پہلی بار بمبئی تشریف لائے تھے، تب تک چونکہ مجھے بھی لکھنے لکھانے کا چسکہ لگ چکا تھا، اس لئے نئی نسل کے بیشتر شاعروں اور ادیبوں سے ان کی تخلیقات کے ذریعہ غائبانہ طور پر واقف ہو چکا تھا۔ اس اعتبار سے مجتبیٰ کا نام میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ چنانچہ مذکورہ پروگرام میں محض مجتبیٰ کو دیکھنے اور سننے کی لگن ہی مجھے کشاں کشاں کھینچ کر لے گئی۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ البتہ سامعین میں ادب کے شائقین کم اور قوالی کے شوقین زیادہ نظر آ رہے تھے کیونکہ اسٹیج پر مزاح نگاروں کے جھرمٹ میں بمبئی کی مشہور خاتون قوالہ براجمان تھیں جن کی قوالیوں نے از بمبئی و دلّی تا حدِ بھوپال بھونچال مچا رکھا تھا، موصوفہ اس ٹھسّے سے شہ نشین پر جلوہ افروز تھیں کہ لگتا تھا جیسے سارا "سُر سنگار سمسد" ان کی "ذات قوالہ صفات" میں سمٹ گیا ہے۔ موصوفہ کا اندازِ نشست و برخاست اس قدر پیشہ ورانہ تھا کہ اسٹیج پر موجود تمام مزاح نگار اپنی اپنی ذات میں سمٹ گئے تھے جس کی وجہ سے ان بے چاروں پر خواہ مخواہ موصوفہ کے "سازندوں و کارندوں" کا گمان ہو رہا تھا۔ موصوفہ چونکہ پروگرام ہٰذا کی کنوینر تھیں۔ اس لئے ہر مزاح نگار کے تعارف کے دوران الفاظ سے کم اور حرکات و سکنات سے زیادہ کام لیتی رہیں بلکہ موقع بے موقع "تالی" بجا کر اپنے موروثی پیشے کی پبلسٹی بھی فرماتی رہیں۔ سامعین کی بڑی تعداد چونکہ قوالہ کے مداحوں کی تھی اسی لئے مزاح نگاروں کو اسی طرح برداشت کرتی رہی جس طرح کہ فلم کے شائقین اصل فلم سے پہلے، فلم ڈیویژن کی "ڈاکومنٹری" کو برداشت کرتے ہیں، لیکن جب مجتبیٰ حسین کی باری آئی تو نقشہ ہی اُلٹ گیا۔ مجتبیٰ نے اپنی گمبھیر آواز کے اتار چڑھاؤ اور مضمون کی ہر سطر سے چھوٹتی مزاح کی پھلجھڑیوں سے ایسا سماں باندھا کہ سُننے والوں کو اصل فلم کا مزہ آ گیا ۔۔ اُس روز مجھے پہلی بار یہ علم ہوا کہ حاصلِ مشاعرہ کلام کی طرح حاصلِ محفل مضامین بھی ہوا کرتے ہیں، اُس سے پہلے میں نے صرف شاعروں کو مشاعرے اور محفلیں لوٹتے دیکھا تھا لیکن مجتبیٰ حسین پہلے ادیب تھے جنھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ "لوٹ مار" کے معاملے میں نثر نگار بھی شاعر سے کم نہیں ہوتا۔ پروگرام کے اختتام پر سامعین کی بڑی تعداد نے مجتبیٰ کو گھیر لیا، اور مشہور زمانہ قوالہ دور بیٹھی زمانے کے "اُتار چڑھاؤ" یعنی اپنے "اُتار" اور مجتبیٰ حسین کے "چڑھاؤ" کو دیکھتی رہیں، جس قوالہ کو بڑے بڑے "کفن پھاڑ" قوال نہیں ہرا سکے تھے اُسے ایک دُبلے پتلے، سانولے، مزاح نگار نے شکستِ فاش دے دی۔ راویوں کا بیان ہے کہ بعد میں خاتون قوالہ نے مجتبیٰ حسین سے اپنی شکست کا بھرپور انتقام یوں لیا کہ ان کی زوردار ضیافت کی اور رات بھر اپنی قوالیوں سے انھیں اس قدر "فیض یاب" کیا کہ بعد ازاں مجتبیٰ کافی عرصے تک قوالی بلکہ صرف "تالی" کی آواز سے بھی بدکنے لگے۔ اُس روز مجتبیٰ کی کامیابی پر مجھے جتنی خوشی ہوئی ان کی صحت دیکھ کر اتنی ہی تشویش بھی ہوئی، اُس زمانے میں ان کی صحت اور مزاح نگاری میں بلا کا تضاد تھا، ان کا مضمون "جہاں" جامِ صحت سے بھرپور ساغر" تھا ان کا جثہ اسی قدر "لاغر" تھا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ حیدرآباد سے دہلی کو منتقلی کے بعد، ان کی صحت بھی، ان کی مزاح نگاری کی ٹکر کی ہو گئی ہے بلکہ اب تو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان کی صحت زیادہ زوردار ہے یا مزاح نگاری ۔۔ !

ابتدا میں مجتبیٰ کے حیدرآباد چھوڑ کر دہلی آباد کرنے کے اقدام پر یار لوگوں نے کافی نکتہ چینیاں کیں کیونکہ اس سلسلے میں عام خیال یہ تھا کہ محض عہدے میں ترقی اور تنخواہ میں تھوڑے سے اضافہ کے لالچ میں مجتبیٰ نے برسوں کے یارانے کی پرواہ کئے بغیر، دکن اور یارانِ دکن کو خیرباد کہا ہے لیکن جلد ہی مجتبیٰ کے بہی خواہوں کی زبانی اصل عقدہ کھل گیا کہ مجتبیٰ محض اس لئے دہلی "شفٹ" ہوئے ہیں کہ وہ ذرا پھیلنا چاہتے تھے۔ مجتبیٰ کے دہلی منتقل ہونے کی وجہ اگر

واقعی یہی ہے تو پھر وہ "بیداد" کے نہیں "داد" کے مستحق ہیں، کیونکہ پھیلنے کے لئے دہلی سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔ آدمی دہلی میں بیٹھ کر سارے ہندوستان میں "متعدی وبا" کی طرح پھیل سکتا ہے۔ مجتبیٰ چونکہ "پھیلنے" کے گُر سے کما حقہٗ واقف ہیں، اس لئے چند ہی برسوں میں انھیں اپنے پھیلاؤ کے آگے دہلی بھی سکڑتی نظر آنے لگی بلکہ ملکی حدود بھی تنگ نظر آنے لگے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ "غیرملکیوں" کو اپنے پھیلاؤ میں سمیٹنے لگے، چنانچہ جاپان، یورپ اور امریکہ کے عالیہ دورے مجتبیٰ کے "بین الاقوامی پھیلاؤ" کا کھلا ثبوت ہیں۔ مجتبیٰ حسین کے ان غیرملکی 'دوروں' کی نوعیت چاہے سرکاری رہی ہو، کاروباری رہی ہو یا اشتہاری، لیکن سرزمینِ غیر' میں بھی وہ، مزاحیہ ادب کی تشہیر، ترویج و تبلیغ سے غافل نہیں رہے، اس اعتبار سے مجتبیٰ کو اگر "عالمی مزاح نگار" کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا۔

مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ اس "عالمی مزاح نگار" کے شانہ بہ شانہ کُل ہند سطح کے ادبی اجلاسوں اور محفلوں میں شرکت کرنے کے باوجود ایک عرصہ تک اس محرومی کا شدید احساس رہا کہ میں نے مجتبیٰ کو بہت دیکھا اور نہیں دیکھا، کئی بار سنا اور نہیں سنا، سینکڑوں مرتبہ ملا اور نہیں ملا۔ نہیں دیکھا اس لئے کہ انھیں ہمیشہ بھیڑ میں دیکھا، نہیں سنا اس لئے کہ ہمیشہ کُل ہند قسم کے ادبی اجلاسوں میں سنا، نہیں ملا اس لئے کہ ہماری ملاقات ہمیشہ ہنگامی رہی کہ ہنگاموں میں ہوتی رہی، یہ بات نہیں ہے کہ ہمیں ایک ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کے مواقع نہیں ملے، بارہا ایسے مواقع میسر آئے لیکن ہمارا اُٹھنا بیٹھنا، اکثر اس ترتیب کے ساتھ رہا کہ میں بیٹھتا تو وہ اُٹھ جاتے اور وہ بیٹھتے تو میں اُٹھ جاتا۔ شائد یہ تشنگی یوں ہی برقرار رہتی، اگر پچھلے دنوں ہمارے مابین ویسی ملاقات نہ ہوئی ہوتی جو ایک دوسرے کو سمجھنے اور پرکھنے کے لئے ضروری ہوتی ہے اور اتفاق سے یہ یادگار ملاقات نہ تو حیدرآباد میں ہوئی اور نہ دہلی میں بلکہ شہر نگاراں بمبئی میں ہوئی اور وہ بھی اس طرح اچانک کہ جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے۔

شام کا وقت تھا، میں اپنے ایک دوست کے ہمراہ باندرہ کورٹ کے پاس والی جھیل کے کنارے بیٹھا گپیں لڑا رہا تھا کہ بی۔ ای۔ ایس۔ ٹی کی ایک بس ہمارے روبرو آکر رکی، میرے ساتھی کی نظر جیسے ہی بس میں بیٹھے ہوئے مسافروں پر پڑی، اس نے اچانک مجھے مخاطب کیا۔ "پرویز بھائی! ذرا اس شخص کی طرف دیکھئے، بالکل مجتبیٰ حسین کی "ٹرو کاپی" ہے" اس اچانک انکشاف پر میں نے سوچتے ہوئے بس کی طرف دیکھا کہ مجتبیٰ حسین یہاں کہاں، وہ اس وقت یا تو دہلی میں کسی کافی ہاوز میں بیٹھے کسی کے ساتھ گپیں ہانک رہے ہوں گے یا پھر کسی شناسا کو معہ فیملی کے ٹرین میں سوار کرا کے دہلی سے رخصت کر رہے ہوں گے۔ لیکن جیسے ہی میری نظر اس مسافر پر پڑی، میری سوچوں کو زبردست جھٹکا لگا۔ واقعی وہ شخص مجتبیٰ کی ٹرو کاپی تھا۔ نظریں ملتے ہی ٹرو کاپی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھِل اٹھی، میرے ساتھی نے حیرت سے کہا۔ "کمال ہے، مسکراہٹ تک مجتبیٰ حسین کی مسکراہٹ کی ٹرو کاپی"۔

اُدھر ٹرو کاپی نے صرف مسکراہٹ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس بار میرا نام لے کر پکارا۔ اِدھر میرے ساتھی کی حیرت قابل دید تھی۔ چنانچہ، انگریزی اور اُردو کو آپس میں گڈ مڈ کرتا ہوا بولا۔ "دِس از ٹو مچ (This is to much) آواز تک مجتبیٰ حسین کی ٹرو کاپی۔"

اس سے پہلے کہ جواب میں، میں کچھ کہتا، ٹرو کاپی نے اپنی سیٹ سے دروازے کی طرف چھلانگ لگائی، اور پھر اگلی چھلانگ نے بس سے باہر سیدھے فٹ پاتھ پر لے آئی۔ فٹ پاتھ پر لینڈ کرتے ہی مجتبیٰ کی ٹرو کاپی نے مسرت آمیز

لہجے میں فرمایا۔ "کیا حسین اتفاق ہے، یوسف ناظم صاحب کی رائے سے اتفاق نہ کرتے ہوئے آٹورکشا کے بجائے میرا بس پکڑنا اور بس کا اتفاق سے اس روٹ کی طرف آنکلنا، اور اسی وقت اتفاق سے تمہارا یہاں موجود ہونا اور یوں اتفاق سے ہماری آپس میں مڈبھیڑ ہونا، ایسے اتفاقات بڑے اتفاق سے ہوتے ہیں۔"

ٹرو کاپی نے ایک ہی سانس میں اتنے اتفاقات کے حوالے دیئے کہ بالآخر مجھے یہ اتفاق کرنا پڑا کہ جسے میں اور میرا ساتھی محض ٹرو کاپی سمجھ رہے تھے، اتفاق سے وہی اصلی مجتبیٰ حسین ہیں۔ اور بمبئی میں ان کے اس اچانک نزول کا سبب چکلس کے پروگرام میں شرکت کی علت کا نتیجہ تھا۔ اگرچہ کہ اس وقت وہ عزیز قیسی صاحب کے ہاں ڈنر پر ہاتھ صاف کرنے جارہے تھے لیکن، ہمیں زبردستی قریبی ہوٹل میں لے گئے اور ہماری ضیافت کرنے پر مصر ہوگئے۔ مجتبیٰ کے اصرار پر میں نے اندازہ لگایا کہ یقیناً یہ حسب معمول چکلس کا اجلاس لوٹ چکے ہیں اور "لوٹ کا مال" معاوضے کی رقم کی شکل میں ان کی جیب میں پہنچ چکا ہے۔ چنانچہ میں نے ان کے مسلسل اصرار پر ازراہ مذاق کہا۔ "لگتا ہے مضمون پڑھنے کا معاوضہ ملتے ہی تم زکوٰۃ کی رقم فوراً نکال دیتے ہو — ؟"

مجتبیٰ نے گمبھیر لہجے میں کہا "اُردو والوں پر زکوٰۃ کا اطلاق ہی کہاں ہوتا ہے۔ اوّل تو اُردو کے ادیبوں وشاعروں کو معاوضہ ہی نہیں ملتا اور اگر کسی خوش نصیب کو بھولے بھٹکے ملتا بھی ہے تو اس قدر قلیل ہوتا ہے کہ معاوضہ بجائے خود زکوٰۃ معلوم ہوتا ہے۔ البتہ ہندی والے بڑا معقول معاوضہ دیتے ہیں جو میرے حساب سے زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہوتا ہے، اس لئے تم بے فکر ہوکر جو چاہو منگواؤ۔ یوں بھی ایک مزاح نگار دوسرے مزاح نگار کو زکوٰۃ نہیں "خراج" دیتا ہے۔"

افسوس کہ مجتبیٰ اسوقت مجھے بھرپور "خراج" پیش کرنے کے موڈ میں تھے اور میں کچھ دیر قبل "چرندم خورندم" کے بہانے کافی کولا، پیلا اپنے پیٹ میں جھونک چکا تھا لہٰذا موصوف کے اصرار پر صرف ٹھنڈے مشروب پہ اکتفا کرنا پڑا، اور یوں مجتبیٰ سے صرف پانچ روپے بارہ آنے ہی بطور خراج کے خرچ کرواسکا۔ مجتبیٰ چونکہ جلدی میں تھے اسی لئے یہ محفل تھوڑی ہی دیر میں برخواست ہوگئی، البتہ وداع لینے سے پہلے مجتبیٰ نے مجھ سے پوچھا۔ "ویسے تمہاری کل کی مصروفیات کیا ہیں ؟"

اس استفسار پر میں سمجھ گیا کہ ابھی ابھی موصوف نے جو خراج میری خدمت میں پیش کیا تھا، اس کے جواب میں کل ہی مجھ سے "خراج" وصول کرنا چاہتے ہیں۔ میرے لئے سوائے ہتھیار ڈال دینے کے کوئی چارہ نہیں تھا، چنانچہ عرض کیا۔ "اب تم آگئے ہو اس لئے کل کی تمام مصروفیات بہ یک جنبش قلم منسوخ — !"

مجتبیٰ نے مسکراکر کہا۔ "ٹھیک ہے، کل ذرا جی بھر کر ملیں گے، باتیں کریں گے۔"

میں نے فوراً ہاں میں ہاں ملائی۔ "بالکل باتیں بھی کریں گے اور بمبئی کی سیر بھی کریں گے، گیٹ وے آف انڈیا، چوپاٹی، نریمان پوائنٹ، جوہو بیچ . . ."

مجتبیٰ نے فوراً میری بات کاٹ دی۔ بولے "اتنے سارے تفریحی مقامات کی سیر کرنے کے لئے تو کافی وقت چاہیئے اور میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے، کل رات کی ٹرین سے مجھے واپس جانا ہے، ایسا کرتے ہیں، باقر مہدی کے پاس چلتے ہیں۔"

میں نے حیرت سے کہا۔ "ان تفریحی مقامات کا باقر صاحب سے کیا تعلق — ؟"

مجتبیٰ نے کہا "بڑا گہرا تعلق ہے، تم شاید نہیں جانتے، میں جب بھی بمبئی آتا ہوں اور تنگیٔ وقت کے باعث، ان

تمام تفریحی مقامات کی سیر پورا نہ لئے ناممکن ہوتی ہے تو تب میں باقر مہدی سے مل لیتا ہوں۔ باقر صاحب سے مل لینے کے بعد مجھے یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ بمبئی میں، میں نے کچھ نہیں دیکھا بلکہ ایسا لگتا ہے جیسے جی بھر کے بمبئی کی سیر کرلی۔"

مجتبیٰ کے اس عجیب و غریب انکشاف پر میں نے حیرت سے سوچا کہ باقر مہدی جو ایک بے رحم نقاد، منھ پھٹ پن کی حد تک صاف گو دانشور، اور کسی کو خاطر میں نہ لانے والے جدید شاعر کی حیثیت سے ساری اُردو دنیا میں بدنام ہیں۔ ان کی شخصیت میں پوشیدہ تفریحی مقامات تک صرف ایک مزاح نگار ہی کی نگاہ جاسکتی ہے، اگرچہ کہ ان دنوں باقر صاحب کی کج رو شخصیت میں وہ طنطنہ نہیں رہا، دانت نکلوانے کے بعد سے ان کی نوکیلی گفتگو میں وہ چبھن وہ کاٹ باقی نہیں رہی ہے۔ تاہم شیر چاہے لاکھ بوڑھا ہوجائے شیر ہی رہتا ہے اور مجتبیٰ نے شیر سے ملنے کے لئے اسی کے کچھار میں جانے کا پروگرام بنایا تھا ——!

اگلے روز میں نے حسب پروگرام یوسف ناظم صاحب کے دولت کدے سے مجتبیٰ حسین کو ساتھ لیا اور پھر بذریعہ بس ہم دونوں بائیکلہ برج پہنچے۔ البتہ وہاں پہنچنے کے بعد یہ بھید کھلا کہ مجتبیٰ اب تک اس مغالطے میں تھے کہ میں باقر مہدی کی جائے رہائش سے اچھی طرح واقف ہوں جبکہ میں اس خیال میں تھا کہ مجتبیٰ کو باقر صاحب کے گھر کا مکمل پتہ معلوم ہے لیکن صورتحال اس کے برعکس تھی۔ اگرچیکہ اس سے قبل مجتبیٰ دو ایک مرتبہ باقر صاحب کے گھر جاچکے تھے لیکن فی الحال انہیں پتہ یاد نہیں تھا، اور مجھے باقر صاحب کے گھر کے پتے سے سرسری واقفیت ضرور تھی مگر کبھی ان کے ہاں جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ البتہ اتنا علم ضرور تھا کہ وہ بائیکلہ پولیس اسٹیشن کے اغل بغل ہی میں کہیں رہتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے پولیس اسٹیشن سے اپنی مہم کا آغاز کیا لیکن کافی دیر اور دور تک بھٹکنے کے باوجود جب باقر صاحب کا سراغ نہ مل سکا تو مجتبیٰ نے مزید آگے بڑھنے سے انکار کرتے ہوئے فکر اندیشہ کا اظہار کیا کہ لگتا ہے ہم غلط سمت میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ چنانچہ میں نے ایک پنواڑی سے پوچھا۔ "بھیا یہ راستہ آگے کہاں جاتا ہے؟"

پنواڑی نے بڑے ہی پُراسرار لہجے میں جواب دیا۔ "ناریل واڑی کے قبرستان۔"

ہم دونوں نے گھگھیائی ہوئی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ مجتبیٰ آنکھوں ہی آنکھوں میں کہنے لگے۔ "تمہارا ارادہ اگر بڑھنے کا ہے تو پھر بسم اللہ۔ فی الحال میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا، ابھی میرے بہت سے کام ادھورے ہیں۔ ابھی تو میں نے صرف جاپان کا دورہ کیا ہے۔ یوروپ اور امریکہ دیکھنا ابھی باقی ہے۔ قبرستان کا نمبر تو بہت بعد میں آئے گا۔"

اس طرح مجتبیٰ نے، اپنے امکانی "بین الاقوامی دوروں" کی تفصیل سے مجھے بہ زبان خامشی آگاہ کیا، اور واپسی کے لئے پلٹے، لیکن چند قدم کا فاصلہ طئے کر کے پھر رُک گئے۔ اب کے ان کی آنکھوں میں مایوسی کی جگہ اُمید کے دیئے جھلملا رہے تھے۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ "کبھی کبھی اُمید کی کرن قبرستان کے اندھیروں کا سینہ چاک کر کے بھی نکل آتی ہے، اب میرا یقین اور بھی پختہ ہوگیا ہے کہ باقر مہدی یقیناً اسی محلے میں رہتے ہیں کیونکہ پولیس اسٹیشن اور قبرستان دونوں ایسی واضح نشانیاں ہیں جن کے آس پاس رہنے کو اُردو کا ہر جدید شاعر، ہر جدید نقاد ترجیح دیگا اب ذرا ان کے گھر کی گلی کا نام یاد کرنے کی کوشش کرو۔" چنانچہ اب ہم اپنے اپنے ذہن پر زور دینے لگے۔ مجتبیٰ نے اچانک بچوں کی طرح خوش ہوکر کہا۔ "یاد آگیا۔ باقر صاحب جس گلی میں رہتے ہیں، اُس کا نام ہے "لولین" (LOVE LANE)"

گلی کے نام کا معمہ تو حل ہو چکا تھا، اب صرف اس کے صحیح محل وقوع کا مرحلہ باقی تھا" جسے حل کرنے کے لئے میں نے ایک اور پنواڑی سے رجوع کرنا چاہا تو مجتبیٰ نے ٹوک دیا۔ "ٹھہرو۔ جلد بازی سے کام مت لو، معاملہ کسی ایرے غیرے گلی کا نہیں لولین (Love Lane) کا ہے، کسی معقول آدمی سے پوچھنا مناسب ہوگا۔" اس تاکید کے ساتھ کسی معقول آدمی کی تلاش میں خود ہی اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگے۔ بالآخر، تھوڑے ہی فاصلے پر انہیں اپنا مطلوبہ معقول آدمی، ایک معقول سے "ہیئر کٹنگ سیلون" کے بالکل باہر، نہایت ہی معقول انداز میں اسٹول پر بیٹھا کوئی معقول سا اخبار پڑھتا ہوا دکھائی دیا۔ ہم دونوں لپک کر اس کے پاس پہنچے، اور مجتبیٰ نے اس سے نہایت معقول انداز میں اپنے گوہر مقصود کی بابت دریافت کیا۔ "بھائی صاحب، کیا آپ بتا سکتے ہیں یہاں لولین (Love Lane) کدھر ہے؟"

جواب میں اس معقول آدمی نے اخبار پر سے نظریں ہٹا کر پہلے ہم دونوں کا سر سے پیر تک جائزہ لیا، پھر دو چار مرتبہ منہ ہی منہ میں لولین کی گردان کی، پھر ایک طویل ترین آہ سرد کھینچ کر بولا۔ "افسوس برادر۔! آپ ایک ایسی چیز ڈھونڈ رہے ہیں، جو اب عنقا ہو چکی ہے، 'Love' محبت، پیار، یہ سب مدت ہوئی دنیا سے اُٹھ چکے ہیں۔ اب یہ الفاظ صرف ڈکشنری میں پائے جاتے ہیں...."

اس سے پہلے کہ اس معقول آدمی کا معقول فلسفہ، ہماری معقولیت کے جامے کے ساتھ کوئی "نامعقول" سلوک کرتا ہم نے معقول کام یہ کیا کہ چپ چاپ وہاں سے کھسک گئے۔

مجتبیٰ نے سگریٹ سلگاتے ہوئے بڑے ہی گمبھیر لہجے میں کہا۔ "پتہ نہیں کیوں، مجھے باقر صاحب کی گلی کا نام ہمیشہ سے کھٹکتا رہا ہے، یہ نام دراصل باقر مہدی کے مزاج سے کسی طور میل نہیں کھاتا، باقر مہدی ان لوگوں میں سے ہیں جو ناداں کی دوستی پر داناں کی دشمنی کو ترجیح دیتے ہیں، ریاکاری اور خود غرضی سے ملوث محبت کے مقابلے میں خالص نفرت کے قائل ہیں۔ ہوسکتا ہے اپنی اسی افتادِ طبع سے مجبور ہو کر، باقر صاحب نے اپنی گلی کا نام لولین (Love Lane) سے بدل کر کوچۂ عداوت، نفرت گلی یا دشمن لین رکھ لیا ہو۔"

مجتبیٰ کے اس انوکھے تجزیے نے نہ صرف "ادب کے مطالعے" ۔ بحث کا ایک نیا باب کھول دیا بلکہ باقر مہدی کے گھر تک سیدھے پہنچنے کا ایک نیا "شارٹ کٹ" بھی ڈھونڈ نکالا، چنانچہ تبدیلیٔ پتہ کی اس نئی روشنی میں ہم بہ آسانی شیر کے کچھار میں پہونچ گئے۔ شیر اس وقت قیلولہ کی تیاری کر رہا تھا لیکن ہمیں دیکھتے ہی، قیلولہ کے پروگرام کو ملتوی کر کے ایک زوردار قہقہے کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔

شیر کے چاروں طرف اس کی غذا کتابوں کی شکل میں پھیلی ہوئی تھی، چنانچہ تھوڑی سی غذا کو ایک طرف ہٹا کر ہم دونوں کے لئے جگہ بنائی، پھر بڑی ہی سنجیدگی سے فرمایا۔ "بڑے اچھے موقع پر آئے ہو مجتبیٰ، میں کل رات سے تمہیں یاد کر رہا تھا۔!"

باقر صاحب کا یہ غیر متوقع اعتراف ظاہر ہے چونکانے والا تھا لیکن اگلے ہی پل موصوف کے مخصوص قہقہے نے تحیر کی اسی وقتی فضاء کو تہس نہس کر دیا، جو لوگ باقر مہدی سے بخوبی واقف ہیں وہ ان کے قہقہوں کے مفہوم و مطلب کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اصل میں باقر صاحب کو جب اپنی ہی کسی بات کی نفی کرنا ہوتا ہے تو اس کے پیچھے ایک عدد قہقہہ چھوڑ دیتے ہیں، گویا ان کے قہقہے محض قہقہے نہیں ہوتے بلکہ "کوڈ ورڈس" میں چھپے ہوئے پیغام ہوتے

ہیں۔ چنانچہ اپنے پہلے ہی جملے کا کھٹورہ قہقہہ نقل کرنے کے بعد آگے فرمایا۔ "کل رات اتفاق سے میرے ٹرانسسٹر کی سوئی ریڈیو ایران پر اٹک گئی جس کے نتیجے میں مجبوراً ریڈیو ایران کو بھگتنا پڑا، اس وقت کوئی صاحب مزاحیہ مضمون پڑھ رہے تھے، آواز کچھ جانی پہچانی سی لگی، چنانچہ کل رات سے تمہارے آنے تک یہی سوچتا رہا کہ وہ آواز کس کی ہوسکتی ہے، اور اب تم نے آکر یہ گتھی سلجھادی، یار تمہاری پہنچ تو ریڈیو ایران تک ہوگئی اور ہاں! اتنی اچھی فارسی کہاں سے سیکھ لی تم نے؟"

اس عجیب وغریب انکشاف پر مجتبیٰ ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ انہیں اس بات پر خوش ہونا چاہیئے یا شرمندہ کہ ایک بار پھر باقر صاحب کے حلق سے قہقہہ کا فوارہ اُبل پڑا۔ جسے میں نے فوراً "ڈی کوڈ" (De code) کیا تو حاصل جواب یہ آیا کہ نہ تو باقر صاحب نے ریڈیو ایران سنا، نہ مجتبیٰ مضمون پڑھ رہے تھے اور نہ مجتبیٰ کو فارسی آتی ہے۔ نفی کی اس دھواں دھار یلغار پر مجتبیٰ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ہتھے سے اکھڑ چکا ہوتا لیکن مجتبیٰ بدستور ہتھے سے جمے رہے بلکہ جواباً شیر کے منھ سے نوالہ کھینچنے کی کوشش کرتے ہوئے فرمایا۔

"باقر بھائی، میں آپ کی سماعت کی داد دیتا ہوں، وہ یقیناً میری ہی آواز تھی، البتہ جسے آپ ریڈیو ایران سمجھ رہے ہیں وہ اصل میں ریڈیو جاپان تھا، پچھلے دنوں جب میں جاپان کے دورے پر گیا تھا تو تب ان لوگوں نے میرے کچھ مضامین ریکارڈ کرلئے تھے، جنھیں اب وقتاً فوقتاً نشر کر رہے ہیں۔" اتنا کہہ کر مجتبیٰ نے ایک زوردار قہقہہ لگایا، جس میں میرے علاوہ باقر صاحب نے بھی بھرپور ساتھ دیا، اور اس بار ان کا قہقہہ منفی نہیں مثبت تھا مجتبیٰ نے آگے کہا "یوں بھی میں اُردو کے نقادوں کا بڑا احترام کرتا ہوں کیونکہ تعداد میں یہ اس قدر کم ہیں کہ نہ ہونے کے برابر ہیں، لہٰذا کسی دن ریڈیو ایران سے فارسی میں مضمون سناکر آپ کی خواہش ضرور پوری کردوں گا، اطمینان رکھئے، اُردو میں تو محض میں منھ کا مزہ بدلنے کے لئے لکھتا ہوں ورنہ سچ پوچھئے تو فارسی میری آبائی زبان ہے، شائد آپ نہیں جانتے میرے آباؤ اجداد ایران کے رہنے والے تھے، یوں سمجھئے تقدیر کی گردش انہیں درۂ خیبر کے راستے ہندستان لے آئی۔"

اس انکشاف پر باقر صاحب نے اُردو فارسی، ایران، ہندستان اور مجتبیٰ کے آباؤ اجداد کو یکسر نظر انداز کرکے درۂ خیبر کی تاریخ اور اس کے جغرافیائی حدود پر ایک نئی بحث کا آغاز کردیا۔ اور میں موصوف کی اس بحث کو نظر انداز کرکے یہ سوچنے لگا کہ اگر خدانخواستہ مجتبیٰ کے آباؤ اجداد ایران کو خیرباد کہہ کر ہندستان نہ آئے ہوتے تو مجتبیٰ حسین کا تو خیر کوئی نقصان نہیں ہوتا کیونکہ اس صورت میں یہ اُردو کے بجائے فارسی کے بہت بڑے مزاح نگار ہوتے اور بفرض محال مزاح نگار نہ بھی ہوتے تو اپنی ذہانت وفطانت کے باعث خمینی حکومت میں کم از کم کسی بڑے عہدے پر ضرور فائز ہوتے اور "آیت اللہ مجتبیٰ حسینی" کہلاتے۔ لیکن ان کے بغیر برصغیر ہندو پاک میں اُردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کا حال بلکہ مستقبل بھی اس کم سن بیوہ کے مقدر کی طرح تاریک ہوتا، جس کے شوہر نے "پھیروں" کے دوران ہی اس سے منہ پھیر لیا ہو۔

خدا کا شکر کہ مجتبیٰ حسین سا بانکا مزاح نگار اُردو سی خانماں برباد زبان کو نصیب ہوا، جس کے دم قدم اور قلم کی برکت وحرکت سے نہ صرف صنف طنز و مزاح کا سہاگ برقرار قائم ہے بلکہ اعتبار و وقار بھی قائم ہے۔ --

* * *

رشید عبدالسمیع جلیل (حیدرآباد)

قصہ مجتبیٰ کا ہے

"تکلف برطرف" صاحب کہ قصۂ مجتبیٰ کا ہے
نہ کہیئے "مختصر" اس کو قصیدہ مجتبیٰ کا ہے

"بہرحال" اب نہیں چارہ سوائے تہنیت کوئی
کہ پیچھے یہ ظرافت کے تماشہ مجتبیٰ کا ہے

چھپا رہتا ہے خالق اپنی ہر تخلیق کے پیچھے
نہ سمجھو "آدمی نامہ" یہ خاکہ مجتبیٰ کا ہے

چلے آئے ہیں دلّی سے پہن کر خود عزیزِ من
بڑی مشکل سے اُترے گا یہ برقعہ مجتبیٰ کا ہے

ہے اُردو نثر میں بے شک مسلسل ارتقا لیکن
مزاح و طنز کے اخبار میں حصہ مجتبیٰ کا ہے

فنِ خاکہ نگاری کا یہ جو دریا سا بہتا ہے
ذرا نزدیک سے دیکھو پسینہ مجتبیٰ کا ہے

یہ لندن، ماسکو، جاپان، یہ ہندوستاں اپنا
کہاں تک دیکھیئے گا اور نقشہ مجتبیٰ کا ہے

ہنسی کے رنگ، سارے قہقہے، محفل کے ہنگامے
یہ زیر و بم، یہ آوازیں، یہ طبلہ مجتبیٰ کا ہے

سیاست روڈ، عابد شاپ، اُردو ہال، اجنتا گیٹ
یہاں تنہا نہ گھومیں یہ علاقہ مجتبیٰ کا ہے

حمایت اور کمال اپنی عمارت کے ستون ٹھیرے
مگر چھت پر تو پُراسرار قبضہ مجتبیٰ کا ہے

ہر اک معصوم دم بھرتا ہے ہر دم ہمنوائی کا
رفیقِ کار اس میں کوئی شوشہ مجتبیٰ کا ہے

ہر اک چہرہ نظر آتا ہے اب خود اشتہار اپنا
کہیں چھوڑا ہوا یہ بھی لطیفہ مجتبیٰ کا ہے

روایت چل پڑی خاکے کی ہر سو رونمائی میں
ہر اک زنجیر میں اب کوئی حلقہ مجتبیٰ کا ہے

"نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ شمالی" راہ لگ اپنی
گلستانِ دکن آخر خرابہ مجتبیٰ کا ہے

جلیل اس مدح گردانی کا مقصد ایک خاکہ ہے
کرم فرما نہ یہ سوچیں کہ چربہ مجتبیٰ کا ہے

ظفر پیامی
(دہلی)

مجتبیٰ حسین

محبتوں کا اسٹاک ایکسچینج

جاننے اور پہچاننے میں بنیادی فرق ہے۔ اکثر جاننے والوں کو ہم خوب جانتے ہیں مگر پہچانتے بالکل نہیں۔ جان اور پہچان کے تضاد کی ایک مثال مجتبیٰ حسین سے میری قربت ہے۔ مجتبیٰ حسین کو میں نے سب سے پہلے قلمی نام کے ایک کالم نویس کی حیثیت سے پڑھا اور سراہا۔ پھر یہ جانا کہ یہ کالم مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں جو نہ صرف برصغیر کے محبوب و مقبول ادیب ابراہیم جلیس کے بھائی ہیں بلکہ اُردو کے مقتدر صحافی محبوب حسین جگر کے برادرِ خورد بھی ہیں، گویا ان کا ادب سے رشتہ پیشۂ اختیاری نہیں بلکہ عارضۂ پُشتینی ہے۔ پیشہ ورانہ رقابت کے نقطۂ نظر سے سوچ کر کے خاصا اطمینان ہوا کہ یہ حیدرآبادی کالم نویس کسی ذاتی ذہانت کی پیداوار نہیں ہے بلکہ "مجبوری کا نام مہاتما گاندھی" کی منہ بولتی مثال ہے۔ دو بڑے صحافیوں اور ادیبوں کا بھائی کالم نویس نہیں بنے گا تو کیا کوتوال بنے گا۔ یوں مجتبیٰ حسین ہمارے لئے قابلِ رشک ہونے کے بجائے قابلِ ہمدردی ہو گئے کہ خاندانی ادیبوں کو اسی رشتے کی ضرورت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔

چند سال بعد وہ دہلی آئے۔ سماجی اور ادبی محفلوں میں آن سے سامنا ہوا۔ رفتہ رفتہ ہم جان سے پہچان کی جانب بڑھنے لگے۔ مگر ذرا رُکیے، کہ مجتبیٰ حسین کے بارے میں کوئی بھی بات سیدھے صاف اور سپاٹ ڈھنگ سے یعنی تسلسل سے نہیں کہی جا سکتی۔ بات ان کے طنز و مزاح کی ہو یا شخصیت کی، پہیلی اونٹ والے اونٹ [illegible] کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے [illegible] اونٹ تیری کون سی کل سیدھی [illegible]

ادب کے اس لالۂ صحرائی، یعنی اونٹ کے کوہان میں انرجی، ذہانت، ظرافت اور محبت کا خدا جانے کتنا اتھاہ خزانہ پوشیدہ ہے کہ کوئی لاکھ تکلف برطرف رکھئے، مگر صفحائے خود ان کے نہ کوئی ان کا قصہ مختصر

کرسکتا ہے اور نہ ہی قطع کلام۔ یہ نہ کسی محبت کو بھولتے ہیں اور نہ کسی کی عداوت کو یاد رکھتے ہیں۔ غرض یہ کہ اُردو ادب کے سہاب گزیدہ صحرا میں مجنوں کے نخلستان کی آبیاری سے کبھی باز نہیں آتے۔ اسی "اُو نشانہ" خصلت (کوئی معزّز و معرب ترکیب فی الحال یاد نہیں آرہی) کا ایک ثبوت ان کا یہ تحریری دعویٰ ہے کہ وہ مجھے تیس پینتیس سال سے اچھی طرح جانتے ہیں حالانکہ میں خود اس وقت کسی ظفر پیامی کو اچھی طرح نہیں جانتا تھا۔ ان کا یہ انکشاف بھی ہے کہ دس پندرہ سال سے مجھے "پہچانتے" بھی ہیں یعنی وہ اس مقام پر پہونچ چکے ہیں جو خود مجھے آج تک نصیب نہیں ہوا۔

امر متنازعہ یہ ہے کہ مجتبیٰ حسین اور ظفر پیامی میں سے کون کسے زیادہ دیر سے جانتا اور پہچانتا ہے۔ اُمید ہے کہ اُردو ریسرچ کے اس کنٹروورشیل ٹاپک (Controversial Topic) کی نشاندہی سے اکیسویں صدی کے محققین مطلوبہ فائدہ اٹھاکر خاصی وافر مقدار میں پی۔ ایچ ڈی اور ڈی لٹ تھیسسوں کے انباروں کے ذریعے دامنِ اُدب میں گرانبار اضافہ کرسکیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ ایسا ضرور ہوگا کہ اُردو میں جوں جوں پڑھنے والے کم ہو رہے ہیں لکھنے والے بڑھ رہے ہیں۔ ایسے موضوعات لکھنے والوں کی تعداد میں یقیناً اضافہ کرکے پڑھنے والوں کی گنتی حسبِ منشاء کم کرسکتے ہیں۔ یوں بھی یہ موضوع ہرگوپال تفتہ کی نانی کے سن ولادت اور علامہ اقبالؔ کے نانیالی کے شجرۂ نسب سے کم اہم تو نہیں ہے کہ اُردو کے محققوں اور مجاوروں کی توجہ کا مستحق ہی نہ سمجھا جائے۔

بہرحال، معتبر تحقیق کے لئے تو قارئین کرام کو کسی اکادیمی کے گراں قدر عطیے کا انتظار کرنا پڑے گا۔ لیکن عام انسانی یادداشت کی بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ مجتبیٰ حسین سے میری پہچان کی شانِ نزول صرف اتنی ہے کہ فکر تونسوی مرحوم دنیا کی کسی اچھی چیز یا کسی خوشگوار قصے کا ذکر مجتبیٰ حسین کو درمیان میں لائے بغیر نہ کیا کرتے۔ مثلاً "پچھلے دنوں حیدرآباد گیا تھا مجتبیٰ حسین کی بدولت"۔ "ٹیلی ویژن والے ایک فلم بنا رہے ہیں مجھ پر مجتبیٰ حسین کی مدد سے۔" "فلاں فنکشن ہو رہا ہے میرے لئے مجتبیٰ حسین کے کہنے پر"۔ "ایک ٹی۔ وی سیریل لکھ رہا ہوں مجتبیٰ کی تحریک پر"۔ گویا مجتبیٰ حسین فکر تونسوی کی ہر ایک غزل کے مقطع کا تخلص بن کر رہ گئے۔

قدرت کا ایک عجیب مذاق یہ ہے کہ یہ صورت حال فکر کے آخری وقت تک ان پر طاری رہی کہ فالج سے نکل سکنے کی حالت میں بھی اگر انہوں نے کسی کو پہچاننے کی کوشش کی تو وہ مجتبیٰ حسین ہی تھے۔ اس منظر کو دیکھ کر اس وقت تو میری آنکھیں بھر آئی تھیں لیکن کچھ برس پہلے تک مجتبیٰ سے فکر کی یہ قربت مجھے خاصی ناقابلِ برداشت معلوم ہوتی تھی۔ تنگ آکر ایک دن میں نے فکر سے پوچھ ہی لیا کہ یہ مجتبیٰ حسین ہیں کیا چیز کہ آپ کا کوئی کلمۂ خیر (مرحوم کلمۂ شر کے دھنی بھی تھے) ان کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔

جواب دیا۔ "طنز نگاروں کی ٹریڈ یونین کے سکریٹری جنرل"

میں نے پوچھا۔ "تو پھر طنز نگاروں کی ٹریڈ یونین کے صدر یقیناً آپ ہی ہوں گے"

جواب دیا "ہاں! لیکن ایسا صدر جیسا بھارت کا راشٹرپتی۔ مجتبیٰ حسین کے سامنے میرا مرتبہ وہی ہے جو گیانی ذیل سنگھ کا اندرا گاندھی کے سامنے ہے۔" اب مجتبیٰ حسین کے بارے میں سُننے یا پوچھنے کی ضرورت ہی نہ رہی۔

اگر فکر تونسوی، طنز نگاروں کے بے تاج بادشاہ تھے تو مجتبیٰ حسین باتخت وزیر اعظم۔ اب تو خیر تیسری دنیا کے اکثر ملکوں کی طرح اس مملکتِ خداداد میں بھی صدر اور وزیر اعظم کا عہدہ ایک ہی شخص کے ہاتھوں میں ہے۔ فکر تونسوی کے بعد

مجتبیٰ حسین بلا شرکتِ غیرے طنز و مزاح کی دنیا کے آئینی سربراہ بھی ہیں اور عملی حکمراں بھی۔ ایک سیاسی مبصر کی حیثیت سے مجھے یہ کہنے میں قطعاً کوئی عار نہیں ہے کہ ان کی حکومت تیسری دنیا کی واحد حکومت ہے جسے نہ عدم استحکام کا خطرہ ہے اور نہ بوفورس جیسے اسکینڈلز کی توپ ماری کا خوف۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ادیبوں کی تمام اقسام میں صرف طنز نگاروں کی بریڈ (Breed) ہی ایسی پائی گئی ہے جو آپس میں ایک دوسرے پر نہیں جھپٹتی۔ طنز نگار ادب کی وہ واحد مخلوق ہیں جو ایک دوسرے کو نیچا دکھاتے گراتے یا بگاڑتے نہیں بلکہ اُٹھاتے، بڑھاتے اور سنوارتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ہم نے خود اپنے کانوں سے بڑے بڑے طنز نگاروں کو اپنے ہم عصروں کی تعریف کرتے بھی سُنا ہے اور وہ بھی پیٹھ پیچھے۔ انسانوں میں یہ خوبی صرف چوروں میں پائی جاتی ہے۔ اس مسئلے کا حتمی فیصلہ محقق کریں کہ یہ خوبی چوروں نے طنز نگاروں سے لی ہے یا طنز نگاروں نے چوروں سے۔ فکر تونسوی کی قربت میں مملکتِ طنز نگاراں کی ایک اور خصوصیت کا بھی مجھے پتہ چلا، کہ اس اقلیم میں صرف ایک ہی پارٹی کی حکومت ہے، اپوزیشن کوئی ہے ہی نہیں۔ ایک پارٹی والے ہر ملک کی طرح مجتبیٰ حسین بھی طنز و مزاح کی پارٹی کے سکریٹری جنرل کی حیثیت سے وہی اہمیت رکھتے ہیں جو روس میں سوویت کیمونسٹ پارٹی کے سکریٹری جنرل میخائیل گورباچوف کی ہے۔ فکر تونسوی سے برسوں پرانی دوستی کی بدولت طنز نگار نامی مخلوق میں ایک مزید خوبی یا خرابی بھی دیکھنے کو ملی۔ آپ یقین کریں یا نہ کریں مگر ہم نے بہترین طنز و مزاح نگاروں کو ایک دوسرے کا بہترین دوست بھی پایا۔ فکر تونسوی کی سربراہی میں اس سلطنت کی جو کابینہ برسوں کام کرتی رہی۔ اس کے سب ہی ارکان مثلاً مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، احمد جمال پاشا، دلیپ سنگھ، نریندر لوتھر، مصطفےٰ کمال اور مسیح انجم وغیرہ ایک دوسرے کے لئے قابلِ اعتماد کولیگ نہیں بلکہ قابلِ فخر یارِ غار بھی ثابت ہوئے۔

طنز و مزاح نگاروں کا یہ اتحاد ہمارے ادب کے لئے لمحۂ فکریہ ہے اور اس کے خطرناک اثرات سے ہر صاحبِ نظر نقاد کو خبردار رہنا چاہیئے۔ سچ تو یہ ہے کہ کافی حد تک اس کے خوفناک نتائج سامنے بھی آرہے ہیں۔ ابھی کل تک ادب والے طنز پر کم اور طنز نگاروں پر زیادہ ہنسا کرتے تھے۔ طنز و مزاح ادب میں بس مذاق بن کر رہ گیا تھا۔ طنز نگار بیچارے ناقدوں کے پیچھے دوڑتے تھے کہ بھیا ہمیں بھی اپنے دربار میں اگر اور نہیں تو دربان کا درجہ ہی دے دو۔ اور ناقد حضرات "نو ویکنسی" (No Vacancy) کا عذر کرکے انھیں ٹکا سا جواب دے دیتے۔ اب حالت یہ ہے کہ بیچارے بڑے بڑے ذو لسانین ذو العرفین شاعر اور نقاد مجتبیٰ حسین کے پیچھے بھاگ رہے ہیں کہ جب تک وہ ان کا خاکہ نہیں اڑالیں گے، پڑھنے والے انھیں ادیب ہی تسلیم نہیں کریں گے۔

مجتبیٰ حسین گویا اَدب کے مادام طوساں (Tossads) ہیں۔ جس طرح لندن میں مادام طوساں کے مومی مجسموں کے میوزیم میں جب تک کسی سیاستدان کو جگہ نہیں ملتی اُس کی عالمی حیثیت مُشتبہ رہتی ہے۔ اُسی طرح مجتبیٰ حسین سے مُشتِ خاک اُڑوائے بغیر کوئی شاعر، ادیب یا نقاد معتبر نہیں بنتا۔ پھر بھی یاد رہے کہ مادام طوساں کے میوزیم کے مجسمے تو امتدادِ زمانہ کے ساتھ ہٹتے یا آتے جاتے ہیں مگر مجتبیٰ حسین کے خاکے میں جو فٹ ہوگیا وہ گویا ادب کا نوشتۂ تقدیر ہوگیا۔

یہ سب کچھ ہم ذاتی تجربے کی بناء پر کہہ رہے ہیں کہ کچھ دن پہلے وہ ہماری بھی عاقبت سنوار چکے ہیں۔ اب کوئی اور ہمیں مانے یا نہ مانے مگر ہم اپنے آپ کو ادیب ضرور سمجھنے لگے ہیں۔ ہمارے جو ادیب دوست مجتبیٰ حسین کی نظرِ التفات

کا ابھی تک شکار نہیں ہوئے انھیں ہم یقین دلادیں کہ خاکہ لکھنے کے معاملے میں یہ خاصے سخی واقع ہوئے ہیں۔ خود میری دیکھی ہوئی بات ہے کہ ادھر ایک صاحب نے ایک شعر لکھا ادھر ہمارے یار نے ایک پورا خاکہ لکھ دیا، بلکہ کچھ واقف کاروں کا تو کہنا ہے کہ مجتبیٰ حسین اکثر خاکے ایڈوانس میں لکھ کر رکھ لیتے ہیں کہ موت کے آنے اور انسان کے ادیب بننے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔

ہمارے عزیز اختر الواسع کی روایت ہے کہ مجتبیٰ حسین اکثر خاکے یوں اُڑاتے ہیں کہ لکھنے سے پہلے صاحب خاکہ ان کے پیچھے دوڑتا رہتا ہے کہ بھیا کب ہمیں لافانی بنا رہے ہو اور لکھنے کے بعد وہ ان سے بھاگتا ہے کہ کہیں مزید قربت کوئی نیا گل نہ کھلادے کہ خاک اور خاکے کا رشتہ بھی مجتبیٰ حسین ہی نے دریافت کیا ہے۔ اختر الواسع ہی کیا ایک شاعر نقاد کو تو ہم نے بھی دیکھا ہے کہ اپنے خاکے کو اہل نظر سے پڑھواتے پھرتے تھے کہ اس سے کہیں تعریف کے بجائے تضحیک کا پہلو تو نہیں نکلتا حالانکہ معاملہ صرف اتنا تھا کہ یاروں نے یہ افواہ اُڑادی تھی کہ مجتبیٰ حسین ہمیشہ سچی بات ہی لکھتے ہیں۔ جب ہم نے انہیں یقین دلایا تھا کہ ایسا آزمائشی مرحلہ ہمارے سامنے کبھی پیش نہیں آیا تو وہ خاصے مطمئن ہوکر ایک بار پھر مجتبیٰ حسین کی جانب تشکر بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔

معاملہ صرف یہ ہے کہ جہاں تکر تونسوی نے کبھی کسی خاص آدمی کو موضوع نہیں بنایا وہاں مجتبیٰ حسین خاص خاص آدمیوں ہی کو تختۂ مشق بناتے رہے ہیں۔ مگر جہاں فکر عام کو خاص بنادیتے تھے وہاں مجتبیٰ کو ہم نے خاص اور بڑے لوگوں کو عام آدمی تو کیا، کبھی کبھی انسان بناتے بھی دیکھا ہے

مجتبیٰ حسین کے خاکے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ قلندر کو اسکندر بنانے کے فن کے ماہر ہیں حالانکہ بعض حاسد اور غیر مستند لوگ اصل معاملہ اس کے برعکس سمجھتے ہیں۔ مثلاً ناچیز پر جو خاکہ لکھا اس میں ہمارے دو دُم دراز کتوں کی خونخواری کا تذکرہ یوں کیا گویا دو شیر ببر رام لیلا میدان کے کسی سیاسی جلسے میں نہتے انسانوں کے شکار پر تعینات ہوں۔ اب حقیقت یہ ہے کہ یہ بیچارے صحافیوں اور ادیبوں کی صحبت میں رہتے ہوئے کاٹنا تو کیا بھونکنا بھی بھول چکے ہیں۔ یہ غریب دُم ہلاکر دوست بنانے کا فن ہی جانتے ہیں۔ ان کے مالک یا خادم کی سب سے بڑی مصروفیت اس جوڑے کی حفاظت کرنا ہے کہ وہ سونے میں زیادہ اور بھونکنے میں کم یقین رکھتے ہیں۔ مگر مجتبیٰ کو دیکھ کر وہ یقیناً بھونکنے لگتے ہیں کہ شائد اُن ہی سے انہیں بوئے وفا آتی ہے۔

انہوں نے راقم الحروف کے دو موٹر نما چوپایوں کا ذکر بھی کچھ ایسا کیا گویا وہ بوئنگ ہوائی جہاز ہوں۔ حالانکہ ان دو کاروں میں سے ایک صرف یہ دکھانے اور ثابت کرنے کے لئے ہے کہ چلتی کا نام گاڑی ہے اور کھڑی کا آثارِ قدیمہ، اور دوسرا موٹر نما چوپایہ جسے مجتبیٰ حسین ستم ظریفی سے موٹر کا نام دیتے ہیں صرف ایک بیکار گیراج میں مرمت کے لئے ہے۔ سواری کرتے ہوئے تو ہم اکثر مجتبیٰ حسین کے اسکوٹر کے پیچھے پائے گئے ہیں۔ مجتبیٰ کا یہ اسکوٹر بھی لاجواب شئے ہے۔ ہم بے زبان تو خیر کس کھیت کی مولی ہیں۔ یہ تو بڑے بڑے اہلِ زبان کو بھی ٹھکانے لگاتا رہا ہے۔ اگر داورِ محشر نے کبھی بے جان اشیاء کو بھی شرف باریابی بخش کر اپنی داستانِ غم سنانے کا موقع دیا تو مجتبیٰ حسین کا اسکوٹر ان سب مظلوموں کا سول اسپوکس مین بنے گا جن کے مالک نیکی کر دریا میں ڈالنے کے شوق میں اپنی اپنی سواریوں کا سُرمہ بناتے رہتے ہیں۔ اگر یقین نہ ہو تو دہلی کے کسی پٹرول پمپ کے سیلز مین سے پوچھ لیجئے

وہ برملا گواہی دے گا کہ دارالحکومت میں پٹرول کی قلت کا اہم سبب مجتبیٰ حسین کا اسکوٹر ہے کہ اس کے دو نازک پہیوں پر پورے اردو ادب کا بار اکثر رہتا ہے۔ یہ بیچارہ تاروں کی چھاؤں میں سفر شروع کرتا ہے اور غروب آفتاب کے ساتھ طلوع ہوتا ہے۔ اس دوران دوستوں کے بچوں کو مکتب پہونچانے سے لے کر میخواروں کو درمادتک پہونچاتا ہے، درمیانی وقفے میں کبھی ایرپورٹ کا چکر ہوجاتا ہے کہ کسی دوست کا کوئی دوست ہونولولو سے آرہا ہے۔ کبھی ریلوے اسٹیشن کا پھیرا ہوتا ہے کہ تشکارپور کی سواریاں اکثر رات کو وارد ہوتی ہیں۔ انٹر اسٹیٹ بس ٹرمینل کا طواف تو خیر روزمرہ کا دستور ہی ہے کہ دہلی پر اکثر حملہ آوروں کی شانِ نزول آج کل ویڈیو کوچ ہوتی ہے۔ طنز و مزاح میں مجتبیٰ حسین نے جس قدر اہم مقام حاصل کیا ہے اتنا ہی اہم مقام انہیں ہوائی اڈے سے لے کر بس اڈے تک حاصل ہے۔ اگر ایک دو روز یہ اُن مقامات پر نہ پائے جائیں تو وہاں کے منتظمین پریشان ہوکر اُن کے دوستوں کو ٹیلی فون کرنے لگتے ہیں کہ خیر تو ہے؟ عموماً یہ ہنگامی صورتحال تب ہی پیش آتی ہے جب مجتبیٰ جاپان، امریکہ، انگلینڈ، روس، ناروے، سویڈن، فرانس وغیرہ کا نام روشن کرنے نکلے ہوں۔ مجتبیٰ حسین کے سفرناموں کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ انہیں پڑھنے کے بعد اپنے وطن سے محبت کا جذبہ رگ و پے میں یوں موجزن ہونے لگتا ہے کہ بدیس کے لئے رختِ سفر باندھنے والے "اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے" کو جزو ایمان بنا کر سفر کی صعوبتوں سے بچ جاتے ہیں۔ ٹوکیو میں ایک متمول اور معقول دوست (حالانکہ یہ اجتماع ضدین کم ہی دیکھنے میں آیا ہے) سے دو سال قبل ہماری ملاقات ہوئی۔ کہنے لگے: پچیس سال جاپان میں گذارنے کے بعد اگلے ہفتے وطن لوٹ رہا ہوں۔ وجہ پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ، مطالعہ کی میز پر "جاپان چلو، جاپان چلو" کے انتہائی مجروح نسخے پر نظر پڑی اور بے زبانی زبان بن گئی۔

حکومت کو چاہئیے کہ مجتبیٰ حسین کے سفرناموں کو ہزاروں کی تعداد میں شائع کر کے ان لوگوں میں مفت تقسیم کرے جو خواہ مخواہ ولایتِ غیر میں اپنی صحت اور ملک کا فارن ایکسچینج ضائع کرنے پر کمربستہ ہیں۔ انشاء اللہ نتائج ملک اور مجتبیٰ کے لئے بے حد مفید ثابت ہوں گے کہ جہاں ابن انشاء کے سفرنامے پڑھ کر پاؤں میں چکر پڑجاتا تھا وہاں مجتبیٰ حسین کے سفرناموں سے نگاہ و دل اور کام و دہن کے سارے تقاضے گھر بیٹھے پورے ہوجاتے ہیں۔

یہ سفرنامے والا قصہ تو خیر جملۂ معترضہ کے طور پر آگیا تھا۔ اصل معاملہ تو اور ہے۔ مجتبیٰ حسین کے ساتھ مشکل ہی یہ ہے کہ ان کا سارا لکھا ہوا بھی جملہ ہائے معترضہ کے گرد گھومتا ہے۔ مثلاً روزانہ جب وہ اپنے بچپن میں دوستوں کو ٹیلی فون کریں گے۔ (ذاتی مشاہدے کی بات ہے کہ ان کا ایک ٹیلی فون اوروں کے چار چار ٹیلی فونوں پر بھاری ہے) تو بات شام کی کسی تقریب سے شروع ہوگی یا کسی نیک دوست کی کسی بور تقریر سے، اس کے بعد جملۂ معترضہ کے طور پر، عشق کے کئی اور امتحان بھی درمیان میں آئیں گے، پھر "بائی دی وے" شب خون مارتا ہوا یہ سوال نازل ہوگا کہ فلاں پبلک اسکول کے پرنسپل سے تو آپ واقف نہیں ہیں۔ فرض کیجئے آپ کا جواب نفی میں ہے تو یہ تسلی دیتے ہوئے کہیں گے۔ خیر کوئی بات نہیں مگر بائی دی وے فلاں اسپتال کے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ سے تو آپ کی واقفیت ہوگی۔ آپ یہاں بھی نہ کردیں تو مجتبیٰ آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔ پوچھیں گے کہ بائی دی وے فلاں کمپنی کے چیئرمین تو آپ کے دوست ضرور ہوں گے۔ اگر یہ بھی نہیں تو فلاں ایجنسی کے کسی اہم ڈپلومیٹ کو تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔ اب تک آپ کا دل چلّا رہا ہوگا کہ اگر فلاں کمپنی کے چیئرمین کو عمر بھر کے لئے دشمن بھی بنانا پڑے تو اس کی دوستی کا دعویٰ فوراً کردیا جائے تاکہ جان کی امان ملے، تب پتہ چلے گا کہ مسئلہ ایک غریب

ادبی رسالے کے ایڈیٹر کو اشتہار دلوانے کا ہے۔ آپ جملۂ معترضہ کے طور پر پوچھیں گے کہ بائی دی وے اس اشتہار کا پبلک اسکول کے پرنسپل، ہسپتال کے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ یا ایمبیسی کے کونسلر سے کیا تعلق ہے تو معلوم ہوگا بظاہر کوئی تعلق نہیں ہے سوائے اس کے کہ تاریخ متعلقہ کو مجتبیٰ کی ڈائری میں یہ چار کام درج تھے۔ اول دور کے ایک دوست کے صاحبزادے کا پرائمری اسکول میں داخلہ، دوئم ایک پڑوسی کے کسی بیمار عزیز کا اسپتال میں علاج، سوئم بمبئی، حیدرآباد یا کلکتہ وغیرہ سے نازل ہونے والے کسی ایڈیٹر کے لئے اشتہاروں کی فراہمی اور چہارم دفتر کے ایک چپراسی کے منہ بولے بھانجے کی بدیش یاترا کے لئے مطلوبہ ویزا کی فراہمی۔ ان کی ڈائری میں اندراجات تو اس کے علاوہ بھی بہت سے ہوں گے۔ مثلاً کسی کو لیگ کے داماد کے لئے نوکری کی کوشش، دور دیس جانے والے کسی شناسا کے لئے (ویسے مجتبیٰ سے کام کروانے کے لئے ذاتی شناسا کے لئے (ویسے مجتبیٰ سے کام کروانے کیلئے ذاتی شناسائی کوئی ضروری بھی نہیں، شناسا سے شناسائی کافی ہے) مطلوبہ تعداد میں متوقع میزبانوں کی فراہمی کسی ہمدم دیرینہ کے دوا دارو کا بندوبست، کسی طالب علم کے لئے کسی ٹیوٹر کی تلاش اور کسی ٹوٹے ہوئے استاد کے لئے ٹیوشن کا بندوبست وغیرہ وغیرہ۔

'بائی دی وے' کی ان تمام فرمائشوں اور آزمائشوں کے دوران صرف ایک ہی بات کبھی سننے میں نہیں آئی، اور وہ ہے اپنے یا اپنے اہل وعیال کیلئے کوئی سوال۔ اس کی وجہ بقلم خود مجتبیٰ حسین یہ ہے کہ "جہاں تک میری گھریلو زندگی کا تعلق ہے میں علی الصبح اپنے گھر واپس ہوتا ہوں اور علی الصبح گھر سے نکل جاتا ہوں۔ سنا ہے کہ میری بھی کوئی گھریلو زندگی ہے اور اس گھریلو زندگی میں میرے اہل وعیال ہیں، یہ اور بات ہے کہ میں اہل وعیال کا اہل نہیں۔"

مجتبیٰ حسین اہل وعیال کے اہل ہوں یا نہ ہوں لیکن اُن کے اہل وعیال ضرور ہیں اور ماشاء اللہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں، لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ ان میں سب طرح کے لوگ ہیں۔ راجہ بھی اور رنک بھی۔ دفتروں کے چپراسی بھی اور کمپنیوں کے چیرمین بھی درباروں کے درباری بھی اور دربان بھی۔ ہندو بھی، مسلمان بھی اور عیسائی بھی حتیٰ کہ میرے ایسے غیر مقلد فقیر بھی۔ یہ سب کے کام آتے ہیں مگر آج تک کسی کو اُن کے کام آتے ہم نے نہیں دیکھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کا انہوں نے کبھی موقع ہی نہیں دیا۔

ان کی ڈائری میں اسٹاک ایکسچینج کے انتہائی ہوشیار بروکر کی مانند ہر دوست اور شناسا کی رائج الوقت، بلکہ رائج الثانیہ قدر وقیمت درج ہے۔ ان کے ہاں یہ پورا حساب موجود ہے کہ کس مسئلے کے لئے کس آسامی سے کیسے سوال کرنا چاہیئے۔ وہ فوراً حساب لگا لیتے ہیں کہ فلاں دوست کے ہاں جو پوتا آج پیدا ہوا ہے، چار سال بعد وہ کسی دوست کے توسط سے کون سے پبلک اسکول میں داخل ہوگا کہ آج کل مرکزی وزارت کی رکنیت تو مل سکتی ہے لیکن پبلک اسکول کا داخلہ نہیں مل سکتا۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ سرکاری کام وہ بائی دی وے کرتے ہی رہتے ہیں۔ ادبی کام وہ مجبوری سے کرتے ہیں کہ اس کے سوائے کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ لیکن رفاہ عامہ یعنی انسانی کام کل وقتی پیشے کے طور پر کرتے ہیں۔ اس انسانی کام سے ان کی لگن ان کے دوستوں کو بعض وقت ان سے دور بھی کر دیتی ہے۔ کئی لوگ کنی بھی کترانے لگتے ہیں، لیکن دوسرے ہی لمحے وہ پھر ان کے قریب آنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ کوئی نہ کوئی کسی نہ کسی کا سوال ضرور ہوتا ہے اور کوئی بھی سوال مجتبیٰ حسین کے حوالے کے بغیر حل نہیں ہو سکتا۔ ہم خود ان سے کئی کام کروا چکے ہیں حالانکہ ان کا تقاضا جاری ہے کہ کوئی "اور" کام بتاؤ۔ ہماری دعا ہے کہ مجتبیوں کے اس اسٹاک ایکسچینج کے خزانے ہمیشہ کی طرح ہمیشہ بھرپور رہیں تاکہ دنیا پر یہ ثابت رہے کہ ادیبوں میں بھی انسانوں کی نسل ابھی ناپید نہیں ہوئی۔

--

مسیح انجم
(حیدرآباد)

من موہن مجتبیٰ

"تکلف برطرف" کے دیباچہ کی آخری سطور میں مجتبیٰ حسین نے یہ لکھا ہے کہ "میرے آباؤ اجداد ایران کے رہنے والے تھے اور درہ خیبر کے راستے سے ہندوستان آئے تھے۔" ــــ اس کے بعد کے جملے میں مجتبیٰ حسین نے راشننگ اور فیملی پلاننگ کے نفاذ کا حوالہ دیتے ہوئے قاری کو ایک سطبوعہ دھمکی بھی دی ہے کہ "اب میں اسی راستے سے ہندوستان سے باہر جانا چاہتا ہوں ....!"

ان جملوں کو پڑھنے کے بعد ایک ایسا قاری جس نے مجتبیٰ حسین کے درشن نہ کئے ہوں، یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گا کہ مجتبیٰ حسین ضرور کوئی ایرانی ہوں گے۔ شہر میں ان کی ایک عالیشان ہوٹل ہو گی جہاں وہ بکریوں اور مرغوں کا سوپ پی کر گاہکوں کو بغیر وٹامنس کے بوٹیوں والی بریانی کھلاتے ہوں گے۔ چنانچہ جب میں نے "تکلف برطرف" کے دیباچہ کی آخری سطریں ختم کیں تو میرے ذہن کے سیلولائیڈ پر مجتبیٰ حسین کی شبیہ کچھ اس طرح ابھر آئی ــــ ایک لمبا تڑنگا نوجوان آغا۔ گورا چٹا رنگ۔ پھولے پھولے گال جن سے لہو ٹپکتی ہوئی۔ اگر کتاب پر ان کی تصویر چھپی ہوئی ہوتی تو میں اس غلط فہمی کا شکار نہ ہوتا۔ یوں بھی آجکل تصویر کے معاملے میں ادیبوں اور شاعروں پر کوئی اعتبار نہ رہا۔ کیونکہ وہ اپنی کتابوں پر کچھ اس قسم کی تصویریں چھپواتے ہیں جنہیں دیکھنے کے بعد کتابیں کسی اور کی اور تصویریں کسی اور کی معلوم ہوں گی۔ اور ان پر بڑی آسانی سے ادبی سرقہ کا الزام لگایا جاسکتا ہے۔ میں نے ایک ایسا شعری مجموعہ بھی دیکھا ہے جس پر شاعر نے 'ساٹھ کے پیٹے' میں ہونے کے باوجود، اپنے سن بلوغ کے ابتدائی دنوں کی تصویر شائع کروائی تھی۔ ہاں تو میں مجتبیٰ حسین کی خیالی شبیہ کا ذکر کر رہا تھا جو میرے ذہن پر نقش کر گئی تھی۔ میں کوئی دوشیزہ تو نہیں تھا کہ فرطِ عشق سے مغلوب ہو کر ان کی تلاش میں نکل پڑتا۔ مگر مضامین کچھ ایسے پُر لطف اور پُر مزاح تھے کہ صاحبِ کتاب کے درشن کرنے کا جذبہ ہر لمحہ بڑھتا ہی جارہا تھا۔ یہ غالباً ۱۹۶۸ء کی بات ہے۔ ان دنوں میری ادبی دنیا بالکل محدود تھی۔ یوں سمجھیے کہ اردو ادب میں میری حیثیت ایک رنگروٹ کی سی تھی۔ مجھے ایک ایسے شخص کی تلاش تھی جو مجتبیٰ کو قریب

جانتا ہو۔ تلاش بسیار کے بعد آخر ایک دن مجھے ایک ایسا شخص محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ کے قریب مل ہی گیا۔ اتفاق سے وہ صاحب ایک اردو ہفتہ وار کے ایڈیٹر تھے اور اشتہار کے سلسلہ میں وہاں پیروی کرنے آئے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں اپنی مجبوری بتائی اور پھر پوچھا "کیا آپ مجتبیٰ حسین صاحب کو جانتے ہیں؟"

"تڑاخ" سے فرمایا "کون مجتبیٰ صاحب؟ — وہ جو اشتہارات دلواتے ہیں!"

میں نے کہا "جی نہیں! مجھے اشتہار والے مجتبیٰ سے نہیں ملنا ہے۔ بلکہ "تکلف برطرف" کے مصنف مجتبیٰ حسین سے ملنا ہے"۔ اس پر مدیر موصوف کے چہرے پر کچھ اس قسم کے آثار نمودار ہوئے جیسے وہ اشتہار والے مجتبیٰ کے علاوہ کسی اور مجتبیٰ حسین کو نہ جانتے ہوں۔ میں نے ان کی تشویش کو بھانپ کر کہا "خیر صاحب، انہی سے ملائیے، اشتہار والے مجتبیٰ صاحب سے!"

میری درخواست پر وہ مجھے محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ کے اندر لے گئے۔ اور دور سے ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے دبلے پتلے نوجوان کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ "وہ دیکھو! یہی مجتبیٰ حسین صاحب!" اور پھر وہ آس پاس ہی کہیں غائب ہو گئے۔ شاید انہیں اشتہار یاد آگیا تھا۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ان دنوں اطلاعات کا دفتر ہاؤزنگ بورڈ کی موجودہ عمارت میں نہیں تھا بلکہ اس کے بازو والی ایک پرانی عمارت میں تھا جس کے اکثر کمروں میں نیم تاریکی سی رہا کرتی تھی۔ خود مجتبیٰ حسین نے اس بلڈنگ کا خاکہ کچھ اس طرح کھینچا ہے ... "باہر سے تو وہ بلڈنگ نظر آتی تھی۔ مگر اندر جانے کے بعد یوں محسوس ہوتا جیسے آپ اچانک عہد وسطیٰ کے کسی کھنڈر میں آگئے ہوں۔ محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ کی اس بلڈنگ میں نہ کوئی اطلاع آسکتی تھی اور نہ ہی جائز قسم کے تعلقات عامہ کی گنجائش تھی۔ بنانے والے نے اس بلڈنگ کو کچھ ایسی بے ترتیبی سے بنایا تھا کہ ایک ہی دفتر میں کام کرنے والے بھی اجنبی سے لگتے تھے۔ گویا ہر شخص کی انفرادیت اس بلڈنگ میں محفوظ تھی!" — حسن اتفاق کہئے کہ مجتبیٰ حسین جس کمرے میں بیٹھتے تھے اس میں کچھ زیادہ ہی تاریکی رہا کرتی تھی۔ ہاں تو اردو ہفتہ وار کے ایڈیٹر کے اشارہ پر جیسے ہی میری نظر مجتبیٰ حسین پر پڑی دل کو ایک دھچکا سا لگا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ کچھ تو کمرے کی تاریکی اور کچھ تو مجتبیٰ حسین کے چہرے کا رنگ، یہ دونوں گڈمڈ ہو کر "نور علیٰ نور" کا کام کر گئے۔ جب ذرا اندھیرا صاف ہوا تو دو چمکدار آنکھیں کسی کار کی ہیڈلائٹس کی طرح نظر آنے لگیں۔ میں اس جانب بڑھنے لگا۔ وہ آنکھیں میری داڑھی کا کچھ اس طرح جائزہ لے رہی تھیں جیسے کوئی تنکا تلاش کر رہی ہوں۔ اگر میں یہ کہوں تو بیجا نہ ہوگا کہ مجتبیٰ کے چہرے پر سوائے دو خوبصورت آنکھوں کے کچھ اور ہے ہی نہیں۔ اور یہ آنکھیں بھی ایسی جن میں ہر وقت شوخی و شرارت مچلتی رہتی ہے۔ اور وہ ان کے حد درجہ ذہین اور چالاک ہونے کا پتہ بھی دیتی ہیں۔ یوں تو کہنے کو گال بھی ہیں۔ مگر پچکے ہوئے۔ ویسے ٹھوڑی بھی ہے۔ اگر وہ کسی قدر اور ذرا اوپر کی جانب مڑ جاتی تو پورا چہرہ "طوطا پری آم" کا سا دکھائی دیتا۔ ناک معقول سی پائی ہے۔ ہونٹ پتلے پتلے۔ لیکن ان کے ناک اور ٹھوڑی سے ٹھیک ٹھیک زاویہ قائمہ بناتے ہوئے نوّے ڈگری پر تقسیم نہیں ہو سکے۔ نچلا ہونٹ اوپری ہونٹ کو پکڑنے کی علت میں کسی قدر سیدھی جانب ٹیڑھا ہو گیا ہے۔

ان کا چہرہ اسکرین فیس (SCREEN FACE) کی تعریف میں آتا ہے۔ تصویر خوبصورت کھینچتی ہے۔ پتہ نہیں فلم انڈسٹری میں کیوں نہیں گئے۔ شاید انہیں اس بات کا اندازہ ہو کہ فلم کی ہیروئن انہیں دیکھتے ہی فلم میں کام کرنا چھوڑ دے گی۔ سیدھا پانوں کسی قدر جھک کر چلتے ہیں۔ آخر بیٹھنے کے لیے بھی تو کوئی چیز چاہیے نا! —

خیر جناب، علیک سلیک کے بعد کسی طرح ملاقات ہو ہی گئی۔ مجتبیٰ نے پہلی ہی ملاقات میں نہ صرف اپنا دل پیش کیا بلکہ چائے کا بل بھی۔ یہی نہیں۔ میرے ایک شائع شدہ مضمون کی تعریف بھی کی۔ میں اس وقت کچھ ایسے مدوجزر کی کیفیت سے دوچار تھا کہ جواب میں "شکریہ" تک نہ کہہ سکا۔ یہ تھی مجتبیٰ سے میری پہلی ملاقات اور میں پہلی ہی ملاقات میں ان کا گرویدہ ہو چلا تھا۔

جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ ان دنوں مجتبیٰ حسین محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ میں ملازم تھے۔ اب تو وہ دہلی میں مقیم ہیں اور گزیٹیڈ عہدہ پر فائز ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے دوستوں کی کھوئی کو یاد کرتے ہیں۔ وہ اکثر کہا کرتے ہیں کہ "جو مزہ دوستوں کی کھوئی میں تھا تو وہ آج ہزار روپیوں میں بھی نہیں ملتا!" یہ ان کی اعلیٰ ظرفی اور شرافت کا ثبوت ہے۔ میں جب بھی مجتبیٰ سے ملنے کے لیے اطلاعات کے دفتر میں جاتا تو سیٹ پر ان کی بجائے ان کے ٹفن باکس سے ملاقات ہوتی۔ وہ اپنی سیٹ پر بہت کم نظر آتے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ آفس سے باہر تعلقات بڑھانے کے لیے گئے ہوئے ہیں۔ اور اگر کبھی مل جاتے تو وہ دوستوں میں گھرے "قاضی الحاجات" اور "دافع البلّیات" بنے نظر آتے۔ کبھی کسی دیکلی کے ایڈیٹر کو اشتہار دلوایا۔ تو کبھی کسی بے کس و بے سہارا کے ٹرانسفر یا تقرر کے سلسلے میں سفارش کروانے کے لیے دوڑے۔ سنتا ہوں کہ دلّی میں بھی ان کی یہی سرگرمیاں ہیں۔ ایک بار مجتبیٰ حسین بلّیات کو رفع کرنے کی علت میں ایک سردار جی سے منہ چھپاتے نظر آئے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آپ نے اطلاعات کے دفتر کے چپراسی کو سود پر رقم دلوائی ہے اور خود ضامن بنے ہوئے ہیں۔ بڑی مشکل سے دوسرے روز وہ چپراسی ملا اور بلا ٹل گئی۔

مجتبیٰ حسین دوستوں کے بڑے رسیا ہیں۔ وہ جن دنوں حیدرآباد میں تھے، حلقۂ احباب اتنا بڑھا ہوا تھا کہ مجھے ان کے نام تو کجا چہروں تک کو پہچاننے میں الجھن سی ہوتی۔ اور پھر لطف کی بات تو یہ کہ ہر روز دوستوں کی صف میں ایک نئے چہرے کا اضافہ ہوتا۔ کبھی کبھی مجتبیٰ دوستوں کے چلے جانے کے بعد کام کو پینڈنگ پڑا دیکھ کر کہتے "یار مسیح! میں تو اب ان لوگوں سے بیزار آ گیا ہوں!" اس پر میں کہتا "مگر آپ ان سے جاتے وقت یہ کیوں کہتے ہیں کہ "پھر ملاقات کب ہوگی؟" یہ تضاد اس بات کی دلیل ہے کہ دوست احباب کو جمع کرنا مجتبیٰ حسین کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ ان کے دوستوں میں کیا ادیب، کیا شاعر، کیا وکیل، کیا لیڈر، کیا وزیر، کیا ڈاکٹر، کیا پروفیسر کیا طالب علم کیا جاکی، کیا رکشا والا — غرض ہر قسم کا مال ملے گا۔ وہ ان ہی جیتے جاگتے کرداروں میں سے خام مال اپنے مزاح کے لئے تلاش کر لیتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کا قول ہے کہ حلقۂ احباب کو بڑھانے سے قرض مانگنے میں بڑی سہولت رہتی ہے۔ انہیں اس قسم کی سہولت تھی یا نہیں، یہ میں کہہ نہیں سکتا۔ البتہ میں یہ پورے یقین کے ساتھ

کہہ سکتا ہوں کہ ان کے دوست احباب نے ان کے آفس کی کرسیوں کو توڑنے میں بڑا اہم رول ادا کیا تھا۔ یہی نہیں وہ مجتبیٰ کی کرسی پر اس ڈھٹائی سے بیٹھتے کہ کبھی کبھی چپراسی کو یہ دھوکا ہوتا کہ شاید مجتبیٰ کی جگہ کوئی اور ٹرانسفر ہو کر آیا ہے۔ جب تک مجتبیٰ محکمہ اطلاعات میں کام کرتے رہے، ان کی کرسی، ان کی نزاکت کے لئے درستی رہی تھی۔ یوں بھی وہ کھڑے کھڑے ہی کام کیا کرتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار مجتبیٰ نے اپنے ایک بزرگ ساتھی کلرک سے ان کی کرسی کچھ دیر کے لیے مستعار مانگی۔ اس وقت اس بزرگ نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا تھا کہ "مجتبیٰ مجھے معاف رکھو۔ میری کرسی آپ کے دوستوں کے سلوک کی متحمل نہیں۔ وہ ٹوٹ جائے گی اور کرسیاں توڑنے کی علت میں میرا ٹرانسفر ہو جائے گا۔ تمہارا کیا ہے۔ تم نوجوان ہو۔ کہیں بھی ٹرانسفر ہو کر جا سکتے ہو۔ کم از کم میرے بڑھاپے اور بیوی بچوں کا تو لحاظ کرو!" ـــــ اس کے بعد اس بزرگ نے دوستی کا لحاظ رکھتے ہوئے ایک چوکور لکڑی کا تختہ مجتبیٰ کو دیا جسے وہ وہاں جانے تک اپنی کرسی میں جا کر دفتری فرائض انجام دیتے رہے۔

اگر آپ میری اس بات کو حق دوستی یا مبالغہ پر محمول نہ کریں تو میں کہوں گا کہ ادیبوں اور شاعروں کی حد تک سادگی اور انکساری تو بس مجتبیٰ پر ختم ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ اتنی کم عمری میں اتنی ساری شہرت پانے کے باوجود انہوں نے کبھی بھی سادگی اور انکساری کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ میرا خیال ہے کہ سادگی اور انکساری ان کی ذات میں رچ بس گئی ہے۔ بعض لوگ سادگی کو تو اپناتے ہیں لیکن وہ اس کوشش میں اکثر معلوم ہونے لگتے ہیں۔ 'سلام' میں پہل کرنا کوئی مجتبیٰ سے سیکھے! اور یہی پیغمبرانہ شان ہے۔ مجتبیٰ اس بات کے منتظر نہیں رہتے کہ ان کے ملنے والے ان کے ادبی قد سے مرعوب ہو کر سلام کریں۔

مجتبیٰ حسین میری سب سے بڑی کمزوری ہیں۔ وہ میرے عزیز ترین دوست ہیں۔ وہ جس محبت سے میرے ساتھ پیش آتے ہیں، اس کی بنا پر میں انہیں اپنا بڑا بھائی سمجھتا ہوں۔ حالانکہ عمر میں میں ان سے تین سال بڑا ہوں (کم از کم عمر میں تو ان سے بڑا ہوں) میں انہیں عقیدت کی حد تک چاہتا ہوں۔ فن، سادگی اور فروتنی انکسار مجھے کسی ادیب یا شاعر میں یکجا نظر آتے ہیں تو میں اس کی بڑی عزت کرنے لگ جاتا ہوں۔ یہ میری مجبوری نہیں ہے۔ بلکہ میرے بزرگوں نے مجھے یہی سکھایا ہے اور کتابوں میں بھی یہی پڑھا ہے۔ مجتبیٰ حسین کی شخصیت میں خدا نے یہ تینوں چیزیں کوٹ کوٹ کر بھری ہیں۔ مجتبیٰ حسین سے میری محبت کو دیکھ کر میرے دوست مصطفیٰ کمال نے ایک بار یہ فقرہ چست کیا تھا:

"پیام انجم اپنی بیوی کو چھوڑ سکتے ہیں، لیکن مجتبیٰ حسین کی دوستی نہیں چھوڑ سکتے!"

شکر ہے کہ یہ بات میری بیوی تک نہیں پہنچی۔ ورنہ ازدواجی تعلقات میں بڑی گڑبڑ ہو جاتی!

مجتبیٰ کی سب سے بڑی کمزوری سگریٹ ہے۔ وہ سگریٹ کے بغیر ایک سطر تو کیا ایک لفظ بھی نہیں لکھ سکتے۔ وہ اس بے تحاشہ سگریٹ پیتے ہیں کہ مجھے حیرت ہوتی ہے۔ خود ان کا کہنا ہے کہ "اگر میں سگریٹ پینا چھوڑ دوں تو مجھے ملازمت کرنے کی فرصت نہیں۔" ان کے خون کا اگر تجزیہ کیا جائے

تو اس میں ہمہ اقسام کے سگریٹوں اور بیڑیوں کے خواص پائے جائیں گے۔ مگر تعصب، تنگ نظری اور نفرت کا زہر نہیں ملے گا۔ جب لکھنے کا ذکر آہی گیا ہے تو میں یہ بتاتا چلوں کہ ان کی تحریر بالکل کیچڑے کوڑوں سے مشابہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ کبھی کبھی ان کی تحریر خود ان سے نہ پڑھی جاتی ہوگی۔ پاکستان کے ممتاز مزاح نگار عطاالحق قاسمی اپنی ہینڈرائٹنگ کے بارے میں بڑی کوفت میں مبتلا تھے کہ ان کی تحریر دوسروں سے پڑھی نہیں جاتی اور مخطوطہ کی تعریف میں آتی ہے۔ لیکن جب میں نے مجتبیٰ کی تحریر کا حوالہ دیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور پھر فرمایا کہ " یار ! تم نے خوب یاد دلایا۔ مجتبیٰ کی ہینڈرائٹنگ کے بعد کوئی دوسرا ادیب کا یہ دعویٰ کرنا کہ وہ اُس سے زیادہ خراب ہینڈرائٹنگ لکھ سکتا ہے، کچھ جچتا نہیں۔ اس کا سارا کریڈٹ تو مجتبیٰ ہی کو جانا چاہئے۔ میں اس سے دستبردار ہوتا ہوں"۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ آخر مجتبیٰ نے اسکول اور کالج کے امتحانات کس برتہ پر پاس کئے ہوں گے ؟

ان کی دوسری بڑی کمزوری حیدرآباد ہے۔ جانے کو تو مجتبیٰ حسین دہلی چلے گئے ہیں۔ لیکن ان کا دل یہیں کہیں اٹکا ہوا ہے۔ وہ اپنے ہر خط میں یہاں کے ادیبوں اور شاعروں اور شہر کے مختلف ہنگاموں کے بارے میں دریافت کرتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ اپنے دشمنوں تک کا ذکر کچھ ایسے دل نشین انداز میں کرتے ہیں کہ خواہ مخواہ ان سے دشمنی مول لینے کو جی چاہتا ہے۔ میں ان کے بعض خطوں کا جواب گول کرجاتا ہوں۔ آخر میں کتنے خطوں کا جواب دوں ؟ پیشے کے لحاظ سے ٹیچر ہوں۔ اس لیے بعض خطوں کا جواب دے دیتا ہوں۔ اور میں مضامین لکھ کر گزارا کرنا میرا پیشہ ہوتا تو ان کے ایک خط کا بھی جواب نہ دے پاتا۔ مجتبیٰ نے اپنے ایک خط میں یہ فقرہ لکھا تھا :

" حیدرآباد میری طاقت ہے "

میں حیران رہ جاتا ہوں کہ آخر وہ طاقت کہاں ہے اور کس طرح ملتی ہے ؟ کہیں یہ طاقت وہ دعوتیں تو نہیں جو انہیں حیدرآباد میں دی جاتی ہیں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ان کے دشمن بھی ان کی ضیافتیں کرنے سے باز نہیں آتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کے موہنی چہرے پر رقص کرنے والا "کالا جادو" ہی دشمنوں سے ان کی ناز برداریاں کرواتا ہے۔

ایک زمانے تک صرف شعرا ہی داد اور ہوٹنگ کی لذت و آزار سے واقف تھے۔ لیکن مجتبیٰ نے مزاحیہ نثر کو اسٹیج پر پہنچا کر مزاح نگاروں کو بھی اس لذت اور آزار سے واقف کروایا۔ اس سے پہلے کہ میرا حافظہ کمزور ہوجائے میں یہ بتاتا چلوں کہ سارے ہندوستان میں ادبی اجلاسوں کو عام کرنے اور اس کو وہاں خشکی دینے کا سہرا مجتبیٰ ہی کے سر باندھا جاسکتا ہے۔ اب مزاح نگار بڑی آسانی سے یہ اندازہ لگاسکتے ہیں کہ داد ملنے پر ان کے خون میں کتنے گرام کا اضافہ ہوا۔ اور ہوٹنگ پر کس کرب سے گزرے !! میں یہاں تک کہوں گا کہ مجتبیٰ بڑی آسانی سے یہ پیشن گوئی بھی کرسکتے ہیں کہ کس لمحہ ہوٹنگ ہونے والی ہے۔ ایک بار ہوٹنگ اور مزاح کی بات چل نکلی تو مجتبیٰ نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں کہا تھا کہ "ایسا مزاحیہ مضمون نہیں سنانا چاہئے جسے سنتے ہوئے یہ محسوس ہو کہ آم کو منہ میں کر رس نکالا جارہا ہے !" مجتبیٰ مضمون سناتے وقت سامعین پر دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ پہلی ذمہ داری یہ کہ وہ اپنے پسینہ دلوں کی فکر کریں

اور دوسری یہ کہ چھت پر بھی نظر رکھیں ۔ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ مجتبیٰ کے بغیر کسی ادبی اجلاس کی کامیابی کی ضمانت نہیں دی جاسکتی ۔ ان کے قہقہوں میں کئی ہیکاٹن قہقہوں کی قوت پوشیدہ رہتی ہے جو ساری کدورت و سلفت دور کر دیتی ہے ۔ آپ کو یوں محسوس ہوگا جیسے آپ نے خمیرہ مروارید کھالیا ہو !

مجتبیٰ حسین بڑے لطیفہ ساز ہیں ۔ نئے نئے لطیفے تصنیف کرنا اور ان کو کسی کی ذات سے وابستہ کر دینا ان کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے ۔ وہ بات میں بات پیدا کرنا بھی خوب جانتے ہیں ۔ ایک بار دوستوں کی محفل میں ایک صاحب نے ایک شاعر سے مخاطب ہو کر کہا کہ " آپ تو مقامی شاعر ہیں !" اس پر شاعر صاحب بہت بگڑ گئے ۔ مجتبیٰ نے محفل کا رنگ بگڑتا دیکھ کر فوراً کہا کہ " جناب ! اس میں بگڑنے کی کیا بات ہے ؟ مقامی شاعر تو اس کو کہتے ہیں جس کا ادب میں ایک مقام ہو !" کئی قہقہے بلند ہوئے اور بات آئی گئی ہو گئی ۔ ہاں تو یہ مجتبیٰ کی خوبی ! فی البدیہہ چبھتے ہوئے فقرے چھوڑنا اور بات میں بات پیدا کرنا مجتبیٰ کی بے پناہ صلاحیتوں کی دلیل ہے ۔ چنانچہ اسی خصوصیت کی بنا پر اور ان کے رنگ کی مناسبت سے میں انہیں " کالا بچھو " بھی کہتا ہوں ۔ اور سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کا ڈسا ہوا روتا اور بسورتا نہیں ۔ بلکہ مسکراتا ہے ، ہنستا ہے اور قہقہے لگاتا ہے ۔ اور جب یہ تاثیر ختم ہو جاتی ہے تو پھر وہ مجتبیٰ کے پاس جا کر چھیڑ چھاڑ میں مصروف ہو جاتا ہے ۔ جیسے کہ رہا ہو :

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا !!

مجتبیٰ حسین کی ازدواجی زندگی ایک پرسکون جھیل کے مانند ہے ۔ اپنی رفیقۂ حیات کے بارے میں مجتبیٰ نے خود لکھا ہے کہ " اپنی بیوی کی عزت اس لئے کرتا ہوں کہ وہ مجھ سے نفرت نہیں کرتی ۔ " اس ایک خوبصورت فقرے میں مجتبیٰ نے اپنی پوری ازدواجی زندگی کو سمو دیا ہے ۔ مجھے کئی بار مجتبیٰ کے گھر جانے بھابی (مسز مجتبیٰ حسین) اور بچوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے ۔ (یوں بھی اپنے آپ کو مجتبیٰ کے خاندان کا ایک فرد ہی تصور کرتا ہوں) ایک مزاح نگار ہونے کے ناطے میں یہ بات کہنے کے موقف میں ہوں کہ گھر اگر جہنم ہو تو مزاح لکھا نہیں جاسکتا ۔ اس کے باوجود اگر کوئی مزاح نگار مزاح لکھنے کا دعوٰی کرتا ہے تو وہ مزاح نہیں " خون ناب " بن جاتا ہے ۔ چنانچہ اسی پرسکون گھریلو ماحول کا نتیجہ ہے کہ مجتبیٰ حسین نے بہت ہی کم عرصہ میں کوئی ایک درجن سے زیادہ باغ و بہار قسم کی تصانیف اردو ادب کو دی ہیں ۔ سچ بات تو یہ ہے کہ مجتبیٰ حسین کی ساری مزاح نگاری کا کریڈٹ (CREDIT) مسز مجتبیٰ حسین کو جانا چاہیئے ۔

رفعت سروش

مثلث کا تیسرا ضلع

مجتبیٰ حسین

اگر میں یہ عرض کروں کہ میرے احباب کا ایک مثلث ایسا ہے جس کے تینوں ضلع ایک سرشت کے ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے نہیں ملتے — یعنی ایک دوسرے میں پیوست نہیں ہوتے — کوئی نہ کوئی چول ڈھیلی رہ جاتی ہے۔ تو شاید آپ یقین نہ کریں۔ یہ مثلث فسادی الشاقین نہیں ہے — اردو ادب کا یہ مثلث — یہ تکونا دیس — صرف حیدرآباد ہی میں نہیں، عالم اردو کے ہر حصے میں، اردو سے محبت رکھنے والے ہر شخص کے دل میں موجود ہے — میں سب سے پہلے اس کے ایک ضلع — محبوب حسین جگر سے ملا — خاموش خاموش اور سراپا خلوص و ایثار — پھر اس کے ساتھ دوسرا ضلع ابراہیم جلیس — طلوع ہوا — اور ایسا طلوع ہوا کہ میرے گوشۂ دل میں "زاویۂ قائمہ" کی تشکیل کر دی۔ اس مثلث کا ہر ضلع دیکھتے ہی دیکھتے پھیلتا گیا — بڑھتا گیا — بڑھتا گیا — پھر اس نے نور کی ایک امر لکیر کی حیثیت اختیار کر لی۔ اور اب وہ سدا روشن اور تابناک ہے۔ اس مثلث کی تشکیل اسی وقت ہوئی جب اس کا ایک تیسرا ضلع — جلوہ گر ہونا شروع ہوا — ورنہ جگر اور جلیس تو محض ایک زاویۂ بنا سکے تھے۔ مگر یہ زاویہ معمولی نہیں۔ تقریباً ۱۵۰° درجہ کا زاویہ۔ اب جو یہ تیسرا ضلع جلوہ گر ہونا شروع ہوا تو اسے اتنے بڑے زاویے کے خطوط کے انتہائی بیرونی نقطوں کو ملانے کے لیے۔ بہت لمبا سفر طے کرنا پڑا۔ کھنچنا پڑا۔ سب سے بڑا ہونا پڑا۔ یہ اس کی مجبوری کہیے یا کچھ اور۔ بڑا بننا اس کے حصے میں آیا۔ تینوں میں سب سے چھوٹا۔ اور پھر بھی سب سے بڑا۔ مثلث کی تکمیل کرنے والے اس تیسرے ضلع کا نام ہے — مجتبیٰ حسین —

جگر اور جلیس سے تو شرف نیاز حاصل ہوا تھا ۱۹۴۵ء کی انجمن ترقی پسند مصنفین کی تاریخی کانفرنس کے موقع پر حیدرآباد میں۔ اور مجتبیٰ حسین سے ملاقات ہوئی بیس بائیس سال بعد دہلی میں۔ اور یہ تو اور بھی بعد میں معلوم ہوا کہ موصوف تکونا دیس مثلث کا تیسرا ضلع ہیں — جو ۱۹۴۵ء میں عالم طفولیت میں ہوں گے۔

مجتبیٰ حسین "تکلف برطرف" قسم کے آدمی ہیں۔ مگر اخلاق کو برطرف نہیں کرتے بلکہ بڑی شان کج ادائی سے ملتے ہیں — یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب میرے دماغ آسمان پر تھے۔ آل انڈیا ریڈیو کے ایک جعفادری افسر اور مشہور افسانہ نگار ریوتی سرن نامتہ ددمیرے کھردرے پن سے متاثر ہو گئے تھے اور میں اردو مجلس (دہلی) کا ایسا پروڈیوسر تھا کہ بقول یاس یگانہ چنگیزی —

چت بھی اپنی ہے پٹ بھی اپنی ہے : میں کہاں ہار ماننے والا !

اب یہ اور بات ہے کہ اس گھوڑدوڑ پن کی لاج رکھنے کے لیے مجھے بہت سے پاپڑ بیلنے پڑے تھے۔ اور پریم ناتھ در جیسے منہ زور گھوڑے کو رام کرنے کے لیے بہت سے کرتب دکھانے پڑے تھے۔

خیر، یہ جملہ معترضہ ہے اور اس میں "خود ستائی" اور "خود نمائی" دونوں ہی کے پہلو نکلتے ہیں۔ بات مسٹر "تکلف برطرف" کی تھی۔ اردو مجلس میں ایک اسکرپٹ رائٹر کی جگہ خالی ہوئی۔ بیکاری اردو ادیبوں کی پہچان ہے۔ چنانچہ اچھے اچھے ادیب کارزار انٹرویو میں خم ٹھونک کر آگئے۔ ریڈیو کا طریقہ ہے کہ اسٹاف آرٹسٹ کی جو جگہ خالی ہوتی ہے۔ اس پر بہت دنوں تک "CARUAL" آرٹسٹ کام کرتے ہیں۔ کام کیا کرتے ہیں۔ اُن کی ناک میں نکیل ڈال کر انھیں سدھایا جاتا ہے۔ (راقم الحروف بھی کبھی اسی طرح سدھایا گیا تھا) اور جب وہ شخص چل نکلتا ہے تو اسے نوکری کے کھونٹے سے باندھ دیا جاتا ہے۔ سلام مچھلی شہری اور طاہرہ حسن کے اُردو مجلس سے اُردو سروس اور ماسکو چلے جانے کے بعد، ہم لوگوں نے یہ جگہ نکالی تھی۔ جسے مشتہر کرنے سے پہلے کئی لوگوں کو سدھایا گیا تھا۔ (اب ان سب کا نام لیکر رسوا کرنا زیادتی ہے) اور خیال تھا کہ انہیں میں سے کسی ایک کو اشتہاری مجرم بنا کر زندانِ اردو مجلس میں محبوس کر لیا جائے گا۔ مگر اشتہار تو اشتہار ہے۔ ہندوستان کے کونے کونے میں پڑھا گیا اور کئی مشہور ادیب آئے، قسمت آزمائی کرتے۔ اور موصوف مسٹر "تکلف برطرف" بھی تشریف لائے۔ جان نہ پہچان۔ صاحب زادے اپنی قلم کا۔ ی کے زعم میں راقم الحروف سے اس طرح مخاطب ہوئے جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ مجھے اس کی یہ ادا تو بہت بھائی کہ اس میں زبردست خود اعتمادی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ مگر پھر اپنا انجام یاد آگیا۔ کہ ایسی ہی عمر میں ذوالفقار بخاری سے بھڑ گیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ آل انڈیا ریڈیو کے اسٹاف آرٹسٹوں کے طویلے میں باندھ دیا گیا۔ اور آہستہ آہستہ تمام خود اعتمادی۔ تمام جوش و خروش۔ تمام تخلیقی صلاحیت۔ قطرہ قطرہ رستی رہی۔ (اگر اب بھی کچھ بچ گیا ہو تو اسے اپنی سخت جانی کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں) اس نوجوان کی ہمت افزائی کے طور پر میں نے اس کی دل شکنی کی۔ اور اسے اپنے دل کی گہرائیوں سے مشورہ دیا کہ میاں! ریڈیو کی ملازمت میں کچھ نہیں رکھا۔ کوئی اور راستہ ڈھونڈو اگر باعزت طور پر جینا چاہتے ہو۔ موصوف میرے ایک عزیز دوست کی سفارش کے ہمراہ تشریف لائے تھے۔ اُنھوں نے مجھے بڑی بدلحاظی کے ساتھ دیکھا۔ بولے تو کچھ نہیں مگر ان کی خاموشی نے مجھے بے نقط سنائی۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں اس ذہین آدمی کے ساتھ بے انصافی نہ ہو جائے اور یہ منتخب نہ کر لیا جائے۔ چنانچہ میں نے اپنا "اثر ورسوخ" استعمال کیا اور مجتبیٰ حسین کو اردو مجلس سے اور اردو مجلس کو مجتبیٰ حسین سے بچالیا — اور اطمینان کا سانس لیا۔ اب اردو مجلس پر اس کے بعد کیا بیتی۔ یہ الگ داستان ہے اور اس بے سرے راگ کو الاپنے کا یہ موقع نہیں۔

قصہ کوتاہ — مجتبیٰ حسین نے زمانے کے اور تھپیڑے کھائے مگر وہ دلّی آنے کی قسم کھائے ہوئے تھے۔ ادھر اُدھر ہاتھ مارے اور آخر کار گجرال کمیٹی کی عاقبت بگاڑنے کے لیے ایجوکیشن منسٹری کی ایک میز پر فٹ ہو گئے — ذہین آدمی ہیں۔ آج کچھ — کل کچھ۔ دیکھتے ہی دیکھتے کلاس ٹو گزیٹڈ افسر بن گئے۔ اب این۔سی۔ای۔آر۔ٹی کے شعبۂ اشاعت کے سیہ و سفید کے مالک ہیں اور آل انڈیا ریڈیو کے اسٹیشن ڈائرکٹر کے برابر تنخواہ پاتے ہیں۔ میں نے دل شکنی نہ کی ہوتی تو شاید ریڈیو اسٹیشن کی کسی جھینپر میز پر بیٹھے قلم گھسیٹ رہے ہوتے۔ اور اب ریڈیو اسٹیشن آتے ہیں تو ایک وی۔آئی۔پی۔ مصنف اور مقرر کی طرح پروگرام انچارج کے کئی ٹیلیفون سُننے اَن سُنے کر دینے کے بعد۔ پوت کے پاؤں پالنے میں — مجتبیٰ حسین نے دہلی آتے ہی اپنے داؤں دکھانے شروع کر دیئے۔ مجتبیٰ اپنے

حبشہ اور شکل وصورت سے ہندوستان کے افلاس اور متوسط طبقہ کے سنگین حالات کی تصویر نظر آتے ہیں۔

ایک فلسفیانہ قسم کی خشکی ان کے نکیلے تبسم کے چہرے پر ہر وقت خیمہ زن رہتی ہے۔ مگر یہ سب فریب کاری ہے۔ ان کے سنجیدہ پیکر کے پہلو میں ایک نہایت زندہ دل دھڑکتا ہے۔ ایسا زندہ دل جو زندہ دلانِ حیدرآباد کی جان ہے۔ اور ان کے بظاہر خشک ہونٹوں سے لطافت کے پھول جھڑتے ہیں اور قلم سے ظرافت کے دریا اس طرح نکلتے ہیں جیسے بذلہ سنجی کا چشمہ بے تحاشہ بہہ رہا ہو۔ مجتبیٰ کا پہلا کارنامہ جو مجھے اس وقت یاد آرہا ہے۔ وہ ہے۔ جامع مسجد اور لال قلعہ کے درمیانی میدان میں۔ مولانا ابوالکلام آزاد جیسے جید عالم کے مزار کے قریب ایک مزاحیہ مشاعرہ کا انعقاد ۔ اور ایسا ویسا انعقاد ۔! انھوں نے ڈاکٹر خلیق انجم کو اپنا ہمنوا بنایا اور ایسا پروگرام ترتیب دیا کہ سبحان اللہ مزاحیہ مشاعرہ اور مزاحیہ شاعر ندارد ۔ ستم ظریفی یہ کہ ہم جیسے سنجیدہ شاعروں کو اکسایا کہ مزاحیہ رنگ میں شعر کہیں ۔ شاعروں کو منہ کا مزہ بدلنے کے لیے مزاح میں فکرِ سخن کرنا اچھا لگا۔ اور سامعین نے اپنے من پسند شاعروں کو جب نئے رنگ میں سنا تو خوب لطف لیا اور مشاعرہ ایسا جم کر ہوا کہ تاریخ بن گیا۔ پھر مجتبیٰ حسین نے دلی والوں کے منہ کو حیدرآباد کا چٹخارہ لگا دیا اور یہاں کے مشاعروں میں حیدرآباد کا رنگ جھلکنے لگا۔ ظاہر ہے مجتبیٰ حسین کے تعلق سے طنز و مزاح کا رنگ اب تک یہاں دلاور فگار، آفتاب لکھنوی اور ہلال رامپوری ہی رنگ جماتے تھے۔ اب آئے بوگس حیدرآبادی۔ ایک مصرعہ بوگس کا۔ اور ایک غالب کا۔ بوگس تحت اللفظ اور غالب ترنم میں ۔ مشاعرہ میں بقول شخصے داد سے چھتیں اڑ گئیں۔ اسی طرح مصطفےٰ علی بیگ حیدرآبادی ۔ نہایت نستعلیق ترنم میں نہایت مزاحیہ کلام۔ دکنی اردو میں طنز و مزاح کے نشتر چبھونے والے گلبرگہ کے شاعر سلیمان خطیب (مرحوم)۔

" پوٹا تھوڑا الاگچی کھاتا ہے"

اور .... طویل القامت ۔ حمایت اللہ ۔ کلام و انداز دونوں دکنی ۔ اور مجتبیٰ نے ایک طرفہ کارروائی نہیں کی۔ دلی کے بہت سے ادیبوں اور شاعروں کے ٹکٹ بھی کٹائے حیدرآباد کے لیے ۔ یعنی دلی میں حیدرآباد اور حیدرآباد میں دلی ۔ چند سال میں ہی مجتبیٰ شمال اور جنوب کے رابطہ کا موثر ذریعہ بن گئے ۔ اردو اکیڈمی نے جشنِ طنز و مزاح کیا تو یہی تھے پردۂ زرنگاری میں ۔ مجتبیٰ حسین تعلقات بنانا بھی جانتے ہیں اور انھیں استوار کرنا بھی۔ وہ اپنا قیمتی وقت مفت بانٹتے ہیں۔ ادیبوں کی تنظیموں کے لیے ۔ اور اسی دریا دلی کا نتیجہ ہے کہ ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع ہے۔ حیدرآباد اور دلی کی تو بات ہی کیا ہے۔ دنیا کے کئی ملکوں میں اردو والے بالخصوص حیدرآبادی جہاں بسے ہیں وہاں مجتبیٰ حسین کا سکہ چلتا ہے۔ اور ان کے مشورہ کے بغیر وہاں کے ادبی پروگرام کامیاب نہیں ہوتے۔ یوپی والوں نے تو رابطہ کمیٹی محض نام کے لیے بنالی ہے۔ دراصل مجتبیٰ حسین ہی یک رکنی رابطہ کمیشن کے چیرمین ہیں۔

بہرحال یہ تو مجتبیٰ کی مصروف سماجی زندگی کا ایک پہلو ہے اور ممکن ہے کہ رابطہ کمیشن کی چیرمین شپ آگے چل کر موصوف کو الیکشن جیتنے میں کام آئے۔ مگر مجتبیٰ نرے رابطہ ہی نہیں ہیں۔ وہ باضابطہ ادیب ہیں اور ایسے ادیب ہیں کہ اچھے اچھوں کے چھکے چھڑا دیتے ہیں اور ہنستے ہنستے ۔۔ مزاح برائے مزاح نہیں ۔ بلکہ مزاح برائے زندگی کی ۔ کسوٹی پر مجتبیٰ کی تحریریں پوری اترتی ہیں ۔ وہ پھبتی کسنے والے، فقرہ بازی کرنے والے اور دوسروں کی پگڑی اچھالنے والے مزاح نگار نہیں۔ پھکڑپن ان کا شعار نہیں ۔ وہ گہرا سماجی اور سیاسی شعور رکھتے ہیں۔ صحافت کے زینے سے ادب کے بام پر پہنچے ہیں اس لیے خوب جانتے ہیں کہ کیا کہنا ہے اور کیا نہیں کہنا ہے

اور کتنا کہتا ہے۔ اس وقت اِن کی تخلیقی کاوشوں کا جائزہ لینا مقصود نہیں مگر یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ مجتبیٰ نے خاکہ نگاری میں ایک ایسا رنگ ایجاد کیا ہے جو شاید ان پر ہی ختم ہو جائے۔ رشید احمد صدیقی نے بھی خاکے لکھے ہیں اور ایک صاحب طرز ادیب کی طرح ان کا مخصوص انداز ہے۔ ایک بھاری بھرکم تبسّم ہونٹوں پر آجاتا ہے۔ رشید صاحب کے کرداروں سے مل کر۔ مگر مجتبیٰ اپنے رنگ میں نرالے ہیں۔ ان کا انداز بوجھل زبان سے پاک اشعار کی پیوندکاری سے عاری۔ وہ اپنے کردار پر مشقِ قلم کرنے سے پہلے اس کا گہرا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس کی شخصیت کے مختلف گوشوں کو اپنی فکر و نظر کی خوردبین سے دیکھتے ہیں۔ اس کی زندگی کی جزئیات سے آشنا ہوتے ہیں۔ اس کی زندگی کا انفرادی پہلو تلاش کرتے ہیں، اسے ان حالات کے تناظر میں دیکھتے ہیں جن سے وہ دوچار ہے۔ پھر نہایت چابکدستی سے ہلکے ہلکے انداز میں اس کا خاکہ قلم بند کرتے ہیں کہ خود وہ کردار بعض اوقات ان الفاظ کے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو جاتا ہے کہ ہاں یہ واقعی میں ہوں۔ میں خود اپنے آپ سے پوشیدہ تھا۔ مجھے آخر مجتبیٰ حسین نے کیسے آشکار کیا۔!!

مجتبیٰ نے دلی کے بہت سے ادیبوں اور شاعروں کے خاکے لکھے ہیں۔ (بقول ایک ادیب کے خاکے اڑائے ہیں) اور جس سنجیدگی سے یہ ان ظرافت آمیز خاکوں کو سرِ محفل پڑھتے ہیں وہ منظر بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ساری محفل زعفران زار بن جاتی ہے، صرف ایک شخص سنجیدہ رہتا ہے۔ سب کو ہنسانے والا۔ مجتبیٰ حسین۔ خاکہ نگاری کی طرح مجتبیٰ نے سفرناموں کو بھی ایک نیا رنگ بخشا ہے۔ جاپان چلو، جاپان چلو ان کا مشہور سفرنامہ ہے۔ اور اس کے بعد وہ جہاں گئے وہاں کی زندگی، وہاں کی بود و باش، وہاں کے لوگوں اور وہاں کے مخصوص سماجی حالات کو پھول بکھیرتے ہوئے قلم سے کاغذ پر اتارا ہے۔ اور ہر موڑ پر ان کا سیاسی اور سماجی شعور ان کا رہنما رہا ہے۔ مجتبیٰ حسین بلاشبہ نئی نسل کے منفرد مزاح نگار ہیں۔ اور نئی نسل ہی کیوں۔ شاید وہ موجودہ تمام مزاح نگاروں میں ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ اور اس کا ثبوت ہے وہ غالب انعام۔ جو انھیں چند سال پیشتر غالب انسٹی ٹیوٹ نے فکر تونسوی، یوسف ناظم، اور رضا نقوی واہی سے پہلے دیا۔ ان کی انفرادیت مسلم ہے۔ اپنے بھائیوں میں بھی وہ اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔ محبوب حسین جگر کی محبوبیت اور صحافت اپنی جگہ ابراہیم جلیس (مرحوم) کی ادبی حیثیت بحیثیت ایک افسانہ نگار کے مسلّم۔ اور مجتبیٰ حسین۔ جو اس مثلث کا تیسرا ضلع ہیں۔ اپنی مثال آپ ہیں۔!

■□

بمبئی میں غفور صاحب کو دیکھ کر میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ بیماریوں کے معاملہ میں "زندہ طلسمات" کو جو اہمیت حاصل ہے وہی اہمیت بمبئی کی تہذیبی زندگی میں غفور صاحب کو حاصل ہے۔ بمبئی میں اگر آپ کو کوئی بھی تہذیبی عارضہ لاحق ہو جائے تو آپ سیدھے غفور صاحب کے پاس چلے جائیے۔ بمبئی کا ہر تہذیبی مسئلہ غفور صاحب سے شروع ہوتا ہے اور ان ہی پر ختم ہوتا ہے۔

سید رحمت علی (حیدرآباد)
(سابق ایم۔ پی)

مجتبیٰ حسین - قہقہوں کا سوداگر

مجتبیٰ حسین کو جاننے کے دعویدار تو بہت سے ہوں گے لیکن میں مجتبیٰ کو ضرورت سے کچھ زیادہ ہی جانتا ہوں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ ذاتِ شریف اتنی آسانی سے سمجھ میں نہیں آنے والی ہے۔ جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں مجتبیٰ اپنے دوستوں کے خاکے اُڑاتا ہے۔ اُس کے بعض دوست اُس سے گھبراتے بھی ہیں کہ کہیں وہ ان کا خاکہ نہ لکھ دے۔ لیکن مجھے ایسا کوئی خوف نہیں ہے کیونکہ عملی سیاست میں ہم لوگ اتنا بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں کہ مجتبیٰ میرا کیا بگاڑ لے گا۔ مجتبیٰ کو میں اُس وقت سے جانتا ہوں جب ہم دونوں حیدرآباد میں اُردو صحافت سے وابستہ تھے۔ وہ روزنامہ "سیاست" میں سب ایڈیٹر تھا اور میں حیدرآباد کا ڈپٹی میئر ہونے کے باوجود روزنامہ "ملاپ" میں رپورٹر کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔

یہ جو مجتبیٰ حسین آپ کے سامنے مسکین سی صورت بنائے بیٹھا ہے دیکھنے میں بہت معصوم دکھائی دیتا ہے لیکن یہ ہے اصل میں کالا بچھو، اس کے کاٹے کو برداشت کرنا بہت مشکل ہے۔

مجھے یاد ہے کہ حیدرآباد میں جب یہ محکمۂ اطلاعات میں کام کرتا تھا تو اس کے باس ایک مشہور شاعر تھے جنھیں ہر دم اپنی شاعری کی فکر رہتی تھی۔ ایک دن حیدرآباد کے ایک گندہ نالے میں پانی کی رکاوٹ کی وجہ سے اس محلہ میں طغیانی آگئی جس میں مجتبیٰ کے باس رہا کرتے تھے۔ مجتبیٰ نے پہلے تو کئی ذریعوں سے اپنے باس کی خیریت معلوم کی، جب پتہ چلا کہ اُس کے باس خیریت سے ہیں اور اُن کے گھر کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے تو اُس نے اطمینان کا سانس لیا لیکن مجتبیٰ کے باس تھے شاعر۔ ڈرامہ کرنے کی انھیں عادت تھی۔ دوپہر میں وہ دفتر آئے تو کچھ احباب کے سامنے کہنے لگے۔
"میں تو برباد ہوگیا، سارے گھر میں گندہ نالے کا پانی آگیا۔ مال و متاع تو خیر پھر بھی آجائے گا لیکن مجھے دُکھ اس بات کا ہے کہ سات صندوقوں میں میرا جو غیر مطبوعہ کلام رکھا ہوا تھا وہ سب گندے نالے میں بہہ گیا۔" دوست اُن سے ہمدردی کرنے لگے تو مجتبیٰ نے بڑی معصومیت کے ساتھ کہا۔ "سر! اس بربادی میں غلطی آپ ہی کی تھی۔"

باس نے پوچھا "میری کیا غلطی ہے؟"

مجتبیٰ نے کہا "سر! اگر آپ نے اپنے غیر مطبوعہ کلام کو پہلے ہی گندے نالے میں پھینک دیا ہوتا تو گندہ

نالے کو کئی معصوموں کے گھروں کو برباد کر کے آپ کے کام تک پہنچنے کی ضرورت نہیں تھی۔"

مجتبیٰ حسین کب کیا کہہ دے گا اس کے بارے میں پیش گوئی کرنا بہت مشکل ہے۔ سیاستدان، ادیب، صحافی تاجر، کوئی بھی اس کے ڈنک سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

ایک ریاست میں ایک فلمی اداکار کی حکومت قائم ہوئی اور اُس نے پہلے ہی مرحلہ پر ایک غلط فیصلہ کیا تو مجتبیٰ نے بیٹھے بیٹھے کہہ دیا " دیکھ لینا اس فلمی چیف منسٹر کی سرکار بہت جلد باکس آفس پر فلاپ ہو جائے گی" ایسی اداکار چیف منسٹر سے اُردو والوں کے ایک وفد نے ملاقات کی تو چیف منسٹر نے اُردو والوں کی صرف باتیں سنیں اور اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں کہا اور خاموش رہے۔ ایک محفل میں چیف منسٹر کے اس رویّہ کا ذکر چلا تو کسی نے پوچھا۔ "آخر چیف منسٹر نے اُردو والوں سے بات کیوں نہیں کی ؟"

مجتبیٰ حسین نے فوراً کہا " اس لئے کہ اُس وقت اس کا ڈائیلاگ رائٹر موجود نہیں تھا" اُس کے لطیفے، اُس کے جملے خود اُس سے زیادہ تیز چلتے ہیں، وہ آج دہلی میں بیٹھ کر کوئی جملہ کہہ دیتا ہے اور دوسرے دن یہ جملہ حیدرآباد پہنچ جاتا ہے۔

مجتبیٰ ہر شیطانی کام نہایت معصومیت کے ساتھ کرتا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ آندھرا پردیش کے ایک سابق چیف منسٹر نے بہت بڑی کابینہ بنائی تھی۔ ہر دوسرا یا تیسرا ایم۔ ایل۔ اے وزیر بن گیا تھا۔ اس پر مختلف حلقوں نے مختلف ردِّعمل کا اظہار کیا، اس معاملے میں مجتبیٰ کا ردِّعمل کیا تھا وہ ملاحظہ فرمائیے۔

اُن دنوں مجتبیٰ حیدرآباد آیا ہوا تھا۔ اس کے ایک دوست نے اُسے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ اتفاق سے اُس کے دوست کا گھر چیف منسٹر کے گھر سے لگا ہوا تھا۔ مجتبیٰ کسی وجہ سے اپنے دوست کے گھر نہ جا سکا۔ شام میں جب اُس کے دوست نے شکایت کی کہ وہ اس کے گھر کیوں نہیں آیا تو مجتبیٰ معصوم سی صورت بنا کر بولا۔ "یار! میں تو تمہارے گھر آنا چاہتا تھا لیکن کوئی آٹو رکشا والا چیف منسٹر کے محلے میں آنے کو تیار نہیں تھا۔ ہر آٹو رکشا ڈرائیور نے کہا کہ صاحب! ہم اُدھر کی سواری نہیں کریں گے کیونکہ وہاں جو بھی جاتا ہے اُسے منسٹر بنا دیا جاتا ہے۔ آٹو رکشا چلانے سے ہمیں جو آمدنی ہوتی ہے وہ عزت کی زندگی گذارنے کے لئے کافی ہے۔ ایک بار منسٹر بن گئے تو آٹو رکشا سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا۔"

آٹھ دس دن وہ حیدرآباد میں رہا اور ایسے ایسے انوکھے لطیفے بنائے کہ دیکھتے ہی دیکھتے حیدرآباد کے گلی کوچوں میں پھیل گئے۔

ایک اہم سماجی شخصیت کی ساٹھویں سالگرہ دھوم دھام سے منانے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ اس دھوم دھام میں مجتبیٰ نے ایک لطیفہ بنایا۔ لطیفہ کچھ اس طرح کا تھا کہ جب اس اہم شخصیت کی ساٹھویں سالگرہ کی تیاریوں کے سلسلے میں اُس شخصیت کے احباب اُن کے گھر آنے جانے لگے تو ایک دن اس اہم شخصیت کی اہلیہ نے ان کے احباب سے پوچھا " ان دنوں آپ لوگ بہت مصروف نظر آتے ہیں، کیا کسی جلسہ کی تیاری چل رہی ہے ؟"

ایک دوست نے کہا " اماں! کیا آپ کو پتہ نہیں ہے کہ ہم آپ کے شوہر کی ساٹھویں سالگرہ منانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔"

اس پر اس اہم شخصیت کی اہلیہ نے کہا: "کیا آپ لوگوں کو اب پتہ چلا ہے کہ میرے شوہر ساٹھ برس کے ہوگئے ہیں۔ میں تو پچھلے تیس برسوں سے اُن کی ساٹھویں سالگرہ منا رہی ہوں۔"

غرض مجتبیٰ ایسے ہی لطیفے بنا کر زندہ رہتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ اس کے ساتھ کسی کے جنازے میں بھی شرکت نہیں کرنا چاہیئے۔ حیدرآباد کے مشہور شاعر سلیمان اریب کی تدفین کے وقت قبرستان میں، میں نے اپنے اور مجتبیٰ کے درمیان ایک شریفانہ فاصلہ قائم رکھا تھا کیونکہ میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ وہاں بھی جملہ بازی میں معروف تھا لیکن اسی مجتبیٰ نے جب سلیمان اریب کی یاد میں مضمون لکھا تو پڑھنے والوں کو خون کے آنسو رُلا دیئے۔ مجتبیٰ کے کردار کا یہ عجیب و غریب پہلو ہے۔ اس کا خیال ہے کہ انسان کا غم اُس کی اپنی ذاتی میراث ہے۔ اسی لئے اسے تنہائی میں محسوس کرنا چاہیئے۔ جب چار آدمی جمع ہوں تو وہاں صرف خوشگوار ماحول ہونا چاہیئے، ہنسی مذاق ہونا چاہیئے۔ زندگی گذارنے کا یہی طریقہ ہے۔

مجتبیٰ کے بارے میں ایک بات اور عرض کردوں کہ یہ اپنی زندگی کم جیتا ہے اور اپنے دوستوں کی زندگی زیادہ جیتا ہے۔ ہر دم دوستوں کے کاموں میں معروف رہتا ہے۔ کوئی دوست پریشانی ہو تو مجتبیٰ اس سے زیادہ پریشان ہوجاتا ہے۔ دوستوں کے طرح طرح کے کام کرتا ہے۔ اس کی ساری زندگی سوشل سروس میں گذر گئی۔ اس کے ایک دوست کے بھائی کا سعودی عرب میں ایکسیڈنٹ ہوا تو یہ بھاگا بھاگا میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔ "آپ کچھ کیجئے"

میں نے کہا۔ "حادثہ سعودی عرب میں ہوا ہے، میں کیا کرسکتا ہوں"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا اور چلا گیا۔ شام میں ملا تو اس کے پاس وزارتِ خارجہ کا ایک ٹیلکس تھا جس میں حادثہ کی ساری تفصیلات تھیں اور حادثہ کا شکار ہونے والے کی موجودہ حالت لکھی گئی تھی۔ پتہ نہیں اس نے کس طرح وزیرِ خارجہ سے ربط پیدا کیا اور چھ سات گھنٹوں کے اندر اندر ساری تفصیلات حاصل کرلیں اور علاج کے سلسلے میں ہدایات بھی روانہ کردیں۔ مجتبیٰ دن بھر دوستوں کے کام میں معروف رہتا ہے کبھی کبھی اُسے احساس ہوتا ہے کہ خود غرضوں کی اس دنیا میں وہ بیوقوف بن رہا ہے لیکن اس احساس کے باوجود وہ اپنی بےوقوفی کو ترک نہیں کرتا، بلکہ خود اپنے بےوقوف بننے کو مزے لے لے کر بیان کرتا ہے۔ خود بھی ہنستا ہے اور دوسروں کو بھی ہنساتا ہے۔

مجتبیٰ کا اسکوٹر سارا دن دوستوں کے کام میں دوڑتا پھرتا ہے۔ کبھی کبھی وہ اپنے اسکوٹر کے بارے میں فخر سے کہتا ہے کہ یہ وہ اسکوٹر ہے جس کی پچھلی نشست پر کئی عظیم ہستیاں بیٹھ چکی ہیں۔ کہتا ہے اس پر صادقین بیٹھ چکے ہیں، پاکستان کا مشہور موسیقار غلام علی بیٹھ چکا ہے۔ مشہور ہندوستانی آرٹسٹ ایم۔ ایف۔ حسین بیٹھ چکے ہیں۔ آندھرا پردیش کے کچھ وزیروں اور آئی اے ایس عہدیداروں کے نام بھی لیتا ہے لیکن اُسے کبھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ اس کا اسکوٹر اس لئے قابلِ فخر ہے کہ اس پر وہ خود بیٹھتا ہے۔ جس دن مجتبیٰ حسین کو یہ احساس ہوجائے گا اُس دن اُس کا پورا کردار بدل جائے گا۔ اور میں نہیں چاہتا کہ اس کا کردار بدلے۔ اگرچہ اس کردار کے ساتھ اس کا نقصان ہی ہوتا ہے مگر اب اُسے نقصان کے ساتھ زندگی گذارنے کی عادت ہوگئی ہے۔ میری دعا ہے کہ وہ دنیا کے ہاتھوں بیوقوف بنتا رہے اور وہ اپنی بیوقوفی پر خود بھی ہنستا رہے اور ہمیں بھی ہنساتا رہے۔ بھلے ہی اس عمل میں اسے کچھ نہ ملتا ہو مگر ہمیں تو بہت کچھ مل جاتا ہے۔

(دہلی کے ایک جلسہ میں پڑھا گیا)

نعیم زبیری
(حیدرآباد)

مُوحَبّتی حُسین

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب مجتبیٰ پکوڑی بڑے شوق سے کھایا کرتا تھا۔ مخصوص اوقات میں سیاست والی سڑک اس کے بے تکلف دوستوں کے لئے "ون وے اسٹریٹ" میں تبدیل ہو جاتی تھی لیکن پھر بھی کوئی نہ کوئی بھولا بھٹکا مجتبیٰ کے چنگل میں پھنس ہی جایا کرتا تھا۔ ایک دن میں سیاست کے قریب ایک ہوٹل میں مجتبیٰ کو پکوڑی کھلانے کے فرض کی انجام دہی میں مصروف تھا کہ اسد جعفری مرحوم ہمیں دیکھ کے ہوٹل میں گھس آیا۔ "ہائیں" اس نے حیرت سے کہا "ابھی ابھی تو تم میرے ساتھ پکوڑی کھا چکے ہو؟"۔

"تو تم کیوں مرے جا رہے ہو۔ اس کا بل بھی تو کسی اور بے وقوف نے دیا تھا" مجتبیٰ نے بچی کھچی پکوڑی پر جھپٹا مارتے ہوئے کہا۔ اور میں خاموشی سے بل دے کر ہوٹل سے باہر نکل آیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مجتبیٰ مزاح نگاری سے زیادہ مزاح گوئی میں مصروف تھا۔ اور اس کا محبوب مشغلہ یہ تھا کہ اپنے شکار سے پکوڑی بھی کھاؤ۔ پھر اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرکے اس کے اندر چھپے ہوئے "میں" کو باہر نکالو اور پھر اگلے موڑ پہ۔ اگلی ہوٹل میں۔ اگلے شکار سے۔ اگلی پلیٹ پکوڑی کھانے تک۔ پچھلے شکار کی معصومانہ slips of tongue سے فائدہ اٹھا کر ایک دو لطیفے بنا لو۔ اور پھر ان کو اگلے شکار پر چھڑک کر اس میں سے دو ایک اور لطیفے نکال لو۔ اور اس طرح وہ اپنے قابلِ رشک اور عمیق بھیجے میں ہزاروں لطیفے تہہ در تہہ جماتا رہا۔ جنھیں وہ بعد میں سیڑھیوں کی طرح استعمال کرکے پہلے حیدرآباد سے دلّی پہنچا اور پھر باہر نکل گیا۔

چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مجتبیٰ کی مزاح نگاری میں پکوڑی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ "پکوڑی" سے "پکوڑے" تک کا سفر مجتبیٰ نے وینگسرکار کی طرح چوے اور چھکّے مار کے طے کیا ہے۔ اپنے مضامین میں جب وہ دلّی کی مخصوص شخصیتوں میں ہوا بھرتا ہے تو کبھی کبھی دوسری طرف دیکھ کے آنکھ مارتا ہوا صاف دکھائی دے جاتا ہے اور ان پہلوانوں کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ وہ اپنے نوکیلے ناخن سے ان کے چہروں پہ چپکے ہوئے چہرے بڑی صفائی سے نوچ رہا ہے۔ پتہ نہیں کتنے "پکوڑے" ان خود ساختہ VIPs نے اسے کھلائے ہوں گے۔ (کیونکہ "پکوڑی" حلق میں اٹکتی نہیں ہے)۔

"آپ اپنا مجموعہ کیوں نہیں چھپواتے ؟" ایک دن میرے ایک نہایت قریبی دوست کے چھوٹے بھائی نے مجھ سے نہایت خلوص سے پوچھا۔

میں نے اسے کئی مرتبہ ٹالا۔ لیکن جب وہ چپک ہی گیا تو میں نے کہا "رسمِ اجرا کے ڈر سے !"

وہ بے چارہ کچھ سمجھ نہیں پایا۔ "رسمِ اجرا کے ڈر سے ؟ کیوں ؟ — وہ تو ایک نہایت اہم رسم ہوتی ہے۔" (جس میں پہلی اور اکثر آخری مرتبہ "قارئین" — یا "ناظرین" کو پتہ چلتا ہے کہ آپ کچھ لکھتے پڑھتے ہیں)۔

پھر مجبوراً مجھے اسے سمجھانا پڑا کہ رسمِ اجرا ہوگی تو پھر مجتبیٰ حسین خاکہ پڑھے گا۔ اور مجتبیٰ کے خاکے کے بعد ممکوک (یعنی وہ جس کے بارے میں خاکہ لکھا گیا ہے) شہر میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ جاتا۔

چنانچہ میں نے اپنی کہانیوں کا مجموعہ اسی وقت شائع کروایا جب وہ حیدرآباد سے سدھار چکا تھا۔ اور پھر رسمِ اجرا، (جس کی عرفیت اختر حسین صاحب کی کوششوں کے نتیجہ میں رسم رونمائی ہوگئی ہے) بھی نہیں ہوا کہ مجتبیٰ حسین کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ کب کہاں سے فن اور شخصیت پر "روشنی" ڈالنے کے لئے چلا آئے کہ یہ اس کا محبوب مشغلہ ہے۔

بہت کم لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ وہ باقاعدگی سے مزاح نگار بننے سے پہلے ایک کہانی نگار بھی تھا اور اس کی کہانیوں میں اتنی شدید گمبھیرتا ہوتی تھی کہ کسی نجومی کے لئے بھی یہ بتانا مشکل تھا کہ وہ مستقبل میں مزاح نگاری کرے گا۔ مجھے اعتراض اس بات پر نہیں ہے کہ وہ کہانی نگاری سے تائب ہوگیا۔ بلکہ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ اس نے اپنی خوبصورت کہانیوں کو بچپن کی بداعمالیوں کی طرح بھولنے کی کوشش کی ہے۔

اہلو والیہ جی۔ ایک ایسے کارخانہ دار ہیں جن کی فیکٹری میں اُردو ادب بنتا ہے۔ وہ ایک بڑے سے کالے صندوق میں بہت سا اُردو ادب لے کے ہندوستان بھر میں گھوما کرتے ہیں۔ اور دیش کے کونے کونے میں پھیلی ہوئی لائبریریوں میں ایک خاص قسم کے اُردو ادب کی "خوشبو" پھیلاتے ہیں۔ ان کا نعرہ ہے کہ بس لکھوائے جاؤ اور چھاپے جاؤ۔

اُردو گھروں میں جب تک ایسی سگھڑ بیبیاں موجود ہیں جو شوہروں کے آفس چلے جانے کے بعد سارے گھریلو کاموں سے فارغ ہوکر، اور بچوں کی پھالیاں والیاں بدل کر چند لمحے سکون کے گذارنا چاہتی ہیں۔ تو قریبی لائبریری سے روزانہ کرایے پر جو کتاب بڑے شوق و ذوق سے پڑھنے کے لئے منگواتی ہیں۔ وہ اہلو والیہ جی کے ادبی کارخانے ہی سے نکلی ہوئی کوئی کتاب ہوتی ہے۔ موصوف کی نظر اس بات پر بھی بڑی گہری ہے کہ ادبی مارکٹ میں کہاں کیا ہو رہا ہے۔ ایک دن وہ نامپلی اسٹیشن پر اُردو ادب کا مشہور صندوق لئے کھڑے تھے تو دو درجن کتابوں کے ایک حیدرآبادی مصنف نے مجھ سے ان کا تعارف کروایا۔ "یہ میرے پبلشر ہیں"

"ہاں جی"۔ انہوں نے بروزن بھاجی اس بیان کی تصدیق کی۔

میرے دوست نے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا "یہ مشہور ادیب فلاں فلاں ہیں"

اہلو والیہ جی نے بڑی فراخدلی سے میرے دوست کی اس غلط بیانی کو درگذر کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا ؟"۔ تو میں ان کے لہجے میں چھپی ہوئی حقارت کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکا۔

بہر حال ٹرین ابھی آئی نہیں تھی تو میں نے اپنی معلومات میں اضافے کے لئے ان سے کچھ سوالات کئے

ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ کون سی کتابیں زیادہ بکتی ہیں تو انہوں نے کہا۔ "مزاکیہ"۔

مجھے مزاکیہ کا ترجمہ کرنے میں زیادہ دیر اس لئے نہیں لگی کہ خود ہم حیدرآبادی بھی "ق" کی دُرگت بنانے میں پنجابیوں سے پیچھے نہیں ہیں۔

"سب سے زیادہ کون سا مزاکیہ ادیب بکتا ہے ؟" میں نے پوچھا۔

"موجبتی حسین" انہوں نے نہایت معصومیت سے میری معلومات میں اضافہ کیا۔

ایک لمحے کے لئے میں چکرا سا گیا۔

اہلووالیہ جی ــــ ! تم نے بھی کس بے محبت شخص کو محبتی بنادیا ہے، جو نہایت بے مروتی سے لمبے لمبے ناخن لئے لوگوں کے چہرے نوچنے دنیا بھر میں گھومتا پھرتا ہے۔

٭٭

شمیم ثریا
پرنسپل ابابیل رضا گرلز کالج الوکہ

مجتبیٰ حسین

ایک تاثر

مجتبیٰ حسین صاحب سے ہماری واقفیت بہت پرانی ہے کیونکہ وہ والدِ مرحوم کے عزیز ترین دوستوں میں سے ہیں مگر اُن کو قریب سے جاننے کا موقعہ ہمیں اُس وقت ملا جب حال ہی میں ہمیں دلّی جانا پڑا۔ ہمارے لئے یہ پہلا موقعہ تھا کہ تنہا دلّی جائیں۔ ایسے میں ایک مینارۂ نور کا خیال آیا۔ وہ تھی مجتبیٰ حسین صاحب کی ہستی۔

ہم نے فوراً اُن سے ربط قائم کیا اور اس تیقن کے بعد کہ دلّی میں ہمارے قیام وغیرہ کی تمام تر ذمہ داری وہ سنبھال لیں گے ہم نے قصدِ سفر کیا۔ سفر کے دوران طرح طرح کے پریشان کن خیالات آتے رہے۔ ہماری حالت کچھ ایسی تھی کہ ؎

منحصر ہو مرنے پہ جس کی اُمید
نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہیئے

ہماری جان میں جان تو اُس وقت آئی جب ہم نے مجتبیٰ صاحب کو بہ نفسِ نفیس اسٹیشن پر موجود دیکھا۔

مجتبیٰ صاحب کے بارے میں ہمیں یہ تو معلوم تھا کہ وہ بلند پایہ کے مزاح نگار ہیں لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ وہ رہتے بھی بلندی پر ہیں۔ یہ بات ہمارے علم میں اُس وقت آئی جب ہم اُن کی قیام گاہ موقوعہ NCERT کیمپس پہنچے اور ہم نے دیکھا کہ وہ چوتھی منزل پر رہتے ہیں۔ ہم نے دل ہی دل میں کہا بھلا وہ ادیب چوٹی کا کیسے ہو سکتا ہے جو گراونڈ فلور پر ہی مل جائے۔ جیسے جیسے ہم سیڑھیاں چڑھتے گئے ہم پر یہ حقیقت واضح ہوتی گئی کہ بے شک مجتبیٰ حسین صاحب کی یہ بلند مقامی منزل بہ منزل ترقی کے زینے چڑھنے کا نتیجہ ہے۔ یہ نہیں کہ وہ سیدھے چوتھی منزل پر ہی پہنچ گئے ہوں۔

اُن کی شخصیت کا ایک اہم پہلو اس وقت روشن ہوا جب ہمیں معلوم ہوا کہ انھوں نے ہمارے قیام کے لئے گیسٹ ہاوز میں چوتھی منزل پر کمرہ محفوظ کروایا ہے اگر وہ ہمیں گراونڈ فلور پر بھی ٹھہراتے تو ہم ممنون ہی ہوتے مگر ان کی زندگی کا یہ اُصول نہیں ہے کہ خود بالائی منزل پسند ہیں اور دوسروں کو نچلی منزل پر دیکھیں۔ ان کی اسی خوبی کے نتیجے میں ہمیں بعد از چڑھنے کا مرحلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ ہم نے سوچا کہ بالائی منزل تک جانا آسان نہیں ہوتا اس لئے جو لوگ بالائی منزل تک نہیں جا سکتے اُن کا نیچے ہونا ہی بہتر ہوتا ہے

مجتبیٰ صاحب کے گھر میں داخل ہونے کے بعد جو بات ہم نے نوٹ کی وہ یہ تھی کہ اُن کے ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم کے درمیان کوئی دروازہ نہیں تھا حالانکہ ہم نے بیشتر لوگوں کو دیکھا ہے جو ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم کے درمیان کا دروازہ ہمیشہ مقفل رکھتے ہیں۔ پہلے پہل تو ہمیں تھوڑا تعجب ہوا لیکن جلد ہی اس کی وجہ ہماری سمجھ میں آ گئی جب مجتبیٰ صاحب نے ڈرائنگ روم کے مہمانوں کو بلا تکلف ڈائننگ روم میں منتقل کر لیا۔ اُن کا ڈائننگ ٹیبل ہر آنے والے کے لئے حاضر خدمت رہتا ہے ایکبار تو جی

میں آیا کہ کہہ دوں، مجتبیٰ صاحب کم از کم ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم کے درمیان ایک پردہ ہی لٹکا دیجئے تاکہ آپ کا ڈائننگ ٹیبل آپ کے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی صحیح و سلامت رہ سکے۔ مگر اس لئے نہ کہا کہ یہ مشورہ اُن کے لئے ہرگز قابلِ قبول نہ ہوتا۔ وہ ڈائننگ ٹیبل کا لوٹ جانا پسند کریں گے مگر اپنے اور عزیز و اقربا کے درمیان مغربیت کے پردے حائل کرنا پسند نہ کریں گے۔

سیڑھیوں اور ڈائننگ ٹیبل کے بعد جس چیز نے ہماری توجہ اپنی جانب کھینچی وہ ٹیلیفون تھا جو دیگر لوازمات کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر موجود تھا۔ کھاتے کھاتے بھی وہ فون پر بات چیت کرتے جاتے۔ فون اُن کے وجود کی علامت ہے جو مسلسل دوسروں سے ربط قائم رکھنا چاہتا ہے۔ بے ربطی و بے تعلقی کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے کیونکہ اس کا مطلب ہے زندگی سے کنارہ کشی۔

غرض مجتبیٰ صاحب اور ٹیلیفون لازم و ملزوم ہیں۔ ان کے گھر میں داخل ہونے کے بعد آپ کا تعارف یا تو اہلِ خانہ سے ہوگا یا فون سے۔ یعنی یہ کہ کبھی وہ فون پہلے ریسیو کریں اور پھر کہیں کہ "ان سے ملئے یہ ہیں ہماری مسز" یا پھر یہ کہ پہلے کہیں "ان سے ملئے یہ ہیں ہماری مسز" اور پھر فون کی جانب لپکیں۔ اب یہ تو حالات پر منحصر ہے کہ پہلے بیوی آجائے یا فون۔ ویسے جب ہم پہنچے تو ہمارا تعارف پہلے فون سے ہوا اور بعد میں اُن کی بیگم صاحبہ سے۔ بعض اوقات ہم نے فون کو اُن کی بیگم صاحبہ پر سبقت پاتے دیکھا مثلاً رات کو اُن کے بیڈ روم میں فون کا ہونا لازمی ہے جبکہ بیوی کا ہونا لازمی نہیں ہے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اگر فون کی گھنٹی بج رہی ہو تو ٹھیک ہے ورنہ اُن کا پہلا سوال یہی ہوگا "کیا کوئی فون آیا تھا"؟

یہاں ایک بات ہم آپ کو بتاتے چلیں۔ ہمارے قیاس کے مطابق گھر میں داخل ہونے پر اُن کا سوال "اجی کہاں ہو، سنتی ہو؟" ہونا چاہئے تھا۔ اس قیاس کی وجہ یہ تھی کہ ہم نے سنا تھا کہ مجتبیٰ صاحب کی شادی اُس وقت ہوئی تھی جب وہ ابھی بی۔اے کے طالب علم تھے۔ اس حساب سے اُن کی شادی کو اتنا عرصہ گزر چکا تھا کہ اُسے محض "اجی سنتی ہو" کی حد تک باقی رہنا چاہئے تھا۔ ہمیں اپنے قیاس کے غلط ثابت ہونے پر خوشی محسوس ہوئی اور اس میں اضافہ اس وقت ہوا جب ہم نے مجتبیٰ صاحب اور اُن کی بیگم کو کسی تقریب میں شرکت کے لئے ساتھ ساتھ سکوٹر پر جاتے دیکھا۔ اُنھیں سویرے سویرے اپنے نواسے کو اسکول چھوڑنے جاتے دیکھ کر بھی خوشی ہوئی اور یہ دیکھ کر بھی کہ وہ اپنے روس میں مقیم فرزند کا خط نہ آنے پر کتنے فکر مند ہیں۔ ہمارے یہاں شاعر و ادیب سماجی و خاندانی زندگی میں بہت کم توازن رکھ پاتے ہیں لیکن مجتبیٰ صاحب نے جس طرح دونوں سے صحت مند رشتہ قائم کر رکھا ہے وہ ہمیں اچھا لگا۔

مجتبیٰ صاحب کی شخصیت کے یہ روپ ہم نے اپنے دو روزہ قیام دلّی میں دیکھے اور یہ تاثر لے کر لوٹے کہ جب تک مجتبیٰ حسین جیسے لوگ موجود ہیں ہماری تہذیب و وضعداری کی ساکھ بنی رہے گی۔

٭ ٭ ٭

"مسیح انجم سے میری پہلی ملاقات ۱۹۶۸ء میں ہوئی تھی۔ ان کا ایک مزاحیہ مضمون "مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا" ایک مقامی روزنامہ میں چھپا تھا۔ اس مضمون کے ساتھ ایک تصویر بھی چھپی تھی۔ مضمون مجھے بہت پسند آیا تھا مگر تصویر پسند نہیں آئی تھی۔ کیوں کہ اس تصویر میں مسیح انجم کم تھے اور ان کی داڑھی زیادہ تھی۔"

مجتبیٰ حسین

"سائیڈ سے چلئے" مصنف مسیح انجم

جے پال نانگیا
(نئی دہلی)

مجتبیٰ حسین ــ بحیثیتِ عہدیدار

مجتبیٰ حسین نے پہلے پہل مجھے نہایت لائق اور نہایت محنتی عہدیدار کی حیثیت سے متاثر کیا۔ اُن دنوں میں (این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی) نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ۔ میں صدر شعبہ اشاعت کی حیثیت سے کام کرتا تھا (اس عہدہ سے میں ابھی دو مہینے پہلے سبکدوش ہوا ہوں) اُن دنوں پبلیکیشن ڈپارٹمنٹ این سی ای آر ٹی کی نصابی کتابیں اور کونسل کی دیگر کتابیں صرف انگریزی اور ہندی میں ہی شائع کرتا تھا۔ ۱۹۷۲ء میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ این سی ای آر ٹی انگریزی اور ہندی کے علاوہ اُردو میں بھی کتابیں شائع کرے ۔ ۱۹۷۴ء تک ایک دو اصحاب اس کام کو انجام دینے کے لئے پبلیکیشن ڈپارٹمنٹ سے وابستہ بھی ہوئے۔ لیکن دو تین کتابیں شائع کرنے کے بعد وہ چلے گئے۔ ۱۹۷۴ء کے اواخر میں ایک کھلے انتخاب میں مجتبیٰ حسین کا تقرر اُردو کے اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے عمل میں آیا۔

جس دن مجتبیٰ حسین نے اسسٹنٹ ایڈیٹر کے فرائض سنبھالے اُسی دن سے انھوں نے اُردو مطبوعات کی اشاعت کے سارے مسائل ، اعلیٰ سطح کی میٹنگ کے لئے مواد کی تیاری اور مرکزی وزارتِ تعلیم سے رابطہ قائم رکھنے کی ساری ذمہ داریاں میرے ہاتھوں سے لے لیں۔ اُردو کتابوں کا جو پروجیکٹ دو برسوں سے لیت و لعل میں پڑا ہوا تھا اس میں اچانک ایک نئی جان سی پیدا ہوگئی اور اُردو کتابوں کی اشاعت کا کام زور و شور کے ساتھ شروع ہوگیا۔ مجتبیٰ حسین نے حضرت امیر خسرو کے بارے میں جو پہلی کتاب این سی ای آر ٹی کی جانب سے شائع کی اُسے ڈی اے وی پی کے قومی مقابلے میں پہلے انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ ۱۹۷۵ء میں پبلیکیشن ڈپارٹمنٹ کے اُردو شعبہ نے عظیم الشان اور حیرت ناک کارنامہ انجام دیا یعنی تین مہینے کے اندر اس شعبہ نے اُردو کی تیس نصابی کتابیں شائع کردیں۔ گویا کونسل نے ہر تیسرے دن میں ایک اُردو کتاب چھاپنے کا ایک نیا ریکارڈ قائم کردکھایا۔ آج این سی ای آر ٹی پہلی جماعت سے بارہویں جماعت تک ۱۰۵ نصابی کتابیں اور زائد نصابی کتابیں شائع کرچکی ہے۔ جن میں سے بیشتر کے کئی کئی ایڈیشن اب تک شائع ہوچکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔

ابتداء میں مجتبیٰ حسین کو میں صرف ایک کارکرد اور قابل عہدیدار کی حیثیت سے جانتا تھا لیکن جوں جوں اُن سے میرا ربط بڑھنے لگا تو مجھے ایک اُردو ادیب کی حیثیت سے اُدب میں اُن کی بے پناہ مقبولیت اور اہمیت کا بھی احساس ہونے لگا۔ یہ بھی احساس ہوا کہ طنز و مزاح جیسی نایاب صنف میں وہ ایک بہت اُونچا مقام رکھتے ہیں۔ یہ عرض کرتا چلوں کہ میں انگریزی ادب کا طالب علم رہ چکا ہوں اور اس زبان کے ایک خاموش ادیب کی حیثیت سے کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا ہوں۔

مجھے ہمیشہ یہ احساس ستاتا رہتا تھا کہ ہندوستان نے کوئی پی جی ووڈ ہاؤس نہیں پیدا کیا۔ مجتبیٰ حسین اور ان کی تحریروں سے جوں جوں آشنا ہوتا گیا۔ مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ مجتبیٰ صاحب کی حسِ مزاح اور الفاظ سے کھیلنے کا انوکھا پن ووڈ ہاؤس سے میل کھاتا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ ان کی طنزیہ و مزاحیہ تخلیقات انگریزی کے بہترین طنز نگاروں کی تخلیقات کے ہم پلہ ہیں۔ اُن کے مضمون "یونیسکو کی چھتری" میں ووڈ ہاؤس کی طنز و ظرافت کی شوخی اور تیزی صاف نظر آتی ہے۔

جب مجھے مجتبیٰ حسین کی ان صلاحیتوں کا اندازہ ہوا تو مجھے تھوڑی سی پشیمانی بھی ہوئی کہ اُردو سے محبت کرنے کے باوجود میں اُن کے کارناموں سے پہلے کیوں واقف نہ ہو سکا۔ میں یہ بتاتا چلوں کہ فورمین کرسچین کالج لاہور میں جب میں پڑھتا تھا تو انٹرمیڈیٹ اور بی۔ایس سی میں میرا اختیاری مضمون اُردو تھا۔ مجھے اُردو سے اور بالخصوص اُردو شاعری سے بے پناہ محبت تھی اور ایک زمانہ وہ تھا جب میں سارا دیوانِ غالبؔ زبانی سنا دیا کرتا تھا۔ کالج کے دنوں میں میرے اکثر ساتھی اُردو کی زلفِ گرہ گیر کے نہ صرف اسیر تھے بلکہ اُن میں سے اکثر شعر بھی کہہ لیتے تھے۔ جبکہ میں انگریزی میں شاعری کیا کرتا تھا اور مضامین لکھا کرتا تھا۔ اس طرح میں فیضؔ، فراقؔ اور ساحرؔ کی شعری تخلیقات سے آشنا ہو چکا تھا۔ اور نثر نگاروں میں عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو اور کرشن چندر کی تحریروں کا مداح تھا۔ پانچویں اور چھٹی دہائی میں، میں رفتہ رفتہ اُردو شعر و اَدب کی دنیا سے دور ہوتا چلا گیا۔ دفتر کی مصروفیات بھی کچھ ایسی رہیں کہ میں انگریزی میں کبھی کبھار چند نظمیں ہی لکھ سکا جو ہندوستان کے انگریزی کے روزناموں اور جریدوں میں شائع ہوتی رہیں۔

مجتبیٰ حسین سے جب ربط ضبط بڑھا تو اُردو کے لئے میرا جو لگاؤ سویا ہوا تھا وہ پھر سے جاگ پڑا۔ پھر ایک دن یہ ہوا کہ جب میں ایک انگریزی نظم لکھنے کے خیال سے بیٹھا تو اچانک ایک اُردو غزل میرے ذہن میں کروٹیں لینے لگی۔ دوسرے دن میں نے یہ غزل مجتبیٰ صاحب کو دکھائی اور اُن سے خواہش کی کہ وہ اس کی اصلاح کریں، اس کے بعد سے یہ معمول سا بن گیا کہ میں اُردو میں غزلیں کہتا اور ان سے بحر، وزن، قافیہ اور ردیف کے نازک مسائل پر تبادلۂ خیال کرتا۔ اُردو سے ایک طویل عرصہ تک دور رہنے کی وجہ سے بعض دفعہ مجھ سے املا کی غلطیاں بھی سرزد ہو جاتی تھیں۔ جنھیں وہ ٹھیک کر دیتے۔ ہر غزل کی اصلاح کے بعد مجتبیٰ صاحب ہنس کر کہتے۔ "میں نے زندگی بھر اپنی تحریروں میں شاعروں اور اُن کی شاعری کا مذاق اڑایا ہے۔ اب اگر کوئی مجھے آپ کی غزل کی اصلاح کرتے ہوئے دیکھ لے تو وہ کیا سمجھے گا"۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ میری بعض غزلیں، ہندی اور اُردو کے بعض رسائل میں بھی شائع ہوئیں۔

رفتہ رفتہ مجھے مجتبیٰ حسین صاحب کی دیگر خوبیوں اور سرگرمیوں کا بھی اندازہ ہونے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ مجتبیٰ صاحب دوپہر کے بعد کوئی نہ کوئی ایسا کام یا مصروفیت نکال لیتے تھے۔ جس میں ان کے لئے باہر جانا ضروری ہو جاتا تھا۔ جیسے کسی مسئلے کو حل کرنے کے لئے ترقی اُردو بورڈ جانا ہو یا کسی سیمینار میں شرکت کرنی ہو۔ مگر یہ بات ضرور ہے کہ جب انھیں باہر جانا ہوتا تو مجھے اس کی اطلاع کر کے ہی باہر جایا کرتے تھے۔ مجھے اس بات سے حیرت ہوتی کہ اکثر و بیشتر سہ پہروں میں دفتر سے باہر رہنے کے باوجود ان کا کام نہایت مکمل ہوتا تھا۔ اور اُردو کتابوں کی اشاعت پر تیزی سے کام بڑھتا گیا۔ نہ صرف وہ ہر کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں منٹ منٹ کی خبر رکھتے تھے بلکہ چند لمحوں کے نوٹس پر پارلیمنٹ

میں اٹھائے گئے کسی سوال کے جواب کے بارے میں سارا مواد پیش کر دیتے تھے۔ اُن کی مستعدی اور کارکردگی پر مجھے حیرت بھی ہوتی تھی۔

میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ پبلیکیشن ڈپارٹمنٹ کے ایک اہم عہدیدار اور ایڈیٹر ہونے کے علاوہ دفتر کے سارے عملے کے بہترین دوست بھی ثابت ہوئے۔ سچ بات یہ ہے کہ جو کوئی بھی کسی مدد کے لئے اُن کے پاس پہنچتا۔ تو وہ اُس کی مدد سے دریغ نہیں کرتے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ راتوں کی محفلوں میں وہ شمع محفل بنے رہتے ہیں۔ اور مختلف قسم کے افراد کے لئے ایک بہترین دوست، فلسفی اور رہنما ثابت ہوتے ہیں۔ مجتبیٰ صاحب کی وساطت سے ہی مجھے اُردو کے کئی شاعروں اور بالخصوص قاضی سلیم اور شہریار سے ملنے کا موقع ملا۔ قاضی سلیم اور شہریار کی بعض نظموں کا بعد میں میں نے انگریزی میں ترجمہ بھی کیا۔

۱۹۸۱ء میں مرکزی وزارتِ تعلیم نے انھیں یونیسکو کے پانچ ہفتوں کے ایک سمینار اور تربیتی پروگرام میں شرکت کے لئے منتخب کیا۔ جس کا نتیجہ اُن کا سفرنامہ "جاپان چلو، جاپان چلو" کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ۱۹۸۴ء میں انھیں غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے طنز و مزاح کا غالب ایوارڈ دیا گیا۔ جو نہ صرف مجتبیٰ حسین کے لئے بلکہ نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ کے لئے ایک اعزاز کی بات تھی۔

۱۹۷۹ء میں مجتبیٰ حسین اُردو کے ایڈیٹر کی آسامی کے لئے اُمیدوار بنے۔ اس عہدے کے لئے امیدوار کا ایم۔اے پاس ہونا لازمی قابلیت میں شامل تھا۔ جبکہ مجتبیٰ حسین نے بی۔اے پاس کیا تھا۔ اس انٹرویو میں ایسے کئی امیدوار پیش ہوئے جو ڈاکٹریٹ کی ڈگری رکھتے تھے۔ انٹرویو کے بعد سارے ماہرین نے بیک زبان یہ کہا کہ جس اُمیدوار کی کتابیں کئی یونیورسٹیوں میں ایم۔اے کے نصاب میں طنز و مزاح کے پرچہ میں حوالے کے طور پر شامل ہیں اُس پر ایم۔اے کی ڈگری رکھنے کی شرط مناسب نہیں ہے اور نتیجہ میں مجتبیٰ حسین کا انتخاب بحیثیت ایڈیٹر عمل میں آیا۔

مجتبیٰ حسین کی بذلہ سنجی اور فقرے بازی دفتر کے تھکے تھکے ماحول میں اچانک ایک خوشگوار تبدیلی پیدا کر دیتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ کونسل نے منشی پریم چند کے بارے میں ایک نہایت خوبصورت کتاب چھاپنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے سرورق پر ایک بڑے سورج کو ایک گاؤں کے اوپر چمکتا ہوا دکھایا گیا تھا۔ اور اس کے پس منظر میں ایک چڑیا کو اُڑتا ہوا دکھایا گیا تھا۔ اس چڑیا کو سرورق کے ڈیزائن میں جس جگہ دکھایا گیا تھا اُس سے میں مطمئن نہیں تھا۔ میں اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے شعبہ کے سینیئر آرٹسٹ مسٹر ہنڈن کے کمرے میں چلا گیا۔ مجتبیٰ حسین اس کتاب کے اُردو ایڈیٹر تھے۔ ان کے علاوہ محکمے کے کئی سینیئر عہدیدار بھی موجود تھے۔ سرورق کو قطعی شکل دینے کے لئے سب سے صلاح و مشورہ ہو رہا تھا۔ اس چڑیا کو مناسب جگہ پر پیش کرنے کے لئے میں نے ہنڈن صاحب کو کئی ہدایات دیں۔ کبھی اس چڑیا کو سورج سے نیچے کیا۔ کبھی اُوپر۔ کبھی اُسے دائیں جانب رکھا، اور کبھی بائیں جانب۔ کئی جگہ اس چڑیا کو رکھا گیا اور پھر اُٹھایا گیا۔ ہنڈن میری ہدایات کے مطابق اس چڑیا کو اِدھر سے اُدھر ہٹاتے رہے۔ کوئی دو تین گھنٹوں کی محنت کے بعد جب میں مطمئن ہو گیا کہ سرورق میں چڑیا کو مناسب جگہ پر رکھ دیا گیا ہے تو میں نے مسٹر ہنڈن کا شکریہ ادا کیا کہ انھیں اس چڑیا کو مناسب جگہ پر رکھنے کے لئے بڑی محنت کرنی پڑی۔ مگر ابھی میرا شکریہ پورا

طرح ادا بھی نہیں ہوا تھا کہ مجتبیٰ حسین نے فوراً کہا۔ "صاحب! آپ غلط ہستی کا شکریہ ادا کر رہے ہیں۔ ہمیں ٹھڈن صاحب کا نہیں بلکہ اس غریب چڑیا کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے جو پچھلے دو گھنٹوں سے کبھی اوپر پرواز کر رہی ہے۔ کبھی نیچے آ رہی ہے، کبھی دائیں جانب اڑ رہی ہے اور کبھی بائیں جانب" یہ سننا تھا کہ ساری محفل زعفران زار بن گئی۔

مجتبیٰ حسین جنہیں میں جانتا ہوں اُن کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ عظیم مزاح نگار، قابل عہدیدار، دوستوں کے دوست، رات کی محفلوں میں جانِ محفل۔ کئی ٹکڑوں میں بٹ جانے کے باوجود وہ ایک مکمل انسان ہیں۔ ہر موسم میں سدا بہار۔

میں اُن کی مزاح نگاری کی پچیسویں سالگرہ پر انہیں مبارکباد دیتا ہوں۔ اور میری یہ تمنا ہے کہ وہ برسوں اُردو طنز و مزاح کی اسی طرح آبیاری کرتے رہیں۔

شمیم نصرتی (حیدرآباد)

قہقہوں کا سوداگر

مجتبیٰ حسین کے نام کے ساتھ ہی اکثر لوگوں کے لبوں پر تبسم بکھر جاتا ہے جو مجتبیٰ حسین کے پسندیدہ مزاح نگار و طنز نگار ہونے کا مظہر ہے۔ مجتبیٰ اردو ادب کے بلند پایہ فنکار اور عظیم مزاح نگار ہیں۔ وہ دنیائے ادب میں ایک ایسے اعلیٰ مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ ان کے فن اور شخصیت کو عالمی سطح پر روشناس ہونے کے لئے قطعی کسی سہارے کی ضرورت باقی نہیں۔ البتہ ان پر قلم اٹھانے والے مجتبیٰ حسین کا سہارا لے کر دنیائے ادب سے متعارف ہو سکتے ہیں جب فنکار فن کی حدیں کو چھو لیتا ہے تو اس کے قلم سے نکلا ہوا ہر لفظ اس کے مداحوں کے لئے باعث فخر و مسرت ہونے کے ساتھ ساتھ سامان فکر بھی مہیا کرتا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے اکثر مضامین میں یہی بات پائی جاتی ہے۔ کسی فنکار پر قلم اٹھانے والے اکثر وہی لوگ ہوتے ہیں جو اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے پوری طرح باخبر رہتے ہیں اور نتیجتاً ان کے احساسات اور جذبات بہت حد تک اس فنکار کی شخصیت سے متاثر ہونے کے علاوہ تعلقات کی بنا پر اس کی ذات سے عقیدت اور محبت کے جذبہ کے تحت داد تحسین پیش کرتے ہیں۔ لیکن میں حلفیہ کہہ سکتا ہوں کہ مجتبیٰ حسین سے میرے کسی بھی قسم کے جائز یا ناجائز تعلقات نہیں ہیں۔

مجتبیٰ حسین کے مضامین میں زندگی کے وہی مسائل و واقعات ملیں گے جو انسان کا مقدر بن چکے ہیں جن کی گتھیوں کو وہ سالہا سال سے سلجھانے کی مسلسل جدوجہد کر رہا ہے لیکن گتھیاں سلجھنے کے بجائے اور الجھتی جارہی ہیں۔ مجتبیٰ ان ہی گتھیوں کو اپنے طنز و مزاح کا ذریعہ بناتے ہیں اور ایک پراگندہ ذہن کے قاری کو جو کشمکش حیات سے تنگ آچکا ہو ایک نئی زندگی عطا کر کے اس کے غموں اور افکار میں برابر کے حصہ دار بن جاتے ہیں مجتبیٰ کی سماج کی ظاہری اور پوشیدہ مصائب پہ بڑی گہری نظر ہے وہ سماج کی ظاہری چمک دمک سے قطعی مرعوب نہیں ہوتے بلکہ اپنے ماحول کی گہرائیوں میں ڈوب کر زندگی کے مسائل کو اپنی فکر اور ذہنی رسائی کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں اور نتائج کو انتہائی سادگی اور معصومیت سے دلکش انداز میں قارئین کے آگے پیش کرتے ہیں اس لئے ان کے قلم سے نکلا ہوا ہر لفظ قاری کے دل و دماغ پہ ایک گہرا تاثر چھوڑتا ہے اور قاری کے ذہن میں ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اسی کیف و مستی کے عالم میں خود کو مسرور پاتا ہے یا پھر ملول ہو جاتا ہے قاری میں جذبۂ مسرت کا پیدا ہونا مجتبیٰ حسین کے کمال فن اور اعلیٰ مزاح کا جادو ہے۔ قاری کا رنجیدہ خاطر ہونا ان کے تیکھے طنز کا اثر ہے۔ مجتبیٰ جہاں قاری کو ہنسا سکتے ہیں وہیں رلانا بھی خوب جانتے ہیں

مجتبیٰ حسین پوری محفل اور حاضرینِ محفل کے دل و دماغ پر چھا کے پڑھنے کے عادی ہیں جس طرح ایک غزل کو ایک نہایت

خوش الحان شاعر اپنے سحر انگیز ترنم میں لہک لہک کر پڑھتا اور داد و تحسین حاصل کرتا ہے اسی طرح مجتبیٰ اپنے متین اور جامع مضمون کے حسن کو اپنے منفرد پڑھنے کے انداز سے دوبالا کردیتے ہیں اور اپنے طنز و مزاح سے بھرپور شگفتہ و برجستہ جملوں کو ایک انوکھے انداز میں رول رول کر پڑھتے اور سامعین سے داد تحسین حاصل کرتے ہیں جب وہ مضمون پڑھتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی شاعر اپنی گمبھیر اور ٹیکی تلی آواز میں نظم آزاد سنا رہا ہو۔ ایک مرتبہ میں احباب کے ساتھ بزم رنگ پروگرام سن رہا تھا جوں ہی اناؤنسر نے یہ اعلان کیا کہ مجتبیٰ حسین اپنا تازہ مضمون سنائیں گے، میرے ایک ساتھی نے فوری ہنسنا شروع کردیا اور مسلسل ہنسنے لگے۔ ہنسی کی وجہ دریافت کی تو کہنے لگے کہ "کمبخت" اس انداز سے مضمون شروع کرتا ہے کہ پہلے ہی جملے پر ہنسی پھوٹ پڑتی ہے اس لئے میں ہنسنے کا ریہرسل کر رہا ہوں تاکہ اس "ظالم" کے مضمون کا پوری طرح ساتھ دے سکوں اور میرا تو یہ خیال ہے کہ اس شخص کا نام بجائے مجتبیٰ کے قہقہہ رکھ دینا چاہئیے۔ لفظ کمبخت اور ظالم کوئی شریف آدمی کسی شریف آدمی کے لئے خواہ مخواہ استعمال نہیں کرتا۔ مجتبیٰ حسین یقیناً قصوروار ہیں اور ان کا قصور یہ ہے کہ وہ خود روتے ہیں اور دوسروں کے لئے سامان مسرت مہیا کرتے ہیں وہ خود خون کے گھونٹ پیتے ہیں اور دوسروں کو اپنے چیندہ اور موزوں الفاظ کے پاکیزہ پیالوں میں اپنے مزاح کی دلکشی، طبیعت کی شگفتگی، محاوروں کی برجستگی، طنز کی تلخی زبان و بیان کی شیرینی مشاہدات و محسوسات کی عکاسی کے آمیزش سے تیار کردہ شراب پلا دیتے ہیں جس کو پینے کے بعد حساس قاری عالم کیف و سرور میں مدہوش غموں کو بھول کر قہقہے لگانے پر مجبور ہو جاتا ہے

مجتبیٰ حسین انتہائی کم عمری میں ایک عظیم فن کار بن چکے ہیں ۳۰ یا ۴۰ سال کی عمر ایک عظیم فنکار یا تخلیق کار کے لئے نہایت ہی مختصر ہوتی ہے معدودے چند فنکاروں کو اس قدر قلیل عرصہ میں یہ اعلیٰ و ارفع مقام ملا ہے۔ آپ نے مشہور ضرب المثل ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ضرور سنی ہوگی۔ مجتبیٰ حسین کی ابتدائی تخلیقات ہی سے اس امر کا اندازہ ہو چکا تھا چنانچہ ان ہی چکنے پات کی طرف اردو زبان کے شہرۂ آفاق ادیب کرشن چندر نے عثمانیہ میڈیکل کالج کے ادبی اجلاس میں اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ مجتبیٰ حسین میں ایک عظیم فن کار پل رہا ہے اور ان کے قلم سے اردو زبان کو بہت زیادہ توقعات وابستہ ہیں۔ اگر کرشن چندر کے حسب بالا بیان کی روشنی میں مجتبیٰ حسین کے مختلف تخلیقات میں اس عظیم فن کار کو تلاش کیا جائے تو مجتبیٰ کا مقام اپنے ہمعصروں میں اور زیادہ بلند ہو جاتا ہے جب کرشن چندر نے انہیں اپنا پہلا مجموعہ "تکلف برطرف" چھپوانے کی طرف توجہ دلائی تو انہوں نے کرشن چندر ہی سے تعارف لکھنے کی خواہش ظاہر کی مگر کرشن چندر عارضۂ قلب میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے تعارف نہ لکھ سکے اور مجتبیٰ حسین کو کوئی ایسی شخصیت نہ مل سکی جو ان کا مکمل طور پر تعارف کروا سکے۔ چنانچہ انہوں نے خود اپنا تعارف "مجھ سے ملئے" کے عنوان سے اس طرح کروایا ہے

"ان میں سے بعض مجھے ایک میل کی دوری سے جانتے تھے اور بعض ایک فٹ کی قربت سے، لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو مجھے اچھی طرح جانتا ہو۔ لیکن ایک شخص مجھ سے اچھی طرح واقف ہے اور اتفاق سے یہ شخص میں ہی ہوں۔ اگر اپنے تعارف کے سلسلے میں کسی درمیانی شخصیت کا وسیلہ ڈھونڈتا تو مجھے یقین ہے کہ یہ شخص مرنے کے بعد دوزخ میں جاتا کیونکہ یہ شخص میری ایسی صفات کا ذکر کرتا جو مجھ میں قطعاً نہیں ہیں۔"

مجتبیٰ حسین نے اس مضمون میں اپنا تعارف [illegible] نہایت ہی جامع الفاظ میں کروایا ہے اور اپنی ذات سے ذرہ برابر بھی رعایت نہیں کی ہے [illegible] دلچسپ واقعات اسکول اور کالج کے ہنگاموں کے تذکرے سے مجتبیٰ حسین کی

لاابالی زندگی کا پتہ چلتا ہے۔ کالج کے اساتذہ مجتبیٰ حسین کی شرارتوں سے تنگ آکر خفیہ طور پر ہر سال ان سے اس بات کا معاہدہ کر لیتے تھے کہ وہ حتی الامکان اس بات کی کوشش کریں کہ کلاس روم میں داخل نہ ہوں — لیکن ان اساتذہ کو کبھی اس بات کا گمان نہ ہوا ہوگا کہ کلاس روم میں پٹاخے چھوڑنے والا، کتے، بلیوں اور بندروں کی آوازیں نکالنے والا مجتبیٰ حسین اپنے وقت کا بڑا نباض اور سماج کی دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھنے والا ایک عظیم مزاح نگار و طنز نگار بن جائے گا۔

انسان کا جذبۂ غم جس قدر معتبر ہوتا ہے جذبۂ خوشی اسی قدر معتبر نہیں ہوتا۔ لیکن اس جذبۂ مسرت میں بہت زیادہ کیف و سرور پایا جاتا ہے جس کی بنیاد جذبۂ غم پر ہوتی ہے اگر انسان کو طنز کی تلخیوں کا اندازہ ہو تو وہ مزاح کی چاشنی بھی محسوس نہیں کر سکتا۔ مجتبیٰ بھی اسی نظریہ کے حامل ہیں اور وہ اپنے مزاح کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"میرے نزدیک مزاح انسان کے پیمانۂ وجود کے لبریز ہو کر چھلک پڑنے کا نام ہے جب انسان کے وجود کا پیمانہ لبریز ہوتا ہے تو وہ قہقہوں کی شکل میں چھلکنے لگتا ہے لوگ مزاح کی کیفیت کو معمولی کیفیت سمجھتے ہیں۔ حالانکہ سچا مزاح وہی ہے جس کی حدیں سچے غم کی حدوں کے بعد شروع ہوتی ہیں زندگی کی ساری تلخیوں اور اس کی تیزابیت کو اپنے اندر جذب کر لینے کے بعد جو آدمی قہقہہ کی طرف جست لگاتا ہے وہی سچا اور باشعور قہقہہ لگا سکتا ہے۔ ہنسنے کے لئے جس قدر گہرے شعور اور ادراک کی ضرورت ہوتی ہے اتنے گہرے شعور کی ضرورت شاید رونے کے لئے درکار نہیں ہوتی۔"

مجتبیٰ حسین نے اپنے مزاح کی جن جامع الفاظ میں تعریف کی ہے اگر ہم اس پہ سنجیدگی سے غور کریں تو ہمیں اس بات کا پتہ چلے گا کہ وہی شخص زندگی میں قہقہے لگا سکتا ہے جو اپنی مختصر سی زندگی میں پیش آنے والے تلخ و تند واقعات زمانے کی شاطرانہ چالوں احباب کے طعنوں، سماج کی پستیوں اور زندگی کی تلخیوں کے ساتھ بالکل اسی طرح سمجھوتہ کر لے جس طرح اپنے وقت کے عظیم مزاح نگار و طنز نگار مرزا غالب نے

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے ⁂ ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے

کہہ کر زندگی کے تمام تلخ حقائق سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔

مجتبیٰ حسین نے بھی زندگی کی تمام تلخیوں سے مکمل مفاہمت کر لی ہے اسی لئے انہوں نے اپنی مختصر سی زندگی کو قہقہوں سے مالا مال کر لیا ہے اور وہ ان ہی قہقہوں کو دنیا کے کئی غمزدہ انسان کی خدمت میں اپنے خوبصورت مضامین کی شکل میں بطور تحفہ پیش کر دیتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کے مضامین کی معیار کے لحاظ سے درجہ بندی کرنا نہایت مشکل ہے۔ ان کا ہر نمونہ خوب سے خوب تر ہوتا ہے۔ میرے محدود مطالعے میں جو مضامین آئے ہیں ان میں سندباد جہازی کا سفرنامہ "ریلوے منتری مسافر بن گئے" میں اور میرا مزاح" "یہ رکشے والے" "مجھ سے ملیئے" "ناز اٹھانے کو ہم رہ گئے" "اس دور میں ہوتے حاتم طائی" طنز و مزاح کی اچھی مثالیں ہیں مجتبیٰ نے اپنی شخصیت میں پائے جانے والے طنز و مزاح کے جراثیم کو ان مضامین میں نہایت ہی خوبصورت انداز میں منتقل کر دیا ہے "سندباد جہازی کا سفرنامہ" ہمارے قومی مزاج اور ان سفید پوش لیڈروں پر گہرا طنز ہے جو رہنماؤں کے لباس میں رہزنوں کا کردار ادا کر رہے ہیں اور جن کی ہولناکی نے ہم ہندوستانیوں کو ہزاروں ہولناک فسادات کی آگ میں جھونک دیا اور جن کے ایک شیطانی اشارے پر ہزاروں انسانوں کے سروں کی فصلیں

کاٹ لی جاتی ہیں۔ ہزاروں معصوم و شیرخوار یتیم و بے سہارا کر دیئے جاتے ہیں اور بستیاں کی اس مقدس سرزمین پر سینکڑوں ماؤں اور بہنوں کی بڑے ہی اہتمام سے برسرِ عام عصمتیں لوٹ لی جاتی ہیں۔ یہ قتل عام کس قدر منظم پیمانے پر اور کس قدر اہتمام سے کئے جاتے ہیں آپ مجتبیٰ حسین ہی سے سنئیے۔

"اس پر لیڈر نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "مسٹر سندباد آپ کس قسم کا فساد دیکھنا پسند کریں گے" میں نے پوچھا "آپ کے پاس فساد کی کتنی قسمیں ہیں" وہ بولا "اے کلاس سے لے کر زیڈ کلاس تک (فساد کی کئی قسمیں ہیں) افواہی فساد، تباہی فساد، خواہی نخواہی فساد، واہی تباہی فساد، ایک قسم ہو تو گناؤں بھی۔ یہ بتائیے آپ سیدھا سادہ فساد دیکھنا پسند کریں گے یا ایکدم ہنگامہ خیز" میں نے پوچھا۔ ان دونوں فسادات میں کیا فرق ہے؟" وہ بولا "سیدھا سادھا فساد در اصل ہنگامہ خیز فساد کا ٹریلر ہوتا ہے اس میں صرف دوکانات اور مکانات جلائے جانے کے علاوہ انسانوں کا خون بھی بہایا جاتا ہے ان کی بیٹیوں میں چھرے گھونپے جاتے ہیں بچوں کو ذبح کیا جاتا ہے عورتوں کی عصمتیں بڑے ہی اہتمام سے لوٹی جاتی ہیں اور یہ فساد (ONLY FOR ADULTS) ہوتا ہے" اسی مضمون میں وہ آگے لکھتے ہیں کہ اچانک سڑک پر ایک اسکوٹر کی دوسری اسکوٹر سے ٹکر ہو گئی۔ کسی نے چیخ کر کہا "جس اسکوٹر نے ٹکر دی وہ مسلمان اسکوٹر ہے کسی نے کہا "جی نہیں یہ ہماری کاستانی ہندو اسکوٹر کی ہے"۔ ہم اپنے مذہب پر اتنے بڑے حملے کو برداشت نہیں کر سکتے۔ حالانکہ میں نے کلاک ٹاور پر سے دیکھا دونوں اسکوٹروں پر لیڈروں کے آدمی ہی تھے۔ میں کلاک ٹاور پر سے چیخ کر کہنا چاہا کہ میں دھوکہ دہی کے ذریعہ ہونے والا فساد دیکھنا نہیں چاہتا۔ اسی اثناء میں ایک چاقو فضاء میں چمک اٹھا۔ پھر آن کی آن میں فضاء میں چاقو لہرانے لگے۔ برچھے بھالے بھی فضاء میں بلند ہوئے۔ ہندو چاقو مسلمان کی گردن تلاش کرنے لگے اور مسلمان چاقو ہندو کی گردن تلاش کرنے لگے" حسب بالا جملوں میں طنز کی گہرائی اور تلخی مجتبیٰ حسین کے عظیم طنز نگار ہونے کا مظہر ہے

مجتبیٰ حسین نے اپنے دور کو خوب پہچانا ہے اور مصلحتاً انہوں نے سماج کی پستیوں سے مفاہمت بھی کر لی ہے اس لئے سماج نے انہیں اپنا سمجھا اور انہوں نے اس موقع کو غنیمت جان کر اپنے ماحول کی گہرائیوں میں ڈوب کر قوم اور سماج کی دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھ کر اپنے طنز کے تیر و نشتر سے اور مزاح کی چاشنی سے انتہائی ہلکے پھلکے انداز میں اپنے پورے ماحول کی پوشیدہ گندگیوں اور برائیوں کو عوام پر ظاہر کر کے انہیں سماج دشمن عناصر سے پوری طرح باخبر کر دیا۔ اس کے باوجود ان کا یہ کہنا کہ "میں اس بات کا قائل ہوں کہ مزاح کا مقصد قوم کی اصلاح ہونا چاہیئے" ایک حساس ذہن رکھنے والے قاری کو فوری قہقہے لگانے پر مجبور کر دیتا ہے ـــ

"میری زندگی کے دیگر احوال یہ ہیں کہ میں ۱۵ر جولائی ۱۹۳۶ء کو اس دنیا میں پہلی بار پیدا ہوا۔ اس کے بعد سے اب تک مسلسل زندہ ہوں اور اندیشہ ہے کہ آئندہ بھی کئی برسوں تک زندہ رہوں گا"

مجتبیٰ حسین

"مجھ سے ملئے" ـــ "تکلف برطرف"

ایم۔ اے۔ وحید

خاکہ نگار کا خاکہ؟

جناب مجتبیٰ حسین کا خاکہ نگاری میں وہی مقام ہے جو فری اسٹائل کشتیوں میں دارا سنگھ کا۔ "رِنگ" میں آتے ہی تو بھوکے شیر کی طرح اپنے شکار پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی شخصیت کا کچا چٹھا بیان کر ڈالتے ہیں۔ پیشانی پر بل ڈالے بغیر معصوم مسکراہٹوں کے ساتھ شکار کی وہ درگت بناتے ہیں کہ وہ اپنا دفاع کرتے کرتے بے بس اور بے سروساماں ہو کر خود مسکرانے لگتا ہے۔

مجتبیٰ صاحب برصغیر کے بلند پایہ مزاح نگاروں میں سے ایک ہیں [بلکہ اُن کی شہرت بدنامی کی سطح سے آگے بڑھ گئی ہے] ویسے تو میں انھیں پچھلے ۱۷، ۱۸ سال سے جانتا ہوں لیکن سچ پوچھیں تو اس جان پہچان کی نوعیت کچھ "یک رخی راستہ" کی طرح تھی۔ وہ مجھ سے قطعاً ناواقف تھے جبکہ میں انھیں قسطوں میں اِدھر اُدھر دیکھا کرتا تھا۔ میں انھیں یکمشت صرف ایک مقام پر بار بار دیکھتا تھا۔ وہ اکثر "سابق ریاست حیدرآباد" کی ایک "سابق" ہوٹل (جس کا نام میں مصلحتاً نہیں لکھنا چاہتا) آیا کرتے تھے وہ ہوٹل کیا تھی جاگیردارانہ نظام کی مسخ شدہ تصویر تھی مالک سابق جاگیردار، منیجر سابق عہدہ دار، باورچی اور دوسرا اسٹاف کسی زمانے میں شاہی لنگر خانوں سے وابستہ تھے اب ہوٹل کی ملازمت کر رہے تھے۔ گاہکوں کی اکثریت عہدہ داروں، سیاستدانوں، شعراء، ادیبوں، شکاریوں اور جواریوں پر مشتمل تھی خاص بات یہ تھی کہ سب کے نام کے ساتھ "سابق" کا دُم چھلّہ لگا ہوتا تھا ان میں وہ نوجوان بھی شامل تھے جو اپنے آپ کو جامعہ عثمانیہ اور علیگڑھ یونیورسٹی کا قدیم طالب علم بتاتے تھے (ان نوجوانوں کی عمریں ..... ساٹھ سال اور ڈیڑھ سو سال کے درمیان ہوا کرتی تھی) کچھ حضرات ایسے بھی تھے جو شیرخوار نواسوں، پوتوں کے ساتھ صرف BABY SITTING کی غرض سے ہوٹل آتے تھے۔ ہوٹل آتے ہی پہلا کام یہ کرتے کہ اپنی اپنی شیروانیاں ہینگر پر لٹکا کر بڑے ہی سکون سے آرام کرسیوں اور صوفوں پر بیٹھ کر اپنی سابقہ زندگی کا پوسٹ مارٹم کرتے تھے لیکن ہوٹل کا انتظامیہ تھا بڑا ہی بااخلاق، کبھی کسی گاہک سے یہ پوچھ کر دل شکنی نہیں کرتا تھا کہ کیا کھائیں گے کیا پئیں گے، کب تک بیٹھیں گے، کہاں بیٹھیں گے....؟

میں اکثر وہاں جایا کرتا تھا اپنی موٹر سیکل کو ہوٹل کے احاطہ میں پارک کر کے کسی اور ہوٹل میں جا کر چائے نوشی کا شغل کرتا ___ مجتبیٰ حسین کو میں جب بھی دیکھتا اُن کی CHAIN SMOKING اور اُلجھے ہوئے بالوں پہ میری نظر

پڑتی تھی غالباً اُن دنوں مجتبیٰ صاحب کا مشغلہ لکھنا پڑھنا کم تھا اور سوچ بچار زیادہ۔ اُن دنوں حیدرآباد میں پہلی بار "جشنِ اربابِ ذوق" کی تقاریب منعقد ہوئیں تو مجتبیٰ صاحب اس کے انتظامات کے سلسلے میں اِدھر اُدھر دوڑ دھوپ کرتے نظر آتے تھے۔ اُن سے کئی بار مڈبھیڑ ہوئی لیکن باقاعدہ تعارف نہ ہوسکا۔ اسی فنکشن کی تقاریب کے موقع پر میرے دوست جناب شریف اسلم کی عنایت سے مجھے کئی مزاح نگاروں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ شریف صاحب کی شگفتہ مزاجی دوستوں کا سرمایہ ہے وہ نجی ملاقاتوں میں اتنے دل چسپ لطیفے سناتے ہیں کہ بعض اوقات ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑنے لگتے ہیں ان سے میری نوک جھونک ہوتی تھی اُن دنوں شریف صاحب روزنامہ اردو "ملاپ" سے وابستہ تھے۔ میں اکثر تفریحِ طبع کی خاطر اُن سے ملنے پہنچ جاتا تھا۔ میں محسوس کرتا تھا کہ شری یدھ ویر جی کی بھاری بھرکم شخصیت ہر وقت اُن کے اعصاب پر سوار رہتی تھی وہ مجھ سے بات کرتے تو پچاس فیصد ہندی بولتے اور پچاس فیصد اردو کبھی کبھار ہندی کا پلّہ بھاری ہوجاتا تو وہ ساٹھ فیصد تک پہنچ جاتی۔ میں لاکھ کہتا۔

"شریف صاحب! میں آپ کا دوست ہوں، آپ کے اخبار کا قاری نہیں پھر آپ مجھ سے صد فیصد اردو میں بات کیوں نہیں کرتے؟"

وہ مسکرا کر مجھے چیتاؤنی دیتے!

"آہستہ بات کرو اگر یدھ ویر جی نے سُن لیا تو خیر نہیں۔ تم "ملاپ" کے احاطہ میں آکر "ملاپ" کی زبان دانی پر طنز کر رہے ہو؟"

شریف صاحب تو ہندی ترک نہیں کرسکتے تھے کیوں کہ یہ اُن کی مجبوری تھی اور میں شریف صاحب کی دوستی ترک نہیں کرسکتا تھا کیونکہ یہ میری مجبوری تھی۔ اس بے بسی کے نتیجے میں کچھ دن بعد میں روانی سے "ملاپ" کی زبان میں بات کرنے لگا۔ میری اس وفاداری سے خوش ہوکر "ملاپ" نے میرے کچھ مضامین بھی شائع کئے — خیر شریف صاحب کا ذکر یہاں اس لیے آیا کہ وہ میرے اور مجتبیٰ صاحب کے درمیان "رابطہ کی کڑی" ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ انھوں نے میرے اور مجتبیٰ صاحب کے درمیان فاصلہ کو کم کرنے میں "پل" کا کام انجام دیا ہے۔

مجتبیٰ صاحب سے میری ملاقات کے اب تک تین دَور ہوچکے ہیں دو مرتبہ دہلی میں اور ایکبار حیدرآباد میں مجھے مسلسل دو، دو، تین، تین دن تک اُن کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے گھومنے پھرنے کا موقع ملا۔ مجتبیٰ صاحب کے مزاحیہ مضامین پڑھنے کے بعد میں انھیں ایک مہذب اور شائستہ انسان تسلیم کرچکا تھا لیکن جب اُن سے ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ وہ ترقی کرتے کرتے صوفیوں، ولیوں اور سنتوں کے مقام تک پہنچ گئے ہیں اور بدستور مزاح نگاری کررہے ہیں مجھ سے رہا نہ گیا آخرکار ایک دن میں پوچھ بیٹھا۔

"مجتبیٰ صاحب! یہ معاملہ کیا ہے! آپ شراب نہیں پیتے، جوا نہیں کھیلتے، عاشق مزاج نہیں، پھر آپ مزاح نگاری کیسے کرسکتے ہیں؟"

بولے "میں ویجیٹرین ہوں؟"

میں بولا "بہت خوب"

پھر ہم دونوں ہنسنے لگے اس دوران وہ زور زور سے سگریٹ کے کش لیتے رہے۔

پھر ہم دوسری باتوں میں اُلجھ گئے۔

میں جب کبھی اُن سے ملنے گیا وہ بے پناہ مصروفیتوں میں غرق نظر آئے نہ صرف آفس کی مصروفیات میں سر کھپائے رہتے ہیں بلکہ روزآنہ کم از کم ۱۸ گھنٹے تک رفاہِ عام کے کاموں میں اُلجھے رہتے ہیں۔ ادیب، شاعر دوستوں کے مجموعوں کی ایڈیٹنگ، اِملا سے لے کر زبان کی غلطیوں کی اصلاح، کتابت کی نگرانی، پروف ریڈنگ، طباعت و اشاعت، نہ صرف خود سفارشی تبصرے لکھتے ہیں بلکہ دوستوں کے ذریعے بھی کتابوں پر تنقید و تبصروں کی اشاعت کرواتے ہیں پھر ادبی محفلوں میں پابندی سے شرکت کرتے ہیں۔ دوستوں کی خدمت شغلوں میں کرتے ہیں دن بھر کا پروگرام اس طرح کا ہوتا ہے فلاں ادیب کو فلاں شاعر سے ملوانا ہے، فلاں شاعر کی فلاں سیاستداں سے سفارش کرنی ہے، فلاں دوست کو فلاں سفارت خانے سے ویزا دلوانا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔

ہندوستان کے طول و عرض سے شاعر اور ادیب کسی نہ کسی کام کے سلسلے میں دہلی آتے رہتے ہیں کہیں نہ کہیں پی پلا کر مدہوش ہو جاتے ہیں یا راستے میں گر پڑتے ہیں تو رات کے کسی بھی پہر مجتبیٰ صاحب کو فون پر اطلاع کی جاتی ہے۔ مجتبیٰ صاحب اس قدر رقیق القلب ہیں کہ یہ سوچے بغیر کہ موسم کیسا ہے، ایمبولنس لے کر مقامِ واردات پہنچتے ہیں اور اس طرح "ریڈ کراس" کے فرائض انجام دیتے ہیں آئے دن کوئی نہ کوئی دوست اس قسم کی ناگہانی صورتِ حال سے دوچار ہوتا ہے چنانچہ مجتبیٰ صاحب بھی اس معاملہ میں اتنے پختہ کار ہو گئے ہیں کہ اپنے رِند دوستوں کے لڑھکنے کا انتظار اسی مستعدی سے کرتے ہیں جیسا کہ فائر بریگیڈ کا عملہ اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کے لیے ہر پل، ہر گھڑی بے چین رہتا ہے۔ مجتبیٰ حسین کو فون پر اطلاع کیا ملتی ہے وہ دوسرے ہی لمحے FIRST AID BOX کے ساتھ مقامِ واردات پہنچ جاتے ہیں۔

میں نے ایک بار اُن سے پوچھا!

"آپ یہ سب کچھ ادیبوں کے لیے کرتے ہیں یا اُردو کے لیے"

وہ فوراً بولے" اُردو کے لیے"

ساتھ میں یہ بھی وضاحت کی "میں ان دوستوں کی بلانوشیوں کو بُرا نہیں سمجھتا کیوں کہ اردو ادب کا تاریخی اور ثقافتی پس منظر ہی کچھ ایسا ہے کہ ادیب اور شاعر دل کھول کر پیتے ہیں، لڑھکتے ہیں، پھر سنبھلتے ہیں لیکن اپنی بدمستیوں کے باوجود وہ اردو کو اپنے سینے سے لگائے رکھتے ہیں، اردو کے لیے یہ لوگ جس قسم کی قربانیاں دیتے آرہے ہیں اس کے پس منظر میں ان کی رِندانہ سرگرمیاں نظر انداز کی جا سکتی ہیں"

اُن سے حیدرآباد میں ملاقات بھی کافی دلچسپ رہی۔ اُن دنوں حیدرآباد بدترین فسادات کے بعد "جزوی کرفیو" کی زد میں تھا۔ مجتبیٰ صاحب پُرانا شہر جانا چاہتے تھے لیکن حالات کے تعلق سے تشویش کر رہے تھے۔ دوسری طرف بارش زوروں پر تھی۔ کچھ دیر سوچ بچار کے بعد یہ طے ہوا کہ ٹیکسی میں چلیں گے ۔۔۔ یہ ٹیکسی کیا تھی اچھی خاصی BOAT تھی جو حیدرآباد کی سڑکوں پر کشتی رانی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ گاڑی میں ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ نہ صرف دروازوں اور کھڑکیوں سے پانی داخل ہو رہا تھا بلکہ چھت بھی ٹپک رہی تھی اور فرش علیحدہ پانی میں ڈوب چکا تھا۔ میں اور مجتبیٰ صاحب اپنے دونوں پیر سیٹ پر رکھ کر آلتی پالتی مار کر سفر طے کرتے رہے۔ راستے میں وہ ایک مزاح نگار سے ملنا چاہتے تھے چنانچہ ڈرائیور گاڑی کو پرانا شہر کی سڑکوں پر دوڑانے لگا مجتبیٰ صاحب ڈرائیور کو کبھی "لفٹ" کبھی "رائٹ" مڑنے کا اشارہ کرتے جاتے اور وہ سعادت مندی سے گاڑی موڑتا جاتا۔ اب گاڑی سڑک چھوڑ کر گلی کوچوں سے گزرنے لگی۔ راستے میں ایک

قبرستان نظر آیا، ڈرائیور کو گاڑی پھر سیدھے ہاتھ کی طرف موڑنے کے لیے کہا، پھر اُلٹے ہاتھ کی طرف پھر ایک اور قبرستان . . . غرض ہر گلی کوچہ کے بعد ایک قبرستان آتا رہا اور اس کے فوراً بعد گاڑی مڑتی رہی۔ قصّہ مختصر بڑی دیر بعد مزاح نگار صاحب کا گھر ملا لیکن وہ گھر پر موجود نہ تھے۔

میں نے مجتبیٰ صاحب سے پوچھا۔

"کیا آپ کے دوست "چھاپہ مار" قسم کے ادیب ہیں جو اِتنے پُراسرار علاقے میں مکان لے رکھا ہے؟"

مجتبیٰ صاحب میرے اس مزاح سے محظوظ ہوئے اور بولے۔

"وہ واقعی "چھاپہ مار قسم کی چیز ہیں۔ ہمیشہ گھر سے غائب رہتے ہیں۔ لوگ گنجان آبادی والے علاقوں سے بھاگ کر سنسان مقامات پر پناہ لیتے ہیں اور یہ مزاح نگار ایسے ہیں کہ اس سنسان مقام سے راہ فرار اختیار کر کے شہر کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ لیکن ہیں بڑی ہی پیاری شخصیت۔"

مجتبیٰ صاحب جب جاپان میں تھے تو وہاں "ہندوستان والے حسین" کی حیثیت سے مشہور تھے جب سے وطن واپس ہوئے ہیں اُن کی شناخت "جاپان والے مجتبیٰ حسین" کے نام سے ہو رہی ہے۔ وہ بچارے دو، تین ماہ کے لیے ملک سے باہر کیا گئے اپنی انفرادیت تک کھو بیٹھے ہیں۔ پہلے بڑے ہی تپاک سے حیدرآبادی انداز کا سلام کرتے تھے اب جاپانیوں کی طرح جھک کر آداب بجالاتے ہیں۔ ہر بات میں جاپانیت کا رنگ عیاں ہے۔ گھڑی کو ٹوکیو کے مقامی وقت کے مطابق ADJUST کرلیا ہے جاپان کے اوقات کار میں دفتر آتے جاتے ہیں ادھر دفتر پہنچنے میں دیر ہوتی ہے تو آفس والے پریشان ہو جاتے ہیں کہ آخر بات کیا ہے، دوسری طرف ہر روز گھر کو واپسی میں تاخیر ہوتی ہے تو گھر والے الگ تشویش میں پڑ جاتے ہیں۔ پہلے اپنے دراز قد پر ناز کرتے تھے اب دوستوں سے پوچھتے پھرتے ہیں کہ قد چھوٹا کرنے کا کوئی تیز بہدف نسخہ ہو تو بتائیں۔ اُردو ادیبوں اور شاعروں سے راہ و رسم ترک کر کے جاپانی ادیبوں اور شعراء میں اُٹھنے بیٹھنے لگے ہیں بلکہ اکثر "بیٹھنے" لگے ہیں کیونکہ جب جاپانی کھڑے ہوتے ہیں تو مجتبیٰ صاحب کو مساوات کا خیال کرتے ہوئے زیادہ وقت تک "بیٹھے" رہنا پڑتا ہے ورنہ وہ بچارے احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ عادات و اطوار میں اِتنا انقلاب آگیا ہے کہ ہندوستانی کھانے کھاتے وقت بھی تیلیوں CHOPSTICKS کے استعمال کی عادت پڑ گئی ہے۔ جاپان کی سیاست، اسپورٹس، فلمیں غرض ہر چیز میں دلچسپی دکھاتے ہیں اور روز بروز ہندوستانی سیاست، ادب، اسپورٹس سے بے بہرہ ہو رہے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ انھیں جاپانی زلزلوں تک کا مزہ لگ گیا ہے رصدگاہ فون کر کے بار بار پوچھتے ہیں کہ ہندوستان کے کس علاقے میں "زلزلہ" کب آئے گا کیوں کہ میں وہاں پکنک کے لیے جانا چاہتا ہوں۔

ان تمام باتوں کے باوجود مجتبیٰ صاحب کا حیدرآباد سے لگاؤ ابھی تک باقی ہے وہ روزانہ پابندی سے "حیدرآباد ہاؤس" جاتے ہیں۔ حیدرآبادی دوستوں سے گپ شپ لڑاتے اور حیدرآباد کے شب و روز سے آگاہی حاصل کرتے ہیں۔ حیدرآباد کے تعلق سے اتنے حساس ہیں کہ حیدرآباد میں شدید بارش کی اطلاع ملتے ہی یہ دہلی میں چھتری لیے گھومتے ہیں اسی طرح حیدرآباد میں سرد ہوائیں چلتی ہیں تو مجتبیٰ صاحب دہلی میں کھانسنے لگتے ہیں۔ باہمی تعلقات میں اتنے محتاط رہتے ہیں کہ ادیبوں سے ادبی گفتگو نہیں کرتے اور سیاستدانوں سے سیاسی گفتگو نہیں کرتے۔ بلکہ ادیبوں سے سیاست پر اور سیاست دانوں سے ادب پر بات چیت کرتے ہیں۔ ■□

احمد سلطان
حیدرآباد

ہمہ خاندان آفتاب است

ہم نے بچپن میں سُنا اور ہوش سنبھالنے کے بعد چند کتابوں میں پڑھا بھی کہ ادب اور شاعری کسی کی میراث نہیں۔ یعنی بادشاہ کا بیٹا بادشاہ ہو سکتا ہے لیکن کسی ادیب یا شاعر کا بیٹا ادیب یا شاعر نہیں ہوتا۔ اب تو بادشاہ کا بیٹا بھی بادشاہ تو کجا وزیر بھی نہیں ہو سکتا۔ اس قاعدہ سے استثنیٰ کی چند صورتیں مِل جاتی ہیں اور کبھی کبھی کسی ادیب یا شاعر کا بیٹا بھی ادیب یا شاعر ہو جاتا ہے اور بعد میں پچھتاتا ہے۔ پُرانے زمانے میں ادیب یا شاعر فخر سے مونچھوں پہ تاؤ دے کر کہا کرتے تھے کہ ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست ؛ تانہ بخشد خدائے بخشندہ

شاعر ہونے کے باوجود اس بات پر فخر کرتے تھے کہ ؎

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

یہ میر انیس کا ہی مقام تھا کہ انھوں نے نہایت فخر کے ساتھ کہا تھا کہ ؎

پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

آج ادب و شاعری کی ناقدری کے دَور میں جب سائنس، انجینئرنگ، ٹکنالوجی میں داخلہ نہ ملنے پر مجبوراً طالب علم ادب میں داخلہ لیتے ہیں اگر کسی بچہ سے بھی پوچھا جائے کہ میاں تم کیا بننا چاہتے ہو تو وہ بلا تامل جواب دیتا ہے سنیل گاؤسکر اگر کسی حیدرآبادی بچہ سے پوچھا جائے تو وہ اظہر الدین کا نام لے گا۔ حیدرآباد کی گلیوں اور کوچوں میں کتنے ہی اظہر الدین کرکٹ کے بال سے پگڑیاں اچھالتے پھرتے ہیں۔ پگڑی نہ ہو تو گولا سیدھا سر یا پیشانی پر جا لگتا ہے۔ ایک ہی خاندان کے افراد ڈاکٹر، انجینئر، سیاست داں یا بیوپاری ہو سکتے ہیں لیکن ایک ہی خاندان کے افراد کے ادیب یا شاعر ہونے کی مثالیں نہیں ملتیں تاوقتیکہ چراغ کی بجائے کئی ہزار کینڈل پاور کا بلب جلا کر نہ دیکھ لیا جائے۔ پُرانے دَور کی فلموں میں ایک ہی پیشہ یعنی اداکاری کو اپنانے والی بہنیں سلطانہ، زبیدہ اور شہزادی کا ذکر آتا ہے جنھوں نے محض اس لیے یہ پیشہ اختیار کیا تھا کہ خود ان کی ماں فاطمہ بیگم ایک اداکارہ فلمساز و ہدایت کار تھی۔ اسی طرح مشہور گلوکارہ، فلمساز ہدایت کار جدن بائی کی بیٹی نرگس اور دونوں بھائی اختر حسین اور انور حسین نے بھی اداکاری کے جوہر دکھائے۔ جنوبی ہند کی رقص کی [illegible] للیتا، پدمنی اور راگنی نے فلموں میں خوب دھوم مچائی۔

اشوک کمار، انوپ کمار اور کشور کمار ان تینوں بھائیوں کو کون نہیں جانتا۔ کپور خاندان کا تو ہر فرد اداکار یا ہدایتکار نکلا۔ دو بھائی پرتھوی راج کپور اور ترلوک کپور مانے ہوئے اداکار تھے۔ پرتھوی راج کپور کے تینوں بیٹے راجکپور شمی کپور اور ششی کپور بھی ہیرو بنے۔ راجکپور کے تینوں بیٹے رندھیر کپور، ششی کپور اور راجیو کپور آج بھی فلمی دنیا سے وابستہ ہیں۔ ادیبوں اور شاعروں میں ایک ہی خاندان کے تین یا زیادہ افراد کے ادیب یا شاعر ہونے کا کھوج لگانے کے لیے باقاعدہ تحقیق کی ضرورت ہے اور اگر ایسے کسی خاندان کا پتہ چل جائے تو کسی بھی جامعہ کے شعبہ اردو میں پی ایچ ڈی کے لیے رجسٹر کروایا جا سکتا ہے۔

میں ایسے ہی ایک خاندان کا ذکر کرنا باعث عزو وقار سمجھتا ہوں جو حیدرآباد اور ہندو پاک کی سرحدیں پار کر کے عالمی شہرت پا چکا ہے۔ میری مراد تین بھائیوں محبوب حسین جگر، ابراہیم جلیس اور مجتبیٰ حسین سے ہے۔ ان تینوں میں خون کا رشتہ ہی نہیں صحیفہ نگاری بھی مشترک ہے۔ جگر کی ابتداء اور انتہا صحیفہ نگاری ہے۔ جلیس نے افسانہ نگاری سے ابتداء کی اور صحیفہ نگاری کی انتہا کو پہنچ کر جام شہادت نوش کیا۔ مجتبیٰ کی ابتداء بھی صحیفہ نگاری سے ہوئی لیکن انتہا طنز و مزاح نگاری ہے۔ ان بھائیوں نے علاقے بانٹ لیے تاکہ کبھی کچھ دینے لینے کی نوبت نہ آئے۔ بڑے بھائی کے حصہ میں حیدرآباد فرخندہ بنیاد آیا۔ دوسرے بھائی نے پاکستان کا رُخ کیا۔ چھوٹے بھائی نے دہلی کو پایہ تخت بنایا۔ یہ تینوں بھائی جب تک حیدرآباد میں رہے اس طرح رہے کہ اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کے لیے انھوں نے ایک دوسرے کے نام کا سہارا نہیں لیا۔ اس طرح جلسوں اور محفلوں میں گھومتے پھرتے رہے کہ جیسے ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہوں۔ دوسروں کے بارے میں کھوج کرنا چند لوگوں کی فطرت میں داخل ہوتا ہے اور کچھ ایسے ہی لوگوں نے بات کی تہہ کو پہنچ کر پتہ چلا لیا کہ یہ تینوں بھائی ہیں۔ محبوب حسین جگر کو ان کے تخلص کی بنا پر کوئی بھی شاعر کہہ سکتا ہے لیکن ان کے قریبی دوستوں نے بھی شاید کبھی ان کا کلام سنا ہو تاہم میں اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہوں کہ میں نے محبوب حسین جگر کا ایک افسانہ پولیس ایکشن سے پہلے ایک ادبی اجلاس میں سنا ہے جو ڈاکٹر یامین زبیری کے بنگلہ پر منعقد ہوا تھا جس میں عالم خوندمیری اور ابراہیم جلیس بھی موجود تھے۔ اس افسانہ پر ابراہیم جلیس نے سخت تنقید کی جس کا جواب جگر نے بھی اسی ترش لہجے میں دیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے کٹر مخالف ہیں بعد میں سٹی کالج کے میرے ساتھی زینت ساجدہ کے بھائی سید احمد نے یہ انکشاف کیا کہ دونوں بھائی ہیں۔ ادب کے معاملے میں رشتہ داری یا پاس ادب کوئی معنی نہیں رکھتے۔ محبوب حسین جگر ان دنوں محکمۂ اطلاعات میں ملازم تھے حکومت کے اعلامیئے اخباروں کے لیے اجراء کرنے کا اہم کام ان کے تفویض تھا جس میں وہ اس قدر مصروف رہتے تھے کہ افسانہ نگاری طاق نسیاں کی نذر ہو گئی۔ اس طرح ابتدائی ملازمت سے ہی جگر اور صحافت کا میاں بیوی کا رشتہ قائم ہو گیا جس کو وہ آج بھی نباہ رہے ہیں۔ محکمہ اطلاعات میں میری ابتدائی ملازمت کے دوران ان سے روزانہ ظہر کی نماز میں ملاقات ہوتی تھی۔ اطلاعات میں تخفیف کا کلہاڑا چلا تو میرے لیے تعلیم جاری رکھنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ جگر نے عابد علی خان کے ساتھ اخبار سیاست جاری کیا اور آج بھی اس سے وابستہ ہیں اخبار سیاست کی مصروفیت کی وجہ سے محبوب حسین جگر کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے استفادہ کا موقع نہ مل سکا۔ اگرچہ اخبار سیاست میں ان کا نام شاید ہی کسی مضمون یا اہم نگارش پر نظر آیا لیکن سیاست کا قدیم و جدید عملہ اس سے واقف ہے کہ جگر نے سیاست کو خون جگر سے سینچا۔ انھوں نے کئی اہم مضامین اور اداریئے سیاست کے لیے قلمبند کئے۔ انھوں نے بہت کچھ لکھا

اور آج بھی لکھتے رہتے ہیں بے شمار ادیبوں اور شاعروں کو بھی متعارف کرایا ان کی ہمت افزائی کی اور ان کے فکر و فن کو جلا دینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ سیاست سے وابستگی کے طویل دور میں جگر کو حیدرآباد کے تمام ادیبوں اور شاعروں نے بھرپور تعاون دیا اور ان کی عظمت کے معترف ہیں۔

ابراہیم جلیس پولیس ایکشن سے پہلے ادبی محفلوں کی رونق تھے۔ وہ واحد ادیب تھے جن کے قلم کی روانی کسی طوفانی دریا کی طرح رکتی ہی نہ تھی۔ جن کے طنز کے تیر امتدادِ زمانہ کے ساتھ تند و تلخ ہوتے گئے۔ ان کی حسِ مزاح کو زمانے کی تلخی بھی کم نہ کرسکی۔ ان دنوں جلیس کی تخلیقات نے ان کی شہرت کو پر لگا دیئے تھے۔ پولیس ایکشن کے بعد حیدرآباد کے ادیبوں اور شاعروں کے قلم یا تو زنگ آلود ہو چکے تھے یا انھوں نے فرار کی راہ نکال لی تھی ابراہیم جلیس کا قلم ہنسی کی پھلجھڑیاں بکھیرتے ہوئے طنز کے تیکھے اور چبھتے ہوئے فقروں سے قاری کے دل میں اتر جاتا تھا۔ وہ بات سے بات پیدا کرنے میں ماہر تھے۔ وہ بات جو دوسرے ادیب اشاروں اور کنایوں میں کہتے ہوئے جھجکتے تھے جلیس اس خوبی سے کہہ جاتے تھے کہ مخالف چوٹ کھا کر بھی مسکرانے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

ابراہیم جلیس نہ صرف ادبی جلسوں، ریڈیو اور عام جلسوں میں ہی اپنے مضامین سنا کر سامعین کو محظوظ کرتے تھے بلکہ کالجوں کی انجمنیں بھی انہیں مدعو کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ جب میں نے انہیں نظر حیدرآبادی اور شور کے ساتھ سٹی کالج مدعو کیا تو انھوں نے سٹی کالج کے پرنسپل حسین ظہیر کے نظریات کے پیشِ نظر اپنے مضمون کا عنوان بدل کر "ہماری دشمن فرقہ پرستی" کے عنوان سے سنایا اور داد و تحسین حاصل کی۔

حیدرآباد کا ادبی ماحول ابراہیم جلیس کی وسعت نظری کے لیے تنگ ثابت ہوا۔ کرشن چندر، جوش ملیح آبادی، شکیل بدایونی، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطان پوری، اختر الایمان اور رامانند ساگر کی طرح جلیس نے بھی قسمت آزمائی کے لیے بمبئی کی فلمی دنیا کا انتخاب کیا۔ ساحر لدھیانوی کے ساتھ بمبئی کی سڑکوں کی خاک چھانی۔ فلمی دنیا ادبی دنیا سے مختلف ہوتی ہے جہاں ادیبوں اور شاعروں کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ طبع زاد کہانی میں مسالہ شامل کرکے اس قدر تبدیلیاں کردی جاتی ہیں کہ لکھنے والا اپنی کہانی تسلیم کرتے ہوئے شرماتا ہے اس لیے کرشن چندر نے فلمی کہانیاں لکھنے سے توبہ کرلی، اختر الایمان نے بے تکے اور بے معنی گیت نہ لکھنے کا فیصلہ کیا۔ جلیس میں اتنی قدر صبر و تحمل کہاں تھا کہ وہ فلم سازوں کے ناز و نخرے سہتے اور ان کے دربار میں کورنش بجا لاتے۔ وہ چند ہی دنوں میں فلم سازوں سے الجھ کر واپس ہوگئے۔ پاکستان میں قدم جمانے کے بعد ابراہیم جلیس نے ایک بار پھر فلموں سے وابستگی اختیار کی۔ ان کی ایک کہانی پر فلم ساز الیاس رشیدی نے نذر الاسلام کی ہدایت میں فلم احساس بنائی جس میں پاکستان کی مشہور فلمی جوڑی شبنم اور ندیم نے اداکاری کے جوہر دکھائے۔ فلم دیکھنے پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فلم کے ہر منظر میں جلیس کا عکس جھلکتا ہے۔ بولتی تصویر تو سب ہی دیکھتے ہیں بولتا طنز و مزاح فلم احساس میں ہی نظر آتا ہے۔ جلیس ۱۹۴۸ء میں کسی کو کچھ بتائے بغیر پاکستان چلے گئے اور روزنامہ جنگ کے کالم نگار کی حیثیت سے شہرت پائی۔ ایک جری اور بے باک صحافی کے فرائض بہ حسن و خوبی انجام دے کر ادب و صحافت کا مینارۂ نور بن گئے۔ ابراہیم جلیس طالب علمی کے دور ہی سے کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ طالب علمی کے دور ہی میں انھوں نے اپنا پہلا افسانہ لکھ کر حیدرآباد سیول سروس کے لیے نااہلیت کا سرٹیفکیٹ حاصل کرلیا۔ جلیس باغی اور سرکش ادیب تھے اپنی خودداری کا سودا کرکے کسی افسر کو خوش کرنا انھیں گوارا نہ تھا۔ وہ کچھ

دونوں سیول سپلائز میں پبلسٹی افسر بھی رہے۔ اخباروں میں قصابوں کی ہڑتال کے سلسلے میں شائع شدہ اشتہار میں ان کا نام پڑھ کر ہنسی آجاتی تھی۔ لیکن یہ ملازمت انھوں نے جگ ہنسائی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس محکمہ کے وزیر سے اختلافات کی بناء پر ترک کردی۔ وزیروں اور سرمایہ داروں کے خلاف نبرد آزمائی ان کی عادت بن گئی تھی جو پاکستان کے تنگ نظر سیاستدانوں کو ایک آنکھ نہ بھائی جلیس کی نگارشات (زرد چہرے، چالیس کروڑ بھکاری) اور دو ملک ایک کہانی حقیقت نگاری کے صحیفے ہیں۔ ان میں مزاح بھی ہے طنز بھی اور تلخ تجربات و مشاہدات کا نچوڑ بھی۔ ایک صحیفہ نگار کی حیثیت سے لفرت لوٹ کھسوٹ اور انسان دشمن نظریات کے خلاف ان کی جنگ انہیں سلاخوں کے پیچھے لے گئی جہاں انھوں نے اپنی مشہور کتاب "جیل کے دن جیل کی راتیں" قلم بند کی۔ الٹی قبر اور پتے کی بات ان کے مزاحیہ اور طنزیہ مضامین کے مجموعے ہیں۔ روزنامہ جنگ کے طنزیہ کالموں سے ان کے افسانہ نگاری کے فن کو گہن لگ گیا۔ جب دوسرے اخبار مصلحت کا شکار ہو گئے تو جلیس نے خود اپنا اخبار مساوات نکالا جس کو فوجی حکومت کی آہنی سنگینوں نے ادھیڑ ڈالا۔ ۲۷ر اکتوبر ۱۹۷۷ء کو طنز و مزاح کا یہ درخشاں آفتاب ہمیشہ کے لیے اُفقِ ادب سے اوجھل ہو گیا۔

تیسرے بھائی مجتبیٰ حسین کی ادبی خدمات روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں۔ مجتبیٰ حسین نے اپنے بڑے بھائی محبوب حسین جگر کی ہمت افزائی اور اپنے منجھلے بھائی ابراہیم جلیس کی اتباع میں ۱۲ر اگست ۱۹۶۲ء سے مزاح نگاری کا آغاز کیا۔ سیاست کے مشہور کالم "شیشہ و تیشہ" میں جب مزاح کی چاشنی بڑھنے لگی اور چٹخارے لینے کی نوبت آ گئی تو حیدرآباد میں ہر ایک کی زبان پر تھا کہ کون ہے پردۂ زنگاری میں۔ مجتبیٰ کا پردہ سے ظہور حیدرآباد کے طنز و مزاح کی دنیا کا ایک یادگار سنگ میل ہے۔ مشاعرے لوٹنا تو عام بات ہے لیکن ادبی محفلیں لوٹ لینے کی اصطلاح مجتبیٰ حسین پر صادق آتی ہے لطیفوں کی محفلیں ہوں یا طنز و مزاح کے جلسے مجتبیٰ حسین کی شخصیت اُبھر کر نمایاں ہونے لگی۔ پاکستان میں ابراہیم جلیس کے سر پر طنز و مزاح کے شہنشاہ کا تاج رکھا گیا تو ہند میں مجتبیٰ حسین نے دھوم مچا دی۔ مجتبیٰ حسین جب حیدرآباد سے دہلی گئے تو اُن کی شہرت ہند کی سرحدوں کو پار کر گئی۔ دہلی میں مجتبیٰ حسین پوری طرح چھا گئے۔ جلیس کی طرح مجتبیٰ نے بھی بسیار نویسی میں سب کو میلوں پیچھے چھوڑ دیا۔ جو کچھ لکھا وہ بھرتی کا نہ تھا ان میں عمق تھا۔ اپنے ذاتی مشاہدات تھے الفاظ کا صحیح استعمال تھا۔ بات سے بات اس طرح پیدا کی گئی کہ بات پر لطف بن گئی۔ جہاندیدہ ادیبوں نے ان کی صلاحیتوں کو پرکھ لیا۔ نامور طنز و مزاح نگاروں نے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا ان کی تحریروں سے لطف اندوز ہوئے اور ان کے فن کا سکہ جما دیا۔ جلیس نے کوئی سفرنامہ نہیں لکھا۔ مجتبیٰ حسین نے جاپان، روس، امریکہ اور یورپ میں اپنی ڈھاک بٹھا دی۔ ان مقامات کے سفرناموں کو اس قدر دلچسپ پیرایہ میں لکھا کہ یہ خود ایک اہم صنفِ ادب بن گئے۔ مجتبیٰ کی ہر تحریر شگفتہ ہوتی ہے اور ہر مضمون انفرادیت کا حامل ہوتا ہے۔ مجتبیٰ حسین ہر فن مولا ہیں لیکن میری نظر میں ان کے خاکے اور سفرنامے اردو ادب میں ایک نئے باب بلکہ دو نئے بابوں کا اضافہ ہیں۔ خاکے اور سفرنامے اوروں نے بھی لکھے ہیں لیکن مجتبیٰ کے خاکے اور سفرنامے طنز و مزاح کے کلاسکس کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ مجتبیٰ نے انھیں اس قدر دلچسپ بنا دیا ہے کہ اگر کسی محفل میں وہ سُناتے ہیں تو محفل زعفران زار بن جاتی ہے اور اگر کوئی انھیں تنہائی میں پڑھتا ہے تو ہنسی کے اس قدر شدید دورے پڑتے ہیں کہ آس پاس کوئی ہوں تو ان کی صحیح الدماغی پر شک کرنے لگتے ہیں یا تجسس سے کتاب کے بارے میں استفسار کر ڈالتے ہیں۔ سفرناموں میں جدت اور شخصیات و کردار کی تخلیق ان کا اہم کارنامہ ہے۔ غفوروف جیسے کردار

نصوحؔ خوجی اور آزاد سے زیادہ زندگی سے بھرپور اور اپنی دنیا کے معلوم ہوتے ہیں۔ اب تو ہر ایک کی تمنّا ہے کہ مجتبیٰ حسین ان کے ملک کی سیر کریں اور ان کو مہمان نوازی کا شرف بخشیں کہ ان کے نام کو اپنے مضمون میں شامل کر کے زندہ جاوید بنادیں۔ اردو ادب کی طنز و مزاح کی تاریخ میں ان کا نام بھی سنہرے حرفوں سے لکھا جائے گا ان کے خاکے مزاح کی معراج ہیں ان میں مزاح ہی مزاح ہوتا ہے جس طرح دو اور دو چار ہوتے ہیں اسی طرح مجتبیٰ کی صلاحیت مسلّمہ ہے خاکوں کی عظمت کے اعتراف کے لیے کسی ادیب یا شاعر کی سند کی ضرورت نہیں تاہم کنھیا لال کپور نے مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری کے کمال کو اچھی طرح خراج عقیدت ادا کیا ہے کہ "تم نے اس خاکسار کا جو خاکہ لکھا ہے وہ اتنا دل آویز ہے کہ تمہارے قلم کی بلائیں لینے کو جی چاہنے لگا ہے۔" حیدرآباد کی جانی پہچانی شخصیتوں مخدوم محی الدین، خواجہ عبدالغفور، سلیمان اریب، سعید بن محمد، حسن الدین احمد، نریندر لوتھر، وقفل، اختر حسن، حکیم یوسف حسین خان کے خاکے پڑھنے کے بعد بے اختیار واہ واہ نکل جاتی ہے۔

مجتبیٰ حسین نے اپنا پہلا خاکہ حکیم یوسف حسین خان پر لکھا تھا۔ اتفاق سے اس پہلے خاکہ کو سامعین نے بھی پسند کیا اور صاحب خاکہ نے بھی۔ ہر ایک کی خواہش ہے کہ مجتبیٰ حسین اس کا بھی خاکہ اڑائیں۔ زندگی میں نہ سہی مرنے کے بعد جو مزار کے کتبہ سے زیادہ دوام ہوگا۔

مجتبیٰ کے قلم میں روانی ہے۔ طبیعت میں جولانی ہے، حلقۂ ادب وسیع اور ادب نواز ہے۔ حالات موافق ہیں۔ کسی فوجی حکومت کی تلوار بے نیام سر پر لٹک نہیں رہی ہے۔ جو کچھ لکھتے ہیں واہ واہ کی گونج میں نکھرتا جاتا ہے۔ رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی کا مقولہ مجتبیٰ پر صادق آتا ہے۔ مجتبیٰ خوش نصیب ہیں کہ ان کا پیشہ اردو کی خدمت ہے اور ان کا شوق ہنسنا ہنسانا۔ اپنی زندگی میں ہی انھوں نے وہ تمام مراحل طے کرتے ہیں جس کی تمنّا میں آج کتنے ہی طنز و مزاح نگار سرگرداں ہیں۔ طنز و مزاح پر ان کو اتنی قدر عبور حاصل ہو چکا ہے کہ الفاظ ہاتھ باندھے استادہ حکم کے منتظر رہتے ہیں مجتبیٰ اس منزل پر ہیں کہ مستند ہے میرا فرمایا ہوا۔ مجتبیٰ حسین کی سلور جوبلی حقیقی سلور جوبلی ہے فلموں کی گھسیٹی ہوئی نہیں یا اپنے حواریوں و حلقۂ احباب کی مرہونِ منت نہیں۔ طنز و مزاح کے نپے تلے قدموں سے انھوں نے یہ طویل ادبی سفر طے کیا ہے جو خود ایک ناقابلِ شکست ناقابلِ فراموش ادبی کارنامہ ہے۔

لاہور میں میرے گھر کے آگے ایک بھینس بندھی رہتی تھی جس پر میرے دوستوں کو اعتراض ہوا کرتا تھا۔ ایک دن ایک دوست نے سختی سے اعتراض کیا تو میں نے کہا "بھئی ہندو کا محبوب جانور گائے ہے اور مسلمانوں کا محبوب جانور اونٹ ہے، کیا ہم سکھوں کو اپنے محبوب جانور بھینس کو پالنے کا حق نہیں ہے۔

راجندر سنگھ بیدی (راوی مجتبیٰ حسین)

علی باقر
(انگلستان)

بَرسات میں دھوپ

مجتبیٰ حسین سے میں اپنی دوستی کو نوجوانی میں مہینوں میں گنتا تھا، جوانی میں برسوں میں گنتا تھا اور اب دہائیوں میں گننے لگا ہوں اور وہ وقت بھی آنے والا ہے جب دہائیاں گننے میں بھی حافظہ دھوکا کھایا کرے گا لیکن مجتبیٰ حسین سے دوستی کی مدت مسکراہٹ ہنسی اور قہقہوں کے پیمانے میں ہی ناپنی چاہیئے اور جب میں اپنے مشترکہ مگر متوازی ماضی کی طرف ذہن کو دوڑاتا ہوں تو عثمانیہ یونیورسٹی کے خوبصورت آرٹس کالج کے طویل کاریڈور میں مجھے مجتبیٰ کے بلند قہقہے گونجتے سنائی دیتے ہیں جو اس کے کھلے دل سے نکلتے تھے اور پھر اس کے قریب کھڑے ہوئے دوستوں کے قہقہے۔ شام کو عابد روڈ کی رونق سے دامن بچا کر اورینٹ ہوٹل میں چائے پیتے ہوئے ادیب، شاعر نقاد، دانشور اور ان کو ہنساتا ہوا مجتبیٰ۔ اور پھر درجنوں بکی ملاقاتیں اور ادبی محفلیں، کتابوں کی اجرا کی تقریبات اور تعزیتی جلسوں میں سوگواروں کا ہجوم۔ مجتبیٰ ہر محفل کا جان بن جاتا ہے۔ اس میں ہمیشہ سے چلبلا پن ہے، وہ دور ہٹ کر بیٹھنے کا قائل نہیں۔ مجتبیٰ محض تماشہ بین نہیں ہے۔ مجھے ایسے مزاح نگاروں سے ملنے کا بھی اتفاق ہوا ہے جن کے ہونٹوں سے نکلا ایک ایسا جملہ یاد نہیں رہتا جس نے دل کو گدگدایا ہو۔ مجتبیٰ سراپا ہنسی اور مذاق ہے چٹکلے اور لطیفے اس کو اتنی روانی سے یاد رہتے ہیں جس طرح مدینہ ہوٹل کے بیرے کو کھانوں کی فہرست یاد رہتی ہے۔ فرق ہے تو اتنا کہ بیرا آرڈر دی ہوئی بریانی، کباب اور رائتہ آپ کے سامنے رکھ کر، پانی کے گلاسوں میں سے اپنی بھیگی ہوئی انگلیاں نکال کر انھیں پونچھتا ہوا چلا جاتا ہے اور مجتبیٰ اپنے سنائے ہوئے لطیفے پر آپ کے ساتھ خوب ہنستا ہے، اور اپنی حاضر جوابی سے اس لطیفے میں اضافہ کرتا ہے اور پھر ہنستا ہے مجتبیٰ کی شخصیت اس کی تحریر سے جدا نہیں ہے اور اسی لیے اتنی دلفریب ہے

میں یہ مضمون مجتبیٰ کے لئے حیدرآباد میں منعقد ہونے والے " تہنیتی جلسہ " کے موقع پر نکلنے والے 'شگوفہ' کے خصوصی نمبر کیلئے لکھ رہا ہوں اس لیئے مجھے اندازہ ہے کہ زیادہ تر مضامین میں وہ مبالغہ بھی رہے گا جو محبت کی فراوانی سے ہوتا ہے، تکرار بھی رہے گی کہ مضمون نگار حضرات کو آزادی دے دی گئی ہے کہ جو اُن کی مرضی میں آئے لکھیں۔

مجتبیٰ اتنا ہر دلعزیز انسان ہے، اتنا مشہور ادیب ہے، اتنا تہہ دار، پہلودار اور زاویہ دار دوست ہے کہ دل چاہتا ہے کہ اس کے بارے میں خوب لکھوں مگر میں صرف ان باتوں کی طرف اشارہ کروں گا جن کا تعلق میری اور مجتبیٰ کی دوستی سے ہے اور اس کی شخصیت اور تحریر کی ان خوبیوں کا ذکر کروں گا جو عرصہ تک ایک دوست

ادیب کو پڑھنے کے بعد سمجھ میں آتی ہیں۔

لطیفے سُنا کر دوسروں کو ہنسانا، چند سطریں لکھ کر ہنسانے کے مقابلے میں آسان کام ہے ۔ لطیفے کی ندرت، آواز کا اُتار چڑھاؤ، مختلف قسم کے تلفظ، چہرے پہ بدلتے ہوئے تاثر اور ڈرامائی انداز سے لطیفے کا کلائمکس ـــ اور اگر حاضرین میں سے کوئی اس وقت کسی پرانی بات کو یاد کر کے بھی ہنسنے لگے تو محفل ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوجاتی ہے۔ یہ کمال مجتبیٰ میں بھی ہے لیکن اس کو اپنی تحریر سے دوسروں کو گدگدانا اور ہنسانا بھی آتا ہے ـــ مجتبیٰ کی تحریر کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے اس کو قاری کی دلی کیفیات سے مکمل آگاہی ہے۔ مجتبیٰ کو پڑھنے کا مطلب ہے خوشگوار احساسات سے دوچار ہونا، عرصہ سے بند کمرے کے دروازے اور کھڑکیاں کھول دینا اور پھولوں سے معطر باغ کی فرحت بخش ہواؤں کو اپنے اطراف محسوس کرنا۔

بی اے کرنے کے فوراً بعد ہی مجتبیٰ نے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اور پچھلے تیس اکتیس برسوں میں اس نے بہت زیادہ لکھا ہے حیدرآباد کے مشہور اخبار "سیاست" میں کالم نگاری کی، صحافت میں دخل رکھا اور آہستہ آہستہ ادب کی ایک مشکل صنف مزاح نگاری کو گلے سے لگا لیا اور میر تقی میرؔ کی طرح تخلیق کے دریا بہا دیئے اور ادب کے غوطہ خوروں پر ذمہ داری ڈال دی کہ وہ نشتر ڈھونڈ نکالیں اور مجتبیٰ کو ادب میں ایک اہم اور منفرد مقام عطا کریں۔ مزاح نگاری کے نازک رنگ پر مجتبیٰ نے اپنی انگلیوں کے نشان چھوڑ دیئے ہیں اور یہ نشان دھبے نہیں لگتے بلکہ پھول نظر آتے ہیں، پھولوں کی طرح خوشبودار ہوتے ہیں، پھولوں کی طرح گنگناتے ہیں، پھولوں کی طرح خوشبو پھیلاتے ہیں، ان میں پھولوں جیسی رنگین روشنی ہوتی ہے

میری اور مجتبیٰ حسین کی دوستی پرانی ہوتی جاتی ہے مگر اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی ۔ یہ اپنی جگہ مستحکم، استوار اور مضبوط ہے۔ اس زمانہ میں بھی تھی جب ہم آرٹس کالج اور عابد روڈ کی گرد اپنے جوتوں سے صاف کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے، اس زمانہ میں بھی تھی جب ہم الگ الگ ملکوں میں رہتے تھے اور آج بھی ہے جب نئی دلی کے جنوبی علاقہ میں قطب مینار کے زیر سایہ ایک سیدھی اور چوڑی سڑک کے دو ٹکڑوں کے قریب ہم دونوں رہتے ہیں مجتبیٰ سے دوستی کا مطلب ہے اتنا قریب آجانا کہ اور قریب آنا مشکل ہوجائے۔ مجتبیٰ دوست ایسا ہے کہ خواہ مخواہ رازداری کرنے کو دل چاہتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مجتبیٰ ایسا ماہر نفسیات ہوگیا ہے جو ہمارے مسائل کا حل ڈھونڈے گا، ہماری تکلیف پر بہت زیادہ پریشان ہوجائے گا، ہماری خوشی میں ہمیں گلے سے لگائے گا، ہم سے جلن اور حسد سے نہ ملے گا ـ ایسی دوستی ایک ایسے ہمدرد انسان سے ملتی ہے جو ذہین ہوتا ہے، دوسروں کے زاویۂ نگاہ کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور خود اپنی اندرونی طاقت کا بھرپور اندازہ کئے بیٹھے ہوتا ہے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جنھیں مجتبیٰ کی دوستی کی دولت ملی اور ان کی تعداد بھی خاصی ہے

مجتبیٰ حسین نے اپنے تیس سالہ تخلیقی سفر میں اپنی اصلی صلاحیت کو پانے کے لئے کئی تجربات کیے ۔ اس کے کالموں، خاکوں اور مضامین میں طرح طرح کے اثر اور رنگ نظر آتے ہیں اور مجتبیٰ نہایت خلوص سے اعتراف کر لیتا ہے کہ کن ادیبوں، شاعروں اور مزاح نگاروں نے اس کو اور اس سے زیادہ اس کے قلم کو متاثر کیا ہے ؟ کس کتاب نے اس کو توانائی دی ہے ! کس تجربہ نے اس کے دیکھنے کی صلاحیت کو نکھارا ہے ! اور کسی سچائی اور خلوص کی وجہ سے وہ سطحی باتوں سے نظریں ہٹا کر انسانوں کا نفسیاتی تجزیہ کر سکتا ہے اور گہرائی میں چھپی ہوئی حقیقت کو دوسروں کے لئے عیاں کر دیتا ہے مجتبیٰ جب اکیلے میں بھی اپنے بارے میں بات کرتا ہے تو اس کی باتوں میں معصومیت ہوتی ہے وہ اپنی کامیابیوں کا ذکر بھی اسی طرح کر سکتا ہے جس طرح ناکامیوں کا ـــ نہ پہلے میں مغرور ہوتا ہے اور نہ دوسرے میں تلخی اور بدمزگی ـ وہ خود کو

خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش میں پڑھتا رہتا ہے، دوسرے تخلیق کاروں سے ملتا رہتا ہے — اور یہ سب کام وہ نہایت انکساری اور نہایت فراخدلی سے کرتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ مجتبیٰ کے ہم عصروں نے اس کا ادبی مقام متعین کرنے میں بڑی بخالت سے کام لیا ہے جب کہ مجتبیٰ دل کا غنی ہے — سب کی دل کھول کر تعریف کرتا ہے اور خلوص سے، خوشی سے۔ یہ شاید اس لیئے ہے کہ مجتبیٰ کو کسی سے کچھ مانگنا، کسی سے تقاضہ کرنا اچھا نہیں لگتا۔ کسی بھی ادب کی تاریخ میں ان تخلیق کاروں کے نام جلی حروف سے لکھے جاتے ہیں جن کی تخلیق انفرادی ہوتی ہے، کسی ایسی صنف سے تعلق رکھتی ہے جس کو عام ہرگز ادا نہیں کیا جا سکتا اور مزاح نگاری یقیناً ایسی صنف ہے اور اس میدان میں مجتبیٰ کا مقام منفرد ہے ایک اچھے مزاح نگار کی تحریر کا کوئی بھی جائزہ مکمل نہیں ہو سکتا اور خصوصاً مجتبیٰ کی تحریر کا چونکہ مجتبیٰ کی تحریر میں حرکت ہے، روانی ہے۔ اس کا کوئی فقرہ ٹھیرا ٹھیرا سا نہیں لگتا۔ اس کے بیان میں تصنع کا فقدان ہے اور ایک ایسی بے باکی ہے جو اپنے مشاہدے کے خلوص کی بنیاد پر فن کا درجہ پا لیتی ہے۔ خاکہ لکھنا اور خاکے میں سراپا بیان کرنا مجتبیٰ کے محبوب مشغلوں میں سے ایک ہے اس کا قلم ایک ماہر آرٹسٹ کا برش بن جاتا ہے اس کی نظر شخصیت کی ہر ایسی خصوصیت پر جا کر رکتی ہے جو عام نظروں سے پوشیدہ سی تھی اور پھر جب وہ اس منفرد تحقیق کو بیان کرتا ہے تو سننے والے داد دینے لگتے ہیں وہ حقیقت نگاری کرتا ہے مگر زبان کی چاشنی اس تحریر میں سحر کا سا حسن پیدا کر دیتی ہے مجتبیٰ کی تحریریں اس بات کا ثبوت ہیں کہ لکھتے وقت مجتبیٰ کی پانچوں حسیں جاگتی رہتی ہیں اور اطراف کی ہر چیز کے مشاہدے میں مصروف رہتی ہیں اور جو کچھ مجتبیٰ کے تجربہ اور احساس کے احاطہ میں آجاتا ہے قلم کی نوک سے اٹھا لیتا ہے مجتبیٰ جو کچھ اپنے قلم کے ذریعہ آپ کو باور کرانا چاہتا ہے اس میں اس کو ذرہ برابر تکلیف نہیں ہوتی اور کبھی کہیں اس سے کوئی غلطی ہو بھی جاتی ہے تو اتنے پُر خلوص طریقے سے کہ آپ اس کو فوراً معاف کر دیتے ہیں چونکہ انسانی جذبات میں صرف ہمدردی، غمگساری اور خلوص کے رنگوں پر قدرت حاصل کرنے کے لیے نیت میں سنجیدگی اور سچائی ضروری ہوتی ہے اور مجتبیٰ حسین، اُردو کا ایک قابلِ فخر مزاح نگار، دراصل بہت سنجیدہ اور بہت سچا آدمی ہے۔ مجتبیٰ کے ہم عصروں میں کوئی اتنا قد آور، اُردو تہذیب کے مزاج سے اتنا واقف، اتنا مخلص مزاح نگار مجھے نظر نہیں آیا۔ اس نے مزاح نگاری کو اپناتے ہوئے مسخرہ پن اور پھکڑ پن سے دامن بچایا ہے۔ اس نے اگر طنز بھی کیا ہے تو دوسروں کا دل نہ توڑنے کی قسم کھا کر۔ اگر اتنی احتیاط مجتبیٰ میں نہ ہوتی تو ہم اس کو اُردو کا اسکھدو اُملڈ کہہ سکتے تھے چونکہ مجتبیٰ بھی حاضر جواب ہے، بے ساختہ ہے، بذلہ سنج ہے

چند دن پہلے ایک خاتون نے جو میرے افسانے خاصی دلچسپی سے پڑھتی ہیں مجھ سے کہا تھا کہ "علی باقر صاحب آپ کے اکثر افسانوں میں ایر پورٹ کا ذکر کیوں ہوتا ہے؟" مجھے دراصل اس بات کا احساس بھی نہ تھا۔ اس لیئے میرے افسانہ "شبنمی رشتے" میں وہ جہاز جس میں ہیروئین کینیڈا سے کانپور آ رہی تھی بحر اٹلانٹک میں گر جاتا ہے مجھے بہر صورت وہ دن یاد آیا جب میں نے مجتبیٰ کے اصرار پر ایک مزاحیہ مضمون نہ صرف لکھا تھا بلکہ "محفلِ زندہ دلان" کے جلسہ میں حیدرآباد کے اُردو ہال میں پڑھا بھی تھا اور وہ مضمون لندن ایرپورٹ پر آنے والے اس ہندوستانی نوجوان کے بارے میں تھا جو تھیمز ن پر اکیلا وہاں پہنچ گیا تھا۔ اس شام ہال میں میرے والد سید آفتاب حسین صاحب مرحوم بیٹھے تھے اور ان کے ساتھ والی کرسی پر ان کے ہمدمی جناب سید سجاد ظہیر صاحب بیٹھے تھے اور دوسری جانب پروفیسر جعفر حسن صاحب تشریف فرما تھے اور یہ سب اُردو ہال میں بیٹھے ہوئے دوست اور عزیز لندن ایرپورٹ کے تماشے سے محظوظ ہوتے رہے اور میں اپنے تئیں

خوش ہوتا رہا لیکن میں نے جیش منٹ کے مضمون میں حاضرین کو جتنا ہنسایا اس کے مقابلے میں مجتبیٰ کا ایک جملہ جو فی البدیہہ تھا، پوری محفل لوٹ گیا۔ مجتبیٰ نے کہا کہ "جب سے پنے بھائی کی بیٹی نجمہ کی شادی علی باقر سے ہوئی ہے بنے بھائی اور زیادہ مشہور ہو گئے ہیں" یہ بات سراسر مبالغہ تھی مگر بنے بھائی بہت دیر تک ہنستے رہے اور بعد میں کئی جگہ انھوں نے ہنس ہنس کر یہ بات اوروں کو سنائی اور ہر بار یہ جملہ یادگار اور ایک خوشگوار یادگار بن گیا۔ مجتبیٰ کے کسی بھی واقعہ کو دیکھنے کے انداز میں یہ حسن ہے کہ وہ اپنی آنکھ، اپنی نظر کی اہمیت کو ختم کر دیتا ہے ۔۔ اس میں اَنا نہیں رہتی، خود غرضی نہیں رہتی، خود پسندی نہیں رہتی اور یہی بے غرضی اور فراخدلی دلوں کو موہ لیتی ہے۔

اس واقعہ کے برعکس اسپنے ہی حیدرآباد کا ایک اور واقعہ مجھے یاد آرہا ہے اور صرف اس لئے لکھ رہا ہوں کہ مجتبیٰ کی مزاح نگاری کا اندازہ ہو جس طرح کسی کو صحت مند ثابت کرنے کے لئے یہ بتلانا پڑتا ہے کہ اس شخص کو ملیریا نہیں، ٹائیفائیڈ نہیں یا یہ نہیں، وہ نہیں لہٰذا یہ صحت مند ہے۔ سلیمان اریب مرحوم کی کتاب کی رسم اجرا تھی۔ اتفاق سے اس دنوں میں حیدرآباد میں ہی تھا صفیہ اور سلیمان اریب سے میری بہت پرانی دوستی تھی۔ صفیہ نے کہا کہ میں سعید بن محمد کی بنائی ہوئی پینٹنگ کی نقاب کشائی کر دوں۔ عالم خوندمیری مرحوم کی زندگی کی غالباً وہ آخری ادبی محفل تھی۔ نہ جانے کہاں سے ادبی حلقوں میں یہ خبر پھیل گئی تھی کہ اریب اور بنے بھائی کے درمیان کچھ نااتفاقی ہو گئی ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو بے حد چاہتے تھے ان دونوں کے ایک دوسرے کے نام لکھے گئے خط میرے پاس محفوظ ہیں عالم صاحب نے اس پس منظر میں میرے نام کا اعلان کرتے ہوئے میرا اور بنے بھائی کے آپسی رشتے کا بھی ذکر کر دیا۔ میں نے چند جملے کہے اور نقاب کشائی کر دی۔ میرے بعد آنے والے ایک مقرر نے یہ کہہ کر اسٹیج پر آنے سے انکار کر دیا کہ وہ اس لیے تقریر نہیں کر سکتے کہ ان کے خسر کوئی مشہور آدمی نہیں تھے۔ حاضرین میں کسی کو ان کے اس جملے پر ہنسی نہ آئی۔

ادب کی دوسری اصناف کا تذکرہ کرتے وقت مثالیں دینا آسان ہے کہ چند اشعار نقل کر دیئے۔ نثر کا ایک جملہ یا پیراگراف مستعار لے لیا، تنقید کی چند سطریں لے لیں بشرطیکہ وہ کسی انگریزی کتاب کے کسی بلیغ جملے کا ترجمہ نہ ہوں مگر مزاح نگار کا پورا کا پورا مضمون یا خاکہ سنانا پڑتا ہے چونکہ کسی ایک حصہ میں بھرپور تاثر نہیں ہوتا۔ بعض اوقات مزاح نگار مشہور لطیفوں سے فائدہ اٹھاتا ہے اور ان میں اضافے کر کے قارئین کو ہنساتا ہے لیکن ایسے لطیف اور شگفتہ روح کی ریشمی چادر کو ببول کے کانٹوں والے درخت پر ڈال کر نیچے کھڑے ہو کر کھینچنے کے مترادف ہو گا۔

میرے افسانوں کے پہلے مجموعہ "خوشی کے موسم" کا پیش لفظ مجتبیٰ حسین نے لکھا اور سرورق ایم ایف حسین نے بنایا۔ اتفاق سے یہ کتاب تیزی سے بک گئی۔ مجتبیٰ سب سے یہی کہتے رہے کہ یہ حسین اینڈ حسین کی وجہ سے ہوا اس پیش لفظ کے بعد جو مجموعہ میں شامل ہے مجتبیٰ نے ایک اور پیش لفظ لکھا یہ اعلان کرنے کے بعد کہ پہلا والا کتاب کو پڑھے بغیر لکھ دیا تھا پھر ایک اور پیش لفظ کسی رسالے کے اصرار پر اور غالب کی طرفداری کے خیال سے لکھا۔ اب مجتبیٰ کا کہنا ہے کہ ان کی پیش لفظیات میرے مجموعہ کی ضخامت سے کہیں زیادہ ہے اور مجھے اس حساب کو چکانا ہو گا چنانچہ میں نے بھی اپنا مضمون طویل کر دیا۔ لیکن مجتبیٰ کے قلم کو لکھتے لکھتے تربیت ہو گئی ہے جس طرح بیل گاڑی میں بندھا بیل سر جھکائے، اپنی ڈبڈبائی آنکھوں سے کچی سڑک کو گھورتا، کانوں سے مکھیاں اڑاتا گاؤں کی طرف لوٹتا رہتا ہے

میری کتاب میں سیلاب کی کیفیت کو یکسر بستیایا میری بیٹی سیما جب چھوٹی تھی اور میں اسے گود میں لیے کسی تقریب میں گیا تو مجتبیٰ نے چھٹتے ہی کہا: "صاحبو! علی باقر کو دیکھئے اپنے پہلی شعر کو گود میں لیے پھرتے ہیں اسی لیے تو کتابیں خوبصورت چھپتی ہیں"

سب کو ہنستا دیکھ کر سیا بھی زور زور سے ہنسنے لگی۔ میرے خیال میں ہنسنے ہنسانے کی مشق بچپن سے ہی کرنا ضروری ہے ورنہ مزاح نگاری میں آمد نہیں آورد رہ جاتی ہے اور مزاح نگار کی دوسروں کو ہنسانے کی کوشش کچھ اس طرح رہ جاتی ہے

راہگیر : جناب یہ سڑک کہاں جاتی ہے؟

مزاح نگار : یہ سڑک کہیں نہیں جاتی رات دن یہیں رہتی ہے۔

اُردو کا اگر کوئی دل ہے اور اگر یہ دل دھڑکتا ہے اور یہ دھڑکن اُردو کی نبض میں سرایت کر چکی ہے تو پھر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مجتبیٰ اُردو کے نباض ہیں چونکہ انہیں بخوبی علم ہے کہ دلی شہر کے ہر گروپ میں (یعنی ترقی پسند، رجعت پسند، جدیدیوں میں) دلی کے اطراف و اکناف میں (یعنی امروہہ، بجنور اور مراد آباد میں) دلی سے دور علاقوں میں (یعنی جموں کشمیر اڈیسہ اور مہاراشٹرا میں) ہندوستان سے دور ممالک میں (یعنی کینیڈا، سنگاپور اور برطانیہ میں) اُردو زبان اور ادب پر کیا کیا گذر رہی ہے۔ مجتبیٰ کو پتہ رہتا ہے کہ اکبر حیدرآبادی کا تیسرا مجموعہ دسمبر کے آخر میں شائع ہوگا، وقار لطیف کے افسانوں کے مجموعے کا نام "رومانے" ہوگا، واجدہ تبسم کسی فلم کا اسکرین پلے لکھیں گی، عصمت چغتائی بمبئی سے دلی کے لئے روانہ ہو چکی ہیں علی سردار جعفری بی بی سی لندن سے اپنا کلام سنائیں گے — بعض وقت میں مجتبیٰ کے ذہنی کمپیوٹر میں اُردو کی بے شمار سرگرمیوں کی تفصیل کے بارے میں سوچ کر حیران رہ جاتا ہوں۔

دلی آنے جانے والے، آنے جانے کا پروگرام بنانے والے، پروگرام بنا کر منسوخ کرنے والے ادیب شاعر اور نقاد مجتبیٰ کے علم میں اپنی نقل و حرکت لائے بغیر مطمئن نہیں رہتے اور کبھی کبھی یہ لگتا ہے کہ یہ سب ان کی مٹھی میں بند ہیں اور پھر مجھے ڈر ہوتا ہے کہ اس طرح بند مٹھی سے اگر مجتبیٰ اپنی اسکوٹر نئی دلی کی چوڑی سڑکوں پر دوڑاتے رہے تو اُردو کی جان کو بہت خطرہ ہے جس طرح مشہور ہے کہ عرصہ تک ساتھ رہنے کے بعد شوہر اور بیوی کی صورت، آواز اور کردار ایک دوسرے سے حد سے زیادہ ملنے لگتے ہیں اور اکثر دونوں میں تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے بالکل یہی حال مجتبیٰ کی اسکوٹر اور اُردو کا بھی ہے — اب دونوں جڑواں بہنیں دکھلائی دینے لگی ہیں۔ یرقان کے مریض کی طرح زرد رنگ، اُردو سے ناواقف راہگیروں کو بچانے میں حالات کی سنگلاخ سڑک پر بار بار گرنے کے بعد جسم پر خراشیں لگائے ہوئے، مناسب دیکھ بھال کی مسلسل کمی سے نازک مشین کی بے سُری آواز گھڑ گھڑاہٹ کے پٹاخے چھوڑتی ہوئی، چلتے ہوئے سائلنسر سے کالے دھوئیں کے مرغولے ہواؤں میں بکھرتی ہوئی یہ اسکوٹر بے حد تاریخی ہے۔ یعنی اُردو کی تاریخ سے کہیں زیادہ اہم چونکہ اس پر مجتبیٰ کے پیچھے بیٹھے ہوئے اُردو کے سب ہی کردار نظر آتے ہیں جنہیں اس کالے دھوئیں میں پہچاننا مشکل ہوتا ہے چونکہ یہ کالا دھواں اُردو والوں کے آپسی جھگڑوں کی طرح گرد آلودہ، کورچشم بدبودار، غیر صحت مند اور ماحول کو ناخوشگوار بنانے والا ہوتا ہے — بہرصورت مجتبیٰ حسین دنیا میں واحد انسان ہیں جو اسکوٹر پر شوفری کے فرائض انجام دیتے ہیں اور دلی کی سڑکوں پر ان کے رواں دواں اسکوٹر کے پیچھے آپ دیکھ سکتے ہیں اُردو کے چھوٹے اور بڑے مقامی اور عالمگیری کرداروں کو — ان میں ہوتے ہیں اُردو کے کوئی ہمدرد یا کوئی دشمن، کوئی وفادار یا کوئی دغاباز، کوئی جانثار یا کوئی باغی، کوئی ہمنوا یا کوئی اجنبی، کوئی بزرگ یا کوئی نابالغ، کوئی گلے کا ہار کوئی آستین کا سانپ — اور اپنے پیچھے بیٹھے ہوئے اُردو سوار سے بے نیاز ہیلمٹ کے خود میں محفوظ مجتبیٰ حسین — اور اب یہ دیکھا گیا ہے کہ اُردو کے جلسوں میں مجتبیٰ ہیلمٹ پہنے رہتے ہیں اور جب پوچھا گیا کہ اُردو کے ناقدین سے ڈرتے ہو تو کہنے لگے یوں تو موت کا ایک دن مقرر ہے لیکن بال ہیں کہ سفید ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ ہیلمٹ نہ صرف ٹریفک پولس سے بچاتا ہے بلکہ بڑھتی ہوئی عمر کی زیادتیوں کو قابو میں رکھتا ہے۔

یہ بات نہیں ہے کہ مجھے مجتبیٰ حسین سے کوئی شکایت نہیں۔ مجھے مجتبیٰ سے سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ ان کے مزاح کا نشانہ اکثر و بیشتر ان کی شریکِ حیات ناصرہ بنتی ہیں۔ بیوی پر فقرے بازی غالب نے بھی کی تھی اور ان ہی دنوں سے رواج ہو گیا ہے کہ کسی بات کی صحت پر یقین نہ ہو تو جملے کا آغاز غالباً سے کیا جاتا ہے (شاید غالب غالباً کو غالبن لکھا کرتے ہوں گے) اور معقول بات انگریزی ادیب کے حضرت نوح نے بھی کیا تھا جب بیگم نے ناؤ میں سوار ہونے کے بعد بھانت بھانت کے جانوروں کو دیکھا تھا لیکن میری گذارش جشنِ مجتبیٰ کا جشن منانے والوں سے یہ ہے کہ وہ مجتبیٰ کی ناصرہ کے تعلق سے لکھی گئی کسی تحریر پر نہ ہنسیں چونکہ ناصرہ بے حد لذیذ کھانے پکاتی ہیں اور شوق سے کھلاتی ہیں، اپنے بچوں کو بے حد اچھی طرح رکھتی ہیں اور ان ہونہار بچوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کی مزاح نگاری نئی نسل کا مستقبل تباہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی اور ناصرہ نے اپنا گھر کچھ اس سلیقے سے چلا رکھا ہے کہ مجتبیٰ کو آزادی مل گئی ہے کہ وہ اردو زبان میں مزاح تخلیق کریں اور دامے درمے، سخنے اور اسکوٹر سے اردو ادب کی خدمت کریں۔ لیکن اس شکایت کے باوجود مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ مجتبیٰ کے فن کا کمال یہ ہے کہ اس نے اپنی مزاح نگاری سے کسی کا دل نہیں توڑا، کسی عقیدے کا مذاق نہیں اڑایا، کسی کی تضحیک نہیں کی۔ اس کی تحریر تباہی نہیں لاتی بلکہ تنظیم پیدا کرتی ہے — اس کی تحریر میں عقیدوں اور جذبات کی ایک پیاری سی آمیزش ہوتی ہے، اس کی نگاہ میں بھی گہرائی ہوتی ہے اور دل میں بھی خلوص ہوتا ہے، نہ وہ خشک مزاج جراح ہے اور نہ بے رحم قاتل — اس کے خاکوں میں خلوت کا بھولپن بھی ہوتا ہے اور جلوت کی احتیاط بھی — ان میں الجھنوں کی عدم موجودگی بھی ہے، ذکاوت بھی ہے، الفاظ کا جادو بھی ہے۔ مجتبیٰ میں بچوں جیسی معصومیت بھی ہے اور عمر رسیدہ بزرگوں جیسی دانشمندی بھی — اس کی تحریر میں ابتدائے عشق جیسی لطافتیں بھی ہیں اور لمبی شادی شدہ زندگی کی خوشگوار مضبوطی بھی۔ وہ گھسے پٹے تشبیہوں اور استعاروں کو ایک نئی تمکنت سے پیش کرنے پر قادر ہے — ایک ایسی تازگی کے ساتھ جو پہلے دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ وہ ساکت اور منجمد الفاظ میں بہار کی شگفتگی پھونک دیتا ہے

کسی بھی اچھے مزاح نگار کا کام صرف، پڑھنے اور سننے والے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھنا ہی نہیں یا قہقہہ کی گونج سننا ہی نہیں بلکہ اس ہنسی اور مسکراہٹ اور قہقہے کے پردے میں ایک ایسے پتے کی بات کہہ دینا ہے جو مسکراہٹ کا تاثر ختم ہونے کے بعد قاری کے ذہن کو بات کا اصلی مفہوم سمجھنے میں مدد دے۔ ہنسی کی بات بھی یاد رہ سکتی ہے مگر اسی وقت جب بات پھکڑپن، عامیانہ پن اور چھچھورے پن سے پاک ہو۔ ہنسا تو کئی لوگ لیتے ہیں مگر ہنسی میں بات کہہ کر متاثر بہت کم لوگ کر پاتے ہیں۔ پطرس، بخاری اور کنہیا لال کپور سے مجتبیٰ کا موازنہ کرنا بڑی حد تک جائز بھی ہے اور کسی حد تک نامناسب بھی۔ جائز اس لیے کہ ہر تخلیق کا موازنہ اس صنف کے بہترین ادب پاروں سے کرنا چاہیے۔ نامناسب اس لیے کہ پطرس، بخاری اور کنہیا لال کپور الگ دور کے ادیب تھے اور مجتبیٰ الگ دور کے ہیں اور دوسرے ادیبوں کے مقابلے میں مزاح نگار کو اپنے فن کا حسن نکھارنے کے لئے زبان کا سہارا لینا پڑتا ہے، الفاظ اور محاوروں کی الٹ پھیر یا تکرار یا جدتِ استعمال سے اپنے بیان میں شگفتگی قائم رکھنا پڑتی ہے اور اس دور میں قدریں بدل گئیں، اخلاق و آداب بدل گئے، بات چیت کے انداز بدل گئے۔ برتاؤ کے طور طریق بدل گئے، سماجی، سیاسی اور تکنیکی حالات بدل گئے اور ان سب کی وجہ سے انسانی رشتے بدلتے بدلتے یا ٹوٹ گئے یا مسخ ہو گئے۔ مزاح نگار اور خصوصاً اردو میں لکھنے والے کے لئے نسبتاً ایک غیر متحرک وسیع (زبان) سے نہایت متحرک حالات کی عکاسی میں تبسم کے پھول کھلانا جوئے شیر لانے کے برابر ہو گیا۔

اب آپ اسی جوئے شیر کی بات لے لیجئے۔ کس قدر فرسودہ اور ناکارہ لگتا ہے آج کل نہ اصلی دودھ ہے

اور نہ ہی اس میں ملانے کے لئے پانی ملتا ہے اور جب دریا سوکھ گئے، تالاب سوکھ گئے اور نہریں سوکھ گئیں تو ایک نئی نہر یا "جوُ" کی کیا ضرورت ہے اور پھر شیریں کے ڈیڈی ہونے والے داماد، فرہاد سے پہاڑی وغیرہ کھود کر نہر لانے کے لئے کیوں کہیں گے ــ وہ تو سیدھے ایرپورٹ جائیں گے پھولوں کا ہار لے کر اور دعا دیں گے کہ فرہاد کویت یا دبائی میں خوب دولت کما کر لوٹے اور آتے آتے رنگین ٹیلی ویژن اور بڑے بڑے کمبل لیتا آئے اور شیریں کو فرہاد کے ہاتھ میں تیشہ و تیشہ دیکھنے کا وقت کہاں ملے گا ــ وہ کسی بیوٹی سیلون میں بالوں میں مہندی لگوا رہی ہوگی اور فرہاد دیس بدیس میں ایک ویڈیو کیمرے سے اپنے ماحول کی تصویریں لیتا رہے کہ آنے والے زمانے میں بیٹھے ہوئے دنوں کو یاد کرنے کی زحمت سے بچ جائے اور کئی سال بعد اس کے اور شیریں کے دونوں بچے "وقت کی آواز ہمیں دو بچوں پہ ناز" ــ اس ویڈیو فلم کو بار بار دیکھ کر ماں باپ سے بغاوت کر دیں گے اور سب آرام و آسائش کے سامان چھوڑ کر نظام آباد سے دور ایک چھوٹے سے گاؤں میں جاکر بس جائیں گے ــ اب ان روح فرسا اور ادب فرسا حالات میں مجتبیٰ یا اُن کی نسل کا کوئی ادیب "جوئے شیر" لانا لکھے یا لیلیٰ کی محمل کے پیچھے قیس کا جلتی ہوئی ریت پر ننگے پیر چلنے کا حال لکھے تو بے سود ہے

اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے میں مجتبیٰ کی تحریر کی ایک ایسی خصوصیت کا ذکر کروں گا جو کسی اور ادیب میں نہیں ہے اور وہ ہے اس کا تعزیتی جلسوں میں اپنی تحریر سے روتے ہوئے لوگوں کو ہنسا دینا۔ مُسکرانے کو نہیں آئے ہوئے لوگوں کو قہقہہ لگانے پر مجبور کر دینا۔ یہ انوکھی اور غیر معمولی صلاحیت مجتبیٰ حسین کو دوسرے مزاح نگاروں میں منفرد اور ممتاز بناتی ہے ــ ایسے غم کے موقعوں پر غمگساروں کو ہنساتے وقت مجتبیٰ کو بھی دوست کی جدائی کا صدمہ ہوتا ہے اس کے بغیر زندگی میں کچھ کمی ہو جانے کا شدید احساس ہوتا ہے مگر تعزیتی جلسوں میں خاکہ یا مضمون پڑھتے وقت مجتبیٰ کی آنکھوں میں آنسو ہوتے ہیں، آواز جذبات سے بھرائی ہوئی ہوتی ہے، الفاظ میں درد ہوتا ہے، بیکراں محبت ہوتی ہے خدا سے شکوہ ہوتا ہے، دنیا سے شکایت ہوتی ہے کہ ایسے بیش بہا خزانے کو سنبھال کر نہ رکھا اور مرنے والے کی دل کھول کر تعریف کرنے کا خلوص ہوتا ہے اور ان حالات، احساسات اور جذبات کے ساتھ مجتبیٰ مرنے والے کے بارے میں کچھ بہت زیادہ پیار سے ایسی بات کہہ جاتا کہ پہلے مرنے والے کے قریبی عزیز آنسوؤں سے بھیگے چہرے اٹھا کر اسٹیج پر کھڑے مجتبیٰ کو دیکھ کر ہنسنے لگتے ہیں اور پھر تعزیتی جلسے میں بیٹھے سب خواتین اور حضرات ہنسنے لگتے ہیں اور ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے سوچتے ہیں کہ ہم یہاں پُرسہ دینے آئے تھے ہنس کیوں رہے ہیں؟ مرنے والے کے قریبی عزیزوں کے ہونٹوں پر آنسوؤں کی نمی کے ساتھ مسکراہٹ کیوں ہے؟ اس تعزیتی جلسے میں قہقہے کیوں گونج رہے ہیں؟ اور ان سوالوں کا جواب مجتبیٰ کا فن ہے جو آنسوؤں اور قہقہوں کو اس طرح گھُلا مِلا دیتا ہے کہ دونوں میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے

مجتبیٰ کی اس صلاحیت کا اندازہ پہلی بار ستمبر ۱۹۷۳ء میں ہوا ـ بنے بھائی کا ماسکو میں اچانک انتقال ہو گیا تھا۔ ان کی بے وقت موت کا تعزیتی جلسہ غالب اکیڈمی میں تھا۔ اسٹیج پر فیض احمد فیض، پروفیسر سید نورالحسن، شری اندر کمار گجرال کی روسی بھابی، محترمہ رضیہ سجاد ظہیر موجود تھے۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مقررین بنے بھائی سے اپنی محبت کا اظہار کر رہے تھے، مخمور نظامی اپنے مخصوص لہجے میں منظوم خراجِ عقیدت پیش کر رہے تھے۔ ؎

خوشبو ہی خوشبو تھا، صبا لے گئی اس کو

اور پھر مجتبیٰ نے اپنا مضمون پڑھنا شروع کیا۔ مجتبیٰ کو آواز کے اُتار چڑھاؤ پر قابو ہے۔ لوگ اس کی آواز کو سنتے رہے۔ مجتبیٰ نہایت خلوص سے حاضرین کو بتلاتا گیا کہ چھوٹی سی عمر میں اس نے کس طرح اپنے بھائیوں سے بنّے بھائی کا بار بار ذکر سنا تھا۔ اس کے بھائی اور ان کے دوست کس طرح اس انقلاب کا انتظار کرتے تھے جس کے لئے بنّے بھائی جیلوں کی صعوبت اٹھا رہے تھے، جس کے لئے انھوں نے ہر قسم کی قربانی دی تھی اور پھر مجتبیٰ نے سنایا کہ آخر ایک ایسا دن بھی آیا کہ وہ ایسے ادبی جلسے میں موجود تھا جہاں سجاد ظہیر کو تقریر کرنا تھی اور پھر بنّے بھائی کے نام کا اعلان کیا گیا اور مجتبیٰ نے دیکھا کہ اگلی صف میں سے ایک صاحب کھڑے ہوئے، نہایت احتیاط سے اپنی سگریٹ کو بجھایا اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اسٹیج کی طرف بڑھنے لگے اور مجتبیٰ کو تب پتہ چلا کہ ہندوستان میں انقلاب آنے میں اتنی دیر کیوں ہوئی۔ پہلے اسٹیج پر کوئی مجتبیٰ کا یہ جملہ سن کر ہنسنے لگا اور پھر حاضرین میں ہنسی کی لہر دوڑ گئی اور پھر سارا جلسہ بنّے بھائی کی موت کی خبر سے نڈھال ہنسنے لگا۔ مجھے وہاں بیٹھے ہوئے یاد آیا تھا کہ میں اور بنّے بھائی رات کے کھانے سے پہلے لندن میں ٹہلنے جاتے تھے۔ اس الگزنڈرا پارک میں جو ہمارے فلیٹ کے پیچھے تھا اور بنّے بھائی کی سست رفتاری سے میں تھک جاتا تھا ایک مرتبہ چڑھائی پر چلتے چلتے رک کر بنّے بھائی مجھ سے کہنے لگے "ہماری جب رضیہ سے شادی ہوئی تھی علی باقر تو ہمیں ایک بات سے بڑی الجھن ہوتی تھی کہ رضیہ چلتیں بہت خراماں خراماں تھیں" اور بنّے بھائی کی تعزیت کے موقع پر ہنستے ہوئے حاضرین کو دیکھ کر میں ان کی اور رضیہ آپا کی سست رفتاری کے بارے میں سوچنے لگا۔ اگر انقلاب کی رفتار کا ان دونوں کے چلنے کی رفتار سے واقعی کوئی تعلق ہوتا تو یہ اتنے تیز رفتار ہو جاتے کہ طبیعات کے قانون بدلنے پڑتے۔

اس واقعہ کے گیارہ سال بعد میں حیدرآباد میں تھا میری چھوٹی بہن، ڈاکٹر سیدہ آفتاب کا کم عمری میں اچانک انتقال ہو گیا تھا۔ سیدہ کے گھر میں سوگواروں کا ہجوم تھا۔ میں، حسن باقر، قیصر بھائی اور تراب بھائی سیدہ کو مرلیدھر باغ میں دفن کر کے گھر لوٹے تھے۔ ہمارے کپڑوں پر سیدہ کی قبر کی تازہ مٹی تھی اور ہم میں سے کسی کو سیدہ کی کوئی بات یاد آئی اور ہم میں سے ایک کو ہنسی آئی، پھر دوسرے کو اور پھر چاروں ہنسنے لگے اور پھر سیدہ کا کوئی لطیفہ یاد آیا اور ہمارے قہقہے اونچے ہو گئے۔ سیدہ کے پُرسہ کے لئے آئی ہوئی ایک خاتون کو ہمارا اس موقع پر ہنسنا بُرا لگا اور ہم نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی، قہقہہ بھی تو غم کے اظہار کا ایک طریقہ ہے۔ استنے شدید صدمہ کے موقع پر بےساختہ ہنس دینا بھی بےساختہ رونے کی طرح ہے اور پھر میں نے سوچا کہ کسی تعزیتی جلسہ میں جہاں مجتبیٰ حسین کو خاکہ پڑھنا ہوگا۔ میں ان خاتون کو لے جا کر اسٹیج پر بٹھلا دوں گا اور کہوں گا کہ حاضرین کے چہرے پڑھتی رہیئے اور دیکھتی جایئے کہ آنسو کس طرح مسکراہٹ بن جاتے ہیں! —— برسات میں کس طرح دھوپ نکل آتی ہے!!

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ ⁂ وہ کانگریس کے جلسے وہ سب کال کے کھانا

نقی تنویر (لندن)

مجتبیٰ حسین ـــــ میرا دوست

لندن میں ہمارے ایک پرانے ساتھی تھے۔ وہ ہر شام اپنے مقامی مئے خانے کو جاتے اور بیئر کے دو گلاسوں کا آرڈر دیتے اور ایک کے بعد ایک انھیں پیتے رہتے۔ ایک دن اس مئے خانے کے بارمین نے ان سے پوچھا "آخر آپ ایک ساتھ دو گلاسوں کا آرڈر کیوں دیتے ہیں ؟" ہمارے ساتھی نے جواب دیا "ایک گلاس میرے لئے اور ایک گلاس میرے بچھڑے ہوئے دوست کے لئے جس کی یاد میں، میں اس کے حصّہ کی شراب بھی پی جاتا ہوں"۔ کچھ مہینوں تک یہی معمول چلتا رہا۔ ایک دن انھوں نے حسب معمول مئے خانہ پہنچ کر صرف ایک گلاس کا آرڈر دیا۔ بارمین نے حیرت سے پوچھا۔ "آپ ہمیشہ دو گلاسوں کا آرڈر ایک ساتھ دیتے تھے۔ آج آپ کو کیا ہوگیا ہے ؟" اس پر انھوں نے اُداس ہوکر کہا "بھائی ! بات یہ ہے کہ ڈاکٹروں نے مجھے شراب پینے سے منع کر دیا ہے۔ آج سے میں صرف اپنے دوست کے حصّہ کی شراب پیوں گا۔"

بات مزاح کی بھی ہے اور انسان کے آپسی رشتوں کی بھی۔ اسی دوستی کی جس کی بنیاد اعتماد، محبت، خیالات اور احساسات کی ہم آہنگی پر قائم ہوتی ہے۔ چنانچہ پچھلے بائیس برس سے میرے وہ ساتھی جو حیدرآباد میں برسوں میرے ساتھ گذار چکے ہیں اور اب لندن میں رہتے ہیں یعنی وقار لطیف، ڈاکٹر یوسف علی خاں اور پروفیسر حسن عسکری، جب بھی ہم آپس میں مل بیٹھتے ہیں تو نادانستہ طور پر کم و بیش ویسی ہی حرکت کر بیٹھتے ہیں جو ہمارے ساتھی نے اپنے بچھڑے ہوئے دوست کے احترام میں کی تھی۔ کئی مرتبہ تو ایسا ہوا ہے کہ غیر شعوری طور پر ایک کرسی اسی طرح خالی چھوڑی گئی جیسے ہمارا دوست مجتبیٰ ابھی آنے ہی والا ہے۔ یہی انسانی رشتوں کی وہ منزل ہے جس نے فیض کو یہ کہنے پر مجبور کیا تھا ؎

نہ جانے کس لئے امیدوار بیٹھا ہوں
اک ایسی راہ پہ جو تیری رہ گذر بھی نہیں

مجتبیٰ جب گلبرگہ چھوڑ کر پہلی مرتبہ حیدرآباد آیا تو شائد اُس کی سب سے پہلی ملاقات مجھ سے ہوئی۔ کیونکہ مجتبیٰ کے چچازاد بھائی حامد حسین اور خورشید حسین جنھیں بعد میں مجتبیٰ کے برادر نسبتی بننے کا شرف حاصل ہوا، میرے قریبی دوست تھے۔

عام طور سے جب خاندان کا ذکر آتا ہے تو یہ کہا جاتا ہے، یہ بڑے امیر گھرانے سے، اور اگر امیر نہ ہوئے تو شریف گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ میرے لئے یہ دونوں الفاظ بے معنی ہیں اور متوسط طبقہ کی سوچ کے ترجمان۔ صرف اتنا کہوں گا

کہ مجتبیٰ کا تعلق ایک انسان دوست گھرانے سے ہے۔ وہ گھرانہ جس نے ہمارے سماج کو محبوب حسین جگر اور ابراہیم جلیس جیسے سپوت عطا کئے۔ غالب اور میر کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ اگر وہ نہ ہوتے تو شائد اُردو زبان کا کوئی شاعر پیدا نہ ہوتا۔ میرا ایقان ہے کہ اگر محبوب حسین جگر نہ ہوتے تو ہندوستان کئی ادیبوں اور صحافیوں سے محروم رہتا۔ جن میں 'میں اور مجتبیٰ حسین دونوں شامل ہیں۔ جس انداز سے محبوب حسین جگر نے ادب۔ صحافت اور ادیبوں کی بے لوث خدمت کی ہے اس کا ہندوستان کے بے شمار ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کو احساس ہے۔ حیدرآباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد کا سہرا بھی ان ہی کے سر ہے۔

تلگو کے مشہور شاعر سری سری کے رزمیہ "مہا پرستھانم" کے مقدمہ میں نامور تلگو مزاح نگار چلم نے کہا تھا کہ "کرشنا شاستری ایسا شاعر ہے جو اپنے سارے دکھ دنیا کے سر ڈال دیتا ہے اور سری سری ایسا شاعر ہے جو سارے جہاں کے درد اپنے سر لے لیتا ہے"۔ مجتبیٰ کے دوسرے بھائی ابراہیم جلیس بھی سری سری جیسے ادیبوں کے زمرے میں شامل ہیں۔ چنانچہ اپنی جواں سالی میں ہی انھوں نے چالیس کروڑ بھکاریوں کا درد اپنے سینے میں سمو لیا تھا اور پھر برصغیر ہندوپاک کی نام نہاد آزادی کے بعد بھی سماجی انصاف کے لئے جدوجہد کرتے رہے۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ شائد قدرت کو مجتبیٰ حسین کے والد احمد حسین (مرحوم) سے ہیٹ ٹرک (Hat Trick) کروانی تھی کہ اس نے محبوب حسین جگر اور ابراہیم جلیس کے بعد مجتبیٰ حسین کو بھی اس خاندان میں پیدا کیا۔

مجتبیٰ کی اور میری دوستی ایک ایسے دور میں پروان چڑھی جو حیدرآباد کے لئے ایک سیاسی انتشار کا دور تھا۔ ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں نام نہاد آزادی کے بعد ترقی پسند طاقتیں مایوسی اور پراگندگی سے دوچار تھیں لیکن حیدرآباد میں ابھی یہ دور نہیں آیا تھا۔ طالب علموں کی تحریک اپنا باغیانہ پرچم سنبھالے ہوئے تھی اور اسی دور میں ہم یونیورسٹی میں ساتھ رہے۔ دوستی کے پروان چڑھنے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ہم فیض کے اس شعر کی تفسیر بنے رہے کہ ؎

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

کالج کی ساری زندگی ایک طرف تو طالب علموں کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے میں صرف ہوئی یا پھر یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں بیٹھ کر معاشقوں اور شرارتوں کے منصوبے بنانے میں۔ چنانچہ بقول مجتبیٰ کے "ہم نے کالج کے دور میں اپنا ذاتی ٹائم ٹیبل بنا رکھا تھا۔ جو زیادہ تر کیفے ٹیریا اور اسٹوڈنٹس یونین کے محور پر گھومتا تھا"۔ ہمارے اساتذہ بڑے امن پسند تھے۔ ان کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ ہم کبھی کلاس میں داخل نہ ہوں۔ کیونکہ اس سے امن عامہ کو بڑا خدشہ لگا رہتا تھا۔ اس کی بناء پر ہمارا زیادہ وقت کلاس سے باہر گذرتا لیکن رجسٹر میں حاضری ضرور لگ جاتی تھی۔ یہ وہ دور تھا جبکہ عثمانیہ یونیورسٹی میں ذریعۂ تعلیم اُردو سے بدل کر انگریزی میں شروع ہوگیا تھا اور ہمارے کچھ بزرگ اساتذہ ابھی اس ذریعۂ تعلیم سے پوری طرح واقف نہیں ہو پائے تھے۔ ان میں سے بعض کو بڑی شکایت رہتی کہ ہم کبھی ان کا " Literature " نہیں کرتے (یعنے ادب نہیں کرتے) کیفے ٹیریا میں بیٹھ کر نت نئی شرارتوں کا پلان بنانے کے لئے ہم نے کئی ایسے کردار جمع کر لئے تھے جو نہ صرف ہماری روحانی غذا کے طور پر کام کرتے تھے بلکہ

عملی طور سے بھی ہمارے چائے پانی کے خرچ کے ذمہ دار تھے۔ اور زیادہ تر سنیما بینی اور سگریٹ نوشی وغیرہ کا خرچ بھی ان ہی احباب کے جیب خاص پر پڑتا۔ ان میں سے کئی کردار آج بھی ماضی کے صحرا میں خودرو پودوں کی مانند نظر آتے ہیں۔ کیفے ٹیریا میں نت نئی شرارتوں کے پلان بنانے اور انھیں روبہ عمل لانے کے علاوہ ہمارا وقت دوستوں کے محبت نامے لکھنے یا انھیں ملے ہوئے محبت ناموں کے جواب لکھنے میں گذرتا۔ بعض احباب کی کہانیوں، افسانوں اور غزلوں کی تصحیح بھی کرنی پڑتی اور بعض دفعہ انھیں لکھنا بھی پڑتا۔ یہی لوگ ہماری ضروریات کو پورا کرنے کے ذمہ دار تھے اور ان ہی کو وسیلہ بناکر ہم نئے نئے لطیفے تراش کر یونیورسٹی میں اس طرح پھیلا دیتے جیسے یہ اسی دن کے مقبول روزنامہ میں شائع ہوئے ہوں۔ بعض کردار تو کوشش کے باوجود بھی بھلائے نہیں جاتے۔ اس میں وہ شریف النفس آدمی کاظم ظہیر بھی تھا جس کی محبوبہ کا نام اتفاق سے شریف جہاں تھا جو اس کے دل و دماغ پر اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ جب بھی ظہیر سے ملاقات ہوتی تو ہم ان سے پوچھتے "کہو ظہیر! مزاج شریف"۔ اور وہ بڑی سادگی سے جواب دیتا۔ "یار پتہ نہیں اُن سے تو دو تین روز سے ملاقات ہی نہیں ہوئی"۔ ہم اس کی ڈراؤنی شکل کو دیکھ کر کہتے۔ "ظہیر! تمہیں دیکھنے کے بعد ہمیں تو ایسا لگتا ہے جیسے عشق پر بھوت سوار ہے"۔ اس پر وہ کہتا۔ "تم لڑکوں کو کیا پتہ ہے، عاشقی بڑے دل گردے کا کام ہے"۔ اس پر ہم کہتے۔ "نہیں یار ظہیر تمہارے لئے تو یہ صرف گردے کا کام ہے۔"

جہاں ہم جیسے طالب علموں کو اس طرح کے کردار ملتے رہے ہوں، وہاں کی سرزمین سے صرف قہقہے ہی بلند ہوسکتے ہیں۔ قہقہوں کا یہ لامتناہی سلسلہ یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا سے نکل کر شام میں اورینٹ ہوٹل اور اس کے بعد حسین ساگر کے کنارے پر پھیلتا رہتا۔

حسین ساگر حیدرآباد کی تہذیب کا ایک اہم ادارہ اور حیدرآبادی نوجوانوں کی شام کا ایک اہم حصّہ ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں ہم رات دیر گئے تک بیٹھے یا تو انقلاب کے گیت گاتے رہتے یا پھر حسن و عشق کی باتیں کرتے۔ ان لڑکیوں کی باتیں جن سے ہم نے محبت کی تھی۔ جن پر ہم نے اپنی اُلفت کے سُرخ گلاب نچھاور کئے تھے، جنھیں اپنے جذبات کی کچّی کلیوں سے سنوارا تھا۔ جنھیں اپنے تخیلات کی مالائیں پہنائی تھیں۔ آج بھی حسین ساگر زندگی کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں ایک حسین جزیرہ کی طرح یاد آتا ہے۔ خصوصاً چاندنی راتوں میں جب ساگر کی لہریں ہلکورے لیتیں۔ تصورات کی کشتیاں ان پر ہچکولے کھاتیں۔ نظارہ بلز پر دمکتے ہوئے قمقمے تخیلات کی طرح رنگ بدلتے رہتے۔ تارے چاند سے شرماکر سرگوشیاں کرتے اور ہم حسین ساگر کے کنارے بیٹھ کر زندگی کے حسین خواب دیکھتے۔ وہ خواب جن میں انقلاب کا رومانس اور رومانس کے انقلاب کا امتزاج تھا۔ جن میں تاروں کی چھاؤں۔ قوس قزح کی رنگت۔ پھولوں کی ملائمت۔ گالوں کی گلابی خاموشی۔ مترنم آنکھوں کی چمک۔ غنچوں کا تبسّم۔ کیوڑے کی موہنی خوشبو میں بسی حیدرآباد کی سانولی شامیں شامل تھیں ..... پھر یہ خواب بکھر گئے۔ حسین ساگر کی لہروں پر بکھرے ہوئے بجلی کے قمقموں کی روشنی کی طرح اور میں ان خوابوں کو ادھورا چھوڑ کر انگلستان چلا آیا۔ ایک نئی دنیا کی تلاش میں یا پھر اپنے کھوئے ہوئے خوابوں کے تعاقب میں۔

یہاں آنے کے کچھ مہینوں بعد ہی اطلاع ملی کہ مجتبیٰ نے باضابطہ مزاح نگاری شروع کردی ہے۔ اس

کا مطلب یہ تھا کہ قہقہوں کا وہ لامتناہی سلسلہ جو عثمانیہ یونیورسٹی کے ماحول سے شروع ہوا تھا وہ اب روزنامہ "سیاست" کے "شیشہ و تیشہ" کے کالم اور دوسرے ادبی رسالوں میں پھیلنے لگا تھا۔ میں نے اور میرے ساتھیوں نے بڑا ہی فخر محسوس کیا تھا۔ اور اس بات کے باوجود کہ یہاں کی معروف زندگی میں اُردو لکھنے اور پڑھنے کا موقع بہت کم ملتا ہے۔ میں، وقار لطیف اور پھر یوسف علی خاں مجتبیٰ کی مزاح نگاری کے مدارج کو بغور دیکھتے رہے ہیں اور اس کی ترقی پر فخر محسوس کرتے رہے ہیں۔

اسپین کے ممتاز شاعر گارسیا لورکا کے متعلق مشہور ہے کہ جب بھی وہ کسی محفل میں جاتا اس کے دوست پکار اُٹھتے۔ "اب تو گارسیا لورکا آگیا ہے۔ اب تو قہقہوں کے طوفان اٹھیں گے"۔ لیکن لورکا کے قریبی دوست اس بات سے واقف تھے کہ ان قہقہوں کے طوفان کے پیچھے آنسوؤں کے سمندر تھے۔ میں نے اب تک مجتبیٰ کی زندگی کی وہ تصویر کھینچی ہے جو حسن و عشق اور بے ہنگم مزاح کے تانوں بانوں سے بُنی ہوئی ہے۔ لیکن مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جہاں ہم نے حسین ساگر کے کنارے بیٹھ کر حسین اور جوان راتوں میں حسن و عشق کی کہانیاں پروئی تھیں۔ وہیں ہم نے بغاوت کے گیت بھی گائے اور وہیں بیٹھ کر ہم نے دنیا کی کم مائیگی، سماج کی نا انصافی، مجبور اور کچلے ہوئے عوام کے استحصال پر آنسو بھی بہائے تھے اور میرا خیال ہے کہ مجتبیٰ کی مزاح نگاری کو سمجھنے کے لئے مجتبیٰ کی زندگی کے اس پہلو کو بھی جاننا ضروری ہے۔

مجتبیٰ نے ایک جگہ لکھا ہے "آج کے انسان کی ہنسی کا المیہ یہ ہے کہ اس کی ہنسی آنسو بن کر آنکھ سے ٹپک پڑتی ہے۔ نہ جانے ہر قہقہے کے پیچھے مجھے تلخیوں، نا آسودگیوں اور محرومیوں کے آنسو کیوں نظر آتے ہیں"۔

لیکن اس کے باوجود بھی مجتبیٰ ہنسنے کا قائل ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ہنسی انسان کی شانِ کج کلاہی ہے۔ یہی اس کا طرۂ امتیاز ہے اور یہی اس کا مقدر بھی ہے۔ مجتبیٰ ۱۹۶۲ء سے اسی شانِ کج کلاہی کے ساتھ سماج کی نا انصافیوں کے خلاف قہقہوں کی صورت میں احتجاج کرتا چلا آرہا ہے۔

ہر شخص اپنے اندر ایک دنیا کو سموئے ہوئے ہوتا ہے۔ لیکن وہ شخص جس کی دنیا وسیع اور زاویۂ نگاہ تیز ہے وہ صحیح معنوں میں شاعر یا ادیب ہے۔ اور کسی ادیب کی عظمت اس بات میں مضمر ہے کہ وہ اپنی اس دنیا کو دوسروں کی دنیا میں کس طرح پیش کر سکتا ہے۔ تاکہ ان کی زندگی میں بھی وسعت پیدا ہو اور انھیں زندگی کو سمجھنے اور زندہ رہنے کا حوصلہ ملے۔ اور مجتبیٰ بھی یہی چاہتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے کالج کے دور میں رکشا والوں کے ایک جلسہ میں تقریر کی تھی۔ جب میں نے تقریر ختم کی تو ایک بوڑھا رکشا والا میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔ "صاحب! آپ تو بہت کم عمر ہیں۔ آپ نے تو کبھی رکشا نہیں چلایا ہوگا۔ پھر آپ نے ہمارے دل کی بات کو کس طرح سمجھ لیا؟"

اس کے کچھ دن بعد ہی کی بات ہے کہ میں اور مجتبیٰ، حسین ساگر کی طرف جا رہے تھے۔ اور ہم نے دیکھا کہ ایک رکشا والے کی ایک پولیس والے سے تکرار ہو رہی ہے۔ تکرار کے ختم ہونے کے بعد رکشا والا نڈھال ہو کر سڑک کے کنارے بیٹھ گیا۔ ہم نے رکشا والے کا حال پوچھا۔ اس نے کہا۔ "صاحب کیا بتاؤں؟ دن بھر محنت کرنے کے بعد آٹھ روپئے کمائے تھے، تین روپئے رکشا کے مالک کو دینے تھے اور پانچ روپیوں میں بیوی بچوں کے لئے کھانے پینے کا سامان لینا تھا۔ اب بغیر قندیل رکشا چلانے کے جرم میں پانچ روپئے تو رشوت کی نذر ہو گئے۔ اب سوچ رہا ہوں کہ اگر رکشا کے مالک کو پیسے نہ دیئے جائیں

تو وہ کل رکشا نہیں دے گا۔ اور اگر اسے پیسے دے دوں تو پھر میرے بال بچے آج کیا کھائیں گے۔"

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس رات دیر گئے تک ہم حسین ساگر کی لہروں پر اپنے آنسوؤں کی کشتیاں بہاتے رہے اب میں اس واقعہ پر غور کرتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہی وہ آنسو تھے جو اس کے کئی سال بعد کبھی مزاح کی شکل میں اور کبھی طنز کی صورت میں مجتبیٰ کے قلم سے نکلے تھے جبکہ اس نے رکشاوالوں پر ایک مضمون لکھا تھا۔

اب میں تم سے مخاطب ہوں میرے دوست مجتبیٰ حسین! مجھے معلوم ہے کہ سماج کی ان نا انصافیوں کے خلاف جدوجہد کرنا ہی تمہارا نصب العین ہے۔ اور یہی میرا فلسفۂ حیات بھی ہے۔ یہی وہ قدرِ مشترک ہے جو ہماری دوستی کو استوار کئے ہوئے ہے۔ جسے وقت اور فاصلہ کی حدوں نے نہ تو کبھی توڑا ہے اور نہ ہی توڑ سکیں گی۔ تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے مزاح نگار بننے سے پہلے میں نے بھی مزاح نگاری کی تھی۔ سماج کی نا انصافیوں اور فرسودہ روایات پر اپنے طنز کے طمانچے لگائے تھے۔ انگلستان آکر میں نے صحافت کا آسان راستہ ڈھونڈ نکالا ہے۔ لیکن مجھے فخر ہے کہ تم مزاح کے میدانِ کارزار میں جمے ہوئے ہو اور روز افزوں ترقی کر رہے ہو۔ میرے دوست! تم نے ہم دونوں کے محبوب دوست اور شاعر سلیمان اریب کے تعلق سے لکھا تھا کہ "بسترِ مرگ پر ہماری بات سننے کے بعد اریب کے کمزور، نحیف اور خشک ہونٹوں پر مسکراہٹ بڑی دور تک پھیل گئی۔ جیسے یہ مسکراہٹ سمندر کی لہر بن کر انجانے سفر پر روانہ ہو گئی ہو"۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے میرے دوست کہ بچوں کے ہونٹوں کی معصوم مسکراہٹ چھین لی جائے تو کبھی یہ فلسطین کے مجاہدین کی بارود بن جاتی ہے۔ تو کبھی ایل سلواڈور (Elsalvador) کے گوریلا فائٹرز کے دل کی آگ اور کبھی تمہارے طنز کے تیر اور نشتر . . . .

پابلو نرودا نے ۱۹۳۴ء میں اسپین میں پھیلے ہوئے فاشزم کے خلاف ایک نظم لکھی تھی اور جب یہ نظم تیس سال بعد اس کے دیوان میں شائع ہوئی تو پابلو نے بڑے مغموم لہجے میں لکھا تھا کہ "کاش ہم دنیا کی تباہی کو شاعری اور محبت سے بچا سکتے"۔ لیکن پھر اس نے لکھا کہ "اس دوران میں دنیا اور میری شاعری بدل گئی اور ان سطروں پر گرا ہوا خون لافانی محبت کی طرح زندہ رہے گا"۔

پابلو نرودا کی طرح میں بھی مایوس نہیں ہوں اور آج تمہیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے یقین ہے، ہم سب مل کر ایک دن انسانیت کو اس کی ہنسی واپس دلا دیں گے۔ وہ ہنسی جو ایک سمندر کی طرح پھیل جائے گی اور جس میں درد اور ظلم و استبداد کے سفینے ہمیشہ کے لئے ڈوب جائیں گے۔

دوستو اور ساتھیو! صرف آخری بات کہتا چلوں۔ میرے محترم بزرگ اور ہندوستان کے مقبول عوامی قائد ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے مجتبیٰ کے لندن آنے سے پہلے اسے میری امانت میں دیتے ہوئے لکھا تھا۔

"مجتبیٰ کی سرگرمیوں بلکہ سرگرانیوں پر نگرانی رکھنا۔ آدمی بڑا ہی زوردار ہے۔ محفل کو گرم رکھتا ہے۔ دنیوی رنج و محن ہنس کر کاٹتا ہی نہیں ان پر کس کر طنز بھی کرنا جانتا ہے۔ یہی مزاح آمیز طنز مصیبتوں سے نبرد آزما ہونے کیلئے ایندھن کا کام کرتا ہے۔" مجھے اپنے محترم دوست سے پورا اتفاق ہے لیکن میں صرف ایک بات کہوں گا کہ مجتبیٰ میری امانت نہیں، سارے اُردو داں طبقہ کی امانت ہے۔ برصغیر ہند و پاک کے عوام کی امانت ہے اور ساری دنیا کے کچلے ہوئے انسانوں کی امانت ہے اور اب اس امانت کو "مایۂ ناز ادیب، عظیم انسان اور اپنے پیارے دوست مجتبیٰ حسین کو آپ کے حوالے کرتا ہوں۔ . . .

(مارچ ۱۹۸۳ء میں لندن میں مجتبیٰ حسین کے اعزاز میں منعقدہ خیرمقدمی تقریب میں یہ خاکہ سنایا گیا)

ڈاکٹر یوسف علی خاں (لندن)

"دوسرا مجتبیٰ"

مجھے اب یاد نہیں کہ میں پہلی بار اس سے کہاں ملا۔

شائد اورینٹ کی کوئی شام ہوگی۔ وہ خاموشی سے آکر احباب کے حلقہ میں شامل ہوگیا۔ دُبلا پتلا جسم۔ سانولا چہرہ۔ مضبوط جبڑا۔ پُرکشش خط و خال۔ مگر یہ وہ زمانہ تھا جبکہ سب ہی دوست پُرکشش لگتے تھے۔ ہر ایک کا ایک دلچسپ کردار تھا۔ پھر بھی بہت جلد سب ہی اس کے لاگو ہوگئے۔ اور اس کے آنے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے اور جب وہ اپنی لمبی لمبی ٹانگوں پر چلتا ہوا آتا اور چائے کی میز پر بیٹھ جاتا تو فضا ہی بدل جاتی تھی۔ گفتگو کی سنجیدگی میں جیسے بھونچال سا آجاتا تھا۔ قہقہوں کے فوارے اُبل پڑتے تھے۔ بات سے بات پیدا کرنا، چٹکلے بازی اور مزاح جیسے اس کی گھٹی میں تھے۔ اس کے طنز و مزاح سے شائد ہی کوئی بچا ہو۔ اس موقعہ پر ایک عجیب سا سرور اس کی آنکھوں میں ہوتا تھا۔ سنجیدگی کے لمحات میں بھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کبھی غائب نہیں ہوتی تھی۔

مگر جس چیز سے میں سب سے زیادہ متاثر ہوا وہ اُس کی ذہانت تھی۔ وہ اتنی تیزی سے لوگوں کے کردار کو کُرید لیتا تھا اور اُن کی باتوں کی پرتوں سے اندر جھانک کر ان کی شخصیت کو بھانپ لیتا تھا کہ کبھی کبھار تو اس سے ایک Jealousy سی ہونے لگتی تھی۔ اِدھر کسی نے کوئی سنجیدہ سی بات کی کہ اُدھر اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہو جاتی تھی اور ہونٹوں پر ایک شریر اور بے چین سی مسکراہٹ پھوٹ پڑتی تھی۔ پھر حملہ ہوتا۔ بات قہقہوں کے طوفان میں کہاں سے کہاں نکل جاتی۔

وہ محفل میں ایک شکاری کی طرح تھا۔ تاک لگا کر بیٹھتا تھا۔ اور موقع ملتے ہی دوستوں کی باتوں کو لے اُڑتا تھا مجھے یاد ہے کہ کچھ بکواسی لوگ اور کچھ دھونس باز تو اُس سے گھبرانے لگے تھے۔ مگر مجال ہے کہ کسی نے اس کی کسی بات یا طنز اور چٹکلے پر بُرا مانا ہو۔ اس نے کبھی رکیک اور گرے ہوئے مذاق یا شخصی حملے نہیں کئے۔ اس کے مزاح میں شدت تو ہوتی ہی نہیں تھی۔ بس ایک چکا چوند ہوتی تھی۔

بہت جلد ہم سب دوستوں نے مان لیا کہ وہ مسخرا ہے۔ مزاح نگار ہے۔ سب کو ہنساتا ہے اور خود بھی زوردار قہقہے لگاتا ہے۔ اس کا یہ کردار جیسے اُبھرتا ہی گیا۔ "سیاست" کی کالم نگاری سے نکل کر وہ مزاح نگاری کے میدان میں تیزی سے جست لگاتا ہوا کہاں سے کہاں پہنچ گیا!

میں انگلستان میں بیٹھا ہوا سنتا رہا کہ وہ اب ہندوپاکستان کا مشہور مزاح نگار بن بیٹھا ہے۔ فخر تو ہوا ہی۔ اور یہ خیال بھی آیا کہ وہ اب جو کچھ بھی ہو اس کے جراثیم اس میں بہت پہلے سے تھے۔ اس کو مشہور اور عظیم مزاح نگار تو بننا ہی تھا۔

مگر بہت کم لوگ ایک "دوسرے مجتبیٰ" سے واقف ہیں۔ میں نے اس کی شخصیت کے اندر جھانک کر دیکھا ہے۔ اس کو میری میڈیکل ٹریننگ کا نتیجہ سمجھئے یا یہ کہ مجھے ایسے مواقع ملے ہوں جب میں نے مجتبیٰ کو اس کے عام فہم Medium سے باہر دیکھا ہو۔ بہرحال میں اس کے اندر چھپی ہوئی ایک ایسی عجیب اور نہایت پُرکشش شخصیت سے واقف ہوں کہ اس کو تحریر میں بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

برسات کی رات تھی۔ بارش جب رُکی تو گھر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ دیکھتا ہوں تو مجتبیٰ ایک دوست کے ساتھ گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ آکر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اور پھر اس نے ایک چونکا دینے والی فرمائش کی۔ کہنے لگا کہ "یوسف۔ تمہارے پاس مغربی موسیقی کے ریکارڈ ہیں نا۔ کچھ سُنادو۔" میں نے موزارٹ کی سمفنی لگادی۔ وہ خاموش بُت بنا سُنتا رہا۔ اس کے چہرے پر ایک وجدان کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اور ایسا لگتا تھا کہ وہ جذبات کی رو میں بہتا ہوا بہت دور چلا گیا ہو۔

مجھے بڑی حیرت اور خوشی ہو رہی تھی۔ "کیا یہ وہی مجتبیٰ ہے ؟" میں نے اپنے دل میں سوچا۔ "وہی جو دوستوں کی محفل میں مرکز توجہ بنا رہتا ہے اور دلگی، مذاق اور قہقہوں کے لالہ زار اُگاتا ہے ؟" یہ "دوسرا مجتبیٰ" تھا۔ اس کا دوسرا رُخ تھا۔ شائد اس کی شخصیت کے اس پہلو سے زیادہ لوگ واقف نہ ہوں۔

اس دوسرے مجتبیٰ کو میں نے اس واقعہ سے پہلے بھی کئی بار دیکھا ہے۔ اور اس کے بعد بھی وہ وقتاً فوقتاً اپنی شخصیت کے اس مخفی پہلو کو یوں دکھاتا رہا جیسے مزاح کی دلکش کہر کے پیچھے سے ایک عمیق اور پُراسرار وادی نظر آجاتی ہو۔

اس کو میں نے کئی بار رقت اور کیف کے موڈ میں دیکھا ہے۔ خصوصاً اس وقت جبکہ وہ اپنے ایک یا دو گہرے دوستوں کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس موقع پر اس پر گانے کی دھن سوار ہوجاتی تھی۔ اس کی آواز بے حد گہری اور ملائم ہے ہماری فرمائش پر وہ پنکج ملک اور سہگل کے گیت سناتا تھا۔ اتنے اچھے انداز میں کہ ہم تھوڑی دیر کے لئے بھول جاتے کہ یہی وہ مجتبیٰ ہے جو ابھی تھوڑی دیر پہلے دوستوں کے ہجوم میں قہقہوں کے بازار لُٹا رہا تھا۔

اس سے بھی آگے میں نے اس کی شخصیت کی اور زیادہ اندرونی اور گہری پرتوں کو بھی دیکھا ہے۔ اس کے اندر کا "آدمی" ایک نہایت سنجیدہ اور حساس شخصیت کا مالک ہے۔ اس میں نرمی، ہمدردی، غم اور کسی حد تک "خوف" کی پرچھائیں بھی ملتی ہیں۔ مگر یہ خوف یا خوف پسندی ایڈگر الان پو کے خوف کی طرح مابڈ (Marbid) نہیں بلکہ اسرار انگیز اور خواب جیسا ہوتا تھا۔

بعض دفعہ مجتبیٰ نے اپنے افسانوں کے Theme سنائے۔ اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ وہ اپنے چند day - dreams کو بھی سنا چکا ہے۔ ان سب میں جو چیز مشترک ہوا کرتی تھی وہ تھی وہی رومانی سنجیدگی اور گمبھیر اسرار انگیزی۔ جیسے اس کو mystery میں غیر معمولی دلچسپی سی تھی۔

اب میں سوچتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ "دوسرا مجتبیٰ" اس کی ظاہری شخصیت کا تضاد نہیں بلکہ Complimentary ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کی مزاح نگاری کی گہرائی اور حساس مشاہدے کا محرک اور باعث، شائد یہی اندرونی شخصیت ہے۔ یہ ایک ایسا dynamo ہے جو طنز و مزاح کے سارے کل پرزوں کو چلاتا ہے۔ اسرار کی خواہش اس کو مختلف واقعات، حالات اور ان سے وابستہ شخصیتوں کے اندر جھانکنے پر آمادہ کرتی ہے۔ اور وہ ایسی باتوں کو دیکھ لیتا ہے جو بہت سوں کی نظروں سے اوجھل رہتی ہیں۔ پھر کسی میر شکاری کی طرح ان واقعات پر طنز و مزاح کے تیر چلاتا ہے۔

کافی عرصہ کے بعد جب گذشتہ بار لندن میں اس سے میری ملاقات ہوئی تو وہ دوست احباب اور چاہنے والوں کے ہجوم میں گھرا ہوا تھا۔ اور ہمیشہ کی طرح مسکراہٹوں اور قہقہوں کے طوفان اٹھا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ خلوص سے آگے بڑھ کر گلے لگ گیا۔ سوائے اس کے کہ کچھ بال سفید ہو گئے تھے اور چہرے پر دو گوشتہ بُردباری آگئی تھی۔ اور کوئی تبدیلی اس میں نہیں ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وہی چمک تھی اور لبوں پر وہی تناؤ جو زوردار قہقہے کی ابتداء ہوتا ہے۔

مگر ایک لمحے کے لئے میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ مجھے اس دوسرے مجتبیٰ کی تلاش تھی۔ عینک کے شیشوں کے پیچھے اس کی آنکھوں میں رومانی خوابناکی صحیح و سالم تھی۔ اور ٹھٹھول بازی اور قہقہوں کے درمیان وہ گہری سوچ میں کھوتا ہوا نظر آتا تھا۔

--

وقار لطیف (لندن)

مجتبیٰ حسین

میرا دوست

مجتبیٰ حسین نے اپنی کسی مضمون میں اپنے بچپن اور جوانی کے اُن دنوں کا ذکر کیا ہے جو کھیتوں کے درمیان گزرے تھے۔ تازہ تازہ فصلوں کی مہک، ہرے بھرے کھیتوں کی دوشیزگی مویشیوں کی آوازیں ــــ

سابق ریاست حیدرآباد کے صوبہ گلبرگہ اور بعد میں غالباً ضلع عثمان آباد میں مجتبیٰ حسین نے یہ دیہاتی زندگی گزاری تھی۔ لیکن میں اس زمانے میں مجتبیٰ کو بالکل نہیں جانتا تھا۔ مجتبیٰ کا اور میرا تعارف ہمارے ایک دوست علی باقر نے کروایا تھا۔ جو سجاد ظہیر کے داماد ہونے اور اپنے افسانوں کے مجموعے "خوشی کے موسم" کے ناطے مشہور ہیں۔ لیکن اس وقت علی باقر کو خود اپنے اس شاندار مستقبل کا علم نہیں تھا۔ علی باقر کی تو اس وقت سب سے بڑی خوبی یہی تھی۔ [اور اب بھی ہوگی] کہ وہ شخصیتوں کی کیمیاوی ترکیب سے بہت اچھی طرح واقف تھے اور ان دوستوں ہی کا آپس میں تعارف کراتے تھے جو ایک دوسرے پر مرکب طور پر اثر انداز ہوسکتے ہوں۔ ان کی شخصیت کی حیثیت خود اس تعارف میں CATALYST یا فامرے جیسی ہوا کرتی جو کیمیاوی عمل کو تیز تر کردیتی ہے ـــ !

یہ ۱۹۵۶ء کے موسم سرما کا زمانہ تھا جب حیدرآباد کے باغ بغیچوں میں کارنیشن اور بوگن ویلیا کے پھول کھل رہے تھے اور ہواؤں میں وہ خنکی اور خوشگوار سرسراہٹ تھی جو حیدرآباد کے موسم بہار کا خاصہ ہوا کرتی ہے۔

مجتبیٰ حسین ان دنوں ہر شام اورینٹ ہوٹل جایا کرتے تھے اور جس وقت علی باقر نے ان سے میرا تعارف کرایا وہ اپنے تین چار دوستوں کے نرغے میں بہت ہی خوش خوش ہنسنے بیٹھے تھے۔ ان کے ٹیبل تک پہنچنے سے پہلے میں نے یہ بات نوٹ کرلی تھی کہ اور ٹیبلوں کی نسبت اس ٹیبل پر قہقہے زیادہ تعداد میں اور مسلسل لگ رہے تھے۔ تعارف کے بعد پتہ چلا کہ ان قہقہوں کا باعث مجتبیٰ حسین تھے جو اپنے کالج کے دوستوں کی کہانیاں مزاحیہ نمک مرچ لگا کر سب کو سنا رہے تھے۔ میں بھی ایک باادب نو وارد کی طرح ان قہقہوں میں شامل ہوگیا۔

نومبر ۱۹۵۶ء کی اس شام میں اورینٹ ہوٹل، علی باقر کے ہمراہ جسمانی طور پر گیا تھا تو مجھے اس بات کا قطعاً پتہ نہیں تھا کہ میں روحانی طور پر وہاں سے کسی وقت بھی نہیں نکل سکوں گا۔ چنانچہ میں اورینٹ ہوٹل سے نہ ہی ۱۹۶۴ء میں نکل سکا۔ جب کہ میں نے حیدرآباد چھوڑا، اور انگلستان آکر یہیں رہائش اختیار کرلی اور نہ ہی اُس وقت جبکہ ۱۹۹۲ء، اسکے لگ بھگ میں نے سنا کہ وہ دارالعلوم، وہ فنون لطیفہ، فلسفے اور سیاسیات، سماجیات، جمالیات، عرض ہر

عظیم فکر کا گہوارہ، دائیں اور بائیں بازو اور بے بازو والوں کا کلب ـــ اورینٹ ہوٹل اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکا ہے۔

مجھے اس قید میں گرفتار کئے رکھنے کی ذمہ دار ہستیوں میں پروفیسر حسن عسکری، ڈاکٹر یوسف علیخاں، تقی تنویر اور خود مجتبیٰ حسین سب سے آگے آگئے ہیں۔ ہم لوگوں کی دوستی جس دھوم دھڑکے کے ساتھ شروع ہوئی تھی، مجھے خوشی ہے کہ اسی دھڑلے سے اب تک قائم ہے۔ بلکہ اٹھائیس سالوں میں زماں و مکاں کے فاصلوں نے اس دوستی میں بجائے کمی کے اور اضافہ کر دیا ہے۔

تو بات ۱۹۵۶ء کی نومبر کی شام کی ہو رہی تھی۔ جب پہلی بار میں مجتبیٰ حسین سے ملا ـــ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یا تو اسی شام یا اس کے بعد کی شام ہم دونوں چہل قدمی کرتے کرتے حسین ساگر کے ٹینک بینڈ تک اور پھر ٹینک بنڈ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ گئے۔ باتیں وہی ہوئیں، جو یونیورسٹی کے طالب علم ایک دوسرے سے کرتے ہیں ـــ معاشقوں کی، حسین چہروں کی شاعری کی اور بچپن کے لمحات کی۔ اور اسی شام میں مجتبیٰ حسین کا ایسا دوست بن گیا کہ جیسے ہم ازل سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں اس کے بعد ہر شام اورینٹ میں بیٹھنا اور شام کو مجتبیٰ کے ساتھ چہل قدمی کے لیے نکلنا میرے لیے ایک معمول بن گیا یہ بات یاد رہے کہ محفل میں مجتبیٰ حسین جس قدر زندہ دل، بذلہ سنج اور خوش مزاج آدمی ہوا کرتا اتنا ہی اکیلے میں اس پر اُداسی اور اضمحلال اور ایک محزون سی رومانیت کا موڈ سوار ہو جاتا ـــ اور وہ زندگی کے پُراسرار لامتناہی رنج و غم اور زندگی کی بے ثباتی پر گھنٹوں یوں گفتگو کرتا جیسے وہ الھڑ نوجوان نہیں بلکہ کوئی اسی سالہ مدبر بوڑھا ہو ـــ اپنی ان چہل قدمیوں کے دوران اپنی بھاری اور دل پذیر آواز میں وہ مجاز مرحوم کا کلام ترنم سے پڑھنے لگتا اور مجھے خواہ مخواہ غمگین بنا دیتا۔ ـــ

سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے ؎ اوروں کے گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے

اس زمانے میں اس پر جرمن فلسفیوں شوپن ہاور اور نطشے کا جادو چڑھا ہوا تھا اور وہ کبھی انسان کو اس زمین پر حقیر کیڑے کی طرح جاننے لگتا اور کبھی اسے نطشے کا فوق البشر (SUPERMAN) سمجھنے لگتا۔ اس کی حس مزاح ابھی تک اورینٹ ہوٹل کے ٹیبلوں پر لگاتار چٹکلے بازی ہی کی حد تک محدود تھی اور ابھی تک یہ راز اس پر نہیں کھلا تھا کہ نطشے اور شوپن ہاور کے فلسفے میں بھی ہزاروں مزاحیہ پہلو ہیں اور نطشے کے سپرمین اور امریکی کارٹونوں کے سپرمین میں کچھ اتنا زیادہ فرق نہیں!

زندگی اور کائنات کی جانب اس سرعت سے بدلتے ہوئے رویے کے سفر میں خود میں مجتبیٰ حسین کا ہمسفر رہا ہوں اور یہ جانتا ہوں کہ جہاں آسکر وائلڈ نے غم کی مطلقاً تردید سے ابتداء کی اور ہر خوشی کی تہہ میں صرف غم دیکھنے کے بعد اپنی زندگی کا اختتام کیا وہاں مجتبیٰ حسین نے غم کی مسلم حیثیت کا اقرار کر لینے کے کچھ ہی سال بعد ہر غم اور حادثے کے پس منظر میں مسکراہٹوں اور قہقہوں کے کھیلتے کودتے بچوں جیسے روشن، متحرک خدوخال بھی دیکھنے شروع کر دیئے۔ شخصیت کے نفسیاتی ارتقاء کا یہ نہایت خوشگوار پہلو تھا۔ مجتبیٰ نے اپنے ادب کی ابتداء نہایت ہی تنگ و تاریک روحانی جگہوں کے طواف سے شروع کی تھی۔ ان جگہوں میں کبھی وہ اڈگر ایلن پو کی طرح اندھی آنکھوں اور متعفن لاشوں کو دیکھا کرتا تو کبھی دوستوفسکی کی طرح اسے وہاں صرف جرم و گناہ کی چڑیلیں اور بھوت پریت نظر آیا کرتے۔

خود میرے افسانے اس زمانے میں، صبا، ساقی، ادب لطیف، افکار اور دوسرے ہندوستانی و پاکستانی ادبی رسائل میں چھپا کرتے تھے اور مجتبیٰ میرے اُن افسانوں کو چھپنے سے پہلے پڑھے بغیر نہیں رہتا تھا۔ میرے ان افسانوں میں زندگی کا خوشگوار سرور اور لاابالی پہلو زیادہ نمایاں ہوا کرتا تھا اور مجتبیٰ حسین اپنی اندرونی چمک دار اور مجلی ہوئی شخصیت کو ان،

افسانوں میں منعکس دیکھ کر خود آہستہ آہستہ تخلیقی طور پر بدل رہا تھا۔

چنانچہ غالباً ۱۹۶۲ء میں جہاں شاہد صدیقی جیسے عظیم شاعر۔ روز نامہ "سیاست" کے "شیشہ و تیشہ" کے مزاحیہ کالم نگار کے انتقال کے کچھ عرصے بعد مجتبیٰ حسین مزاح نگار کی پیدائش بھی ہوئی اور اپنا پہلا مزاحیہ مضمون اسی نے "شیشہ و تیشہ" کے کالموں کے لیے لکھا۔ پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی آئی۔ یا یوں کہیے کہ چراغوں میں روشنائی آئی۔ اور مجتبیٰ حسین کا مزاحیہ قلم وہ گھوڑا بن گیا کہ "نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں" — اور پھر مجتبیٰ حسین نے اردو ادب میں مزاح لکھنے والوں کے اولمپک ریکارڈ دھڑا دھڑ توڑنے شروع کر دیئے —

چند مزاح نگاروں نے ماضی میں جیسے شوکت تھانوی نے درجنوں کتابیں لکھ ڈالیں لیکن ان میں سے تین یا چار کتابوں ہی کو مستقل ادبی اہمیت کا حامل سمجھا گیا۔ مجتبیٰ حسین نے اپنے سے سینئر معزز مزاح نگاروں یعنی مشتاق احمد یوسفی، کنہیا لال کپور، اور شفیق الرحمٰن کی طرح جو کچھ بھی لکھا اس میں کہیں بھی ادب عالیہ کے معیار کو گرنے نہ دیا۔ حالانکہ تعداد نویسی میں وہ تقریباً کنہیا لال کپور کے دوش بدوش نظر آتے ہیں۔ ان کے مضامین کے چھ مجموعے چھپ چکے ہیں۔ "تکلف برطرف" "قطع کلام" قصہ مختصر، بہرحال، بالآخر اور آدمی نامہ" پھر اس کے بعد ان کا شاہکار سفرنامہ جاپان — جاپان چلو، جاپان چلو، پچھلے سال شائع ہوا تو سارے ہندو پاک میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ اور وہ لوگ بھی جو ادب سے کوئی شغف نہ رکھتے تھے اس کتاب سے اتنے متاثر ہوئے کہ اب نہ صرف مجتبیٰ حسین کی ساری کتابیں پڑھنے بیٹھے ہیں بلکہ سارے اردو ادب کو ہی چاٹ جانا چاہتے ہیں۔ "جاپان چلو" نے اردو کے مزاحیہ ادب کے لیے شاید وہی کیا ہے جو سنجیدہ افسانوی ادب کے لیے منٹو اور کرشن چندر نے کیا تھا۔ مجتبیٰ کے اس سفرنامے کے ترجمے نہ صرف ہندی میں بلکہ ہندوستان کی بہت ساری علاقائی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ اور ان زبانوں میں بھی اسی قدر مقبول ہوئے ہیں کہ اور تو اور خود جاپانی زبان میں یہ کتاب ترجمہ کی جا چکی ہے۔ مجتبیٰ حسین کی شخصیت میں وہ کیا بات ہے جو اسے اس قدر محبوب و ہر دلعزیز مصنف بنانے کی ذمہ دار ہے۔ اگر میں مجتبیٰ حسین کی کتاب "آدمی نامہ" کے شخصی خاکوں کی زبان مستعار لوں جس میں انھوں نے سجاد ظہیر کو "مسکراہٹوں کا آدمی" اور مخدوم محی الدین کو "یادوں میں بسا آدمی" کا نام دیا ہے تو مجتبیٰ حسین کا نام میں "بے غرض آدمی" تجویز کر دوں گا بے غرض آدمی سے میرا مطلب ایسا شخص نہیں جسے کھانے پینے، گھر گرہستی، اوڑھنے بچھونے کے لیے پیسے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ بلکہ ایسے شخص سے ہے۔ جو اس دنیا کے بازار سے تجاہلِ عارفانہ کے ساتھ گزرتا ہے، جسے نہ مال و دولت کی ہوس ہے نہ مال و دولت سے نفرت، جسے نہ شہرت کی طمع ہے نہ شہرت سے بددلی، جو حیدرآبادی ہونے کے ناتے اپنے وطن کی ہر شخصیت اور ہر شئے کا عاشق ہے۔ (بشرطیکہ اب بھی وہ حیدرآبادی تہذیب کی آئینہ دار ہو۔) پنجابیوں کو پنجاب سے محبت کرتے ہوئے دیکھ کر وہ پھولے نہیں سماتا اور جاپانیوں کو اسی لیے پسند کرتا ہے کہ وہ ماڈرن مشینی زندگی کے قائل ہونے کے باوجود اس مشینی زندگی کے شکنجے میں نہیں ہیں —! عجیب بات ہے کہ مجتبیٰ کی تازہ ترین کتاب یعنی "جاپان چلو — جاپان چلو" میں میں نے اُسکی تحریر میں غالب جیسی فقیرانہ شگفتگی دیکھی اور غالب جیسی ہی مہذب حسِ مزاح — اور اسی سال جب غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کے چار سالانہ انعامات میں مزاح کا اضافہ ہوا تو مجتبیٰ حسین ہی اس انعام کے مستحق قرار دیئے گئے۔ گویا جہاں قرۃ العین حیدر جیسی مایہ ناز ناول نگار کو افسانوی ادب اور ناولی ادب کا سب سے بڑا انعام دیا گیا اور دیوندر ستیارتھی شرما کو اردو ڈرامہ نویسی کا وہیں مجتبیٰ حسین مزاحیہ ادب کے شہزادے مانے گئے —!

○○

[مارچ ۱۹۸۲ء میں لندن کے ایک جلسہ میں پڑھا گیا]

وہاب عندلیب

مجتبیٰ حسین

میں مجتبیٰ حسین کو اُن دنوں سے جانتا ہوں جب کہ وہ گلبرگہ میں انٹرمیڈیٹ کر رہے تھے۔ گریجویشن کے لئے حیدرآباد آئے تو ان کا قیام بھی ہمارے ساتھ گلبرگہ کے طلباء کی ہوسٹل "اسٹوڈنٹس کاٹیج" ہی میں رہا۔
کالج کے ڈائیننگ ہال میں مجتبیٰ کی وجہ سے بڑی ہماہمی رہتی۔ دسترخوان پر اگر احباب ان کے منتظر رہتے تو بعض ان کا سامنا کرنے سے احتراز کرتے کیونکہ مجتبیٰ کے تیز و تند فقروں کی تاب لانا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔
جامعہ عثمانیہ میں وہ مجھ سے دو سال جونیئر تھے۔ ان دنوں ان کا خصوصی مشغلہ گپ ہانکنا تھا۔ ہر دم غیر نصابی سرگرمیوں میں معروف رہتے۔ پڑھتے کم، گھومتے زیادہ تھے۔ زیادہ تر وقت سگریٹ پھونکنے کی نذر ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ ابتدائی مدارس سے لے کر کالج تک اسپورٹس میں دلچسپی لی۔ گلی ڈنڈا، فٹ بال اور پینگ پانگ کھیلتے رہے۔ اسپورٹس سے دلچسپی کم ہوئی تو سنیما بینی اور ہوٹلنگ پر توجہ مرکوز کی۔ خود ان کا بیان ہے کہ انھیں کلاس روم میں پٹاخے چھوڑنے، بندروں اور بلیوں کی آوازیں نکالنے میں مہارت تھی۔ زندہ دلی اور خوش ذوقی کے باعث ہاسٹل اور کالج کے احباب میں ممتاز رہے، گویا ہنسنا اور ہنسانا ان کی ہابی تھی۔ اکثر فقرے کستے، لطیفے اور چٹکلے گھڑتے مذاق اُڑاتے یا بھری بزم میں راز کی بات کہہ دیتے تو کور ذوق ان سے منہ چھپاتے اور زندہ دل ان کی پُرلطف باتوں سے اپنی تکان دور کرتے۔ ابتدا ہی سے بڑے لطیفہ گو اور لطیفہ ساز تھے۔ اکثر کسی کے حوالے سے لطیفہ یا واقعہ سناتے مگر بہت سارے لطائف ان کی دماغی پیداوار ہوتے۔ جتنی دیر بھی ہم ان کے ساتھ ہوتے وقت کے گذرنے کا احساس نہ ہوتا۔ اسی فطری میلان نے انھیں مزاحیہ ادب کی جانب راغب کر دیا۔ غالبؔ، مارک ٹوئین، پی۔ جی وڈ ہاؤس، پطرسؔ، اسٹیفن لیکاک، کرشن چندر، بیدیؔ، شفیق الرحمٰن، رشید احمد صدیقی، کنہیا لال کپور، ابن انشاء، فکر تونسوی اور ابراہیم جلیس، ان کے پسندیدہ ادیب ہیں۔ نیٹشے کا فلسفہ، غالبؔ کا دیوان اور پطرس کے مضامین انھیں زبانی یاد ہیں۔
نئے مزاح نگاروں میں مشتاق احمد یوسفی کو پسند کرتے ہیں۔ ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے ۱۹۶۶ء میں حیدرآباد میں پہلی بار ملک بھر کے مزاح نگاروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا۔ تب سے یہ روایت چل پڑی ہے کہ حیدرآباد میں مزاح نگاروں کا سالانہ اجتماع باقاعدگی سے ہوتا رہتا ہے۔ مجتبیٰ کے دہلی پہنچنے کے بعد اس طرح کے اجتماعات دہلی، لکھنؤ، پٹنہ اور شمال کے دیگر شہروں میں بھی منعقد ہو رہے ہیں۔

مجتبیٰ نے روزنامہ "سیاست" کے فکاہی کالم "شیشہ و تیشہ" سے مزاح نگاری کا آغاز کیا اور ایک عرصہ تک ماہنامہ "پونم" میں بھی فرضی نام سے مستقل مزاحیہ کالم لکھتے رہے۔ ان کا پہلا مضمون "ہم طرفدار ہیں غالب کے سخن فہم نہیں" ۱۹۶۴ء میں 'صبا' میں چھپ کر مقبولِ عام ہوا۔

'تکلف برطرف' (۱۹۶۸ء) ان کے مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔ جس کی ادبی حلقوں نے بڑی گرم جوشی سے پذیرائی کی۔ ممتاز مزاح نگار فرقت کاکوروی کے یہ الفاظ سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ "۳۲ سال کی عمر میں ایسے انداز میں رچے بسے فقرے نکالنا اسداللہ خاں قیامت ہے"۔

مجتبیٰ نے برق رفتاری سے مضامین لکھے۔ ہر دوسرے سال ان کا ایک نیا مجموعہ منظر عام پر آتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۷۰ء میں "قطع کلام" ۱۹۷۲ء میں "قصہ مختصر" اور ۱۹۷۴ء میں "بہر حال" شائع ہوا۔ ان کے مجموعہ ہائے مضامین کے باعث مزاح نگاری کی شہرت دکن سے شمال تک پہنچ گئی۔

اس طرح ایک عرصے کے بعد ولی دکنی کی طرح مجتبیٰ حسین بھی شمال میں ادبی محفلوں کی روح رواں بن گئے ہیں۔ جس کا اعتراف اہل شمال نے کیا ہے۔ جنوری ۱۹۷۵ء کے اوائل میں "بہر حال" کی رسم اجراء کا جلسہ دہلی میں منعقد ہوا۔ ممتاز محقق و نقاد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اس تقریب کی صدارت کرتے ہوئے یوں اظہار خیال فرمایا تھا۔

"ڈھائی سو سال پہلے ارضِ دکن سے غزل کا شہزادہ ولی دکنی دہلی آیا تھا اور اب ڈھائی سو سال بعد ارضِ دکن سے مزاح کا شہزادہ دہلی آیا ہے اور اس کے آتے ہی دہلی کی مزاحیہ ادبی محفلوں میں ایک جان سی پیدا ہو گئی ہے"۔

حیدرآباد اور گلبرگہ جیسے شہر تو دکن میں کسی تعارف کے محتاج نہیں مگر نارنگ کے اس خراجِ تحسین کے بعد چنچولی، تانڈور اور راجوری جیسے مقامات بھی دکن کے نقشے میں نمایاں ہو جاتے ہیں کیونکہ مجتبیٰ اپنے ننھیال، چنچولی ضلع گلبرگہ (کرناٹک) میں ۱۵ر جولائی ۱۹۳۶ء کو پیدا ہوئے۔ راجوری ضلع عثمان آباد (مہاراشٹرا) ان کا آبائی وطن ہے۔ انھوں نے تانڈور (آندھرا) سے میٹرک، گلبرگہ سے انٹرمیڈیٹ اور جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے گریجویشن کے علاوہ ڈپلوما اِن پبلک اڈمنسٹریشن کا امتحان کامیاب کیا۔ اس طرح مجتبیٰ بہ یک وقت کرناٹکی، مہاراشٹری اور آندھرائی کہلانے کا استحقاق رکھتے ہیں۔

مجتبیٰ مزاح کے شہزادے ہی نہیں بلکہ خوابوں کے شہزادے بھی معلوم ہوتے ہیں۔ سانولا سلونا رنگ، اونچی ناک، شرارت و فراست سے پُر آنکھیں، سلیقے سے جمے ہوئے بال اُن کی شخصیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اِن شرٹ کئے اپنی سادگی کا اعلان کرتے نظر آتے ہیں، مگر آپ ان کے اس سادہ لباس اور چہرہ پر پھیلی ہوئی بے ضرر معصومیت پر نہ جائیے ان کی معصومیت میں کئی شرارتیں پوشیدہ ہیں۔ ان کی سدا بہار شخصیت کے باعث ان کی اصلی عمر کا پتہ لگانا مشکل ہے۔ وہ ابھی کنوارے ہی نظر آتے ہیں۔ حال ہی میں کملا نہرو کالج دہلی میں اپنی صاحبزادی کے داخلے کے سلسلے میں گئے تو وہاں اچانک ایک محترمہ کا سامنا ہوا جو ان ہی کے آفس میں کام کرتی ہیں۔ مجتبیٰ کو لڑکیوں کے کالج میں دیکھ کر انھیں اچنبھا ہی نہیں بلکہ تشویش ہوئی۔ محترمہ کو یقین نہیں آیا کہ مجتبیٰ کی صاحبزادی ڈگری کالج میں ہو سکتی ہیں۔ وہ تو مجتبیٰ کو اس عمر کا سمجھتی ہیں جس میں کالج کا طواف کسی اور مقصد سے کیا جاتا ہے۔

آج محرومی اور عدم تحفظ کے احساس نے فرد کو نیم جاں اور شکستہ بنا دیا ہے۔ جاں نثار اختر نے اسی احساس کو یوں بیان ...

بکھر گیا ہے کچھ اس طرح آدمی کا وجود
ہر ایک فرد کوئی سانحہ لگے ہے مجھے!

اس حوصلہ شکن ماحول میں ہنسنا ہنسانا یقیناً ایک پرابلم ہے۔ اس خصوص میں مزاح نگار کی ذمہ داریاں دوچند ہوجاتی ہیں۔ کیونکہ اس کی تحریریں نہ صرف دل برداشتہ و دل شکستہ افراد کی دلجوئی کا موجب بن جاتی ہیں بلکہ کچھ دیر کے لئے ہی سہی، ان کی بے کیف زندگیوں کو مسرت سے ہمکنار کرتی ہیں۔ مجتبیٰ کی تمام تر خدمات اسی خوشگوار فریضہ کے لئے وقف ہیں۔ ان کے ہاں "ہنسی ایک مقدس فرض اور قہقہہ لگانا، دنیا کا سب سے بڑا اڈوینچر ہے"۔ مجتبیٰ نے نہایت کم عمری میں لکھنا شروع کیا، اور قلیل عرصے میں ہی اپنی چونکا دینے والی تحریروں کے ذریعہ ایوانِ ادب میں تہلکہ مچا دیا۔ ان کے ہاں قہقہے بھی ہیں اور زیرلب تبسم بھی۔ جب وہ پھلجھڑیوں اور لطائف سے پُر مضامین پڑھتے ہیں تو جلسہ گاہ کی چھت اُڑ جانے کا خدشہ لگا رہتا ہے۔

مجتبیٰ حسین کو خاکہ نگاری میں بھی کمال حاصل ہے۔ انھوں نے مرقع نگاری کو ایک نیا موڑ دیا ہے۔ سلیمان اریب، عزیز قیسی، عمیق حنفی، فکر تونسوی اور حسن الدین احمد پر لکھے گئے ان کے خاکے ادب میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

مجتبیٰ دوستوں کے رسیا اور متوالے ہیں۔ دفتری مصروفیت کے بعد ان کا زیادہ تر وقت دوستوں کی نذر ہوتا ہے۔ حیدرآباد کا اورینٹ ہوٹل ہو کہ دہلی کا کافی ہاؤس احباب ہمیشہ ان کے منتظر رہے ہیں جہاں ادبی سیاسی اور معاشرتی مسائل پر گھنٹوں گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ وہ دوستوں پر اس طرح جان چھڑکتے ہیں کہ بسا اوقات اپنا گھر بھول جاتے ہیں۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ رات دیر گئے گھر پہنچتے ہیں اور علی الصبح گھر چھوڑ دیتے ہیں۔ سارے جہاں کا درد اپنے جگر میں محسوس کرتے ہیں۔ دوستوں کی ضرورتوں کو اپنی ضرورت سمجھتے ہیں۔ مجتبیٰ ایک دردمند انسان دوست ادیب ہیں۔ وہ جدوجہد پر ایقان رکھتے ہیں۔ زندگی کے تندو تیز تھپیڑوں سے گھبراتے نہیں۔ مایوسی ان کے مسلک میں حرام ہے۔

۱۹۴۸ء کے پُرآشوب دور میں جبکہ وہ ہائی اسکول میں تھے معصوموں کو لٹتے اور بے گناہوں کو کٹتے دیکھا۔ یہاں تک کہ ان کے حقیقی ماموں ان کی نظروں کے سامنے موت کے گھاٹ اُتار دیئے گئے۔ اس کے باوصف وہ عصبیت کا شکار نہیں ہوئے۔ انھوں نے فرقہ واریت سے اپنے دامن کو محفوظ رکھا۔ اپنی تحریروں میں اگرچہ وہ کسی ازم کے ڈھنڈورچی نظر نہیں آتے۔ مگر ہر مرحلہ پر ترقی پسند طاقتوں کا پوری طاقت اور خلوص سے ساتھ دیتے ہیں۔ ان کے قریبی احباب میں ہر مکتب فکر کے اصحاب شامل ہیں۔ مجتبیٰ ان دنوں دہلی میں صاحب محفل بھی ہیں اور جانِ محفل بھی۔ جدیدیت کے ہمنوا ہوں کہ ترقی پسندی کے علم بردار، سبھی حلقوں میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔ ویسے ایک ذمہ دار ادیب کا منصب بھی یہی ہے کہ وہ انتہا پسندی کا شکار ہوئے بغیر حقیقت کی ترجمانی کرے۔ (۱۹۷۷ء) ••

قدیر زماں

مجتبیٰ حسین ــــ گردشوں کا آدمی

بعض لوگ برسوں ساتھ رہ کر بھی اپنی شخصیت کی پیچیدگی کی وجہ سے یا یوں کہیئے کہ اپنی شخصیت کی گہرائی کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آتے اور بعض احباب ایسے بھی ہیں جن سے ملاقاتیں گاہے گاہے ہوتی رہتی ہیں اور برسوں بعد یہ ملاقاتیں کسی موڑ پر تکمیل کو پہنچتی ہیں۔ مجتبیٰ حسین کا اور میرا کچھ ایسا ہی گاہے گاہے ساتھ رہا ــ ورنہ ۱۹۵۴ء کو گزرے کوئی تینتیس (۳۳) سال کا طویل عرصہ بیت چکا ہے اور اب کہیں جاکر اُن سے دوستی کی استواری کا احساس ہوتا ہے۔ یہ اظہار بھی یک طرفہ ہے۔ کون جانے مجتبیٰ کے ذہن میں کیا بات ہو ہر شخص کو اِتنا حق تو حاصل ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے دوستوں کی ایک فہرست بناسکے۔ ان کی درجہ بندی کرے۔ حسن کی، اقتدار کی اور شہرت کی درجہ بندی، روابط کی درجہ بندی۔ پھر ان سب کا کشید محبتوں کی درجہ بندی۔

... ...

۱۹۵۴ء کی بات ہے میں حیدرآباد میں نووارد تھا۔ گلبرگہ اسٹوڈنٹس کا یخ کاچی گوڑہ (مبول اڈہ) اپنی جمہوری اساس کے ساتھ ساتھ علمی اور ادبی مشاغل کی وجہ سے کافی شہرت پاچکا تھا۔ وہاب عندلیب (گلبرگہ) اس کے روح رواں تھے۔ ہر روز سٹی کالج سکندرآباد جانے کے لیے میرا کاچی گوڑہ میں قیام ضروری تھا۔ یہاں میں نے داخلہ لیا تو پہلی بات جو نمایاں طور پر میں نے محسوس کی وہ یہ تھی کہ ہر صبح اقامت خانے کے چند طلبہ کچھ جھنڈیاں اور کچھ ورقیے ہاتھوں میں لیے آرٹس کالج کے لیے روانہ ہوتے۔ واپس ہو کر یہ احباب اکٹھے بیٹھے ہوئے خوش گپیوں اور خوش الحانیوں میں مصروف نظر آتے۔ ایک دن پتہ چلا کہ اس گروہ نے کالج یونین کا جو پیانل بنایا تھا وہ جیت لیا ہے۔ کوئی غلام احمد صاحب صدر بنے ہیں اور معتمد کوئی مجتبیٰ حسین ہیں۔

جب کسی نے بتایا کہ مجتبیٰ حسین مہابراہیم جلیس کے بھائی ہیں تو چونکہ اُن دنوں ابراہیم جلیس کا چرچا تھا اور [illegible] اشین پڑھ بھی چکا تھا اس بے تیر نے دل ہی دل میں سوچا " ہولنگے یہ ابراہیم جلیس کے بھائی بہت سے لوگ

کسی نہ کسی کے بھائی بہن ہوتے ہی ہیں۔ صرف بھائی بننے سے انھیں کون سُرخاب کے پر لگ گئے۔

مجتبیٰ کو سُرخاب کے پَر لگانے سے ابھی بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے لیکن کوئی شخص اپنی زندگی کو کسی کاز کے لیے وقف کردے اور اُس کے بدلے میں دُنیا اُسے کوئی اعزاز بخشے تو اس سے چھٹکارا بھی تو نہیں ہے۔

آرٹس کالج اسٹوڈنٹس یونین کے معتمد کا کوئی نقشہ تو میرے ذہن میں نہیں رہا لیکن ہر صبح "شیشہ و تیشہ" پڑھ کر احباب کو ہنسی مذاق میں لگانے والے اور باتیں بنانے والے مجتبیٰ کا نقشہ اُس وقت ذہن میں بنا جب وہ خود "شیشہ و تیشہ" لکھنے لگے۔

ابھی ذرا ملاقاتیں بڑھی ہی تھیں کہ ایک دن مجتبیٰ مجھ سے ملے تو اُن کے ہاتھ میں تصویروں کا ایک بنڈل تھا اورنگ آباد کی سیر و سیاحت کی تازہ یادیں تھیں۔ ایک ایک تصویر دکھاتے ہُوئے کہنے لگے "دیکھئے یہ ہے 'الف' کی تصویر اور یہ ہے "میم" کی تصویر اور میں یہاں ہوں جناب۔" اب حیرت ہوتی ہے کہ اورنگ آباد کی سیر و سیاحت کی تصاویر دکھانے والا یہ شخص کبھی نہیں کہتا کہ "دیکھئے روس میں مَیں یہاں ہوں۔ اِس جگہ میں امریکہ میں چل رہا یہ میری جاپانی تصویر ہے۔" اب انھیں اپنی تصویریں دکھانے کا کوئی شوق نہیں رہا ہے۔ البتہ جس ملک کی وہ سیاحت کرتے ہیں اُس ملک کی، وہاں کے لوگوں کی، اُن کی روایتوں اور اُن کی تہذیبی زندگی کی تصویریں دِکھا دِکھا کر اپنے احباب اور پڑھنے والوں کی معلومات کے خزانے میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔

تصویریں دِکھانے کا ایک اور فن بھی انھیں آتا ہے۔ باتیں کرنے اور باتیں بنانے کا فن ہر شخص میں کچھ نہ کچھ ودیعت ہوتا ہی ہے لیکن مجتبیٰ باتیں کرتے کرتے کب باتیں بنانے لگ جاتے ہیں اس کا فرق مشکل ہی سے کیا جاسکتا ہے۔ دن بھر باتیں بنانے والا اور رات دیر گئے تک احباب کی محفلوں کو اپنے قہقہوں سے گرمانے والا یہ شخص نہ جانے کب کاغذ اور قلم لے کر بیٹھ جاتا ہے اور ایک آرٹسٹ میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ اسکیچس اور کیریکیچرس بناتا ہوا یہ فنکار کبھی کبھی فوٹوگرافی کی حدوں کو چھو جاتا ہے۔ معلوم نہیں جن کی تصویریں کھینچی جاتی ہیں وہ اپنے تئیں کیا محسوس کرتے ہیں لیکن قاری اوّل تو مُسکرانے لگتا ہے پھر ہنسنے لگتا ہے اور ہنستے ہنستے اچانک ایسے موڑ پر پہنچ جاتا ہے جہاں ماہ و سال اُس کے سینے پر مونگ دل رہے ہوتے ہیں۔ کبھی وہ 'تانگے کا گھوڑا' ہے تو کبھی 'ہلدی کی گانٹھ'۔ آخر کار خود اپنے اور اپنے ہمزاد کے الجھے سے گزر کر جب ہم مجتبیٰ حسین کے 'انجام' تک پہنچتے ہیں تو پھر سے اُن کی کوئی تحریر پڑھنے کو جی چاہتا ہے تاکہ پھر سے مُسکرائیں۔ اُنھوں نے اِن مُسکراہٹوں میں نہ تو بخل سے ہی کام لیا ہے اور نہ ہی خجالت سے۔ مجتبیٰ قہقہہ بھی لگاتے ہیں تو آپ کو اس سے مفر نہیں کہ آپ اُن کے قہقہوں میں شامل نہ ہوں۔

ابھی آپ نے مجتبیٰ سے اپنا 'تکلف برطرف' ہی کیا ہوگا کہ 'قطع کلام' کہہ کر وہ آپ کو آپ ہی کا یا خود اپنا 'مختصر قصّہ' سُنانے لگیں گے۔ 'بہرحال' یا 'بالآخر' وہ آپ کو اپنے 'آدمی نامہ' تک لے آئیں گے اور جب آپ ان کے تمام آدمیوں سے مل چکیں تو پھر وہ کہیں گے اب تو 'جاپان چلو بھئی جاپان' لیکن شرط یہ ہے کہ پہلے آپ مجتبیٰ سے تکلف کو برطرف کردیں۔

میں کئی برس تک مجتبیٰ کے قہقہوں کی لطافت سے محروم رہا۔ بہت دِنوں بعد اس کا علم ہوا کہ وہ ایک پُرسوز اور دردمند دل کے مالک ہیں میں نے انھیں اپنے دوستوں کی مشکلات کو دور کرنے کے لیے دِلّی کی لمبی لمبی سڑکوں پر اس طرح گھومتے ہُوئے دیکھا ہے جیسے اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ہم لوگ گھر اور بازار کے چکّر لگاتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ دِلّی سے حیدرآباد کے بھی اسی طرح چکّر لگاتے ہیں جیسے

کوئی دفترِ معتمدی کے ایک محکمے سے دوسرے محکمے کو پیروی کرنے کے لیے جاتا ہو۔

مجتبیٰ کی بے شمار ایسی ہی خصوصیات ہیں جن کا ہم اپنے اپنے تجربہ کی بنیاد پر باری باری سے ذکر کر سکتے ہیں اُن کی مکمل شخصیت کو پیش کرنا مشکل کام ہے۔ یُوں بھی میرے بس کی بات نہیں کہ کسی کو پوری طرح سے سمجھوں اور سمجھ پاؤں تو لکھ بھی سکوں۔ اتنی بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ مجتبیٰ اندر سے کتنے ہی سنجیدہ ہوں احباب میں وہ کبھی سنجیدہ نظر نہیں آتے۔ محفل نے کسی وجہ سے سنجیدگی کا لبادہ اُوڑھ بھی لیا ہو تو وہ موقع کی تلاش میں رہتے ہیں کہ کوئی بات نکلے اور وہ محفل کو زعفران زار بنادیں۔ البتہ میں نے کبھی کبھی محسوس کیا کہ محفل سے نکل کر اکیلے میں وہ آپ کے ساتھ پوری سنجیدگی برتیں گے۔ ایک موقع پر ایسی ہی محفل سے نکل کر کہنے لگے " آپ نے اچھا کیا بلکہ بہت ہی اچھا کیا کہ اُس شخص کا نام پوچھ لیا۔ اُسے حقیر کرنے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ چند دِنوں کی گورنری کیا کی کہ وہ ابھی تک اپنے آپ کو گورنر سمجھتا ہے۔ ہم سے تو ملاقات ہے اور آپ جانتے ہیں کہ ہم مروّت کے مارے ہیں۔ ہم اُس کا نام کیسے پوچھتے " لیکن یہ عجب نہیں کہ دوسرے ہی دن آپ مجتبیٰ کو اُسی شخص کی لڑکی کو کسی کالج میں داخلہ دِلوانے کے لیے سڑکوں پر مارا مارا پھرتے دیکھ لیں۔

خیر، یہ تو اُن کی شخصیت کا ایک پَرتَو تھا۔ مجتبیٰ کے اندر کا آدمی تو اُن کی تحریروں میں چھپا ہوا ہے۔ اُن کا تخلیق کیا ہوا کوئی بھی کردار ہنسوڑ نہیں ہے۔ ڈاکٹر ہو کہ مریض، رکشا راں ہو کہ رکشا سوار، باورچی ہو کہ مالک، فقیر ہو کہ داتا، موچی ہو کہ لکھ پتی، منتری ہو کہ پرجا مجتبیٰ اِن سب کے مسائل کو درد مندانہ دل سے دیکھتے ہیں۔ اُن کے دکھ میں خود بھی شریک ہوتے ہیں اور قاری کو بھی شریک کر لیتے ہیں۔ غور سے دیکھئے تو اُن کی تحریروں میں طنز نہیں بلکہ مزاح ہے اور اسی کی آڑ میں وہ پتے کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ اُن کے اس ایک جملے ہی کو پڑھیئے۔ شب و روز کی زندگی میں مجتبیٰ کو آپ اپنا ہم سفر پائیں گے۔

> " سورج خوش قسمت ہے کہ اسے صرف ایک ہی صورت میں گہن لگتا ہے یعنی جب چاند، سورج اور زمین کے درمیان آجاتا ہے۔ مگر ہم ایسے سیّارے ہیں جن کے اطراف ہزاروں سیارے گردش کرتے رہتے ہیں "

○

" مزاح نگار کا کام معاشرے کی اصلاح کا نہیں ہے، کیوں کہ طنز و تشنیع سے معاشرے کی اصلاح ممکن ہوتی تو بارُود ایجاد نہ ہوتی "

مُشتاق احمد یُوسفی

سنی حسن جاوید صدیقی
(دہلی)

مجتبیٰ حسین — سچے لمحوں کا سچا انسان

۱۹۷۷ء کی ایک شام امروہہ میں انجمن ترقی اردو کی جانب سے مجتبیٰ حسین کے اعزاز میں ایک ادبی محفل منعقد کی گئی تھی۔ مجتبیٰ حسین کی دو کتابیں قطع کلام اور بہرحال میں پڑھ چکا تھا۔ ان دنوں میں بی اے کا طالب علم تھا اور امروہہ کی ادبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتا تھا۔ چونکہ ان کی کتابیں پڑھی تھیں اور حسب استطاعت محظوظ بھی ہوا تھا۔ سوچا کہ آج ان کا دیدار بھی کر لیا جائے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ دیدار بعد میں ایک ایسے تعلق کا پیش خیمہ ثابت ہوگا جو نہ صرف سدا کے لیے استوار ہوگا بلکہ ایک ایسا جذباتی رشتہ بھی بن جائے گا جو میرے لیے بھی اور مجتبیٰ حسین صاحب کے لیے بھی ایک کمزوری کی صورت اختیار کر لے گا۔ پہلی بار مجتبیٰ حسین کو وہاں دیکھا اور سنا اور ان کی باتیں بہت دنوں تک امروہہ کی ادبی محفلوں میں گونجتی رہیں۔ میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ امروہہ میں مجتبیٰ حسین صاحب کے اعزاز میں اس جلسے کے انعقاد کے محرک محسن امیر تھے جو میرے کرم فرما اور محسن ہیں اور برسوں سے دہلی میں مقیم ہیں۔ مجھے نہیں پتہ کہ محسن امیر کی مجتبیٰ حسین سے ملاقات کب سے تھی۔ بی۔ اے کرنے کے بعد جب میں تلاش معاش کے سلسلے میں دہلی آیا اور محسن امیر سے اس کا ذکر کیا تو نہ جانے محسن امیر کے جی میں کیا آئی کہ وہ مجھے کشاں کشاں مجتبیٰ حسین کے یہاں لے چلے جو ان دنوں این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی میں نہ صرف اسسٹنٹ ایڈیٹر کے طور پر کام کر رہے تھے بلکہ اردو شعبہ کے سربراہ بھی تھے۔ مجتبیٰ حسین بڑی محبت سے ملے اور کہنے لگے کہ میاں! بی۔ اے تو اکثر لوگ کر لیتے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ تم اوپننگ کالج سے ایم اے کی تعلیم بھی حاصل کر لو۔ میں نے کہا "مگر میں دہلی جیسے شہر میں رہنے اور ایم۔ اے کی تعلیم کے اخراجات کیسے برداشت کر سکوں گا جب کہ میں نہیں چاہتا کہ میری اگلی تعلیم کا بوجھ میرے سرپرستوں پر پڑے۔ اس پر کہنے لگے کہ تم کل ہی سے میرے دفتر میں روزانہ اُجرت پر دن میں کام کرو اور شام میں اپنی پڑھائی جاری رکھو۔ محنت تو تمہیں بہت کرنی پڑے گی مگر تمہاری عمر ایسی ہے کہ تم کو محنت کرنی چاہیئے اور دوسرے ہی دن سے میں این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی میں روزانہ اُجرت پر کام کرنے لگا اور شام میں ایم۔ اے کی تعلیم بھی جاری رکھی۔ اب جو مجتبیٰ صاحب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو احساس ہوا کہ یہ حضرت عام مزاح نگاروں سے بالکل مختلف ہیں۔ ان کے دفتر میں اور بھی لوگ کام کرتے تھے لیکن سب کے لیے ان کا رویہ ایک عام آدمی کا سا ہوتا تھا۔ اردو ادب سے تعلق رکھنے والے عہدیدار اپنی عہدیداری سے نام ونمود اور شہرت کو حاصل کرنے کے متمنی رہتے ہیں مگر مجتبیٰ حسین اس معاملہ میں اس قدر بے نیاز

نظر آئے کہ کبھی کسی کو یہ بتاتے ہوئے نہیں سُنا کہ وہ این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی میں کام کرتے ہیں۔ شروع ہی سے مجھے ان کی شفقتیں حاصل رہی ہیں۔ وہ بنیادی طور پر ایک کھُلے اور صاف دل دماغ کے آدمی ہیں اس لیے اپنی کوئی بات کسی سے پوشیدہ نہیں رکھ سکتے۔ اپنے ماتحتین سے وہ بعض دفعہ ایسے موضوعات پر بھی گفتگو کر جاتے جو کوئی افسر اپنے ماتحت سے کرنا ہرگز پسند نہیں کرے گا۔ یہی وہ دن تھے جب میں مجتبیٰ حسین کو سمجھنے، پرکھنے اور جانچنے کی منزل سے گزر رہا تھا۔ کبھی کبھی ان کی بے تکلفی پر حیرت بھی ہوتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو سال بیت گئے اور میں نے اپنی ایم۔ اے کی تعلیم بھی مکمل کرلی۔ ایک دن جب میں نے ان سے اپنی ملازمت کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگے۔ بیروزگاری کے مسئلے کو حل کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے رہو۔ ملازمت بھلے ہی ملے یا نہ ملے آدمی کو علم کی دولت تو ملتی رہتی ہے۔ میرے حالات ایسے نہیں تھے مگر ان کی شخصیت کا سحر مجھ پر کچھ اس طرح غالب تھا کہ میں ملازمت کے خیال کو ترک کر کے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں ایم۔ فل میں داخل ہوگیا۔ اب جو مجتبیٰ حسین سے اور ان کی سماجی سرگرمیوں سے بھی منسلک ہونے کا موقع ملا تو احساس ہوا کہ اِس جذباتی رشتے میں سود کی گنجائش کم اور زیادتی کی فراوانی زیادہ ہے۔ ان سے قربت کی بناء پر ان کے دوستوں سے بھی میری قربت اور عقیدت بڑھنے لگی اور پھر یوں ہوا کہ مجتبیٰ حسین، ان کا اسکوٹر اور میں سرِ شام ہی دہلی کی سڑکوں پر دوڑتے ہوئے نظر آتے کہ آج شاذ تمکنت آرہے ہیں تو کل وحید اختر کی نگہبانی کرنی ہے۔ پرسوں قاضی سلیم کی کسی محفل کا بندوبست کرنا ہے۔ آج گوپی چند نارنگ کا کوئی کام ہے تو کل شمس الرحمان فاروقی کے یہاں جانا ہے۔ آج مغنی تبسم کو ائیرپورٹ پر ریسیو کرنا ہے تو کل شہریار کو کسی گاڑی پر سوار کرانا ہے گویا میرے سماجی رشتوں پر ان کے سماجی رشتوں کا سایہ پڑنے لگا۔ گھر ہو یا دفتر، ادب ہو یا سیاست میں مجتبیٰ حسین کی زندگی جینے لگا۔ ان کی پسند میری پسند، ان کی خواہش میری خواہش، ان کے رویے میرے رویے بنتے چلے گئے۔ مجتبیٰ حسین نے ٹوکا بھی کہ میں گھاٹے کی زندگی جیتا ہوں اور اپنے مزاج کی وجہ سے جیتا ہوں تم اپنا مزاج ایسا تو نہ بناؤ کہ بعد میں تم بھی اور تمہارے لواحقین بھی مجھے کوستے رہ جائیں۔ میں بہت کم کسی ادیب یا شاعر سے اور اس کی شخصی زندگی سے متاثر ہوا ہوں مگر مجتبیٰ حسین کے جینے کے ڈھنگ کو میں نے بالکل مختلف پایا۔ جینے کا شاید یہی انوکھا پن مجھے بھا گیا۔

بہت کم ادیب ایسے ہوں گے جن کی عملی زندگی اور ادب میں اتنی گہری مطابقت ہوگی۔ نہ جانے مجتبیٰ حسین کتنی صبحوں کی شام کر چکے ہیں مگر انھیں آج تک یہ پتہ نہیں چل سکا کہ صبح کیسی ہوگی اور شام کیسی۔ لمحے کو صدیوں کا عرصہ عطا کرنے کا حوصلہ میں نے مجتبیٰ حسین میں ہی دیکھا ہے۔ ان کے یہاں وہ لمحہ ہی، جس میں وہ زندہ ہیں، سب سے اہم ہے۔ اگلے لمحے کا انتظار انھوں نے کبھی نہیں کیا۔ جتنی غیر منصوبہ بند زندگی وہ جیتے ہیں، اُسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور خدا پر ایمان لانا پڑتا ہے کہ ایک آدمی اس طرح بھی جی سکتا ہے۔ میں چونکہ ان سے بہت قریب رہ چکا ہوں اور شمالی ہند میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو ان کی اچھائیوں اور برائیوں، کمیوں اور زیادتیوں، نشیب و فراز سے واقف ہو۔ لمحے میں جینے کی بات میں نے اس لیے بھی کی ہے کہ میں نے مجتبیٰ حسین کو اپنی ہر صبح صفر سے شروع کرتے دیکھا ہے۔ وہ ہر دن کو پوری ایک عمر سمجھنے کے عادی رہے ہیں۔ اسی لیے ہر دن اس طرح گزارتے ہیں جیسے ایک آدمی اپنی پوری عمر بسر کرے اور وہ بھی ایک ایسی عمر جو اپنے لیے نہ ہو، دوسروں کے لیے ہو۔ دوستوں کے لیے ہو۔ دوستوں اور ملنے والوں کی ضروریات، خواہشات اور تقاضوں کا انھیں اتنا احساس ہوتا ہے کہ

ان کی اپنی ضروریات، خواہشات اور تقاضے ہر دن پیچھے رہ جاتے ہیں۔ میں عمر میں ان سے بہت چھوٹا اور ان کا عقیدت مند ہونے کے باوجود یہ محسوس کرتا رہا ہوں کہ وہ اپنی زندگی کی موم بتی دونوں سِروں سے جلاتے چلے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی دبی زبان میں کہنے کی کوشش بھی کی مگر میری بدقسمتی یہ کہ میں ان سے اس وقت ملا تھا جب ان کے مزاج، ان کی عادتوں اور ان کے رویّوں کی تشکیل ہو چکی تھی۔ میری بات کو وہ محسوس تو کر لیتے ہیں مگر ان پر عمل کرنے سے یکسر عاری رہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب زندگی کے اتنے برس پوری سرخ روئی کے ساتھ گزار لیے تو باقی چند برس بھی اسی طرح بیت جائیں گے۔ یہ ایک ایسا اعتماد ان کی ذات میں موجود ہے جو ان کی ہر صبح کو شام تک بخیر و خوبی لے آتا ہے اور پھر ان کی زندگی میں دوسرا سورج بھی طلوع کروا دیتا ہے۔ اپنی ہر صبح صفر سے شروع کر کے شام تک جذباتی طور پر اتنا تونگر ہونا بہت کم کسی کے حصے میں آیا ہوگا۔ یہ تونگری پیسے کی تونگری نہیں، جذبے اور جذبے کے لیے جینے کی سرشاری کی تونگری ہے۔ ادب میں جینے کے باوجود مجتبیٰ حسین نے کبھی ادب کو اپنی شناخت کا ذریعہ بنانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ صرف اپنے سچے جذبے کو ہی اپنی شناخت کی بنیاد بناتے ہیں۔ میں جب ان سے قریب ہوا تو ان کی زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح میرے سامنے آئی۔ ان کے مضامین سے لے کر ان کی ساری شخصی خط و کتابت تک میری دسترس میں رہ چکے ہیں۔ ان کی زندگی میں کوئی راز ایسا نہیں جسے پوشیدہ کہا جا سکے۔ وہ انسان اور انسانیت کی عظمت میں یقین رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہر طرح کے انسان سے وہ اپنے رشتے کو استوار کر لیتے ہیں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ وہ مختلف النوع انسانوں سے کس طرح اپنا رابطہ قائم کر لیتے ہیں۔ سیاستدانوں، دانشوروں، ادیبوں، شاعروں، موسیقاروں، مزدوروں غرض ہر پیشے سے وابستہ افراد سے ملتے ہیں اور ہر فرد انھیں اپنا ہی سمجھتا ہے۔ جس طرح یہ لوگوں کے کام آتے، اُسے دیکھ کر مجھے تعجب ہوتا ہے۔
ایک دن ایک خاتون این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی میں کسی صاحب کا پتہ پوچھتی ہوئی آئی۔ وہ صاحب اس دن چھٹی پر تھے۔ انھوں نے مجتبیٰ حسین صاحب سے اُن صاحب کے بارے میں پوچھا۔ مجتبیٰ صاحب نے بتایا کہ وہ تو چھٹی پر ہیں مگر ساتھ میں یہ بھی کہا کہ اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیے۔ وہ خاتون اپنے شوہر کے ساتھ انگلستان سے واپس ہوئی تھیں اور اپنی بیکاری کو ختم کرنے کے لیے کسی اسکول میں انگریزی پڑھانا چاہتی تھیں۔ اگرچہ مجتبیٰ صاحب بہت مصروف تھے مگر پھر بھی کہا کہ آپ کچھ دیر رک جائیں۔ میں آپ کے لیے کسی سے بات کروں گا۔ تھوڑی دیر بعد انھیں انگریزی کی ایک پروفیسر سے اس طرح ملوایا اور ایک اسکول میں اس طرح سفارش کی کہ دیکھتے ہی دیکھتے ان کا تقرر ہو گیا۔ جب یہ سب کچھ ہو چکا تو مجتبیٰ صاحب نے ان کا نام پوچھا اور یہ بھی پوچھا کہ آپ کے شوہر کیا کام کرتے ہیں۔ جب تک کام نہیں ہو گیا، تب تک مجتبیٰ حسین نے نہ تو ان کا نام جاننے کی کوشش کی اور نہ یہ جاننے کی کوشش کی کہ ان کے شوہر کیا کام کرتے ہیں۔ بعد میں محترمہ نے بتایا کہ ان کے شوہر وزارتِ داخلہ میں جوائنٹ سکریٹری ہیں۔ میں نے دیکھا کہ ان خاتون نے اور ان کے شوہر نے کئی بار انھیں اپنے گھر بلانے کی کوشش کی مگر وہ کبھی ان کے گھر نہیں گئے کیونکہ مجتبیٰ حسین لمحے کی زندگی جیتے ہیں اس لیے وہ جانتے ہیں کہ اس لمحے ان خاتون کا ان سے ملنا اور مجتبیٰ صاحب کا انگریزی کی پروفیسر سے ملوانا اور پھر ایک اسکول میں ان کا تقرر ہو جانا یہ سب پہلے سے طے تھا۔ مجتبیٰ حسین کہتے ہیں کہ اس طے شدہ فیصلہ کی تہمت نہ جانے کتنوں مجھ پر عائد کی جاتی ہے: پتہ نہیں کیوں میں ایسے کاموں کے لیے ایک وسیلہ بنتا ہوں۔ میرا کام صرف وسیلہ بننا ہے اس وسیلہ کی قیمت وصول نہیں کرنی ہے۔ نہ جانے ایسے کتنے کام یہ کرتے ہیں۔

شاید ہی کوئی دن ایسا جاتا ہو جب کوئی ضرورت مند ان کے پاس نہ پہنچتا ہو۔ بھائیوں کے اختلافات سے ازدواجی اختلافات تک کے حل (میں ادبی اختلافات کی بات نہیں کروں گا) سب کے سب ان کے رہینِ منّت ہیں۔

مجتبیٰ حسین کی سماجی و ادبی حیثیت چاہے جو بھی ہو میں نے انھیں بڑی سے بڑی شخصیت سے لے کر تمام لوگوں کے مسائل تک کو حل کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ادیب بننے کے بعد انسان بننا کچھ آسان سا ہو جاتا ہے کیونکہ ادیب جب لفظ کا استعمال کرتا ہے تو اسے اس کے معنی معلوم ہوتے ہیں اور وہ ان معنوں کو حتی الامکان روبہ عمل لانا چاہتا ہے۔ بہت سے لفظ وہ مروتاً کہنے کو تو کہہ جاتے ہیں مگر بعد میں وہ ان لفظوں کی قیمت ادا کرنا بھی جانتے ہیں۔ میں نے انھیں اپنے ایک ایک لفظ کی قیمت چکاتے اور اپنے آپ کو ہلکان کرتے دیکھا ہے ڈکشنری میں لفظ کے صحیح معنی بھلے ہی ملیں نہ ملیں مگر مجتبیٰ صاحب کی ذات ایک ایسی ڈکشنری ہے جس میں لفظ اپنے معنی کی بندشوں سے آزاد نہیں ہو سکتے۔ دوسروں کے لیے لفظ کی قیمت ادا کرتے ہوئے وہ اپنے افرادِ خاندان کا بھی کبھی لحاظ نہیں رکھتے۔ مجتبیٰ حسین کہتے ہیں کہ ۱۹۴۸ء میں انھوں نے اپنے ماموں کو اپنی آنکھوں کے سامنے فسادات میں قتل ہوتے ہوئے دیکھا ہے اور اس کے بعد ایک نیزہ ان کی گردن پر بھی رکھا گیا تھا۔ پتہ نہیں وہ کون تھا جس نے نیزہ رکھنے والے کا ہاتھ پیچھے سے کھینچ لیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ اس معصوم بچے کو مارنے کا کیا فائدہ؟ مجتبیٰ حسین تب ہی سے منافع کی تو زندگی جی رہے ہیں۔ وہ اکثر کہتے ہیں کہ میری اپنی شخصی زندگی تو ۱۹۴۸ء میں ہی ختم ہو چکی تھی۔ مجھ میں اور موت میں بال برابر کا فاصلہ تھا۔ اب جو زندہ ہوں تو اسی بال برابر فاصلہ کی وجہ سے زندہ ہوں۔ یہ کیوں سوچوں کہ میں مرا نہیں۔ میں مر بھی چکا ہوں اور مر کر زندہ بھی ہو چکا ہوں۔ شاید موت سے قربت کا یہی وہ واقعہ ہے جس نے انھیں زندگی کو ارفع ترین اور اتنا ہی حقیر ترین دیکھنے کا حوصلہ عطا کیا ہے۔ یہ سانحہ ان کی زندگی میں نہ ہوتا تو شاید وہ مختلف آدمی ہوتے۔ آسائشوں کے پیچھے بھاگتے اور مصلحتوں کا شکار ہوتے مگر ۱۹۴۸ء کے بعد سے انھوں نے ہر دن کو ایک تونگر آدمی کی طرح جینے کی کوشش کی ہے۔ چاہے وہ مالی اعتبار سے کتنے ہی کنگال کیوں نہ رہے ہوں۔ بلکہ وہ کوشش اس بات کی کرتے ہیں کہ مالی اعتبار سے ہمیشہ کنگال رہیں۔ مجتبیٰ حسین ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے ہمیشہ اپنے سے بڑی شخصیت پر احسان کرنے کی اور اپنے سے چھوٹے آدمی کے احسان مند رہنے کی کوشش کی۔ یہ ایک عجیب و غریب وصف ہے جو کم از کم آج کے دور میں ناپید ہے۔ بڑی بڑی شخصیتوں سے ان کا واسطہ اور گہرا تعلق رہا ہے مگر کبھی انھوں نے اپنی ذات کے لیے ان شخصیتوں سے استفادے کی کوشش نہیں کی۔ یہ ضرور ہے کہ کسی ضرورت مند یا محتاج کا کام نکل آیا تو ان بڑی شخصیتوں کو زحمت دی ہے مگر کبھی کسی سے کسی بات کے لیے طلبگار نہیں ہوئے۔ میں ان کے ایسے کئی احباب سے واقف ہوں جو مالی اعتبار سے لکھ پتیوں میں شمار کیے جاتے ہیں اور ان سے مجتبیٰ صاحب کے تعلقات نہایت بے تکلفانہ ہیں۔ مجتبیٰ صاحب کے ایک اشارے پر وہ اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کو بھی تیار رہتے ہیں لیکن میں نے دیکھا ہے کہ مجتبیٰ صاحب جب جب مالی طور پر تنگ دست ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے لکھ پتی دوستوں سے کھینچے کھینچے سے ملتے ہیں اور حتی الامکان اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی مالی پریشانیوں کی بھنک بھی کسی کو نہ لگے۔ اکثر ایسا ہوا کہ اچانک ضرورت پر انھوں نے مجھے فون کیا یا پھر کسی ایسے دوست کو زحمت دی جو مالی اعتبار سے بہت خوشحال نہ ہو۔ ان کا خیال ہے کہ قرض ہمیشہ مالی اعتبار سے اپنے سے کم حیثیت کے آدمی سے لینے میں ہی آدمی کی انا محفوظ رہ سکتی ہے۔ دینے والا

کبھی خوش اور لینا والا بھی مطمئن۔ مجتبیٰ صاحب اپنے دوستوں کو قرض دے کر پہلے ہی بھول جاتے ہوں گے مگر جب وہ خود دوستوں سے قرض لیتے ہیں تو اس کو نہیں بھولتے جیسے ہی ان کے حالات ٹھیک ہوتے ہیں، اسے لوٹا دیتے ہیں۔ مجتبیٰ صاحب نے اپنے کئی دوستوں کے بے شمار فائدے کروائے لیکن خود ہمیشہ اپنے حالات اور حالت دونوں پر قانع رہے۔ ان کے مزاج میں جو استغنا اور اپنی ذات کے تعلق سے جو بے نیازی اور قلندرانہ شان ہے وہ کم از کم آج کے دور میں مفقود ہے۔ لکھنے بیٹھوں تو ایسی کئی مثالیں پیش کر سکتا ہوں لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ ان کے ذکر سے وہ خوش نہیں ہوں گے۔

میں نے مجتبیٰ صاحب کو ہر رنگ میں دیکھا ہے۔ جہاں تک ان کے لکھنے کا تعلق ہے، وہ جب لکھنے پر اُتر آتے ہیں تو لکھتے ہی چلے جاتے ہیں اور جب نہیں لکھتے تو ہفتوں اور مہینوں تک نہیں لکھتے۔ ان کے احباب کو بعض دفعہ حیرت ہوتی ہے کہ سماجی طور پر اتنا مصروف رہنے کے باوجود وہ لکھنے کے لیے کیسے وقت نکال لیتے ہیں۔ وہ عموماً یا تو علی الصبح لکھنے کے عادی ہیں یا پھر سرِ شام ہی محفلوں کو خیرباد کہہ کر لکھنے کے لیے بیٹھ جاتے ہیں۔ لکھنے کے لیے وہ کسی خاص ماحول کے بھی طلبگار نہیں ہوتے۔ موڈ کے بھی وہ تابع دار نہیں ہیں۔ ایک بار تو یوں بھی ہوا کہ دہلی سے حیدرآباد کے سفر میں، میں ان کے ساتھ تھا۔ چھتیس گھنٹوں کا سفر تھا اور انھیں ایک خاصا طویل مضمون لکھنا تھا۔ پہلی رات تو وہ سو گئے مگر دوسری صبح انھوں نے مجھے جو لکھوانا شروع کیا تو حیدرآباد کے آتے آتے سو، سوا سو صفحے کا یہ مضمون ختم بھی کر دیا۔ مجتبیٰ حسین میں لکھنے کا ایک عجیب و غریب اسٹیمنا STAMINA ہے۔ یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ اکثر تحریریں وہ آخری وقت میں لکھنے کے عادی ہیں چونکہ طبعاً کسی کو "نہ" نہیں کر سکتے اسی لیے مروّت کے کسی لمحے میں یہ وعدہ کر لیتے ہیں کہ وہ کسی شخص کا خاکہ لکھ دیں گے لیکن ٹالتے ٹالتے یہ نوبت آ جاتی ہے کہ اس شخص کا خاکہ جس محفل میں پڑھا جاتا ہو، اس کے انعقاد میں صرف چند گھنٹے باقی بچتے ہیں تو قلم اور کاغذ لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور ایک نشست میں اس شخصیت کو صفحۂ قرطاس پر اس طرح بکھیرتے ہیں کہ حیرت ہونے لگتی ہے۔ مجتبیٰ حسین نے ایک بار یہ بتایا تھا کہ جن دنوں 'سیاست' اخبار کا روزانہ مزاحیہ کالم لکھا کرتے تھے تو ان کی چھ سالہ مجھلی بیٹی زکیہ کا انتقال ہوا جس کی تدفین سے وہ علی الصبح فارغ ہو کر آئے اور اپنا مزاحیہ کالم لکھنے بیٹھ گئے۔ اور یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ قارئین نے اس کالم کو بہت پسند کیا۔ جو شخص یا جو ادیب ایسے حالات میں لکھنے کے لیے بیٹھتا ہے تو اس کے ظرف کا آپ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کے بارے میں ان کے بعض احباب کو یہ شکایت بھی رہی ہے کہ وہ ہر کس و ناکس کا خاکہ لکھ دیتے ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ اس شخص کو جس کا خاکہ لکھا جا رہا ہو، اسی طرح پیش کرتے ہیں جس طرح کہ اسے پیش کیا جانا چاہیے اور جیسے لوگ قبول بھی کر سکیں۔ وہ بنیادی طور پر DOWN TO EARTH قسم کے آدمی ہیں۔ اپنا مضمون یا خاکہ لکھ دینے کے بعد وہ کسی بڑے ناقد یا پروفیسر (جن سے ان کے بہت اچھے مراسم ہیں) کی رائے جاننا یا انھیں سُنانا پسند نہیں کرتے بلکہ مجھ جیسے کم علم یا اپنے مداح کو سُنانا پسند کرتے ہیں اور اگر میں کوئی تبدیلی تجویز کر دوں تو اس پر ناک بھوں نہیں چڑھاتے بلکہ اس پورے پیراگراف کو دوبارہ لکھ دیتے ہیں۔ یہ ان کی ایک ایسی شفقت ہے جو مجھے ہمیشہ حاصل رہی اور جس پر میں بھی کبھی کبھی نازاں ہو جاتا ہوں۔

میری خاطر انھوں نے امروہہ کے کئی پھیرے کیے اور شاید میری ہی وجہ سے امروہہ ان کی کمزوری

کیفیت ہے۔ امروہہ والوں نے بھی انھیں بڑی محبتیں دیں۔ حیدرآباد کے بعد اگر وہ کسی مقام پر جا کر خوش ہوتے ہیں، تو وہ امروہہ ہے۔ ایک بار تو یوں بھی ہوا کہ میں نے انھیں ایک ادبی نشست میں شرکت کے لیے اکسایا۔ وہ راضی بھی ہوئے اور چلے بھی گئے مگر منتظمین کے ساتھ کچھ ایسا سانحہ پیش آیا کہ وہ جلسے کا انعقاد نہ کر پائے۔ امروہہ جانے کے بعد جب پتہ چلا کہ جلسہ نہیں ہو رہا ہے تو مجتبیٰ حسین کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ سچ بات تو یہ کہ وہ جلسوں سے اور رسمی تقاریب سے اپنے آپ کو ہمیشہ دُور رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جلسے ہمیشہ ایک عذاب کی صورت میں نازل ہوتے ہیں جن میں آدمی کو خواہ مخواہ سنجیدہ اور رسمی ہونا پڑتا ہے۔ جب انھیں پتہ چلا کہ امروہہ میں ان کی کوئی رسمی مصروفیت نہیں ہے تو اتنے خوش ہوئے کہ خوش ہوتے ہی چلے گئے۔ امروہہ کے کئی دوستوں سے ملاقاتیں کیں۔ امروہہ کی گلیوں اور بازاروں کو دیکھا۔ انھیں جاننے کی کوشش کی۔ کہنے لگے۔ ہر بار کوئی جلسہ یا تقریب منعقد کر کے تم نے مجھے ہمیشہ امروہہ سے دُور رکھا۔ یہی تو موقع ملا ہے جب میں امروہہ کو اور اس میں رہنے والوں کو سمجھنے کا اہل ہو سکا ہوں مگر شومیِ قسمت یہ کہ پورا ایک دن جب وہ بے فکری کے ساتھ امروہہ اور اہلِ امروہہ کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ امروہہ کی ایک مذہبی انجمن کو ان کی آمد کا پتہ مل گیا اور دوسرے دن وہ اسکولی بچوں کی قرأت کے مقابلہ کی تقریب میں صدارت کرتے ہوئے پائے گئے۔ میں نے سامعین میں بیٹھے بیٹھے مجتبیٰ حسین کو سر پر ٹوپی اوڑھے نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ، باوضو حالت میں، لگاتار پانچ گھنٹوں تک نہایت سنجیدگی کے ساتھ قرأت کو سنتے دیکھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ یہ مجھ پر ناراض ہوں گے۔ واپسی کے سفر میں کہنے لگے، "یہ اچھا ہوا کہ اس بار امروہہ میں کلامِ شوق امروہوی کو نہیں سُنا، کلامِ مجید کو سنا۔" امروہہ کے اس سفر سے وہ اتنے خوش تھے کہ اب بھی اکثر مرتبہ کہتے ہیں کہ "یار سُنّی! امروہہ میں کوئی ایسا جلسہ کراؤ جو منعقد نہ ہو مگر پھر بھی ایسا لگے کہ میرے اندر بہت کچھ منعقد ہو چکا۔"

میں اپنے آپ کو خوش نصیب تصوّر کرتا ہوں کہ مجھے مجتبیٰ حسین کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور ان کی شخصیت کا یہ عجیب و غریب سحر ہے کہ جب جب میں انھیں بہت قریب محسوس کرتا ہوں تب تب وہ مجھے خود سے بہت دور نظر آتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ مجھے ایک شخص نہیں، ایک ایسی روح کے روپ میں نظر آتے ہیں جسے ایک اجنبی ملک میں مصلحتوں اور مفادات کی ماری ہوئی اس دنیا میں ایک قالب عطا کر کے زبردستی بھیج دیا گیا ہو۔ ان کی شفقتیں، ان کی محبتیں، ان کی رفاقتیں میرے لیے ایک شخصی اثاثہ تو ہیں ہی شاید وہ اس دور میں جینے والے بہت سے لوگوں کے لیے بھی جینے کا ایک جواز ہوں۔ پروفیسر نارنگ نے ایک بار کہا تھا کہ "مجتبیٰ حسین اکثر یہ غلط فہمی پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ ہر آدمی کے خاص دوست ہیں۔" نارنگ صاحب نے یہ بات صد فیصد صحیح کہی ہے کیونکہ ان سے جو بھی ملتا ہے۔ چاہے وہ پہلی بار ہی کیوں نہ ملا ہو، ان کا خاص دوست ہو جاتا ہے۔ میں ان کی شفقت کو کسی غلط فہمی پر محمول نہیں کرنا چاہتا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ میری خوش فہمی ہی ہو کہ وہ مجھے بہت عزیز رکھتے ہیں اور میں اس خوش فہمی کو اپنے تئیں بہت عزیز رکھتا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس خوش فہمی نے مجھے کتنا حوصلہ اور جینے کا ایک نیا ڈھنگ عطا کیا ہے! ■

شبیع احمد

ایک تعارف
ایک ملاقات
ناصرہ رئیس (بیگم مجتبیٰ حسین)

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ہر کامیاب شخصیت کے پیچھے کسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے، کم از کم ناصرہ بھابی کو پہلی بار دیکھ کر یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ کہاوت مجتبیٰ حسین پر بھی صادق آتی ہے، لیکن اس کی صداقت کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب ایک شام میں نے ناصرہ بھابی سے مفصل گفتگو کی، اور مجھے لگا کہ مجتبیٰ حسین کے لیے ظرافت و مزاح نگاری کے اس درخشاں آسمان کو پا لینے اور زندگی کی پرخار وادیوں سے صحیح سلامت گزر آنے کے لیے جس بلند ہمتی، دلنواز سخن اور شیرینیِ جاں کی رفاقت کی ضرورت تھی وہ ناصرہ بھابی میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

مجتبیٰ حسین صاحب نے اگر "سیاست" اخبار کی سخت محنت طلب ملازمت سے لیکر این، سی، ای، آر، ٹی کی موجودہ افسری تک کا سفر اپنی روایتی قلندرانہ شان کے ساتھ طے کیا ہے تو اس میں جہاں مجتبیٰ صاحب کی بے مثل ذہانت، تیکھی نگاہ، گہرا مطالعہ اور محنتی جسم و دماغ کو دخل ہے تو وہیں اس بات کو بھی کہ ان کو اس سفر کے ہر موڑ پر ناصرہ بھابی سے ایک غیر مشروط تعاون ملتا رہا ہے۔ وہ چاہے گھر پہ دیر سے لوٹنے کا مسئلہ ہو یا اپنے احباب کے ساتھ رات کو گھر پر ہی محفل جمانے کا اچانک فیصلہ ہو، اور یہ فیصلے اکثر ہی ہوتے رہتے ہیں، ناصرہ بھابی نے ایک خوشگوار مسکراہٹ اور لطیف طنز کے ساتھ ان کو بخوبی نبھایا ہے۔ میرا خیال ہے کہ زندگی کی یہی خوشگوار رفاقت وہ عظیم سہارا ہے جس نے مجتبیٰ حسین کے اندر کے غم کو ان کی شخصیت اور زندگی پر حاوی نہیں ہونے دیا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ غم انھیں اندر ہی اندر گھلا دیتا اسے مجتبیٰ حسین کو خود پر اور دوسروں پر ہنسنے کا ایک بے مثل ادراک عطا کر دیا ہے۔

ناصرہ بھابی ایک سیدھی سادی شریف دیندار خاتون ہیں۔ وہ عثمان آباد کے ایک پڑھے لکھے متوسط خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے والد جو مجتبیٰ صاحب کے حقیقی چچا ہیں۔ خود تحصیلدار تھے، انھوں نے اپنے صاحبزادوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی، اور وہ سب آج اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں، لیکن وہ اپنی لڑکیوں کی تعلیم کے زیادہ حق میں نہ تھے۔ ناصرہ بھابی کے بقول ان کو پڑھائی کا خاصا شوق تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی والدہ کی شدید علالت کے باعث اپنی پڑھائی جاری نہ رکھ سکیں حالانکہ ان کے دو بڑے بھائی جو ان دنوں حیدرآباد اور امریکہ میں رہتے ہیں، ان کی تعلیم میں خاصی دلچسپی رکھتے تھے۔ جلد ہی ۱۹۵۶ء میں ان کی شادی ان کے حقیقی تایا زاد بھائی مجتبیٰ حسین سے کر دی گئی۔ جو ان دنوں عثمانیہ سے بی اے کرنے کے بعد حیدرآباد میں "تلاشِ روزگار" میں مصروف تھے۔ جس میں تلاش کو زیادہ دخل تھا، روزگار کو کم۔

وہاں سے ناصرہ بھابی کی محبت کا جو سفر شروع ہوا تھا وہ آج بھی اسی تگ و تاز کے ساتھ جاری ہے اور شاید ماہ و سال کی گردش نے ان کی محبت میں اور زیادہ نکھار ہی پیدا کیا ہے۔ میں نے ناصرہ بھابی سے ازراہ مذاق کہا "آپ کی خوشگوار زندگی کو دیکھ کر لگتا ہے کہ مجتبیٰ بھائی سے آپ کی "لو میرج" ہوئی ہوگی۔ کہنے لگیں "نہیں بالکل نہیں، ہمارے گھر میں ایسی باتوں کا رواج نہ تھا۔ لیکن شادی کے بعد ہمیں یہ محسوس نہیں ہوا کہ ہماری محبت کی شادی نہیں ہوئی"۔ میں نے فوراً ہی دوسرا سوال پوچھا تو پھر آپ کو اتنے "مشکل ترین شوہر" کے ساتھ زندگی گزارنا کیسا لگتا ہے؟ ہنس کر کہنے لگیں کہ "دقت تو ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی ایسا بھی لگتا ہے کہ زندگی کا جیسے کوئی مقصد ہو، اُن سے ملاقات سے پہلے ایسا کچھ نہیں لگتا تھا۔

میں سمجھتا ہوں، مجتبیٰ بھائی کی زندگی کی یہی معراج ہے، ایک ہنستا مسکراتا ہوا، دلفریب گھر کا آنگن، دو سمجھدار لڑکیاں، جن میں سے ایک اپنے گھر کی ہو چکی اور اس کی ایک خوبصورت امانت "کرانی" ناصرہ بھابی کی ممتا کے مضبوط حصار میں محفوظ ہے اور ان کے دو بیٹوں ہادی اور مصباح کے خوشگوار مستقبل کی امیدوں کا آسمان۔ یہی ان کے قلم کی سب سے بڑی طاقت ہیں۔

میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی ناصرہ بھابی سے ایک مشکل سوال کر ہی ڈالا۔ میں نے کہا کہ یہ سب جانتے ہوئے کہ مجتبیٰ صاحب کا حلقۂ احباب کتنا وسیع ہے۔ اور اس پر یہ کہ وہ ایک انتہائی احباب پرور اور دریا دل انسان ہیں اور یہ کہ زندگی کی حقیقتیں اپنی جگہ ہیں۔ اس میں دو اور دو چار ہی ہوا کرتے ہیں پانچ نہیں ہو سکتے۔ آپ ان سب چیزوں کو کیسے نباہتی ہیں۔ اور یہ کہ مجتبیٰ حسین بہ حیثیت ایک باپ اور شوہر کس طرح کے انسان ہیں؟ اس سے پہلے کہ ناصرہ بھابی کچھ جواب دیتیں ان کی چھوٹی بیٹی سنجیبہ بول اُٹھی، "ہمارے ابا ایک لاجواب انسان ہیں وہ ہماری تعلیم و تربیت کا بھرپور خیال رکھتے ہیں"۔ میں نے ناصرہ بھابی کو اور کریدتے ہوئے پوچھا "کیا مجتبیٰ بھائی اپنی گوناگوں مصروفیت اور احباب پروری کے تقاضوں کے ساتھ گھر کی طرف بھی پوری توجہ دے پاتے ہیں؟" انھوں نے کہا "ان کی اس دریا دلی اور پرانی بگڑی ہوئی عادتوں سے کبھی کبھی تو بے حد تکلیف ہوتی ہے لیکن ان کے پیچھے چھپی ہوئی جب اعلیٰ انسانی قدروں، انسان دوستی اور محبت کے اتھاہ سمندر کی کارفرمائی نظر آتی ہے تو اس تکلیف کا احساس نہیں رہتا۔ اور پھر یہ کہ ان کے احباب کا حلقہ اتنا وسیع ہے کہ ہم لوگ ذہنی طور پر ہمیشہ ایک بڑی برادری سے جڑا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ میں نے آخر میں ڈرتے ڈرتے دریافت کیا۔ آپ کو اتنے بڑے مزاح نگار ادیب کی بیوی ہونا کیسا لگتا ہے؟ بھابی نے برجستہ جواب دیا کہ ہمیں کبھی اس کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ بڑے ادیب یا بڑے آدمی ہیں، وہ چاہے "سیاست" اخبار کی اٹھارہ گھنٹے کی جان توڑ ملازمت ہو یا آج کا زمانہ، مجتبیٰ صاحب ہمیشہ ایک جیسے ہی رہے، بڑے اور چھوٹے کا احساس شاید نہ انھیں خود ہوا اور نہ انھوں نے کسی اور کو ہونے دیا، غالباً ان کو اس کا ادراک ہی نہیں ہے۔ اور نہ ہی انھوں نے اپنا ادیب، مزاح نگار ہونا ہم پر کبھی تھوپا ہے۔ زندگی میں جیوں جیوں ان کو خوشیاں ملتی ہیں، ہم بھی خوش ہو لیتے ہیں، جب تکلیف ہوتی ہے، ہم بھی اس میں شریک ہوتے ہیں، یہی ہماری خوشیوں کی معراج ہے۔" اُن کے ہی اندر کا غم ہے جس نے شاید ان کو ایک پرسوز جان بنا دیا ہے۔ وہ اس کا نمونہ اشتہار بانٹتے نہیں پھرتے ہیں"۔

□□

راشدہ صمدانی

میرے ابّا

سردی کی چھٹیاں بتانے کے لیے میں دہلی آئی ہوئی تھی۔ ان ہی دنوں دہلی میں ماہنامہ "شگوفہ" حیدرآباد کے مدیر ڈاکٹر مصطفیٰ کمال سے پہلی بار ملاقات کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر انھوں نے یہ ذکر چھیڑا کہ ماہنامہ "شگوفہ" کا مجتبیٰ حسین نمبر چھپنے جارہا ہے۔ آپ کیوں نہ اپنے ابا پر کچھ اپنے تاثرات کا اظہار کریں۔ ہاں! کچھ دنوں سے میں اڑتی اڑتی یہ خبر سن رہی تھی کہ مجتبیٰ حسین نمبر چھپنے والا ہے۔ چونکہ یہ خبر سال دو سال پرانی تھی اس لئے مجھے یقین نہیں آیا۔ مگر اس خبر کا یقین میرے ابا نے نہیں بلکہ مصطفیٰ انکل نے دلایا تو آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جس کا نمبر چھپنے جارہا ہے۔ ان کو خود اس بات کا یقین نہیں تھا تو بھلا ان کی بیٹی کو کیا ہوگا۔

بہر حال میں جیسے تیسے میں ابا کے تعلق سے لکھنے کے لئے راضی ہوگئی دوسرے معنی میں بہت بڑا خطرہ مول لے لیا کیوں کہ کہاں میرے ابا کا مقام اور کہاں میں۔ اگر ہمالیہ کی سب سے اونچی چوٹی ماونٹ ایوریسٹ ہے تو طنز و مزاح کی سب سے اونچی چوٹی میرے ابا ہیں۔ ان کے فن اور ان کی شخصیت کی شہرت چاند سورج کی روشنی کی طرح نہ صرف ہندستان بلکہ اس دنیا کے کئی دوسرے ممالک تک پھیلی ہوئی ہے۔ سورج کی روشنی سے گرمی حاصل ہوتی ہے تو ابا کے فن سے حقیقت کی مسلسل لہر حاصل ہوتی ہے اور ان کے فن کو پڑھنے کے بعد انسان مزا ہی نہیں لیتا بلکہ زندگی کے اصلی پہلو اور حقیقی دکھ سکھ کو سمجھتا بھی ہے۔ ان کے مزاج میں ایک تلخ اور کڑوی حقیقت چھپی رہتی ہے جسے صرف ایک سچا انسان ہی محسوس کرسکتا ہے۔

یہ تو رہیں فن کی باتیں اور باہر کی زندگی کی باتیں۔ گھریلو زندگی میں ابا کس طرح کے رول ادا کرتے ہیں مثلاً وہ چار بچوں کے باپ ہیں جو اللہ کے فضل و کرم اور ابا اور امی کی محبتوں کی بدولت اپنی اپنی زندگیوں کا راستہ اختیار کرچکے ہیں۔ میرے ابا ایک باپ کی حیثیت سے نہایت شفیق اور مخلص باپ ثابت ہوئے ہیں۔ یوں تو عام طور پر یہ نظریہ ہے کہ ادیب اور شاعر کی زندگی لاپرواہیوں کا شکار ہوتی ہے۔ اپنے بیوی اور بچوں سے کھنچے کھنچے رہتے ہیں لیکن ہمارے ساتھ تو کم از کم خدا نے ناانصافی نہیں کی ہے۔ ہم اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتے ہیں کہ ہم اپنے ابا کے بہت قریب ہیں۔ ہمیں ایک محبت

کرنے والا اور بچوں کے حقوق اور تکلیفوں کا احساس رکھنے والا مشفق باپ میسر ہے بلکہ میں یہاں یہ کہتی چلوں کہ اب تک تو صرف بیوی اور بچوں کا خیال اور احساس ہی نہیں رکھا جا رہا ہے بلکہ بچوں کے بچوں کا، بچوں کے دوست اور احباب کا کچھ زیادہ ہی خیال رکھا جاتا ہے۔ زندگی کے حقیقی ڈرامہ میں وہ ایک عظیم باپ کا رول ادا کر رہے ہیں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ جب سے انھوں نے ہوش سنبھالا ہے تب سے اپنا خدمت خلق کا کام انجام دے رہے ہیں جسے ان کی شخصیت کا سیکولر کردار کہا جا سکتا ہے۔ ان کے یہاں سب کے لئے یکسانیت EQUALITY نظر آتی ہے، کوئی فرق (DIFFERENCIATION) نہیں ملتا چاہے وہ ماں باپ، بیوی بچے، دوست احباب، ہندو مسلمان سکھ وغیرہ ہی کیوں نہ ہوں۔

دفتر کی افسری سے کر گھر کے گیہوں پسوانے کے کام تک انجام دیتے ہیں۔ ہم گھر والوں کو کسی تکلیف کا احساس ہونے نہیں دیتے۔ بہت ہی PLANNED اور SYSTEMATIC زندگی گزارتے ہیں سادہ لوح فطرت ان کی شخصیت کو اور نکھار دیتی ہے۔ لوگوں سے بے حد سادگی سے پیش آتے ہیں۔ ان کی سادگی اور انکساری سے سامنے والا شخص بے حد متاثر ہو جاتا ہے۔ ہر ایک کا دکھ بانٹنا ان کی زندگی کا خاص پہلو ہے۔ ؎

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

کسی کو آج نوکری لگوا دی تو کل کسی کو اسکول میں داخلہ دلانے چلے گئے وغیرہ وغیرہ۔ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ اتنی پر مزاح طبیعت رکھنے کے باوجود بھی وہ اپنی زندگی سنجیدگی سے گزارتے ہیں۔ ان کی زندگی دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک ادبی زندگی دوسری گھریلو زندگی۔ جیسے ہی وہ ادبی اجلاس یا محفل سے باہر نکل آتے ہیں ایسا لگتا ہے کہ وہ ادبی احساسات کو اسی محفل میں چھوڑ آئے ہیں اور گھر کی فکر کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ مثلاً بچوں کو اسکول چھوڑنا، اگر بیمار ہو تو دواخانہ پہنچانا، بیمار کی مزاج پرسی کرنا اور اگر بیمار کو اسپتال میں کچھ دقت پیش آ رہی ہو تو بھاگ دوڑ کر کے ایک جان پہچان کے ڈاکٹر کو ڈھونڈ نکالتے ہیں اور اس بیمار کی پریشانی کو دور کر دیتے ہیں۔ اس طرح گھر والوں سے لے کر باہر والوں تک کی مصیبتوں کے حل ڈھونڈتے رہتے ہیں اور بڑی آسانی سے دوسروں کی دعاؤں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ان کی ترقی کا یہ سب سے بڑا راز ہے۔

مجھے ایسا لگتا ہے کہ ظاہری طور پر وہ جتنے ظریف نظر آتے ہیں اس سے کہیں زیادہ باطنی طور پر غم زدہ ہیں۔ ہر ایک کے دکھ اور غم کو اپنے آپ سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ نہ جانے ایسے کتنے غموں کی تہہ ان کے دل پر جمی ہوتی ہے کہ اس کو خوشی کی لہر میں بدلنے کے لئے اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں اور اس وقت تک حالات کا مقابلہ کرتے رہتے ہیں جب تک غموں کے ان کانٹوں کی سیج پھولوں کی سیج میں نہ بدل جائے۔

ابا اپنے مضامین میں امی کو بہت نشانہ بناتے ہیں کیوں کہ دنیا میں پہلی کا جوڑا ہی اس نشانہ کی تلملاہٹ اور چبھن کو سہتا ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزارتے گزارتے وہ خود ایک دوسرے کے مزاج کا حصہ بن جاتا ہے۔ اسی طرح امی ابا کی زندگی کا ایک ایسا حصہ ہیں جس کو ابا کے حق نے دو حصوں میں

بانٹ دیا ہے۔ ایک حصہ وہ کہ مزاح کا رول ادا کرتا ہے تو دوسرا جس پر مزاح نگاری کو نایا اور تا ابھا سکے جسے فن کی کسوٹی پر کس کر چمکایا جاتا ہے۔ یہ ہے امی اور ابا کا خلوص اور محبت کا رشتہ۔ ابا امی کی بے حد قدر کرتے ہیں۔

آج کل دہلی میں وہ ایک عدد بیوی، ایک عدد بیٹی اور ایک عدد نواسے کے ساتھ رہتے ہیں وہ اپنے بچوں سے زیادہ اپنے نواسا نواسی سے پیار کرتے ہیں اور ہر طرح سے ان کا دل بہلانے کی پوری پوری کوشش کرتے ہیں۔ ہر طرح کا کھیل کھلاتے ہیں کبھی گھوڑا بن کر کبھی ہاتھی بن کر بچوں کو اپنے پیٹ پر سوار کر لیتے ہیں کیوں کہ ان کی صحت کے مطابق وہ صرف گھوڑا اور ہاتھی ہی بن سکتے ہیں تب ہی تو بچے یہ کہہ کر خوش ہوتے ہیں کہ "موٹے لالے پیلے دھپ کنویں میں گر پڑے" ان بچوں کے ساتھ کھیل کر وہ خود بھی اپنے آپ کو بچہ سمجھنے لگتے ہیں۔ بچے قدرتی طور پر معصومیت کی تصویر ہوتے ہیں جن کو دکسی ذات کا پتہ ہوتا ہے نہ بات کا۔ ویسی ہی فطرت میرے ابا نے پائی ہے۔

اب رہا سوال بڑوں کی قدر کرنے کا تو صاحبو! جب بھی وہ بڑوں کے سامنے ہوتے ہیں تو سنجیدہ تصویر کی طرح بنے بیٹھے رہتے ہیں۔ چہرے سے معصومیت ٹپکتی ہے اور ان لوگوں کے سامنے سگریٹ بھی نہیں پیتے۔ بزرگوں کی قدر کرنے کی یہ پہلی نشانی ہے۔ دوسری یہ کہ اس محفل میں وہ قہقہے بھی نہیں لگاتے بلکہ مونالیزا کی مسکراہٹ کا منظر پیش کرتے ہیں۔

آخر میں میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ زندگی میں میں نے کبھی اردو کی تحریر نہیں لکھی یہ میری پہلی اردو تحریر ہے یوں تو گھر کا ماحول اردو زبان کا ہی ماحول رہا ہے لیکن ہم نے اسکول میں کبھی اردو ایک مضمون کی حیثیت سے نہیں پڑھی بلکہ اپنے شوق کی خاطر اپنے آپ اردو لکھنی پڑھنی سیکھی ہے۔ ظاہر ہے میری اس تحریر میں کافی غلطیاں ہوں گی جس کے لئے میں بہت شرمندہ اور معذرت خواہ ہوں۔

تو حضرات! میں اپنے تاثرات کو یہیں ختم کر دینا چاہتی ہوں مگر ایسا نہ سمجھیں کہ بٹیا نے اپنے جذبات اور خیالات کو اپنے ابا کے تعلق سے اتنا مختصر کر دیا۔ نہیں نہیں بلکہ اپنے ان تاثرات کا سلسلہ اتنا لمبا اور مضبوط ہے کہ تا قیامت اور مضبوط ہوتا رہے گا۔ انشاء اللہ اور جسے توڑنے کے لئے خدا بھی راضی نہ ہوگا۔

تو یہ رشتہ ہے ہم بچوں کا اور ہمارے ابا کا۔ وہ اس دنیا کے مسیحا ہیں۔ وہ اندھیرے راستوں کا چراغ ہیں جس کی روشنی کو کوئی طوفان یا آندھی نہیں بجھا سکتی۔ خدا سے ہر لحظہ اور ہر لمحہ یہی دعا ہے کہ ان کو سلامت رکھے، صحت دے اور ان کے قلم کو اور طاقت ور بنائے جس سے رشتوں کی کڑی اور مضبوط ہوتی رہے۔ آمین ثم آمین۔

سرور مرزائی
(گلبرگہ)

مجتبیٰ حسین کیلئے دو نظمیں

سرور مرزائی جن کا ابھی حال ہی میں انتقال ہوا ہے، گلبرگہ کے صوفی منش، قلندر صفت اُستاد شاعر تھے۔ کم و بیش بیس برس پہلے گلبرگہ میں مجتبیٰ حسین کے اعزاز میں منعقدہ ایک استقبالیہ میں یہ نظمیں سنائی تھیں۔ یہ نظمیں جہاں سرور مرزائی کے استادانہ رنگ کی غماز ہیں وہیں مجتبیٰ حسین کے تئیں ان کے جذباتِ محبت کی بھی آئینہ دار ہیں۔ پرانے کاغذات میں یہ نظمیں دستیاب ہوئیں، جنھیں قارئینِ شگوفہ کی نذر کر رہا ہوں ——— سنجی حسن جاوید صدیقی۔

تکلّف برطرف

مجتبیٰ اے خالقِ حرف "تکلف برطرف"
تیرے ہر اک لفظ میں تاب و تبِ دُرِّ نجف
ہم تجھے اس شہر میں کہتے ہیں اب خوش آمدید
ہے تجھے حاصل جہاں کوچہ نوردی کا شرف!
قابلِ تحسین ترا اعجازِ فن، اندازِ فکر
دست بستہ در پہ حاضر ہیں مضامیں صف بہ صف
تیرا ہر عنوان قیسِ فکر ہے ساغر بدوش
لیلیٰ لطفِ بیاں مضمون میں مینا بکف
ہاں کبھی اوجھل نہیں، اوجھل نہیں، اوجھل نہیں
تیری نظروں سے نقوشِ پائے اربابِ سلف
وقت کے ناسور کی خاطر ہے مرہم کی تلاش
نافِ آہوئے رمیدہ تیرے پیکاں کا ہدف
طیباتِ جاں فزا تریاق کا نعم البدل
ہے عطائے آبِ حیواں تیرا دیرینہ شغف
شانۂ گیسوئے اردو خامۂ زرّیں نگار
وقت کے فرہاد اے خارہ شکن تیشہ بکف!
پیکرِ اخلاص آ، رشحات سے اپنے نواز
منتظر احباب ہیں کچھ اس طرف کچھ اس طرف

قطعِ کلام

شانۂ گیسوئے اُردو ہے تیری نیم نگاہ
ہاں مگر ہے مرے مسلک میں تملق بھی گناہ
خالقِ "قطعِ کلام" آج پئے استقبال
بہمنی شہر کا ہر فرد ہوا چشم براہ
تیری تحریر میں گیرائی بھی گہرائی بھی
کہ نکلتی ہے زباں سے مرے بے ساختہ واہ
شانۂ گیسوئے لیلائے ادب تیرا مزاج
"جلوۂ شاہدِ اُردو تری فردوسِ نگاہ"
فیضِ فطرت بھی ہے فیضان بھی ہے صحبت کا
کردے اخلاق کو آداب و اُدب سے آگاہ
برقِ بے مہریٔ ایام کے ہاتھوں اے دوست!
گلشنِ اُردو ہو کٹ نکڑیوں ہی تاراج و تباہ
برطرف سارے تکلف یہ دعا ہے میری
کہ ہمیشہ رہے روشن ترا قلبِ آگاہ
رہبر و محتسب و مصلح و مفتی ہیں بہت
بن کے مومن ہمیں کرنا ہے ابھی کارِ سپاہ
مقصدِ زیست سے عاری ہوں اگر قلب و دماغ
زندگی سے نہیں بڑھ کر کوئی سنگین گناہ

مجتبیٰ پیکر [illegible] مجتبیٰ سرور
ہو سکے [illegible] اخلاص [illegible] زیست نباہ

مرتب: حامد اکمل
ایڈیٹر ہفت روزہ "ایقان" گلبرگہ

سارے جہاں کا درد

مجتبیٰ حسین سے گفتگو

شرکاء: زبیر رضوی، مخمور سعیدی، کمار پاشی، حامد اکمل

۲۲ ستمبر ۱۹۸۷ء کی شب، دہلی میں جناب زبیر رضوی کے دولت کدہ پر جناب زبیر رضوی، جناب مخمور سعیدی اور جناب کمار پاشی نے ممتاز مزاح نگار جناب مجتبیٰ حسین سے ان کے فن اور ان کی شخصیت پر گفتگو کی۔ یہ انٹرویو جناب مجتبیٰ حسین کے اندر جھانکنے کی ایک کوشش ہے۔ بلکہ اس سے اُردو مزاح کی بعض دیگر شخصیات کے فن پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

حامد اکمل

حامد اکمل: حضرات آج ہم مجتبیٰ حسین صاحب سے انٹرویو کیلئے یہاں جمع ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ محض رسمی انٹرویو کی طرح سوال جواب تک محدود نہ رہے بلکہ اسے ایک بے تکلف گفتگو کی شکل دی جائے۔

کمار پاشی: مجتبیٰ صاحب! آپ کا جو حیدرآباد میں ملنا جلنا رہا ہے، وہ زیادہ تر رہا ہے سلیمان اریب سے، مخدوم سے، عزیز قیسی سے، شاذ تمکنت سے یعنی تمام شاعروں کے درمیان ہی آپ اُٹھتے بیٹھتے رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اُردو کا محاورہ ہے خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے، کیا ــــ؟ آپ نے بھی ان کا رنگ پکڑنے کی کوشش کی یا نہیں، شعر وغیرہ کہے یا نہیں کہے؟

مجتبیٰ حسین: جی نہیں۔ اصل میں رنگ پکڑنے والی بات تو یہ ہے کمار صاحب کہ ان لوگوں کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا تھا تو اس طرح کا تھا کہ حیدرآباد میں، یہ لوگ مجھ سے سینئر تھے بہت ــ جیسے مخدوم تھے، سلیمان اریب، عزیز قیسی وغیرہ بھی مجھ سے خاصے سینئر تھے۔ تو یہ ۱۹۵۳ء کی بات ہے۔ جب عثمانیہ یونیورسٹی میں، میں داخل ہوا تب تک تو اُردو ہی ذریعۂ تعلیم تھی تو سارا ماحول وہاں شعر و ادب کا تھا۔ مخدوم کا طوطی بولتا تھا سکندر علی وجد وغیرہ [illegible] سب کی شاعری پر [illegible]

جو رغبت ہوئی وہ شاعری کے وسیلے سے ہوئی۔ وہ بھی صرف سننے کی حد تک، کبھی شعر میں نے نہیں کہا۔ اور نہ میں آج تک اپنے آپ کو اس کا اہل پاتا ہوں کہ شاعری کر سکوں۔

کمار پاشی: کبھی جی نہیں چاہا آپ کا؟ شعر کہنے کو۔

مجتبیٰ حسین: جی نہیں۔ میرا ذہن ہی کچھ اس طرح کا رہا کہ طبیعت اس طرف راغب ہی نہیں ہوئی۔

محمود سعیدی: کمار پاشی صاحب! اسکی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے، مجتبیٰ حسین صاحب کا اُٹھنا بیٹھنا ان کے ساتھ تھا لیکن جیسا کہ انہوں نے کہا ہے کہ ظاہر ہے کہ حفظ مراتب کا فاصلہ ان کے درمیان رہتا ہوگا۔ دوسرے یہ کہ ان کا جو گھریلو ماحول تھا۔ وہ غالباً نثر کا ماحول تھا۔ اسلئے کہ ان کے دونوں بھائی ایک صحافت میں ایک ادب میں بہت نمایاں حیثیت انہوں نے حاصل کی اور طنز و مزاح کے میدان میں خصوصاً ابراہیم جلیس نے۔ تو ان کے ذہن پہ جو پہلا اثر پڑا ہوگا۔ وہ ان کے گھریلو ماحول کا ہوگا۔ اسلئے اگر ان کا ذہن شعر گوئی کی طرف مائل نہیں ہوا تو یہ ایسی کوئی انہونی بات نہیں۔ پھر یہ کہ ظاہر ہے کہ فطری میلان تو لے کر ہر آدمی پیدا ہوتا ہے، جسے فنکار بنتا ہے اسے شاعر بنتا ہے۔ جسے ادیب بننا ہے اُسے ادیب ہی بننا ہے۔ یہ سلسلہ ہے۔۔۔۔

مجتبیٰ حسین: ویسے میں یہ بتاؤں کہ اس زمانہ میں شعر و ادب کا ماحول تو تھا ہی، دلچسپی تو تھی۔ میرا رجحان بنیادی طور پر نثر کی طرف زیادہ تھا۔ اور میں نے ابتدا میں کچھ افسانے بھی لکھے تھے۔ اور مجھے یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ مجھے مزاح کی طرف جانا ہوگا۔ تو میں نے بہت سنجیدہ قسم کے، بلکہ موت کے موضوع پر میں نے کوئی دس افسانے لکھے تھے۔ جو شائد۔۔۔۔۔

محمود سعیدی: یہ بات آپ نے کہی تو ایک بات کی طرف میرا ذہن منتقل ہوا وہ یہ کہ آپ آجکل جو مزاحیہ مضامین لکھ رہے ہیں یا خاکے لکھ رہے ہیں۔ ان میں بھی ایک حزنیہ پہلو بار بار سامنے آتا ہے۔ خاص طور پر آپ نے جو مزاحیہ خاکے لکھے ہیں، ان کا جو اختتام ہوتا ہے وہ مزاحیہ ہوتے ہوئے ایک خاص قسم کی گویا اداسی پر ختم ہوتا ہے یا ذہن کو اس طرف منتقل کرتا ہے۔ یہ میں سمجھتا ہوں، شائد یوں کہیئے کہ یہ شاعری کی انسانی تجزیاتی صورت ہے۔ آخری میں ایک اُداسی کا ماحول سا بنتا ہے۔۔۔۔

مجتبیٰ حسین: آپ نے ٹھیک کہا۔ میں بنیادی طور پر اپنے آپ کو بہت ہی سنجیدہ آدمی سمجھتا ہوں اور ہوں بھی۔ اپنے طور پر، مجھے ایک حزنیہ سی کیفیت مجھ پر طاری رہتی ہے۔ ایسا نہیں کہ میں سب۔۔۔۔

کمار پاشی: لیکن عام محفلوں میں، میں نے آپ کو کبھی سنجیدہ نہیں دیکھا!

مجتبیٰ حسین: عام محفلوں میں بھی میں خاصا سنجیدہ رہتا ہوں۔ غم کو میں آدمی کا ایک ذاتی معاملہ سمجھتا ہوں جسے سماج میں نہیں پہنچانا چاہیئے۔ غم کو جہاں تک ہو سکے آدمی اپنی ذات تک محدود رکھے۔ ویسے آپ نے یہ بالکل ٹھیک کہا ہے کہ بنیادی طور پر غمگینی کا سا ماحول میرے اندر چھایا رہتا ہے۔

محمود سعیدی: کمار صاحب، آپ نے جو یہ بات کہی کہ محفلوں میں یہ ہمیشہ خندہ بلب نظر آتے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ بعض موقعوں میں یہ انتہائی غم زدگی کا اظہار ہوتا ہے۔ مثلاً میری شاعری سے بھی انہیں دلچسپی رہی ہے اور مجھے اپنا یہ شعر یاد آتا ہے کہ:

خود سے مل کر بہت اُداس تھا آج
وہ جو ہنس ہنس کے سب سے ملتا ہے

تو محفلوں کے لمحوں میں جب ان کی خود سے ملاقات ہوتی ہے تو ایک حزنیہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ کم از کم میں نے ہمیشہ محسوس کیا ان کی تحریروں کو پڑھتے ہوئے۔

مجتبیٰ حسین: ایک بات یہ بالکل ٹھیک ہے محمود صاحب کہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اچھے اور سچے مزاح کی حد بچے غم کو اپنے اندر انگیز کر لینے کے بعد شروع ہوتی ہے۔

کمار۔ محمود: صحیح کہا آپ نے۔

مجتبیٰ حسین: جب آپ ساری غمگینی کو یا غم کو، دکھ درد کو اپنے اندر انگیز کر لیں تبھی آپ سچا اور اچھا مزاح پیدا کر سکتے ہیں۔

کمار۔ محمود: یہ عمل تو آپ کی تحریروں سے محسوس ہوتا ہے۔

کمار پاشی: ایک بات... وہ آپ کے خاکوں کے حوالے سے کہنا چاہوں گا کہ آپ نے بہت سے شاعروں ادیبوں کے خاکے لکھے ہیں۔ بلاشبہ بہت اچھے خاکے لکھے لیکن ان خاکوں میں ایک تو بہر حال جس شاعر یا ادیب پر خاکہ لکھا آپ نے اس کی شخصیت کے اور اس کے ساتھ ساتھ آپ کی شخصیت کے پہلو بھی اس میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ کسی شاعر کی آوارگی کا ذکر کرتے ہیں اور بعض باتوں کا ذکر کرتے ہیں تو اپنے آپ کو اس سے علاحدہ کر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر میری آوارگی کا کیا آپ نے...

محمود سعیدی: میری آوارگی کا بھی جو....

کمار پاشی: ہاں! بالکل کہہ دیا کہ میں ان کی آوارگی میں شامل نہیں ہوں۔ جبکہ میری ہر آوارگی میں آپ شامل رہے ہیں۔ (قہقہہ)

مجتبیٰ حسین: نہیں... ایسا نہیں ہے۔ میں نے ایک جگہ کہیں لکھا بھی ہے کہ میں نے جتنے خاکے لکھے ہیں، وہ اصل میں، میں نے اپنا خاکہ لکھنے کی چاٹ میں لکھے ہیں۔ ویسے تو صحیح ہے کہ جب ایک آدمی ڈسکرائب Describe کرتا ہے ایک دوسرے شخص کی آوارگی کو، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی اس میں۔ اس آوارگی میں شامل ہے۔

کمار پاشی: جو شخصیت آپکی اُبھر کر سامنے آتی ہے، وہ بہت ہی مسکین اور سیدھے آدمی کی اُبھر کر سامنے آتی ہے۔

مجتبیٰ حسین: وہ تو مزاح نگار کی.....

کمار پاشی: جب آپ نے محمود سعیدی پر خاکہ لکھا۔ اس میں بھی محمود سعیدی کی آوارگیوں کو آپ نے بہت بڑھا چڑھا کر لکھا لیکن اپنی آوارگیوں کا ذکر اس میں شامل نہیں کیا۔

مجتبیٰ حسین: پڑھنے والا تو بہت اچھی طرح جان لیتا ہے کہ صاحب اس آوارگی میں جہاں جہاں یا جن جن جگہوں پر محمود سعیدی جاتے ہیں۔ جس کا ذکر اس میں موجود ہے تو اس کا مطلب یہ کہ یہ چشم دید گواہ ویسے ہی....

محمود سعیدی: لیکن جگہ جگہ آپ اپنی علاحدگی کا اظہار کرتے گئے ہیں... نہیں؟ میں یہ کہوں گا پاشی صاحب کہ آپ کی بات سے میں اس حد تک متفق ہوں کہ آپ یعنی مجتبیٰ حسین، وہاں ایک راوی نظر آتے ہیں۔ شریک کار نہیں...

مجتبیٰ حسین: جی ہاں۔ جی ہاں۔ میرا کام تو راوی کا ہی ہے اس میں۔

کمار پاشی: شریک کار بھی ہونا چاہیے...

محمود سعیدی: یہ شریک کار نظر نہیں آتے ہیں راوی نظر آتے ہیں۔ ایسا غالباً میں جہاں تک سمجھتا ہوں جیسا کہ ابھی انہوں نے حیدرآباد تہذیب کا ذکر کیا تھا کہ ان محفلوں میں بھی اپنے بزرگوں سے ملتے ہوئے ایک تکلف کا پردہ حائل رہتا ہے۔ اگر میں غلط نہیں سمجھا تو مجتبیٰ حسین صاحب،، شاید آپ کی اس حیدرآبادی تہذیب میں جس کی آغوش میں آپکی پرورش ہوئی کچھ تحفظات بھی داخل ہیں۔

مجتبیٰ حسین: جی ہاں جی ہاں۔ شاید آپ نے ٹھیک نفسیاتی تجزیہ کیا۔ بالکل ٹھیک۔

کمار پاشی: ایک شکایت مجھے رہی ہے، مختصر سا سوال ہے۔ آپ سے بھی اور بہت سے مزاح نگاروں سے جو شعر کہتے ہیں مزاحیہ لہجہ

جو نشتر لکھتے ہیں۔ یعنی وہ شخصیت یہ کہ جب بھی اپنی بیوی کا ذکر کریں گے تو اُس کے مضحک پہلو کا ذکر کریں گے تاکہ سُننے والا یا قاری جو پڑھنے والا ہے اس سے خوشی حاصل کرے۔ مسرت حاصل کرے، جو وہ تلاش کرتا ہے۔

مجتبیٰ حسین: جی...

مجاہد ہاشمی: فکر صاحب کے ہاں جو بیوی کا ذکر آتا ہے۔ غالباً بہت آتا ہے ان کے مضامین میں، اور ہندی کے بہت سارے ادیب جو اپنی بیوی کا ذکر کرتے ہیں، اس میں بھی اس کا مضحک پہلو سامنے آتا ہے۔ اور ہنساتے ہیں۔ اس طرح مزاح کا ایک پہلو تلاش کر لیتے ہیں۔ حالانکہ آپ کے مضامین میں میں نے وہ کردار نہیں دیکھا یا میری نظر سے نہیں گذرا۔ تو اس سلسلہ میں آپ کیا کہیں گے۔ فکر کے حوالے سے — ؟

مجتبیٰ حسین: ایک تو یہ بتا دوں کہ بہت سے مزاح نگاروں نے اپنے خاص کردار رکھے۔ جیسا کہ شوکت تھانوی نے ایک خاص کردار ایک ٹائپ رکھا۔ فکر تونسوی نے کسی طرح کا کوئی ٹائپ TYPE نہیں بنایا۔ جب بھی مذاق اُڑانا چاہا تو بیوی کو ایک کردار کے طور پر۔ ایک مزاحیہ کردار کے طور پر لکھا۔ اس کا بھی مقصد ایک طرح سے یہی ہوتا تھا کہ صاحب اپنے آپ پر SATIRE اسٹائر کرو۔ کیونکہ بیوی تو شریکِ زندگی ہے ان کی زندگی سے جڑی ہوئی ہے۔ اس کا مذاق اُڑانا، ایک طرح سے اپنا مذاق اُڑانا ہے۔ میں نے یہی دیکھا کہ فکر تونسوی نے بیوی کے حوالے سے خود اپنا مذاق اُڑایا ہے۔ بیوی کے مضحک پہلو تو لکھے مگر یہ کہ مذاق اُڑانے کی کوشش کی اپنا آپ کا اور میری نظر میں اپنا آپ مذاق اُڑانا وہ بہت بڑے ظرف کی بات ہے۔ لوگ تو کسی اور کا مذاق اُڑا کر — کسی کردار کا۔

محمود سعیدی: اچھا! مجتبیٰ صاحب۔ جب یہ آپ کے مزاح نگاروں کا ذکر چھڑ ہی گیا ہے جیسا کہ مجاہد ہاشمی نے فکر تونسوی کا نام لیا۔ میں یہ جاننا چاہوں گا کہ آپ کے زمانے کے جو طنز و مزاح نگار رہیں، ان میں آپ کی پسند کے کون لوگ ہیں۔ اور اس سے آگے بڑھ کر کوئی آدمی ایسا بھی ہے جس کا آپ نے کسی بھی مرحلہ پر اپنی ادبی زندگی میں کسی قسم کا کوئی اثر قبول کیا ہو؟

مجتبیٰ حسین: محمود صاحب، یہ بالکل ریلیونٹ بات کی۔ اصل میں دیکھئے کہ سب سے پہلے میں نے جس سے اثر قبول کیا ایک تو میرے بھائی ابراہیم جلیس۔ جن کی تحریریں، ویسے ظاہر ہے کہ ادب کے حوالے سے بھی اور چھوٹے بھائی ہونے کے ناطے بھی ذکر کر رہا ہوں۔ ویسے طنز نگاری کے معاملے میں دوسرا ادیب ہیں کرشن چندر جن کے طنز کا میں بڑا قائل ہوں۔ اور کنھیا لال کپور بھی۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ اچانک مزاح نگاری مجھ پر تھوپی گئی، لادی گئی، صحیح بات تو یہ ہے کہ میں مزاح نگار ضرورتاً بن گیا مجھے پتہ نہیں تھا کہ میں مزاح لکھ بھی سکتا ہوں، مجھے یہ تک یاد ہے کہ ——

۱۲ر اگست سنہ ۱۹۶۲ء کو دن میں ٹھیک ساڑھے دس بجے میں نے مزاح نگاری شروع کی۔ ہوا یہ کہ شاہد صدیقی جو کالم لکھا کرتے تھے طنز و مزاح کا روزانہ کالم۔ جب ان کا انتقال ہوا تو، حیدرآباد کے کئی ادیبوں سے کہا گیا کہ وہ لکھیں اس کالم کے لئے۔ مگر تجربے ہوتے رہے۔ میں اس اخبار میں کام کرتا تھا، سب ایڈیٹر کے طور پر —— اور میرے بڑے بھائی محبوب حسین جگر جوائنٹ ایڈیٹر تھے اس کے۔ ایک دن میں دفتر ایسے ہی پہنچا اپنے کام پر۔ جب میں پہنچا تو مجھے حکم دیا گیا کہ فوراً آپ کو کالم لکھنا چاہئے۔ ایسے ظاہر ہے کہ میں تو مجبور تھا۔ میں نے لکھنا شروع کیا۔ دو چار پانچ کالم۔ میں آپ کو یہ کلمہ

بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے صحافتی مزاح یا روزانہ مزاح کا آغاز کیا۔ روزانہ کالم نگاری کے جو اس دور کے ادیب تھے ان کو میں نے بہت باضابطہ طور پر پڑھنا شروع کیا۔ سب سے پہلے فکر تونسوی کو۔ اس زمانے میں "ملاپ" میں ان کا کالم "پیاز کے چھلکے" بہت پاپولر تھا۔ وہ کالم میں نے پڑھنا شروع کر دیا۔ اس سے ہٹ کر پاکستانی رسائل اور اخبار بھی "سیاست" کے دفتر میں بہت آتے تھے۔ مثلاً احمد ندیم قاسمی اس زمانہ میں "عنقا" کے نام سے روزانہ فکاہیہ کالم "امروز" میں لکھا کرتے تھے اسی طرح ابراہیم جلیس کا کالم "وغیرہ وغیرہ" "جنگ" میں چھپتا تھا، شوکت تھانوی کا کالم تھا۔ اور اسی طرح کی تحریریں میں نے باضابطہ طور پر پڑھنا شروع کیں۔ تو میں متاثر ہوا ہوں ان ادیبوں سے اور اس کے بعد۔ پھر ظاہر ہے پطرس وغیرہ کو تو ہم پہلے بھی پڑھ چکے تھے۔ کنہیا لال کپور اور اسٹیفن لی کاک مارک ٹوین وغیرہ باہر کے ادیبوں کو بھی میں نے خاصا پڑھ رکھا تھا، مگر میں نے اپنے آپ کو تیار کیا ایک چیلنج کے لئے۔ وہ تو ایک چیلنج تھا میرے لئے مزاح لکھنا۔ میں نے زندگی میں ایک ہی کام یہ کیا کہ چاہے کوئی چیز میرے سامنے آئے چیلنج کے طور پر۔ تو میں اس چیلنج کو قبول کرتا آ رہا ہوں۔ کوشش یہ کرتا ہوں کہ اس چیلنج تک جا کر جی سکوں۔ دو چار برسوں ہی میں بلکہ اسی سال جب میں نے لکھنا شروع کیا اس کے دو چار مہینوں بعد ہی لوگوں نے پوچھنا شروع کیا کہ یہ کالم کون لکھ رہا ہے۔

محمود سعیدی: یہ کالم آپ نے فرضی نام سے لکھے؟

مجتبیٰ حسین: جی میں نے یہ کالم "کوہ پیما" کے نام سے لکھے۔ "شیشہ و تیشہ" یہ ریگولر کالم تھا۔ ہاں تو ان ادیبوں سے میں متاثر ہوں۔ جہاں تک CONTEMPORARY WRITERS (ہم عصر ادیبوں) کی بات کر رہے ہیں۔ اس زمانے میں احمد جمال پاشاہ بھی بہت اچھے کالم لکھا کرتے تھے "گلوریاں" "قومی آواز" میں۔ اور "پرتاپ" کا مزاحیہ کالم بھی بہت اچھا ہوتا تھا۔ اسے بھی میں پابندی سے پڑھا کرتا تھا، تو مطلب یہ کہ میں نے پھر مزاح کو اوڑھنا بچھونا سا بنا لیا۔ اس کے بعد اگرچہ کہ میرا مزاج بالکل مزاح کی طرف نہیں تھا مگر یہ کہ یہ کام مجھے ضرورتاً کرنا پڑا۔ اور جب دو تین برس میرے کچھ اس طرح گزرے، طنز و مزاح لکھنے کے ماحول میں۔ تو میں نے سوچا کہ صاحب کیوں نہ مزاح نگاروں کو منظم کیا جائے اور مزاح کو ایک آرگنائزڈ ORGANISED ڈھنگ سے پیش کرنے کی کوشش کی جائے۔ میں نے زندہ دلانِ حیدرآباد کے تحت سنہ ۱۹۶۲ء میں اردو کے مزاح نگاروں کی پہلی کل ہند کانفرنس منعقد کروائی۔ اب رہی CONTEMPORARY WRITERS کی بات۔ تو ان میں جیسے میں یوسف ناظم کو بہت پسند کرتا ہوں۔ میں ہندوستانی ادیبوں کی بات کر رہا ہوں۔ بھارت چند کھنہ ہوئے۔ یا نریندر لوتھر ہوئے۔ احمد جمال پاشاہ اور فکر تونسوی کا تو میں نے ذکر کر ہی دیا ہے۔ فکر تونسوی سے میں خاصا متاثر رہا ہوں۔ اس کے علاوہ دوسرے بہت سے اور بھی مزاح نگار ہیں۔ جیسے وجاہت علی سندیلوی۔ ان سب کی تحریریں میں نے پڑھیں۔ اور ظاہر ہے کہ ان سے کچھ نہ کچھ اثر تو میں قبول کیا ہی ——

نثار پاشی: آپ نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے احمد جمال پاشاہ کا —— اور اس کے ساتھ کچھ اور کا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ طنز و مزاح نگاروں میں آج کل اس طرح کا کوئی CONTRIBUTION کانٹری بیوشن ہے جس کا ذکر کیا جائے؟

مجتبیٰ حسین : دیکھئے جب احمد جمال پاشاہ کی کتاب "اندیشۂ شہر" آئی اُس نے چونکا دیا تھا۔ احمد جمال پاشاہ کا سائنٹفک پوشن خاص طور پر پیروڈی کے معاملہ میں.....

کمار پاشی : آپ نے اور بھی نام گنوائے ہیں....

مجتبیٰ حسین : بہت سے مزاح نگار ہمارے ایسے ہیں جو CASUALLY کیا ڑولی ۔ کبھی لکھ دیتے ہیں۔ ویسے بھارت چند کھنّہ نے خاصی کتابیں لکھیں ۔ نریندر لوتھر زیادہ نہیں لکھتے لیکن جب بھی لکھتے ہیں اچھا خاصا لکھتے ہیں۔ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ جیسے یوسف ناظم ہوئے۔ یوسف ناظم لگاتار لکھے جا رہے ہیں۔

کمار پاشی : آپ نے دوستوں پر لکھا تو بہت کھُل کر لکھا لیکن ہمعصروں کے بارے میں کہتے ہوئے....

مجتبیٰ حسین : میں یہ سمجھتا ہوں یہ بڑا مشکل کام ہے لیکن.....

کمار پاشی : اس مشکل کام کو بہت جگہ آپ نے آسان بنایا ہے تو اس موقع پر جبکہ ہم بہت ہی قریبی دوست مل بیٹھے ہوئے ہیں یہاں تو کھُل کر اظہار کرنا ہی چاہیئے ۔

مجتبیٰ حسین : نہیں ۔ کمار صاحب ۔ ایسا ہے....

محمود سعیدی : مجتبیٰ صاحب یہ ایسا سوال ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ جس سے آسانی سے نہیں گزرنا چاہیئے۔ اسلئے کہ ہمارے یہاں کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی ایک نظم پر کسی آدمی کی شہرت قائم ہو گئی۔ اس کی شہرت کی جو عمارت ہے، اس سے لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ جو کچھ لکھتا ہے اچھا ہی لکھتا ہے۔ اس کی مثالیں شاعری میں بھی ہیں۔ جیسے مجاز کے پاس ایک نظم "آوارہ" موجود ہے، تو معلوم ہوا کہ بہت بڑے شاعر ہیں لیکن آج ہمیں لگتا ہے کہ یہ بات صحیح نہیں ہے ۔ احمد جمال پاشاہ میرے بھی دوست ہیں۔ میں انکی بہت عزت کرتا ہوں۔

کمار پاشی : ہم سب کے دوست ہیں۔

مجتبیٰ حسین : جی ہاں ۔ یقیناً۔

محمود سعیدی : اب دیکھئے کہ وہ پیروڈی کا "اندیشۂ شہر"۔

مجتبیٰ حسین : جی ہاں، پیروڈی کا بہت کامیاب تجربہ ہے۔

محمود سعیدی : لیکن ۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ وہ دھیرے دھیرے کچھ خاموش ہوتے گئے۔ اور ایسا لگا مجھے کہ وہ ایک جو اُپج تھی ان کے یہاں جو تازگی تھی...

مجتبیٰ حسین : جی ہاں میں بھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ ان کے یہاں، بعد کی تحریروں میں مزاح کی وہ شدت نہیں ہے جو پہلے تھی۔

محمود سعیدی : ابھی آپ نے جس کا ذکر کیا کہ ان میں یوسف ناظم تازہ کار ہیں۔ اور اب بھی کبھی کبھی ایسی تحریریں دیتے ہیں جو ایک فنکار کو زندہ رکھتی ہیں۔ خیر ۔ اچھا ۔ مجتبیٰ صاحب آپ نے بہت دلچسپ بات یہ بتائی کہ مزاح نگاری کی طرف آپ ضرورتاً آئے ۔ یعنی یہ آپ کی طبیعت کا تقاضہ نہیں تھا ایک دفتری ضرورت کے تحت آپ نے لکھنا شروع کیا۔ اور پھر آپ اسی کے ہو گئے اور اس کو اختیار کر لیا۔ تو ایسا میں سمجھتا ہوں کہ بہت کم ہوا ہو گا کہ بعض لوگوں نے ضرورتاً ادب کی کوئی صنف اختیار کی ہو اور اس میں اتنی کامیابی حاصل کی ہو، جتنی آپ نے کی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ تو نہیں ہو سکتی کہ جیسا کہ آپ نے کہا کہ یہ آپ کی نیچر ہے کہ جب بطور چیلنج کوئی چیز آپ کے سامنے آئے تو آپ اُسے پورا کر دکھاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ چیلنج تو اس وقت ختم ہو جانا چاہیئے تھا جب آپ نے اس اخبار سے علٰحدگی اختیار کر لی ہو گی...

مجتبیٰ حسین : نہیں ... پھر رفتہ رفتہ کچھ یوں ہوا کہ محمود صاحب .... ویسے میرے مزاج میں یہ رہا ہے کہ میں بڑا سوشیل SOCIAL تو رہا ہوں۔ دوستوں کی محفل میں لطیفے اور فقرہ بازی یہ تو چلتی رہی۔ مگر تحریر میں اس کا کبھی اظہار نہیں ہوا۔ اور جب ضرورتاً مزاح لکھنے لگا تو لوگوں نے اس کو پسند کرنا شروع کیا۔ اور

حامد اکمل : اور یہ لت آپ کو لگ گئی۔

ـ مشترکہ قہقہہ ـــ

کمار پاشی : مجتبیٰ صاحب، ابھی آپ نے چیلنج کا ذکر کیا تھا، کسی کا خاکہ لکھتے ہوئے کیا آپ نے ایسا محسوس کیا میرے لئے یہ ایک چیلنج ہے ؟

مجتبیٰ حسین : اکثر ایسا ہوا ـــ جی ہاں۔

کمار پاشی : اکثر ایسا ہوا FOR EXAMPLE مثال کے طور پر !

مجتبیٰ حسین : مثال ـ مثال دینا تو مناسب نہ ہوگا۔

حامد اکمل : ایک مثال دیجئے کہ کس کا خاکہ لکھتے وقت یہ محسوس ہوا کہ یہ خاکہ لکھنا ایک چیلنج ہے ... ؟

مجتبیٰ حسین : بزرگوں کے خاکے لکھتے ہوئے خاص طور پر بڑا مجھے احساس ہوتا ہے کہ صاحب کیسا لکھا جائے۔ ان کے بارے میں خاص طور پر جب کوئی گذر جائے۔ مثلاً اعجاز صدیقی کا خاکہ میں نے ان کی موت کے بعد لکھا تھا، اس کو لکھتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ یہ ایک چیلنج تو ہے، اور موت کے بعد کسی پر خاکہ لکھنا، بڑا ....

کمار پاشی : جن سے اتنی قربت رہی ہو ....

مجتبیٰ حسین : جن سے قربت رہی ہو، اور جو مجھے بہت زیادہ عزیز رکھتے تھے مگر یہ کہ چونکہ میرا اپنا مزاج ہے ہیومرسٹ کا HUMOUR ۔ اس لئے مزاحیہ خاکہ لکھتا ہوں میں۔ اگرچہ کہ جیسا محمود صاحب نے پہلے بھی کہا کہ میں خاکے کو جب END اینڈ کرتا ہوں تو تب اس شخصیت کے ساتھ جو میری جذباتی وابستگی ہے اس کا اظہار ہوتا ہے۔ مگر اس سے پہلے میں ایک مزاح نگار کے طور پر اس شخصیت کے مزاحیہ پہلو تلاش کرتا ہوں تو اعجاز صدیقی صاحب کے خاکے میں بھی میں نے یہی کیا کہ صاحب ان کی شخصیت کے اطراف مزاح کے جو پہلو ابھر سکتے تھے مثلاً یہ کہ اپنی بیماری کا ذکر وہ بار بار کرتے تھے ....

کمار پاشی : بہت اچھا پہلو ان کی شخصیت کا آپ نے تلاش کیا۔

محمود سعیدی : ہاں ـ بھئی وہ بہت مدت کے بعد ایک خط آپ کو ملا ان کا ـ جس میں ان کی بیماری کا ذکر نہیں تھا آپ بہت حیران ہوئے، کارڈ کو پلٹ کے دیکھا تو وہ پتہ کے اوپر لکھا ہوا تھا کہ ....

مجتبیٰ حسین : بستر علالت پر ہوں .... (قہقہہ ـ مشترکہ قہقہہ)

کمار پاشی : پہلو تو یہ مجتبیٰ صاحب نکال لیتے ہیں۔ بہت خوبصورت پہلو ـ جیسے کہ سجاد ظہیر اور مخدوم ـــ

محمود سعیدی : مجتبیٰ صاحب! اب یہ کہ خاکہ نگاری کا ذکر آیا ـ اور یہ بھی کہ آپ ایسی شخصیتوں پر جن سے آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کا خوردی اور بزرگی کا رشتہ ہے۔

مجتبیٰ حسین : قطع کلام ہوتا ہے، میں یہ بھی عرض کر دوں کہ بنے بھائی مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ بنے بھائی کے انتقال کے بعد جب یہاں تعزیتی محفل ہوئی۔ اس میں تو کوئی گنجائش تھی نہیں اس طرح کی مگر

میں نے اپنے مزاج کے حساب سے ۔ میری جو اُفتادِ طبع ہے اس کے حساب سے میں اسی طرح کا خاکہ لکھ سکتا تھا۔ اس میں بھی بعض پہلو ایسے آئے یعنی بنے بھائی کی زندگی کے خوشگوار پہلو ۔۔۔ اور لوگوں نے پہلے تو انکار کیا ہنسنے سے اور بڑی دیر تک وہ گھٹتے رہے، ضبط کیا ۔ مگر میں نے بعد میں دیکھا کہ وہاں پروفیسر نورالحسن بھی بیٹھے ہوئے تھے، وہ بھی بعد میں ہنسنے لگے ۔ اس کے بعد پھر یہ ہوا کہ باقی لوگوں نے بھی ہنسنا شروع کر دیا۔ کچھ لوگوں نے بعد میں اعتراض بھی کیا کہ صاحب آپ نے تعزیتی محفل میں ایسی چیز پڑھ دی ۔ مگر میں اس بات کو یہ سمجھتا ہوں کہ موت تو اپنی جگہ اٹل ہے ہی ۔ مگر ایک شخصیت کا جو ....

کمار پاشی : مضحک پہلو ہے ...

مجتبیٰ حسین : مضحک بھی نہیں ۔ خوشگوار پہلو جو اُن کی زندگی کے ہیں ۔ وہ بھی آجائیں تو کوئی ایسا ....

کمار پاشی : اچھا ایک اور بات آپ کے خاکوں کے حوالے سے ۔ یعنی شکایت ہی کہہ لیجئے ۔ یہ کہ جب آپ خاکہ لکھتے ہیں کسی کا تو اس میں بعض ایسے واقعات کا بھی ذکر کرتے ہیں جس کا اس شاعر کی، اس ادیب کی زندگی سے جس پر کہ یہ خاکہ لکھا ہے آپ نے، اس کا دور تک کوئی تعلق نہیں ہوتا ۔

مجتبیٰ حسین : نہیں ۔ میں نے ایسا تو نہیں کیا ۔

کمار پاشی : ایسے لطیفے کئی ملتے ہیں ۔ مثال کے طور پر مخمور سعیدی کا جو خاکہ آپ نے لکھا، اس میں بھی بعض لطیفے ایسے ہیں، جن کا میں سمجھتا ہوں کہ مخمور صاحب کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔ مثلاً میرے بارے میں بھی جو خاکہ لکھا آپ نے اس میں ایسے کئی لطیفے ہیں ۔

حامد اکمل : یہ دراصل بات کو آگے بڑھانے کیلئے .....

کمار پاشی : میں نہیں سمجھتا کہ ۔

مجتبیٰ حسین : مثلاً یہ بتلائیے کہ میں نے مخمور کے خاکے میں یا آپ کے خاکے میں جہاں جتنا ذکر کیا ہے تھوڑی سی مبالغہ آرائی تو ہو سکتی ہے ۔ مثلاً جیسے وہ مشاعرہ والی بات ۔

کمار پاشی : میں اسی مبالغہ آرائی کا ذکر کر رہا تھا ۔

مجتبیٰ حسین : جی ہاں ۔۔۔۔

مخمور سعیدی : یہاں تک تو ٹھیک ہے ذرا سا کچھ اس میں مبالغہ شامل ہو جاتا ہے لیکن وہ واقعہ ظہور میں آیا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ اس میں اُنہوں نے تھوڑی سی رنگ آمیزی کر دی ۔۔۔

مجتبیٰ حسین : تھوڑی سی رنگ آمیزی تو ہے جیسے آپ نے مشاعرے والی بات کہی ۔ اس رات واقعی مشاعرہ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی ۔ مشاعرہ تو ہوا تھا (قہقہہ) کیوں مخمور ۔۔۔ ؟

مخمور سعیدی : اچھا ۔۔۔ یہ بات میرے ذہن میں آئی مجتبیٰ صاحب کہ خاکہ نگاری پر آپ کی، گفتگو ہو رہی ہے تو خاکے سعادت حسن منٹو نے بھی لکھے ہیں ان کا کوئی ذکر نہیں آیا ۔ منٹو کا بھی رویہ بھی رہا ہے جو آپ کے یہاں رہا ہے ۔ تقریباً ۔ یعنی یہ کہ شخصیت میں جو کچھ ہے، اُسے سامنے رکھ دو کہ اس آدمی کے یہ پہلو بھی ہیں ۔۔۔

کمار پاشی : مزاحیہ پہلو ۔۔۔

محمود سعیدی : یہی میں کہہ رہا ہوں آپ سے، لیکن شخصیت کو بے نقاب کرنے کی کوشش ان کے یہاں، ان سے بھی زیادہ شدید ـــ

مجتبیٰ حسین و کمار پاشی : زیادہ شدید ـــ بیشک۔

حامد اکمل : آپ ان کے لئے تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ منٹو نے تو پوسٹ مارٹم کیا شخصیات کا۔

کمار ۔ محمود : جی۔ جی

محمود سعیدی : تو میں جاننا چاہ رہا تھا کہ منٹو کے خاکے ظاہر ہے کہ آپ نے پڑھے ہونگے۔

مجتبیٰ حسین : جی ہاں !

کمار پاشی : حالانکہ انہوں نے مزاحیہ مضامین بھی لکھے ہیں۔ وہ چاہتے تو ان میں بھی کوئی مزاحیہ پہلو تلاش کرتے لیکن انہوں نے اپنے خاکوں میں مزاح کو در آنے نہیں دیا۔ !

محمود سعیدی : میں صرف یہ پوچھ رہا تھا آپ سے کہ آپ کے یہاں بھی یہ جو کوشش نظر آتی ہے شخصیت کے چھپے ہوئے گوشوں کو سامنے لانے کی۔ ایک الگ انداز میں سہی۔ یہ تحریک آپ کو وہاں سے تو نہیں ملی۔ یہ آپ کا طبعی رجحان ہے یا منٹو کی مثال بھی آپ کے سامنے رہی۔

مجتبیٰ حسین : محمود صاحب، ایک بات میں آپ کو بتاؤں کہ بنیادی طور پر پہلے میں مزاح نگار بنا بعد میں خاکہ نگار بنا۔ تو مزاح نگاری تو اوڑھنا بچھونا بن گئی کسی طرح۔ ضرورتاً ہی سہی۔ بعد میں وہی پیشہ بھی بن گئی۔ ذریعہ عزت بھی بن گئی، سبھی وہ بن گئی۔ جب میں خاکہ کسی شخصیت کا لکھتا ہوں۔ سب سے پہلے حکیم یوسف خاں نے مجھ سے خواہش کی تھی۔ پہلا خاکہ انہیں کا لکھا تھا۔ پتہ نہیں کیوں ان کے ذہن میں یہ بات آئی۔ یہ ۱۹۶۸ء کی بات ہے جبکہ مجھے مزاح نگاری شروع کئے ہوئے کچھ چھ، سات سال ہو چکے تھے۔ پتہ نہیں کیوں انہوں نے مجھ سے یہ کہا کہ صاحب آپ خاکہ میرا لکھیں گے۔ میں نے منع بھی کیا کہ وہ میرے بزرگ ہیں۔ مگر جب میں لکھنے بیٹھا تو ان کی شخصیت کے گوشے میرے سامنے تھے۔ پھر میرا مزاح نگار۔ وہ کچھ مجھ پر غالب آگیا۔ اور میں نے اس خاکہ میں جان بوجھ کر یہ کوشش کی کہ اُن کو بہت ہی LIGHTER (ہلکے پھلکے) انداز میں پیش کروں، اتفاق سے وہ ان کو بہت پسند آیا۔ کچھ لوگوں نے اگرچہ اعتراض بھی کیا کہ صاحب آپ نے حکیم صاحب کا مذاق اُڑایا ہے۔ مگر خود حکیم یوسف حسین خان کو بہت پسند آیا۔

محمود سعیدی : کمار صاحب، بات تو خاکہ پر ہوئی۔ ابھی تو ان کے کام کے بہت سے پہلو باقی ہیں۔

کمار پاشی : میں اسی طرف آ رہا تھا۔

محمود سعیدی : ایک تو ان کے مضامین ہیں۔ پھر ان کے سفر نامے ہیں۔

کمار پاشی : ابھی میں ذکر کرنا چاہوں گا ان کے ESSAYS اِسّیز کا۔ ظاہر ہے کہ اِسّے کو یعنی انشائیہ کہہ لیجیے کو رواج دینے میں اس دور میں وزیر آغا نے خاصا کام کیا ہے اور کافی نئے انشائیہ نگار ہمارے سامنے آئے ہیں۔ اور خود وزیر آغا نے بھی بہت اچھے انشائیے لکھے ہیں۔ انشائیہ کی کیا تعریف ہے آپ کے ذہن میں۔ یا کیا تعریف ہونی چاہیئے اور وزیر آغا صاحب نے جو تعریف اس کی لکھی ہے اپنی کتابوں میں بھی اور رسائل میں بھی تو کیا آپ اس تعریف سے مطمئن ہیں ؟

مجتبیٰ حسین : صاحب، دیکھئے ایک تو انشائیہ کے مسئلہ پر جو بحث ان دنوں چل رہی ہے۔ اُصول مرتب کئے جارہے ہیں وزیر آغا کے حوالے ہی سے میں کہہ رہا ہوں۔ وزیر آغا کے کچھ انشائیے مجھے پسند تو ہیں، مگر انشائیہ نگار سے آپ یہ توقع رکھیں کہ صاحب انشائیہ یہاں اسی طرح لکھا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس طرح تو انشائیہ کبھی بھی نہیں لکھا جاتا۔ انشائیہ کا انہوں نے جو اُصول بنایا ہے، یا جو تعریف انہوں نے مقرر کر رکھی ہے اس کی وجہ سے بڑی حد تک کنفیوژن CONFUSION بھی پھیلا ہے۔ ایک تو وہ بھی کہتے ہیں کہ مزاح الگ چیز ہے اور انشائیہ الگ چیز۔ مزاح نگاری، مزاحیہ مضمون الگ چیز ہے اور انشائیہ نگاری الگ چیز۔

کمار پاشی : انہوں نے ایسّے ESSAY کا جو متبادل تلاش کیا ہے، انشائیہ۔ تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ وہ لکھ رہے ہیں انشائیہ ہی لکھ رہے ہیں۔ انشائیہ ہی نام دیتے ہیں وہ اسے۔ کیا وہ ایسّے پر پورا اُترتا ہے۔ انگریزی میں جیسے لکھے گئے ہیں یا لکھے جارہے ہیں۔

مجتبیٰ حسین : ایک حد تک اُترتا ہے ضرور ـــ جس طرح کہ پُرانے لکھنے والے یعنی مطلب وہ انگریزی کے، ہلکی پھلکی تحریریں یعنی جن میں کچھ معلومات بھی شامل ہو جائیں۔

محمود سعیدی : وزیر آغا صاحب کے مضامین یا وہ انشائیے جنھیں کہا جائے ان میں۔ وزیر آغا صاحب کی طبیعت کا یہ میلان بھی ہے کہ وہ ہر چیز کو ایک فریم ورک میں رکھتے ہیں۔ یہ رکھتے ہیں اُسے۔

کمار پاشی : نہیں محمود صاحب! ایسا نہیں۔ وہ ان کا جو مقصد ہے کہ بات میں سے بات پیدا کرنے کا۔ بات میں سے بات نکالتے ہیں وہ۔

محمود سعیدی : بات میں بات پیدا کرنے کا عمل جہاں تک ہے۔ میں پھر عرض کروں کہ اس کی تو سب سے اچھی مثال ہمیں مجتبیٰ حسین صاحب کے مضامین میں ملتی ہے کہ کوئی بات نہیں ہے۔ مگر بات سے بات نکلتی جارہی ہے اور ایک فرحت کا احساس ہوتا ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ بعض یہ چیزیں ہمارے بالکل سامنے کی تھیں لیکن ان پہلوؤں تک ہماری نظر نہیں گئی۔ اور یہ ایسا لگتا ہے کہ اس کے لئے کوئی اہتمام نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ ذہن ہے جو خود بخود ادھر سے اُدھر کھل رہا ہے۔ وزیر آغا کے انشائیے آپ دیکھیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے انہیں سوچا گیا بعد میں کاغذ پر اُتارا گیا۔ اسی لئے وہ، وہ جو ایک آزاد خرامی ہونی چاہیئے۔ وہ یہاں نظر نہیں آتی۔ بلکہ .....

کمار پاشی : بلکہ آرٹ کم ہوتا ہے اور ــ

حامد اکمل : کرافٹ زیادہ..... یعنی کہ منصوبہ بند تحریر۔

کمار پاشی : ہم آسانی سے تو نظر انداز نہیں کرسکتے انہیں۔ انہوں نے ESSAY کو انشائیہ کا نام دیا مگر انگریزی میں ایسّے لکھا جاتا ہے۔ ایک ہلکی پھلکی چیز۔ اور جس کی طرف وزیر آغا نے اشارہ بھی کیا ہے مجھ سے کہا تھا، نے کہا کہ وہ فریم FRAME پہلے بنا لیتے ہیں۔ چلئے آپ کی بات مان لیجئے کہ فریم انہوں نے پہلے تیار کرلیا۔ اس کے بعد انشائیہ لکھ دیا۔ لیکن جو فریم انہوں نے تیار کیا اس میں سے آپ بات میں سے بات پیدا نہیں کرسکتے۔ لیکن اگر انہوں نے ایک بات کہہ دی ہے، پہلے جملے میں۔ تو اس ایک جملہ کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ مختلف سمت کی طرف نکل جاتے ہیں،

مجتبیٰ حسین : ہاں ——

کمار پاشی : ابھی نیند سا ذکر کر رہے ہیں اور ابھی کہیں اور نکل جائیں گے ۔

مجتبیٰ حسین : ایک تعریف ایسّے کی ہے پریشان خیالی۔ ایک لمحے میں جس طرح کا موڈ آدمی پر طاری ہو یا جس طرح کی سوچ اس پر طاری ہو، اسی میں وہ لکھتا چلا جائے۔ بھلے ہی ذہن کئی موضوعات کی طرف چلا جائے کوئی اس میں قباحت نہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں جو تعریف ہمارے وزیر آغا نے کی ہے۔ اس پر کیا آپ سمجھتے ہیں کہ لیطرس بخاری اُتر سکتے ہیں پورے۔ کیا کنہیا لال کپور اُتر سکتے ہیں۔

کمار پاشی : وہ تو اس بات کا دعویٰ بھی نہیں کرتے۔ انشائیہ جو اُن کے یہاں ملتا ہے ــ . . .

محمود سعیدی : مگر وہ اس پر بضد نظر آتے ہیں کہ صحیح انشائیہ کی تعریف وہی ہے، جو انہوں نے پیش کی ہے، اچھا انشائیہ وہی ہو سکتا ہے جس کی تعریف وزیر آغا صاحب کے قلم نے ایک بار کر دی ہے۔ یہ طریقہ کار . . . .

مجتبیٰ حسین : میں سمجھتا ہوں کہ یہ طریقہ کار ٹھیک نہیں ہے۔ ایک سچے ادیب کا یا شاعر کا یہ کام نہیں ہوتا کہ وہ اپنے . . . بغیر آپ جو صحیح سمجھتے ہیں لکھتے رہیئے۔ آپ یہ کیوں بضد ہوتے ہیں کہ انشائیہ وہی ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ دوسری حالت میں یہ انشائیہ سے باہر —— اس سلسلہ میں جو بحث چلی تھی، وہ آپ کے علم میں ہوگی۔

کمار پاشی : میں آپ ہی کی بات کہہ رہا ہوں مجتبیٰ صاحب۔ ایسا ہے کہ انشائیہ تو اسے اُنہوں نے نام دیا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایسّے کی جو تعریف ہے، انہوں نے انشائیہ کے نام سے بیان کی ہے۔ اور ایسّے پر، ان کے جو مضامین ہیں وہ پورے اُترتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین : ظاہر ہے تعریف بھی ان کی ہے اور ایسّیز بھی اُن کے ہیں تو وہ تو ہو گا ہی۔ (قہقہہ)

کمار پاشی : نہیں انگریزی میں نہیں۔

محمود سعیدی : لیکن دوسروں سے یہ توقع کیوں رکھی جائے کہ وہ بھی اس تعریف پر پورے اُتریں۔

کمار پاشی : انگریزی میں جو ہلکے پھلکے ایسّے ہیں، وہ بھی اسی تعریف کی ذیل میں آتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین : میں نے بھی یہ بات آپ سے کہی تھی لیکن اسے انشائیہ کا نام دیا گیا۔ مگر صرف انگریزی ایسّے کو سامنے رکھکر۔ اُردو کا ایک مزاج ہے۔ اب آپ اس میں مشتاق احمد یوسفی کو کہاں رکھیں گے۔ انشائیہ نگار مانیں گے یا صرف مزاح نگار مانیں گے۔ مجھے آپ وزیر آغا کی تعریف سے بتلائیے۔

کمار پاشی : ظاہر ہے مشتاق احمد تو بہت ہی اہم اور بڑے مزاح نگار ہیں۔ . . .

مجتبیٰ حسین : ظاہر ہے سب سے بڑے طنز و مزاح نگار ہیں۔ مگر ان کو انشائیہ کی تعریف میں وہ فٹ نہیں ہو سکتے۔ وزیر آغا کی تعریف میں۔

محمود سعیدی : اچھا ہم سب جب گفتگو کر رہے تھے۔ ان کے جو انشائیے کہہ لیجئے۔ ایسّیز کہہ لیجئے یا مزاحیہ مضامین کہہ لیجئے۔ ان کے حوالے سے کوئی بات ہو تو ان سے پوچھی جائے، تو وہ زیادہ مناسب ہے۔

کمار پاشی : مجتبیٰ حسین کے خاکے لکھنے سے پہلے ظاہر ہے کہ بہت سے مزاحیہ مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ کتابی صورت میں بھی اور رسائل میں بھی۔ ان میں طنز کی جگہ مزاح جو ہے وہ زیادہ عمدہ قسم کا ہے۔

محمود سعیدی : وہ تو ان کی پوری تحریروں کی خصوصیت ہے کہ طنز تو بہت زیریں لہر کے طور پر ہوتا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایک اچھے مزاح نگار کی میری دانست میں پہچان ہونی چاہیئے کہ اس کے یہاں طنز زیادہ نمایاں نہ ہو۔ طنز ایک الگ چیز ہے بھائی صاحب! مزاح ایک قطعاً الگ چیز۔ تو ہمارے ہاں جو مزاح نگار ہیں

اُن میں مجتبیٰ حسین کا جو غالب مزاج ہے وہ مزاح نگاری کا ہے ۔

کمار پاشی: مجتبیٰ حسین کا شمار مزاح نگاروں میں ہوگا۔ ہاں ___ مجتبیٰ صاحب، آپ نے اثرات تو قبول کئے اپنے بڑے بھائی "ابراہیم جلیس" سے، ان کے ہاں مزاح تو بہت کم ملتا ہے، طنز بہت شدید ہے، تلوار کی کاٹ بالکل۔

مجتبیٰ حسین: اسکی ایک وجہ میں آپ کو بتانا چاہوں گا۔ شائد آپ حیرت بھی کریں اس پر، میں نے اثر قبول کیا تھا ابراہیم جلیس صاحب سے، ان کی تحریروں سے، کرشن چندر اور کنہیا لال کپور سے۔ طنز کی شدت مجھ میں تھی ابتدائی تحریروں میں۔ لیکن میرے بڑے بھائی محبوب حسین جگر جو اس اخبار کے جوائنٹ ایڈیٹر تھے، وہ بڑے صلح کل قسم کے قائل ہیں۔ اخبار کی پالیسی بھی صلح کل قسم کی تھی۔ سیاسی موضوعات میں بھی طنز کرتے ہوئے بہت محتاط رہنا پڑتا تھا۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا تھا کہ میرا پورا کالم وہ ریجکٹ REJECT کر دیتے تھے۔ کئی کئی جملے وہ کاٹ دیتے تھے۔ مجھے دوبارہ لکھنا پڑتا تھا۔ اگرچہ کہ اخبار کا کالم تو طنزیہ کالم ہونا چاہئے تھا لیکن بڑے بھائی کی پسند کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے یہ کوشش کی، اخبار کی پالیسی بھی اس قسم کی تھی یعنی بہت ہی غیر جانبدار اور سیدھی ___ یعنی شدت پسندی والا اخبار نہیں تھا بہت ہی لبرل اخبار۔ تو میں نے سوچا کہ اس میں سوشیل سٹائر ہو اور ہیومر۔ بجائے سیاسی طنز کے۔

کمار پاشی: تو یہ ہوا کہ آپ کے مضامین جو ہیں وہ موجودہ سیاست سے دور پڑ رہے ہیں۔

مجتبیٰ حسین: میں نے کچھ اپنے آپ کو دور بھی رکھا مگر یہ ہے کہ کئی مضامین میں آجاتا ہے۔ جیسے "ریل منتری مسافر بن گئے"

کمار پاشی: وہ بھی بہت ہلکے پھلکے انداز میں۔

مجتبیٰ حسین: ہاں PREDOMINENTLY میں یہ مانتا ہوں کہ مزاح کا عنصر میرے مضامین میں زیادہ غالب ہے طنز کے مقابلے میں۔

محمود سعیدی: مگر میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں بھائی صاحب! کہ معلوم نہیں آپ اس سے اتفاق کریں گے یا نہیں کہ کسی مزاح نگار کے ہاں طنز کا عنصر کم ہونا یا ایک زیریں لہر کے طور پر ہونا شائد اس کی خوبی ہے عیب نہیں۔ ہمیں طنز نگار سے طنز کی توقع کرنا چاہئے اور مزاح نگار سے مزاح کی توقع ___ دونوں چیزوں کو گھال میل کرنا، یہ کوئی اچھے نتائج کا حامل نہیں۔

کمار پاشی: طنز نگار کے ہاں مزاح کا پہلو تو ہوتا ہے۔

محمود سعیدی: ہوتا ہے، لیکن خالص مزاح بھی ایک چیز ہوتی ہے۔

مجتبیٰ حسین: جیسے پطرس بخاری۔ پطرس بخاری کو آپ مزاح نگار کہہ سکتے ہیں۔

کمار پاشی: تو مجتبیٰ حسین کو بھی آپ مزاح نگار . . . .

محمود سعیدی: بنیادی طور پر وہ ہمارے ہاں مزاح نگار کی حیثیت سے آتے ہیں۔ اور یہ شائد فرمائشی طور پر ایسا ہوا ہے یا طبعی میلان بھی ان کا یہ ہے؟

کمار پاشی: ممکن ہے یہ فرمائشی رہا ہو۔ لیکن بعد میں ان کی فطرت کا حصہ بن گیا۔

محمود سعیدی: اب جناب ان کے سفرناموں کا معاملہ بھی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ان کے سفرنامے جو ہیں، وہ بھی مزاحیہ پہلو لئے ہوئے ہیں لیکن اس سے پہلے کے بھی ایسے سفرنامے ہمارے سامنے ہیں۔

کمار پاشی: خاصے ہیں۔ ابن انشاء۔ کرنل محمد خان۔ لیکن وہ جو سفرنامہ ہے ان کا جاپان چلو جاپان چلو۔ اس

میں ایک بات تو بہت ہی خوبصورت ہے۔ ایک پہلو مزاح کا تو جگہ جگہ موجود ہے، ہر جملے میں موجود ہے لیکن یہ کہ اس میں جو ناظر ہے بہت ہی چوکنا ہے اور ہر چیز اس کی نظر میں ہے۔ کوئی چیز چھوٹی نہیں ہے۔ یہ دیکھ کر بیحد خوشی ہوتی ہے۔

مجتبیٰ حسین: واقعی یہی کمار صاحب! ایک تو جاپان مجھے خود بڑا عجیب لگا۔ مشرق میں ہونے کے باوجود بالکل الگ ہے مغرب سے بالکل مختلف مشرق سے بھی مختلف۔ سارے مشرقی اقدار اس نے اپنے پاس محفوظ رکھے ہیں۔ ان کے طنز کے آداب اور۔ ایک طرف تو اپنے آداب کا اتنا خیال کرنے والے اپنی تہذیب کا خیال کرنے والے اور اتنے ہی ترقی یافتہ۔

کمار پاشی: پھر اس سفرنامہ میں وہ جگہ جگہ ہندوستانی "مماثلت" (موازنہ) کرتے گئے ہیں۔ وہاں کی ریلوں کو انہوں نے دیکھا تو ہندوستانی ریلوں پر انہوں نے طنز بھی کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سفرنامہ ایسا ہے جس میں آپ کا طنز بھی ابھر کر سامنے آیا ہے ـــــ اس وجہ سے ابھر کر سامنے آیا کہ آپ نے ہندوستان کا اس سے موازنہ کیا۔

مجتبیٰ حسین: وہ اس لئے بھی کہ جاپان پہلا ملک تھا، جہاں میں گیا بھی باہر۔

محمود سعیدی: تو اس سے یہ ظاہر ہوا کہ ان میں حب الوطنی کا جذبہ بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔

کمار پاشی: وہ بھی ہے اور آپ جو کہہ رہے تھے کہ ان کے ہاں طنز بہت کم ملتا ہے۔ یا زیریں لہر ملتی ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان کے سفرنامے میں وہ طنز بہت ابھر کر سامنے آیا ہے۔

مجتبیٰ حسین: میں نے ایک طرح کوشش یہ کی ہے کہ اپنا مذاق آپ اڑایا ہے۔ میں نے اس میں جاپان والوں کا مذاق نہیں اڑایا ہے۔ جاپان کا بھی مذاق نہیں اڑایا۔ بلکہ ایک طرح سوچا جائے تو میں نے اپنا مذاق آپ اڑایا ہے۔ خود اپنے ہندوستانی سماج کا ماحول کا۔ جس طرح کی کمیاں ہمارے ہاں ہیں، اور جاپان کو دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ بھی مشرق میں ہیں، اور جس مذہب کو وہ اپنائے ہوئے ہیں وہ خود یہاں سے گیا ہوا ہے۔

کمار پاشی: لیکن وہ بھی بہت سلیقہ سے اور بہت میٹھے لفظوں میں۔

مجتبیٰ حسین: ہاں! ایک مزاح نگار کا یہ فرض بھی ہونا چاہئے کہ دل شکنی نہ ہو کسی کی۔ میں نے کوشش یہ بھی کی کہ یعنی خود ہندوستانیوں کی دل شکنی نہ ہو۔ میں نے اس طرح مذاق اڑایا کہ ایک طرح کا لطف اس میں آئے۔

محمود سعیدی: یعنی لطف کا ایک پہلو نکل آئے۔ یہ بات صحیح ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ خاصی مقبولیت بھی حاصل ہوئی آپ کے سفرنامے کو۔

مجتبیٰ حسین: اس کے نتیجے میں وہ کئی ہندوستانی زبانوں میں یہاں چھپا۔

کمار پاشی: جاپان میں بھی اس کا ترجمہ ہوا۔

مجتبیٰ حسین: ہاں، جاپانی میں بھی ہوا ـــــ

کمار پاشی: پھر آپ نے خاکے بہت لکھے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آئندہ دو ایک برس میں کوئی ادیب اور شاعر ایسا نہیں رہ جائے گا کہ (مشترکہ قہقہہ) مجھے ڈر یہ ہے کہ اس کے بعد کس کا خاکہ لکھیں گے آپ؟ بہت سے

ادیب و شاعر تو خود پیدا کرنے ہوں گے آپ کو۔

مجتبیٰ حسین: اصل میں بات یہ ہے کہار صاحب کہ کچھ تو یہ ضرور ہے کہ بعض اغراض و مقاصد اور کچھ لوگوں کے تقاضے اور کچھ ایک طرح کا فیشن سا بھی بن گیا کہ ۔۔۔۔

محمود سعیدی: کہار پاشی سا جو اندیشہ ہے وہ تو میں دور کئے دیتا ہوں کہ جبتک اُردو کتابوں کا تقریب اجراء کے جلسے ہوتے رہیں گے۔ (مشترکہ قہقہہ) یہ خاکے لکھتے رہیں گے۔ کوئی دشواری ایسی نہیں آئے گی۔ اس لئے کہ وہ یہ مروّتیں ہیں جن کا ابتدا میں ابھی ذکر ہوا تھا۔! اچھا اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ خود شکار کہتا ہے کہ آؤ مجھے شکار کرو۔ (قہقہہ) اور اسے شکار نہ کیا جائے تو کچھ ناراضگی ہو جائے۔۔۔ یا سرگرمی باقی نہ رہے۔

کہار پاشی: اب تک آپ نے کتنے ادیبوں اور شاعروں کے خاکے لکھے؟

مجتبیٰ حسین: میرا ایسا خیال ہے کہ ابتک کوئی پچاس سے زیادہ خاکے لکھے ہیں۔ اب میرے دو مجموعے آچکے ہیں

کہار پاشی: باقی کتنے شاعر اور ادیب بچے ہیں جن پر آپ کو خاکے لکھنے ہیں؟

مجتبیٰ حسین: کہار صاحب آپ تو جانتے ہیں کہ اُردو میں شاعر۔۔۔ ہر شہر میں (۵۰۰) (۶۰۰) سے کم تو ہوتے نہیں۔ (قہقہہ) مگر میں نے حتی الامکان کوشش یہ کی کہ ان ہی لوگوں کے بارے میں لکھوں جن کو میں جانتا ہوں بعض محفلوں کے لئے لکھے ہیں میں نے ضرور۔۔۔ وہ میں اپنی کتاب میں شامل نہیں کرتا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ وہ میں نے وقتی طور پر کسی خاص ضرورت کے تحت، کسی تقاضے کی بنیاد پر لکھے ہیں۔

محمود سعیدی: اچھا مجتبیٰ صاحب! دلّی کی حد تک تو میں جانتا ہوں، وہ بھی نواح دِلّی۔۔۔ کہ شاید ہی کوئی ایسی ادبی محفل، شعری نشست اور شعر و ادب سے متعلق کوئی جلسہ، کوئی ہنگامہ ہو، جہاں آپ موجود نہ ہوں۔ بالعموم آپ بڑی مستعدی کے ساتھ اس طرح کی تقریبات میں شرکت کرتے ہیں اور ماشاءاللہ۔ آپ کے لکھنے کی رفتار بھی جو ہے وہ میں سمجھتا ہوں کہ معصروں میں کوئی ایسا نہیں ہے جو آپ کا مدِمقابل کہا جائے۔ سوائے فکر تونسوی مرحوم کے۔ وہ تو ظاہر ہے کہ آپ سے سینیئر تھے۔ اس کے ساتھ آپ بہت ذمہّ داری۔۔۔

کہار پاشی: اچھا رفتار کی بات آگئی تو ایک جملہ۔۔۔۔

محمود سعیدی: پہلے میری بات ختم ہونے دی جائے۔ میری مراد یہ تھی کہ گویا شعر و ادب سے جو متعلقات ہیں یا ر باشی کی محفلیں، ان میں بھی آپ دیر گئے یعنی ایک ایک دو دو بجے تک شریک رہے ہیں۔ اس کے بعد یہ ہے کہ آپ ایک انتہائی ذمہ دار ادارے میں کام کر رہے ہیں۔

کہار پاشی: یہ ذمہ دارانہ پہلو بھی آنا چاہیئے۔

محمود سعیدی: میں نے کسی آدمی کو آپ کے دفتری معاملات سے متعلق آج تک شاکی نہیں پایا۔ تو وہ کونسا نسخہ کیمیاء ہے آپ کے پاس۔ اتنے مختلف النوع کام جو ہیں، آپ اتنی خوش اسلوبی کے ساتھ کس طرح انجام دے لیتے ہیں۔ ذرا سا بتائیے آپ؟

مجتبیٰ حسین: محمود صاحب! ایک تو میرے معمولات میں یہ ہے کہ دوستوں کی محفلوں کے بناء تو میں رہ بھی نہیں سکتا۔ یعنی سوشیل بیئنگ SOCIAL BEING کی حیثیت سے سماجی تقاضے بھی ہیں اور دوست

احباب کی محفلیں بھی ۔ ایک تو یہ کہ مجھے میری عادت سی بنی ہوئی ہے کہ یہ بھی جاری ہے اور لکھنا پڑھنا بھی جاری ہے ۔ اور میں راتوں میں کبھی کبھی ایک دو بجے بھی واپس ہوتا ہوں مگر صبح ضرور (۵) بجے جاگ جاتا ہوں۔ لکھنے کا کام زیادہ تر صبح ہی ہوتا ہے ۔ صبح کے وقت ہی میں لکھتا ہوں ۔

محمود سعیدی : یہ تو جوش ملیح آبادی بھی کیا کرتے تھے ۔

مجتبیٰ حسین : زیادہ تر صبح ۵ بجے اُٹھ کر تھوڑی سی واک کر لی ، اور ناشتہ کیا ۔ ویسے لکھنے کے لئے میں کسی خاص وقت کا پابند بھی نہیں ہوں مگر کوشش بھی یہ کرتا ہوں کہ زیادہ تر صبح ہی میں لکھ لیا جائے ۔ اسکے بعد دفتر کے اوقات میں مجھے آپ نے کبھی باہر نہیں دیکھا ہوگا بہت کم ـــــ جو میرے دفتری فرائض ہیں ، ان کو انجام دینا میں ضروری سمجھتا ہوں ۔ ایک تو اسکی وجہ یہ بھی ہے شاید کہ میرا دفتر دہلی میں کچھ ایسی جگہ ہے جہاں بہت کم ادیب پہنچ پاتے ہیں اور میں بھی وہاں سے نکل پاتا ۔

کمار پاشی : ویسے لکھتے تو آپ صبح ہیں ، لیکن دفتر سے نکلنے کے بعد کیا کرتے ہیں ۔

مجتبیٰ حسین : دفتر سے نکلنے کے بعد تو دوستوں کی محفلیں ہیں اور سارے احباب ـــــ

کچھ وقفے کے بعد

محمود سعیدی : آئیے جناب زبیر صاحب ! آپ کا بہت انتظار رہا ۔ ہم لوگ یہاں ایک گھنٹے سے بیٹھے ہوئے گفتگو کر رہے ہیں ۔ خیال یہ تھا کہ آپ کوئی پندرہ بیس منٹ میں اس گفتگو میں شریک ہوجائیں گے ۔ ظاہر ہے کہ دفتری مصروفیات نے آپ کا دامن کھینچا اور آپ رُک گئے ۔

مجتبیٰ حسین : اور بات بھی دفتری مصروفیت کی چل رہی ہے ۔

محمود سعیدی : بات اس وقت یہی چل رہی تھی کہ مجتبیٰ حسین صاحب ، اتنی مختلف النوع سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اپنی دفتری مصروفیات خوش اسلوبی کے ساتھ کس طرح نبھا لیتے ہیں ۔ حالانکہ ہم میں سے ہر آدمی کرتا ہے ۔ لیکن شاید ہم میں سے ہر ایک کا طریقہ الگ ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ صبح ۵ بجے اُٹھ جاتے ہیں اور پھر ـــــ دفتر ـــــ ان کی جو دفتری کامیابی ہے ان میں ، میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایک بڑی کامیابی اُردو کی جو نصابی کتابیں ان کی اشاعت اور باقاعدہ تقسیم ، جو ، اب عمل میں آرہی ہے ۔ بالخصوص تقسیم کا مسئلہ تو بہت اُلجھا ہوا تھا ـــــ پیچیدہ تھا ۔

کمار پاشی : میں سمجھتا ہوں کہ اس کے بارے میں تفصیل سے مجتبیٰ صاحب ہی کچھ بتائیں ۔

مجتبیٰ حسین : جی ہاں ۔ یہ پہلو رہ گیا تھا ۔ محمود صاحب نے اس کی طرف اشارہ کیا ۔ ظاہر ہے دفتری مصروفیات کی بات چل رہی ہے ، صحیح بات تو یہ ہے کہ میں نے زبیر کو بھی اسی طرح کی مصروفیات میں دیکھا ۔ زبیر اپنے فرائض منصبی کا کچھ زیادہ ہی خیال رکھتے ہیں ۔ دراصل محمود صاحب ۔ میں جب سیاست اخبار میں کام کرتا تھا مجھے یاد ہے کہ بارہ (۱۲) چودہ گھنٹے کام کرتا تھا ۔ اور انتخاب پریس جو سیاست کا ہے اس کا میں جنرل منیجر بھی رہا ، اور میں نے اس بات کا خیال رکھا کہ دفتر کا کام جس سے روزی روٹی چلتی ہے ، پوری ذمہ داری سے کیا جائے ۔ اُردو کا ادیب کوئی ۲۴ گھنٹے کا ادیب تو ہو نہیں سکتا ۔ اسے کہیں نہ کہیں کام کرنا ہی ہے ۔ اس اعتبار سے ہمیشہ میں نے پیشے کی جو ذمہ داریاں ہیں ان کو نبھانے کی کوشش کی ۔ ایسے ہی این سی ای آر ٹی NCERT پورا اس کی کتابوں کی بات آپ نے کی ۔ میں آپ کو بتا دوں یہ کوئی خودستائی والی بات نہیں ہے ۔

میں میں نے این سی ای آر ٹی کو جوائن JOIN کیا تھا۔ کونسل نے یہ فیصلہ کیا کہ اُردو کی نصابی کتابیں بھی شائع کی جائیں۔ اس سے پہلے دو چار لوگوں کا انتخاب اس کام کیلئے ہوا بھی تھا، کچھ عرصہ تک یہ کام بھی کرتے رہے۔

بہار پاشی : آپ کے جائن کرنے سے پہلے وہاں اُردو نصابی کتابوں کا کام نہیں ہوا تھا ؟

مجتبیٰ حسین : نہیں اُردو کتابیں شائع نہیں ہوئی تھیں۔ مجھے ذمہ داری سونپی گئی تو میں نے اسے ایک فرض سمجھا زبان کی خدمت اور خاص طور پر یہ محسوس کیا کہ رائٹر تو ہوں ہی، جہاں پڑھا جاتا ہے پڑھا جاؤں گا۔ لیکن جب تک زبان نہیں چلتی رہے گی نصابی کتابوں کی صورت میں۔ اور طالب علموں کے پاس کتابیں نہیں پہنچیں گی تو۔ یہ سب بے سود رہے گا۔ تو میں نے بہت DEDICATEDLY اس کام کو اپنایا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ یہ بھی میرے لئے ایک چیلنج تھا۔ ابھی زبیر کے آنے سے پہلے یہ بات چلی تھی۔ مزاح نگاری بھی میرے لئے ایک چیلنج تھی اور یہ کام بھی میرے لئے ایک چیلنج تھا۔ جب مجھے پتہ چلا کہ نصابی کتابیں اُردو میں بھی چھپتی ہیں اور کسی قومی ایجنسی نے یہ کام نہیں سنبھالا۔ میں نے یہ سوچا کہ قومی سطح پر یہ کام ہو جائے تو بہت بڑی بات ہوگی۔ تو میں نے بہت ہی ایمانداری کے ساتھ اور بڑا DEDICATEDLY اس کام کو شروع کیا۔ میرے ساتھ مظفر حنفی تھے۔ پروڈکشن اسسٹنٹ کی حیثیت سے۔ کتابوں کی تیاری کی ذمہ داری ان کی تھی اور ادارت میری ذمہ تھی۔ ترقی اُردو بورڈ سے ان کا ترجمہ ہوتا تھا۔ تو کچھ عرصہ کے اندر میں نے اس کام کو بہت پھیلایا کچھ میرے عہدہ داروں کا تعاون بھی میرے ساتھ رہا۔ ان کی سرپرستی مجھے ملی۔ کچھ ہی عرصہ کے اندر ساری کتابوں کا میں نے اُردو میں ترجمہ کروایا۔ ان کو چھپوایا۔ پانچ چھ سال کے اندر ــــ اور ظاہر ہے کہ میں کسی سے کہتا بھی نہیں کہ میں NCERT میں کام کرتا ہوں۔ باہر بہت کم لوگوں کو پتہ ہے۔ پہلے یہ کتابیں ہزار دو ہزار کی تعداد میں چھپتی تھیں۔ پھر کچھ ریاستی حکومتوں نے اپنے یہاں انہیں PRESCRIBE کرنے پر سوچا۔ شروعات کی سب سے پہلے حکومت جموں و کشمیر نے۔ کیونکہ ان کے پاس طباعت و اشاعت کی سہولتیں نہیں تھیں۔ تو یہ کام بھی انہوں نے ہمیں سونپا۔ آپ حیرت کریں گے کہ پہلے جو کتاب ہزار دو ہزار کی تعداد میں چھپتی تھی، بعد میں وہ ایک لاکھ ڈیڑھ لاکھ کی تعداد میں چھپنے لگی۔

بہار پاشی : آپ کس جماعت تک کی کتابیں چھاپتے رہے ؟

مجتبیٰ حسین : ہم لوگ پہلی سے بارہویں جماعت تک کی کتابیں چھاپتے رہے۔ اگرچہ کہ کشمیر کی حکومت نے آٹھویں جماعت تک کی کتابیں ہماری وہاں لگائیں۔ اب بعد میں بھی وہ لگائے جا رہے ہیں۔ اور ہم نے یہ کام شروع کیا تھا اس طرح کہ دلی اور آس پاس کے علاقوں کی کتابیں چھاپی جائیں۔ ۔ ۔

بہار پاشی : ان میں کون کون سے مضامین شامل کرتے ہیں ؟

مجتبیٰ حسین : سارے مضامین۔ شہریت۔ تاریخ۔ جغرافیہ۔ کیمسٹری۔ فزکس۔ سائنس کی ساری کتابیں۔ جن جن موضوعات پر ہیں وہ سبھی اُردو میں منتقل ہوئیں۔ اور یہ بھی میں بتا تا چلوں کہ میں نے یہ کوئی بڑا کام وام نہیں کیا ہے بلکہ ایک فرض نبھایا ہے۔ اُردو ادیب کی حیثیت سے زبان کے تئیں میری جو ذمہ داری تھی۔

بہار پاشی : بہت بڑا کام کیا ہے!

مجتبیٰ حسین : اب چونکہ اس کے ڈسٹری بیوشن کا بھی مسئلہ تھا۔ پہلے تو ہمارے نیشنل ڈسٹری بیوٹر، پبلیکیشنز ڈویژن

والے رہے۔ اب ہم نے یہ کام اُردو اکاڈمی دہلی کے حوالے کیا ہے۔ اور یہ کام اس نے اس خوش اسلوبی سے سنبھالا ہے کہ مجھے حیرت اور مسرت ہوتی ہے اور یہ بڑا کارنامہ ہے اُردو اکاڈمی کا کہ اب ہماری کتابوں کی sale سیل دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے۔ اور یہ کتابیں اب کئی ریاستی حکومتوں نے اپنے ہاں لگائی ہیں جیسے بہار ـــ اور علیگڑھ میں ہماری کتابیں چل رہی ہیں۔

کمار پاشی: یہ کتابیں مفت بانٹی گئیں یا ـــ ؟

مجتبیٰ حسین: نہیں ـــ نہیں۔ خریدی گئیں۔ یعنی بکتی ہیں.....

مخمور سعیدی: میں آپ کو بتاؤں کہ اُردو اکاڈمی سے یہ کام خوش اسلوبی سے ہو رہا ہے۔ پہلے تو یہ ہوتا ہے تھا کہ اکاڈمی باہر کی کتابیں نہیں رکھتی تھی۔ صرف اپنی ہی کتابوں کا سیل ہوتا تھا۔ جب سے NCERT کی کتابیں وہاں سیل ہونی شروع ہوئی ہیں، تو مانگ بڑھ گئی اور پہلے جو ذریعہ تقسیم تھا اس میں پتہ نہیں کیا کمی کوئی گڑبڑ تھی کہ انہیں لوگ حاصل نہ کر پائے تھے۔

مجتبیٰ حسین: بہرحال اُردو کی خدمت کا مجھے موقع ملا۔

مخمور سعیدی: اس کا کریڈٹ تو میں سمجھتا ہوں کہ مجتبیٰ ـــــ

زبیر رضوی: این سی ای آر ٹی کی بات تو مخمور صاحب، آپ نے کرلی۔ بھئی مجتبیٰ سے ہماری ملاقات کا سلسلہ بہت پرانا ہے اور ملاقاتوں کا سلسلہ بھی کئی سطحوں پر ہے۔ حیدرآباد میں مجتبیٰ حسین سے میری ملاقات اس حوالے سے ہوئی تھی کہ یہ محبوب صاحب کے چھوٹے بھائی ہیں۔ محبوب صاحب کا ظاہر ہے کہ صحافت سے تعلق بہت زیادہ ہے اور دوسرا نام جو حیدرآباد نے نثر اور طنز کی سطح پر پیدا کیا وہ ابراہیم جلیس ہی تھا۔ اُن کی کتاب "چالیس کروڑ بھکاری" بہت مقبول بھی ہوئی تھی۔ میں مجتبیٰ حسین سے صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ مجتبیٰ کے لکھنے پڑھنے کا یہ پس منظر تھا۔ بڑے بھائی کے ہاں صحافت تھی۔ چھوٹے بھائی کے پاس ادب تھا اور طنز تھا۔ بنیادی طور پر ابراہیم جلیس طنز نگار ہی تھے۔ تو اس ماحول نے مجتبیٰ کی ذہنی تربیت میں یقیناً بڑا رول ادا کیا ہے۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ مجتبیٰ کے ہاں ایک دوسرا جو امتزاج پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ یہ طنز کے ساتھ ساتھ مزاح نگار بھی ہیں۔ جو ابراہیم جلیس کے یہاں نہیں ہے۔ اچھے ان دونوں کا امتزاج بڑا مشکل ہے۔ یا تو ہمارے یہاں طنز نگار ہوتے ہیں۔ یا مزاح نگار۔ مزاح اور طنز کی دو دھاری تلوار کو تخلیقی ہتھیار کی طرح استعمال کرنا اور اسکو پوری طرح نشانہ پہ بٹھانا اور وار سیدھا ڈالنا وہ میں سمجھتا ہوں کہ دوسروں کو بہت کم نصیب ہوا۔ تو مجتبیٰ حسین سے میری یہ پہلی جانکاری تھی، میں یہ جاننا چاہوں گا کہ وہ جو ماحول ان کو ملا تھا اس کا اثر ان پر کیسا ہوا؟

مجتبیٰ حسین: جیسے کہ آپ کے آنے سے پہلے یہ بات ہو رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ اپنے خاندان سے میں نے یہ INSPIRATION انسپریشن تو حاصل کی تھی۔ میں متاثر تو ہوا۔ ان دونوں بڑے بھائیوں کی تحریروں اور ان کی سرگرمی سے ـــ خاص طور پر ابراہیم جلیس سے اُن کے مضامین سے۔ میں نے ان سے یہ سب کچھ حاصل تو کیا ہے ایک ذہنی تربیت تو رہی ہے ادب سے ناطہ ادب سے رشتہ... بلکہ ادب کی زندگی جینے اس زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی کا ماحول بھی رہا ہے۔ آپ کے آنے سے پہلے یہی بات ہو رہی تھی

اس زمانہ میں چونکہ لکھنے پڑھنے کا ماحول تھا۔ ہمارے یہاں کتابیں اور رسالے آتے تھے۔ انہیں ہم پڑھا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ فطری طور پر ادب کی طرف رجحان تو میرا رہا ہی۔ باضابطہ طور پر لکھنا میں نے بہت بعد میں شروع کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ کالج کے میگزین کیلئے کبھی کچھ لکھ لیا گر۔ بحولیشن کرنے کے بہت عرصہ بعد میں نے لکھنا پڑھنا شروع کیا۔ ایک صحافی کے طور پر میں نے اپنی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ صحافی کے طور پر کہ۔ ایڈیٹنگ کرنی ہے۔ ترجمے کرنے ہیں۔ اس حد تک ہی میرا کام تھا۔ مگر جیسے میں نے ابھی بتایا کہ سنہ ۱۹۶۲ء سے خاص طور پر مجھے مزاح نگاری کے میدان میں آنا پڑا۔

محمود سعیدی: زبیدہ صاحبہ! ایک سوال ہم نے آپ کی آمد تک روکا تھا۔ اگر مجتبیٰ حسین اجازت دیں تو میں سمجھتا ہوں کہ اس سلسلہ کی گفتگو آپ سے بہتر ہم میں سے شاید کوئی نہیں کر سکتا۔ ــــ ظاہر ہے کہ سب کی زندگی میں کچھ جذباتی لمحات بھی آتے ہیں۔ اور جب ہم اُن لمحات سے گزرتے ہیں تو ان کے نقوش بھی ہمارے ذہنوں پر مُرتسم رہ جاتے ہیں۔ مجتبیٰ صاحب جیسا کہ آپ نے کہا آپ کے بھی دوست ہیں۔ میرے بھی دوست ہیں اور پاشی صاحب کے بھی دوست ہیں۔ ہم سب ان کی عادات سے بھی واقف ہیں۔ ان کے حالات سے بھی واقف ہیں۔ حالت یہ کہ ــــ (مشترکہ قہقہہ) تو ہم ان کی حیاتِ معاشقہ کے بارے میں پوچھیں۔ اگر یہ پوچھنا نامناسب نہ ہو، تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی ایک ایسا موضوع ہے جس کے بغیر شاید مجتبیٰ حسین صاحب سے انٹرویو مکمل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے بھی کہ اس کی گواہی میں کچھ پکی سیاہی میں کاغذ پر چھپا ہوا بھی ہمارے سامنے موجود ہے؟

کمار پاشی: ایسا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ بہت مروتوں کے آدمی ہیں مجتبیٰ صاحب!

زبیدہ رضوی: میرا خیال ہے کہ مجتبیٰ صاحب کا ہی یہ مسئلہ نہیں ہے یہ سبھی کا مسئلہ ہے۔ ــــ ہم سب کا مسئلہ ہے۔ ہم سب کا ــــ

محمود سعیدی: نہیں نہیں ــ مجتبیٰ صاحب کا جہاں تک تعلق ہے اس سلسلہ میں جیسا کہ میں نے آپ سے عرض کیا کہ پکی روشنائی میں کاغذ پر چھپی ہوئی کچھ شہادتیں ہمارے سامنے موجود ہیں ۔ ۔ ۔ اور ــــ

زبیدہ رضوی: اس کے لئے کسی شہادت کی ضرورت نہیں ۔ ۔ ۔

کمار پاشی، نہیں ــــ ہر ادیب و شاعر کے بارے میں پکی روشنائی کی شہادتیں مل جائیں گی۔

محمود سعیدی: کیا یہ گوشہ تشنہ چھوڑ دیا جائے ۔ ۔ ۔

زبیدہ رضوی: ہر ادیب کی زندگی میں اس قسم کے انسانی رشتے ۔ ۔ ۔ ۔

محمود سعیدی: وہ تو خیر ــ اگر وہ انسانی رشتے اس کے اندازِ فکر پر کوئی نہ کوئی نقش چھوڑیں تو ان سے ہمیں واقف ہونے ۔ ۔ ۔ ویسے اصل میں یہ ہے کہ جیسے کہ شرت چندر کا واقعہ ہے کہ ــ ٹیگور نے ان سے پوچھا کہ تمہاری جوانی کے دن کیسے گذرے؟ تو انہوں نے کہا گرو دیو! مجھے اگر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ یہ سوال بھی کریں گے تو میں جوانی کسی مختلف طریقے سے گزارتا۔ (ہا ــــ ہا ــــ ہا ــ)

مجتبیٰ حسین: وہ تو ہے ہی ــ یہ سوال کر کے آپ نے مجھے ۔ ۔ ۔

زبیدہ رضوی: اس میں مسئلہ کیا ہے۔ بھئی اصل میں آپ نے حیاتِ معاشقہ اور یہ سب لفظ استعمال کئے ہیں۔ میرے

نزدیک۔ نہ میں اسکو معاشقہ کہتا ہوں۔ اور نہ ــــ ؟ یہ صرف انسانی رشتے ہیں۔ انسان کی سطحوں پر۔۔۔۔

محمود سعیدی: کئی انسانی رشتے ہیں۔ ہم نے رشتوں کے نام رکھے ہوئے ہیں۔

زبیر رضوی: رشتوں کے دھاگے بھی مختلف ہیں۔ اور یہ فینامینا (PHENOMENA) جو ہے ناکسی اُردو ادیب و شاعر تک نہیں ہے۔ یہ ساری دنیا کے ساتھ۔۔۔۔ میرا اپنا یہ خیال ہے محمود صاحب پتہ نہیں آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں یا نہیں۔ جس قسم کے انسانی رشتوں کی بات آپ کر رہے ہیں۔ اور جس قسم کے انسانی رشتوں کے کریدنے کی کوشش آپ مجتبیٰ حسین کی زندگی میں کرنا چاہ رہے ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ امنا (RELAMENT) آپ کی تحقیق سے ہوتا نہیں۔ کیا ہے کہ وہ کبھی کبھی ہمارے یہاں ایک سرگرمی کے طور پر۔۔۔۔

محمود سعیدی: دیکھئے۔ زبیر صاحب! میں (BASICALLY) آپ کے اس خیال سے اختلاف کرتا ہوں کہ ان رشتوں کا ہماری تخلیقی سرگرمیوں سے کوئی نہ کوئی تعلق ہوتا ہے۔۔۔

زبیر رضوی: اصل میں محمود صاحب! آپ کا سوال اسپیسی فِک (SPACEFIC) نہیں ہے۔ میں اسلئے کہہ رہا ہوں کہ انسانی رشتے بہت سے اس قسم کے ہوتے ہیں، جو صرف سرگرمی کے طور پر اپنائے جاتے ہیں۔ اچھا ان میں سے کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں۔ جو دور تک ہماری زندگی میں جاتے ہیں۔

کمار پاشی: زبیر صاحب ان رشتوں کا ذکر ان کی تحریروں میں کہیں بھی نظر آتا۔ تب تو ہم ان سے پوچھ سکتے ہیں کہ ان رشتوں کی تفصیل سے ہمیں بھی آگاہ کریں۔

محمود سعیدی: میں یہی جاننا چاہتا ہوں۔

زبیر رضوی: میرا خیال ہے ڈائرکٹ DIRECT سوال ہم ان سے کرلیں۔ بغیر کسی تمہید کے میں اپنی تمہید مختصر کرتا ہوں۔

محمود سعیدی: میں یہ کہتا ہوں کہ نسوانی رشتوں کی آپ کی زندگی میں کیا اہمیت ہے؟

مجتبیٰ حسین: میرے نزدیک تو بہت بڑی اہمیت ہے۔ ہماری زندگی میں سرشاری کے اور خوشی کے جو لمحے آتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ۔ بقول آپ کے "حیاتِ معاشقہ" میں دکھ کے رشتے یعنی لمحے بھی ساتھ آتے ہیں۔ ایسا تھوڑے ہی ہے کہ سب خوشی کے ــــ

زبیر رضوی: پرابلم یہ ہے مجتبیٰ صاحب کہ آپ نے اب تک جتنے خاکے لکھے ہیں ان میں کوئی خاتون نہیں ہے۔ (قہقہہ) جبکہ آپ کے ہاں انسانی روابط میں نسوانی رشتے بھی موجود ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ کسی بھی خاتون ادیب یا کسی بھی ایسے کیریکٹر پہ جو نسوانی ہو۔ آپ نے خاکہ نہیں لکھا۔ جبکہ آپکی زندگی میں بہت اچھے نسوانی ادیب بھی آئے ہیں۔ بہت سی دوسری چیزیں آئی ہیں۔

محمود سعیدی: میں تو یہیں تک لانا چاہتا تھا۔

زبیر رضوی: اسکی ایک مثال میں بتاتا ہوں۔ منوکھنڈاری ہیں۔ ہندی کی رائٹر۔ ان کے یہاں نسوانی کردار بہت زیادہ ہیں اسکی وجہ کیا ہے! آپ کے ہاں عموماً زندگی میں جو آپ بہار ان آنکھوں کے سامنے اور سورج کی روشنی میں گذارتے ہیں، وہ زندگی جو شبستانی کی زندگی ہے ــــ دونوں زندگی

میں آپ کے ہاں نسوانی رشتے بہر حال اپنی اہمیت رکھتے ہیں۔ کہیں آپ یا تو اپنے آپ کو ایکسپوز EXPOSE نہیں کرنا چاہتے۔ یا یہ کہ آپ ڈرتے ہوں۔

مجتبیٰ حسین: ڈرنے والی بات تو خیر نہیں ہے۔ زبیر صاحب! لیکن یہ کہ میں بعض رشتوں کو بہت عزیز رکھتا ہوں۔

زبیر رضوی: آپ چاہتے ہیں کہ دوسرے رہتے سے غیر کو کیوں تیر آگھر ملے؟

مجتبیٰ حسین: (قہقہہ) جی ہاں، جی ہاں — میں یہ نہیں چاہتا کہ۔۔۔ اگر میں اظہار بھی کروں کسی طرح اور اس کے کوئی غلط معنی لئے جائیں —

زبیر رضوی: سیدھی بات ہے۔ ہمارا معاشرہ جو ہے وہ نسوانی رشتوں کے تذکرے یا انکی تشہیر کی اجازت نہیں دیتا۔ اسی لئے جوش صاحب کو اپنی یادوں کی بارات میں یہ بات لکھنی پڑی کہ ا — ب — ب — ت — اور انہوں نے ان کے نام نہیں لئے تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ جب۔۔۔۔

محمود سعیدی: مطلب، ان رشتوں کا وجود تو ہے۔

مجتبیٰ حسین: وجود تو رہا ہے۔

زبیر رضوی: ظاہر ہے کہ رہا — اور — روی شنکر نے جب اپنی یادداشت لکھی۔۔۔ (مسلسل شور و غل)۔۔ دیکھئے ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی ہے۔۔۔ کہ روی شنکر نے اپنی بایوگرافی کا آغاز اس طرح کیا ہے کہ ہندوستان میں جب ذرا کسی کو شہرت مل جاتی ہے، کوئی مشہور ہو جاتا ہے تو ہندوستانی قوم اس کا اس طرح احترام شروع کر دیتی ہے کہ اس کا نچلا دھڑ کاٹ دیتی ہے۔۔۔ کہ وہ انسان ہی نہیں رہتا۔ دیوتا ہو جاتا ہے۔ یعنی اسے یہ قوم مہاتما بنا دیتی ہے۔۔۔۔۔ (قہقہہ)

محمود سعیدی: میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ جوش صاحب کے یہاں الف۔ ب۔ ت سے آغاز ہوا۔ آپ کے ہاں ان رشتوں کا آغاز کس حرف سے ہوا۔ یہ ذرا آپ بتائیں —

مجتبیٰ حسین: نہیں۔ میں سمجھتا ہوں۔

زبیر رضوی: اس سے کچھ فرق نہیں پڑنے والا ہے۔ بھئی مجتبیٰ صاحب! آپ کی ادبی زندگی اور تخلیقی سرگرمیاں ایک طرف۔ جیسا کہ آپ کا خاکہ لکھتے ہوئے میں نے لکھا تھا کہ اگر آپ ایک مہینے کی چھٹی لے کر دلی سے باہر جائیں۔ اور آپ یہ جاننا چاہیں کہ پچھلے ایک مہینے میں دہلی میں کیا ہوا ہے؟ تو آپ مجتبیٰ حسین کو ٹیلیفون کر لیجئے اور مجتبیٰ سے یہ پوری روداد آپ کو معلوم ہو جائے گی۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا ان سے، میرا خیال ہے کہ جتنے ادیب دلی میں ہیں ان سب میں ایک ادبی تجسس جس کو ہم کہتے ہیں۔ یعنی ادبی دائریہ ہم کہتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے یہاں ادبی الائنمنٹ ہوتے ہیں۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ اس پوری دلی کی اور ہندوستان کی جو اُردو کی ادبی پالیٹکس ہے اس میں تمھارا اپنا بھی ایک رول رہتا ہے۔ اور میرا اپنا خیال یہ ہے کہ تمہیں ذاتی طور پر بھی ان باتوں میں دلچسپی ہے۔ تمھارے مزاج سے یہ بات قریب لگتی ہے کہ کبھی جب تک تمہیں یہ نہ معلوم ہو کہ کون کہاں جا رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے؟ کیسے جا رہا ہے اس

سا کس مجلس میں کیسے PARTICIPATION ہوا؟ یا وہ اسائنمنٹ کس آدمی کو کیسے ملا؟ تمہارا کیا رول تھا؟ کمار پاشی یا مخمور سعیدی کا کیا رول تھا؟ جتنی DEPTH میں جا کر تم جانکاری کرتے ہو۔ کوئی دوسرا نہیں کرتا۔ اسکی کوئی وجہ ــــ؟

مجتبیٰ حسین: اسکی کوئی وجہ میرے اپنے ذاتی مفاد کے سلسلہ میں کبھی نہیں۔ صرف ایک CURIOCITY ایک تجسس سا جذبہ کہ بھئی کون کیا کر رہا ہے؟ کس منزل پر ــ کس سطح پر؟ چونکہ میں ایک سماجی سطح پر جینا چاہتا ہوں INVOLVE ہو کے جینا چاہتا ہوں۔ ایک بات تو زبیر نے ٹھیک کہی کہ بہت سی اطلاعیں مجھے مل جاتی ہیں کہ کون کہاں جا رہا ہے؟ کون کدھر ہے؟ تو اس میں میرا دخل صرف اتنا ہی ہوتا ہے۔۔۔ میں بہت سوں کا دوست ہوں۔ بہت سے دوستوں کا دوست ہوں۔ اور ایسے بھی دوست، جو ہو سکتا ہے کمار پاشی کو ناپسند کرتے ہوں یا زبیر رضوی کو بھی۔۔۔ مگر یہ کہ میں ان سب میں ایک خاموش تماشائی کی حیثیت سے۔۔۔

کمار پاشی: لیکن یہ بھی دیکھا گیا ہے اکثر دیکھا گیا ہے کہ کسی دوست کی کمزوری آپ کے ہاتھ لگ جائے تو آپ بہت محظوظ ہوتے ہیں۔ بہت خوش ہوتے ہیں۔ اور پھیلا دیتے ہیں۔ مزے لے لے کر سناتے ہیں۔۔۔

مجتبیٰ حسین: نہیں۔۔ وہ تو میں۔۔۔۔

زبیر رضوی: میرا سوال بڑا SPECIFIC ہے۔ ان کے بارے میں، جو ان کی نیچر سے متعلق ہے ــ یہ نہیں کہ ان کی دلچسپیاں نثر نگار سے متعلق ہیں۔ مزاح نگاروں سے متعلق ہیں، ان کی دلچسپیاں نقاد سے متعلق بھی ہیں۔ شاعر سے متعلق ہیں۔

مخمور سعیدی: حتیٰ کہ محقق سے متعلق ہیں۔۔۔۔

زبیر رضوی: ہاں محقق سے متعلق ہیں۔۔۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ تم کو جو PLEASURE پلیژر ملتا ہے کسی چیز کو DISCOVER ڈسکور کرنے میں ــ جس کو ہم کہتے INVESTIGATIVE REPORTING ہیں ــ (قہقہہ) تمہارے ہاں یہ بہت ہے مثلاً تم اس DEPTH میں جاؤ گے کہ کمار پاشی پچھلے دنوں لندن گئے تھے تو کیسے گئے تھے۔ کس نے بلایا تھا؟ کیوں گئے تھے؟ اس کے پیچھے کیا محرک تھا؟ ٹکٹ کس نے خریدا۔ اور ــــ کمار پاشی جب ایئرپورٹ گئے تھے تو کس گاڑی میں گئے تھے۔ اس معاملہ میں تمہارے علاوہ دہلی میں مجھے کوئی آدمی نہیں ملتا۔ ایک آدمی ملتا ہے اس کا نام نہیں لوں گا۔

مجتبیٰ حسین: اس میں یہ ہے کہ میرا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ میرے دوست احباب کا جو حلقہ۔۔۔۔

زبیر رضوی: تم اس سے پلیژر حاصل کرتے ہو۔ میرا مطلب یہ کہ مزا آتا ہے تمہیں۔ اس میں۔

مجتبیٰ حسین: (قہقہہ) تھوڑا آتا ہی ہے۔ کیونکہ دوستوں کے بارے میں سن کر کہ کون کہاں جا رہا ہے، کس طرح جا رہا ہے۔ یہ سن کر ــ

زبیر رضوی: یعنی جو تمہارے قریب ترین دوست ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں تم آلو پسٹی گیٹیو رپورٹ کر کے اپنے دوسرے دوستوں کو سناتے ہو۔

مجتبیٰ حسین: ظاہر ہے کہ اس میں کچھ مبالغہ بھی ہوتا ہے ----

زبیدہ رضوی: لیکن مبالغہ۔ وہ تو میں نے تمہارے بارے میں لکھا تھا (قہقہہ) کہ مجتبیٰ حسین جب کمار پاشی زبیدہ رضوی کے بارے میں یا حامد اکمل کے بارے میں کوئی خبر سنا رہے ہوں۔ تو اس کو آپ کو چاہیئے ۷۵٪ REDUCE کر لیجئے۔ اور ۲۵٪ آپ سمجھ لیجئے کہ اس میں مجتبیٰ نے صحیح کہی ہے۔ صرف ۲۵٪۔ اور ۷۵٪ بڑھا کر جو تم مبالغہ کرتے ہو، اس میں تمہیں جو لطف آتا ہے، وہ میں جاننا چاہتا ہوں کہ آخر کیا ہے؟

مجتبیٰ حسین: وہ یہ ہے زبیدہ کہ! میں دوستوں کا رسیا ہوں۔ دوستوں کے بیچ جیتا ہوں۔ دوستوں کے اندر جیتا ہوں۔ اور دوست مجھے چاہتے ہیں۔ اور آپ حیرت کریں گے کہ ایسی ایسی محفلوں میں، جو نہایت ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔ لوگ میری وجہ سے جمع ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ انوسٹی گیٹیو رپورٹنگ اسے میں اسلئے نہیں کہتا کہ صبح میرا ٹیلیفون جتنا بزی BU-SY رہتا ہے (قہقہہ) کہ رات کہاں گزاری۔ کس نے گزاری۔ کئی دوستوں کی ایسی اطلاعیں آتی رہتی ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کمار پاشی! یہ بڑی سرپرستی بہت سے لوگوں کی کرتے رہتے ہیں۔ وہ شکایت کرے گا تو مجھ سے کرے گا۔ کمار پاشی سے نہیں کہے گا۔ میں چونکہ ملتا رہتا ہوں بہت دوستوں سے۔ اور بڑی قیمت بھی ادا کرتا ہوں۔ کہ شام میں کبھی اِدھر بھی نکلتا ہوں اُدھر بھی جاتا ہوں ---- میں انوسٹی گیٹیو رپورٹنگ ایسے نہیں کرتا۔

کمار پاشی: میرا خیال ہے مجتبیٰ صاحب! کہ یہ آپکی شخصیت کا انتہائی خطرناک پہلو ہے۔ اس سے بچ کر رہنا چاہیئے!

مجتبیٰ حسین: نہیں اس میں خطرناک پہلو بالکل نہیں ہے (اجتماعی قہقہہ) بلکہ میں چونکہ رشتوں کی سطح ایسی رکھتا ہوں کہ جس سے ملو تو اُسی کی طرح ملو، کہ بھئی وہ بھی تو ----

زبیدہ رضوی: ایک بات یہ اپنی جگہ ٹھیک ہے کہ آپ اس طرح ملیں۔ لیکن میں نے ایک چیز تم میں نہیں دیکھی۔ مثال کے طور پر تم ذاتی گفتگو میں AGITATE کروگے۔ پروٹسٹ PROTEST کروگے کہ یار یہ نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ فلاں آدمی وہاں چلا گیا۔ وہ DESERVE نہیں کرتا تھا۔ اس پالیٹکس میں فلاں آدمی یہ ہوگیا۔ وہ ہوگیا۔ لیکن جب ACTUAL وہ آدمی تمہارے سامنے آئے گا یا وہ سچویشن سامنے آئے گی تو میں نے یہ دیکھا کہ تم پروٹسٹ نہیں کرتے ---- COMPROMISING ATTITUDE تمہارا زیادہ ہوتا ہے۔

مجتبیٰ حسین: نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔

زبیدہ رضوی: اس وقت جو گفتگو کر رہا ہوں۔ تمہارے فن سے متعلق نہیں ہے۔ میں اس بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ پروٹسٹ اور ایجی ٹیٹ کرنے کا۔ دوسروں کو کسی مخصوص موقع پر ڈسکارڈ کرنے کا۔ کبھی کہیں ری وولٹ میں نے دیکھا ہے۔ ایسے INCIDENT ہیں جہاں میں نے دیکھا کہ تم نے ایک STAND اسٹینڈ لیا۔ بڑا وہ پریشان بھی ہوا تمہاری مخالفت سے۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ دیر پا تمہارے یہاں رہ نہیں پاتا۔

پتہ نہیں کیوں، جیسے ایک دم تم پگھل جاتے ہو!

مجتبیٰ حسین: نہیں! پگھلنے والی بات تو نہیں ہے۔ اسٹینڈ STAND تو میرا اپنی جگہ رہتا ہے۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ زوال پذیر معاشرہ ہمارا ہے، اُردو کا ـــ اس سے آپ انکار نہیں کریں گے میں جانتا ہوں کہ اس میں ....

محمود سعیدی: میں اس زوال پذیر کو اگر زوال یافتہ میں تبدیل کردوں تو ـــ کیا خیال ہے آپ کا؟ (قہقہہ)

زبیر رضوی: مجھے ان کے زوال پذیر۔ اور آپ کے زوال یافتہ دونوں سے اختلاف ہے۔۔ یہ تو DEFINE ڈی فائن کرنا پڑے گا کہ تم زوال پذیر کن معنوں میں استعمال کر رہے ہو۔

محمود سعیدی: زوال پذیر کا مطلب یہ ہے کہ زوال کی طرف جا رہا ہے۔

زبیر رضوی: بھئی! دیکھئے زبان جب تک بولی جاتی رہے گی.....

مجتبیٰ حسین: زبان کی نہیں میں معاشرہ کی بات کر رہا ہوں....

زبیر رضوی: معاشرہ۔ تو میں نہیں سمجھتا کہ زوال پذیر ہے۔۔

کمار پاشی: اصل بات ہوجائے مجتبیٰ صاحب! زبیر وہ پروٹسٹ والی بات ہوجائے پلیز؟

زبیر رضوی: انہیں اِرّی ٹیٹ IRRITATE کرنا ہے یار...

مجتبیٰ حسین: اِرّی ٹیٹ کرنے والی بات نہیں۔ میں قطعی نہیں ہوا۔ اِرّی ٹیٹ تو ہو ہی نہیں سکتا۔

کمار پاشی: میں نے بہت کم اِرّی ٹیٹ ہوتے دیکھا ہے مجتبیٰ صاحب کو ـــ مجتبیٰ کو ہم نے ایک مصلحتوں کا آدمی پایا ہے۔

مجتبیٰ حسین: نہیں! مصلحتوں کا نہیں یار ـــ میں ایک تماشائی ہوں۔

زبیر رضوی: مگر ایک بات، آپ ان تماشائیوں میں ہیں کہ جب آپ یہ دیکھتے ہیں کہ ایک ایکٹر اپنا کردار پورا کرنے کے قابل نہیں ہو رہا ہے تو آپ اسٹیج پر پہنچتے ہیں۔ اس سے کہتے ہیں کہ تو ہٹ جا۔ تجھ سے تیرا کردار پورا ادا نہیں ہو رہا ہے تو آرام کر۔ میں باقی کردار تیرا ادا کر دیتا ہوں....

مجتبیٰ حسین: نہیں۔ ویسا بھی نہیں ہے... میرا خیال ہے کہ اُردو کا زوال آمادہ ماحول ہے۔ اب میں سوچتا ہوں اپنے اندر کہ اب وہ BITTERNESS اپنے اندر پیدا کرنا چاہیئے۔

زبیر رضوی: میرا خیال ہے کہ وہ بِٹرنیس آنی چاہیئے....

مجتبیٰ حسین: آنی چاہیئے۔ اور میں اب محسوس کر رہا ہوں اس بات کو ـــ

زبیر رضوی: نہیں! میں جیسے آپ سے یہ کہہ رہا تھا پاشی کہ اگر آپ مجھ سے یہ بات کریں کہ مجتبیٰ حسین صاحب کس طرح کے ادیب ہیں۔ تو مجھے یہ لگتا ہے ہندوستان میں مجھے تو مشتاق احمد یوسفی کے بعد سب سے زیادہ کسی ادیب نے اپیل کیا ہے۔ (ہندوستانی رائٹرس کی بات کر رہا ہوں یہیں) تو وہ مجتبیٰ ہے۔ اس آدمی کے کے جو دوسرے DIMENSIONS ہیں میں انہیں تھوڑا سا اکسپوز کرنا چاہتا ہوں....

پتہ نہیں وہ خاکہ آپ نے سُنا ہے یا نہیں... جو میں نے مجتبیٰ حسین پہ لکھا (شاید زندگی میں ایک دو ہی خاکے میں نے لکھے ہیں) مجتبیٰ کا جو خاکہ تھا.....

محمود سعیدی: بھئی مجتبیٰ پہ میں نے بھی ایک نظم لکھی تھی ایک جلسہ کیلئے ـــ لیکن مجھے آج تک اس جلسہ کا دعوت نامہ

نہیں ملا۔ وہ نظم میرے پاس ہے ۔ ۔ ۔

زبیر رضوی : اتنا دلِ درمند۔ مثال کے طور پر شاذ تمکنت کا انتقال ہوا۔ اور مجتبیٰ پریشان۔ مجتبیٰ کے کوئی ایسے ٹرمس TERMS نہیں تھے جیسے میرے شاذ کے ساتھ تھے۔ میں بالکل اسباب کو کہہ سکتا ہوں کہ میرے یہاں اس طرح کی DEPTH یعنی گہرائی میں جاکر پھیل جانے والی کیفیت ــــ مجتبیٰ کے یہاں عجیب قسم کی بے چینی۔ کہ اب کیا ہوگا۔ اس کی فیملی کا کیا ہوگا ؟ اس کے بچوں کا کیا ہوگا۔ جو میرے بس کا روگ نہیں۔ یعنی مجھے نہیں معلوم کہ بھئی میں مرنے والے اپنے دوست کی کیا مدد کرسکتا ہوں۔ مجھے ایک ہی راستہ معلوم ہے۔ میں اپنے ہی جیب کے حوالے سے، اپنے وسائل کے حوالے سے، اسکی مدد کرسکتا ہوں۔ مجتبیٰ حسین ان لوگوں میں ہے، جو اپنے وسائل سے بھی واقف ہیں اور اس سے بھی واقف ہے کہ یہ جو مشترکہ (۷۰) ستّر راستے نکلتے ہیں۔ یہ کہاں کہاں سے کہاں کہاں پہنچتے ہیں ــ ایسا کونسا راستہ ہے، جو شاذ تمکنت کی مالی معاونت کیلئے ہے۔ یہ اس پر لگ جاتے ہیں۔ ٹھیک ہے۔ اس طرح کی بہت سی مثالیں ہیں۔ میں مجتبیٰ حسین کو بہت قریب سے جانتا ہوں۔ ۔ ۔ جہاں ان کے یہاں بہت سی خوبیاں PLUS POINT ہیں وہاں ان کے NEGATIVE پہلو بھی ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ کوئی شخصیت مسلسل رکھتی ہے تو وہ شخصیت نہیں ہے۔ شخصیت وہاں ہے جہاں CONTRADICTION پیدا ہو۔ اور جس شخصیت میں کنٹراڈکشنس نہیں ہیں ۔ ۔ ۔ میں اُسے ۔ ۔ ۔ ۔

کمار پاشی : سنئے ! جہاں انہوں نے پہلے CLUE دیا تھا۔ مجتبیٰ کے بارے میں کہ وہ دوستوں کا مذاق بھی اُڑاتے ہیں، خوش بھی ہوتے ہیں۔ لیکن دوست کے غم میں برابر کے شریک بھی ہوتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین : میں بنیادی طور پر ایک غمگین آدمی ہوں۔

مخمور سعیدی : رُکئے۔ آپ ختم کیجئے ــ یہ بات ہوچکی آپ کے بارے میں ۔ ۔ ۔ ۔

کمار پاشی : یہ تضاد ہے ان کی شخصیت میں۔

زبیر رضوی : نہیں تضاد نہیں ہے۔ میں نے تمہیں بھی دیکھا ہے۔ سات سطحوں پر تم بھی جیتے ہو۔ بہت سی سطحوں پر زندگی جینا میں سمجھتا ہوں POSITIVE پہلو ہے کسی شخصیت کا۔ آپ باپ ہیں۔ بیٹے ہیں ــ ملازم ہیں۔ ادیب ہیں شاعر ہیں۔ میں نے کمار پاشی کو دیکھا ہے ـــــ کمار پاشی سے آپ یہ کہیے کہ بھئی یہ میرا مسئلہ ہے۔ یہ میرے دکھ ہیں ــ آپ پریشان ہو رہے ہیں۔ کمار پاشی اپنے دس کام چھوڑ کر آپ کی مدد کرنے کیلئے تیار ہوجائے گا۔

مجتبیٰ حسین : پہلا دوست تو کمار پاشی ہی رہا ہے میرا دلّی کی زندگی میں ــــــ

مخمور سعیدی : کمار پاشی کا سلسلہ بیچ میں آیا میں اپنے آپ کو الگ ہٹا کر ایک بات کہتا ہوں آپ سے کہ یہ دوستوں کے بارے میں ہی اس طرح محسوس نہیں کرتا، جو لوگ اسے تکلیف پہنچاتے ہیں، اسکی اہانت کرتے ہیں۔ وہ بھی اس کے گھر پہ پہنچ جائیں تو وہ ان کو دیکھ کر منہ نہیں چھپاتا۔

زبیر رضوی : وہ تو اس کا اپنا روپ ہے ۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ کمار پاشی بھی مدد کرتا ہے مگر کمار پاشی کے پاس ایک دو راستے ہی ہیں۔ مجتبیٰ حسین ستّر (۷۰) راستے، کمار پاشی اور میرے مقابلے میں زائد کھلے رکھتے ہیں ۔ ۔

مجتبیٰ حسین : مگر میں کبھی ان کی تشہیر نہیں کرتا۔ مگر کمار پاشی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب یہ دیکھئے کہ جب دلّی آیا ہوں تو صرف ایک ہی اس آدمی کے حوالے سے کہ بھئی کمار پاشی وہاں میرا دوست ہے، اس نے ایک کتاب "پہلے آسمان کا زوال"

چھاپی تھی۔ میں نے اسکو پڑھا بھی تھا۔ اور افسانہ نگار کی حیثیت سے کمار پاشی مجھے بہت پسند بھی ہے اور اس کے بعد اس شخص کے حوالے سے بڑے رشتے بنتے چلے گئے ——— ظاہر ہے کہ اور لوگ بھی یہاں تھے۔ پسندیدگی کا معاملہ کمار پاشی کے حوالے سے تھا......

محمود سعیدی: مجھے مجتبیٰ سے ملایا۔ خود اس آدمی نے ——— پاشی نے۔

زبیر رضوی: مجتبیٰ۔ تمھاری ایک شخصیت ہے۔ اس وقت ظاہر ہے کہ طنز و مزاح نگار مجتبیٰ حسین کی بات نہیں کررہا ہوں۔ میں مجتبیٰ حسین کی بات کررہا ہوں جو ظاہر ہے کہ اوسیہ ہے۔ میں نے اُردو کا بڑا کلاسیکی شعر سُنا تھا۔ اُسکو میں کبھی کبھی خود بھی استعمال کرتا ہوں۔ موقع محل کے اعتبار سے گفتگو میں۔ مشاعروں اور محفلوں میں۔ اور میں ہی نہیں اُردو کے ہزاروں لکھنے پڑھنے والے اس شعر کو استعمال کرتے ہیں۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس شعر کا جو کردار رہا ہے اور جس آدمی کو، جس شخصیت کو دیکھ کر اس طرح کے شعر نے جنم لیا ہوگا۔ وہ غالباً مجتبیٰ حسین ہے۔ یقیناً ہے۔ غالباً کا لفظ نکال دوں۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

محمود سعیدی: جواب نہیں جناب والا۔ یہ تو لاجواب شعر ہے۔ مجتبیٰ کی شخصیت پر اس سے بہتر۔ اس شخصیت کی تصویر کشی ہو نہیں سکتی ——— لیکن اب۔ یہ اس حوالے سے ایک شعر سنادوں کہ ؎

سوداؔ، جو تیرا حال ہے ایسا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس حال میں دیکھا

زبیر رضوی: محمود صاحب، آپ یوں اس طرح میرے حافظہ کو آزمانا چاہیں تو میں یہ کہوں گا کہ ایسے نہ جانے کتنے شعر ہیں جو مجتبیٰ کی شخصیت پر صادق آسکتے ہیں...

محمود سعیدی: اچھا میں نے سمجھ لیا کہ آپ ایک تیر لگانے والے ہیں اس لئے میں نے ایک شعر اور سوچ لیا ہے۔

زبیر رضوی: جی! جی!

محمود سعیدی: وہ بھی عرض کئے دیتا ہوں (قہقہہ) کہ ؎

دنیا میں کوئی جان سے پیارا نہیں ہوتا
کچھ لوگ مگر جان سے پیارے بھی ہوئے ہیں

محبوب مانجھومی
بلاسپور

مجتبیٰ حسین
سے

بانکا، سجیلا اور جواں مجتبیٰ حسین
مردِ جہانِ اُردو زباں مجتبیٰ حسین

برسا رہا ہے تیر بڑی آن بان سے
طنز و مزاح کی لے کے کماں مجتبیٰ حسین

اہلِ دکن کی آنکھ کا تارا کہیں اسے
یا کہیئے فخرِ زندہ دلاں مجتبیٰ حسین

سلجھا رہا ہے طنز کا شانہ لئے ہوئے
مدت سے زلفِ اُردو زباں مجتبیٰ حسین

میخانۂ ادب پہ بہاروں کا ہے نزول
جب سے بنا ہے پیرِ مغاں مجتبیٰ حسین

دِلّی کی سرزمین پہ چھایا ہوا ہے آج
ارضِ دکن کا مردِ جواں مجتبیٰ حسین

نوکِ قلم سے خوشیاں لٹاتا ہے بے دریغ
رنج و محن کا دشمنِ جاں مجتبیٰ حسین

محبوب[۱] اور جلیس[۲] کی صحبت کا فیض ہے
پہنچا کہاں سے ہے یہ کہاں مجتبیٰ حسین

حاصل تھا قربِ خاص سلیمان خطیب کا
ہے فخر کا مقام، میاں مجتبیٰ حسین

شوکت[۳] کے بعد طنز و مزاح کے دیار میں
ہے تیری ذات سب میں عیاں مجتبیٰ حسین

دیوانہ تیری طرزِ ادا کا ہے اک زماں
شیدا ہے تیرا ایک جہاں مجتبیٰ حسین

طنز و مزاح کی راہ کے رہرو ہیں اور بھی
تجھ سا کہاں ہے زورِ بیاں مجتبیٰ حسین

تیرے ہی دم قدم سے جہانِ ادب میں آج
رنگین ہے شام، صبح جواں مجتبیٰ حسین

کیوں کر کریں نہ فخر بھلا تیری ذات پر
زندہ دلانِ زندہ دلاں مجتبیٰ حسین

دل سے دُعا نکلتی ہے، قائم رہے سدا
تیرا یہ نام اور نشاں مجتبیٰ حسین

واقف نہیں ہوں اُس سے مگر ربط ہے دلی
محبوب میں کہاں، وہ کہاں مجتبیٰ حسین

-۰- -۰- -۰-

۱۔ محبوب حسین جگر ۲۔ ابراہیم جلیس ۳۔ شوکت تھانوی

"کوہ پیما" روزنامہ "سیاست"

مجتبیٰ حسین کی ابتدائی مزاحیہ تحریریں

کالم "شیشہ و تیشہ"

۱۸؍اگست ۱۹۶۲ء (شنبہ)

یورپ میں گونگوں، بہروں، اندھوں اور دردمندوں کی انجمنوں کی کوئی کمی نہیں بلکہ ایک ڈھونڈئیے تو ایسی ہزاروں انجمنیں مل جاتی ہیں۔ لیکن "زندہ ملان پیرس" نے ایک نئی وضع کی اکیڈیمی قایم کی ہے جس کا مقصد فرانس میں ہنسی مذاق کو فروغ دینا ہے اس اکیڈیمی کے بے شمار اغراض ومقاصد میں سے ایک حقیر مقصد یہ بھی ہے کہ یکم اپریل کو عام تعطیل دلوانے کے لیے جدوجہد کا آغاز کیا جائے تاکہ اس دن فرانس کے سارے باشندے فلک شگاف قہقہے بلند کرتے رہیں اور سرزمین فرانس زعفران زار بن جائے۔ یہ اکیڈیمی کوئی ایسے ویسے لوگوں نے بھی قایم نہیں کی ہے بلکہ ممتاز ناول نگار فرانکاش اسپین مزاح نگار اچنڈ کیوتر اور فلم ڈائریکٹر ای نکلیڈ اس کے دوامی رکن ہیں۔ گویا وہ عمر بھر کے لیے ہنسنے ہنسانے کو شیوہ بنا لینا چاہتے ہیں۔

اس اکیڈیمی کا طریقہ کار کیا ہوگا اس کا اندازہ لگانا قبل ازوقت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ارکان اس کے جلسوں میں تقریریں کرنے کے بجائے صرف قہقہے لگاتے رہیں۔ زبان کا کام مسکراہٹ سے لیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اگر اس اکیڈیمی کے کسی رکن کا "انتقال پر مسرّت" ہو جائے تو تعزیتی جلسوں کے بجائے مسرت وانبساط کے جلسے منعقد کئے جائیں۔ ابھی تو یہ اکیڈیمی صرف ایک مسکراہٹ ہے۔ جب بڑھ کر قہقہہ بن جائے گی تو دنیا کی ساری انجمنیں پکار اٹھیں گی :

> ؎ تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

۲۲؍اگسٹ ۱۹۶۲ء (چہارشنبہ)

ان دنوں دنیا کی ہر شے نہ صرف مقصدی بلکہ ہمہ مقصدی ہونے لگی ہے۔ مثال کے طور پر ادب مقصدی ہوتا ہے۔ فلمیں مقصدی ہوتی ہیں اور پراجکٹس ہمہ مقصدی ہوتے ہیں۔ مقصدی ادب

ہمہ مقصدی کی طرح "بے مقصدی" کی ایک نئی اصطلاح وجود میں آرہی ہے۔ مثلاً اب چوری کی لاتعداد اقسام کو دو بڑے شعبوں "مقصدی" اور "غیر مقصدی" میں تقسیم کیا جانے لگا ہے۔ مقصدی چوری تو وہ ہے جس سے ہمارے آباواجداد بھی واقف تھے اور ہم بھی واقف ہیں۔ غیر مقصدی چوری ذرا نئی بات ہے جس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ "مال صاف کرنے" کے بجائے صرف "ہاتھ صاف" کیا جائے۔

اس تمہید کا مقصد اس بے مقصد سرقہ کی واردات کی طرف اشارہ کرنا ہے جو مغربی سویڈن کے شہر گوتھن برگ میں ہوئی ہے۔ ہوا یہ کہ وہاں ایک نوجوان نے مگرمچھ کے ایک بچے کی چوری کی ہے جو تین فٹ لانبا تھا۔

اب اس طرح کی حرکات پر غور کیجئے سمجھ میں نہیں آتا کہ چوری کرنا ہی تھا تو اس نوجوان نے مگرمچھ کے بچے کی ہی چوری کیوں کی؟ مگرمچھ نہ تو کتے کی طرح وفادار جانور ہے۔ اور نہ بکری اور گائے کی طرح وہ دودھ دیتا ہے۔ اور نہ بلی کی طرح چوہے پکڑتا ہے۔ مگرمچھ کو بین الاقوامی شہرت عطا کرنے والی واحد خصوصیت اس کے آنسو ہیں جو ظاہر ہے نہ کسی کی آنکھ کا نور ہیں اور نہ کسی کے دل کا سرور بھیا! اس کے علاوہ جب سے انسانوں نے خود مگرمچھ کے آنسو بہانے کا فن سیکھ لیا ہے اس وقت سے یہ جانور اس خصوصیت سے بھی محروم ہو گیا ہے ——— سویڈن کے اس مجرم نے مگرمچھ کا سرقہ غالباً اس لیے کیا ہوگا کہ عادی مجرم بننے کے بعد اظہار ندامت کے لئے مگرمچھ کے آنسو بہانا سیکھ لے!

۲۸ راگسٹ ۱۹۶۲ء (سہ شنبہ)

سوشلسٹ لیڈر ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کے منہ سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی بات کا اثر سماج کے ایک مخصوص گروہ پر ہی ہوتا ہے۔ پرسوں انہوں نے بھری بزم میں ایک راز کی بات یہ کہہ دی تھی کہ ارکان پارلیمنٹ اور اسمبلی کو ماہانہ پندرہ سو روپے ملتے ہیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ڈاکو چاقو کھول کر ارکان پارلیمنٹ اور اسمبلی کے پیچھے پڑے ہوئے تھیا۔

آٹھ دن پہلے کی بات ہے کہ مدھیہ پردیش کے وزیر مسٹر تخت مل جین کو ڈاکوؤں نے چاقو دکھا کر لوٹ لیا۔ ابھی اس صدمہ جانکاہ سے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ پرسوں کرالا سے تعلق رکھنے والی ایک خاتون رکن پارلیمنٹ کو لوٹ لیا گیا۔ اس سارے ہنگامے کو فرو کرنے کے لیے اتر پردیش کے ایک نائب وزیر نے وضاحتی بیان بھی دیا تھا کہ وزراء کی مالی حالت بڑی سقیم ہے اور ان سے اکثر تو مقروض ہیں۔ لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکوؤں پر وزیر موصوف کا کوئی کنٹرول ہی نہیں ہے۔ اور وہ ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کے فراہم کردہ "راز" پر یقین کرتے ہوئے اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ مگر ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کو بھی اس سلسلے میں احتیاط برتنی چاہیئے۔ کیونکہ حال ہی میں یہ اطلاع ملی تھی کہ وہ پارلیمنٹ کے کسی ضمنی انتخاب میں حصہ لینا چاہتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ وہ منتخب ہو جائیں تو پھر ———

"الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا"

یکم ستمبر ۱۹۶۴ء (سہ شنبہ)

جلسے اور جلوس ہماری روزمرہ زندگی کا ایک جزو ہیں۔ ویسے "تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے"۔ ماضی میں جلسے ہوتے تھے تو مقررین کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا۔ اب انہیں صرف ڈائس پر بٹھایا جاتا ہے۔ پہلے آدمی بگت ہوتی تھی تو اب "ضلع جگت" ہوتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مقررین اور سیاسی قائدین خود "چور دروازہ" سے ایسے جلسوں کے انعقاد کا انتظام کرتے ہیں۔ گویا سامعین سمت لے مقررین حیثیت والا معاملہ پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے۔ ایک سیاسی قائد کے بارے میں مشہور ہے کہ انہیں ایک دن اپنا جلوس نکلوانے اور خیر مقدم کروانے کی جو طلب ہوئی تو کسی شہر میں اپنے حامیوں کو بذریعہ ٹیلی گرام اطلاع دے دی کہ وہ قدم رنجہ فرمانے والے ہیں۔ لیکن ڈاک کے ناقص انتظام کے باعث یہ ٹیلی گرام ان کے حامیوں تک وقت پر نہ پہنچ سکا۔ راوی یوں بیان کرتا ہے کہ ہزاروں تمناؤں اور آرزوؤں کے ساتھ جب یہ سیاسی قائد اسٹیشن پر پہنچے تو نہ پُرجوش نعرے تھے اور نہ لوگوں کا ہجوم۔ لیکن وہ کب مایوس ہونے والے تھے۔ پلیٹ فارم پر ہی ٹھہر گئے اور شہر میں اپنے حامیوں کے نام یہ چٹھی بھیجی کہ میں اسٹیشن پر آچکا ہوں مجھے آکر لے جاؤ۔ اب ان کے حامی دن بھر لوگوں کو ہانکتے رہے۔ شام میں جب پانچ سو کا جلوس تیار ہوا تو یہ قائد اسٹیشن سے برآمد ہوئے۔ ظاہر ہے کہ اس سے مقررین اور قائدین کی اہمیت میں یقیناً کمی ہوگی۔ پہلے مقررین کو جلسہ میں شرکت کے لیے دعوت نامے دیئے جاتے تھے۔ اب حکمنامے دیئے جاتے ہیں۔ چنانچہ کانپور کے ایک معاصر نے کسی جلسے کے منتظمین کی جانب سے ایک مقرر کو جلسے میں شرکت کے لئے اس طرح ہدایت دی ہے:

"حسرت انصاری صاحب بنارسی متوجہ ہوں! جہاں کہیں ہوں ۲۷/۲۸ اگست کو مولانا ابوالوفا صاحب کے جلسہ میں ہزاری باغ ضرور پہنچیں"۔

جلسے کے منتظمین نے یہ نہیں سوچا کہ اس ہدایت کو لوگ "اعلان گمشدگی" بھی تصور کرسکتے ہیں۔ ▬

مجتبیٰ حسین

علامہ نارسا کی وفاتِ مسرت آیات پر ــــــ!

جب عین عالمِ ضعیفی میں علامہ نارسا کا انتقال ہوا تو ان کے انتقال کی خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی اور فائر بریگیڈ کا عملہ حیرت سے منہ دیکھتا رہ گیا۔ علامہ نارسا کے بال بہت بڑے تھے اسی لیے وہ اردو کے "چوٹی" کے شاعر سمجھے جاتے تھے اور لوگ انھیں سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ بعض لوگوں نے انھیں ناک اور پیشانی پر بھی بٹھانے کی کوشش کی مگر مرحوم کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ یہ سراسر ان کی کسرِ نفسی تھی۔ علامہ ہر اعتبار سے علامہ تھے جیسے بنیا ہر اعتبار سے بنیا ہوتا ہے۔ مرحوم میں کئی خوبیاں تھیں جنھیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے اور یہیں آکر قدرت کی ستم ظریفی کو کوسنے کو جی چاہتا ہے کہ اس نے بلاوجہ انسان کو دس انگلیاں دے رکھی ہیں کیونکہ علامہ کی خوبیوں کو گننے کے لیے دو چار انگلیاں ہی کافی ہو سکتی تھیں یہ قدرت کی فضول خرچی نہیں تو اور کیا ہے۔

علامہ کی سب سے بڑی خوبی جو دراصل ایک خرابی تھی وہ یہ تھی کہ وہ شاعری کرتے تھے لیکن مرحوم کی قوتِ ارادی کی داد دینی چاہیئے کہ انھوں نے مرتے دم تک شاعری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور نزع کے عالم میں بھی تیمارداروں کو اپنی ایک نامکمل غزل کا مقطع سنا کر مر گئے۔ حق جہنم رسید کرے عجب بور مرد تھا۔ اسے علامہ کی فرض شناسی نہ کہیں تو اور کیا کہیں کہ انھوں نے اپنی ایک غزل بھی نامکمل نہ چھوڑی۔ علامہ نے ۸۰ برس کی عمر پائی اور انھوں نے ۸ ہزار غزلیں کہیں جن پر ۸ لاکھ افراد نے ہوٹنگ کی۔ مگر مرحوم ایسے حوصلہ مند، نڈر اور جری انسان واقع ہوئے تھے کہ اگر ۸ کروڑ افراد نے بھی ہوٹنگ کی ہوتی تو وہ ٹس سے مس نہ ہوتے۔ بات دراصل یہ تھی علامہ بڑے ظریف الطبع واقع ہوئے تھے اور ہر سنجیدہ بات کو مذاق میں ٹال جاتے تھے۔ مثلاً ایک مشاعرے میں جب سامعین نے ان پر انڈے پھینکے تو انھوں نے سارے انڈے ہاتھ میں جھیل لیے اور گھر جا کر ان انڈوں کی پڈنگ پکوائی، پھر جب دوسری بار مشاعرے میں شرکت کرنے گئے اور لوگوں نے ان پر انڈے نہ پھینکے تو علامہ بپھر گئے اور سامعین سے شکایت کرنے لگے:

"حضرات! اگر آپ لوگوں نے انڈے نہیں پھینکے تو میں غزل نہیں سناؤں گا۔" اس پر منتظمین مشاعرہ نے فوراً بازار سے انڈے منگوائے اور جب دو چار انڈے پھینکے گئے تو علامہ نے غزل کا سلسلہ شروع کیا جو صبح تک جاری رہا۔ اس کے بعد علامہ نے ایک معمول سا بنا لیا کہ جب بھی کسی مشاعرہ میں جاتے تو لوگوں سے کہتے کہ آج مجھ پر آلو پھینکے جائیں کیوں کہ آج آلو کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔ ایک بار تو انھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ "آج مجھ پر ایک پلیٹ بریانی، ایک پیالی چائے اور سگریٹ

کی ڈبیہ پھینکی جائے۔"

علامہ نے بڑی خوددار طبیعت پائی تھی۔ چنانچہ انھیں زندگی بھر اپنے کلام کے سوائے کسی شاعر کا کلام پسند نہ آیا۔ مزا تو یہ کہ اُنھوں نے اپنی خودداری کو نبھانے رکھنے کے لیے کسی شاعر کا کلام بھی نہیں پڑھا اور اپنے سوائے کبھی اور کسے کلام پر داد نہیں دی۔ خودداری کی ایسی مثال ان دنوں مشکل ہی سے ملے گی۔ علامہ نے ۸۰ برس کی عمر میں چار شادیاں کیں اور اپنی شاعری کے جملہ ۴ مجموعے شائع کروائے جن میں سے ہر ایک مجموعہ کو اُنھوں نے اپنی ایک ایک بیوی کے نام معنون کروایا (خدا کا شکر ہے کہ مرحوم نے پانچ شادیاں نہیں کیں ورنہ پانچ مجموعے منظر عام پر آجاتے)۔

پہلے مجموعہ کا انتسابی نوٹ انھوں نے یوں لکھا تھا:

"میں اپنے پہلے مجموعۂ کلام کو بصد نفرت و حقارت اپنی پہلی بیوی کے نام معنون کرتا ہوں"۔

دوسرے مجموعے کے دیباچہ میں انھوں نے لکھا تھا:

"میرے دوسرے مجموعۂ کلام کے منظر عام پر آنے کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ میری دوسری بیوی کو عرصہ سے شکایت تھی کہ میں نے اپنا مجموعۂ کلام صرف پہلی بیوی کے نام کیوں معنون کیا ہے' اس کے نام کیوں معنون نہیں کیا۔ اس مسئلہ پر میری ہر دو بیویوں میں لڑائی جھگڑا جاری رہتا تھا جس سے میں تنگ آ چکا تھا سو میں اپنے گھریلو حالات کو پُرامن بنانے کے لیے دوسرا مجموعۂ کلام شائع کر رہا ہوں۔ اب اگر ضمنی طور پر اس مجموعہ کی اشاعت سے ادب کی خدمت ہوتی ہے تو میں اس کے لئے معافی کا خواستگار ہوں"۔

ان تیسرے اور چوتھے مجموعۂ کلام کی اشاعت کے پیچھے بھی علامہ کی ازدواجی زندگی پوشیدہ تھی جو لوگوں کو بہت کم نظر آتی تھی۔ علامہ ریاضی میں بہت کمزور تھے۔ چنانچہ انھیں ۲۵ تک گنتی آتی تھی اور وہ بھی اس لیے آتی تھی کہ علامہ کی ۲۵ اولادیں تھیں۔ ریاضی سے ان کی واقفیت محض ایک مجبوری تھی۔ عمر کے آخری حصے میں علامہ کی بینائی اس حد تک خراب ہو چکی تھی کہ ایک بار جب ان کے بڑے لڑکے نے سڑک پر انھیں سلام کیا تو انھوں نے اپنے ہی بیٹے کے سلام کا جواب دینے کے بعد اس سے پوچھا:

"کہو میاں! تمہارے والد کی صحت کیسی ہے؟"

اور سعادت مند بیٹا ان کے استفسار کے جواب میں بولا:

"کیا عرض کروں ان دنوں والد بزرگوار کی صحت اچھی نہیں رہتی۔ بینائی بہت خراب ہو چکی ہے' یہاں تک کہ ہم لوگوں کو بھی نہیں پہچان پاتے"۔

اس پر علامہ نے کہا:

"آپ بینائی کی خرابی کی باتیں کرتے ہیں۔ اگر بینائی اچھی بھی ہو تب بھی میں اپنے بچوں کو نہیں پہچان سکتا"۔ پھر بولے "میاں! ایسے سعادت مند والدین اس دنیا میں کہاں باقی ہیں جو اپنی اولاد کو پہچان سکیں"۔

علامہ کی ایک اور خوبی یہ تھی کہ انھیں اپنا کلام سُنانے کا مرض لاحق تھا۔ اگر کوئی نئی غزل ہوتی (جو اتفاق سے ہر روز تیار ہو جایا کرتی تھی) تو سارے محلے کو سُنانے کے لیے نکل کھڑے ہوتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب علامہ گھر سے نکلتے تو سڑکوں پر بھگدڑ مچ جاتی اور لوگ گلیوں میں بھاگ جاتے' دکاندار اپنی دکانیں بند کر دیتے اور مائیں اپنے بچوں کو اُٹھا کر

سینے سے چمٹا لیتیں۔ غرض دیکھتے ہی دیکھتے سڑک ویران ہو جایا کرتی تھی۔ مگر علّامہ کا یہ عارضہ اکثر اوقات ملک اور قوم کے لیے بڑا کارگر ثابت ہوتا تھا۔ مثلاً ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مقامی کالج کے طلباء نے ہڑتال کی اور جلوس نکالا۔ ایک مقام پر جلوس مشتعل ہو گیا اور پولیس پر سنگ باری کرنے لگا۔ پولیس نے لاٹھی چارج کیا مگر جلوس پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ جب صورتِ حال بہت نازک ہو گئی تو سب انسپکٹر پولیس کے ذہن میں اچانک ایک ترکیب آئی۔ وہ سیدھے علّامہ کے گھر بھاگا اور انھیں اپنے ساتھ لے آیا۔ ادھر طلباء کی سنگ باری بدستور جاری تھی کہ اچانک مائیکروفون پر اعلان ہوا :

" خواتین و حضرات ! اب آپ علّامہ نارسا سے ان کی تازہ غزل سماعت فرمائیے " مائیکروفون پر یہ اعلان ہونا تھا کہ طلباء اپنے سر پر پاؤں اور پاؤں پر سر رکھ کر بھاگنے لگے اور ابھی علّامہ نے اپنی غزل کا مطلع ہی سنایا تھا کہ مطلع صاف ہو گیا۔ طلباء تو طلباء، پولیس کی ساری جمعیت بشمول سب انسپکٹر پولیس مقامِ حادثہ سے غائب تھی۔

علّامہ کے کشف و کرامات کی یہ ایک معمولی سی مثال ہے۔ مگر بعض اوقات سنانے کے اس مرض نے علّامہ کو کافی ذلیل و خوار بھی کروایا۔ مثلاً ایک بار علّامہ نے اپنی غزل سنانے کے لیے ایک راہ چلتے شخص کا اغوا کیا اور اسے ایک ہوٹل میں لے گئے اور چائے کے ساتھ لگاتار دو گھنٹوں تک اسے اپنا کلام پلاتے رہے اور وہ بھی لگاتار دو گھنٹوں تک مختلف اشیائے خورد و نوش کھاتا رہا۔ جب علّامہ کی طبیعت سنبھلی تو شخصِ مذکور سے اپنے کلام کے بارے میں رائے پوچھی۔ اس پر وہ شخص اپنے کان پر ہاتھ رکھتے ہوئے چلّا کر بولا :

" قبلہ ! اگر آپ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہوں تو براہِ کرم اس کاغذ پہ لکھ دیجیے کیونکہ میں پیدائشی بہرہ ہوں اور کوئی بات سننے کی اہلیت نہیں رکھتا "

لوگوں کا بیان ہے کہ یہ واحد شخص تھا جسے علّامہ کی ذات سے فائدہ پہنچا تھا، کیونکہ اور لوگوں کو وہ اپنی غزل سنائے بغیر کچھ کھلاتے پلاتے نہیں تھے۔ حد تو یہ کہ کسی فقیر کو ایک پیسہ بھی خیرات دیتے تو اُسے اپنا ایک شعر ضرور سُنا دیتے۔ اس عادت کا نتیجہ یہ نکلا کہ علّامہ کے گھر پر آج تک کسی فقیر کو بھیک مانگتے نہیں دیکھا گیا۔

علّامہ کو شاعری کے میدان میں قدم جمانے کے لیے کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ابتداء میں جب ان کے ہر شعر پر ہوٹنگ کرنے کو لوگ اپنا فرضِ اولین سمجھتے تھے تو اُنھوں نے اپنے کلام کو مقبول بنانے کے لیے بعض فقیروں کی خدمات حاصل کیں۔ انھیں اپنا کلام رٹایا اور سڑکوں پر بھیک مانگنے کے لیے چھوڑ دیا۔ جہاں وہ علّامہ کی غزلیں گا گا کر بھیک مانگتے مگر انھیں دن بھر میں ایک پیسے کی خیرات بھی نہیں ملتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علّامہ کا کلام تو عوام میں مقبول ہو گیا مگر بے چارے فقیروں کا بزنس تباہ و تاراج ہو گیا۔ جب فقیروں نے بھی علّامہ کا کلام گانے سے انکار کر دیا تو انھیں ایک نئی ترکیب سوجھی۔ یعنی اب کی بار اُنھوں نے ایک کاتب کی خدمات حاصل کیں اور اپنی ساری پسندیدہ غزلیں شہر کی دیواروں پر لکھوا دیں۔ جب ان کا سارا کلام شہر کی دیواروں پر " زیورِ طبع " سے آراستہ ہو گیا اور لوگ سفیدی کراتے کراتے عاجز آ گئے تو شہریوں کے ایک وفد نے علّامہ سے ملاقات کی اور ان سے صلح کر لی کہ وہ انھیں مشاعروں میں مدعو کیا کریں گے (تاریخ میں اس صلح کو صلح نامہ شاعر و سامعین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) اس کے بعد سے علّامہ ہر مشاعرہ میں جانے لگے اور مشاعروں کو لوٹ کر اپنے گھر لے جانے لگے۔ یہاں تک کہ ان کے گھر میں مشاعروں کا انبار لگ گیا۔ علّامہ کے کلام کی واحد خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ترنم کے سوائے کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ اگر ان کے کلام میں سے ترنم کو نکال دیا جائے تو کلام میں تخلص کے

سوائے کچھ بھی باقی نہیں بچ جاتا تھا۔

علامہ نے زندگی بھر میں ایک شعر بھی ایسا نہیں کہا جو بحر سے خارج نہ ہو۔ ہر مصرعہ دوسرے مصرعہ سے یا تو چھوٹا ہوتا تھا یا بڑا۔ اور جب لوگ ان سے شکایت کرتے کہ غزل کے سارے مصرعے بحر سے خارج ہیں تو وہ اس کے جواب میں یہ دلیل پیش کرتے کہ :

"میاں! جب انسان کے ایک ہاتھ کی پانچ انگلیاں برابر نہیں ہوتیں ایک غزل کے دس مصرعے کس طرح برابر ہو سکتے ہیں۔ قدرت کی تخلیق خود بحر سے خارج ہے، خدا نے سب کو یکساں پیدا نہیں کیا ہے؟"

علامہ کے کلام سنانے کا انداز بھی بڑا انوکھا اور اچھوتا تھا۔ وہ کلام کیا سناتے تھے، اچھا خاصا ڈرامہ پیش کرتے تھے۔ شعر میں اگر معشوق کی انگڑائی کا تذکرہ ہوتا تو اسٹیج پر ایسی بھرپور انگڑائی لیتے کہ مائیکروفون سمیت چار پانچ شعراء کو اپنی انگڑائی کی زد میں لے لیتے۔

ایک مشاعرہ کا ذکر ہے کہ علامہ نے ایک شعر میں گریبان کے چاک ہونے کا سماں باندھا تھا۔ اس شعر کو پڑھتے ہوئے انھوں نے اداکاری کے وہ جوہر دکھائے کہ آن کی آن میں قمیص کا گریبان چاک کر لیا۔ پھر جب مشاعرہ ختم ہوا تو منتظمین کے پیچھے پڑ گئے کہ انھیں مشاعرہ کے مقررہ معاوضہ کے علاوہ قمیص کی قیمت بھی ادا کی جائے۔ منتظمین نے لاکھ سمجھایا کہ علامہ آپ کا قمیص تو پرانا تھا، ہم آپ کو نئے قمیص کی قیمت کس طرح ادا کر سکتے ہیں؟ مگر علامہ نہ مانے اور بالآخر منتظمین کو نئے قمیص کی قیمت ادا کرنی پڑی۔

اس کے بعد علامہ نے ایک معمول سا بنا لیا کہ جس کسی مشاعرہ میں جاتے وہاں گریباں چاک والی غزل سناتے اور پرانے کے بدلے نیا قمیص لے کر آتے مگر رفتہ رفتہ منتظمین بھی ہوشیار ہو گئے۔ چنانچہ ایک مشاعرہ میں جب علامہ کلام سنانے کے لیے پہنچے تو انھوں نے زبردستی علامہ کا قمیص اُتار لیا اور احتیاطاً انھیں پاجامے سے بھی محروم کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علامہ کو صرف لنگوٹ پہن کر مائیکروفون پر کلام سنانا پڑا۔

مگر افسوس کہ علامہ کے کلام سنانے کا یہی انداز بالآخر اُن کی موت کا سبب بنا اور وہ شاعری کی راہ میں شہید ہو گئے۔ ہوا یوں کہ ایک شعر میں "قتل" کا تذکرہ تھا۔ چنانچہ علامہ نے قتل کا سماں باندھنے کے لیے اپنی جیب سے اُسترا نکالا اور آن کی آن میں اسے اپنے گلے پر پھیر لیا۔ علامہ کی نعش اسٹیج پر تڑپنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے علامہ کی رُوح "قفسِ عنصری" کا تالا توڑ کر پرواز کر گئی۔

اب علامہ ہم میں نہیں رہے جس پر جتنی مسرّت کا اظہار کیا جائے کم ہے۔ زندگی بھر علامہ کو بہتیرا سمجھایا گیا کہ علامہ ایسے مہلک اشعار نہ کہئے جن سے آپ کی جان کے لالے پڑ جائیں مگر وہ نہ مانے اور گزشتہ پیر کو شاعری کے میدان میں شعر پڑھتے پڑھتے شہید ہو گئے۔

علامہ کی کس کس بات کا ذکر کیا جائے اور ان کی موت پر کتنے قہقہے لگائے جائیں غرض علامہ کے انتقال سے ایک ایسا خلاء پیدا ہو گیا ہے جسے پُر کرنا کسی کے بس کی بات نہیں کیونکہ علامہ بہت موٹے تھے اور اتنا بڑا خلاء تین چار شعراء سے بھی پُر نہیں کیا جا سکتا۔ خدا مرحوم کی رُوح کے ساتھ قرار واقعی سلوک کرے اور ان کے پس ماندگان کو بے صبری عطا کرے۔ ☆

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

مُجتبیٰ حُسین

ریل منتری مُسافر بَن گئے!

اور ایک دن ریل منتری نے اچانک اپنے سکریٹری کو بُلا کر کہا: "دیکھو جی! ہم کل بھیس بدل کر ایک عام مُسافر کی طرح ٹرین کے تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں سفر کرنا چاہتے ہیں۔ تمہیں بھی بھیس بدل کر ہمارے ساتھ چلنا ہوگا"——— سکریٹری نے پلکیں جھپکا کر منتری کو دیکھا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ آخر اس کے بھیس بدلنے کی کیا ضرورت ہے۔ بھیس بدلنا تو صرف منتریوں کا کام ہوتا ہے۔

پھر بھی اس نے ڈرتے ڈرتے کہا "حضور آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بات عرض کردوں کہ آپ تو ریل منتری ہیں۔ ریل میں سفر کریں آپ کے دشمن۔ ریل منتری تو وہ ہوتا ہے جو ہمیشہ ہوائی جہاز سے سفر کرتا ہے۔ آپ تو ابھی منتری کی گدی پر براجمان ہیں۔ پھر عام چناؤ کا بھی دُور دُور تک کہیں کوئی پتہ نہیں ہے۔ ایسے میں آپ پر ایسی کون سی بپتا آن پڑی ہے کہ آپ ریل میں سفر کریں؟"

منتری بولے "تم زیادہ بکواس نہ کرو۔ آخر ہمیں اپنے محکمہ کے بارے میں جانکاری تو حاصل کرنی ہی چاہئیے"——— سکریٹری نے کپکپاتے ہوئے کہا "حضور آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن میرا خیال ہے کہ منتری اپنے محکمہ کے بارے میں جانکاری حاصل کرنا چاہئیے تو تب بھی وہ جانکاری حاصل نہیں کرسکتا۔ ابھی چند روز پہلے ہمارے وزیر خوراک قحط زدہ علاقوں کے دورہ پر گئے ہوئے تھے، وہ بھی جانکاری حاصل کرنا چاہتے تھے۔ واپسی پر اُنھوں نے بتایا کہ "قحط زدہ علاقوں میں مجھے کہیں بھی قحط کے آثار نظر نہیں آئے۔ کیوں کہ مجھے تو تینوں وقتوں کا کھانا پابندی سے ملتا رہا بلکہ دوسرے ریسٹ ہاؤسوں کے مقابلے میں یہاں کا کھانا زیادہ لذیذ محسوس ہوا۔ کیسا قحط اور کہاں کا قحط؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قحط کی افواہ صرف اپوزیشن والوں نے اُڑائی ہے"۔

ریل منتری نے اپنے سکریٹری کی بات اَن سنی کرتے ہوئے کہا "دیکھو جی! تم ہمارے سکریٹری ہو، ہم تمہارے سکریٹری نہیں ہیں، ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں اس پر تمہیں عمل کرنا ہوگا"۔

سکریٹری لاجواب ہوگیا۔ اس نے جان لیا کہ اب مزید کچھ کہنا اپنی ملازمت کو خطرہ میں ڈالنا ہے۔ لہٰذا وہ چُپ چاپ منتری کے کمرے سے جانے لگا۔

منتری جی نے اسے آخری بار یاد دلاتے ہوئے کہا: "آج رات تم ٹھیک آٹھ بجے اسٹیشن پر آجانا"۔

سکریٹری نے پوچھا "حضور یہ بتایئے کہ ہم بلاٹکٹ سفر کریں گے یا ٹکٹ خرید کر"؟ منتری بولے "اس کا فیصلہ اسی وقت کریں گے۔"

منتری جی دن بھر بھیس بدلتے رہے۔ شام شام تک وہ بھیس بدلتے بدلتے اپنی اصلی حالت پر آگئے۔ آئینہ میں صورت دیکھی تو انھیں یوں معلوم ہوا جیسے وہ سچ مچ اپنے آپ کو دیکھ رہے ہیں۔ مدتوں بعد اپنے آپ کو اصلی حالت میں دیکھ کر انھیں تھوڑی دیر کے لیے خوشی بھی ہوئی۔ شام میں جب وہ ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس لے کر اسٹیشن پہنچے اور اپنا اٹیچی کیس سکریٹری کو دینے کی کوشش کی تو سکریٹری نے انھیں گھورتے ہوئے کہا: "کیسے بدتمیز آدمی ہیں آپ بھی۔ کیا آپ مجھے قلی سمجھتے ہیں۔ نہ جانے کیسے کیسے لوگ آجاتے ہیں؟" منتری جی نے اچانک منتری بنتے ہوئے کہا "دیکھو جی! یہ بدتمیزی نہ کرو، میں تمہارا منتری ہوں۔"

سکریٹری نے منتری کو غور سے دیکھا۔ پھر ایک ہلکا سا نعرہ تحسین لگاتے ہوئے بولا: "حضور، یہ آپ ہیں۔ بھگوان قسم زندگی میں پہلی بار آج آپ ہم میں سے ہی ایک فرد نظر آرہے ہیں۔ اگر آپ اس کے بعد پھر کوئی بھیس نہ بدلیں تو کتنا اچھا ہوگا۔"

منتری بولے "چلو اب باتیں نہ بناؤ۔ ہمیں سب سے پہلے ٹکٹ خریدنا چاہیے۔" سکریٹری بولا "لائیے، مجھے ٹکٹ کے پیسے دیجئے۔"

وہ بولے "نہیں، ٹکٹ میں خود خریدوں گا۔"

سکریٹری نے کہا "حضور یہ الکشن کا ٹکٹ نہیں ہے، ریل کا ٹکٹ ہے۔ یہ اتنی آسانی سے نہیں ملے گا۔ اس کے لیے تو باضابطہ فری اسٹائل کشتی لڑنی پڑتی ہے۔"

وہ بولے "تم فری اسٹائل کشتی کی فکر نہ کرو۔ پارٹی کے ہنگامی اجلاسوں میں شرکت کرتے کرتے میں بھی کشتی لڑنے کے فن سے تھوڑا بہت واقف ہوتا جارہا ہوں۔"

یہ کہہ کر منتری جی مسافروں کی کیو کو چیرتے ہوئے ٹکٹ گھر کی کھڑکی کی جانب بڑھنے لگے۔

لوگوں نے شور مچایا "مہاشے جی! کیو میں آجائیے۔ ہم یہاں گھنٹہ بھر سے کھڑے ہیں۔ آپ کہاں آگے بڑھے آرہے ہیں۔"

وہ بولے "جب سارا دیش آگے بڑھ رہا ہے تو مجھے بھی آگے بڑھنے کا حق ہے اور زندگی تو ہر دم آگے بڑھنے کا نام ہے۔" وہ آگے بڑھنا ہی چاہتے تھے کہ چار پانچ مسافروں نے انھیں پیچھے ڈھکیلتے ہوئے کہا "مہاشے جی! زندگی میں ضرور آگے بڑھیئے لیکن یہ تو کیو ہے۔ یہاں آدمی ایک گھنٹے میں ایک انچ کا فاصلہ طے کرتا ہے۔ کیا آپ اتنا بھی نہیں جانتے۔"

ان کا سکریٹری بڑا ہوشیار آدمی تھا۔ منتری جی کا سکریٹری بننے سے پہلے وہ ٹرینوں میں سفر کرنے کا تجربہ رکھتا تھا۔ اس نے کیو میں آگے جاکر کسی سے بات کی پھر منتری جی کو الگ لے جاکر اس نے کہا "میں نے کیو میں آگے ٹھہرنے کا بندوبست کرلیا ہے۔ اگر آپ فی کس ایک روپیہ دیں تو اگلے دو آدمی اپنی جگہ چھوڑنے کے لئے تیار ہیں۔"

منتری جی بہت خوش ہوئے اور بولے "واہ! یہ تو بڑا اچھا انتظام ہے۔ ہمیں یہ معلوم ہی نہ تھا کہ ریلوے ایڈمنسٹریشن نے عوام کی سہولت کے لیے یہ بندوبست بھی کر رکھا ہے۔" منتری جی نے دو روپے دیئے اور تھوڑی دیر بعد منتری اپنے سکریٹری کے ساتھ کیو میں آگے پہنچ گئے لیکن وہاں ٹکٹ فروخت کرنے کے لیے کوئی بھی نہیں تھا۔

منتری جی نے پوچھا "مگر ٹکٹ فروخت کرنے والا کلرک کہاں ہے"؟

کسی نے کہا "جو کلرک اب تک یہاں ٹکٹ فروخت کر رہا تھا اس کی ڈیوٹی ختم ہو چکی ہے۔ اب وہ ٹکٹ فروخت نہیں کرے گا، اس کی جگہ نیا کلرک آئے گا۔ اور جس کلرک کو یہاں آنا ہے اس نے ابھی فون پر اطلاع دی ہے کہ وہ اپنے محلہ کے بس اسٹانڈ کی کیو میں کھڑا بس کا انتظار کر رہا ہے۔ بس کی کیو میں جیسے ہی اسے ٹکٹ ملے گا وہ اسٹیشن پہنچے گا اور ہمیں اس کیو سے نجات دلائے گا۔"

منتری جی بولے "گویا ہمیں اس وقت تک ریل کا ٹکٹ نہیں مل سکتا جب تک کہ ریلوے کلرک کو بس کا ٹکٹ دل جائے؟"

سکریٹری نے کہا "حضور! ہمارے ملک کے سارے کام کیو میں طے پاتے ہیں۔ اور آدمی دن بھر ایک کیو میں سے نکل کر دوسری کیو میں جاتا رہتا ہے۔ اسی لیے تو ہمارے ملک میں سوشلزم کے آنے میں دیر ہو رہی ہے؟"

اسی اثنا میں ریلوے کا کلرک آگیا۔ منتری جی نے فوراً اپنا ہاتھ کھڑکی میں ڈال دیا۔ کلرک نے پوچھا "آپ کو کہاں کا ٹکٹ چاہیئے؟"

منتری نے پوچھا "یہ گاڑی کہاں تک جائے گی؟"

کلرک بولا "اگر راستہ میں کوئی حادثہ نہ پیش آئے تو یہ بمبئی تک جائے گی۔"

منتری بولے "تب تو مجھے بمبئی کے دو ٹکٹ دے دیجئے۔"

منتری جی اور ان کا سکریٹری ٹکٹ لے کر تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے پلیٹ فارم پر آگئے۔ گاڑی تیار کھڑی تھی۔ منتری جی ایک ڈبہ کے سامنے پہنچ کر کھڑے ہو گئے اور دروازہ کے راستے سے اس میں داخل ہونے کی کوشش کرنے لگے۔

سکریٹری نے پکار کر کہا "سرکار! آپ غلط راستہ سے ڈبہ میں داخل ہو رہے ہیں ـــ"

منتری نے کہا "مگر ڈبے میں جانے کا راستہ تو یہی ہے؟"

سکریٹری نے کہا "حضور تھرڈ کلاس کے ڈبے میں دروازہ صرف اس لیے لگایا جاتا ہے کہ اس کے راستے سے ڈبہ کے اندر ہوا آتی جاتی رہے۔ دروازے کو لوگ صرف ایمرجنسی میں استعمال کرتے ہیں۔ ورنہ ڈبہ کے اندر داخل ہونے کا صحیح راستہ تو وہ کھڑکیاں ہیں جو اس ڈبے میں جگہ جگہ لگائی گئی ہیں۔ سچ پوچھئے تو کھڑکیاں بھی ڈبے کے اندر داخل ہونے کا صحیح راستہ نہیں ہیں۔ آدمی کو اصولاً ڈبہ میں نقب لگا کر داخل ہونا چاہیئے۔ مگر میں نقب زنی کے فن سے واقف نہیں ہوں۔"

منتری جی فوراً ایک کھڑکی کے سامنے پہنچے۔

سکریٹری نے کہا "حضور آپ مجھے اٹھا کر اندر پھینک دیجئے۔"

منتری بولے "مگر ڈبے میں تو کوئی جگہ نہیں ہے۔"

سکریٹری بولا "آپ فکر نہ کریں۔ ریل کے ڈبے میں بڑی گنجائش ہوتی ہے۔

سمٹے تو دلِ عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

دریا کو کوزہ میں یہیں بند کیا جاتا ہے۔ آپ یقین کریں کہ اس ایک ڈبہ میں ہمارے ایک گاؤں کی پوری آبادی سما سکتی ہے۔ مسافر کو ڈبہ میں صرف پاؤں رکھنے کی جگہ مل جائے تو سمجھئے کہ اس کا پورا خاندان مع سامان اندر آسکتا ہے۔ آپ گھبرائیے

نہیں بلکہ پوری بے دردی کے ساتھ مجھے اندر ڈھکیل دیجئے ورنہ گاڑی چھوٹ جائے گی۔"

منتری جی نے فوراً اپنے سکریٹری کو اٹھایا اور اسے ایک گٹھڑی کی طرح کھڑکی میں رکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی ڈبے کے اندر شور و غل برپا ہوگیا۔" باہر نکالو اسے ڈبہ میں جگہ کہاں ہے؟ ہمارے سروں پر بیٹھے گا کیا!"

آن کی آن میں پورا ڈبہ سکریٹری کے خلاف سینہ سپر ہوگیا۔ سارے مسافر اسے باہر ڈھکیلنے لگے اور منتری جی اسے اندر ڈھکیلنے لگے۔ منتری کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ ان کا سکریٹری ہے، اس وقت تو ان کے اندر صرف انتقام کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح سارے مسافروں کو شکست دیں اور اپنے سکریٹری کو اندر ڈھکیل کر دم لیں۔ اسی کوشش میں انھوں نے اپنے کندھے سے زوردار دھکا اپنے سکریٹری کو دیا اور سکریٹری ڈبہ کے اندر پہنچ کر ایک مسافر کے سر پر بیٹھ گیا۔ مسافر چلّایا ـــ" ابے ہٹ، اِدھر کدھر بیٹھتا ہے، یہاں ہم بیٹھیلا ہے۔" اس پہ سکریٹری ایک اور مسافر کی پیٹھ پر سوار ہوگیا۔ اس نے پیٹھ اچھالی تو وہ ایک بڑھیا کی گود میں جا کر گر گیا۔ سکریٹری اس وقت تک تقریباً نیم بے ہوش ہوگیا تھا۔ بڑھیا نے اسے ڈانٹنے کی کوشش کی تو سکریٹری بڑی منت سے بولا:

"مائی اس سارے ڈبے میں مجھے ماں کی گود ہی سب سے زیادہ محفوظ جگہ نظر آرہی ہے، مجھے یہاں بیٹھنے دے۔"

" بڑھیا بولی" چل ہٹ، تو اگر میری گود میں بیٹھے گا تو میرا بیٹا اور اس کے دس بچے کہاں بیٹھیں گے۔" سکریٹری کو برابر والے مسافر کی گود خالی نظر آئی تو اس نے پوچھا بھیا جی، کیا آپ کی گود میں پہلے ہی سے کوئی بیٹھا ہوا ہے؟"

مسافر بولا، "دیکھتے نہیں۔ میری گود میں دو رومال رکھے ہوئے ہیں، یہ دونوں مسافر ابھی چائے پینے کے لیے گئے ہیں۔"

سکریٹری سنبھلتے سنبھلتے کھڑکی تک آگیا۔ منتری جی کھڑکی کے راستے سے اندر آنے کے لیے منتظر کھڑے تھے۔

سکریٹری بولا" حضور آپ کھڑکی میں اوپر چڑھ کر پہلے دونوں پاؤں کا ایک انگوٹھا اندر داخل کیجئے پھر میں رفتہ رفتہ آپ کو اندر کھینچ لوں گا۔"

منتری نے کہا" مگر اندر جگہ کہاں ہے؟"

سکریٹری بولا" حضور یہ سب کاریگری ہے۔ قدیم زمانے میں جب ہمارے کاریگر ململ کا پورا ایک تھان ایک انگوٹھی میں سے گزار دیا کرتے تھے تو کیا اب ہم ایک کھڑکی میں سے ایک منتری کو نہیں گزار سکتے۔ آپ چنتا نہ کریں ریل کی کھڑکی بہت کشادہ ہوتی ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ ضرورت پڑنے پر میں ساری ریل گاڑی کو انجن سمیت اس ڈبہ کی کھڑکی میں سے گزار سکتا ہوں۔ یہ سب تصوّف کا مسئلہ ہے۔ قطرہ سمندر میں جا ملتا ہے اور کبھی سمندر خود ایک قطرہ میں جا کر مل جاتا ہے۔"

اتنے میں ریل نے سیٹی بجائی۔ منتری جی فوراً کھڑکی پر چڑھ گئے اور اپنے دونوں پاؤں کھڑکی میں سے اندر داخل کر دیئے۔ سکریٹری نے فوراً منتری کے پاؤں پکڑ لیے اور پورا زور لگا کر انھیں اندر کھینچنے لگا۔ اسی اثناء میں مسافروں کی بھیڑ ایک ریلے کی شکل میں اس کے سامنے گزر گئی۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ اسے منتری جی نظر نہیں آرہے تھے مگر ان کے پاؤں ضرور نظر آرہے تھے۔ وہ منتری جی کے پاؤں کو خوب پہچانتا تھا۔ اس لیے کہ مختلف فلطیوں کے بعد اسے ان پاؤں کو چھونے کی ضرورت پیش آئی تھی۔ اسے ان پاؤں سے محبت بھی تھی اور نفرت بھی۔ جیسے ہی اسے منتری جی کے پاؤں پھر نظر آئے اس نے جھپٹ کر انھیں پکڑ لیا اور جھٹکا دے کر زور زور سے کھینچنے لگا۔ پھر پکار کر پوچھا "یہ بتائیے آپ کہاں تک اندر آگئے ہیں!"

دُور سے آواز آئی "بس ٹخنوں تک اندر آ گیا ہوں"۔

سکریٹری نے کہا : "بس بس اب فکر نہ کیجئے ۔ آپ آدھے اندر آ جائیں تو پھر دنیا کی کوئی طاقت آپ کو اندر آنے سے روک نہیں سکتی"۔

اسی اثناء میں گاڑی چلنے لگی اور سکریٹری نے اب کی بار پورا زور لگا کر منتری کو اندر کھینچ لیا ۔ منتری نے اندر پہنچتے ہی کہا "میں اندر آ گیا ہوں ۔ اب میرے پاؤں چھوڑ دو"۔

سکریٹری بولا "پاؤں کیسے چھوڑ دوں سرکار ۔ میری دونوں بغلوں میں اس وقت دو مسافر آ گھسے ہیں ۔ میری گردن پر ایک اور مسافر کا پاؤں رکھا ہوا ہے جو اُوپر برتھ پر رکھے ہوئے صندوق اور صندوق پر رکھے ہوئے اٹیچی کیس اور اٹیچی کیس پر رکھے ہوئے ہولڈال پر چڑھنا چاہتا ہے ۔ آپ اسی طرح لیٹے رہیں ۔ جب تک میں اس شکنجہ سے آزاد نہ ہو جاؤں اس وقت تک میں آپ کے چرنوں میں ہی رہنا چاہتا ہوں"۔

منتری کی آواز آئی "مگر بے وقوف ، اس وقت میرے سینہ پر دو مسافر بیٹھ گئے ہیں؟"

سکریٹری بولا "تھوڑی دیر صبر کیجئے ، گاڑی چلنے لگے گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا"۔

پھر گاڑی چلنے لگی ۔ تھوڑی دیر بعد منتری جی نیچے سے نکل آئے اور ایک کٹھڑی پر بیٹھ گئے ۔ سکریٹری نے انھیں دیکھا اور انھوں نے سکریٹری کو دیکھا ۔ منتری جی کے شرٹ کی ایک آستین کندھے سے پھٹ کر بالکل غائب ہو گئی تھی البتہ سیدھے ہاتھ میں ایک آستین ضرور موجود تھی ۔

منتری بولے "ایک آستین کا شرٹ اچھا نہیں معلوم ہو رہا ہے کیوں نہ میں دوسری آستین بھی پھاڑ دوں"۔

سکریٹری بولا "ایسی غلطی نہ کیجئے ۔ بعد میں ڈبے سے اُترتے وقت آپ کو ایک اور آستین کی ضرورت پیش آئے گی ۔ اُترتے وقت آپ کے شرٹ میں چھٹنے کے لیے کچھ تو باقی رہنا چاہیئے"۔

منتری جی کی سمجھ میں یہ بات آ گئی ۔ یوں بھی ڈبہ میں سوار ہونے کے بعد ان کی سمجھ کافی بہتر ہو گئی تھی ۔

زندگی میں پہلی بار منتری جی تھرڈ کلاس کے ڈبے میں ایک عام مسافر کی طرح سفر کر رہے تھے ۔ وہ اس سفر سے لطف اُٹھانا چاہتے تھے ۔ انھوں نے سارے ڈبے میں حیرت سے نظر ڈالی ، پورا ڈبہ ایک جان ہزار قالب بن گیا تھا لوگ ایک دوسرے سے چپک کر یوں کھڑے تھے جیسے سارے مسافر مل کر ایک ہی جسم میں تبدیل ہو گئے ہوں ۔ ڈبے کے آخری سرے پر جس آدمی کا دل دھڑک رہا تھا اس کی آواز دوسرے سرے پر کھڑے ہوئے آدمی کے سینہ میں صاف سُنائی دے رہی تھی ۔ آخری کونہ میں کوئی مسافر کروٹ بدلتا تھا تو اس کی کروٹ سمندر کی ایک لہر کی طرح سارے ڈبے میں پھیل جاتی تھی ۔ اور سارے ڈبے میں ہلچل سی پیدا ہو جاتی تھی ۔ مشرقی دروازے سے ہوا کا کوئی جھونکا جب زور سے داخل ہوتا تھا تو ڈبہ میں ہوا کے لیے جگہ فراہم کرنے کی غرض سے مغربی دروازے میں کھڑا ہوا مسافر ڈبے سے باہر لہرانے لگتا تھا ۔ اسی اثناء میں ایک مسافر کے پاؤں پر صندوق گر گیا تو اس چوٹ کا کرب سارے مسافروں کے جسم میں دوڑنے لگا ۔ منتری جی نے تھوڑی دیر کے لیے سوچا کہ اگر ساری قوم اسی طرح متحد ہو جائے تو ملک کیا سے کیا ہو جائے گا ۔

منتری جی نے دیکھا کہ ایک مسافر دونوں برتھوں پر اپنی کہنیاں ٹکائے کھڑا ہے اور اس کے اطراف دوسرے مسافر بیل کی طرح لپٹ گئے ہیں ۔ اس کا سر برتھ پر رکھے ہوئے ہولڈال کے نیچے دب گیا ہے اور اس کی ٹھوڑی کے نیچے ایک اور مسافر کا سر آ گیا ہے ۔ لہٰذا وہ اپنی گردن ایک طرف موڑ کر کھڑا ہے ۔ اُوپر برتھ پر ایک مسافر نے سگریٹ جلا لیا ہے اور

بار بار سگریٹ کی راکھ اس مسافر کے کان میں جھاڑ رہا تھا۔ طنزی جی نے زندگی میں پہلی مرتبہ کان کا بطور ایش ٹرے (ASH TRAY) استعمال ہوتے دیکھا۔ جس مسافر کے کان میں راکھ جھاڑی جارہی تھی وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ اس کا حلق ایک مسافر کی کہنی میں پھنس گیا تھا۔ تاہم جب اوپر بیٹھے ہوئے مسافر نے کافی راکھ جھاڑنے کے بعد اس کے کان میں سگریٹ بجھانے کی کوشش کی تو وہ درد کے مارے چیخ اٹھا مگر وہ پھر بھی اپنی جگہ سے نہ ہل سکا۔

سامنے دو مسافر ایک دوسرے میں پیوست ہوکر کھڑے تھے۔ دونوں کو سگریٹ نوشی کی طلب ہوئی تو دونوں نے ایک ساتھ اپنے ہاتھ اپنی اپنی پتلونوں کی جیبوں میں داخل کئے۔ وہاں سے سگریٹ کی ڈبیاں نکل آئیں تو وہ دونوں حیران رہ گئے۔

ایک نے کہا "میں تو چار مینار سگریٹ پیتا ہوں۔ یہ برکلے کی ڈبیا میری جیب میں کیسے آگئی"؟ دوسرے نے کہا "میں تو برکلے پیتا ہوں۔ یہ چار مینار کی ڈبیا کہاں سے آگئی"؟ دونوں نے حیران ہوکر اپنے ہاتھ پھر جیبوں میں داخل کئے مگر جب ان کی نظر اپنے ہاتھوں پر پڑی تو پتہ چلا کر دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے کی جیبوں میں جارہے ہیں۔

دونوں مسکرا کر بولے "ٹھیک ہے میری پتلون تم استعمال کرو اور تمہاری پتلون میں استعمال کرتا ہوں"۔

اسی اثناء میں ایک مسافر دوسرے مسافروں کے سروں پر سے چلتا ہوا ڈبے کے بیت الخلاء کے پاس پہنچا۔ اس نے بیت الخلاء کے دروازے پر زوردار گھونسے رسید کرنا شروع کردیئے۔ اتنے میں تین چار مسافروں کی آوازیں آئیں "کون ہے"؟

مسافر بولا "باہر نکلو میں اندر آنا چاہتا ہوں"۔

اندر سے بیک وقت کئی مسافر بول اٹھے "کسی اور بیت الخلاء کی طرف جاؤ، یہ بیت الخلاء تو ریزروڈ (RESERVED) ہے۔

مسافر بولا "بیت الخلاء کیسے ریزرو ہوسکتا ہے؟"

اندر سے آواز آئی "ہم لوگ پیچش کے مریض ہیں اور ہم نے بطور خاص یہ بیت الخلاء ریزرو کروایا ہے"۔ مسافر لاجواب ہوگیا اور پھر لوگوں کے سروں پر سے چلتا ہوا ڈبے کے پنکھے سے لٹک گیا۔

کسی نے کہا "بھئی پنکھا چلاؤ بڑی گرمی ہورہی ہے"۔

دوسرے مسافر نے پنکھا کا سوئچ آن کردیا۔ اس کے جواب میں پنکھے کی پتیوں میں تو کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی، البتہ پنکھے کے اطراف جالی کا جو خول ہوتا ہے وہ دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں ہلنے لگا اور اس کے ساتھ ہی وہ مسافر بھی جو پنکھے سے لٹک کر کھڑا ہوگیا تھا جھولنے لگا۔

لٹکنے والے مسافر نے چیخ کر کہا "بدتمیزو پنکھا بند کرو۔ اس کی پتیاں تو نہیں گھوم رہی ہیں، ہوا آنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صرف خول ہل رہا ہے اور خول کے ساتھ میں بھی ہل رہا ہوں"۔

نیچے بیٹھے ہوئے مسافروں نے کہا "پنکھا بند نہ کرو پنکھے کے خول کے ساتھ اس آدمی کے ہلنے سے بھی تھوڑی بہت ہوا پیدا ہورہی ہے"۔ اور وہ شخص مجبور ہوگیا اور پنکھے کے خول کے ساتھ خود بھی ہلنے لگا۔ اتنے میں سامنے بیٹھے ہوئے مسافر نے بڑی مشکل سے پہلو بدلتے ہوئے کہا: "باپ رے" پتہ نہیں ہماری ریلوں کا انتظام کب ٹھیک ہوگا۔

دوسرے نے کہا "کیا ٹھیک ہوگا جی، ہمارے ریل منتری تو صرف بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں۔ پرسوں ہی ان کا بیان اخبارات میں چھپا تھا۔ منتری جی کہتے ہیں کہ "دیش میں ٹرینوں کے ذریعہ ہی سوشلزم آئے گا۔"

تیسرے مسافر نے کہا "بھگوان سوشلزم کی رکھشا کرے۔ ہمارے دیش میں سوشلزم بیل گاڑی میں بیٹھ کر ہی آئے تو اچھا ہے۔ ریل گاڑی میں آئے گا تو منزل تک پہنچتے پہنچتے اس کا کچومر نکل جائے گا۔"

چوتھے مسافر نے کہا "آپ منتری جی کے بیان کا مطلب نہیں سمجھے۔ سوشلزم ریل گاڑی میں ہی آئے گا مگر فرسٹ کلاس کے ڈبّے میں بیٹھ کر آئے گا، سمجھے۔ ہمارے سوشلزم کو تھرڈ کلاس کے ڈبّے سے کیا مطلب؟"

منتری جی، اُن باتوں کو سُن کر اچانک غصّے میں آگئے۔ انھوں نے جھٹ سے کہا "آپ لوگوں نے غلط سمجھا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں تھا۔ بلکہ ـــ"

وہ آگے کچھ کہنا چاہتے تھے کہ ان کے سکریٹری نے فوراً اُن کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کان میں کہا "حضور یہ آپ کیا کرتے ہیں؟ آپ تو اس وقت بھیس بدلے ہوئے ہیں۔"

منتری جی کو اچانک اس بات کا خیال آگیا اور وہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔

اتنے میں گاڑی ایک پُل پر سے گزرنے لگی۔ پھر اچانک دھماکے کی آواز آئی۔ مسافروں کی چیخ و پکار سے سارا ماحول گونج گیا اور ٹرین دریا میں گرنے لگی۔ منتری جی گھبرا کر فوراً اپنے سکریٹری سے لپٹ گئے۔

مگر سکریٹری نے انھیں پرے ڈھکیلتے ہوئے کہا "اب میرے قریب نہ آؤ، مرنے کا وقت آگیا ہے، نہ تم میرے منتری نہ میں تمہارا سکریٹری۔ اپنی جان آپ بچاؤ، میں تو چلا" یہ کہہ کر سکریٹری کھڑکی سے دریا میں کود گیا۔

منتری جی نے بھی ایک زور دار چیخ لگائی اور اس چیخ کی آواز سے ان کی آنکھ اچانک کھل گئی۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ تو اپنی خواب گاہ میں ایک آرام دہ بستر پر لیٹے ہوئے ہیں اور دور سے کسی مرغ کے بانگ دینے کی آواز آرہی ہے۔

منتری جی کو پھر بڑی دیر تک نیند نہ آئی۔ اس ڈراؤنے خواب کو دیکھ کر ان کی طبیعت بوجھل ہوگئی تھی۔

دوسرے دن وہ اپنے دفتر گئے تو ان کا موڈ کافی خراب تھا ـــ ان کا سکریٹری جیسے ہی ان کے کمرے میں داخل ہوا انھوں نے گرج کر کہا "تم اسی وقت میرے سامنے سے چلے جاؤ۔ مجھے تم جیسے نمک حرام سکریٹری کی ضرورت نہیں ہے۔ تم آج سے ڈسمس کئے جاتے ہو۔ نکل جاؤ یہاں سے۔"

سکریٹری بولا "مگر میرا قصور؟"

منتری بولے "میں کچھ نہیں سُننا چاہتا، نکل جاؤ میرے سامنے سے۔"

اور سکریٹری چپ چاپ منتری جی کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ سچ مچ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہے۔

قصہ داڑھ کے درد کا

اور ایک دن اچانک ہماری داڑھ میں یوں درد شروع ہوگیا جیسے آسمان پر یکایک قوس قزح نکل آتی ہے اور قوس قزح کے نکل آتے ہی ساتوں طبق روشن ہوگئے۔ یوں تو ہم انواع و اقسام کے "دردوں" سے گزر چکے تھے۔ پیٹ کا درد، سر کا درد، کمر کا درد، دل کا درد، قوم کا درد اور اولاد کے درد سے لے کر خواجہ میر درد تک ہم سبھی دردوں سے آشنا تھے، لیکن داڑھ کا درد ہمارے لئے بالکل نیا تھا، اردو شاعری میں جگہ جگہ ایسے مصرعے پڑھتے آئے تھے کہ

ع آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

یا

ع درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

لیکن ہمیں ان مصرعوں کی صداقت پر کبھی یقین نہیں آیا تھا۔ کیوں کہ ہم نے آج تک کبھی درد کو حد سے گزرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ مگر صاحب داڑھ کا درد ہی ہمیں وہ واحد درد نظر آیا جو حد سے گزر جانے کی بڑی زبردست صلاحیت رکھتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر سیدھے جبڑے کی داڑھ میں درد ہو رہا ہو تو وہ صرف داڑھ تک محدود نہیں رہے گا بلکہ یہ حد سے گزر کر آپ کے گال کو آپ کے جبڑے سے کم از کم پانچ چھ انچ دور کر دے گا اور جبڑے اور گال کے درمیان ایک "غیر جانبدار علاقہ" پیدا کر دے گا۔ آپ کو یوں محسوس ہوگا جیسے آپ کا گال آپ کے جسم سے کافی فاصلہ پر واقع ہے۔ آپ سڑک پر چلنے لگیں تو یوں محسوس ہوگا جیسے آپ کا گال آپ سے آگے چل رہا ہو اور آپ صرف اسے پکڑنے کے لئے بھاگے جا رہے ہوں کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے جو گال آپ کے ساتھ چل رہا ہے وہ آپ کا نہیں کسی اور کا ہے۔ جبڑے اور گال کے درمیان یہ جو "ہجر کی کیفیت" پیدا ہو جاتی ہے وہ بڑی کربناک ہوتی ہے اور یہی داڑھ کے درد کا نصب العین بھی ہوتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو داڑھ کے درد میں مزہ ہی کیا باقی رہ جائے!

جب داڑھ کا درد اپنی حدوں کو پھلانگ کر کائنات کی وسعتوں میں پھیلنے کی کوشش کرنے لگتا ہے تو کائنات بھی درد کی وسعت کے آگے ایک ادنیٰ سا نقطہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ جب پہلے پہل ہمارے سیدھے جبڑے

والی داڑھ کا درد حد سے سوا ہو گیا اور ہم سیدھی جانب زیادہ جھکاؤ محسوس کرنے لگے تو اس عدم توازن کے احساس نے ہم میں بڑی بے چینی پیدا کر دی۔ آئینہ میں صورت دیکھی تو پتہ چلا کہ آئینہ میں ہماری جگہ ایک بھوت کھڑا ہے۔ ہم گھبرا کر فوراً دانتوں کے ایک ڈاکٹر کے پاس بھاگے۔ وہ ہمیں پہلے سے جانتے تھے لیکن داڑھ کے درد کے سبب انہوں نے ہمیں پہچاننے سے انکار کر دیا۔ ہم نے اس بات کی شکایت کی تو بولے "بھائی صاحب! داڑھ کے درد کے بعد آدمی کی پہچان بڑی مشکل ہو جاتی ہے۔ مجھے تو اپنے سارے ہی مریض "ہم شکل" نظر آتے ہیں۔ کس کس کو کہاں تک پہچانوں؟ یوں بھی آپ کے سامنے اگر بہت ساری ڈبل روٹیاں ایک ساتھ رکھ دی جائیں تو آپ ان ڈبل روٹیوں کو کیسے پہچانیں گے کہ یہ ڈبل روٹی زید ہے اور وہ ڈبل روٹی بکر ہے۔ داڑھ کے درد کی خوبی یہی ہوتی ہے کہ آدمی کے چہرے کو دیکھئے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے آدمی کا چہرہ ڈبل روٹی بنانے کی مشین میں سے ڈھل کر نکلا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی اس طویل اور دلچسپ گفتگو کے بعد جب ہم نے اپنی آمد کی غرض و غایت بتانی چاہی تو وہ بولے: غرض و غایت بتلانے کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ آپ کا گال خود اس غرض و غایت کی غمازی کر رہا ہے"۔ یہ کہہ کر انہوں نے ہمارا منہ کھولنا چاہا تو یوں لگا جیسے منہ پر تالا لگ گیا ہے۔ بڑی مشکل سے انہوں نے ایک ایسا زاویہ بنایا کہ ہماری داڑھ انہیں نظر آ گئی جو ہمارے سارے وجود کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمارا منہ غڑاپ سے بند کرتے ہوئے کہا "اس وقت تو میں اس داڑھ کو نہیں نکال سکتا۔ چند روز اور اس داڑ کے ساتھ نباہ کیجے۔" ہم نے کہا "ڈاکٹر صاحب! مجھے اس داڑھ کے ساتھ نباہ کرنے میں کوئی عذر نہیں ہے۔ لیکن یہ جو میری گردن پر ڈیڑھ چہرہ ابھر آیا ہے کم از کم اسے تو ٹھیک کر دیجئے۔ یہ عدم توازن مجھ سے اور بالخصوص میری بیوی سے بالکل نہ دیکھا جائے گا۔"

وہ بولے "بھیا ڈیڑھ چہرہ میں توازن و تناسب پیدا کرنے کا ایک ہی علاج ہے۔"

ہم نے پوچھا "وہ کیا؟"

بولے "کسی طرح آپ کے بائیں جبڑے والی داڑھ میں بھی درد کو داخل کرنا ہوگا۔ پھر یہ درد بھی پھیل کر آپ کے بائیں جبڑے کی حدوں کو پھلانگتا ہوا کائنات کی وسعتوں میں پھیل جائے گا اور اس کے بعد آپ کے دونوں جبڑے "جیومٹری" کے اصولوں کے مطابق مساوی ہو جائیں گے۔ کہئے تو آپ کے بائیں جبڑے کی داڑھ میں درد کا افتتاح فرما دوں۔"

ہم نے کہا: "ڈاکٹر صاحب چاہے کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو میں چاہتا ہوں کہ آپ میری داڑھ کو نکال پھینکیں۔ میں یوں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ذلت کی موت مرنا نہیں چاہتا۔ ٹیپو سلطان نے کیا خوب کہا تھا کہ "شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے بہتر ہوتی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب بولے "قبلہ خبردار! آپ کی داڑھ کا درد اب فلسفہ بکنے لگا ہے۔ یہ بڑا خطرناک اسٹیج ہے۔ اپنے آپ پر قابو پائیے ورنہ تاریخ میں ٹیپو سلطان کا تو کچھ بھی نہیں بگڑے گا لیکن آپ کا رہا سہا جغرافیہ بھی برباد ہو جائے گا۔ پھر یہ بھی سوچئے کہ اگر میں ہر مریض کی داڑھ فوراً نکال دیا کروں تو میرا کاروبار کیسے چلے گا؟ ایک داڑھ پر مجھے کم از کم سو روپے تو ملنے ہی چاہئیں۔ آپ اپنی داڑھ کا پہلے سو سال

کی حد تک علاج کروا یئے، اس کے بعد میں بلا چوں و چرا آپ کی داڑھ نکال دوں گا"۔ یہ باتیں کہتے ہوئے اچانک ڈاکٹر صاحب کی مصنوعی بتیسی ان کے منہ سے باہر نکل آئی اور وہ اپنے پوپلے منہ سے بولے "اب آپ میری فیس مشورہ دیجئے۔ اور چلتے بنئے ــــ"

ہم نے کہا "حضور! آپ نے مشورہ ہی کون سا دیا ہے جو میں آپ کو اس کی فیس ادا کروں"

وہ بولے "میں نے تو تمہیں ایک بہترین مشورہ دیا ہے کہ داڑھ کے درد کو فلسفہ سے دور رکھو ورنہ آدمی باقی نہ رہو گے فلسفی ہو جاؤ گے"۔

ہم غصّے کے مارے ڈاکٹر صاحب کے کلینک سے باہر نکل آئے چند قدم ہی چل پائے تھے کہ داڑھ مذکور میں اچانک بجلی سی کوند گئی۔ برق کی ایک رَو تھی جو داڑھ سے نکل کر سارے بدن میں ہر اگئی۔ ایک تجلّی تھی جو آنکھوں کو چکاچوند کر گئی۔ یوں لگا جیسے ہماری داڑھ میں اچانک ایک ہرن نے کلیلیں بھرنا شروع کر دیا ہو۔ جیسے کسی نے ہماری داڑھ میں توپ داغ دی ہو یا ایک ٹرین چلتے چلتے ہماری داڑھ میں پٹڑی سے اُتر گئی ہو۔ جیسے ہماری داڑھ میں اچانک فوجی انقلاب آیا ہو۔ کیفیات کا اتنا ہجوم تھا کہ ہمارے لیے یہ پتہ چلانا مشکل تھا کہ ہماری داڑھ میں کیا ہو رہا ہے اور کیا نہیں! یوں لگتا تھا جیسے ہم سراپا داڑھ بن گئے ہیں۔

ہم درد کے اس اچانک حملے سے سنبھلنے کے لیے ایک الکٹرک پول کا سہارا لے کر کھڑے ہو گئے اور ہماری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ یوں لگا جیسے ساری کائنات ایک بہت بڑی داڑھ ہے۔ داڑھ ہی کائنات ہے۔ داڑھ کے سوا اس دنیا میں کچھ بھی نہیں۔ ہر شئے داڑھ سے شروع ہوتی ہے اور داڑھ پر ختم ہو جاتی ہے۔ عدم سے پہلے بھی داڑھ تھی اور ہستی سے پرے بھی داڑھ ہے۔ ازل داڑھ اور ابد داڑھ۔ یکلخت ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے سورج ہمارے منہ میں آگیا ہو، اور ہم اسے چبا چبا کر کھا رہے ہوں۔ جی چاہتا تھا کہ سورج کو چبا کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں پھر سورج کے ان ٹکڑوں کو لوگوں میں بانٹ دیں کہ بھئی اپنے اپنے گھروں میں اجالا کرو۔ ہر شخص کا اپنا سورج الگ ہونا چاہیئے۔ ہر شخص کی صبح الگ ہونی چاہیئے۔ اتنی بڑی کائنات کو ایک سورج کے تابع کر دینا مناسب نہیں ہے۔ آؤ کہ ہم سب مل کر سورج کو تقسیم کریں اور اس کے ٹکڑوں کو اپنی اپنی جیبوں میں رکھ لیں تاکہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آئیں۔

داڑھ کے درد کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ یہ درد بالاقساط ہوتا ہے یعنی درد کی ایک لہر جاتی ہے اور دوسری آتی ہے۔ جب درد کی پہلی لہر جا چکی تو ہم پر یہ عظیم انکشاف ہوا کہ درد کی ہر لہر کے ساتھ ہم میں "جدید شاعر" بننے کی زبردست صلاحیتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ ایسے پیغمبرانہ انکشافات صرف داڑھ کے درد میں ہی ممکن ہیں اچانک ہم پر یہ راز کھلا کہ "جدید شاعری" اصل میں "داڑھ کے درد کی شاعری" ہے جس میں آدمی کا سارا کرب سمٹ آتا ہے اور وہ سورج کو چبا کر کھا جانے کی منزل میں پہنچ جاتا ہے۔ ہم اب تک حیران تھے کہ ہمارے اکثر جدید شاعر ایسے تکلیف دہ اور کرب انگیز خیالات

کو آخر کس طرح اتنی آسانی اور روانی سے اپنی شاعری میں پیش کر دیتے ہیں۔ اب داڑھ کے درد سے سابقہ پڑا تو احساس ہوا کہ یہ تو بڑی آسان سی بات ہے۔ جدید شاعر بننا ہو تو پہلے اپنی داڑھ میں درد پیدا کیجئے اور دیکھیے کہ کس طرح ؎

ع "آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں"

آپ یقین کریں کے درد کی پہلی لہر کے ساتھ ہی ہم نے شاعر بن جانے کی ٹھان لی تھی اور سوچا تھا کہ دوسری لہر میں ڈوب کر ایک شاہکار نظم نکال لائیں گے لیکن درد کی پہلی لہر اور دوسری لہر کے درمیان جو وقفہ ہوتا ہے وہ آدمی کو پھر خیال کی رفعتوں سے پستیوں میں لے آتا ہے۔ ہم نے سوچا کہ جب ہمارے پاس کوئی تخلص ہی نہیں ہے تو پھر نظم کہنے سے کیا فائدہ؟

خیر صاحب ہم اسی طرح درد کی لہروں سے گزرتے ہوئے اپنے گھر پہنچ گئے۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ اس دن گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ جو بچہ ہمیں دیکھتے ہی لپٹ جایا کرتا تھا وہ ہمیں دیکھ کر اُلٹے پاؤں بھاگ گیا۔ وہ بیوی جو ہمارے گھر میں قدم رکھتے ہی کوئی نہ کوئی مسئلہ ہمارے سامنے رکھ دیتی تھی وہ ہمیں دیکھ کر چپ چاپ رسوئی گھر میں چلی گئی۔ ہم گھر کی اس بدلی بدلی فضا کو بھانپ نہ سکے۔ جب بڑی دیر تک کسی نے ہمارا حال نہ پوچھا تو ہم نے غصّے سے کہا "آخر اس گھر میں سب کو سانپ کیوں سونگھ گیا ہے؟ آخر معاملہ کیا ہے؟"

ہمارے اس سوال کو سن کر بیوی نے کہا "مجھے آپ سے ہمیشہ یہی شکایت رہی کہ دفتر میں اپنے عہدیدار کی گالیاں سن کر آتے ہیں اور غصّہ ہم لوگوں پر نکالتے ہیں۔ میں تو آپ کے گھر میں داخل ہوتے ہی سمجھ گئی تھی کہ آج آپ کا "موڈ" اچھا نہیں ہے۔ جبھی تو آپ گال پھلائے اور منہ بسورے گھر میں داخل ہو رہے ہیں۔ اب کوئی آپ کا حال پوچھے تو کیسے؟ آپ تو ایسی حالت میں کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ آج آپ کے عہدیدار نے کچھ زیادہ ہی ڈانٹ پلائی ہے۔ ذرا دیکھئے تو آپ کا گال کتنا پھول گیا ہے۔ اتنی ڈانٹ تو آپ نے پہلے کبھی نہیں کھائی تھی۔

ہم نے درد سے کراہتے ہوئے کہا: "ای نیک بخت! تجھے ہمیشہ الٹی بحث کرنے کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ میں داڑھ کے درد کی وجہ سے مرا جا رہا ہوں اور تجھے اس میں میرے عہدہ دار کی ڈانٹ نظر آرہی ہے۔"

ہمارے اس انکشاف کو سنتے ہی سارے افرادِ خاندان کی باچھیں کھل اٹھیں۔ بچے دوڑ کر ہم سے لپٹ گئے اور بولے "اگر سچ مچ آپ کی داڑھ میں درد ہے تو ہمیں اس بات کی بڑی خوشی ہے ورنہ ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ آج بھی آپ دفتر سے ڈانٹ سن کر آئے ہیں۔ اور اب تھوڑی ہی دیر میں ہماری پٹائی ہونے والی ہے"۔

داڑھ کے درد کے بعد آدمی خواہ مخواہ ہی معزز نظر آنے لگتا ہے۔ سیدھے جبڑے والی داڑھ کے درد کے زمانے میں ہی ہمارے کئی دوست صرف اس لیے ہم سے کنارہ کش ہو گئے تھے کہ ہم صورتاً انہیں مغرور نظر آنے لگے تھے۔ جگہ جگہ ہمارے غرور کے چرچے ہونے لگے تھے کہ صاحب ادھر جب سے دفتر میں اسے ترقی ملی ہے بس ہمیشہ منہ پھلائے رہتا ہے۔ کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا بلکہ یوں کہئے کہ ٹیلیگرام کی زبان

میں بات کرتا ہے۔ سیدھے جبڑے میں اتنا غرور آ گیا ہے کہ یہ ہمیشہ دو تین انچ پھولا رہتا ہے۔"

اب یہ محض اتفاق تھا کہ ہماری ترقی اور داڑھ کا درد دونوں ایک ساتھ شروع ہوئے تھے ورنہ کہاں غرور اور کہاں ہم! بعد میں جب بائیں جبڑے والی داڑھ میں بھی درد شروع ہو گیا تو ہمارے اچھے دوستوں نے بھی ہم سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ نہ داڑھیں رہیں اور نہ ہی دوست اب کسے کیسے سمجھاتے پھریں کہ بھائی صاحب سارا قصور داڑھ کے درد کا ہے ہم تو ازل سے معصوم آدمی ٹھہرے۔ زندگی میں ایک ہی بار ہم نے غرور کا مظاہرہ کیا تھا۔ جب ہم اپنی شادی کے موقعہ پر گھوڑی پر سوار ہو کر اپنی سابقہ دلہن یعنی موجودہ بیوی کے گھر گئے تھے اور اس غرور کا جو نتیجہ برآمد ہوا ہے وہ ہمارے چھ بچوں کی صورت میں دنیا پر ظاہر ہے۔ اس غرور کا کفر اس طرح ٹوٹا ہے کہ ہمیں خود "غرور" کے معنی معلوم کرنے کے لیے "ڈکشنری" دیکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ مگر کیا کریں کہ اس داڑھ کے درد کی وجہ سے ہم دنیا والوں میں ایک مغرور آدمی کی حیثیت سے کافی شہرت رکھتے ہیں۔

ہمارے ساتھ ایک اور ستم بھی ہوا تھا یعنی نہ صرف ہم داڑھ کے درد میں مبتلا تھے بلکہ قدرت نے ہمارے عہدہ دار کو بھی اسی نعمت غیر مترقبہ سے نوازا تھا۔ اور آپ کو جانتے ہیں کہ داڑھ کا درد رکھنے والے دو اشخاص کس بات پر متفق نہیں ہوتے کیونکہ داڑھ کے درد کے بعد آدمی "داخلیت پسندی" کا شکار ہو جاتا ہے اور اپنی ذات کی تنہائی میں بند ہو کر اپنی بساط کے مطابق داڑھ کے درد کو قبول کرتا ہے۔ نتیجہ میں "ترسیل کا المیہ" پیدا ہو جاتا ہے۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ ہم کوئی تجویز لکھ کر اس کے پاس بھیج دیتے اور وہ اسے مسترد کر دیتا۔ وہ کوئی آرڈر لکھ کر ہمارے پاس بھیجتے اور ہم اس میں نئی پیچیدگیاں پیدا کر دیتے "ترسیل کا المیہ" اس نوبت کو پہنچ گیا تھا، جہاں ہم دونوں میں دفتری آداب کے خلاف "تو تو میں میں" کا آغاز ہو گیا تھا۔ یہ غلط فہمی اور بھی بڑھتی مگر ایک دن جو ہم عہدہ دار کے کمرے میں اچانک چلے گئے تو دیکھا کہ وہ اپنا گال پکڑے بیٹھا ہے۔ ہم نے پوچھا "کیا آپ کی داڑھ میں کچھ ہو رہا ہے"؟

وہ بولا۔ "ہاں بہت درد ہے۔"

اس پر ہم نے اپنا گال پکڑتے ہوئے کہا "ادھر بھی وہی حال ہے۔"

تب ہم نے اسے سمجھایا کہ اصل میں ہم دونوں کے اختلافات کی اصل وجہ ہم دونوں کی داڑھیں ہیں۔ ہم دونوں کی داڑھوں میں جب ایک ساتھ درد ہوتا ہے تو اس کا لازمی انجام اختلاف رائے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ آسان بات ہمارے عہدہ دار کی سمجھ میں آ گئی۔ یوں بھی اس وقت تک اس کی عقل داڑھ کرنے کی منزل میں پہنچ گئی تھی۔

بعد میں ہم دونوں نے متفقہ طور پر ایک معاہدہ کیا۔ جب ہم کسی فائل میں کوئی تجویز پیش کرتے تو اس تجویز کے نیچے دستخط کرنے کے بعد چھوٹے حروف میں "داڑھ کا درد" بھی لکھ دیتے۔ وہ فائل دیکھ کر سمجھ جاتا کہ یہ تجویز داڑھ کے درد کے دوران میں لکھی گئی ہے۔ اگر وہ اس تجویز کو مسترد کرتا تو وہ بھی دستخط کرنے کے بعد نیچے چھوٹے حروف میں "داڑھ کا درد" لکھ دیتا۔ کچھ دن بعد اس نے یہ طریقہ بھی بنا لیا تھا کہ جب بھی کوئی

فائل اس کے سامنے پیش ہوتی تو وہ اس پر لکھ دیتا "داڑھ کے درد کے بعد پیش کی جائے" اس طرح دفتر میں دو اقسام کی فائلیں بن گئی تھیں۔ یعنی داڑھ کے درد سے پہلے کی فائلیں اور داڑھ کے درد کے بعد کی فائلیں۔

فائلوں کی بات تو چھوڑیئے، ہم نے اپنی پوری زندگی کو اسی طرح دو حصّوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ایک زندگی وہ جو داڑھ کے درد سے پہلے تھی۔ اور دوسری زندگی وہ جو داڑھ کے درد کے بعد پیدا ہوئی ہے۔ اب تو ہماری ساری داڑھیں اُکھڑ چکی ہیں گویا ہم بھی اب دانتوں کے ڈاکٹر بن گئے ہیں۔ بلکہ یوں کہئے کہ اب تو ہماری مصنوعی بتیسی کے دانتوں کے اکھڑنے کی بھی باری آ گئی ہے۔ مصنوعی بتیسی کے دانت نہ ٹوٹیں گے تو اور کیا ہوگا۔ کیوں کہ جب ہم اپنی مصنوعی بتیسی نکال کر سو جاتے ہیں تو بچّے اس بتیسی کو کھلونے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ گھنٹوں یہ اپنے ڈیڈی کے دانتوں سے کھیلتے رہتے ہیں۔ ہم پولی شکایت کرتے ہیں تو بیوی کہتی ہے "ایسی بھی کیا جلدی ہے، کھانا تو دس بجے کھاتے ہو۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اگر بچے آپ کی مصنوعی بتیسی سے کھیل لیتے ہیں تو ایسی کونسی آفت آجاتی ہے۔ کبھی تمہیں اتنی توفیق تو نہیں ہوتی کہ بچّوں کے لیے کھلونے ہی لے آؤ۔ اب بچّوں نے تمہاری بتیسی میں سے اپنے لئے ایک کھلونا ایجاد کر لیا ہے تو اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ یوں بھی تم گھر میں ہمیشہ منہ پھلائے رہتے ہو۔ حسرت رہ گئی کہ بچے تمہارے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ دیکھیں جو دانتوں کا دیدار کرا دے۔ اب اگر بچّے تمہاری مسکراہٹ کے بغیر دانت دیکھ کر خوش ہو لیتے ہیں تو انہیں خوش ہو لینے دو کہ یہ ایک تبسّم بھی کسے ملتا ہے

اور ادھر جب سے ہمارے بچپن کے دوست مانگے رام جی ہمارے پڑوسی بن کر آئے ہیں، ہماری مصنوعی بتّیسی بے گھر ہو گئی ہے۔ مانگے رام جی کو جب بھی کچھ کھانے کی ضرورت پیش آتی ہے تو پکار کر کہتے ہیں۔ "بھیا تمہاری بتّیسی اگر خالی ہو تو تھوڑی دیر کے لیے بھیج دینا، میں مونگ پھلی کھا کر اور سماج کے خلاف ذرا دانت پیس کر تمہاری بتیسی واپس کر دوں گا"۔ مانگے رام جی ہمارے ہم پیالہ و ہم نوالہ تو تھے ہی اب "ہم دانت" بھی ہو گئے ہیں۔

مگر صاحب کبھی کبھی ہمیں اس زندگی کی یاد آتی ہے جو داڑھ کے درد سے پہلے تھی۔ کیسی ہنس مکھ اور تر و تازہ زندگی تھی۔ ہمارے گال کتنے سڈول تھے۔ ہمارا چہرہ کتنا متناسب تھا۔ نہ جانے ہمارا وہ چہرہ کہاں کھو گیا۔ اب تو صرف چہرہ کی تہمت اپنی گردن پر اُٹھائے پھرتے ہیں۔

ع خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

مجتبیٰ حسین

ابھینیتا نیتا بن گئے

ابھی نیتا اے بی سی ڈی نے جب سو فلموں میں کام کرلیا اور ملک پر سے جمہوریت کے تینتیس ۳۳ برس بیت گئے تو ایک دن اس کے کانوں میں غیب سے آواز آئی "اے، اے بی سی ڈی! اپنے چہرے سے میک آپ اتار اور کر دیش کی سیوا۔"

اے بی سی ڈی نے سوچا یہ فلم ڈائریکٹر کی آواز ہے۔ تینتیس ۳۳ برس کی جمہوریت کے بعد جب لیڈروں نے جنتا کی آواز کو سننا چھوڑ دیا ہے تو میں سو فلموں میں کام کرنے کے بعد ڈائریکٹر کی آواز کیوں سنوں؟ وہ انجان بن گیا تو پھر آواز آئی "کیا تو ہماری آواز نہیں سن رہا ہے؟ میں فلم کا ڈائریکٹر نہیں، سارے جگ کا ڈائریکٹر بول رہا ہوں۔ اٹھ اور کر دیش کی سیوا۔"

اب کی بار اے بی سی ڈی نے تھر تھر کانپتے ہوئے کہا "پربھو! آپ کا حکم سر آنکھوں پر، مگر آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں تو ساری زندگی ابھی نیتا بنا رہا، اب نیتا کیوں کر بن سکتا ہوں۔"

آواز آئی "اے بی سی ڈی! ہماری لیلا ہی نرالی ہے۔ ہم بعض اوقات غلط آدمی سے صحیح کام اور صحیح آدمی سے غلط کام لے لیتے ہیں۔ تجھے اس وقت اور ابھی ابھینیتا سے نیتا بننا ہوگا۔ نیتا جب دس پارٹیاں بدلتا ہے تو وہ نیتا نہیں ابھی نیتا بن جاتا ہے، اسی طرح کوئی ابھی نیتا سو فلموں میں کام کر لیتا ہے تو اسے بھی نیتا بن جانے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ کیا تو نہیں جانتا کہ بلی نو سو چوہے کھانے کے بعد حج کو چلی جاتی ہے۔ تیری بھی اب سو فلمیں پوری ہو گئیں۔ اب کر دیش کی سیوا، ورنہ تیری ساری فلمیں فلاپ کر دوں گا۔"

اے بی سی ڈی نے کہا "پربھو! بڑے جوردار ڈائیلاگ بول رہے ہو، سلیم جاوید کے لکھے پڑتے ہیں۔"

زور کی آواز آئی "بدتمیز! اپنی زبان کو لگام دے۔ کیا تو ہمیں اپنی طرح سمجھتا ہے کہ جب تک ڈائیلاگ رائٹر پانی مانگنے کا ڈائیلاگ نہ لکھ کر دے۔ تب تک پانی بھی نہیں مانگ سکتا اور پیاسا رہ جاتا ہے۔"

اے بی سی ڈی نے گھبرا کر کہا "شما کیجئے پربھو! مجھ سے غلطی ہوگئی۔ اب میں دیش کی سیوا کروں گا۔ مگر یہ تو بتلائیے دیش کی سیوا کیسے کی جاتی ہے۔ میں تو سیاست، جمہوریت اور سوشلزم اور نہ جانے کیا کیا ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔"

پربھو بولے "کیا تو سمجھتا ہے کہ یہ جو نیتا لوگ ہوتے ہیں وہ سیاست اور جمہوریت کے بارے میں کچھ جانتے ہیں، ارے یہ بھی کچھ نہیں جانتے۔ صرف جاننے کی ایکٹنگ کرتے ہیں۔ سیاست میں جو جتنا کم جانتا ہے۔ اتنا ہی کامیاب نیتا بنتا ہے۔ آج کے نیتا لوگ گاندھی جی کے بارے میں اتنا ہی جانتے ہیں جتنا کہ اٹین برو نے اپنی فلم "گاندھی" میں بتایا ہے۔ وہ بھی ہندی میں اس فلم کو دیکھتے ہیں تو ان کی سمجھ میں آتا ہے۔ انگریزی میں دیکھیں تو اتنا بھی نہ جان پائیں۔ تو نے دیکھا نہیں اب لوگ گاندھی جی کی صرف ایکٹنگ کی تعریف کر رہے ہیں۔ دیش کے لئے ان کی قربانی کی کوئی تعریف نہیں کرتا۔ پہلے ہم نیتا

بناتے تھے تو اس کی شخصیت میں سچائی، حب الوطنی اور ایمانداری کی ملاوٹ بھی کر دیتے تھے مگر بعد میں جب ہم نے دیکھا کہ ملک میں جمہوریت آگئی ہے تو سوچا کہ اب ہم کیوں نیتاؤں کو بنانے میں اپنا وقت برباد کریں۔ اس معاملہ میں ہم نے غیر جانبداری کی پالیسی اپنائی۔ ہم نے کہا اب جنتا اور نیتا دونوں مل کر ایک دوسرے کو بناتے رہیں۔ لہٰذا پچھلے کئی برسوں سے ہم نے نیتاؤں کو بنانا چھوڑ دیا، ابھی نیتاؤں کو بنانا شروع کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج فلم انڈسٹری نے اتنی ترقی کر لی ہے اور سیاست کا یہ حال ہو گیا ہے کہ بری سے بری فلم کی سلور جوبلی ہو جاتی ہے۔ اور اچھی سے اچھی سرکار چند ہفتوں میں ٹوٹ جاتی ہے۔"

اسے بی سی ڈی نے کہا "پربھو اب آپ پھر سے نیتا بنانا کیوں شروع نہیں کر دیتے؟"

پربھو بولے "وہی تو کر رہا ہوں، اب نئے نیتا بنانا شروع کروں گا تو وہ اٹھارہ سال میں بالغ ہوں گے اور اکیس سال بعد ووٹ دینے کے قابل ہوں گے اسی لئے کام چلانے کی خاطر اس وقت تک ابھی نیتاؤں سے نیتاؤں کا کام لینا چاہتا ہوں۔"

اسے بی سی ڈی نے کہا "مگر مجھے سیاست کا کوئی تجربہ نہیں ہے؟"

پربھو بولے "مگر ہم نے امریکہ میں ایک ابھی نیتا کو نیتا بنانے کا کامیاب تجربہ کیا ہے۔ کیا تو نہیں جانتا کہ امریکہ میں ایک ابھی نیتا کی سرکار باکس آفس پر ہٹ جا رہی ہے۔ ہم نے یہ تجربہ امریکہ میں اس لئے کیا تھا کہ ہندوستان کے ابھی نیتا بھی اس کی نقل کریں۔ کیونکہ ہندوستان کی اکثر فلمیں ہالی وڈ کی فلموں کی کاپی ہوتی ہیں۔ تجھے تو اپنے آپ ہی نیتا بن جانا چاہیئے تھا۔ ہمارے یاد دلانے کی ضرورت نہیں تھی۔"

اسے بی سی ڈی نے کہا "مگر پربھو! میری سرکار کی پالیسی کیا ہوگی اور میں کس کی سیوا کروں گا؟"

پربھو بولے "پالیسی کے چکر میں نہ پڑ، نیتا لوگ پالیسی بناتے ہی اس لئے ہیں کہ جنتا کو پالیسی کی بھول بھلیوں میں الجھا کر خود دیش کی سیوا سے بچے رہیں۔ تجھے صرف سیوا کرنا ہے اور ان ہی لوگوں کی سیوا کرنا ہے جو تیری فلمیں تیسرے درجہ میں بیٹھ کر دیکھتے ہیں اور تیری ایک ایک ادا پر سیٹیاں بجا کر داد دیتے ہیں۔ تو سیٹیاں بجانے والوں کی سیوا کرے گا تو دیش میں سوشلزم آسکتا ہے۔ یہ لوگ تیری فلمیں دیکھتے ہی اس لئے ہیں کہ دیش میں سوشلزم نہیں آرہا ہے۔ اگر نیتا اس دیش میں سوشلزم لے آتے تو تیری فلمیں سلور جوبلی اور گولڈن جوبلی نہ مناتیں۔ تجھے تو نیتاؤں کا مشکور ہونا چاہیئے کہ ان کے نکمے پن کا تجھے فائدہ مل رہا ہے۔"

اسے بی سی ڈی نے کہا "سیاست میں تو بہت بولنا پڑتا ہے، میں کیسے بول پاؤں گا۔"

پربھو بولے "فکر نہ کر ہم تیرے لئے ایک ڈائیلاگ رائٹر کا بندوبست کر دیتے ہیں۔ ابے مورکھ! کیا تجھے اتنا بھی نہیں معلوم کہ سیاست میں بھی "بیک گراؤنڈ میوزک" چلتی ہے۔ بلکہ فلموں سے کہیں زیادہ چلتی ہے۔ دنیا کے کئی ملکوں کی طرف دیکھو کہ دیکھنے میں تو آزاد ملک ہیں۔ لیکن ان کے پیچھے یا تو امریکہ کی بیک گراؤنڈ میوزک چلتی ہے یا روس کی۔ اب عالمی سیاست میں ایک نئی بیک گراؤنڈ میوزک بھی چل پڑی ہے جو تو نے سنی ہوگی۔ اسے "نان الائینڈ بیک گراؤنڈ میوزک" کہتے ہیں۔ اس میوزک کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ہر کوئی اپنی ڈفلی بجا سکتا ہے۔"

اسے بی سی ڈی نے کہا "پربھو! آپ کی باتیں اب کچھ کچھ میرے پلے پڑنے لگی ہیں۔ آپ کا حکم ہے کہ میں ملک میں سوشلزم کو لے آؤں مگر مجھے یہ تو بتلائیے کہ سوشلزم کیا ہوتا ہے۔ کتنی ٹانگیں ہوتی ہیں ان کی؟ ناک کیسی ہوتی ہے؟ سوشلزم ویجیٹیرین ہوتا ہے یا نان ویجیٹیرین؟"

پربھو بولے "یہ سارا لفڑا نیتاؤں نے کھڑا کیا ہے۔ سوشلزم تو سیدھی سادھی سی چیز ہے مگر نیتاؤں نے سوشلزم کے ایسے طوطا مینا بنائے کہ اب تو اس کی ٹانگیں تک ڈھونڈنے لگا ہے۔ نیتاؤں نے اپنی کرسی کی ٹانگوں کو سلامت رکھنے کے لئے سوشلزم کے بھی ٹانگیں لگا دیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ انہیں سوشلزم تک چل کر جانے کی زحمت نہ ہو بلکہ سوشلزم خود چل کر ان کے پاس آئے۔ سوشلزم کو جاننے کے لئے بڑی بڑی کتابیں بالکل نہ پڑھ، فلم "پیاسا" دیکھ لے۔ "دو بیگھے زمین" اور اسی طرح کی دو ایک فلمیں دیکھ لے اور لے آ دیش میں سوشلزم"۔

اے بی سی ڈی نے کہا "بہت اچھا پربھو! میں یہ فلمیں پھر ایک بار دیکھ لوں گا۔ سوشلزم کا مسئلہ تو حل ہو گیا۔ یہ بتلائیے میں اپنی سرکار کی کاسٹ کیسے بناؤں؟"

پربھو بولے "ابے سرکار کی کاسٹ نہیں بلکہ کیبنٹ ہوتی ہے۔ ویسے فلم کی کاسٹ اور سرکار کی کیبنٹ میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ہر آدمی کو مناسب کام دینا پڑتا ہے۔"

اے بی سی ڈی نے کہا "سرکار! آج ملک میں انتشار بہت پھیلا ہوا ہے۔ اگر میں اپنی سرکار بنانے میں کامیاب ہو گا تو اپنا وزیر داخلہ کیسے بناؤں؟"

پربھو بولے "اسی کو وزیر داخلہ بنا جو تیری فلموں میں ولن کا کام کرتا رہا ہے۔ جنتا نے اسی کو فلموں میں دیکھ دیکھ کر غنڈہ گردی اور مار دھاڑ سیکھی ہے۔ اب اسی سے کہہ کر سماج میں اسی کی لائی ہوئی خرابیوں کو دور کر دے۔ مگر ایک بات کا خیال رکھنا، تیری فلموں میں پولیس ہمیشہ اس وقت آتی ہے۔ جب ہیرو دشمن کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ تیری سرکار میں یہ بات نہیں چلے گی یہاں پولیس کو پہلے آنا ہو گا۔ اور ہیرو بعد میں آئے گا۔"

اے بی سی ڈی نے کہا "سرکار! اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے ڈشوم ڈشوم کرنے کا کوئی موقع نہیں ملے گا۔ پھر میری سرکار میں ہیرو کا کیا کام ہو گا۔"

پربھو بولے "فلم میں ہیرو کو بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ سیاست میں ہیرو خود کام نہیں کرتا، دوسروں سے کام کرواتا ہے۔"

اے بی سی ڈی نے پوچھا "پربھو! میری سرکار کی ہیروئن کون ہو گی؟"

پربھو بولے "تیری سرکار کی ہیروئن جنتا ہو گی۔ جنتا! تجھے ہر مشکل سے اپنی ہیروئن کو بچانا ہو گا۔"

اے بی سی ڈی نے منہ بنا کر کہا "سرکار! بڑی بری ہیروئن ہو گی۔ کوئی اچھی شکل والی نہیں مل سکتی۔ مجھے تو ہیروئن کے ساتھ ناچنا بھی ہو گا اور گانا بھی۔ کیا نئی ہیروئن یہ سب کرے گی۔"

پربھو بولے "تو اپنی ہیروئن کی چند دن سیوا کر کے دیکھ لے، ارے میں تو کہتا ہوں اتنے کم معاوضہ پر اس سے اچھی ہیروئن تجھے آج تک نہ ملی ہو گی۔"

اے بی سی ڈی نے کہا "جب میری سرکار کی ہیروئن ہو گی تو کیا میری سرکار میں سائڈ ہیرو، ولن، کامیڈین اور ایکسٹراز بھی ہوں گے۔"

پربھو بولے "یقیناً ہوں گے بلکہ اس ملک میں سیاست ناکام ہی اس لئے ہوئی کہ اس میں سائیڈ ہیروز، ولن اور کامیڈین کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی۔ البتہ اپنی سرکار میں ایکسٹراز کو ذرا دیکھ بھال کر رکھنا۔ سیاست میں ایکسٹراز کو جو چمچے کہتے ہیں بہت دھاندلی مچاتے ہیں۔ چمچے بعد میں اتنے طاقتور ہو جاتے ہیں کہ خود سرکار کو چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

اسے بی سی ڈی نے کہا "پربھو! آپ کا حکم ہے تو میں ابھی نیتا سے نیتا بن جاتا ہوں لیکن یہ بتائیے میں اپنی سرکار کتنے ریل کی بناؤں۔ صرف بالغوں کے لئے بناؤں یا ایسی سرکار بناؤں جسے بچے بوڑھے سب دیکھ سکیں اور آخری بات یہ بتائیں کہ میری سرکار کامیڈی ہوگی یا ٹریجڈی؟"

پربھو بولے "اے بی سی ڈی! تو بہت سوالات پوچھتا ہے۔ پہلے تو ایں نیتا سے نیتا بن جا، تو اگر سرکار بنانے میں کامیاب ہوگیا تو تب ہم تجھے بتائیں گے کہ تیری سرکار کتنے ریل کی ہوگی، انٹرول کب ہوگا، ٹریجڈی ہوگی یا کامیڈی؟ اس کا فیصلہ ہم اسی وقت کریں گے۔ اس وقت ہم جلدی میں ہیں۔ ہمیں دنیا کے اور بھی کئی کام کرنے ہیں"

پربھو جانے لگے تو اسے بی سی ڈی نے کہا "مجھے آشیرواد دیجئے اور جانے سے پہلے ایک وعدہ کرجائیے کہ اگر میں سرکار بنانے میں کامیاب ہوگیا تو آپ اس کے مہورت اور پریمیر میں ضرور آئیں گے۔"

پربھو نے کہا "ہم ضرور آئیں گے"۔ اور یہ کہہ کر پربھو غائب ہوگئے۔

اسے بی سی ڈی نے اپنے چہرے سے میک اپ اتارا اور ایکٹر نیتا سے نیتا بن گیا۔ جب وہ نیتا بن گیا تو بڑا سے نیتاؤں نے اس کا خوب مذاق اڑایا۔ مگر وہ بھی دھن کا پکا تھا۔ اپنے آپ کو نیتا ثابت کرنے میں اُسے کئی مہینے لگ گئے۔ اس نے بیچ میں کئی بار پربھو کو پکارا کیوں کہ سے کئی معاملوں میں ان کی صلاح لینی تھی۔ مگر پربھو شائد دوسرے کاموں میں معروف ہوگئے۔ بالآخر ایک دن اسے بی سی ڈی نے اپنی سرکار بنالی۔ ہر طرف اس کی جے جے کار ہونے لگی جس دن اس کی سرکار کا مہورت تھا۔ اس دن وہ بہت خوش تھا۔ اتنا خوش کہ اسے اپنی سرکار کی مہورت پر پربھو کے آنے کا وعدہ یاد ہی نہ رہا۔ اس کی سرکار کی شوٹنگ شروع ہونیوالی ہی تھی، کیمرہ مین تیار کھڑے تھے کہ اسے بی سی ڈی کے کانوں میں پربھو کی آواز آئی "اسے بی سی ڈی! تجھے مبارک ہو! تو اپنی سرکار بنانے میں کامیاب ہوگیا۔ ہم وعدے کے مطابق تیری سرکار کا مہورت کرنے آئے ہیں۔"

اسے بی سی ڈی نے گھبراکے کہا "پربھو آپ اتنے دن کہاں چلے گئے تھے۔ میں نے آپ کو بہت آوازیں دیں مگر آپ نہیں آئے۔ آپ سے اپنی سرکار کا مہورت کروانے کا وعدہ کیا تھا وہ مجھے اب بھی یاد ہے مگر پربھو آپ نے بہت دیر کردی۔ میں نیتا بن کر سرکار بنانے چلا تو احساس ہوا کہ فلموں کی طرح سیاست میں بھی ایک فینانسر کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے آپ سے سیاست کی ساری باتیں تو پوچھ لی تھیں مگر فینانسر کے بارے میں پوچھنا بھول گیا تھا۔ ایک منزل وہ بھی آئی جب میں فینانسر کی مدد کے بغیر نیتا کی حیثیت سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتا تھا۔ لہذا مجبور ہوکر ایک فینانسر کی مدد حاصل کی اور اس سے وعدہ کرلیا کہ اگر میں نے سرکار بنالی تو اپنی سرکار کا مہورت اسی سے کراؤں گا۔ میں مجبور تھا پربھو! چنانچہ اب وہ فینانسر میری سرکار کا مہورت کرنے کے لئے آگیا ہے۔ میں آپ کو یہ چانس نہیں دے سکتا۔ اگلی بار اگر پھر سرکار بناؤں گا تو آپ کو ضرور موقع دوں گا۔

پربھو نے غصہ سے کہا "اسے بی سی ڈی! ہمیں تجھ سے یہ امید نہیں تھی۔ تو نے بڑی غلطی کی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ تیری سرکار گولڈن جوبلی منائے مگر تو فینانسر کے چکر میں پھنس گیا۔ اب تیری سرکار بہت جلد مارننگ شو میں لگ جائے گی۔ یہ میرا شراپ ہے"

اے بی سی ڈی نے کہا "پربھو! مجھ سے غلطی ہوگئی۔ مجھے معاف کیجئے۔"

مگر پربھو غصہ میں آکر چلے گئے۔ وہ جانے لگے تو ان کی نظر ایک فلم اسٹوڈیو پر پڑی جس کے آگے سارے سابق نیتا کھڑے تھے۔ پربھو نے پوچھا "تم لوگ یہاں کیوں کھڑے ہو؟"

نیتاؤں نے کہا "ہماری سرکار چھن گئی ہے۔ اب ہم یہاں فلموں میں کام تلاش کرنے آئے ہیں۔ ہماری کچھ مدد کیجئے۔"

پربھو بولے "میری مدد لے کر کیا کرو گے؟ کسی فینانسر کو پکڑو۔ اب دنیا کے سارے کام مجھ سے نہیں۔ فینانسر سے چلتے ہیں۔ تم جو چاہو سو کرو۔ میں تو اب اس دھرتی کے کاروبار میں "نان الائینڈ" رہنا چاہتا ہوں۔"

یہ کہہ کر پربھو پھر سے غائب ہوگئے۔ دوستو! اب پربھو سیاست کے معاملے میں نیتاؤں اور ابھی نیتاؤں دونوں سے مایوس ہوگئے ہیں۔ کیا عجب کہ اب کی بار وہ ادیبوں کو سرکار بنانے کا موقع دیں۔ لہٰذا ادیبو! ہوشیار رہو اور ابھی سے ایک فینانسر کو پکڑ رکھو!!

مجتبیٰ حسین

ہماری بے مکانی دیکھتے جاؤ

پرسوں میں نے کرایہ کے مکانوں میں رہنے کی سنچری اور اپنی زندگی کی نصف سنچری ایک ساتھ مکمل کرلی تو سوچا کہ کیوں نہ اس مبارک و مسعود موقع کو سیلبریٹ کیا جائے۔ یہ اعزاز کے ملتا ہے کہ سواں مکان شروع اور زندگی کا پچاسواں سال ختم ہو۔ یہ حسنِ اتفاق نہیں، عشقِ اتفاق ہے۔ میں خوش خوش گھر پہنچا تو بیوی کو افسردہ و رنجیدہ پایا۔ میں نے کہا "بہت اداس دکھائی دیتی ہو۔ کیا نیا مکان تمہیں پسند نہیں آیا"۔

بولی "تمہاری رفاقت میں آج تک میں نے اَن گنت مکان بدلے کبھی کسی مکان کے بارے میں شکایت کی؟"

میں نے کہا "سچ تو یہ ہے کہ مجھے تم سے ہی یہ شکایت ہے کہ اتنے مکان بدلنے کے باوجود تم نے میرا ساتھ اور ہاتھ نہیں چھوڑا"۔

بولی "اگر میں مکانوں کے بدلنے میں ہنسی خوشی تمہارا ساتھ نہ دیتی تو تم مکان بدلنے کی بجائے بیویاں بدلتے اور اس کوشش میں ایک نہ ایک دن کہیں گھر داماد لگ جاتے"۔

میں نے کہا "بات کیا ہے؟ تم نہ صرف اداس نظر آتی ہو بلکہ لڑائی کے موڈ میں ہو"۔

بولی "ایک بری خبر ہے، خدا کرے کہ جھوٹی ہو، ابھی تمہارے بھتیجے نے آکر یہ اطلاع دی ہے کہ پچیس ۲۵ سال پہلے تم جس ہاؤزنگ سوسائٹی کے ممبر بنے تھے اس نے بالآخر مکان بنالئے ہیں اور یہ کہ تمہیں اب اپنا مکان ملنے ہی والا ہے"۔

اس اطلاع کو سن کر میں بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ پیروں تلے سے مکان سمیت زمین نکلنے لگی۔ میں نے سوچا "ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ میں اور اپنا ذاتی مکان! زندگی کے پچاس برس بیت چکے ہیں، اب میں اپنا مکان لے کر کیا کروں گا۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ ستر برس کے ایک بزرگ نے ایک موسیقار سے پوچھا "میاں طنبورے اور تانپورے میں کیا فرق ہوتا ہے؟ موسیقار نے جواباً دریافت کیا! "بزرگوار اب آپ کی عمر کیا ہے؟"

بزرگ بولے "ستر برس کا ہوچکا ہوں"۔ موسیقار نے کہا "قبلہ جب آپ نے اپنی زندگی کے ستر برس طنبورے اور تانپورے کا فرق جانے بغیر گذار دیئے تو دو چار برس اور صبر کیجئے، اس کے بعد آپ کو ان دونوں کا فرق جاننے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے گی"۔ میرا بھی اب یہی حال ہے۔ چند برس اور اس دنیا میں گذارلوں تو مجھے کرایہ کے مکان اور ذاتی مکان کے فرق کو جاننے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے گی"۔

میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ بیوی نے کہا "کس سوچ میں پڑگئے، بتاؤ اب کیا ہوگا؟"

میں نے بیوی پر قابو پانے کی خاطر اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا "ہونا کیا ہے اگر ذاتی مکان ملتا ہے تو اس میں چلے جاتے ہیں۔ لوگ تو ذاتی مکان کے لئے ترستے ہیں یہ اداس ہونے کی نہیں خوشی کی بات ہے"۔

بولی" مگر میرے لئے یہ خوشی کی بات نہیں ہے۔ کرایہ کے مکان میں ازدواجی زندگی کا جو لطف ہے وہ ذاتی مکان میں کہاں۔ میں نے تو تم سے شادی ہی اس لئے کی تھی کہ تمہارا اپنا کوئی ذاتی مکان نہیں ہے' کیونکہ میں جانتی ہوں کہ جس دن تمہیں اپنا مکان مل جائے گا۔ تم اپنی ساری توجہ مجھے بنانے سنوارنے کی بجائے مکان کو بنانے سجانے میں صرف کردو گے۔ میں اپنے اور تمہارے بیچ کسی مکان کو حائل ہوتے نہیں دیکھنا چاہتی۔ پھر ہماری خوشگوار ازدواجی زندگی کا راز یہی ہے کہ تمہارا زیادہ وقت مکانوں کے مالکوں سے لڑنے یا انہیں خوش کرنے میں گذرتا ہے۔ مجھ سے لڑنے کی تمہیں مہلت ہی نہیں ملتی۔ جس دن مالک مکان ہم دونوں کے بیچ سے نکل جائے گا۔ ہم ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو جائیں گے۔ یہ ایک ایسی جنگی حکمت عملی ہے جس کے باعث ہمارے گھر میں دائمی اور پائیدار امن قائم ہے۔ میں گھریلو اور عالمی امن کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتی ہوں۔ چاہے مجھے ذاتی مکان سے ہاتھ ہی کیوں نہ دھونا پڑے۔"

زندگی میں پہلی بار میں اپنی بیوی کی فہم و فراست کا قائل ہو گیا۔ میں نے کہا" میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں خود بھی اب کرایہ کے مکانوں میں رہنے کا عادی ہو چکا ہوں جس آدمی نے فی برس دو مکانوں کے حساب سے اپنی جائے رہائش تبدیل کی ہو۔ اس کی خانہ بدوشی کو کم از کم تمہیں تو تسلیم کر لینا چاہئے۔ اپنی تو ساری زندگی اس طرح گذری کہ ایک پاؤں ایک مکان میں اور دوسرا پاؤں دوسرے مکان میں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں مکانوں کو بدلتے بدلتے مکاں سے لامکاں تک پھیل گیا ہوں۔ میں مکان میں ہوں بھی اور نہیں بھی۔ میں مکان کے اندر ہوں اور مکان میرے اندر۔ کرایہ کی مکانوں کی برکتوں سے جتنا میں واقف ہوں' شائد کوئی اور ہو' بلکہ آج میں جو کچھ ہوں وہ کرایہ کے مکانوں میں رہنے کی وجہ سے ہوں۔ تمہیں یاد ہو گا کہ شادی کے بعد ہم نے ایک مکان کرایہ پر لیا تھا۔ مالک مکان نے تین چار مہینوں تک ہمیں ہنی مون منانے کی اجازت دیدی۔ پانچویں مہینہ سے اس نے کرایہ کی ادائیگی کا مطالبہ شروع کر دیا۔ میں اس سے منہ چھپاتا رہا ایک دن آمنا سامنا ہوا تو اس نے پوچھا" آخر تم کرایہ کیوں ادا نہیں کرتے؟" میں نے کہا" اس لیے کہ بے روزگار ہوں۔ کہیں نوکری لگے تو کرایہ بھی ادا کروں"۔ تمہیں شاید نہیں معلوم کہ مالکِ مکان کئی دنوں تک میری ملازمت کی خاطر جوتیاں چٹخاتا پھرا۔ جگہ جگہ میری درخواستیں دیں۔ بالآخر اس نے مجھے نوکری سے لگا دیا۔ تنخواہ سے سارا کرایہ وصول کیا' اور اپنے گھر سے نکال باہر کیا۔ اس کے بعد میں نے ایک بڑا مکان کرایہ پر لے لیا۔ میں نے سوچا کہ جب کرایہ ادا کرنا ہی نہیں ہے تو کیوں نہ بڑا مکان کرایہ پر لیا جائے۔ یوں بھی کہنے کو میری نوکری لگ چکی تھی مگر جب میں اپنی قلیل تنخواہ میں سے مکان کا کرایہ پابندی سے ادا کرنے کے قابل نہیں رہنے لگا تو دوسرے مالکِ مکان نے اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کر کے دفتر میں میری پروموشن کروادی۔ یہ سب مکانوں کے مالکوں کی دین ہے۔ یہ ان ہی کا احسان ہے کہ آج میں خوش حال زندگی گذار رہا ہوں۔"

بیوی نے بات کو کاٹ کر کہا۔ تمہیں یاد ہو گا ایک مالک مکان کو یہ شکایت تھی کہ لکڑی کے چولھے پر پکوان کرنے کی وجہ سے اسکا رسوئی گھر خراب ہو رہا تھا۔ آخر کو اسی نے تنگ آکر اور ہم پر ترس کھا کر گیس کے چولھے کا کنکشن دلوا دیا تھا۔ اگر ہمارا ذاتی مکان ہوتا تو ہمارے پاس گیس کا کنکشن کہاں سے آتا؟"

میں نے کہا" بیگم تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔ صبر کرو۔ مجھے یقین ہے کہ ہمیں اپنا ذاتی مکان ملنے کی اطلاع جھوٹی ہے۔ ہاوزنگ سوسائٹی پر پورا بھروسہ رکھو کیونکہ یہاں نہ صرف دیر ہوتی ہے بلکہ اندھیر بھی ہوتی ہے۔"

وہ میرے لیئے چائے بنانے کی خاطر چلی گئی تو میں پھر سے سوچ میں ڈوب گیا۔ اب اگر واقعی ہمیں ذاتی مکان مل گیا تو کیا ہوگا۔ مجھے رہ رہ کر وہ سارے مکان یاد آنے لگے جن میں اپنا سر چھپانے کے علاوہ بہت کچھ چھپایا تھا جیسے اپنی غربت، عزت، شرافت و غیرہ وغیرہ۔ اور وہ سارے مکان مالک بھی یاد آنے لگے جن پر اپنا سب کچھ ظاہر کر دیا تھا جیسے اپنی غربت، بے روزگاری، مفلوک الحالی اور آوارہ گردی وغیرہ وغیرہ۔ جس بات کا علم مکان کو نہیں ہوتا تھا اسے مالک مکان جان لیتا تھا اور اسی بنیاد پر ہم نے یہ مفروضہ بنا رکھا تھا کہ کرایہ کا مکان چاہے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو وہ اپنے مالک سے بڑا ہوتا ہے۔ ہم تو صرف مکان کی مکانیت کا کرایہ ادا کرتے تھے۔ اس کے ظرف کا کرایہ کہاں ادا کرتے تھے۔ کن کن باتوں کو یاد کریں۔ برسات کے موسم میں جب ایک مکان کی چھت غالب کے مکان کی چھت سے بھی زیادہ ٹپکنے لگی تو میں ایک اور مکان کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ ایک محلہ میں پنواڑی سے پوچھا "کیوں بھئی! کیا تمہارے علاقے میں کوئی مکان خالی ہے؟"

پنواڑی نے کہا "حضور ایک مکان خالی تھا۔ مگر آپ نے یہاں آنے میں ذرا دیر کر دی"۔

میں نے پوچھا "تو کیا وہ مکان کرایہ پر اُٹھ گیا؟"

وہ بولا "جی نہیں! شاید بارش کے زور سے ابھی ابھی گرا ہے۔ آپ کچھ دیر پہلے آجاتے تو مکان آپ ہی کا تھا"۔ اور یوں کھلے ہوئے غنچوں کو مرجھانے کا ایک اور موقعہ ہاتھ سے نکل گیا۔ گھر واپس ہوا تو بیوی نے پوچھا "کوئی مکان ملا؟" میں نے کہا "مکان تو نہیں ملا، البتہ ایک دوست کے ہاں دو پرانے واٹر پروف مل گئے۔ وہ اُن کا کرایہ بھی نہیں لے گا۔ ایک تم پہنو، دوسرا میں پہنتا ہوں، پھر دیکھو ساون کا مزہ کیسے آتا ہے؟"

ہمارا ایک مکان پڑوسیوں کے مکانوں اور ان کے مکینوں میں کچھ اتنا دخیل تھا اور وہاں فرد کی انفرادیت کچھ اتنی غیر محفوظ تھی کہ نماز پڑھنے کے بعد سلام پھیرنے سے پہلے یہ اعلان کرنا پڑتا تھا کہ "صاحبو! ہم سلام پھیر رہے ہیں، اپنی بیبیوں سے پردہ کرالو"۔ بعض اوقات تو ہمیں دایاں سلام پھیرنے کے بعد بایاں سلام پھیرنے میں دس منٹ لگ جاتے تھے، کیونکہ اس وقت پڑوسن کی بیٹی کی چوٹی گوندھی جارہی ہوتی تھی۔

ہمارا ایک مکان چوتھی منزل پر تھا۔ پہلی منزل میں مالکِ مکان سردار مہابیر سنگھ رہتے تھے اور دوسری منزل میں پرمود کمار چٹرجی اور تیسری منزل میں مسٹر تھامس رہتے تھے۔ چوتھی منزل ہماری تھی۔ مکان کیا تھا اچھا خاصہ ملک تھا۔ اس مکان میں ہم خوش بھی بہت تھے۔ بس ایک شکایت یہ تھی کہ مہینہ میں چار یا پانچ تہوار مشترکہ طور پر منانے پڑتے تھے بلکہ تہواروں کے سوا اس گھر میں کچھ بھی نہیں منایا۔ تہوار تو ہمیں اچھے لگتے تھے لیکن ہماری جیب ان تہواروں کا بوجھ اٹھا نہیں سکتی تھی۔ قومی یکجہتی کو فروغ دینے کے لئے جتنی خوشحالی درکار ہوتی ہے، وہ ہمارے پاس نہیں تھی اسی لیئے وہاں سے بادلِ ناخواستہ نکل آئے۔

مکان یاد آنے لگے تو مکان کے مالک بھی یاد آتے چلے گئے۔ ایک مالک مکان اتفاق سے ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو ہمارے گھر کے سامنے گذرتے تھے نہ صرف اتفاق سے گذرتے تھے بلکہ اتفاق سے کال بیل بھی بجا دیتے تھے۔ میں اتفاق سے گھر پر ہوتا تو کہتے "بھئی اتفاق سے ادھر سے گذر رہا تھا، سوچا آپ سے مل لوں۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ آج پہلی تاریخ ہے"۔ ایک مہینہ میں اکتیس تاریخ کو اتفاقاً ان کے گھر پہنچا۔ مجھے دیکھ کر بہت سٹپٹا گئے۔ بولے "آج آپ کے اتفاق سے

اِدھر چلے آنے سے کچھ نااتفاقی کی بو آرہی ہے۔"

میں نے کہا "اتفاق سے مجھے اس مہینہ تنخواہ نہیں مل رہی ہے۔ اتفاق سے اِدھر سے گذر رہا تھا۔ سوچا کہ آپ کو آگاہ کردوں کہ آپ کل اتفاق سے میرے گھر نہ آئیں۔" اور یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ چند دنوں بعد مجھے اس گھر کو خالی کرنا پڑا۔

ایک اور مالکِ مکان بھی بہت یاد آئے۔ خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ پہلی تاریخ کو مکان کا کرایہ تو وصول نہیں کرتے تھے۔ البتہ آدھی رات کو اپنا بے بحر شعر سنا کر داد ضرور وصول کرلیا کرتے تھے۔ میں نے مہینوں انہیں مکان کا کرایہ ادا نہیں کیا۔ البتہ شعر کی داد کے معاملے میں وہ ادھار کے قائل نہیں تھے۔ کھڑے کھڑے داد وصول کرلیتے تھے۔ بلکہ مستقبل میں سرزد ہونے والے شعروں کی پیشگی داد تک پگڑی سمیت وصول کرلیتے تھے۔ مکان چونکہ ان کا چھوٹا تھا۔ اس لئے چھوٹی بحر میں شعر کہتے تھے۔ شاعری بھی اپنے مکان کی طرح کرتے تھے۔ جس میں کمرے کم اور بیت الخلاء زیادہ ہوتے تھے۔ بات بات پر شاعری میں اپنا کلیجہ، پھیپھڑا وغیرہ نکال کر رکھ دیتے تھے۔ میں تو زندگی بھر ان کے مکان کو خالی نہ کرتا مگر قدرت کو اردو شاعری کا فائدہ اور میرا نقصان مقصود تھا۔ ایک دن وہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔ یہ ان کے مرنے کے دن نہیں تھے۔ جوں جوں مکان کا کرایہ بڑھتا جارہا تھا۔ ان کی شاعری میں مجھے نئے نئے گوشے بشمول گوشۂ عافیت کے نظر آنے لگے تھے اور میں ان کی شاعری میں امکانات اور مکانات تولوں کو ڈھونڈنے لگا تھا۔

جب مکانوں اور مکان مالکوں کی یاد نے زور مارا تو میں نے سوچا کہ یادوں کی اس دہلیز کو پھلانگ کر میں اپنے ذاتی مکان کی دہلیز پر کیوں کر قدم رکھوں گا۔ اسی اثنا میں میری بیوی چائے لے کر آگئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ بولی "مجھے آج اپنا سنگھ سنٹھواں مکان بہت یاد آرہا ہے۔ ہادی وہیں پیدا ہوا تھا اور انہیر داں مکان بھی، کیوں کہ تجیبہ وہیں پیدا ہوئی تھی۔"

میں نے اسے روکتے ہوئے رندھی رندھی آواز میں کہا "بیگم! اب کچھ یاد نہ دلاؤ۔ یادوں کا ایک ایسا ٹھاٹھیں مارتا سمندر میرے اندر موجزن ہے۔ کہ اگر ہمارا ذاتی مکان بھی اس کی زد میں آجائے تو اس کے بام و در پاش پاش ہوجائیں گے۔ اس کی اینٹ اگر خود سے نہ بجی تو بجادی جائے گی۔"

میں یہ کہہ ہی رہا تھا کہ میرا بھتیجا بھاگا بھاگا آیا۔ اس نے کہا "انکل معاف کیجئے۔ میں ایک بری خبر لے کر آیا ہوں۔"

میں نے کہا "مجھے اس بری خبر کی اطلاع مل چکی ہے۔"

بھتیجے نے کہا "نہیں! وہ تو خوش خبری تھی، آپ کے ذاتی مکان کے ملنے کی۔"

میں نے پوچھا "تو پھر بری خبر کیا ہے؟"

بھتیجے نے کہا "مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ ہاؤزنگ سوسائٹی نے جس بلاک میں آپ کا فلیٹ تعمیر کیا تھا۔ وہ سارا بلاک ملاوٹی سمنٹ کے استعمال کے باعث گر گیا ہے۔ اب کیا ہوگا؟"

اس بری اطلاع کو سن کر ہم دونوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ ہم خوشی کے مارے ہنسنے لگے تو میرے بھتیجے نے کہا "انکل آپ کی طبیعت خراب معلوم ہوتی ہے۔ کسی ڈاکٹر کو بلاؤں؟" میں نے کہا "ڈاکٹر کو نہیں وقت کو بلاؤ، وقت ہی سب سے بڑا ڈاکٹر ہے جب تم بھی پچاس برس کے ہوجاؤ گے اور کرایہ کے سوویں مکان میں جاؤ گے تو تمہیں بھی اچانک یہ عرفان ہوگا کہ "بے امکانی، مکان سے بہتر ہوتی ہے۔"

مجتبیٰ حسین

حیدرآباد کا جو ذکر کیا

صاحبو! ہمیں حیدرآباد کو چھوڑے ہوئے تیرہ برس بیت گئے۔ اب ہم زندگی میں ٹھوکریں کھانے کے لئے حیدرآباد کی نہیں بلکہ دہلی کی سڑکوں کو زحمت دیتے ہیں۔ پھر بھی سال میں دو تین موقعے ایسے ضرور آجاتے ہیں جب ہم حیدرآباد کی سڑکوں پر پھر سے ٹھوکریں کھانے کے لئے آجاتے ہیں کیونکہ ٹھوکریں کھانے کے لئے اس سے بہتر سڑکیں کسی اور شہر میں دستیاب نہیں ہیں۔
ان تیرہ برسوں میں حیدرآباد میں کیا تبدیلی آئی اور کیا نہیں آئی۔ یہ ہم نہیں جانتے۔ بس اتنا جانتے ہیں کہ تیرہ برس پہلے ہمارے گھر کے سامنے مین ہول کا جو ڈھکن غائب تھا، وہ ہنوز غائب ہے۔ ہمارے گھر کے سامنے ایک پبلک نل بھی تھا بلکہ اب بھی ہے۔ تیرہ برس پہلے عوام کو اس نل کی ٹونٹی بار بار کھولنے میں دشواری پیش آتی تھی لہٰذا کسی نے عوام کی سہولت کی خاطر اس کی ٹونٹی غائب کر دی تھی۔ یہ ٹونٹی ابھی تک غائب ہے۔ ہمارے گھر کے سامنے بیس برس پہلے ایک دیوار پر منجن بنانے والی ایک کمپنی نے اپنے منجن کا اشتہار جلی حروف لکھوایا تھا۔ ہم یہ منجن تو استعمال نہیں کرتے تھے مگر اجنبیوں کو اپنے گھر کا پتہ سمجھانے کے لئے اس اشتہار کو ضرور استعمال کرتے تھے۔ یہ اشتہار اب بھی وہیں موجود ہے۔ اگرچہ منجن بنانے والی کمپنی کب کی مر چکی ہے۔ مگر ہمارا پتہ ابھی تک زندہ ہے۔ اس منجن کو استعمال کرنے والے بھی شائد اب اس دنیا میں زندہ نہیں ہیں۔ اگر یہ مرے نہیں ہیں تو ان کے دانت ضرور گر گئے ہوں گے۔ کیونکہ منجن کی خاصیت بلکہ خوبی ہی ایسی تھی۔

یوں تو کہنے کو حیدرآباد جوں کا توں موجود محفوظ ہے۔ لیکن اس کے باوجود ادھر چند برسوں سے جب بھی ہم حیدرآباد آتے ہیں تو حضرت جگر مرادآبادی کی طرح ہمیں بھی یہاں کی ہر شے میں کسی شے کی کمی نظر آتی ہے۔ حیدرآباد وہی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ اب حیدرآباد میں ہمیں خود حیدرآباد کی کمی نظر آتی ہے۔ تیرہ برس پہلے شام کو معظم جاہی مارکیٹ پر نکلتے تھے تو ہر چند قدم کے بعد کوئی ملنے والا پیچھے سے ہمارے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتا تھا کہ "بھیّا! کہاں چلے۔ کیسے ہو؟ کس حال میں ہو؟" اب معظم جاہی مارکیٹ پر نکلتے ہیں تو اس کی سڑک وہی ہے مگر وہ ہاتھ جو پیچھے سے ہمارے کندھے پکڑ لیتا تھا۔ کہیں غائب ہو گیا ہے۔ بہت ہوا تو اتنا ہوتا ہے کہ کوئی رکشا والا اچانک ہمارے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دھکا دے دیتا ہے کہ "لبے سڑک پر کدھر چلتا ہے۔ فٹ پاتھ پر چل" فٹ پاتھ پر چلتے ہیں تو کوئی بزرگ ہمارے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتے ہیں "میاں! کیا اندھے ہو گئے ہو۔ دیکھتے نہیں فٹ پاتھ پر پردہ دار خواتین بیٹھی ہیں۔ سڑک پر جاؤ" ادھر کئی برسوں سے ہم حیدرآباد میں اس محبت بھرے ہاتھ کی تلاش میں ہیں جس کی اچانک گرمی ہمیں اس شہر سے جوڑ دیتی تھی۔

ہمیں یاد ہے کہ پچھلے سال مارچ میں لندن کی ایک سرد شام کو آکسفورڈ اسٹریٹ سے گذر رہے تھے کہ ہو بہو ایسا ہی ایک نرم گرم ہاتھ ہمارے کندھے پر رکھا گیا۔ پیچھے پلٹے بغیر ایک لمحے کے لئے سوچتے رہے کہ ایک اجنبی شہر میں یہ کیسا اجنبی ہاتھ ہے جس کا لمس جانا پہچانا سا لگتا ہے ہم نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہماری نوجوانی کا دوست

مجید اپنے بالوں میں چاندی سجائے کھڑا ہے۔ اس نے ہم سے بے ساختہ بغلگیر ہوتے ہوئے کہا۔ "ارے تم! تم آکسفورڈ اسٹریٹ پر کیسے آ گئے؟"

ہم نے کہا "یار! میں لندن کی آکسفورڈ اسٹریٹ پر کہاں ہوں۔ مجھے تو یوں لگ رہا ہے۔ جیسے میں کئی برسوں بعد حیدرآباد کی عابد روڈ پر کھڑا ہوں۔ میں تو تمہیں عابد روڈ پر ڈھونڈتا رہا۔ اور تم لندن میں کیا کر رہے ہو؟"

مجید بولا "یار! بیس برس سے لندن میں ہوں اور تم مجھے ابھی تک عابد روڈ پر ڈھونڈتے ہو۔ عجیب احمق ہو۔ اچھا یہ بتاؤ لندن میں کہاں ٹھہرے ہو۔ اپنا پتہ دو۔ ایک دن میرے گھر چلو۔ خالص حیدرآبادی کھانا کھلاؤں گا۔"

ہم نے کہا "یار لندن آئے ہوئے بیس دن ہو گئے۔ ان بیس دنوں میں اتنے حیدرآبادی کھانے کھائے ہیں کہ خود حیدرآباد میں بھی پچھلے تیرہ برسوں میں نہ کھائے ہوں گے۔ کھلانا ہی ہو تو انگریزی کھانا کھلاؤ۔ میں تو انگریزی کھانا کھانے کے لئے ترس گیا ہوں۔" مجید بولا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دو حیدرآبادی پردیس میں ملیں۔ اور بگھارے بینگن بیچ میں نہ آئیں۔"

سچ پوچھئے تو پچھلے برس یورپ، امریکہ اور کنیڈا کے دورہ کے بعد ہی ہمیں یہ احساس ہوا کہ جس حیدرآباد کو ہم حیدرآباد کی سڑکوں پر تلاش کرتے پھرتے ہیں وہ تو اب لندن کی سڑکوں پر ملتا ہے۔ پیرس کی گلیوں میں پایا جاتا ہے۔ شکاگو کے چینل گوڈہ میں ملتا ہے۔ ٹورانٹو کے بنجارہ ہلز میں پایا جاتا ہے۔

ہمیں اس وقت پچھلے سال ۱۰ / مارچ کی وہ شام یاد آ رہی ہے جب جنوبی لندن کے ایک ہال میں ہمارے دوست حبیب حیدرآبادی کی بیٹی کی شادی مقرر تھی۔ ہم تقریب عقد میں پہنچے تو یوں لگا۔ جیسے ہم کئی برس بعد حیدرآباد واپس آئے ہیں۔ وہ سارے حیدرآبادی جنہیں ہم حیدرآباد میں ڈھونڈتے پھرتے تھے یا وہ سارے حیدرآبادی جو حیدرآباد میں ہم سے منہ چھپاتے تھے وہ سب کے سب وہاں موجود تھے۔ حیدرآبادی شیروانیوں میں ملبوس ان حیدرآبادیوں کو دوبارہ زندہ و سلامت پا کر ہمیں کتنی خوشی ہوئی اس کا حال ہم کیا بیان کریں۔ حیدرآبادی کھانوں اور شمامۃ العنبر کی ملی جلی خوشبوؤں میں بسے حیدرآباد کی بازیافت ہمارے لئے ایک انوکھا تجربہ تھی۔ ہمارے ایک حیدرآبادی دوست جن کی مغفرت کے لئے ہم پچھلے کئی برسوں سے دعا کرتے آ رہے ہیں۔ وہ ہمیں وہاں نہ صرف زندہ سلامت ملے بلکہ اپنی تیسری انگریز بیوی کا تعارف بھی ہم سے کرایا۔ معلوم ہوا پچھلی دو انگریز بیویوں میں سے ایک تو اللہ کو پیاری ہو گئی اور دوسری کسی اور کو پیاری ہو گئی۔ حبیب حیدرآبادی کی بیٹی کی شادی کی جس تقریب کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ دولہا انگریز تھا۔ اور ایک حیدرآبادی لڑکی سے شادی کرنے کی کوشش میں مسلمان ہو گیا تھا۔ اس کے اصلی انگریزی نام کے ساتھ اس کے نئے اسلامی نام کو جوڑنے سے اس کا نیا نام "الفریڈ عرفان" بن گیا تھا۔ چنانچہ شادی کے کارڈ میں دولہا کا نام نورچشمی الفریڈ عرفان لکھا گیا تھا۔ شادی اسلامی طریقہ سے ہوتی تو کوئی بات بھی تھی مگر یہاں شادی حیدرآبادی رسومات کے مطابق ہو رہی تھی۔ دولہن کے ماموں اور ہمارے دوست ڈاکٹر مغنی تبسم نورچشمی الفریڈ عرفان کی شادی کا سہرا حیدرآباد سے بطور خاص بنوا کر لے آئے تھے۔ سہرے کو صحیح و سالم حالت میں لندن لانے کی جستجو میں مغنی تبسم کا سوٹ کیس سیرین ایرلائنس کے طیارے میں ہی رہ گیا تھا۔ اور وہ جب سے لندن آئے تھے ایک ہی سوٹ پہن کر شادی کی تقاریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ اس حیدرآبادی سہرے کی خوبی یہ تھی کہ اس میں سے دولہا کا چہرہ بالکل دکھائی نہیں

دیتا تھا۔ ہمارے حیدرآبادی دولہے کبھی کبھی سہرے کو اپنے چہرے سے ہٹاکر براتیوں کو دیکھ بھی لیتے ہیں۔ مگر ڈاکٹر مجتبیٰ الفرید عرفان نے حیدرآبادی رسومات کا اتنا پاس و لحاظ رکھا کہ کسی نامحرم کی نظر اپنے چہرے پر پڑنے نہیں دی۔ دولہا کے انگریز رشتہ داروں اور احباب کی سہولت کی خاطر حیدرآبادی رسومات کی نزاکتوں کے بارے میں سلیس انگریزی زبان میں ایک تقریر بھی کی گئی۔ انگریزوں کو بتایا گیا کہ عقد کے بعد جب چھوہارے اچھالے جائیں تو انھیں لوٹا جائے۔ انگریزوں کی نوآبادیات جب سے ختم ہوئی ہیں، وہ لوٹ مار کے عادی نہیں رہے مگر چھوہاروں کی لوٹ مار میں ان کی فطری صلاحیتیں کام کر گئیں ہم نے دو بادام، ایک کھجور اور مصری کی ایک ڈلی لوٹی۔ ہم لوٹ کا یہ مال ہاتھ میں لیے بیٹھے تھے کہ ایک انگریز نے اچانک ہمارے ہاتھ کو زبردستی مروڑ کر یہ مال غنیمت حاصل کیا اور بھیڑ میں غائب ہوگیا۔ عقد کے بعد ہمارے دوست حبیب حیدرآبادی کی طرف سے عشائیہ کا انتظام تھا۔ عشائیہ کیا تھا۔ حیدرآبادی کھانوں کی نمائش تھی۔ تین اقسام کی بریانی تھی۔ لقمیاں، دہی کی چٹنی، کباب، بگھارے بینگن، دم کا مرغ، ڈبل کا میٹھا، خوبانیوں کا میٹھا، سوئیاں سب کچھ تھا۔ اس عشائیہ کی خوبی یہ تھی کہ یہ بلالحاظ مذہب و ملت سب کے لئے تھا۔ دولہا کے انگریز رشتہ داروں کی خدمت میں بھی یہی حیدرآبادی کھانا پیش کیا گیا۔ لہٰذا ہم نے دیکھا کہ ایک انگریز دہی کی چٹنی میں ڈبل کا میٹھا ملاکر نہ صرف کھا رہا تھا بلکہ حیدرآبادی پکوان کی تعریف بھی کر رہا تھا۔ ایک انگریز کباب میں بگھارے بینگن ملاکر کھا رہا تھا۔ ایک اور انگریز مرغ کی ٹانگ کی مدد سے خوبانیوں کا میٹھا کھا رہا تھا۔ انگریز جس طرح حیدرآبادی تہذیب کو کھا رہے تھے۔ اُسے دیکھ کر ہمارے منہ میں پانی بھر بھر آ رہا تھا۔ ہمارے دوست مغنی تبسم نے کئی گھنٹوں کی محنت کے بعد مہمانوں کے لیے حیدرآبادی پان بھی بنا رکھے تھے۔ یہ پان کھانے کے بعد مہمانوں کو پیش کیے گئے۔ انگریزوں کو آسان انگریزی میں بتایا گیا کہ اگر پان کھانے کے بعد منہ سے لال رنگ کا تھوک نکلے تو اس سے پریشان ہوکر ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے، انگریز تھوکنے کو بہت برا سمجھتے ہیں۔ لیکن اس دن بہت سے انگریزوں کو پان کھانے کے بعد پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ تھوکنا کس کو کہتے ہیں۔ اور تھوکنے کے حیدرآبادی آداب کیا ہیں۔ ایک انگریز دیر سے محفل میں آیا۔ اس نے لوگوں کو پان کھاتے دیکھا تو کھاتا ہی چلا گیا۔ ہم نے سوچا یہ انگریز تو پان کا بہت شوقین معلوم ہوتا ہے مگر جب اس نے آستین چڑھاکر پان پر پان کھانا شروع کیا تو ہم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا بھیا! کھانا وانا بھی کھایا یا نہیں؟ بہت حیرت کے ساتھ ہم سے پوچھنے لگا۔ "کیا اس کھانے کے علاوہ اور بھی کچھ کھانے کا انتظام ہے؟"

غرض لندن میں قیام کے دوران میں ہم نے حیدرآبادی تہذیب کو جس طرح پروان چڑھتے دیکھا اس سے ہمارا دل باغ باغ ہوگیا۔ ہمارے دوست عامر موسوی اور عباس زیدی کے ہاں حیدرآبادی نہاری اور بکرے کی جتنی زبانیں کھائیں اتنی کبھی اور کہیں نہیں کھائیں۔ عامر موسوی نے ہمیں بتایا کہ حیدرآبادیوں کے لندن آنے سے پہلے انگریز اپنی زبان کی اہمیت سے تو واقف تھے لیکن بکرے کی زبان کی اہمیت اور افادیت سے ناآشنا تھے۔ انگریزوں نے اپنی زبان کے علاوہ بکرے کی زبان کی عزت کرنا حیدرآبادیوں سے ہی سیکھا۔ پہلے انگریز قصائی بکرے کی زبان کو پھینک دیتا تھا۔ مگر اب حیدرآبادیوں کے انتظار میں سینت سینت کے ریفریجریٹر میں رکھتا ہے۔ اگر کوئی حیدرآبادی نہیں آتا تو خود کھا لیتا ہے۔ مانا کہ انگریزوں نے ہمیں بہت کچھ سکھایا مگر تم یہ بات کیوں تسلیم نہیں کرتے کہ حیدرآبادیوں نے انھیں بکرے کی زبان کھانے کا گر سکھایا۔ حیدرآبادیوں کے آنے سے پہلے انگریز دنیا کی ایک بڑی لذت سے محروم تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اب بعض انگریز بھی صبح کو کھچڑی، خاگینہ اور آم اور املی کی چٹنی، پاپڑ وغیرہ کھانے لگے ہیں۔ لندن میں ہمارا قیام 'قیام الدین' کے ہاں تھا اور وہ لندن میں مقیم ہی اس لئے تھے کہ

یہاں رہ کر خالص اشیاء کی مدد سے لذیذ حیدرآبادی کھانے بنائے جاسکتے ہیں۔ لندن تو خیر لندن ہے پیرس میں ہم چار دن کے قیام کے لئے اپنے دوست مسرور خورشید کے ہاں پہنچے تو انھوں نے جاتے ہی اپنا ریفریجریٹر کھول کر دکھا دیا کہ بھیا! میں نے اس میں پورے ایک ہفتہ کے حیدرآبادی کھانے پکا کر رکھ دیئے ہیں۔ تم صرف چار دن کیوں رہتے ہو۔ ایک ہفتہ رہو۔ یہ رہی نہاری، یہ رہے بگھارے بینگن، یہ رہی دہی کی چٹنی، یہ رہی کھچڑی اور یہ رہی"

ہم نے اپنے اور ان کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "خدا کے لئے اب حیدرآبادی کھانوں کا ذکر نہ کیجئے۔ مجھے ابکائی آرہی ہے۔ کیا حیدرآبادی تہذیب اب صرف پکوان میں ہی اٹک کر رہ گئی ہے؟"

بولے "یہ بات ہے تو لو مجھ سے مخدوم کے شعر سنو۔ امجد حیدرآبادی کی رباعیاں سنو، شاذ تمکنت کے شعر سنو، میں تو ضرورت پڑنے پر کنول پرشاد کنول کے بھی شعر سنا سکتا ہوں؟"

مسرور خورشید کا گھر حیدرآبادی ادیبوں اور شاعروں کی کتابوں سے بھرا پڑا ہے۔ گھر میں اتنی کتابیں ہیں کہ ان کا پلنگ بڑی مشکل سے گھر میں سما پاتا ہے۔ پیرس میں ہماری آمد کے پیشِ نظر اپنا پلنگ انھوں نے ہمارے لئے خالی کر دیا تھا۔ اور خود حیدرآبادی ادیبوں اور شاعروں کی کتابوں پر سوجاتے تھے۔ رباعیاتِ امجد کو سرہانے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ فرہنگ آصفیہ کو اسٹول کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ کھڑکی کو اچھی طرح بند کرنے کیلئے کلیاتِ قلی قطب شاہ سے استفادہ کرتے تھے۔ حیدرآبادی تہذیب ان کے لئے صرف کھانا ہی نہیں، بلکہ اوڑھنا بچھونا بھی تھی۔ پیرس میں پہلے ہی دن پیرس کی سیر کروانے کے لئے ہمیں زمین دوز ٹرین "میٹرو" سے لے کر چلے تو بولے "ذرا اس اسٹیشن کا نام پڑھیئے" ہم نے رومن رسم الخط میں فرانسیسی نام کو پڑھنے کی کوشش کی تو پتہ چلا اسٹیشن کا نام "بوا سیر" ہے۔ ہم نے کہا "یہ اسٹیشن ہے یا بیماری۔ پیرس کی سیر کا آغاز ہی ہم غلط اسٹیشن سے کر رہے ہیں" بولے "کوئی فکر کی بات نہیں۔ ایفل ٹاور سے قریب آپ جس اگلے اسٹیشن پر اتریں گے۔ اس سے آپ کی پریشانی دور ہوجائے گی۔" ایفل ٹاور سے قریب اسٹیشن پر اترے تو مسرور خورشید نے کہا "اب اس اسٹیشن کا نام پڑھیئے۔"

ہم نے نام پڑھا تو تلفظ اس طرح ادا ہوا۔ "بیر حکیم" ہنس کر بولے "جب ہم بوا سیر سے اپنے حیدرآباد کے بیرے حکیم کے پاس پہنچ رہے ہیں تو اس میں ڈرنا کیا۔ جو کوئے دار سے نکلے تو سوئے یار چلے؟"

پیرس کی شاہراہ شانزالیزے پر چلتے ہوئے انہوں نے عابد روڈ کا حال پوچھا۔ مامارت کے گرجا گھر پر نوبت پہاڑ کی خیریت پوچھی۔ لوور کے میوزیم میں سالار جنگ میوزیم کی مزاج پرسی کی۔ وارسائی کے محل میں چومحلہ پیلس کا حال دریافت کیا۔ ناترے دیم کے گرجا گھر پر آل سینٹس کے گرجا گھر کی خیریت پوچھی۔ ہم نے جواباً فرانس کے صدر مسٹر متراں کا حال پوچھا تو انھوں نے اپنے حیدرآبادی دوست نرسنگ راؤ کا حال پوچھا۔ حیدرآباد مسرور خورشید کو پیرس میں بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔

ہم یورپ کے حیدرآبادیوں کو نپٹا کر امریکہ پہنچے تو احساس ہوا کہ امریکہ میں شاید ہی کوئی ایسا شہر ہوگا جس میں حیدرآبادی آباد نہ ہوں۔ ہم اپنے بھائی ڈاکٹر اصغر حسین اور ایک پاکستانی ڈاکٹر فرحت خاں کے ساتھ واشنگٹن سے ساحل میامی تک کے کئی ہزار میل کے سفر پر روانہ ہوئے تو امریکہ کی ریاست جارجیا سے گذرتے ہوئے ہمیں شام کے وقت ایک چھوٹا سا قصبہ دکھائی دیا۔ غالباً تلاد یگا نام تھا اس کا۔ اشارے کے ڈاکٹر فرحت خاں کو یہ شکایت ہے کہ حیدرآبادی

نہ صرف سارے امریکہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بلکہ ان کی تعداد امریکہ کے اصلی باشندوں ریڈ انڈینس سے بھی زیادہ ہے اگر کہیں سے پتھر بھی اٹھاؤ تو اس کے نیچے سے ایک حیدرآبادی فرشی سلام کرتا ہوا برآمد ہوتا ہے۔ ہم نے کہا "اس وقت ہم جس چھوٹے سے قصبہ سے گذر رہے ہے اس کی آبادی ہزار دو ہزار نفوس پر مشتمل ہوگی۔ اس میں تو کوئی حیدرآبادی نہیں ہوگا"

فرحت خاں بولے "لگاسیئے اسی بات پر شرط۔"

ہمارے بھائی ڈاکٹر اصغر حسین نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "شرط نہ لگائیے' آپ نقصان میں رہیں گے۔ ہمیں آج کی رات اسی قصبہ میں رکنا ہے۔ میرا ایک حیدرآبادی دوست ڈاکٹر اسد یہاں رہتا ہے"

ڈاکٹر اسد جو چنچل گوڑہ کے رہنے والے ہیں اس چھوٹے سے قصبہ میں ایک ایسے مکان میں رہتے ہیں۔ جو محل سے کم نہیں۔ گھر کے باہر تین چار موٹریں کھڑی تھیں۔ بہت خوش ہوئے مگر ان سے زیادہ ان کے والد ہم سے مل کر خوش ہوئے جو چھ مہینوں سے امریکہ کے قصبہ میں رہ رہے تھے۔ کہنے لگے چھ مہینوں سے اپنے بیٹوں کے سوائے کسی اور حیدرآبادی کی صورت نہیں دیکھی میں تو امریکہ کی آسائشوں سے تنگ آگیا ہوں چنچل گوڑہ بہت یاد آتا ہے۔ ایک دو مہینوں میں واپس چلا جاؤں گا۔ دوسرے دن صبح کو وہ اپنے بیٹے کا مکان اور جائیداد بالتفصیل دکھلانے کے لئے ہمیں لے گئے ایک ٹیلہ پر کھڑے ہوکر انھوں نے کہنا شروع کیا "وہ جو پہاڑ آپ دیکھ رہے ہیں۔ وہ میرے بیٹے کے ہیں۔ وہ جو بادلوں کے نیچے جنگل نظر آرہے ہیں' وہ میرے بیٹے کے ہیں۔ یہ جو جھیل بہہ رہی ہے۔ وہ بھی میرے بیٹے کی ہے۔"

ہم نے بڑے میاں کی بات کو کاٹ کر کہا "وہ جو آسمان پر سورج چمک رہا ہے۔ وہ کس کا ہے؟"

فوراً اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولے "نعوذ باللہ اس سورج سے میرے بیٹے کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ کسی اور کا ہے"

شکاگو میں ہم اپنے سائنسداں دوست مظفرالدین فاروقی کے مہمان تھے۔ ان کی اہلیہ نے پہلی ہی شام کو امباڑے کی بھاجی کھلاکر ہمیں حیرت زدہ کر دیا۔ پوچھا "امباڑے کی بھاجی اور وہ بھی شکاگو میں"

بولیں "جی نہیں۔ یہ کو ہیر سے آئی ہے اسے بے وقت ضرورت کے لئے سکھا کر رکھ لیا ہے"۔

مظفرالدین فاروقی بولے "میں پچھلے چند برسوں سے اس بھاجی کو اپنے کچن گارڈن میں اگانے کے تجربے کر رہا ہوں۔ انشاءاللہ دو ایک برس بعد اس تجربے میں کامیاب ہو جاؤں گا"۔

"اور اسی ضمن میں شائد آپ کو سائنس کا نوبل انعام بھی مل جائے"' ہم نے ہنس کر کہا۔

شکاگو میں ہی ہمیں اپنے پرانے دوست عزیز الرحمٰن ملے ' جنھوں نے اپنے اطمینان قلب کے لئے ٹھیٹ حیدرآبادی گالیوں کا ٹھیٹ انگریزی میں ترجمہ کر رکھا ہے۔ جنہیں وہ آئے دن ہسپانوی ٹیکسی ڈرائیوروں کو پابندی سے دیتے رہتے ہیں ہم نے پوچھا ہسپانوی ڈرائیور ناراض تو نہیں ہوتے"۔

بولے "سچ پوچھئے تو حیدرآبادی گالیوں میں اتنی تجرید ہوتی ہے کہ یہ جب اردو میں ہی بری نہیں معلوم ہوتیں تو ترجمہ کی چھلنی سے گذرنے کے بعد انگریزی میں کیا بری معلوم ہوں گی میں نے تو بس اپنے اطمینانِ قلب کے لئے ان کا ترجمہ کر رکھا ہے۔ چلو اپنے ڈھنگ سے گالی دے دی اور وطن مالوف سے اپنا رشتہ بنائے رکھا۔

ہمیں شکاگو کے چنچل گوڑہ بھی جانے کا موقع ملا۔ یہاں زیادہ تر وہی لوگ رہتے ہیں جو پہلے حیدرآباد کے چنچل گوڑہ میں رہتے تھے۔ اس میں اور حیدرآباد کے چنچل گوڑہ میں ہمیں کوئی مماثلت نظر نہیں آئی۔ ایک صاحب نے اس چنچل گوڑہ میں کھانے پر

بلا یا تھا۔ ہم نے ان سے پوچھا "یہ کیسا چنچل گوڑہ ہے۔ جہاں بھینسیں نہیں بندھی ہوئی ہیں"۔

بولے" بھینسیں تو ہمارے ذہنوں میں بندھی ہوئی ہیں"۔

پوچھا" تو پھر دودھ بھی وہی دیتی ہوں گی"۔

ایک آہ بھر کر بولے اب اس ذکر کو جانے دیجئے۔ کھانا شروع کیجئے۔ اللہ دیا ہے"۔

اچانک اس "اللہ دیا" کو سن کر ہمیں یقین آگیا کہ ہم سچ مچ حیدرآباد کے چنچل گوڑہ میں بیٹھے ہیں۔

ہم نے ان صاحب سے کہا "مگر ذرا سوچئے کہ اللہ نے آپ کو جو کچھ بھی دیا ہے وہ حیدرآباد سے کتنی دور لاکر دیا ہے"

اپنی آنکھوں میں آنسو لاکر بولے" آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اگر اللہ نے اس کا دسواں حصّہ بھی ہمیں حیدرآباد میں دیا ہوتا تو ہم چنچل گوڑہ کی گلیاں چھوڑ کر یہاں کیوں آتے"۔

ہم نے بات کو اور آگے نہیں بڑھایا کیونکہ آنسو ان کی پلکوں پر چھلکنے کو بیقرار تھے۔

اور ہمیں یوں لگا جیسے حیدرآباد ایک شہر نہیں پھیل کر کائنات بن گیا ہے۔

" مجتبیٰ حسین صحیح معنوں میں مزاح نگار ہیں وہ ان مزاح نگاروں میں نہیں جو شائستہ اور نفیس ادب کی تخلیق کر سکتے ہیں ان کے مزاح میں وہ تندی اور بے باکی نہیں جو طبیعت کو مکدر کر دیتی ہے بلکہ وہ رچاؤ اور لطافت ہے جو پڑھنے والے کو کبھی زیر لب تبسّم اور کبھی بلند آہنگ قہقہے کی دعوت دیتی ہے مزاح نگاری ایک مشکل فن ہے مجتبیٰ حسین ان مشکلات سے بخوبی واقف ہیں۔ مجتبیٰ کا فن اردو کے مزاحیہ ادب میں یقیناً ایک خوشگوار اضافہ ہے"

کرشن چندر

مجتبیٰ حسین

سلیمان اریب

میں جب بھی معظم جاہی مارکٹ پر واقع جبر گاہ کے کمرہ نمبر ۱۷ پر جاتا، اور اریب کے ہمراہ کسی ایسے شخص کو دیکھتا جو میرے لئے اجنبی ہوتا تو میں فوراً وہاں سے بھاگ جانے کی کوشش شروع کر دیتا۔ کیونکہ ایک اجنبی کی موجودگی میں اریب سے ملنا کم از کم میرے لئے بہت تکلیف دہ ہوا کرتا تھا۔ ایسی صورتوں میں وہ میرے پہنچتے ہی کہا کرتے "اچھا ہوا تم آگئے۔ ان سے ملو۔ یہ فلاں صاحب ہیں لکھنؤ سے آئے ہیں۔ تم انھیں ذرا وہ لطیفہ تو سنا دو۔"

میں انجان بن کر پوچھتا "کون سا لطیفہ"؟

"ارے وہی لطیفہ جو تم نے میرے بارے میں گڑھا ہے۔ وہی مستری والا۔"

میں شدید کرب میں مبتلا ہو جاتا، کیونکہ اریب مجھے ہر بار مجبور کیا کرتے تھے کہ میں اس لطیفہ کو ہر نئے آنے والے شخص کے سامنے سناؤں، میں ان کی بات کو ٹال جانے کی کوشش کرتا مگر وہ مسلسل اصرار کرتے کہ "ارے بھئی! سنا دو۔ یہ سننا چاہتے ہیں۔"

میں رونی صورت بنا کر لطیفہ سنانا شروع کر دیتا "اچھا صاحب سنئے۔ لطیفہ صرف اتنا ہے کہ اریب اپنے مکان کی کمپاؤنڈ وال کو اونچی کرنا چاہتے تھے۔ ایک بار انھوں نے اس کا ذکر ایک مستری سے کر دیا۔ بدقسمتی سے یہ مستری سخن فہم ہونے کے علاوہ اریب کا مداح بھی تھا۔ گویا کریلا وہ بھی نیم چڑھا۔ اب وہ ہر روز اریب کے گھر پہنچتا اور پوچھتا کہ کمپاؤنڈ وال کی تعمیر کا کام کب سے شروع ہونے والا ہے؟

اریب کہتے "بھئی ابھی تو پیسوں کا بندوبست نہیں ہوا ہے۔ پیسہ آئے گا تو نئی دیوار کی تعمیر کے لئے درکار مال خریدوں گا اور تمھیں اطلاع دوں گا۔"

اس کے باوجود مستری اریب کے مکان پر پہنچتا اور دیوار کی تعمیر کے لئے ان سے اصرار کرتا۔ اریب ہمیشہ یہی عذر کر کے اسے ٹال دیتے کہ ابھی پیسہ کا بندوبست نہیں ہوا ہے مگر وہ مستری کب ہار ماننے والا تھا۔ ایک دن وہ اپنے ساتھ اینٹیں اور گارا لے کر اریب کے گھر پر پہنچ گیا اور کہنے لگا:

"اتفاق سے میرے پاس اینٹیں آگئی ہیں آپ مجھے ان اینٹوں کی قیمت اس وقت ادا کیجئے جب آپ کے پاس پیسے آئیں۔ آپ کا بڑا مسئلہ تو حل ہو گیا ہے۔ اب آپ صرف مزدوروں کی اجرت ادا کرنے کا انتظام کیجئے مال تو آگیا ہے۔"

اس پر اریب نے کہا "بھائی مشکلات تو یہ ہے کہ میں مزدوروں کی اُجرت کا بندوبست بھی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا فی الحال اس مسئلہ کو ملتوی ہی رکھو"۔

اس پر میستری نے قدرے جھلا کر کہا "آخر آپ پر ایسی کونسی آفت آن پڑی ہے کہ مزدوروں کی اُجرت بھی ادا نہیں کر سکتے"۔

اریب مسکراتے ہوئے بولے "بھائی اصل قصہ یہ ہے کہ "صبا" ابھی تک پریس میں ہے وہ چھپ جائے گا تو اشتہارات کی رقم ملے گی۔ اس سے پہلے میں پیسہ کہاں سے لاؤں گا؟"

تب میستری نے عاجز ہو کر کہا "صاحب! آپ سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ آپ آج ہی سے "صبا" میرے حوالے کر دیجئے۔ میں آئندہ سے "صبا" بھی نکالوں گا اور آپ کی کمپاؤنڈ وال بھی تعمیر کر دوں گا"

لطیفہ ختم ہوتا تو اریب زوردار قہقہہ لگاتے اور فرطِ مسرت میں اجنبی سے یوں مصافحہ کرتے جیسے لطیفہ میں نے نہیں خود اریب نے سنایا ہو۔

میں انھیں کہتا "اریب صاحب۔ لطیفہ تو آپ کو پسند آیا مگر اس نکتہ پر بھی غور کیجئے کہ لطیفہ کی رو سے "صبا" ایک ایسا رسالہ بن جاتا ہے جسے نکالنے کے لئے ایک عدد سلیمان اریب کی نہیں بلکہ ایک میستری کی ضرورت پیش آتی ہے"

اس پر اریب پھر قہقہہ لگا کر اجنبی سے مصافحہ کرتے۔ ابھی پہلے لطیفہ کی ہنسی ختم بھی نہیں ہوتی کہ اریب کہتے۔ "اچھا وہ لطیفہ تو سناؤ"۔

میں پھر انجان بن کر پوچھتا "کون سا لطیفہ"؟

"ارے وہی جاکی صاحب والا"۔

میں اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھ کر طوعاً و کرہاً لطیفہ سنانے لگتا۔ لطیفہ یہ ہے کہ ایک بار کسی چھوٹی سی بات پر اریب صاحب اور جاکی صاحب میں اَن بَن ہوگئی۔ ایک دن جاکی صاحب اورینٹ ہوٹل میں بیٹھے اریب کا مذاق اُڑا رہے تھے کہ میں نے پوچھا۔

"جاکی صاحب! جب آپ اریب کو بڑا شاعر نہیں مانتے تو پھر آپ نے اپنے پہلے مجموعۂ کلام میں اریب کی رائے کیوں شائع کی ہے؟"

اس پر جاکی صاحب نے اپنے تاریخی جھٹکے کے ساتھ کہا "ہیں! تبھی تو اریب کی رائے میں نے گرد پوش پر چھاپی ہے بھلا گرد پوش بھی کبھی کتاب کا حصہ بن سکتا ہے؟" اریب کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہو جاتی اور وہ اپنے لمبے لمبے بال چہرہ کے سامنے پھینک کر ایک زوردار قہقہہ لگاتے اور پھر ایک بار اجنبی سے مصافحہ کرنے کا عمل دہرایا جاتا۔

میں اپنی جان چھڑا کر وہاں سے بھاگ جانے کی کوشش کرتا مگر اسی اثناء میں اریب پھر فرمائش کرتے "اچھا اب وہ نوری والا لطیفہ بھی سنا دو"۔

اب کی بار میرے چہرے پر ایسے آثار نمودار ہوتے جیسے میں نے ارنڈی کا تیل پی لیا ہو۔ مگر میں جانتا تھا کہ لطیفہ سنائے بغیر اریب مجھے جانے نہیں دیں گے۔

میں پھر لطیفہ سنانا شروع کر دیتا اور اجنبی کی سہولت کے لئے کہنے لگتا "اس لطیفے کو سمجھنے کے لئے آپ کا شاہ نوری سے واقف ہونا ضروری ہے۔ شاہ نوری اریب کے اسسٹنٹ کے طور پر "صبا" کا کام کرتے تھے۔ ایک دن ایک صاحب اریب

اپنے چپراسی کے ذریعہ اریب کو ایک خط بھیجنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنے چپراسی کو بلا کر کہا "یہ خط لے کر کمرہ نمبر ۔۔۔ پر جاؤ اور وہاں سلیمان اریب کو دے آؤ" چپراسی نے اریب کو پہچاننے سے انکار کرتے ہوئے کہا "اگر آپ ان کا حلیہ بیان کردیں تو مجھے پہچاننے میں آسانی ہوگی"۔ ان صاحب نے کہا "ارے تم سلیمان اریب کو نہیں جانتے۔ لمبے لمبے بال رکھتے ہیں، اونچے پورے ہیں، گورا سا رنگ ہے ۔۔۔" چپراسی نے پھر بھی پہچاننے سے انکار کردیا۔

تب ان صاحب نے کہا "ارے بھئی سلیمان اریب کو کون نہیں جانتا، مشہور شاعر ہیں، چہرے پر چیچک کے داغ ہیں، کرتا اور پاجامہ پہنتے ہیں"۔

اس پر چپراسی نے اچانک دماغ پر زور دیتے ہوئے پوچھا "صاحب آپ کا اشارہ کہیں ان صاحب کی طرف تو نہیں ہے جو اکثر شاہ نوری صاحب کے ساتھ گھومتے رہتے ہیں"۔

اس پر اریب پھر ایک بار قہقہہ لگا کر کہتے "لیجئے صاحب! یہ حیثیت ہوگئی ہے ہماری کہ لوگ شاہ نوری کے توسط سے ہمیں پہچاننے لگے ہیں جیسے ہماری کوئی حیثیت ہی نہ ہو"۔

میں یہ لطیفہ سنا کر کافی مطمئن ہوجاتا کیونکہ اریب کے بارے میں میرے پاس صرف تین ہی لطیفے تھے۔ اریب اکثر پوچھتے "تم نے میرے بارے میں صرف تین ہی لطیفے کیوں بنائے ہیں؟"

میں کہتا "اریب صاحب! سچ تو یہ ہے کہ میں آپ کے بارے میں سینکڑوں لطیفے بنا سکتا ہوں، لیکن مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ میں ایک ہی لطیفہ کو سینکڑوں مرتبہ سناؤں۔ میں تو یہ تین لطیفے بنا کر پچھتا رہا ہوں۔ جب بھی باہر سے کوئی مہمان آتا ہے یا کوئی ادبی شخصیت آتی ہے تو آپ اکبر اعظم بن جاتے ہیں اور میں صرف ملا دو پیازہ بن کر رہ جاتا ہوں آخر میری بھی تو کوئی حیثیت ہے"۔ اریب اس بات پر بھی مسکراتے۔

میں نے بہت سی زندہ دل شخصیتیں ایسی دیکھی ہیں جو اپنے بارے میں لطیفے سن کر ناک بھوں چڑھانے لگتی ہیں مگر اس معاملہ میں اریب کا حال جداگانہ تھا۔ وہ اپنے بارے میں ہونے والے مذاق کو عام کرنا چاہتے تھے بلکہ ایک نوبت تو وہ بھی آتی تھی جب لطیفہ گھڑنے والا خود ایک لطیفہ بن جایا کرتا تھا۔

اریب کو سب سے پہلے میں نے ۱۹۵۲ء میں گلبرگہ میں دیکھا تھا۔ ہم لوگوں نے گلبرگہ میں ایک کل ہند مشاعرہ کا اہتمام کیا تھا جس میں اریب شرکت کے لئے آئے ہوئے تھے۔ میں اس مشاعرہ کا معتمد تھا۔ میری عمر یہی کوئی سترہ سال کی ہوگی۔ گویا یہ وہی عمر تھی جہاں سے آدمی اپنی زندگی میں لغزشوں کا آغاز کرتا ہے۔ اس عمر میں آدمی شعر کا مفہوم تو سمجھنے لگتا ہے لیکن شعر پر عمل کرنے کی ہمت اس میں نہیں ہوتی۔ آدھی رات کا وقت تھا جب اریب اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ٹرین سے گلبرگہ اسٹیشن پر اترے تھے۔ اریب اپنے ساتھیوں سے باتیں کر رہے تھے اور بات بات پر قہقہے لگا رہے تھے۔ یقین مانئے زندگی میں پہلی بار مجھے شاعروں کو دیکھنے کا موقع مل رہا تھا، میں نے احتیاطاً ایک آٹوگراف بک بھی خریدلی۔ میں چونکہ مشاعرہ کا معتمد تھا اسی لئے مجھے ڈر تھا کہ کہیں انتظامات کی گڑبڑ میں مجھے شاعروں کے آٹوگراف لینے کا موقع نہ مل سکے۔ اسی لئے اسٹیشن پر ہی میں نے اپنی آٹوگراف بک سب سے پہلے اریب کی جانب بڑھادی۔ موصوف نے گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا

"رات کے دو بج رہے ہیں بھلا یہ بھی کوئی وقت ہے آٹوگراف لینے کا؟"

شاہد صدیقی نے جو برابر میں کھڑے تھے اچانک کہا "اریب تم وقت نہ دیکھو بلکہ فوراً اپنا آٹوگراف دے دو۔ یہ لوگ کل تمہاری شاعری سن لیں گے تو شاید تم سے آٹوگراف لینے نہ آئیں۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ مشاعرہ سے پہلے ہی

آٹوگراف دے دو۔ تمہیں دوسروں کی غفلت سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

اریب نے کہا "ایسی بات ہے تو پھر مجھے ابھی اپنا آٹوگراف دے دینا چاہیئے" یہ کہتے ہوئے اریب نے فوراً قلم نکالا اور آٹوگراف بک پر دستخط کر دیئے۔ مشاعرہ میں اریب نے بڑی جاندار نظم سنائی۔ مجھے اریب کی اس نظم کے کئی بند آج بھی یاد ہیں اور وہ آٹوگراف بک آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ پھر کئی برس بیت گئے۔ میں گلبرگہ سے حیدرآباد آ گیا اور ادبی محفلوں میں اریب سے لگاتار اور مسلسل ملاقاتیں ہونے لگیں اور مجھے انھیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

اریب ان لوگوں میں سے تھے جن سے آپ کا جی خواہ مخواہ ملنے کو چاہتا ہے چنانچہ اریب کے اطراف بہت سے لوگ خواہ مخواہ جمع رہا کرتے تھے۔ میں نے جب بھی اریب کو دیکھا انھیں خواہ مخواہ لوگوں میں گھرے دیکھا۔ وہ خواہ مخواہ گھنٹوں دوستوں کے ساتھ بیٹھا کرتے اور خواہ مخواہ ان سے بحثیں کیا کرتے تھے۔ کرونبگلہ روڈ پر "صبا" کا دفتر تھا جو عملاً اریب کے دوستوں کا اڈہ تھا۔ وہ صبح میں اس ارادے کے ساتھ اپنے گھر سے نکلتے تھے کہ دفتر میں بیٹھ کر کام کریں گے لیکن "صبا" کے دفتر پر پہنچتے تو دوستوں کے نرغے میں پھنس جاتے۔ دن بھر گپیں ہوتیں، چائے کے دور چلتے اور محفل کمرہ نمبر ۱۷ سے اٹھ کر سڑک پر جاری رہتی۔ اریب ہر روز اپنے ساتھ بیاگ لے کر آتے، لیکن کبھی اس بیاگ کو کھولنے کی نوبت نہ آتی۔ یہاں تک کہ "صبا" لیٹ ہو جاتا۔ خریداروں کے خطوط آنے لگتے، ایجنٹ یاد دہانی کرانے لگتے۔ لیکن اریب کی بے نیازی میں کوئی فرق نہ آتا۔ میں اریب سے کہا کرتا "صبا" اردو کا واحد ماہنامہ ہے جو سال میں چار مرتبہ بڑی پابندی سے شائع ہوتا ہے۔"

اریب کے اطراف بھانت بھانت کے لوگ جمع رہتے تھے۔ ایسے لوگ بھی رہتے تھے جن سے کوئی شاعر یا ادیب چند منٹ کے لئے بھی بات نہیں کر سکتا مگر اریب ان سے گھنٹوں باتیں کیا کرتے تھے۔ اریب کی ذات ایک ایسا گھاٹ تھی جس پر شیر اور بکری دونوں ایک ساتھ پانی پیا کرتے تھے۔ حیدرآباد کا کوئی بھی مشاعرہ اریب کے بغیر نہ تو کامیاب ہو سکتا تھا اور نہ ہی فیل ہو سکتا تھا۔ بہت کم شعراء ایسے ہوں گے جن میں بیک وقت مشاعرہ کو کامیاب بنانے اور اسے فیل کرنے کی اتنی بڑی صلاحیت موجود ہو۔ اریب چاہتے تو مشاعرے کو بڑی بلندی تک لے جاتے اور کبھی بگڑ جاتے تو مشاعرہ کو بچے کے کھلونے کی طرح توڑ تاڑ کر پھینک دیتے اور بڑی معصومیت کے ساتھ ٹوٹتے ہوئے مشاعرے کی طرف دیکھتے۔ میں تو کہتا ہوں کہ حیدرآباد کے مشاعروں کی آدھی فضا اریب ہی بنایا کرتے تھے اور بقیہ آدھی دوسرے سارے شعراء مل کر بناتے تھے۔ شعر سنا کر سماں باندھنا تو سب کو آتا ہے لیکن اریب مشاعرہ میں صرف اپنی مخصوص آمد کے ذریعہ ہی سماں باندھ دیا کرتے تھے۔ مشاعرہ گاہ میں جب اریب داخل ہوتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے سچ مچ ایک شاعر چلا آ رہا ہے۔ بہکتی ہوئی چال، اطراف دوستوں کا ہجوم۔ یوں لگتا جیسے اریب کو پابہ زنجیر کر کے مشاعرہ میں لایا جا رہا ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ رک جاتے سامعین پر پلٹ کر نگاہ ڈالتے۔ کوئی شناسا نظر آتا تو لہراتا ہوا اسلام کر دیتے اگر بہت زیادہ موڈ میں ہوتے تو سامعین کی بھیڑ کو چیرتے ہوئے اپنے شناسا تک پہنچنے کی کوشش کرتے اور ان کے احباب انھیں زبردستی روکنے کی کوشش کرتے۔ اریب اپنے ساتھیوں سے الجھتے، ان سے بحث کرتے، بالآخر ڈائس پر پہنچ جایا کرتے تھے۔ اریب اپنی مخصوص آمد کے ذریعہ ہی سامعین سے داد وصول کر لیا کرتے تھے۔ شعر سنا کر داد وصول کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ اریب کے انتقال پر مجھے سب سے زیادہ دکھ اس احساس سے ہوا کہ اب حیدرآباد میں کوئی ایسا شاعر باقی نہیں رہ گیا جو اریب کی سی شاعرانہ سج دھج کے ساتھ مشاعرہ گاہ میں داخل ہو سکے۔ اب شعراء مشاعرہ گاہ

میں یوں پہنچتے ہیں جیسے کلام سنانے نہ آئے ہوں بلکہ کسی گھر میں نقب لگانے آئے ہوں۔ اریب اس دھوم دھام اور سج دھج کے ساتھ مشاعرہ گاہ میں آتے کہ یوں محسوس ہوتا جیسے مشاعرہ سے پہلے ہی انھوں نے مشاعرہ لوٹ لیا ہو۔ پھر کلام یوں سناتے جیسے وہ ڈائس پر نہیں دیوان خانہ میں بیٹھے ہوں۔ سامعین سے بے تکلف گفتگو ہوتی تھی۔ سامعین کے سوالات کے جوابات دیئے جاتے تھے۔ آخری زمانے میں تو وہ کلام کم سناتے تھے اور سامعین سے گفتگو زیادہ کرتے تھے۔ یوں تو اریب اپنی غزلیں اکثر ترنم سے سنایا کرتے تھے۔ مگر میں ان سے کہا کرتا تھا کہ اریب صاحب آپ کا ترنم تو فقط اللفظ ترنم ہوا کرتا ہے" اس پر وہ کہتے "بھئی شاعر اور قوال میں کچھ فرق تو ہونا ہی چاہیئے"۔

صفیہ (مسز اریب) اریب صاحب کی سب سے بڑی کمزوری اور سب سے بڑی طاقت تھیں۔ ہر بات میں صفیہ کا بے موقعہ ذکر کیا کرتے تھے۔ ایک دن فراق کی شاعری پر بحث ہو رہی تھی۔ کسی نے کہا فراق کی شاعری کے بارے میں پروفیسر احتشام حسین کی یہ رائے ہے۔

اس پر اریب نے فوراً کہا "اور صفیہ کی بھی یہی رائے ہے۔" یہ کہہ کر وہ یوں مطمئن ہو گئے جیسے صفیہ کی رائے کے بعد اب پروفیسر احتشام حسین کی رائے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ دنیا کا کوئی بھی مسئلہ پیش ہوتا تو اریب اس میں صفیہ کی رائے کو ضرور شامل کر دیتے تھے۔ ان کی بات چیت کا نمونہ کچھ اس طرح ہوتا تھا کہ:

"عرب اسرائیل جنگ کے بارے میں امریکہ نے جو رویہ اختیار کیا ہے اس سے صفیہ متفق نہیں ہے۔" "مسز اندرا گاندھی انقلابی اقدامات کے ذریعہ ملک میں سوشلزم لانا چاہتی ہیں اور صفیہ کی بھی یہی رائے ہے۔" "اردو بڑی شیریں زبان ہے کیونکہ صفیہ کی یہی رائے ہے"۔

ایک دن انھوں نے دوست احباب کی ایک محفل میں کوئی پندرہ سولہ مرتبہ صفیہ کی رائے کا اظہار کیا۔ محفل برخواست ہوئی تو اریب کے ایک بے تکلف دوست نے کسی بات پر اریب سے کہا "اریب تم نرے احمق اور بیوقوف آدمی ہو۔" اس پر میں نے فوراً لقمہ دیا "اور صفیہ کی بھی یہی رائے ہے"۔ اریب نے فوراً پلٹ کر مصافحہ کیا اور بڑی دیر تک ہنستے رہے۔

اریب کو اپنے اطراف نوجوان ادیبوں اور شاعروں کو جمع کرنے کا بڑا خاص ملکہ تھا۔ اریب ہی نے انھیں سب سے پہلے "صبا" میں چھاپا۔ غالباً ۱۹۶۱ء میں میں نے موت کے موضوع پر چند کہانیاں لکھی تھیں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نے لکھنا شروع ہی کیا تھا۔ ان کہانیوں کی اطلاع کسی طرح اریب تک پہنچ گئی۔ ایک دن میرے پاس آئے اور کہنے لگے "سنا کہ تم نے موت کے موضوع پر چند کہانیاں لکھی ہیں۔ وہ کہانیاں پہلے "صبا" کو دے دو۔" میں نے کہا "اریب صاحب یہ کہانیاں بالکل رف حالت میں میرے پاس ہیں اور پھر یہ اتنی طویل ہیں کہ انھیں اب فیر کرنا مجھ سے ممکن نہیں ہے"۔

اریب نے زبردستی مجھ سے ایک کہانی کا مسودہ لیا اور کہا "تم فکر نہ کرو میں اسے فیر کر لوں گا"۔ وہ کئی دن تک اس مسودہ کو فیر کرنے کی کوشش کرتے رہے مگر میری ہینڈ رائٹنگ کچھ ایسی ہے کہ بعض اوقات مجھے بھی اپنی تحریر کو پڑھنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ لہذا اریب چند دنوں بعد میرے پاس آئے تو ان کے ساتھ میری کہانی کا مسودہ تھا اور اس کے ساتھ چند کاغذات بھی تھے جن پر اریب نے میری کہانی خود اپنے ہاتھ سے فیر کی تھی۔ کہنے لگے "تمہاری ہینڈ رائٹنگ اتنی خراب ہے کہ بڑی مشکل سے چند صفحات ہی فیر کر سکا ہوں اور وہ بھی نامکمل۔ اب بتاؤ میں کیا کروں؟"

میں نے کہا "اریب صاحب! میری ہینڈ رائٹنگ کو پڑھنے کے لئے آدمی کا بہت زیادہ تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے" اریب نے کہا "لیکن میرا خیال ہے کہ تمہاری جیسی ہینڈ رائٹنگ لکھنے کے لئے آدمی کا پڑھا لکھا ہونا قطعاً ضروری نہیں ہے"

پھر مجھے یہ ذمہ داری سونپی کہ میں اسے فیر کر کے دے دوں۔ اس اثناء میں میں نے مزاح نگاری کے میدان کو اپنایا اور وہ کہانیاں جوں کی توں پڑی رہیں۔ جب بھی اریب ملتے یہ ضرور پوچھتے کہ میں نے ان کہانیوں کا کیا کیا۔

میں ان سے کہتا "اریب صاحب! اب ان کہانیوں کو چھوڑیے میں نے مزاح لکھنا شروع کر دیا ہے۔ میں نے موت کے موضوع پر کہانیاں لکھی تھیں اور اب چاہتا ہوں کہ یہ کہانیاں میری موت کے بعد ہی "صبا" میں چھپیں۔ اس پر اریب کہتے "خیر ٹھیک ہے، میں تمہاری موت کا انتظار کروں گا۔ ابھی تو میں کافی جوان ہوں۔"

لیکن مزاح کے میدان میں بھی اریب نے میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ چنانچہ میرا پہلا مزاحیہ مضمون سب سے پہلے ۶۲ء میں "صبا" ہی میں چھپا۔

نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی ہمت افزائی میں وہ اس قدر آگے نکل جاتے تھے کہ بعد کو نوجوان ادیب خود ان سے بھی آگے نکل جانے کی کوشش کرنے لگتے تھے۔ اریب کے ساتھ بے شمار بیٹھکیں ہوتیں۔ جب وہ ساری دنیا کو انگور کی بیٹی دینے کے موڈ میں ہوتے تو آپ اپنے کو یوں سمجھتے جیسے غالب کے بعد اگر اردو شاعری نے کوئی بڑا شاعر پیدا کیا ہے تو وہ خود ہیں۔ اس وقت وہ گردن اٹھا کر دنیا کی طرف یوں دیکھتے جیسے وہ ہمالیہ کی چوٹی پر چڑھ گئے ہوں۔ اسی موڈ میں اریب کی اپنے ساتھیوں سے ان بن ہو جایا کرتی تھی۔ دوستوں سے خوب لڑتے جھگڑتے مگر دوسرے دن ملتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں بلکہ دوستوں سے یہ تک نہ پوچھتے کہ انھوں نے رات میں کس کس سے کیا کیا کہا تھا اور خود ہی اپنی باتوں پر ہنسنے لگتے۔

پھر اریب ایک دن اچانک بیمار ہو گئے۔ کسی نے بتایا کہ ان کی آواز بیٹھ گئی ہے۔ ان دنوں ادب میں ترسیل کے مسئلہ پر رسالوں میں بڑی بحث چل رہی تھی۔ ایک دن اریب سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا "اریب صاحب! آپ تو سچ مچ ترسیل کا مسئلہ بن کر رہ گئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں جب سے آپ کی آواز بیٹھ گئی ہے آپ کو ترسیل کا مسئلہ بڑی آسانی سے سمجھ میں آ رہا ہوگا۔"

اریب نے بیٹھی ہوئی آواز میں ہنسنے کی کوشش کی لیکن ان کی آنکھوں نے بڑا زوردار قہقہہ لگایا۔ اریب کے ہونٹ کم مسکراتے تھے اور ان کی آنکھیں زیادہ مسکراتی تھیں۔ پھر چند دن بعد ملے تو ان کے گلے میں پلاسٹک کا ایک خول چڑھا ہوا تھا۔

میں نے پوچھا "یہ کیا ہے"

کہنے لگے "ضعف نے گلے میں پٹہ باندھ دیا ہے"

میں نے کہا "اریب صاحب! آپ تو ہمیشہ پٹے تڑاتے رہے ہیں۔ اس پٹے کی کیا اہمیت ہے"

بولے "مگر کسی کسی پٹے کو توڑنا بہت مشکل ہوتا ہے۔" اریب نے یہ بات اس وقت کہی تھی جب ان کی زندگی کا پٹہ ٹوٹنے لگا تھا۔ پھر چند دنوں بعد یہ اطلاع ملی کہ اریب کو کینسر ہو گیا ہے اور ہم سب لوگ اریب کو وداع کرنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ میں ان کے پاس جلد جلد جانے لگا۔ موت اریب کے بہت قریب آگئی تھی مگر اریب پھر بھی موت سے بہت دور تھے۔ وہ ہمیشہ یوں ہی مسکراتے جیسے پہلے مسکرایا کرتے تھے۔ اریب کی مسکراہٹ کینسر کی زد سے بہت دور تھی۔ کینسر نے اریب کو تو زیر کر لیا تھا لیکن وہ ان کی مسکراہٹ پر کوئی کمند نہیں پھینک سکا تھا۔

اسی اثناء میں مخدوم بھی چل بسے۔ مخدوم کے جنازہ میں بھی میں نے اریب کے چہرہ پر مسکراہٹ دیکھی جیسے وہ جانتے تھے کہ انھیں مخدوم کی موت پر آنسو نہیں بہانا ہے۔ کیونکہ مخدوم سے ان کی جدائی بہت عارضی ہے۔ صرف چند دنوں چند مہینوں کی بات۔ اسی لئے انھوں نے دوسروں کو جی کھول کر رونے کا موقع دیا۔ اور خود ہنستے رہے۔ مخدوم کے جلسۂ تعزیت میں اریب نے ایک مضمون پڑھا اور اس مضمون کے ردعمل کے طور پر ان پر انڈے بھی پھینکے گئے۔ اس واقعہ کے بعد اریب کے جذبات کافی تلخ ہوگئے تھے اور دوستوں کے لئے بھی ان کے رویہ میں تبدیلی آگئی تھی۔ ایک دن عابد روڈ پر نظر آئے تو مجھے دیکھ کر انجان بن گئے۔ مجھے یوں لگا جیسے اریب اپنی دانست میں یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان پر انڈے میں نے ہی پھینکے تھے۔ میں نے بھی انھیں چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ اسی اثناء میں اسد اللہ برلن سے آگئے اور ایک دن مجھ سے کہنے لگے "چلو آج کی شام اریب کے ساتھ گزاریں گے۔"

میں نے کہا بات دراصل یہ ہے کہ اریب مجھ سے کھنچے کھنچے سے نظر آتے ہیں، جانے کیا بات ہے۔ جانا ہو تو آپ چلے جائیں۔ وہ بیمار بھی ہیں اسی لئے میں ان کی بیماری کو مزید تلخ نہیں بنانا چاہتا۔ مگر اسد اللہ نہ مانے، اریب کو فون کیا اور ہم تینوں ایک بار میں بیٹھ گئے۔ اریب تب بھی مجھے کھنچے کھنچے ہوئے نظر آئے مگر اچانک انھوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "بھئی تم تو ہماری محفلوں میں کاجو کھانے پر اکتفا کرتے ہو، آج جی بھر کا جو کھالینا۔ لیکن اگر انگور کا پانی مجھ پر اثر کرے تو میری بات کا اثر نہ لینا۔"

میں نے مسکرا کر پلیٹ میں سے کاجو اٹھا کر منہ میں ڈال لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس محفل میں کوئی گفتگو ایسی نکلے جس سے اریب کو تکلیف پہنچے مگر اریب نے دو پیگ کے بعد ہی تلخ بحث چھیڑ دی۔ اریب کہنے لگے "مجھ پر پرسوں جو انڈے پھینکے گئے کیا تم اس کو درست سمجھتے ہو؟" میں نے بھی تڑاخ سے کہہ دیا "اریب صاحب انڈے پھینکنے کی بات کو درست یا نادرست سمجھنا ایک الگ بات ہے لیکن کیا یہ درست بات ہے کہ آپ بھی مجھے انڈے پھینکنے والوں میں شامل سمجھیں؟"

میرا جملہ سنتے ہی اریب جھومتے ہوئے اپنی کرسی سے اٹھے، مجھے گلے سے لگالیا۔ پھر ٹیبل کے نیچے سے سگریٹ کی ایک خالی ڈبیہ نکال کر مجھ سے قلم مانگا اور سگریٹ کی ڈبیہ پھاڑ کر لکھنے لگے۔

"حسین (فرزند اریب) کی قسم، صفیہ کی قسم میں نے کبھی ایسا نہیں سمجھا۔ میں تمھیں بہت بڑا مزاح نگار سمجھتا ہوں۔ تم رشید احمد صدیقی اور پطرس کا تسلسل ہو۔"

پھر اسی کاغذ کے دوسرے رخ پر لکھنے لگے۔

"حسین کی قسم مخدوم سے مجھے بے حد پیار ہے۔ میں مخدوم کے خلاف کچھ لکھ ہی نہیں سکتا۔"

پھر اسی کاغذ کو میرے حوالے کر کے کہنے لگے "اس کاغذ کو اپنے پاس دستاویزی ثبوت کے طور پر محفوظ رکھو۔"

میں نے کہا "اریب صاحب! آپ نے کہہ دیا یہ بہت کافی ہے، دستاویزی ثبوت لے کر کیا کروں؟"

بولے "دنیا دستاویزی ثبوت کے بغیر کسی سچائی کو قبول نہیں کرتی۔"

پھر کوئی نزاعی بات نکلی تو اریب پھر اٹھ کر برابر کی ٹیبل کے نیچے سے سگریٹ کی ڈبیہ تلاش کرنے لگے۔ اسد اللہ اور میں انھیں روکتے رہے۔ مگر اس دن انھوں نے اس "بار" میں ایک بھی خالی ڈبیہ پڑی نہ رہنے دی۔ بات بات پر دستاویزی ثبوت تقسیم کرتے رہے۔ یہاں تک کہ میں نے بیرے سے کہا کہ "بار" میں سگریٹ کی جتنی بھی خالی ڈبیاں پڑی ہوئی ہیں انھیں فوراً یہاں سے ہٹا دو۔" بیرے نے کہا "اب میں کیا ہٹاؤں ساری ڈبیاں تو آپ کے ساتھی نے اٹھالی ہیں۔"

اس دن کے بعد میں نے اریب کو پھر کسی بار میں نہیں دیکھا۔ پھر وہ دواخانہ میں رجوع ہوگئے۔ موت آہستہ آہستہ

ان کی جانب بڑھنے لگی۔ اریب موت کے قدموں کی آہٹ سے بے نیاز جاتی ہوئی زندگی کے قدموں کی چاپ سنتے رہے ہیں اکثر ان سے ملنے دواخانہ چلا جاتا۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ کو دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آجاتے۔

غالباً ۲ر اگست ۱۹۷۰ء کو میں کرشن چندر اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کر اریب کو دیکھنے دواخانہ گئے۔ اریب کے سیدھے ہاتھ پر زخم آگیا تھا اور اسی دن دواخانہ میں اس کا آپریشن ہوا تھا۔ اریب پر نیم بے ہوشی کی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ بات کرنے کے قابل بھی نہیں تھے کرشن چندر کے قدموں کی آہٹ سن کر انھوں نے آنکھیں کھولیں۔ پھر سمندر کی ایک لہر کی طرح اریب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس وقت اریب بات نہیں کر سکتے تھے صرف مسکرا سکتے تھے۔ انھوں نے غالباً یہ محسوس کیا کہ انکے [illegible] کرشن چندر [illegible] زیادہ ثبوت فراہم کرنے کے لئے اپنے بائیں بازو سے کپڑا اٹھایا اور اپنا گہرا زخم دستاویزی ثبوت کے طور پر کرشن چندر کو بتلا دیا۔ کرشن چندر کی آنکھوں میں اچانک آنسو آگئے مگر وہ ضبط کرتے رہے۔ کرشن چندر نے کہا۔ "اریب یہ تمھیں کیا ہو گیا۔ ارے بھئی یہ تو ہمارے مرنے کے دن ہیں۔ تم ہم سے بھلا آگے کیسے جاسکتے ہو۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ کرشن چندر کا یہ جملہ سن کر اریب کی مسکراہٹ کے سمندر میں ایک طوفان سا اٹھ گیا اور اس طوفان میں ہم سب بہہ گئے۔ کرشن چندر فوراً باہر نکل آئے۔ اریب کے زخم کو وہ برداشت کر گئے تھے۔ لیکن اریب کی مسکراہٹ کو برداشت کرنے کی ان میں سکت نہیں تھی۔ وہ فوراً باہر نکل آئے اور دروازے کے سامنے ہی اچانک بیٹھ گئے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور میں نے انھیں فوراً تھام لیا۔ اس وقت تو ضرورت اس بات کی تھی کہ ہم اریب کو سنبھالتے کیونکہ اریب کمرہ کے اندر اکیلے رہ گئے تھے۔ لیکن مشکل تو یہی تھی کہ اریب کا کرب خود اریب تو بڑی آسانی سے سنبھال لیتے تھے لیکن ان کا کرب کوئی دوسرا آدمی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ کرشن چندر کو برابر کے کمرہ میں لٹایا گیا اور فوراً ڈاکٹر کو طلب کیا گیا تاکہ وہ کرشن چندر کا معائنہ کر سکے۔

اب موت اریب کے بالکل قریب آگئی تھی۔ میں ہر روز صبح میں اخبار اٹھا کر سب سے پہلے اریب کی تصویر تلاش کرتا اور جب مجھے یہ تصویر نہ ملتی تو میں حیران سا رہ جاتا۔ اسی اثنا میں میرے مضامین کا دوسرا مجموعہ "قطع کلام" شائع ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اریب اس کتاب کو کبھی نہ پڑھ سکیں گے لیکن مجھے انھیں اپنی کتاب دینے کی بڑی جلدی تھی۔ ۶ر ستمبر کی رات کو میں اپنی کتاب دینے کے لئے اریب کے پاس گیا۔ ان کی زندگی میں اب صرف چند گھنٹے باقی تھے مجھے بڑی نقاہت سے دیکھا۔ آنکھوں آنکھوں میں کتاب کے لئے شکریہ ادا کیا۔ پھر اشارہ سے بتایا کہ وہ کچھ پڑھنے کے قابل نہیں ہیں۔ مجھے اشارہ کیا کہ میں کتاب کو کھولوں۔ میں نے کتاب کا پہلا ورق پلٹا۔ ہاتھ کے اشارے سے پوچھا کیا لکھا ہے؟

میں نے زور سے کہا "اریب صاحب! یہ میری کتاب کا "پس و پیش لفظ" ہے۔ سب لوگ "پیش لفظ" لکھتے ہیں مگر میں نے "پس و پیش لفظ" لکھا ہے

یہ سنتے ہی اریب کے کمزور نحیف اور خشک ہونٹوں پر مسکراہٹ بڑی دور تک پھیل گئی۔ اتنی دور تک کہ جب مسکراہٹ ختم ہو گئی تو اریب کو اپنے ہونٹ پھر اپنی جگہ پر واپس لانے میں بڑی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا یوں لگا تھا جیسے پھیلی ہوئی مسکراہٹ اب پھر کبھی واپس نہ ہو گی جیسے یہ مسکراہٹ سمندر کی لہر بن کر ایک انجانے سفر پر روانہ ہو گئی ہے۔ اریب کی یہ مسکراہٹ میرے دل میں ایک خنجر کی طرح اتر گئی۔ میں چپ چاپ اس خنجر کو اپنے دل میں چھپائے اور اریب کے ہونٹوں پر اپنی دی ہوئی مسکراہٹ کو جوں کا توں چھوڑ کر کمرہ سے باہر نکل آیا۔ اور اس کے چند گھنٹوں بعد اریب اس دنیا سے چلے گئے۔

میں نے اریب کو غالباً اس دنیا کی آخری مسکراہٹ دی تھی اور یہ آخری مسکراہٹ ابھی تک میری آنکھوں میں پھیلی

ہوتی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں اریب کے ہونٹوں سے یہ آخری مسکراہٹ چھین لوں اور اریب سے کہوں،
"اریب صاحب! میری دی ہوئی مسکراہٹ مجھے واپس کر دیجئے ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ یہ کیا بات ہوئی کہ میں آپ کو مسکراہٹ عطا کروں اور آپ میرے سینے میں خنجر اتار دیں۔" میں سچ مچ اریب سے یہ آخری مسکراہٹ چھین لینا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اریب کی زندگی کی غالباً یہ پہلی اور آخری مسکراہٹ تھی جس میں اریب کی زندگی کا سارا درد اور سارا کرب سمٹ آیا تھا۔ مجھے یوں معلوم ہوا تھا جیسے اریب کے ہونٹوں سے ان کی آنکھیں ٹپاٹپ ٹپکنے لگی ہیں اور زندگی قطرہ قطرہ بن کر خشک ہونے لگی ہے۔

مجتبیٰ حسین ؔ

عمیق حنفی، آدمی در آدمی

حیدرآباد میں عمیق حنفی کے ایک دوست تھے مجاہد انصاری، وہ عمیق حنفی کے کچھ اتنے ناقابلِ علاج مداح تھے کہ ہر دوسرے تیسرے جملے کے بعد کہتے "عمیق حنفی بڑے قادر الکلام شاعر ہیں"۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ میں بھی عمیق حنفی کو قادر الکلام شاعر سمجھتا ہوں۔ لیکن قادر الکلامی کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہر دوسرے تیسرے جملہ کے بعد عمیق حنفی کا ذکر کیا جائے۔ ایک دن بات کا رُخ پھر عمیق حنفی کی قادر الکلامی کی طرف ہونے لگا تو میں نے مجاہد انصاری کو ٹوکتے ہوئے کہا "میں بھی عمیق حنفی کا قائل ہوں بلکہ تم انھیں صرف قادر الکلام شاعر سمجھتے ہو، میں تو انھیں "عبدالقادر الکلام" شاعر سمجھتا ہوں"۔ اس دن کے بعد سے اُنہوں نے پھر کبھی عمیق حنفی کے سلسلے میں "قادر الکلامی" کو زحمت دینے کی کوشش نہیں کی۔

اُس وقت تک میں بھی عمیق حنفی کی چیدہ چیدہ نظمیں اور غزلیں مختلف رسالوں میں پڑھ چکا تھا مگر کبھی "قادر الکلامی" سے ملنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ البتہ تین چار برسوں میں ان کی ایک ہی مطبوعہ تصویر مختلف رسالوں میں مختلف اوقات میں نظر سے گزر چکی تھی۔ اور یہ تصویر کچھ ایسی تھی کہ اُسے دیکھنے کے بعد عمیق حنفی سے ملنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ یہ میں اس تصویر پارینہ کی بات کر رہا ہوں جس میں عمیق حنفی کا چہرہ داڑھی کی تہمت سے پاک تھا۔ اُن کی تصویر کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا جیسے آپ جزیرہ نمائے عرب کے نقشے کو دیکھ رہے ہوں، بلکہ غور سے دیکھا جائے تو اس میں کہیں کہیں عرب کا صحرا بھی صاف دکھائی دیتا تھا۔ بالکل سپاٹ سا چٹانی اور کرخت چہرہ۔ ویسے اب بھی عمیق حنفی کے چہرے کے اس صحرا میں نخلستان کے اُگ آنے کے باوجود آپ ان کے چہرے کو دیکھیں تو نہ جانے کیوں جزیرۂ عرب کا خیال آجاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ داڑھی کے بغیر ان کا چہرہ عرب کے جغرافیے سے قریب تھا۔ اور اب داڑھی کے بعد یہ عرب کی تاریخ اور تمدن سے قریب ہو گیا ہے۔ اور تاریخ و تمدن کی چونکہ جغرافیہ سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ اس لیے ان کا چہرہ اب قابلِ قبول سا بن گیا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۶۹ء میں دہلی ریڈیو اسٹیشن پر "قادر الکلامی" سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی بسلام مچھلی شہری نے میرا تعارف ان سے کرایا تھا۔ وہ اُس وقت عجلت میں تھے۔ اور کہیں جا رہے تھے۔ تعارف کے بعد قسمت میں ان سے مصافحہ کرنا تو لکھا ہی تھا مگر انھوں نے مجھ سے کچھ اس طرح مصافحہ کیا جیسے بجلی کے تار کو چھونے جا رہے ہوں۔ ایک سکنڈ میں مصافحہ کے نام پہ وہ مجھے چھو کر یوں چلے گئے جیسے واش بیسن میں انھیں اپنے ہاتھوں کو دھونے کی جلدی ہو۔ وہ اپنی اُن چھوٹی چھوٹی ٹانگوں کی مدد سے جو بڑی مشکل سے زمین تک پہنچ رہی تھیں، تیز تیز چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ یہ تک

نہیں کہا کہ "مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی"۔ یہ سب کچھ اس قدر آناً فاناً ہوا جیسا کہ عام طور پر بجلی کے شاک میں ہوتا ہے کہ میں بھونچکا سا رہ گیا۔ سلامہ مچھلی شہری نے میرے اندرونی تاثرات کو بھانپ کر ہنستے ہوئے کہا "انھیں لوگوں سے مل کر خوشی نہیں ہوتی"۔ اور میں نے کہا "اور لوگوں کو بھی ان سے مل کر کہاں خوشی ہوتی ہے؟"

پھر ہم ریڈیو اسٹیشن کی سیڑھیوں سے اُتر کر آنے لگے تو دیکھا کہ عمیق حنفی اپنے پستہ قد کو زمین سے گھسیٹتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ پستہ قد لوگوں کو میں ہمیشہ مشورہ دیتا ہوں کہ وہ زمین پر کم سے کم چلیں۔ قدرت نے جتنا بھی قد دیا ہے اس کی جی جان سے حفاظت کریں۔ اگر خدا نخواستہ یہ کثرتِ استعمال سے گھس گھسا گیا تو زمین پر آدمی کی بجائے ٹوپی چلے گی، غالباً اس بے لطف ملاقات کا نتیجہ تھا کہ جوں جوں انھیں دیکھتا گیا مجھے ان کی چال ڈھال میں مزاحیہ گوشے دکھائی دینے لگے۔ اگرچہ جانتا تھا کہ کسی کی جسمانی ساخت کا مذاق اُڑانا اچھے مزاح کا شیوہ نہیں ہے۔ مگر میں تو اس وقت اندر سے جلا بھنا تھا۔ کبھی کبھی بیسویں صدی کے آدمی میں دو ہزار سال پہلے کا آدمی بھی تو جاگ پڑتا ہے۔

۱۹۷۲ء میں جب میں مستقل طور پر دہلی آگیا تو مجھے احساس تھا کہ دہلی میں "بجلی کا ایک شاک" بھی موجود ہے۔ قسمت کا کھیل دیکھئے کہ میں افسانہ نگار رامنہ ابوالحسن کے کرزن روڈ والے مکان میں رہنے لگا تو پتہ چلا کہ عمیق حنفی کا گھر بھی اسی روڈ پر ہے۔ اور یہ کہ وہ مجھ سے STONE THROW فاصلہ پر رہتے ہیں۔ اس STONE THROW فاصلہ کو ناپنے کے لیے کبھی کبھی واقعی جی چاہا کہ پتھر پھینک کر تو دیکھوں کہ آیا یہ عمیق حنفی کے لگتا ہے یا نہیں۔ اب بھلا بتائیے یہ کیسے ممکن تھا کہ دو آدمی ایک ہی روڈ پر رہتے ہوں اور کبھی اُن کا آمنا سامنا نہ ہو۔ یوں بھی دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر رکھنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ ابتداء میں کئی دنوں تک جب بھی مجھے سامنے سے "جزیرۂ عرب" آتا ہوا دکھائی دیتا تو میں فوراً پنواڑی کی دُکان پر سگریٹ خریدنے کے لیے چلا جاتا اور جزیرۂ عرب کے گزرنے تک سگریٹ ہی خریدتا رہتا لیکن ہر آدمی کی ایک قوتِ خرید بھی ہوتی ہے۔ ایک دن بالآخر ان سے ملنا ہی پڑا۔ البتہ احتیاط یہ برتی کہ مصافحہ نہیں کیا۔ پھر اُن سے بغیر مصافحہ والی یا ضابطہ ملاقاتیں ہونے لگیں اور رفتہ رفتہ مجھے اُن سے مل کر خوشی ہونے لگی۔ میں یہ نہیں جانتا کہ انھیں بھی مجھ سے مل کر خوشی ہوتی ہے یا نہیں۔ یوں بھی آج کی دنیا میں خوشی کے معاملے میں آدمی کو خود غرض ہونا چاہیئے۔ دوسرے کی خوشی جائے بھاڑ میں، مجھے کیا لینا دینا۔

مجھے ان تینوں برسوں میں عمیق حنفی کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ عمیق حنفی اصل میں کئی اچھے بُرے عمیق حنفیوں کے مجموعے کا نام ہے۔ شاعر عمیق حنفی، تاریخ داں عمیق حنفی، فلسفہ شناس عمیق حنفی، ناقد عمیق حنفی، ریڈیو فیچر نگار عمیق حنفی، ہندی اور سنسکرت کے ماہر عمیق حنفی، مذہب پرست عمیق حنفی، سیکولر عمیق حنفی، منہ پھٹ عمیق حنفی، مقروض عمیق حنفی، پریشان حال عمیق حنفی، عجیب عمیق حنفی، غریب عمیق حنفی، جس شخص کی ذات میں اتنے سارے عمیق حنفی ہوں۔ اس سے ملتے ہوئے عموماً بڑی پریشانی ہوتی ہے۔ اکثر ایسا ہوا کہ میں شاعر عمیق حنفی سے ملنے گیا تو دیکھا کہ "مقروض عمیق حنفی" بیٹھے ہیں۔ کبھی ناقد عمیق حنفی سے ملنے کے ارادہ سے نکلا اور ملاقات ہوئی مذہب پرست عمیق حنفی سے۔ ایک آدمی کی ذات میں اتنے سارے آدمی بیٹھے ہیں کہ مجھے سالم عمیق حنفی کچھ OVER POPULATED سے لگتے ہیں۔ نشاۃ ثانیہ کے بعد عموماً اس قسم کے انسانوں کی نسل ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ غلطی سے دو چار پیدا ہو جاتے ہیں تو بالآخر لوگ اُن کا بھی "عمیق حنفی" بنا ڈالتے ہیں۔ ادب، فلسفہ، آرٹ، سیاست، تاریخ، تنقید، لسانیات اور مذہب کا شاید ہی کوئی ایسا شعبہ ہوگا جس کے بارے میں عمیق حنفی ضروری اور غیر ضروری، جائز اور

ناجائز، اہم اور غیر اہم معلومات نہ رکھتے ہوں۔ آدمی جب "ریفرنس لائبریری" بن جائے تو پھر لوگ اس کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو عموماً لائبریریوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ میرے اور عمیق حنفی کے ایک مشترکہ دوست ہیں جنھیں "علم" حاصل کرنے کا نہ صرف شوق بلکہ ہوکا سا ہے۔ جب تک دہلی میں رہے، ہر دوسرے تیسرے دن میرے پاس آتے اور کہتے "چلو یار! آج ذرا عمیق حنفی سے اکتسابِ علم کریں۔ تین دن سے دماغ میں ایک بھی نیا خیال نہیں آیا"۔ ڈیڑھ سال تک وہ دہلی میں رہے اور وہ وقفہ وقفہ سے عمیق حنفی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرتے رہے اور جب جانے لگے تو اپنا زانو اپنے ساتھ لے گئے اور ادب کو پھر عمیق حنفی کے پاس چھوڑ گئے۔

بحیثیت شاعر میں عمیق حنفی کو اس لیے پسند کرتا ہوں کہ وہ کبھی ملنے والوں کو اپنے شعر نہیں سناتے۔ دوسروں کی بات چھوڑیئے مجھے شبہ ہے کہ وہ خود کو بھی اپنے شعر نہیں سناتے ہوں گے۔ ورنہ میں نے ایسے شاعر بھی دیکھے ہیں جو "السلام علیکم" کا جواب "عرض کیا ہے" سے دیتے ہیں۔ ان تین برسوں میں ایک واقعہ مجھے ایسا یاد نہیں جب عمیق حنفی نے خود اپنا کوئی شعر سنایا ہو۔ انھیں شعر سنانے پر آمادہ کرنے کے لیے عموماً وہی کچھ کرنا پڑتا ہے جو شیر کے شکار کے لیے شکاریوں کو خصوصاً شیر کے ساتھ کرنا پڑتا ہے۔ اسی لیے جب کبھی ان کی نظمیں سننے کا موقع ملتا ہے تو میں اکثر دوستوں سے کہتا ہوں "کبھی ہم کل شکار پر گئے تھے۔ عمیق حنفی کی دو نظمیں مار لائے"۔

عمیق حنفی کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ ہمیشہ غلط موقع پر صحیح رائے دیتے ہیں۔ اور نتیجہ میں اپنے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ کر لیتے ہیں۔ اس معاملے میں انھیں ایسا ملکہ حاصل ہے کہ اچھی خاصی فضا کو آن کی آن میں درہم برہم کر دیتے ہیں۔ زندگی کے ۴۵ برس گزارنے کے باوجود انھیں نیک نامی حاصل کرنے کا یہ آسان گر نہیں آیا کہ ہمیشہ صحیح موقع پر غلط رائے دی جائے! اسی لیے بہت سے ادیب اور شاعر ان سے کبھی اپنے بارے میں ان کی رائے نہیں پوچھتے۔ دور کیوں جایئے خود میرا شمار بھی ایسے ہی افراد میں ہوتا ہے۔ میں نے آج تک ان سے کبھی اپنے بارے میں رائے نہیں پوچھی۔ البتہ ایک بار جب میری کتاب چھپ کر آئی تو میں نے بالواسطہ طور پر ان کی رائے جاننے کے لیے ایک ترکیب نکالی اور ان سے خواہش کی کہ وہ اس کی رسم اجرا انجام دیں۔ انھوں نے رسم اجرا تو انجام دی مگر رائے ہرگز نہ دی۔ ان کی تقریر میں ہر طرف تقریر ہی تقریر تھی، رائے بالکل نہیں تھی۔ ان کی تقریر میں سے رائے کو تلاش کرنا ایسا ہی ہے جیسے روئی کے ڈھیر میں سوئی کو تلاش کیا جائے۔ پھر بھی میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ انھوں نے میرے بارے میں کوئی رائے نہیں دی۔ یہی بہت بڑی بات ہے ورنہ صحیح رائے دینے کے معاملے میں وہ تو نو مسلموں کا سا جوش و حوصلہ رکھتے ہیں۔ ایک بار ایک افسانہ نگار نے انھیں اپنا افسانہ سنایا۔ افسانہ ختم ہوا تو افسانہ نگار نے عمیق حنفی کی رائے پوچھی۔ عمیق حنفی نے افسانہ نگار سے کہا "پہلے اپنا دایاں ہاتھ افسانہ کی دائیں جانب رکھیئے اور پھر بایاں ہاتھ بایاں جانب پھر افسانہ کو زور سے پکڑ کر بائیں ہاتھ کو مضبوطی سے اپنی جگہ پر قائم رکھیئے اور دایاں ہاتھ افسانہ سمیت اپنی طرف کھینچیے"۔ عمیق حنفی کی اس جیومیٹریکل رائے کا آسان مطلب یا ترجمہ یہ تھا کہ افسانہ کو پھاڑ دیا جائے۔ اپنے سامنے بیچارے افسانہ نگار سے اس کے افسانے کے پرزے پرزے کروائے۔ پھر ازراہِ احتیاط یہ بھی پوچھ لیا کہ کہیں تمہارے گھر میں اس کی فاضل کاپی تو نہیں ہے۔ نفی میں جواب ملا تو وہ مطمئن ہو گئے جیسے ادب پر سے ایک بہت بڑا خطرہ ٹل گیا۔

بہت سے شاعر اور ادیب ان کی شاعری اور علمیت سے متاثر ہو کر اُن کے پاس اپنے کلام کے مجموعوں کے مسودے اس لیے بھیجتے ہیں کہ وہ اُن پر "مقدمہ" لکھ دیں پہلے یہ مسودے منگوا لیتے ہیں اور اُن پر ایک نظر ڈالتے ہیں. پھر مسودے کو ایسی محفوظ جگہ رکھ دیتے ہیں جہاں کسی کا ہاتھ نہ پہنچ سکے۔ بے چارے غرض مند شاعر اور ادیب بہت دنوں تک اُن سے "مقدمہ" مانگتے ہیں، وہ انھیں نہیں دیتے پھر آخر میں جب شاعر تھک ہار کر اپنا مسودہ مانگتا ہے تو وہ بھی اُسے نہیں دیتے۔ میں نے بہت سے شاعروں کو ان کے گھر "مقدمہ" اور "مسودے" کے پھیر میں چکر لگاتے دیکھا ہے۔ بعض اوقات تو عمیق حنفی کے قرض خواہوں اور مسودوں کی واپسی کے متمنی شاعروں میں تمیز کرنا تک دشوار ہو جاتا ہے. کیونکہ دونوں کے مانگنے کا انداز ایک ایسا ہوتا ہے۔ اس معاملہ میں عمیق حنفی کا استدلال یہ ہے کہ ناقابل اشاعت کلام کو اگر ہر مقدمہ نگار "مقدمہ" کے آنچ پر ہی روک لے تو ادب میں اتنی افراتفری نہیں پھیلے گی.

عمیق حنفی جب بھی کسی شاعر کا خراب کلام سُنتے ہیں تو اُن کی رائے زبان پر آنے سے پہلے اُن کے چہرے پر نمودار ہو جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے انھوں نے ارنڈی کا تیل پی رکھا ہو۔ غلط بات، غلط حرکت اور غلط خیال پر یوں جھپٹتے ہیں جیسے بلی چوہے پر۔ اس سے عمیق حنفی کو ایک فائدہ ضرور حاصل ہوا ہے کہ ہر ایرا غیرا انھیں اپنا کلام نہیں سُناتا.

اُن کے سماجی رویے بھی عام آدمی کے زاویوں سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ اُن کے زاویوں کے بارے میں قبل از وقت اندازہ لگانا بہت مشکل کام ہے۔ اس معاملے میں ان کی حالت اس حادث، لاری ڈرائیور کی سی ہوتی ہے جو ہاتھ دکھائے بغیر اچانک اپنی لاری یا دائیں جانب یا بائیں جانب موڑ دیتا ہے۔ ابھی دو برس پہلے کی بات ہے کہ اتر پردیش اردو اکاڈمی نے اُن کی ایک کتاب کو ڈیڑھ ہزار روپے کا انعام دینے کا اعلان کیا۔ دن میں مجھے اس کی اطلاع ملی اور شام میں کناٹ پلیس پر عمیق حنفی مل گئے۔ اب ایسے موقعوں پر ایک نارمل آدمی دوسرے نارمل آدمی کو مبارکباد تو دیتا ہے۔ لہٰذا میں نے انہیں انعام کی مبارکباد دے دی۔ اس کے جواب میں اُن کے چہرے پر اچانک ایسے آثار نمودار ہونے لگے جو عموماً مرگی کے مریض کے چہرے پر مرض کے حملے کے وقت نمودار ہوتے ہیں۔ پھر یکایک انھوں نے ہاتھ بتائے بغیر اپنی لاری کو موڑتے ہوئے کہا "گالی دینے کے اور بھی کئی مہذب طریقے شرفا نے ایجاد کر رکھے ہیں۔ اس انعام کی مبارکباد دے کر مجھے گالی کیوں دے رہے ہو؟" اب میں حیران کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ میں نے مزید کوئی بات نہیں کی، البتہ ان کے ساتھ جو دوست اُس وقت موجود تھے۔ اُن سے پتہ چلا کہ موصوف نے از راہِ کرم اتر پردیش اردو اکیڈمی کو یہ انعام واپس کر دیا ہے۔ جب ہم کناٹ پلیس سے واپس ہونے لگے تو عمیق حنفی نے مجھ سے کہا "بھئی میں شدید مالی بحران سے گزر رہا ہوں۔ آپ کچھ بندوبست کیجئے"۔ میں نے کہا "قدرت آپ کے لیے بندوبست کرنا چاہتی ہے مگر آپ کو یہ بندوبست منظور نہیں ہے۔ میں بھلا کیا بندوبست کر سکتا ہوں" لاکھ سمجھایا کہ فی الحال اس انعام کو لے کر اپنے مالی بحران اور قرض خواہوں کا منہ بند کیجئے۔ بعد میں اتر پردیش اکیڈمی کو قسطوں میں یہ انعام واپس فرما دیجئے گا۔ اکیڈمی آپ سے سود بھی نہیں لے گی۔ بولے "مانا کہ اکیڈمی سود نہیں لے گی۔ لیکن مجھے "ڈیڑھ ہزاری منصب داروں" کے زمرے میں کھڑا کر دے گی۔ یہ سود سے زیادہ نقصان دہ سودا ہے۔ قرض خواہ سے قرض لینے کا فائدہ یہ ہے کہ وہ صرف سود سے مطلب رکھتا ہے میرے ادبی قد و قامت کے راستے میں حائل نہیں ہوتا۔" اس کے بعد وہ قرض خواہ اور اتر پردیش اردو اکیڈمی کے فوائد و نقصانات کی طویل فہرست کچھ اس طرح پیش کرتے رہے جیسے جغرافیہ کے پرچے میں دکن کے دریاؤں اور شمالی ہند کے دریاؤں کا تقابل کر رہے ہوں۔ بعد میں وہ شدید مالی بحران سے گزرتے رہے لیکن انعام کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

قبل اس کے کہ میرا حافظہ کمزور ہو جائے یہاں اُن کی یادداشت کی جانب بھی کچھ اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ غیر شخصی واقعات کو اُن کا حافظہ بڑی خوشی سے قبول کر لیتا ہے اور شخصی واقعات کو قبول کرنے کے معاملہ میں ان کا حافظہ بالکل اڑیل بن جاتا ہے۔ انھیں عربوں کے ہندوستان آنے کی تاریخ، رومیوں کے زوال کے اسباب اور دنیا بھر کے فلسفیوں کے نظریات تو اچھی طرح یاد رہتے ہیں، لیکن انہیں کسی دوست کے اپنے یہاں آنے کی تاریخ خود اپنے زوال کے اسباب اور اپنے اچھے بھلے شعر یاد نہیں رہتے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی صاحب سے بڑی گرمجوشی سے مل تو لیتے ہیں لیکن بعد میں پتہ چلتا ہے کہ جسے انجینیئر سمجھ کر مل رہے تھے وہ بعد میں ڈاکٹر بن گیا۔

ایک بار حیدرآباد سے ایک نوجوان اُن سے ملنے آیا۔ انھوں نے سمجھا کہ یہ وہی نوجوان ہے جس نے حیدرآباد میں قیام کے دوران ان کی بڑی خاطر مدارات کی تھی۔ بڑی گرمجوشی سے ملے۔ پھر شکایت کی کہ آپ نے خط نہیں لکھا۔ نوجوان نے حیرانی سے پوچھا "حنفی صاحب! آپ نے مجھے پہچانا ہے"؟ بولے "کیسے نہیں پہچانوں گا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آپ سے حیدرآباد میں ملاقات ہوئی تھی۔"

اس پر نوجوان نے کہا "صاحب! میں آپ کے حافظہ کی داد دیتا ہوں۔ حیدرآباد میں جس جلسہ کو آپ نے مخاطب کیا تھا اُس میں سامنے کی ایک نشست پر میں بیٹھا تھا۔ آپ سے دو ایک بار نظریں چار ہوئی تھیں۔ پھر جلسے کے بعد جب آپ جانے لگے تو میں نے بھیڑ میں آپ سے مصافحہ بھی کیا تھا۔ مجھے حیرت ہے کہ اس کے باوجود آپ نے مجھے یاد رکھا! ایسا تیز حافظہ میں نے بہت کم لوگوں کا دیکھا ہے"۔ نوجوان کہے جا رہا تھا اور عمیق حنفی بڑے معصوم بنے اپنے حافظہ کی گرفت کی داد وصول کر رہے تھے۔ اور شاید دل ہی دل میں پشیماں بھی ہو رہے تھے کہ کس کی گرمجوشی کس کو دے دی۔

عملی زندگی میں بھی یہ بڑی اول جلول حرکتیں کرتے ہیں۔ مجھے پتہ نہیں یہ دہلی میں کتنے برس رہ چکے ہیں لیکن انہیں دہلی کے راستے بالکل نہیں معلوم۔ اسی لیے جنوبی دہلی جانے کے ارادے سے نکلتے ہیں تو شمالی دہلی میں پہنچ کر دم لیتے ہیں۔ کہیں جانا ہو تو جانے سے پہلے اپنے اُوپر سراسیمگی طاری کر لیتے ہیں۔ سراسیمگی ان کے لیے "سامانِ سفر" کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی سراسیمگی کے تحت ایک بار وہ بھوپال جانے کے لیے نکلے تو اپنے گھر کی مانوس سڑک کو عبور کرنے کے فوراً بعد ایک راہ گیر سے پوچھ بیٹھے "کیوں بھئی! کیا بھوپال کو یہی راستہ جائے گا؟"

اس سراسیمگی کا ایک اور واقعہ سن لیجئے کہ پچھلی سردیوں میں اُنہیں "اقبال سیمینار" میں شرکت کے لیے حیدرآباد جانا تھا۔ ریل کے ٹکٹ کا ریزرویشن یہ بالکل نہیں کروا سکتے۔ اس لیے میں نے بھاگ دوڑ کر کے ریزرویشن کروا دیا۔ پھر یہ سوچ کر کے کہیں یہ کرزن روڈ کے نکڑ سے ہی حیدرآباد کے راستہ کا پتہ نہ پوچھنے لگ جائیں خود اسٹیشن گیا۔ نشست پر بٹھایا اور واپس چلا آیا۔ حیدرآباد میں اُنھوں نے بہت زوردار مقالہ پڑھا۔ جب دہلی واپس آئے تو میں ان سے ملنے گیا۔ دیکھا کہ بہت اداس بیٹھے ہیں۔ اُداسی کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے "یار! راستہ میں کسی نے میرا سوٹ کیس چُرا لیا۔ اُسی میں میرا واحد سوٹ بھی رکھا تھا مگر خدا کا شکر ہے کہ اقبال پر جو مقالہ لکھا تھا وہ محفوظ رہ گیا"۔ پھر کچھ دیر اِدھر اُدھر کا حساب کرنے کے بعد بتایا "تب بھی یہ سفر نقصان میں نہیں پڑا۔ کیونکہ سیمینار والوں نے ۹۰۰ روپے دیئے تھے اور جو سامان چوری گیا ہے اس کی مالیت ۸۹۰ روپے کی ہوتی ہے۔ دس روپے کا تو پھر بھی فائدہ رہا"۔ یہ کہہ کر اُنھوں نے وہ کاغذ میری جانب بڑھا دیا جس پر اُن کے پُرانے سوٹ کیس، پرانے سوٹ، پُرانے تولیہ اور اقبال پر ان کے بعض پُرانے مضامین کی رائج الوقت قیمتیں درج تھیں۔ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو اپنی بربادی کا جواز بھی خود ہی ڈھونڈتے ہیں اور جب جواز ملتا ہے تو یوں خوش ہو جاتے ہیں

جیسے گوہرِ مقصود" حاصل ہو گیا۔

عمیق حنفی کو جب بھی میں نے دیکھا، مالی پریشانیوں میں مبتلا دیکھا۔ ان کی ایک چوتھائی مالی پریشانیاں قدرت کا عطیہ ہوتی ہیں مگر بقیہ تین چوتھائی پریشانیاں اُن ہی کی مرہونِ منت" ہوتی ہیں۔ جو آدمی صرف تفریق ہی تفریق جانتا ہو اور جمع کے قاعدے سے بالکل واقف نہ ہو اُسے معاشیات کی اصطلاح میں "فضول خرچ آدمی" کہتے ہیں۔ لطف یہ کہ اُن کی مالی پریشانیاں بھی جاری رہتی ہیں اور دوستوں کی مہمان نوازی بھی۔ صبح یہ مالی بحران میں مبتلا ہوں گے۔ اور شام میں آپ اُن کے یہاں جائیں تو دیکھیں گے کہ کسی دوست کی پرتکلف ضیافت ہو رہی ہے۔

یہ بحث بہت دنوں سے چل رہی ہے کہ عمیق حنفی جدید ہیں یا ترقی پسند۔ میں اِس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا البتہ میں نے انہیں ہر دو فریقین سے بے تحاشہ لڑتے ہوئے دیکھا ہے۔ چونکہ لڑائی میں سمجھتا ہوں جدیدیت اور ترقی پسندی عمیق حنفی کے لیے ذیلی باتیں ہیں۔ اصل اہمیت تو لڑائی کی ہے۔ آدمی کو ہمیشہ لڑتے رہنا چاہیئے۔

شاعری کے معاملہ میں بھی وہ چوکھے پن کے قائل ہیں۔ ان کی نظموں میں جہاں عریاں اشارے ملیں گے وہیں خالص مذہبی رنگ بھی ملے گا۔ اس لیے میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ عمیق حنفی کی شاعری کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے نہ صرف "مہارت" کی بلکہ "طہارت" کی بھی ضرورت ہے۔ میرا اشارہ ان کی مشہور نعتیہ نظم "صلصلۃ الجرس" کی طرف ہے۔

عمیق حنفی کی ایک ادا مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔ وہ یہ کہ وہ ادب اور زندگی دونوں میں کہیں اپنے ضمیر کو بیچنا پسند نہیں کرتے۔ اور ادب اور زندگی دونوں کو اس کی بھاری قیمت ادا کرتے ہیں۔ اُن کی کمائی اور اُن کا بینک بیلنس بس یہی ضمیر ہے۔ ورنہ ان دنوں تو انسانوں میں خالص ضمیر کا ملنا بہت دشوار ہے۔

میں آخر میں اس خاکہ کو عمیق حنفی کی ایک نظم پر ختم کرنا چاہتا ہوں جس کا عنوان ہے۔

"کاش آئے ایسی شام ——
اے مرے سائے
میں ترانہ اگر اڑاؤں
اور تو بن جائے میرا کارٹون
تو کوئی جوسی سا گاسیپ (GOSSIP) چھیڑ دے
میں تجھے کچھ چٹپٹی غزلیں سناؤں
دونوں مل کر بے سُری تانیں لگائیں
قہقہوں سے چھید ڈالیں ہم اُداسی کا بدن
اور لے لیں شام سے پژمردگی کا انتقام
کاش آئے ایسی شام

اور میرا ایسا خیال ہے کہ عمیق حنفی کی نظم کی وہ شام آج آئی ہے۔

(۱۹۷۵ء)

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

میری نظر میں بزرگ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک قسم کے بزرگ وہ جن کی بزرگی پر ترس آتا ہے اور دوسری قسم کے بزرگ وہ جن کی بزرگی پر پیار آتا ہے۔ اگرچہ پیار اور ترحم دونوں ایک ہی وسیع جذبے کے ذیلی جذبے ہیں لیکن پیار چاہے بزرگ پر آئے یا خوشیزہ پر، پیار ہی ہوتا ہے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی صاحب سحر کا شمار موخر الذکر بزرگوں میں ہوتا ہے جن کے بڑھاپے پر ان دنوں شباب آیا ہوا ہے۔ ایک ایسا شباب جس کا تھوڑا سا حصہ بھی ہمیں پندرہ بیس برس پہلے مل جاتا تو ہم بھی وہ سب کچھ کر گزرتے جو آدمی کو کرنا چاہیئے۔ بزرگوں کی اکثریت ایسی ہوتی ہے جنھیں دیکھ کر آدمی عبرت پکڑتا ہے لیکن بعض خوش نصیب بزرگ ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں دیکھ کر آدمی عبرت کے سوائے ہر چیز کو پکڑ لیتا ہے جیسے تین سال پہلے ایک دن میں نے کنور صاحب کو دیکھ کر اپنا کلیجہ پکڑ لیا تھا۔ یہ اُس دن کی بات ہے جب دہلی میں ہر دن کی طرح بجلی فیل ہو گئی تھی۔ مجھے اور کنور صاحب کو دہلی کی ایک پچیس منزلہ عمارت کی ساتویں منزل پر پہنچنا تھا اور لفٹ بند تھی۔ کام چونکہ میرا تھا اس لئے میں نے کنور صاحب سے کہا "میرا کام اتنا ضروری نہیں ہے کہ آپ ساتویں منزل تک چڑھ کر جائیں اور پھر آپ کی عمر بھی تو (۷۴) برس کی ہو چکی ہے۔"

میرے اس جملے کو سنتے ہی ان کے بڑھاپے پر شباب آگیا اور وہ بڑی تیزی کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنے لگے میں انہیں منع کرتا رہا۔ سمجھاتا رہا کہ میں نے یہ جملہ اس لئے نہیں کہا کہ وہ ۷۴ برس کے ہو گئے ہیں بلکہ اس لئے کہا ہے کہ میں ۴۸ برس کا ہو چکا ہوں۔ مسئلہ میرے ضعف کا ہے ان کے ضعف کا نہیں مگر وہ نہ مانے اور سیڑھیاں چڑھتے چلے گئے بلکہ اکثر موقعوں پر تو دو دو سیڑھیاں ایک ہی قدم میں پھلانگ ڈالیں۔ میں اُن کے پیچھے ہانپتا کانپتا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ میرے روکنے کا کوئی اثر ان پر نہیں ہوا۔ بالآخر اس سفر میں ایک نوبت وہ بھی آئی جب وہ مجھ سے دو منزل آگے ہو گئے۔ ان کے قدموں کی چاپ تو سنائی دے رہی تھی مگر وہ خود دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں گرتا پڑتا ساتویں منزل پر پہنچا جہاں ہمیں ایک شخص سے ملنا تھا۔ میں نے اپنی اکھڑی اُکھڑی سانسوں کو بڑی مشکل سے یکجا کر کے ان صاحب سے پوچھا کہ کہیں کنور صاحب آتو نہیں گئے

وہ بولے "کنور صاحب تو نہیں آئے۔ البتہ میں نے ابھی کچھ دیر پہلے سیڑھیوں پر ایک سردار جی کی جھلک دیکھی ہے جو بڑی تیزی سے اوپر جا رہے تھے"

میں نے کہا "وہی تو کنور صاحب تھے جو آپ سے ملنے کے لئے اس عمارت میں آئے ہیں۔" "تو پھر وہ اوپر کیوں چلے گئے؟" اُن صاحب نے حیرت سے پوچھا۔ میں نے کہا "کچھ نہیں ذرا جوش جوانی میں اوپر تک چلے گئے ہیں۔ ابھی آجائیں گے۔"

کچھ دیر بعد کنور صاحب نیچے آگئے۔ پتہ چلا کہ میرے جملے نے انہیں اتنا مشتعل کیا کہ تیرہ منزلوں تک چڑھتے چلے گئے۔ تیرہویں منزل پر اشتعال کچھ کم ہوا تو انہیں احساس ہوا کہ انہیں تو ساتویں منزل پر ہی رکنا تھا۔

مجھ سے کہا "تم کیسے جوان ہو۔ سات منزلیں تک نہیں چڑھ سکتے۔ کیا ابھی سے تم پر بڑھاپا آگیا ہے مجھے دیکھو کہ

۴۷ برس کا ہو چکا ہوں مگر آج بھی یہ حال ہے کہ ساتویں منزل پر کوئی کام ہو تو تیرہ منزل تک چڑھ جاتا ہوں؟"

میں نے اپنی ہار مانتے ہوئے معذرت کی اور اپنی صفائی میں ایک دانا کا قول انہیں سنایا کہ "بیس برس کی عمر کا گدھا، ساٹھ برس کے آدمی سے کہیں زیادہ بوڑھا ہوتا ہے۔ کیونکہ بڑھاپے کا تعلق کسی مخلوق کی عمر سے نہیں اس کے قویٰ سے ہوتا ہے"۔ کنور صاحب اس قول سے ایسے ہی محظوظ ہوئے جیسے کہ ایک سچے سکھ کو ہونا چاہئے۔ یہ واقعہ تین برس پہلے کا ہے مگر مجھے یقین ہے کہ اگر آج بھی انہیں کسی عمارت کی ساتویں منزل پر جانا ہو اور لفٹ بند ہو اور کوئی ان کے بڑھاپے کو للکارے تو وہ کم از کم بارہویں منزل تک ضرور چڑھ جائیں گے اور ہم جیسے نچلی منزل پر ہی کھڑے رہ جائیں گے

اُن کی اس اعلیٰ و ارفع صحت کا راز نہ جانے کیا ہے۔ سنا ہے کہ نوجوانی میں بہت کسرت کرتے تھے۔ خالص چیزیں کھاتے تھے۔ ہر قسم کی کشتیاں لڑتے تھے۔ اور ہر قسم کا شکار کھیلتے تھے۔ میں نے کبھی اُن کی صحت کا راز جاننے کی کوشش نہیں کی کیونکہ کچھ ایسے راز ہوتے ہیں جنہیں اگر آپ جان بھی لیں تو ان سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ آپ نے وہ لطیفہ تو سنا ہوگا کہ ایک شخص کی عمر سو برس کی ہو گئی تو کسی نے پوچھا "قبلہ! آپ نے یہ جو طویل عمر پائی ہے اس کا راز کیا ہے؟"

بزرگ بولے "میری طویل عمر کا راز صرف اتنا ہے کہ جب تک میں تیرہ برس کا نہیں ہو گیا تب تک میں نے عورت اور شراب کو ہاتھ نہیں لگایا" اب آپ ہی بتائیے اس طرح کے راز کا آپ کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

ادھر دس بارہ برسوں سے کنور صاحب نے اپنی داڑھی کو خضاب سے پاک کیا ہے۔ ورنہ آج بھی یہ خضاب لگانا شروع کر دیں تو ہم جیسوں سے نوجوان نظر آنے لگیں البتہ آواز ایسی پر شباب، پاٹ دار اور رعب و دبدبہ والی پائی ہے کہ لگتا ہے گلے میں خضاب لگا رکھا ہے۔

یادش بخیر کنور صاحب کو میں نے سب سے پہلے ۱۹۶۱ء میں حیدرآباد میں دیکھا تھا، حیدرآباد میں ہم لوگوں نے مزاح نگاروں کی ایک کانفرنس منعقد کی تھی اور میں اس کانفرنس کا جنرل سکریٹری تھا۔ کانفرنس کے تین اجلاس تھے پہلا اجلاس لطیفہ گوئی کا تھا، جس کی صدارت کنور صاحب کو کرنی تھی دوسرا اجلاس مزاحیہ مضامین کا تھا جس کی صدارت آنجہانی راجندر سنگھ بیدی کو کرنی تھی۔ اور تیسرا اجلاس مزاحیہ مشاعرہ سے متعلق تھا جس کی صدارت آنجہانی وی شنکر نے کی تھی مجھے نہیں معلوم کہ ان دنوں کنور صاحب کسی بڑے عہدہ پر فائز تھے یا نہیں کچھ عہدیدار ایسے ہوتے ہیں جو بڑے عہدے پر فائز نہیں رہتے بلکہ عہدہ ان پر فائز رہتا ہے ہر دم اپنی عہدیداری کو حاضر و ناظر جانتے ہیں میں نے سوچا کہ کنور صاحب بھی اسی طرح کے عہدیدار ہوں گے مگر جب حیدرآباد آئے تو یوں لگا جیسے ہم میں سے ہی ایک ہیں مزاح نگاروں کی اس کانفرنس کی کامیابی کی لوگوں نے پہلے ہی سے پیشن گوئی کر دی تھی کیونکہ اس میں دو سکھ ادیب حصہ لے رہے تھے بلکہ راجندر سنگھ بیدی نے تو حیدرآباد ایئر پورٹ پر اترتے ہی مجھ سے کہہ دیا تھا "میاں! مزاح نگاروں کی کانفرنس کی کامیابی کے لئے ایک ہی سردار کافی تھا۔ تم نے دو دو سردار اور وہ بھی بیدی سردار بلا لئے۔ سونے پر سہاگا اسی کو کہتے ہیں۔" سچ تو یہ ہے کہ حیدرآباد میں مزاح نگاروں کا یہ سب سے کامیاب جلسہ تھا میں نے تمام لطیفہ گو حضرات سے کہہ دیا تھا کہ وہ سرداروں والے لطیفے ہرگز نہ سنائیں۔ اس پر بعض لطیفہ گو حضرات نے محفل لطیفہ گوئی میں شرکت سے معذرت کر لی کہ واہ صاحب یہ کیا بات ہوئی کہ محفل لطیفہ گوئی کی ہو اور اس میں سرداروں کا ذکر نہ ہو۔ خیر صاحب لطیفہ گوئی کی محفل ہوئی مگر میرے منع کرنے کے باوجود اس میں سرداروں کے لطیفے خوب سنائے گئے۔ تاہم اس صورت حال کے لئے میں ہی ذمہ دار تھا کیونکہ غیر سرداروں کو تو میں نے سرداروں کے لطیفے سنانے سے منع کیا تھا لیکن خود

سرداروں سے یہ التجا نہ کی تھی کہ وہ اپنے بارے میں لطیفے سنانے سے گریز کریں۔ مجھے اب تک وہ محفل یاد ہے اور اس کے قہقہے اب تک میرے کانوں میں گونجتے ہیں۔ کنور صاحب سے میرے مراسم کا یہ نقطۂ آغاز تھا اس دن سے آج تک زندہ دلانِ حیدرآباد کو ان کی سرپرستی اور شخصی طور پر مجھے اُن کی شفقت حاصل رہی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۶۹ء میں ایک ملازمت کے انٹرویو کے سلسلے میں' میں دہلی آیا۔ اگرچہ میں اس ملازمت کے بارے میں سنجیدہ نہیں تھا لیکن کنور صاحب سے ملا تو وہ اس ملازمت کے بارے میں مجھ سے زیادہ سنجیدہ ہوگئے۔ میرے منع کرنے کے باوجود کئی لوگوں سے میرے بارے میں سفارش کی۔ کئی لوگوں کو بلاوجہ یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ میں ذہین آدمی ہوں' قابل ہوں' اہل بھی ہوں اور نہ جانے کیا کیا ہوں مگر میں نے انٹرویو میں اُن کے سارے دعوؤں کی تردید کردی اور حیدرآباد واپس چلا گیا۔ ایک سال بعد وہ زندہ دلانِ حیدرآباد کے ایک جلسہ میں شرکت کے لئے حیدرآباد آئے تو خفا تھے کہ میں نے جان بوجھ کر انٹرویو میں اپنے آپ کو نا اہل ثابت کیا تھا۔ میں نے اپنی صفائی میں صرف اتنا کہا کہ کنور صاحب مجھے آپ سے ہی یہ شکایت ہے کہ آپ نے جان بوجھ کر میری قابلیت' اہلیت اور صلاحیت کے بارے میں اس محکمہ کے ڈائرکٹر جنرل کو اتنا بڑھا چڑھا کر بتا دیا تھا کہ وہ اپنی کرسی کے لئے مجھے ایک خطرہ سمجھنے لگا یوں بھی ایک محکمہ میں دو قابل لوگوں کی گنجائش کہاں ہوتی ہے اسی لئے واپس چلا آیا۔

کنور صاحب کی یہی ادا تو مجھے پسند ہے کہ جس پر مہربان ہوتے ہیں' اس کے ساتھ یہی سلوک کرتے ہیں۔ اسے آپ ان کی شفقت اور محبت نہ کہیں تو اور کیا کہیں کہ جسے عزیز رکھتے ہیں اگر وہ نا اہل بھی ہے تو اس میں اہلیت ڈھونڈتے ہیں' نا لائق بھی ہے تو اس میں لیاقت تلاش کرتے ہیں' جاہل ہے تو اس میں علم کی کھوج کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کنور صاحب کے اطراف مجھ جیسوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔

۱۹۷۲ء میں جب میں دہلی آیا تو کنور صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ سچ مچ مجلس آدمی ہیں۔ وہ محفل میں ہوں تو کیا مجال کہ کوئی اور جانِ محفل بن جائے۔ ان کی باتیں حاضر جوابی' بذلہ سنجی' شگفتہ مزاجی اور خوش طبعی سے عبارت ہوتی ہیں۔ محفل کی نبض ان کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ جس طرح کے لوگ ہوں اور جس طرح کا موقع ہو اس کے مطابق ایسی پتے کی بات کرتے ہیں کہ سب کو بھا جائے۔ محفل میں دس بارہ آدمی ہوں یا تیس پینتیس ہزار آدمی کنور صاحب سب کا مزاج جانتے ہیں۔

کنور صاحب اردو شاعروں کے عالی جاہ ہیں۔ شاعر اور ادیب انہیں احتراماً "عالی جاہ" کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کنور صاحب گھر پر نہ ہوں اور کوئی انہیں فون کرے اور ایسے میں مسز کنور مہندر سنگھ بیدی فون کا ریسیور اٹھائیں تو وہ کہتی ہیں " میں مسز عالی جاہ بول رہی ہوں " اپنے شاعر دوستوں کو وہ خوب نوازتے بھی ہیں۔ اردو شاعروں کے مسائل اگرچہ بہت بڑے نہیں ہوتے لیکن اُن کا حل تلاش کرنا ضرور دشوار ہوتا ہے۔ کنور صاحب اُن کے مسائل کو نہ صرف حل کرتے ہیں بلکہ انہیں پیدا بھی کرتے ہیں (مراد مسائل سے ہے) بھانت بھانت کے شاعر اُن کے اطراف جمع رہتے ہیں۔ جس پر مہربان ہو جائیں اُسے ہندوستان کے کونے کونے میں گھما دیتے ہیں بلکہ بیس بائیس برس پہلے وہ اردو شاعروں کی ایک ٹیم کو لے کر برطانیہ گئے تھے۔ اس ٹیم میں انہوں نے اکثریت ایسے شاعروں کی شامل رکھی تھی جو برطانیہ کی قومی زبان انگریزی سے واقفیت نہیں رکھتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ اہل برطانیہ نے ان شاعروں کو اور اُن کے کلام کو خوب سمجھا اور لطف اندوز ہوئے۔ ان شاعروں کے لئے بھی یہ ایک انوکھا تجربہ تھا کیونکہ پیلی بھیت یا پانی پت کے شاعروں سے اچانک لندن کے مشاعرہ میں کلام سنا تا کوئے یار سے نکال کر

سوئے دار چلے جانے کے مترادف تھا۔ اس کا ایک فائدہ اردو زبان و ادب کے حق میں یہ ہوا کہ بہت سے شاعر یورپ کی ترقی اور چکاچوند سے اتنے مبہوت ہوئے کہ وطن واپس آکر ایک لمبے عرصہ تک کوئی شعر نہ کہہ سکے۔

کنور صاحب کے اطراف نہ صرف شاعر اور ادیب جمع رہتے ہیں بلکہ پہلوان اور فن پہلوانی سے تعلق رکھنے والے افراد بھی جمع رہتے ہیں۔ اس لئے میں اُن کی محفل میں بہت محتاط رہتا ہوں کیونکہ برابر بیٹھے ہوئے شخص کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مطلع عرض کرے گا یا گھونسہ رسید کرے گا۔ کسی اچھی بات پر مصافحہ کرے گا یا پنجہ لڑائے گا۔ گویا کنور صاحب کی ذات ایک ایسا گھاٹ ہے جس پر پہلوان اور شاعر دونوں ہی ایک ساتھ پانی پینے کے علاوہ اور بھی بہت کچھ پیتے ہیں۔ میں نے راتوں کی محفلوں میں بھی کنور صاحب کو دیکھا ہے۔ وہی سلیقہ، وہی رکھ رکھاؤ اور وہی آن بان۔ کیا مجال ہے کہ شائستگی کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ کوئی شاعر یا ادیب بہک جائے تو اُسے ٹوکنے سے بھی گریز کرتے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ اس کے بعد اس ادیب یا شاعر کی ویڈیو فلم ریکارڈنگ شروع ہو جاتی ہے۔ جو دوسرے دن اُسے بلا ٹکٹ دکھا دی جاتی ہے۔ وہ راہ راست پر آجاتے تو ٹھیک ہے ورنہ معاملہ اگلی فلم پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ایک محفل میں ایک ادیب نے اپنے ہوش کچھ اس طرح گنوائے کہ خود کنور صاحب سے لڑنے لگا۔ اُس کے جی میں جو آیا وہ بکتا گیا مگر کنور صاحب خاموش رہے۔ کنور صاحب کے پہلوان دوستوں کو طیش آگیا۔ وہ اس ادیب کو سبق سکھانا ہی چاہتے تھے کہ کنور صاحب بڑی خاموشی کے ساتھ اس ادیب کو الگ لے گئے اور اپنی گاڑی میں اُسے بٹھا کر بیس کلو میٹر کا فاصلہ طے کر کے اُسے گھر چھوڑ آئے۔ ایسی حرکت وہی آدمی کر سکتا ہے جو یا تو بہت کمزور ہو یا پھر ایک باظرف سکھ ہو۔

کنور صاحب کو میں نے کبھی غصّہ کی حالت میں نہیں دیکھا۔ سوائے ایک دفعہ کے اور اتفاق سے اُن کا یہ غصّہ مجھ سے ہی متعلق تھا۔ ۱۹۸۵ء کی عالمی مزاح کانفرنس میں شرکت کے لئے کنور صاحب کو حیدرآباد آنا تھا۔ انہوں نے اپنی آمد کی تاریخ اور وقت سے مجھے مطلع کر دیا تھا اور تاکید کی تھی کہ میں انہیں لینے حیدرآباد ایرپورٹ پر آجاؤں۔ میں کانفرنس کی تیاریوں میں بہت پہلے حیدرآباد چلا گیا تھا۔ بارہ ممالک کے مندوبین اس کانفرنس میں شرکت کر رہے تھے۔ کانفرنس کے کام اتنے پھیلے ہوئے تھے کہ ہم لوگوں نے کاموں کی تقسیم کر دی تھی۔ ایک کمیٹی صرف مہمانوں کے استقبال اور دیکھ بھال کے لئے بنائی گئی تھی۔ میں نے اس کمیٹی کے کنوینر کو بلا کر تاکید کر دی تھی کہ فلاں تاریخ کو فلاں فلائٹ پر کنور صاحب کے استقبال کے لئے چلا جائے جس دن وہ آرہے تھے اُس دن صبح بھی میں نے کنوینر کو کنور صاحب کی آمد کے بارے میں یاد دہانی کرادی تھی۔ میں مطمئن ہو کر دوسرے کاموں میں جٹ گیا۔ دن میں تین بجے کے قریب اخبار "سیاست" کے دفتر سے میرے لئے فون آیا کہ کنور صاحب بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے فون اٹھایا تو دوسری طرف سے کنور صاحب کی ہاٹ دار آواز سنائی دی۔ بولے "میاں! میں اسی وقت دہلی واپس جانا چاہتا ہوں۔ میں کانفرنس میں شرکت نہیں کروں گا۔ میں نے تم سے خاص طور پر کہا تھا کہ ایرپورٹ پر آجانا مگر مجھے لینے کے لئے ایرپورٹ پر کوئی نہیں آیا۔ بڑی دیر تک انتظار کرتا رہا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ایک صاحب نے مجھے پہچان لیا اور "سیاست" کے دفتر پر چھوڑ گئے۔ اب میں فوراً دہلی واپس جانا چاہتا ہوں" کنور صاحب کی یہ بات سن کر مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ سخت کوفت اور ندامت ہوئی۔ میں نے بہت معذرت کی۔ ساری صورت حال سے انہیں آگاہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ میری ہر وضاحت کے جواب میں دہلی واپس جانے پر مصر نظر آئے۔ میں نے سوچا کہ اس وقت میرا اُن کے پاس جانا مناسب نہیں ہوگا۔ لہٰذا میں نے زندہ دلانِ حیدرآباد کے سارے اچھے مزاحیہ فنکاروں کو موٹروں میں بھر کر اُن کے پاس روانہ کیا اور تاکید کی کہ پہلے تو اپنے لطیفوں

اور اپنی پُر مزاح حرکتوں کے ذریعہ اُن کا موڈ ٹھیک کریں اور انہیں ایک ویو گیسٹ ہاؤس لے جائیں جہاں اُن کے قیام کا انتظام تھا۔ میں جان گیا کہ یہ دیو ایسا ہے جس پر لطیفوں اور مزاح کے ذریعہ ہی قابو پایا جا سکتا ہے۔ میں دو گھنٹوں بعد لیک ویو گیسٹ ہاؤس پہنچا تو کنور صاحب کے کمرہ سے زوردار قہقہوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ میں کمرہ میں داخل ہوا تو وہ قہقہہ لگانے کے لئے اپنا منہ کھول چکے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اپنے قہقہہ بار منہ کو مصنوعی طور پر بند کرنے کی کوشش کی مگر قہقہہ اُن کے قابو میں نہیں آ رہا تھا قہقہہ ختم ہوا تو انہوں نے پھر اپنے چہرے پر سنجیدگی کو طاری کرنے کی کوشش کی۔ میں اس انتظار میں خاموش بیٹھا رہا کہ وہ اپنی خفگی مجھ پر ظاہر کر دیں۔ خود ہی بولے "یہ تم نے یتیموں کی شکل کیوں بنا رکھی ہے۔"؟ میں نے کہا "آج آپ دہلی واپس ہونا چاہتے ہیں مگر آج کی فلائٹ میں کوئی نشست آپ کے لئے نہیں مل رہی ہے۔" بولے "میاں! میں تمہیں تمہاری ذمہ داری سے واقف کرانا چاہتا تھا۔ میں جب اپنے سے چھوٹوں میں غیر ذمہ داری کو پاتا ہوں تو بھڑک اُٹھتا ہوں۔ میں تم سے بہت ناراض تھا مگر تمہارے ساتھیوں نے اب میرا موڈ بدل دیا ہے۔ جاؤ تمہیں معاف کیا مگر آئندہ ہرگز ایسا نہ کرنا۔" اُس دن پتہ چلا کہ اُن کا غصہ جھاگ کی طرح ہے کہ ادھر اُبل پڑا اور اُدھر دیکھتے ہی دیکھتے دب گیا۔

واضح رہے کہ کنور صاحب مشاعروں اور ادبی جلسوں میں جانے کا کوئی معاوضہ نہیں لیتے۔ صرف کرایہ آمد و رفت لیتے ہیں بلکہ دوسرے شہر میں قیام و طعام کے اخراجات بھی اکثر صورتوں میں خود ہی برداشت کرتے ہیں۔ کنور صاحب کی کتاب "یادوں کا جشن" کے مطالعہ سے میری معلومات میں نہ صرف ایک خوشگوار اضافہ ہوا ہے بلکہ ایک گونہ گو اطمینان بھی حاصل ہوا۔ انہوں نے اپنی کتاب میں بھوپال کے ایک ہفتہ وار اڈیٹر کا ذکر کیا ہے جس نے انہیں ایک مشاعرہ میں بھوپال بلایا تھا۔ مشاعرہ کے بعد یہ اڈیٹر غائب ہو گیا اور کنور صاحب کو آمد و رفت کا کرایہ نہیں ادا کیا۔ کنور صاحب نے ایک باظرف آدمی کی طرح اس رسالہ کا یا اس کے اڈیٹر کا نام ظاہر نہیں کیا ہے۔ صرف اتنا لکھا ہے کہ اگر وہ یہ کتاب پڑھے تو اُن کے اخراجات آمد و رفت ادا کر دے۔

اس واقعے کو پڑھ کر مجھے بھی بھوپال کے ایک ہفتہ وار اڈیٹر کی یاد آ گئی جس نے مجھے اور فکر تونسوی کو طنز و مزاح کے ایک جلسہ میں بلایا تھا۔ وعدہ کیا تھا کہ وہ ہم دونوں کو آنے جانے کا فرسٹ کلاس کا کرایہ ادا کرے گا اور اگر جلسہ کامیاب رہا تو دو سو روپیہ فی کس معاوضہ بھی ادا کرے گا۔ میں اور فکر تونسوی فرسٹ کلاس سے بھوپال گئے۔ اس نے پہلے تو ہمیں دہلی سے بھوپال جانے کا سیکنڈ کلاس کا کرایہ ادا کیا پھر کہا کہ وہ جلسہ کے بعد واپسی کا کرایہ اور باقی رقم ادا کر دے گا۔ جلسہ بے حد کامیاب رہا لیکن جلسہ کے فوراً بعد وہ اڈیٹر ایسا غائب ہوا کہ تلاش بسیار کے باوجود نہیں ملا۔ اس کی تلاش میں میں نے اور فکر تونسوی نے تقریباً سارا بھوپال دیکھ لیا مگر وہ نہیں ملا۔ بالآخر ہم دونوں ادب کی بے لوث خدمت انجام دینے کے بعد دہلی واپس آ گئے۔ فکر تونسوی نے اس اڈیٹر کے خلاف ایک عدد کالم اور میں نے ایک عدد مضمون لکھا۔ مجھے یقین ہے کہ جس ہفتہ وار اخبار کے اڈیٹر نے کنور صاحب کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا وہ وہی تھا جس نے ہمیں بھی اردو کی بے لوث خدمت انجام دینے پر مجبور کیا تھا۔ میں چاہوں تو اس اڈیٹر کا نام ظاہر کر سکتا ہوں لیکن جب کنور صاحب نے خود ہی اُسے پوشیدہ رکھنا چاہا ہے تو میں کون ہوتا ہوں اُس کا نام ظاہر کرنے والا۔

سنا ہے کہ کنور صاحب شکار کے بھی شوقین رہے ہیں۔ مجھے کبھی اُن کے ساتھ شکار پر جانے کا اتفاق نہیں ہوا البتہ اُن کی ایک تصویر ضرور دیکھی ہے جس میں وہ اپنے مارے ہوئے ایک شیر کی نعش پر اپنا سیدھا پاؤں اور بندوق رکھے کھڑے ہیں۔ اس تصویر کی سب سے اہم خصوصیت مجھے یہ نظر آئی کہ اس میں کنور صاحب دیگر شکاریوں کی طرح اپنی فتح پر مسکراتے ہوئے نظر نہیں آتے بلکہ فکر

کے ہونٹوں پر میں نے ضرور ایک عجیب سی مسکراہٹ دیکھی ہے' جیسے وہ کنور صاحب کے ہاتھوں اپنے ہلاک ہونے پر نازاں' فرحاں اور شاداں ہو۔

کنور صاحب جیسی ہشت پہلو شخصیت کے بارے میں کہنے کو میرے پاس بہت سی باتیں ہیں۔ اُن کی شخصیت جن تہذیبی قدروں اور عوامل سے مل کر بنی ہے۔ وہ قدریں اب معدوم اور ایسی شخصیتیں بھی اب نایاب ہوتی جارہی ہیں۔ ہماری یہ خوش بختی نہیں تو اور کیا ہے کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے ایسی شخصیتوں کو دیکھا۔ وہ رواداری' انسان دوستی' محبت' یگانگت اور خلوص کا ایک انوکھا پیکر ہیں جسے عزیز رکھیں' اس کے لئے کچھ بھی کر گزریں۔ ۱۹۸۴ء میں جب مجھے طنز و مزاح کا ساگر سوری غالب ایوارڈ دینے کا اعلان کیا گیا تو میں حیران رہ گیا۔ میں نے پتہ لگانے کی کوشش کی کہ اس انعام کے لئے میرے انتخاب کی غلطی کس سے سرزد ہوئی ہے۔ جب معلوم ہوا کہ کنور مہندر سنگھ بیدی اس انعامی کمیٹی کے رکن ہیں تو غلطی کی وجہ میری سمجھ میں آگئی۔ میں نے اُن سے کہا بھی کہ میں اس انعام کا مستحق نہیں ہوں۔ مجھ سے سینیر مزاح نگار کئی اور بھی ہیں مانا کہ آپ مجھے عزیز رکھتے ہیں لیکن اردو ادب تو مجھے اتنا عزیز نہیں رکھتا۔ مگر وہ نہ مانے اور مجھے انعام دلوا کر ہی دم لیا۔

نومبر ۱۹۸۴ء میں مسز اندرا گاندھی کے قتل کے بعد جب دہلی میں فسادات پھوٹ پڑے تو ہم سب پریشان ہوگئے۔ کنور صاحب کی خیریت معلوم کرنے کے لئے جب اُن کے گھر فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ کسی دوست کے گھر منتقل ہوگئے ہیں اُن کے دوست ساقی تارنگ صاحب نے بتایا کہ اُن کے بیٹے کی کوٹھی جلادی گئی ہے اور مالی کافی نقصان ہوا ہے۔ جب حالات ذرا سنبھلے تو میں اُن سے ملنے گیا۔ چہرے پر وہی شگفتگی' بشاشت اور تازگی نظر آئی۔ انہوں نے فسادات کا ذکر تک نہ کیا۔ جب میں نے ہی اپنے طور پر فسادات پر اپنے دُکھ کا اظہار کیا تو بڑی متانت اور خاموشی کے ساتھ بولے :

"وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے"

اب بھلا بتایئے اس کے بعد میں اُن سے اس موضوع پر کیا بات کر سکتا تھا۔ اُن کا یہ تبصرہ مجھے آج بھی اُن کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ اگرچہ کنور صاحب کی مادری زبان پنجابی ہے لیکن اردو سے انہیں جو والہانہ عشق ہے ویسا عشق مجھے کسی اردو والے کے ہاں نظر نہیں آیا۔ وہ سراسر اردو تہذیب کی زندگی جیتے ہیں۔ اردو سے متعلق دہلی کی کوئی ادبی سرگرمی اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک اُسے کنور مہندر سنگھ بیدی کی سرپرستی حاصل نہ ہو۔

اُن کی کتاب "یادوں کا جشن" ایک ایسی شخصیت کی یادوں کا مجموعہ ہے جس نے اس برصغیر کی تاریخ کے ایک کربناک اور نازک دور سے گزرنے کے باوجود انسان دوستی کے دامن کو اپنے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔ جس کے پائے استقامت کو کسی بھی آزمائش میں لڑکھڑاہٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ایک اعتبار سے یہ کتاب برصغیر کی تاریخ کو صحیح پس منظر میں سمجھنے کے لئے ایک نیا زاویۂ نگاہ عطا کرتی ہے اور آنے والی نسلوں کے لئے آدرش کی حیثیت رکھتی ہے۔

کنور صاحب اپنی مصروف سماجی زندگی میں سے شام کے دھندلکے میں کچھ وقت ضرور نکال لیتے ہیں۔ جب وہ چیمسفورڈ کلب کے لان پر اکیلے چہل قدمی کرتے ہوئے گوربانی کا پاٹھ کرتے ہیں۔ دوست بھی موجود ہوں تو اجازت لیکر پاٹھ کرنے کے لئے چلے جاتے ہیں۔ میں نے اکثر انہیں تنہائی میں اس طرح کی عبادت کرتے دیکھا ہے۔ وہ اپنے سر کو جھکائے چپ چاپ چلتے رہتے ہیں جیسے انہیں اس دنیا سے کوئی علاقہ نہ ہو۔ ایسے وقت وہ مجلسی آدمی بالکل نہیں دکھائی دیتے۔ انہیں دیکھ کر میرا جی بھی خدا سے دعا کرنے کو چاہتا ہے کہ کنور صاحب برسوں ہمارے درمیان رہیں اور اپنی باتوں سے ہمیں جینے کا نیا حوصلہ عطا کرتے رہیں۔ اس وقت مجھے

ایک بچہ کی یاد آگئی جسے رات میں سونے سے پہلے ماں نے کئی دعائیں مانگنے کی تاکید کی ۔ آخر میں ماں نے بچہ سے کہا "بیٹا اب ذرا اپنے نانا جان کی درازیٔ عمر کے لئے بھی دعا مانگو کہ وہ کئی برس تک اس دنیا میں زندہ رہیں ۔" اس پر بچہ نے کہا "نہیں ماں! یہ دعا بیکار ہے ۔ نانا جان اب ویسے بھی اتنے کمزور ہوگئے ہیں کہ اس بڑھاپے کے ساتھ ان کا مزید کچھ برس تک زندہ رہنا مناسب نہیں ہے ۔ برخلاف اس کے میں خدا سے دعا کرنا چاہوں گا کہ وہ انہیں پھر سے نوجوان بنا دے ۔" کنور صاحب کے تعلق سے میری دعا کی نوعیت بھی کچھ اسی طرح کی ہے ۔ خدا کے فضل سے مہ و سال کی اس گردش کے باوجود ان میں آج بھی نوجوانوں کی سی توانائی اور حوصلہ ہے اور اسی توانائی اور حوصلہ کا نام کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ ہے ۔ میری دعا ہے کہ ان کی یہ توانائی اور جولانی ہماری آخری سانس تک قائم و دائم رہے ۔ (آمین)

(دسمبر ۱۹۸۶ء)

مجتبیٰ حسین

پروفیسر آل احمد سرور

پروفیسر آل احمد سرور جیسی بڑی شخصیت کے بارے میں کچھ لکھنے یا اظہار خیال کرنے کا ایک واضح نقصان تو مجھے یہ پہنچا ہے کہ مجھے اچانک اپنی کم مائیگی، کم علمی، بے حیثیتی اور بے بضاعتی کا شدت سے احساس ہونے لگا ہے۔ اگر سرور صاحب پر کچھ لکھنے کی بات نہ ہوتی تو میں آج یوں اپنے آپ کو اتنا حقیر و فقیر پُر تقصیر اور ذرۂ بے مقدار کی طرح کیوں پاتا۔ خود کو اپنے اصلی روپ میں دیکھنے کے لیے بھی بڑے حوصلہ کی ضرورت ہوتی ہے اور میں یہ حوصلہ اپنے میں نہیں پاتا۔ قد آور شخصیتوں پر لکھنے کا دوسرا زیاں یہ ہوتا ہے کہ لکھنے والے کو اپنے قد کا صحیح صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔ جو لوگ میری طرح بے وقوفوں کی جنت میں رہتے ہیں انہیں اپنے قد کے بارے میں کچھ اتنی خوش فہمی ہوتی ہے کہ لال قلعہ کے دروازے کے نیچے سے بھی گذریں تو اپنے سر کو بر بنائے انکسار نہیں بلکہ بر بنائے ضرور جھکا لیتے ہیں۔

سرور صاحب اردو ادب کی ان چند عظیم ہستیوں میں سے ہیں جن کا میں اتنا احترام کرتا ہوں کہ مارے احترام کے ان سے ہمکلام ہوتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں۔ ان کے علم و فضل کو دیکھتا ہوں تو اپنی جہالت کچھ اور بھی روشن اور عیاں ہو جاتی ہے۔ ۱۰ء سال کا جہاں تک تعلق ہے جولائی ۱۹۳۶ء میں جب میں پیدا ہو رہا تھا تو سرور صاحب نہ صرف علی گڑھ یونیورسٹی میں اردو کے لیکچرر بن چکے تھے بلکہ اس سے بہت پہلے انگریزی کی لیکچراری چھوڑ کر اردو میں اپنا شعری مجموعہ "سلسبیل" بھی شائع کرا چکے تھے۔ سرور صاحب کو سب سے پہلے بہت عرصہ قبل حیدرآباد کے اردو ہال میں تقریر کرتے سنا اور دیکھا تھا۔ ان کی تقریر سنی تو احساس ہوا کہ آدمی پروفیسر ہونے کے باوجود عقلمندی کی باتیں کر سکتا ہے۔ اُن کی تنقید میں جو اعتدال ہوتا ہے وہی اعتدال نہ صرف ان کی تقریر میں نظر آیا بلکہ ان کے رکھ رکھاؤ اور برتاؤ میں بھی نظر آیا۔ خطابت کے دریا تو اردو کے بہت سے پروفیسر بہاتے ہیں بلکہ بعض پروفیسر تو ایسے بھی ہیں جو پہلے تو خطابت کا دریا بہاتے ہیں بعد میں جب یہ دریا ان کے قابو میں نہیں رہتا تو اس دریا میں خود بہنے لگتے ہیں اور اکثر صورتوں میں اپنے سامعین کو اس دریا کے کنارے بے یار و مددگار چھوڑ کر خود ڈوب جاتے ہیں۔ سرور صاحب خطابت کے معاملے میں دریا بہانے کے قائل نہیں ہیں۔ ان کی تقریر میں ہر دم چھوٹے چھوٹے چشمے ابلتے رہتے ہیں اور جب تقریر ختم ہوتی ہے تو خیال ایک وشال سمندر کی طرح پھیل جاتا ہے جو وسیع بھی ہوتا ہے اور عمیق بھی۔

دوسری طرف ہمارے بہت سے دانشور ایسے بھی ہیں جو پتے کی بات کرنے کی کوشش میں بات کم کرتے ہیں اور ناپتے تولتے زیادہ رہ جاتے ہیں۔ حالانکہ پتے اور دانشوروں میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔ سرور صاحب سچ مچ پتے کی

سوچی سمجھی بات کرتے ہیں اور ذہن کی گرہیں کھولتے چلے جاتے ہیں۔ سرورؔ صاحب کو پہلی بار سن کر دل و دماغ کو ایک عجیب و غریب سرور حاصل ہوا۔ میں نے ایک مدّاح اور عقیدت مند کی حیثیت سے اپنی آٹوگراف بک میں ان کے آٹوگراف لیے اور یہ آٹوگراف بک آج بھی میرے پاس "تحفتہ السرور" کے طور پر محفوظ ہے۔

سرورؔ صاحب سے میری ملاقات ۱۹۷۲ء میں دہلی میں ہوئی۔ اس وقت پتہ چلا کہ سرورؔ صاحب بیکار و لغو ادب کا مطالعہ بھی کرتے ہیں، چنانچہ وہ میرے بعض مضامین پڑھ چکے تھے اور ان کے حوالے سے مجھے جانتے تھے۔ ان دنوں میں حکومت ہند کی "کمیٹی فار پروموشن آف اردو" میں کام کرنے کے لئے ڈیپوٹیشن پر دو سال کے لئے حیدرآباد سے دہلی آیا تھا۔ میں اور ڈاکٹر خلیق انجم جواب سرورؔ صاحب کے جانشین کی حیثیت سے انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری بن کر خلیق انجمن بن گئے ہیں شاستری بھون کے ایک کمرہ میں بیٹھتے تھے۔ سرور صاحب کمیٹی کے کام کے سلسلہ میں علی گڈھ سے دہلی آتے تو کبھی اس کمرہ میں بھی آجاتے اور اپنی شفقتوں سے نوازتے۔ مجھے اس وقت ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ فروری ۱۹۷۲ء میں یہی دن تھے بلکہ اتفاق سے تاریخ بھی یہی تھی۔ اردو کمیٹی کا کام تقریباً ختم ہو رہا تھا اور میں اردو اور اس کی کمیٹی کا بوریا بستر گول کر رہا تھا اور حیدرآباد واپس جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ دوستوں نے کہا بھی کہ اب دہلی آگئے ہو تو دہلی میں ہی رہو۔ حیدرآباد واپس کیوں جاتے ہو، مگر سوال نوکری کا تھا۔ میں اردو کی روٹی کھانے سے حتی الامکان گریز کرتا ہوں کیونکہ اردو کی روٹی پہلے تو آسانی سے نہیں ملتی اور اگر ملتی بھی ہے تو اس روٹی کی تقسیم میں بہت گھپلا ہوتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ دوسرے پیشوں میں لگے ہوئے لوگوں کو تو اللہ میاں روٹی دیتے ہیں لیکن اردو کی روٹی اردو کا پروفیسر دیتا ہے جو سلیکشن کمیٹیوں میں بیٹھتا ہے۔ وہی ہمارا رازق اور ان داتا ہوتا ہے۔ پھر جس طرح وہ روٹی دیتا ہے اگر خدا نخواستہ اللہ میاں بھی اسی طرح دینے لگ جائیں تو شاید آدمی بھوکا رہنے کو ضروری سمجھے۔ بندے کی بھی تو ایک انا ہوتی ہے۔ اسی لیے اردو کی روٹی میں غذائیت کم اور ذلت زیادہ ہوتی ہے۔ اسے اتفاق ہی سمجھیے کہ جب میں حیدرآباد جانے کی تیاریاں کر رہا تھا تو اچانک نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ سے میرے نام ایک انٹرویو کال آیا کہ ۲۳ فروری کو اردو کے اسسٹنٹ ایڈیٹر کی اسامی کے انٹرویو میں شرکت کرو۔ میں نے نہایت بے دلی کے ساتھ اس انٹرویو میں شرکت کرنے کا فیصلہ تو کیا مگر جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ بارہ سال پہلے آج ہی کے دن دوپہر میں یہ انٹرویو تھا۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ انٹرویو میں کون ایکسپرٹ ہوگا اور امیدوار کون کون ہوں گے۔ میں شاستری بھون میں بیٹھا تھا کہ اچانک سرورؔ صاحب اپنے ہاتھ میں سامان پکڑے علی گڈھ سے آگئے۔ میں اکیلا تھا۔ بولے "ابھی علی گڈھ سے آرہا ہوں۔ دوپہر میں ایک ضروری کام ہے میں سامان یہاں چھوڑے جا رہا ہوں۔ شام میں آکر اسے لے جاؤں گا۔ تم تو اپنے دفتر میں ہی رہو گے؟"

میں نے کہا "سرورؔ صاحب! دوپہر میں مجھے بھی ایک غیر ضروری کام سے باہر جانا ہے مگر شام تک واپس آجاؤں گا۔ آپ شوق سے اپنا سامان یہاں چھوڑ جائیں"۔ وہ چلے گئے تو میں انٹرویو دینے کے لیے بھاگ کھڑا ہوا۔ وہاں کئی جغادری امیدوار ہاتھوں میں ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں لیے بیٹھے تھے۔ مجھے اپنی بی۔ اے کی ڈگری پر بہت شرم آئی۔ اس یونیورسٹی کو بھی شرم آئی ہوگی جس نے مجھے یہ ڈگری دی تھی۔ میں چپ چاپ وہاں سے کھسک جانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک میرا نام پکارا گیا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ اندر گیا تو دیکھا کہ بڑے نامی گرامی پروفیسر صاحبان بیٹھے

میرا انتظار کر رہے ہیں۔ ان میں پروفیسر آل احمد سرور بہت نمایاں تھے میں نے سوچا اچھا تو یہی ضروری کام تھا سرور صاحب کا دہلی میں پھر خیال آیا چونکہ سرور صاحب کا سامان میرے ہی کمرہ میں ہے۔ اسی لیے وہ میری خاطر نہ سہی کم از کم اپنے سامان کی خاطر ہی میرے ساتھ ضرور ہمدردی کریں گے۔ مگر انٹرویو شروع ہوا تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی جن سے میں کبھی نہیں ملا تھا، نہایت نرمی اور شفقت سے پیش آتے رہے بلکہ کھلے بندوں اور دن دہاڑے میری تعریف تک کرتے رہے، جب کہ سرور صاحب نے طرح طرح کے سوالوں کی بوچھار مجھ پر کردی۔ میں پسینہ میں شرابور ہوگیا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ آئندہ کبھی اردو کی روٹی نہیں کھاؤں گا۔ میں انٹرویو کے بعد کمرہ سے باہر نکل آیا۔ اپنا پسینہ خشک کیا۔ کچھ امیدواروں سے باتیں کیں معلوم ہوا دو امیدوار ایسے بھی ہیں جو سرور صاحب کے عزیز شاگرد رہ چکے ہیں۔ میں مایوس سا ہوگیا۔ مگر آس بھی کیا بڑی چیز ہوتی ہے میں نے سوچا سرور صاحب اپنا سامان لینے کے لیے میرے کمرے پر آئیں گے تو نتیجہ کے بارے میں اُن سے پوچھ لوں گا۔ بسوں میں دھکے کھاتے دفتر واپس آیا تو دیکھا کہ سرور صاحب اپنا سامان لے کر کب کے جاچکے تھے۔

ان کے اس طرح چلے جانے سے مجھے اپنے نتیجے کا اندازہ ہوگیا اور میں نے حیدرآباد واپس جانے کی تیاریاں زور وشور سے شروع کردیں۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ آئندہ کبھی اردو کے کسی پروفیسر کے سامان کی حفاظت نہیں کروں گا۔ آٹھ دن بعد میں دفتر میں بیٹھا تھا کہ NCERT سے میرے نام خط آیا کہ میاں تمہارا انتخاب ہوگیا ہے آکر اپنا راج پاٹ سنبھالو۔ خط کا متن کچھ اس طرح تھا کہ میاں چونکہ تمہاری تعلیم بہت کم ہے۔ اسی لیے اس کی تلافی کے لیے تمہیں دو زائد انکریمنٹس (INCREMENTS) بھی دیے جائیں گے۔ بعد میں کسی نے بتایا کہ سرور صاحب نے انٹرویو میں مجھے پریشان کرنے کے لیے جتنا زور لگایا تھا اتنا ہی زور انھوں نے میرے انتخاب کے لیے بھی لگایا تھا۔ پروفیسر گیان چند جین نے سرور صاحب پر اپنے خوبصورت خاکہ میں لکھا ہے کہ سرور صاحب سلکشن کمیٹیوں کے بہترین رکن ہوتے ہیں اور کبھی غلط انتخاب نہیں کرتے ہیں ان کے اس دعوی کی تردید کے لیے اپنی مثال پیش کرتا ہوں کہ سرور صاحب کبھی کبھی انتخاب میں غلطی بھی کر جاتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے احساس ہوتا ہے کہ اگر اس دن سرور صاحب نے میرے کمرے میں اپنا سامان نہ رکھوایا ہوتا تو آج میں اپنی بے سروسامانی کے ساتھ حیدرآباد میں ہوتا۔

اگرچہ بزرگوں کی خامیوں کی طرف اشارہ کرنا خود ایک خامی ہے مگر میں سرور صاحب کی ایک خامی کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا کہ وہ اردو کے پروفیسر ہونے کے باوجود اردو کے پروفیسر نہیں لگتے۔ ان میں وہ بات ہی نہیں ہے جو اردو کے بہت سے رائج الوقت پروفیسروں میں پائی جاتی ہے۔ ان میں نہ چھل ہے نہ کپٹ، سازش ہے نہ ہیر پھیر، کینہ ہے نہ بغض، غیبت ہے نہ منافقت، نہ اقتدار کی ہوس ہے نہ صاحبانِ اقتدار کی قربت سے انہیں کوئی سروکار ہے۔ اردو کے استاد اب جوڑ توڑ کے ہی نہیں بلکہ توڑ توڑ کے قائل ہوتے جارہے ہیں۔ یہ صلاحیت اب اردو کے پروفیسروں کی بنیادی قابلیت میں شمار کی جانے لگی ہے اور اردو کلچر کا حصہ بنتی جارہی ہے۔ سرور صاحب ان سب باتوں سے بے نیاز نام ونمود اور شہرت کی طلب سے ناوابستہ اپنے جہانِ علم ودانش میں مست اور مگن ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ گروہ بندیوں سے اپنے آپ کو الگ رکھا ہے۔

انھوں نے اپنے لیے غیر جانبداری، میانہ روی اور اعتدال پسندی کی وہ مشکل روش اختیار کی ہے جس پر آج کے دور میں چلنا اور پھر سرخ رو ہونا کوئی مذاق دل لگی نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ عالمی سیاست میں ہندوستان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے (NON- ALIGNMENT) یا غیر جانبداری یا گٹ نر پیکشتا کو رائج کیا ہے لیکن مجھے یہ کہتے ہوئے فخر ہو رہا ہے کہ اردو ادب میں "یہ گٹ نر پیکشتا" سرور صاحب کی وساطت سے پچھلے پچاس برسوں سے رائج ہے۔

سرور صاحب کے مزاج میں جو استغنا ہے، جو بے نیازی ہے، جو نرمی اور ملائمت ہے، جو اعتدال اور توازن ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔ یہ بیش بہا دولت ان کی اپنی ہے۔ میں ان کے فرزند صدیق احمد صدیقی کا دوست ہوں۔ سرور صاحب کے مزاج میں جتنی نرمی ہے اتنی ہی تندی صدیقی کے مزاج میں ہے۔ جتنا توازن سرور صاحب کی ذات میں ہے اتنا ہی عدم توازن صدیقی کی ذات میں ہے۔ سرور صاحب کسی بھی معاملہ میں حتمی رائے نہیں دیتے۔ صدیقی نہ صرف رائے دیدیتے ہیں بلکہ فیصلہ بھی صادر کردیتے ہیں۔ اسی کو کہتے ہیں۔

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

انعامات اور اعزازات سرور صاحب کے پیچھے بھاگتے ہوں تو یہ الگ بات ہے مگر سرور صاحب نے کبھی انعامات اور اعزازات کے پیچھے بھاگ کر اپنے آپ کو ہلکان نہیں کیا۔

یہ بات ہم سب کے لئے بڑی مسرت کی ہے کہ آج سرور صاحب کے اعزاز میں شائع کردہ کتاب "تحفۃ السرور" کا اجراء ہو رہا ہے۔ اگرچہ یہ کتاب اپنے نام سے تصوف کی کوئی کتاب معلوم ہوتی ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو سرور صاحب سچ مچ جدید اردو ادب کے صوفی اور قلندر رہے ہیں، جن کا مسلک لوگوں میں علم اور آگہی کی دولت دونوں ہاتھوں سے لٹاتا رہا ہے۔ سرور صاحب نے اپنے افکار و خیالات کے ذریعہ کئی نسلوں کی ذہنی تربیت کی ہے۔ اپنی تنقیدی بصیرت کے ذریعہ لاکھوں ذہنوں کو جلا بخشی ہے۔ سرور صاحب اپنی وضع کے آخری اردو پروفیسر اور دانشور ہیں۔ جب جب انہیں دیکھتا ہوں تو فراق گورکھپوری کا وہ شعر مجھے یاد آتا ہے جس میں انھوں نے اپنے ہم عصروں کو اس لحاظ سے خوش قسمت ثابت کیا ہے کہ انھوں نے فراق کو دیکھا تھا اور فراق سے باتیں کی تھیں۔ سرور صاحب کے بارے میں میرا تاثر بھی کچھ اسی طرح کا ہے کہ ہم اس اعتبار سے خوش قسمت ہیں کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے سرور صاحب کو نہ صرف دیکھا، اپنے کانوں سے انھیں سنا، اپنے دل سے انھیں محسوس کیا، اپنے دماغ سے انھیں سوچا۔ ہم نے انھیں نہ صرف پرکھا اور برتا ہے بلکہ ان کے سامان کی حفاظت بھی کی ہے اور آگے ان کی اقدار کی حفاظت کرتے رہیں گے۔ میری دعا ہے کہ سرور صاحب کی تنقید کا سایہ ہمارے ادب پر برسوں قائم رہے۔

آمین۔

(۲۳ر فروری ۱۹۸۶ء)

مُجتبیٰ حُسین

کنھیا لال کپور
لمبا آدمی! ___

کنہیا لال کپور کو جب بھی دیکھتا ہوں قطب مینار کی یاد آتی ہے اور جب قطب مینار کو دیکھتا ہوں تو آپ جان گئے ہوں گے کہ کس کی یاد آتی ہوگی۔ چونکہ دہلی میں ایسی جگہ رہتا ہوں، جہاں سے ہر دم قطب مینار سے آنکھیں چار ہوتی رہتی ہیں اس لیے کپور صاحب بے تحاشہ، لگاتار اور بنا کوشش یاد آتے رہتے ہیں۔ کیا کریں مجبوری ہے۔ دہلی میں کسی اچھی لوکیلٹی میں مکان بھی تو نہیں ملتا۔ کپور صاحب اور قطب مینار میں مجھے فرق یہ نظر آیا کہ قطب مینار پر رات کے وقت ایک لال بتی جلتی رہتی ہے تاکہ ہوائی جہاز وغیرہ اندھیرے کا رخ نہ کریں۔ کپور صاحب پر رات کے وقت یہ حفاظتی انتظام نہیں ہوتا۔ جو خطرے سے خالی نہیں ہے۔ کیا پتہ کسی دن کوئی ہوائی جہاز اندھیرے میں کپور صاحب سے نبرد آزما ہو جائے اور ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے (مراد ہوائی جہاز سے ہے) ایسی "سات منزلہ شخصیتیں" اب بہت کم دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ایک بار بس میں سوار ہوئے تو فوراً اپنے آپ کو یوں دوہرا تہہ کر لیا جیسے کسی نے انگریزی کے L کو اُلٹ دیا ہو (ᑎ) اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ جب بھی ان سے بات کی تو اُن کی آواز دور سے آتی ہوئی محسوس نہیں ہوئی۔ ورنہ عام صورتوں میں اُن سے کھڑے کھڑے بات کیجئے تو یوں لگتا ہے جیسے آپ کسی دور افتادہ شخص سے ٹیلیفون پر بات کر رہے ہوں۔ لمبا قد بھی کیا عجب شے ہے۔

کپور صاحب کو خود بھی اپنے لمبے قد کے متعلق کچھ "خوش فہمیاں" اور کچھ "غلط فہمیاں" ہیں۔ "خوش فہمی" کا یہ عالم ہے کہ لال قلعے کے باب الداخلہ کے نیچے سے گزرنا ہو تو اپنے سراقدس کو خم دے کر سینہ پر اور سینہ کو خم دے کر پیٹ پر رکھ لیتے ہیں اور "غلط فہمی" کا یہ عالم ہے کہ فکر تونسوی کے گھر میں پانچ فٹ طول والی چارپائی پر سو جانے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں! ایسی ہی غلط فہمیاں اور ایسی ہی خوش فہمیاں تو انسان کو طنز نگار بناتی ہیں۔ ان کے قد کے بارے میں کچھ زیادہ کہنے کا حق ویسے تو مجھے بھی نہیں پہونچتا کیونکہ اکثر لوگ میری ذات کے حوالے سے لمبے آدمیوں کے احمق ہونے کی دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ اس کو بنیاد مان کر کپور صاحب کے قد کا اندازہ لگائیے۔ کبھی پوچھا تو نہیں کہ ناپ تول کے حساب سے اُن کا قد کتنا ہے۔ تاہم ایک بار شدید گرمی میں دہلی آئے اور میں نے دہلی کے موسم کے بارے میں اُن کی رائے پوچھی تو بولے "سینے تک تو موسم بڑا جان لیوا ہے۔ البتہ گردن اور سر کے آس پاس موسم خاصا خوشگوار ہے۔"
اتنا تو ہم نے بھی جغرافیوں میں پڑھ رکھا تھا کہ آدمی سطح سمندر سے جوں جوں بلند ہوتا جائے گا اسی کے مطابق موسم

خوشگوار ہوتا جائے گا، اسی لیے ان کی بات پر فوراً ایمان لے آئے۔

اُن کے قد کے معاملے میں تو قدرت نے بڑی فیاضی دکھائی ہے البتہ اس قد کے اطراف گوشت پوست کا پلاستر چڑھانے میں قدرت نے بڑی کنجوسی سے کام لیا ہے۔ اتنے دُبلے پتلے ہیں کہ ملک کی غذائی صورتِ حال پر ایک مستقل طنز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ہندوستان جیسے ملک میں رہتے ہیں۔ اگر مغرب کے کسی ترقی یافتہ اور خوشحال ملک میں ہوتے تو وہاں کی حکومت ان پر "تہمت" کو کب کا ملک بدر کر چکی ہوتی (دروغ بر گردنِ راوی کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ جب بھی ملک کو بیرونی غذائی امداد کی ضرورت ہوتی ہے تو کپور صاحب کا فوٹو بھیج کر فوراً بیرونی غذائی امداد حاصل کی جاتی ہے)۔

کپور صاحب بچپن سے میری کمزوری رہے ہیں۔ کمزوری ان معنوں میں کہ اُردو کی ایک نصابی کتاب میں اُن کا مضمون "غالبؔ جدید شعرا کی مجلس میں" شامل تھا اور محض اُن کا مضمون ٹھیک ڈھنگ سے یاد نہ کرنے کی وجہ سے میں اردو کے پرچے میں "کمزور" رہ گیا تھا۔ بعد میں اُن کے اس مضمون سے ایسی چڑ ہوئی کہ جہاں کہیں یہ مضمون دکھائی دیا فوراً منہ پھیر لیا۔ اب اسے اتفاق ہی کہیے کہ جس مضمون سے اس قدر چڑ رہی وہی مضمون لوگوں کو اتنا پسند آیا کہ اب تک ہر انتخاب میں اسے شامل کیا جاتا ہے۔ بہرحال میں نے اس مضمون کو چھوڑ کر کپور صاحب کے سارے مضامین پڑھے اور ان کا گرویدہ ہو گیا۔

اُن سے ملنے کی بڑی تمنا تھی۔ ۱۹۶۶ء میں حیدرآباد میں مزاح نگاروں کی پہلی کُل ہند کانفرنس منعقد ہوئی تو ان سے خواہش کی گئی کہ وہ حیدرآباد آکر اس کانفرنس کی صدارت کریں۔ انھیں کئی خط لکھے مگر کسی کا جواب نہ آیا۔ کرشن چندر اور مخدوم محی الدین نے بھی سفارشی خط لکھے مگر جواب ندارد (بہت بعد میں پتہ چلا کہ وہ خط کا جواب دینے کو خلافِ تہذیب بات سمجھتے ہیں۔) پھر آخری حربے کے طور پر جب انھیں پے بہ پے ٹیلیگرام بھیجے جانے لگے تو عاجز آکر لکھا "بابا! کیوں ہم قلندروں کے سکون میں خلل ڈالتے ہو۔ صدارت کی دعوت سر آنکھوں پر۔ مگر ڈاکٹروں نے مستقلاً لیٹے رہنے کا مشورہ دیا ہے۔ بتائیے میں لیٹے لیٹے آپ کی کانفرنس کی صدارت کیسے کر سکتا ہوں۔؟" بات معقول تھی کیونکہ ہم نے بھی کسی کو لیٹے لیٹے صدارت کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے بعد یہ معمول سا بن گیا کہ ہم لوگ ہر سال انھیں حیدرآباد بلاتے اور یہ طبی تصدیق نامہ پیش کرکے باعزت بری ہو جاتے۔ بالآخر تھک ہار کر ہم نے بھی اپنی دعوت کو لیٹے رہنے پر مجبور کر دیا (اُتنی ڈاکٹری تو ہمیں بھی آتی ہے)۔

پھر یوں ہوا کہ کئی برسوں بعد ایک دن اچانک دلی میں میرے دفتر کے فون کی گھنٹی بجی۔ پیغام تھا "کنہیا لال کپور آپ سے آج شام ٹی وی ہاؤس میں ملنا چاہتے ہیں، ٹھیک چھ بجے پہنچ جائیے!" کسی طرح اعتبار نہ آتا تھا کہ جو قطب مینار برسوں سے لیٹا ہوا تھا وہ آخر کس طرح اُٹھ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ میں بھاگا بھاگا ٹی وی ہاؤس پہنچا کر دیکھا کہ کپور صاحب جاں نثار اختر اور فکر تونسوی ایک میز پر بیٹھے ہیں۔ کپور صاحب نے مجھے بڑے بڑے پیار سے گلے لگایا۔ کرسی پر بٹھایا پھر کرسی پر بٹھاتے ہی ایک لطیفہ سنایا اور لطیفہ سناتے ہی میری طرف ہاتھ بڑھا کر مجھے کرسی سے کھینچا اور اس زور سے کھینچا کہ میں کرسی سے نیچے آگیا۔ اپنی ہنسی کو روک کر مجھے قرینے سے کرسی پر رکھا۔ کرسی پر بٹھاتے ہی پھر لطیفہ سُنایا اور لطیفہ سناتے ہی میری طرف ہاتھ بڑھا کر مجھے کرسی سے کھینچا اور اس زور سے کھینچا کہ میں پھر کرسی سے نیچے آگیا۔ اپنی ہنسی روک کر پھر مجھے کرسی پر — میں حیران ہوا تو فکر تونسوی بولے "کپور صاحب کی یہ عادت

ہے کہ جب کبھی کوئی اچھا فقرہ یا لطیفہ کہتے ہیں تو (۳) آدمی سے بے ساختہ معانقہ کرتے ہیں جس پر یہ بہت زیادہ مہربان ہوتے ہیں۔ میں خود بھی ان کی مہربانی سے کئی بار گر چکا ہوں۔ اب یہ مہربانی تمہارے حصے میں آتی ہے۔ بیٹا! طنز نگاروں کی اور قدر کرو۔"

جاں نثار اختر مرحوم تو یوں بھی بڑے مرنجان مرنج آدمی تھے۔ نکرتونسوی کا یہ جملہ سن کر بہ نظر احتیاط اپنے دونوں ہاتھ رانوں کے نیچے دبا کر بیٹھ گئے۔ مجھے کرسی سے گرانے کا شغل آدھے پون گھنٹے تک جاری رہا۔ اس کے بعد کپور صاحب اس قابل ہوئے کہ میری خیریت دریافت کر سکیں۔ بہت سے آسان سوالات پوچھے جن کے جواب دینا کم از کم میرے لیے مشکل تھا۔ (کالج کے پرنسپل ہونے کا یہی تو فائدہ ہوتا ہے)۔

اس پہلی ملاقات کے بعد کپور صاحب سے دہلی میں کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ امرتسر ٹیلیویژن سے جب بھی ان کا کوئی پروگرام ہوتا ہے تو وہ ریکارڈنگ کے لیے دہلی آتے ہیں اور مجھے کرسی سے گرائے بغیر واپس نہیں جاتے۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ کپور صاحب انگریزی کے استاد رہے ہیں۔ لیکن یہ کھاتے ہیں انگریزی کی اور گاتے ہیں اُردو کی۔ انھیں فارسی انگریزی اور اُردو کے بے شمار اشعار یاد ہیں۔ نثر کا ایک جملہ کہتے ہیں اور اس کے فوراً بعد ایک شعر داغ دیتے ہیں۔ ایک دن ملٹن کا ایک شعر سنایا اور اس شعر کے پیچھے حافظ کے ایک شعر کو دوڑایا اور آخر میں حافظ کے اس شعر کے تعاقب میں غالب کا ایک شعر چھوڑ دیا۔ پھر غالب کے شعر کی عظمت کو اپنے تجزیے سے کچھ اس طرح نمایاں کرنے لگے جیسے یہ ثابت کرنا چاہتے ہوں کہ ملٹن اور حافظ نے اپنے شعر "دیوانِ غالب" سے چرائے تھے۔ واضح رہے یہ عنایتِ خاص صرف غالب کے لیے نہیں بلکہ ہر اس شاعر کے لیے ہے جو اردو میں شعر کہتا ہے۔ اکثر ایسا ہوا کہ انھوں نے مومن کو ورڈ سورتھ سے بھڑا کر ورڈ سورتھ کو شرمندہ کیا۔ داغ کی ٹکر شیلی سے کرا کے شیلی کا کچومر نکالا۔ حالی کو براؤننگ پر چھوڑا۔ حد ہو گئی کہ ایک دن پنڈت رتن ناتھ سرشار سے جیسٹرٹن کو چت کرا دیا۔ وہ ہر دم یہ ثابت کرنے پر تُلے رہتے ہیں کہ دنیا میں جتنی اچھی شاعری اور تھوڑی بہت طنز نگاری ہوتی ہے وہ اردو میں ہوتی ہے۔ اردو سے ایسی پڑھی لکھی محبت میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ اردو کی موجودہ کسمپرسی پر جتنی طویل آہ کنہیا لال کپور کھینچتے ہیں اتنی طویل آہ اردو کا کوئی اور ادیب کھینچ کر دکھا دے تو ہم اس کے غلام ہو جائیں۔ کپور صاحب باتیں کرنے کا فن خوب جانتے ہیں۔ وہ گھنٹوں اپنی علمیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ کبھی انگریزی کبھی اردو اور کبھی پنجابی میں۔

کبھی کبھی طنز نگار کو مزاحیہ صورتِ حال میں گرفتار دیکھنا بھی ایک انوکھا تجربہ ہوتا ہے۔ ایک بار کپور صاحب کو میں اس صورتِ حال میں گرفتار دیکھ چکا ہوں۔ نومبر ۱۹۷۰ء میں ایک دن مزاح نگار نریندر لوتھر حیدرآباد سے آئے تو مجھ سے کہا کہ میں شام میں ان سے ملنے ہوٹل جن پتھ پر پہنچوں۔ شام کے چھ بجے تھے اور میں اپنے اسکوٹر پر قد وائی نگر سے گزر رہا تھا کہ اچانک مجھے بس اسٹاپ پر ایک شخص نظر آیا جو بجلی کے کھمبے کی طرح کھڑا تھا۔ میں نے سوچا ہو نہ ہو یہ کپور صاحب ہی ہوں گے۔ اسکوٹر روک کے قریب گیا تو دیکھا کہ سچ مچ کپور صاحب تھے۔ اُن کے ساتھ ان کے وہ نوجوان دوست تھے جو پنجابی کے ادیب ہیں اور جو ہر بار موگا سے ان کے ساتھ دہلی آتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک اور لڑکا تھا جس سے کپور صاحب محو کلام تھے۔ مجھ کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔ بولے "میں آج ہی موگا سے آیا ہوں۔ ٹی۔ وی پر ایک ریکارڈنگ تھی جو ہو چکی ہے۔" پھر اُس نوجوان لڑکے کی طرف اشارہ

کرکے کہا "یہ میرا بھتیجہ ہے، جو یہیں قدوائی نگر میں رہتا ہے۔ اس سے ملنے گیا تھا۔ اب ساتھ کی گاڑی سے واپس جا رہا ہوں۔ ریزرویشن ہو چکی ہے۔"

میں نے کہا "کپور صاحب! یہ تو آپ غضب کر رہے ہیں۔ آج ہی آئے اور آج ہی واپس ہو رہے ہیں۔ یہ کیا بات ہوئی۔ اتفاق سے نریندر لوتھر بھی آج دہلی میں ہیں۔ وہ بھی عرصہ سے آپ سے ملنے کے مشتاق ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ کچھ دیر کے لیے اُن کے ہاں چلتے۔"

کپور صاحب کے بھتیجے نے کہا "نہیں جی! یہ تو آج رات کی گاڑی سے واپس ہو رہے ہیں۔ میں خود انھیں روک رہا ہوں مگر یہ رک نہیں رہے ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی کپور صاحب نے مجھ سے پوچھا "نریندر لوتھر کہاں ٹھہرے ہیں؟" میں نے فوراً ہوٹل کا نام اور کمرے کا نمبر بتا دیا۔ بولے "ہم لوگ دو چار منٹ کے لیے ہی سہی وہاں ضرور پہنچ جائیں گے۔"

کپور صاحب کے بھتیجے نے پھر مداخلت کرتے ہوئے کہا "صاحب! ان کی اُمید نہ رکھیے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کا سامان کالکاجی میں رکھا ہے اور اس سامان کو لے کر انھیں لمبے اسٹیشن پر پہنچنا ہے۔ آپ خود دہلی میں رہتے ہیں۔ اندازہ لگائیے وقت کتنا کم ہے۔"

میں نے کہا "اچھا تو کپور صاحب آپ سامان لے کر اسٹیشن پہنچئے میں اور لوتھر صاحب سیدھے اسٹیشن پہنچ جائیں گے مگر یہ بتائیے آپ کی گاڑی پُرانی دلی سے جائے گی یا نئی دلی سے؟"

کپور صاحب نے حیران ہو کر اپنے نوجوان دوست کی طرف دیکھا۔ پھر پوچھا "بھئی! ہماری گاڑی کونسے اسٹیشن سے جائے گی؟" اُن کے دوست نے شپٹا کر کہا "موگا اسٹیشن سے جائے گی جی۔ اور کیا؟" میں ان کی بدحواسی پر ہنسنے لگا تو بولے "صاحب! پتہ نہیں گاڑی کس اسٹیشن سے جاتی ہے، جی، دھیان نہیں رہا۔ ٹکٹ پر دیکھنا ہوگا۔"

تب میں نے کپور صاحب کی طرف پلٹ کر کہا "اسٹیشن کو گولی ماریئے۔ یہ بتائیے کونسی گاڑی میں آپ کا ریزرویشن ہوا ہے۔ میں اسٹیشن کے بارے میں پتہ کرلوں گا۔"

کپور صاحب بولے "شاید امرتسر ایکسپریس ہے۔"

میں نے کہا "وہ تو دوپہر میں چلی جاتی ہے۔"

بولے "شاید فرنٹیئر میل ہے۔"

میں نے کہا "مگر وہ تو صبح میں چلی جاتی ہے۔ کپور صاحب! کمال ہے آپ کو ڈھائی گھنٹے بعد سفر پر روانہ ہونا ہے اور آپ کو ابھی تک یہ پتہ نہیں ہے کہ کس گاڑی میں آپ کی ریزرویشن ہوئی ہے؟"

یہ سنتے ہی کپور صاحب نے میرے ہاتھ کو زور سے دبایا۔ پھر مجھے الگ لیجا کر سرگوشی کے انداز میں کہنے لگے "مجھ پر وکیلوں کی طرح جرح کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ مجھے تو تمہارے ادیب ہونے پر شبہ ہونے لگا ہے۔ بھتیجے کے سامنے میری بے عزتی کروا رہے ہو۔ وہ چاہتا ہے کہ میں رات اُس کے ہاں رہوں اور میں اس بچے کو زیر بار نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے جھوٹ موٹ ہی اس سے کہہ دیا ہے کہ آج رات کی گاڑی سے واپس جا رہا ہوں۔ اُسے یہ تک نہیں بتایا ہے کہ کہاں ٹھہرا ہوں۔ ایسے میں تم نے آ کر لب سڑک میرے خلاف "شاہ کمیشن" بٹھا دیا اور لگے جرح کرنے۔ تم فوراً یہاں سے پھوٹو۔ میں دس منٹ کے اندر نریندر لوتھر کے ہاں پہنچ رہا ہوں۔ کمال ہے تم لوگوں سے ملے بنا میں کیسے جا سکتا ہوں۔ میں تو دہلی میں تین چار

دن رہوں گا؟"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اچانک ایک بس آگئی۔ میں نے کپور صاحب اور اُن کے دوست کو فوراً بس میں سوار کروادیا۔ بس چلی گئی تو اُن کے معصوم بھتیجے نے مجھ سے کہا "میرے چاچا جی! سچ مچ بڑے رائٹر ہیں۔ یہ نشانی بڑے رائٹر کی ہے کہ اُسے دو گھنٹے بعد ٹرین میں جانا ہے اور اُسے ٹرین کا پتہ نہیں ہے۔ اور تو اور اُنھیں یہ بھی نہیں معلوم ہے کہ کہاں سے اسٹیشن پر جانا ہے۔ میں ان کی مدد کو جانا چاہتا تھا مگر اُن کے نوجوان دوست نے مجھے بس میں سوار ہونے نہیں دیا۔ کہنی مار کے نیچے اُتار دیا۔ پتہ نہیں چاچا جی کو اب کتنی تکلیف ہوگی؟"

میں نے اُن کے معصوم بھتیجے کو تسلی دی کہ بیٹا چاچا کے لیے اتنا پریشان نہیں ہوا کرتے۔ دنیا کا ہر چاچا اتنا ہی بڑا رائٹر ہوتا ہے۔ میری اتنی تسلی کے باوجود بھتیجے کی آنکھ میں دو چار آنسو اُمڈ آئے۔ جھوٹی تسلی بھلا کہیں سچے آنسوؤں کو روک سکتی ہے۔ میں اس لڑکے سے نپٹ کر ہوٹل جن پتھ پہونچا تو دیکھا کہ کپور صاحب نریندر لوتھر کے کمرے میں بیٹھے قہقہے لگا رہے ہیں۔ پہنچ کر جیسے ہی کرسی پر بیٹھا انھوں نے میرا ہاتھ کھینچ کر مجھے پھر کرسی سے گرادیا۔ پھر پوچھا "اتنی دیر کیوں کردی؟" بولا۔ آپ کے بھتیجے کو صبر کی تلقین کر رہا تھا۔" نریندر لوتھر کو ساری داستان سُنائی اور خود ہی اپنے آپ پر ہنستے رہے۔

کپور صاحب کی دو بڑی کمزوریوں کا میں نے اب تک ذکر نہیں کیا ہے۔ یہ دو کمزوریاں ہیں لاہور اور پطرس بخاری۔ یوں تو خود کپور صاحب کے ہزاروں شاگرد سارے پنجاب میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن جب اپنے استادِ محترم پطرس بخاری مرحوم کا ذکر کرتے ہیں تو نظریں نیچی کر کے "باادب با ملاحظہ ہوشیار" بن جاتے ہیں۔ اُس وقت اُن کے سارے وجود پر ایک "طالب علمانہ کیفیت" طاری ہو جاتی ہے۔ دروغ بر گردن راوی لاہور سے محبت کا یہ عالم ہے کہ رات کو کبھی لاہور کی طرف پیر کر کے نہیں سوتے کبھی کبھی حیرت ہوتی ہے کہ جب یہ لاہور میں تھے تو نہ جانے کس طرح سو جاتے تھے، سُنا ہے کہ ہوگا میں بھی لاہور کے ہی خواب دیکھتے ہیں۔ دلی کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ انارکلی کی ایک جھلک پر سینکڑوں کناٹ پلیس قربان کئے جا سکتے ہیں۔

کپور صاحب نے اردو طنز و مزاح کو کیا دیا ہے اس کا حساب کتاب تو ناقد کرتے رہیں گے۔ یہاں میں صرف اتنا کہوں گا کہ جب ہندوستان کی بہت سی زبانوں میں جدید سیاسی طنز کی داغ بیل بھی نہیں پڑی تھی تو تب کپور صاحب نے اردو میں "جدید سیاسی طنز" کے بے مثال نمونے پیش کیے تھے۔ کنھیا لال کپور سچ مچ اردو طنز نگاری کے قطب مینار ہیں۔ جب بھی میں قطب مینار کو دیکھتا ہوں تو دُعا کرتا ہوں کہ کپور صاحب ہمارے ادب میں یونہی سربلند و سرافراز رہیں۔

(اپریل ۱۹۷۸ء)

مُجتبیٰ حُسین

یونیسکو کی چھتری!

"وہ ہمیں ٹوکیو میں دوسرے دن مِلی اور ہم نے اسی دن اپنی بیوی کو خط لکھا۔" وہ ہمیں آج ملی ہے۔ دیکھنے میں کچھ خاص نہیں مگر پھر بھی اچھی ہے۔ اب ہمیں اسی کی رفاقت میں ٹوکیو کے شب و روز گذارنے ہیں۔ اسی کے سائے میں رہنا ہے؟" آٹھ دن بعد ہم اپنے ہوٹل میں گہری نیند سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ نیند سے جاگ کر فون کا ریسیور اٹھایا تو پتہ چلا کہ ہندوستان سے فون آیا ہے۔ دوسری طرف سے ہماری بیوی کی آواز آئی تو ہم نے بے ساختہ پوچھا "ہیلو کیسی ہو؟ خیریت سے تو ہونا؟"

ہماری بیوی نے کہا "میری خیریت جائے بھاڑ میں۔ پہلے یہ بتاؤ اس وقت کمرے میں اکیلے ہو یا وہ بھی تمہارے ساتھ ہے"۔ ہم نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا "وہ کون؟ میں تو کمرے میں اکیلا رہتا ہوں۔ کیسی باتیں کرتی ہو۔ میری غریب الوطنی کا تو لحاظ کرو۔ پھر ایسی باتیں کرنے کے لیے کئی سمندر پار سے فون ملانے کی کیا ضرورت ہے؟"

بولیں "یہ تمہاری آواز میں اتنا خمار کیوں ہے؟ ایک عجیب سی مستی کیوں ہے؟"

ہم نے کہا "رات کا ڈیڑھ بجا ہے۔ تمہارے فون کی گھنٹی پر جاگے ہیں۔ گہری نیند میں کیا اتنا خمار اور اتنی مستی بھی نہ آئے گی؟"

بولیں "بالکل غلط۔ اس وقت تو رات کے صرف دس ہی بجے ہیں"۔

ہم نے بات کو کاٹ کر کہا "ٹھیک ہے۔ ہندوستان میں دس بجے ہوں گے مگر یہاں تو رات کا ڈیڑھ بجا ہے"۔

بولیں "مجھے معلوم ہے کہ اب تمہارا وقت اور میرا وقت کبھی نہیں ملے گا۔ مجھے پہلے ہی شبہ تھا۔ تمہارے لہجہ کی سرشاری بتا رہی ہے کہ وہ چنڈال اب بھی تمہارے کمرے میں ہی ہے؟"

ہم نے غصہ سے کہا "یہ کیا مذاق ہے۔ تم کس چنڈال کا ذکر کر رہی ہو۔ جاپان میں کوئی چنڈال ونڈال نہیں رہتی"۔

بولیں "اب تو تم اُدھر ہی کے گن گاؤ گے۔ اسی لیے تو میں تمہارے جاپان جانے کی مخالف تھی۔ سچ بتاؤ وہ کون ہے جس کے بارے میں تم نے خود اپنے خط میں لکھا ہے کہ وہ تمہیں ٹوکیو میں دوسرے ہی دن مل گئی تھی دیکھنے میں کچھ خاص نہیں مگر پھر بھی اچھی ہے۔ اور یہ کہ اب تمہیں اسی کی رفاقت میں ٹوکیو کے شب و روز گذارنے ہیں"۔

ہم نے زوردار قہقہہ لگا کر کہا "تم سچ مچ بڑی بھولی ہو۔ لوکیو میں ہمیں دوسرے دن جو ملی وہ کوئی حسینہ نہیں بلکہ یونیسکو کی چھتری ہے۔ روانی میں شاید ہم چھتری لکھنا بھول گئے اور تم نے اس کا رشتہ عورت سے جوڑ لیا"۔

پوچھا "اچھا تو یہ چھتری ہے؟"

ہم نے کہا "اور کیا؟"

پوچھا "اچھا یہ بتاؤ۔ چھتری شادی شدہ ہے یا غیر شادی شدہ؟"

ہم نے کہا "بھلا چھتریوں کی بھی شادی ہوتی ہے؟"

بولیں "اس کا مطلب یہ ہوا کہ شادی شدہ نہیں ہے۔ یہ بتاؤ عمر کیا ہے؟"

ہم نے کہا "بڑی پرانی چھتری ہے۔ اس سے پہلے بھی کئی لوگ اسے استعمال کر چکے ہیں؟"

بولیں "اے ہے، کچھ تو اپنی عمر کا لحاظ کرو۔ اب تمہیں کون سی غیر مستعمل چیز ملے گی۔ مرد کی ذات ہی ایسی ہوتی ہے۔ رسی جل جاتی ہے پر بل نہیں جاتا۔" پھر اپنے لہجہ میں غمگینی اور رقت طاری کرتے ہوئے بولیں۔ "خدا کے لیے راہ راست پر آجاؤ۔ تمہاری اولاد اب شادی کے قابل ہو رہی ہے اور تمہیں اب بھی نئی نئی چھتریوں کی تلاش ہے"۔

ہم نے کہا "تمہارا الزام بالکل غلط ہے۔ یہاں ایسا کوئی سلسلہ نہیں ہے۔ میں نے اپنے خط میں جس کا ذکر کیا ہے وہ سچ مچ چھتری ہے۔ کہو تو تمہارے سر کی قسم کھاتا ہوں جسے میں نے ہمیشہ عزیز رکھا ہے"۔

بولیں "اچھا تو تم میرے سر کی عزت کرتے ہو تبھی تو میرے سر پر ایک نئی چھتری لا رہے ہو"۔

یہ کہہ کر ہماری بیوی نے دھڑ سے فون رکھ دیا اور ہندوستان سے تھوڑی دیر کے لیے اچانک جو ہمارا رشتہ قائم ہو گیا تھا وہ ٹوٹ گیا۔ نیند کوسوں دور بھاگ گئی۔ ہمیں ہندوستان چھوڑے ہوئے گیارہ دن ہو گئے تھے۔ کوفت ہوتی رہی کہ یونیسکو کی چھتری نے خواہ مخواہ گڑبڑ کر دی ورنہ ہمیں اپنی بیوی سے کتنی اہم اور ضروری باتیں کرنی تھیں۔ اپنے وطن عزیز کا حال پوچھنا تھا۔ یہ جاننا تھا کہ ہمارے بغیر ہندوستان کیسا لگ رہا ہے، کیا یہ اب بھی ترقی کر رہا ہے؟ ہمارے پیچھے سورج وقت پر طلوع ہو رہا ہے یا نہیں۔ ہمارے بغیر کہیں چاند کی روشنی ماند تو نہیں پڑ گئی۔ ان ضروری باتوں کے علاوہ کچھ غیر ضروری باتیں بھی کرنا تھیں۔ مثلاً ہمارے نکلتے وقت پکوان کی گیس ختم ہو گئی تھی۔ یہ آئی یا نہیں۔ ایک دوست کو مٹی کا تیل اکٹھا کر کے پہنچانے کے لیے کہا تھا یہ ملا یا نہیں۔ بجلی کٹنے والی تھی۔ کٹی یا نہیں۔ ہم جب چلے تھے تو آندھرا پردیش کے چیف منسٹر کا تقرر زیر تصفیہ تھا۔ اس کا تصفیہ ہو گیا یا ہماری واپسی کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ ایسی ہی کئی باتیں تھیں مگر یونیسکو کی چھتری نے ٹانگ اڑا دی۔ بیوی پر سخت غصہ بھی آیا کہ محترمہ کی اولاد شادی کے قابل ہو گئی ہے لیکن اب تک ہم پر شک کرنے کی عادت نہیں گئی۔ عورت کی ذات ہی ایسی ہوتی ہے۔ رسی جل جاتی ہے پر بل نہیں جاتا۔ اصل غصہ تو اس بات پر تھا کہ اس ٹرنک کال پر کم از کم سو روپے کا خرچ تو آ ہی جائے گا، جو بالآخر ہماری جیب سے ادا ہوگا۔

نیند اچٹ گئی تو بس اچٹتی ہی چلی گئی۔ گھڑی دیکھی تو تین بج رہے تھے۔ کمرے کی کھڑکی کھولی تو ٹوکیو کی سڑکوں کو بدستور مصروف پایا۔ کھڑکی سے نظر ہٹائی تو میز کے برابر رکھی ہوئی یونیسکو کی وہ چھتری نظر آ گئی جو فساد کی اصل جڑ تھی۔

دس دن پہلے ہم یونیسکو کے سمینار کے افتتاحی اجلاس میں پہونچے تھے تو یونیسکو کی عہدہ دار مس جو نے ہمیں کئی اور اشیاء دینے کے بعد کہا تھا "میں یہ چھتری بھی آپ کو سونپ رہی ہوں۔ ٹوکیو کا موسم بڑا غیر یقینی ہوتا ہے۔ کبھی بھی وقت بارش ہوسکتی ہے۔ اس چھتری کو ہمیشہ اپنے پاس رکھئیے۔ دیگر اشیاء تو اب آپ کی نجی ملکیت بن گئیں لیکن خیال رہے یہ چھتری یونیسکو کی ملکیت ہے۔ جب تک جاپان میں رہیں اسے اپنے پاس رکھئے اور جاتے ہوئے ہمیں واپس دے جائیے تاکہ یہ یونیسکو کے دیگر سمیناروں میں آنے والے مندوبین کے استعمال میں آسکے۔"

ہم نے مس جو کے ہاتھ سے چھتری کو لیتے ہوئے کہا "مس جو ہم نے ہمیشہ چھتری کے استعمال سے گریز کیا ہے۔ برسات تو ہمارے پاس بھی ہوتی ہے لیکن ہم بھیگنے کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں یا موقع پاتے ہی دوسرے کی چھتری کے نیچے گھس جاتے ہیں۔ غریب آدمی کی زندگی بہر طور گزر جاتی ہے۔ چھتری کو ہر جگہ اپنے ٹنگائے پھرنا ہمیں پسند نہیں۔ چھتری تو پھر چھتری ہے ہم تو اپنی بیوی کو بھی کبھی اپنے ساتھ لے جانے کے روادار نہیں ہیں۔"

مس جو نے ہنس کر کہا "۳۵ دن اس چھتری کو اپنے ساتھ رکھئیے۔ ہندوستان جانے کے بعد آپ شاید اپنی بیوی کو بھی چھتری کے نعم البدل کے طور پر رکھنے لگ جائیں گے عادت اور سنگت بڑی بُری چیز ہے۔"

ہم نے کہا "آگے کا حال ہم نہیں جانتے۔ چونکہ یہ یونیسکو کی ملکیت ہے اسی لیے اس چھتری کی حفاظت کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔ بیوی کی طرح نہیں محبوبہ کی طرح دل و جان سے عزیز رکھیں گے۔"

یہ پلاسٹک کی چھتری تھی جس کے مٹھ پر گم ٹیپ سے چپکا ہوا ہمارا نام تھا "مسٹر حسین انڈیا"۔ ہو بہو ایسی ہی چھتریاں سمینار کے دیگر مندوبین کے حوالے بھی کی گئیں تھیں۔ ہم اس چھتری کو لے کر کانفرنس روم میں آئے تو یوں لگا جیسے ہمارے پیروں تلے سے زمین نکل جارہی ہو۔ جاپان کے زلزلوں کے شہرۂ آفاق جھٹکوں سے یہ ہمارا پہلا واسطہ تھا۔ ہم چھتری چھوڑ کر بھاگنا چاہتے تھے کہ جاپانی دوست نے کہا "زلزلے کے ایسے جھٹکوں پر یہاں چھتری چھوڑ کر بھاگنا منع ہے۔ یہ تو روز کا معمول ہے کب تک آپ بھاگیں گے اور کہاں تک آپ بھاگیں گے۔" سمینار کے دیگر مندوبین بھی ہراساں تھے بلکہ سری لنکا کے مندوب مسٹر جیا کوڈی تو اتنے خوفزدہ ہوگئے کہ گھبراہٹ میں اچانک یونیسکو کی چھتری کھول کر کھڑے ہوگئے۔

زلزلے کا زور تھما تو ہم نے مس جو سے کہا "بی بی! ہمیں آسمان سے آنے والی بلاؤں سے بالکل ڈر نہیں لگتا۔ فلک کج رفتار سے یوں بھی ہماری پرانی آشنائی ہے۔ ہمیں کوئی ایسی چھتری دیجئے تو ہمیں زمین کے نیچے سے آنے والی بلاؤں سے محفوظ رکھ سکے۔ جاپان اتنا ترقی یافتہ ملک ہے۔ آپ نے ایسی چھتری ضرور ایجاد کی ہوگی۔"

وہ مسکرا کر چلی گئیں تو سری لنکا کے مسٹر جیا کوڈی تھر تھر کانپتے ہوئے ہمارے پاس آئے اور کہنے لگے "مسٹر حسین! میں کل ہی جاپان سے چلا جاؤں گا۔ مجھے ایسا دہلانے والا سمینار نہیں چاہیئے۔ اگر یہ روز کا معمول ہے تو میں یہاں بقیہ دن کیسے گزاروں گا۔ سری لنکا میں میرے دو چھوٹے اور معصوم بچے ہیں۔ ان کی ایک معصوم ماں بھی ہے۔ ان کا کیا ہوگا؟"

ہم نے کہا "مسٹر جیا کوڈی! آپ تو پھر بھی مزے میں ہیں۔ ہمارے تو چار بچے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ آپ کے بچوں کی طرح معصوم نہیں ہیں۔ ایک بیوی ہے جو اتفاق سے معصوم ہے اور پھر اوپر سے یہ یونیسکو کی چھتری بھی اب ہمارے سائے عاطفت میں چلی آئی ہے۔

صاحبو! ہم جاپان کو ذرا دلجمعی اور اطمینان کے ساتھ دیکھنا چاہتے تھے لیکن ہماری یہ خواہش محض اس لیے پوری نہیں ہوئی کہ یونیسکو کی چھتری ہمارے ساتھ تھی۔ محض اس چھتری کی خاطر ہمیں ایک ہی مقام کو دو دو مرتبہ دیکھنا پڑتا تھا۔

پہلی مرتبہ اس مقام کو دیکھنے جاتے تھے۔ جاپان ریڈیو بھی دو مرتبہ گئے۔ ایک مرتبہ اپنا انٹرویو ریکارڈ کرانے اور دوسری مرتبہ یونیسکو کی چھتری کو واپس لانے کے لیے جاپان کی زنانہ یونیورسٹی میں بھی دو مرتبہ گئے۔ ایک مرتبہ اپنا خیر مقدم کرانے کے لیے اور دوسری مرتبہ اپنی چھتری کو واپس لانے کے لیے۔ اگرچہ تھائی لینڈ کی مندوب مس پرینیا کا خیال تھا کہ ہم جان بوجھ کر زنانہ یونیورسٹی میں اپنی چھتری بھول آئے تھے تاکہ وہاں ایک بار اور جانے کا بہانہ ہاتھ آسکے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہماری بھول بھی بڑی سوچی سمجھی ہوتی ہے۔ خیر دنیا کی زبان کو کون روک سکتا ہے اور دنیا نے کب کس کا بھلا چاہا ہے۔ تاہم اتنا جانتے ہیں کہ زنانہ یونیورسٹی سے بھولی ہوئی چھتری کو واپس لانے کے لیے ہم جس قدر خوشی خوشی گئے تھے کہیں اور نہیں گئے۔ بلکہ دوسری مرتبہ بھی اس چھتری کو وہیں چھوڑے آرہے تھے۔ بُرا ہو یونیورسٹی کی عہدہ دار کا کہ ہمارے دبے پاؤں واپس جاتے وقت پکار کر کہا "مسٹر حسین! آپ جس چھتری کو لینے آئے ہیں اُسے پھر بھولے جارہے ہیں"۔ ہم نے با دلِ نخواستہ عہدیدار کا شکریہ ادا کیا اور راستہ بھر اُن کے تیز حافظے کو کوستے آئے۔ اس چھتری کو ہم کہاں کہاں بھولے اس کا حساب بتانا دشوار ہے۔ ہم اسے لے کر ہیروشیما گئے، ادمیا گئے، نارا گئے، کیوٹو گئے اور ہر جگہ اسے بھولے مگر یہ پھر بھی ہمیں واپس مل گئی۔ کیوٹو کی بالی ڈے ان ہوٹل کا کمرہ خالی کرکے ہم باہر نکل آئے۔ کچھ دیر بعد یاد آیا کہ ہماری چھتری تو ہالی ڈے ان میں ہی رہ گئی ہے۔ بھاگم بھاگ واپس گئے تو دیکھا کہ کمرے پر ایک نوجوان جوڑے نے قبضہ کرلیا ہے۔ نوجوانوں کی سرگرمیوں میں خلل ڈال کر اپنی چھتری واپس حاصل کی تو اس لطیفے کی صداقت پر ایمان لانا پڑا کہ ایک بزرگ ہماری ہی طرح اپنی چھتری ہالی ڈے ان کے ایک کمرے میں بھول کر چلے گئے۔ چھتری کو واپس حاصل کرنے کے لیے ہماری ہی طرح واپس آئے تو دیکھا کہ ہنی مون منانے کے لیے آئے ہوئے ایک نوجوان جوڑے نے ان کے سابقہ کمرے پر قبضہ کرلیا ہے۔ چونکہ ہم سے زیادہ سمجھدار تھے۔ اسی لیے کمرے کے دروازے پر کان رکھ کر اندازہ لگانے لگے کہ دیکھیں جوڑا کیا کررہا ہے۔ اس وقت لڑکا لڑکی سے پوچھ رہا تھا "ڈارلنگ! یہ گھنیری زلفیں کس کی ہیں؟"

لڑکی بولی "تمہاری ہیں"

"اور یہ ہرنی جیسی آنکھیں کس کی ہیں؟"

لڑکی بولی "یہ بھی تمہاری ہیں"۔

"اور یہ موتی جیسے دانت؟"

لڑکی بولی "یہ بھی تمہارے ہیں"

یہ مکالمہ سن کر بڑے میاں پریشان ہوگئے اور چیخ کر کہا "میاں برخوردار! جب معاملہ چھتری تک پہونچے تو خیال رہے کہ یہ تمہاری نہیں میری ہے"۔

صاحبو! اس چھتری سے ہمارے کمزور حافظے کا رشتہ کچھ اتنا استوار ہوگیا تھا کہ آدھی رات کو اچانک نیند سے جاگ کر اس چھتری کو تلاش کرتے تھے۔ جاپان میں سارے عام مقامات پر چھتریاں رکھنے کے اسٹینڈ ہوتے ہیں۔ چھتری کو اسٹینڈ میں رکھ کر مقفل کیجئے اور کنجی اپنے ساتھ لیتے جائیے۔ دو مرتبہ ہم چھتری کو اسٹینڈ پر رکھ کر نہیں بھولے مگر جب اسے حاصل کرنے کے لیے پہونچے تو پتہ چلا کہ ہم چھتری کے اسٹینڈ کی کنجی بھول گئے ہیں۔ کنجی کو نہ ملنا تھا نہ ملی بیچارے اسٹینڈ والے کو فاضل کنجی کا سہارا لینا پڑا۔ غرض اس چھتری نے ہمیں جاپان میں جگہ جگہ رسوا کیا۔ کسی مقام کی سیر کرکے واپس جانے کے لیے یونیسکو کی بس میں بیٹھتے تو اچانک ہمیں چھتری کی یاد آجاتی تھی اور ہم اسے لینے کو بس سے کود پڑتے

تھے۔ ایک پبلشنگ کمپنی کا معائنہ کرنے کے بعد ہم بس میں واپس چلے آئے اور معمول کے مطابق پھر چھتری کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ آدھے گھنٹے کی تلاش کے بعد مایوس ہو کر بس میں خالی ہاتھ لوٹے تو دیکھا کہ چھتری ہماری نشست پر آرام کر رہی ہے۔ بس ڈرائیور کو بھی ہماری عادت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ بس چلانے سے پہلے پوچھتا تھا "کیا مسٹر حسین کی چھتری بس میں آگئی ہے؟" اثبات میں جواب ملتا تو کہتا "اس کا مطلب یہ ہوا کہ سارے مندوبین بس میں آچکے ہیں۔"

عوام الناس کی اطلاع کے لیے ہم یہ عرض کرتے چلیں کہ جاپان میں قیام کے دوران میں ہمیں صرف دو منٹ کے لیے اس چھتری کو استعمال کرنے کا موقع ملا تھا۔ غالباً ٹوکیو میں ہماری آمد کا ہی فیض تھا کہ موسم اچانک خوشگوار ہو گیا تھا جاپانی بھی حیران تھے کہ آخر موسم کو کیا ہو گیا ہے۔ ہم ان پر اس راز کو فاش نہیں کرنا چاہتے تھے کہ موسم کی یہ خوشگواری ہماری دین ہے ورنہ وہ ہمیں وہیں روک لیتے۔

ایک دن ذرا سی بوندا باندی ہوئی تو ہم نے کہا چلو آج اس چھتری کو استعمال کر کے دیکھ لیتے ہیں۔ مگر وہ تھی جاپانی چھتری۔ ہم سے کھلنے کا نام نہ لیتی تھی ایک جاپانی کی خدمات حاصل کر کے چھتری کھلوائی۔ مگر ادھر چھتری کھلی اور ادھر برسات رُک گئی۔ چار و ناچار دوسرے جاپانی کی خدمات حاصل کر کے چھتری بند کروائی۔

جب اس چھتری کے دوبارہ حصول کے پیچھے ٹیکسیوں اور ٹرینوں میں خاصی رقم خرچ کر چکے اور جاپان کو چھوڑنے میں صرف آٹھ دن باقی رہ گئے تو ایک دن ہم نے چھتریوں کی ایک دکان پر اس چھتری کی قیمت پوچھی پتہ چلا ایک ہزار ین کی ہے۔ اس کے بعد ہم نے اس رقم کو جوڑا جو ہماری غائب دماغی کے باعث اس چھتری پر خرچ ہوئی تھی۔ معلوم ہوا کہ جملہ پانچ ہزار ین خرچ ہوئے ہیں۔ واضح رہے کہ اس رقم میں ٹرنک کال کا سو روپے کا بل بھی شامل ہے جو ہماری بیوی نے اس چھتری سے گھبرا کر ہمیں کیا تھا۔ آدمی کو حساب کتاب کے معاملے میں ایماندار رہنا چاہیئے۔

جب سمینار ختم ہوا تو وداعی تقریب کے بعد ہم نے سینہ تان کر بڑے فخر کے ساتھ اس چھتری کو مس جو کے حوالے کیا بلکہ جوش جنوں میں فارسی میں یہاں تک کہہ دیا کہ "سپردم بتو مایہ خویش را"۔

مس جو نے ہنس کر کہا "مسٹر حسین! اب تو آپ ہندوستان جا کر اپنی بیوی کو بھی اسی طرح ساتھ رکھیں گے جس طرح یہاں چھتری کو رکھا کرتے تھے۔"

ہم نے کہا "مس جو! اس چھتری کی وجہ سے اب تو ہمیں سچ مچ کسی کو ساتھ رکھنے کی عادت ہو گئی ہے ہم تو کہتے ہیں کہ اس چھتری نے جاپان میں ہمیں اپنی بیوی کی عدم موجودگی کا احساس نہ ہونے دیا۔ یہ اب چھتری نہیں سچ مچ ہماری بیوی بن گئی ہے۔ ذرا دیکھیے تو سہی کہ ہم نے اسے کتنا استعمال کیا ہے۔ ۳۵ دن میں صرف ایکبار۔"

مس جو نے ہنستے ہنستے اس چھتری کے مٹھ پر سے گم ٹیپ کو چھیلا اور ہمارا نام نکال دیا۔ ہمارے دل پر ایک بجلی سی گری۔ تڑپ کر بولے "مس جو! اس چھتری پر سے ہمارا نام ذرا آہستہ نکالیے۔ دل پر چوٹیں سی پڑ رہی ہیں۔" اتنا کہنے کے بعد نہ جانے کیوں ہماری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

ہمیں ٹوکیو سے ہندوستان واپس آئے ۲۵ دن بیت چکے ہیں لیکن یہ چھتری اب بھی ہمارے ذہن میں کھٹ سے کھل جاتی ہے اگرچہ ہم اسے کھولنا نہیں چاہتے تھے۔ خدا جانے کون اس چھتری کو ہمارے ذہن میں کھول دیتا ہے۔ یہ چھتری، جو ٹوکیو کے بازاروں میں ہمارے ساتھ رہتی تھی۔ یہ چھتری جس کی مدد سے ہم ٹوکیو کا ناکے

کی ریت پر نہ جانے کیا کیا شکلیں بنائی تھیں، ماؤنٹ فیوجی کے دامن میں یہ ہماری رفیق تھی۔ جاپان کے دیہاتوں کی گرد اس پر جمی تھی۔ نارا کے پگوڈوں میں یہ ہماری ہمرکاب تھی، کیوٹو کے گیشا گھروں میں یہ ایک چشم دید گواہ کے طور پر ہمارے ساتھ تھی! اس چھتری پگوڈوں کے سائے میں اب تک جوان یادیں پل رہی ہیں۔ ہمیں یوں لگتا ہے جیسے ہم جان بوجھ کر اس چھتری کو ٹوکیو میں بھول آئے ہیں کہ اسے لینے کے بہانے پھر ٹوکیو جا سکیں تاکہ جذبوں کے سلسلے پھر جوڑیں، یادوں کی کڑیاں پھر ملائیں، لمحوں کے موتی پھر پرو دیں، ارمانوں کے دھاگوں سے پھر نئی نئی داستانیں بنیں۔

اے یونیسکو کی چھتری! ہماری ہمدم ہماری رفیق۔ اداس نہ ہونا۔ ہم تجھے دوبارہ حاصل کرنے کے لیے پھر آئیں گے۔ ہماری راہوں میں آنکھیں بچھائے رکھنا۔ کیا عجب کہ اب کی بار ہم بادل بن کر تجھ پر برسنے آجائیں۔

مُجتبیٰ حسین

خموشی گفتگو ہے!

شاعر نے کہا ہے ؎ عزت اسے ملی جو وطن سے نکل گیا۔ ہم جب بھی اس مصرعے کو پڑھتے تھے تو سوچتے تھے کہ شاعر کا کام دل کے پھپھولے پھوڑنا ہے۔ وطن میں لوگوں نے شاعر کے کلام پر داد نہ دی اور بجا طور پر نہ دی تو وطن کے خلاف ہی شعر لکھ مارا۔ ہم نے اس مصرعے کو شاعر کے دل کا جلنا سمجھ کر کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی۔ مگر جب جاپان گئے تو احساس ہوا کہ اس مصرعے میں اور کچھ ہو یا نہ ہو صداقت ضرور ہے۔ (۱) لیکن جب سے جاپان آئے ہیں ہم مصوری، آرٹ اور کلچر کے بہت بڑے پارکھ اور ناقد سمجھے جانے لگے ہیں۔ وطن میں کوئی آرٹسٹ ہمیں منہ نہیں لگاتا۔ دس گز دُور رکھتا ہے۔ کہنے کو مقبول فدا حسین جیسے آرٹسٹ سے دوستی ہے بلکہ ان پر ایک عدد خاکہ بھی لکھا ہے مگر اُنھوں نے کبھی ہمیں اس قابل نہیں سمجھا کہ اپنے آرٹ کے بارے میں ہم سے بات کریں۔ مگر جاپان آتے ہی ہمارا نقشہ بدل گیا ہے۔ اب آرٹسٹ لوگ ہمارے آگے پیچھے گھومتے ہیں۔ اپنی پینٹنگس دکھاتے ہیں اور اپنے آرٹ کے بارے میں ہماری قیمتی رائے کو جاننے کے لیے بے تاب رہتے ہیں۔ ہمیں بھی اپنی رائے کے قیمتی ہونے کا اندازہ ہے جبھی تو کسی کو کوئی رائے نہیں دی ہے۔ سب سے کہہ رکھا ہے کہ وطن واپس جاکر آپ کے بارے میں رائے لکھ بھیجیں گے۔

وطن والو! تمھیں اس اطلاع سے دکھ ہوگا کہ تم نے جس کے آگے گھاس نہیں ڈالی وہ جاپان پہنچ کر آرٹ کا بڑا ناقد بن گیا۔ اصل میں خدا جب کسی کو کچھ بنانا چاہتا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے 'بلنے' سے روک نہیں سکتی۔ قصہ صرف اتنا ہے کہ جب ہم جاپان جانے لگے تو ہمارے ایک دوست نے جو انگریزی میں آرٹ کے بہت بڑے ناقد سمجھے جاتے ہیں ہم سے خواہش کی کہ ہم جاپان سے ان کے لیے جاپان کے بعض مشہور آرٹسٹوں کی پینٹنگس کے پرنٹس لیتے آئیں! انھوں نے ہماری سہولت کے لیے جاپانی آرٹسٹوں کے نام اور ان کی پینٹنگس کے عنوانات بھی لکھ دیئے تھے۔ جاپان کے ایک مشہور آرٹسٹ تائی کیان کے بارے میں یہ بھی بتا دیا تھا کہ موصوف ہندوستان آئے تھے اور رابندر ناتھ ٹیگور سے ان کی دوستی تھی۔ ہمیں کیا پتہ تھا کہ ان پینٹنگس کے پرنٹس کو حاصل کرنے کی کوشش میں ہم ایک دن آرٹ کے ناقد اور قدر داں بن جائیں گے۔

ہم نے جاپان پہونچتے ہی یونیسکو کے عہدیداروں کو جاپانی آرٹسٹوں کے نام معہ ان کی پینٹنگس کے عنوانات

سنانے شروع کردیئے۔ یہ بھی کہا کہ ہمیں ان کے پرنٹس ہر حالت میں چاہئیں۔ ہم نے یہ چالاکی ضرور کی کہ انہیں یہ بتایا کہ ان پرنٹس کی ضرورت ہمارے ایک دوست کو ہے۔ جاپانی بے چارے سیدھے سادے ہوتے ہیں۔ دوسرے کی بات پر بھروسہ کر لیتے ہیں۔ انھوں نے یہ سمجھا کہ ہم آرٹ کے اور وہ بھی جاپانی آرٹ کے بڑے قدرداں ہیں۔ ہماری شہرت جاپانی آرٹسٹوں میں پھیلی اور وہ ہمارے قدرداں بن گئے اور ہم نے ان کی قدردانی کے خوب مزے لوٹے۔

ہم جاپان کے سائتما ضلع کے ایک گاؤں متاسی رونزانگ میں پہونچے تو ایک جاپانی دوست نے ہمیں یہ مژدہ سنایا کہ جاپان کا مشہور آرٹسٹ جوڑا ماروکی ایڈی اور ماروکی توشی یہیں پاس میں رہتے ہیں۔ ان کی پینٹنگس کا میوزیم بھی یہیں ہے۔ ماروکی ایڈی اور ماروکی توشی دونوں میاں بیوی ہیں۔ دونوں آرٹسٹ ہیں اور دونوں نے زندگی بھر ہیروشیما کی بربادی کو پینٹ کیا ہے۔ ہمیں جب یہ اطلاع ملی تو ہم نے فوراً کہا کہ ہم یہ میوزیم دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہمیں وہاں لیجایا گیا اور ہیروشیما کی تباہی کی پینٹنگس کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ آپ سے کیا بتائیں کہ ہمارے دل پر کیا گزری۔ ایک ایک پینٹنگ کو دیکھتے تھے تو کلیجہ منہ کو آجاتا تھا۔ مسٹر ماروکی اب ۸۰ برس کے اور مسز ماروکی ۷۰ برس کی ہو گئی ہیں۔ ۶ اگست ۱۹۴۵ء کو جب ہیروشیما پر بم گرایا گیا تو دونوں میاں بیوی ٹوکیو میں تھے۔ بم گرنے کے تیسرے دن یہ پہلی ٹرین سے ہیروشیما گئے جو اُن کا آبائی شہر ہے۔ وہاں جو بربادی دیکھی تو فیصلہ کیا کہ زندگی بھر ہیروشیما کی تباہی کی تصویریں بناتے رہیں گے اسی میوزیم کے برابر ان دونوں آرٹسٹوں کی رہائش گاہ بھی ہے۔ اگرچہ یہ میوزیم ایک دیہات میں واقع ہے مگر لوگ ہیں کہ اسے دیکھنے کے لیے دھڑا دھڑ آتے ہیں۔ ہم بھی بڑی دیر تک اس میوزیم میں لگی تصویروں کے آگے اپنے سر کو ہلا ہلا کر داد دیتے رہے۔ داد دینے سے فرصت ملی تو ہم نے کہا کہ ہم ان آرٹسٹوں سے ملنا چاہتے ہیں۔ آرٹسٹوں کو خبر بھجوائی گئی کہ آرٹ کا ایک مشہور ہندوستانی ناقد آپ سے ملنا چاہتا ہے مسز ماروکی گھر پر موجود تھیں۔ فوراً اپنے گھر کے اندر بلایا۔ بڑی عزت سے بٹھایا۔ ہم نے ان کی تصویروں کی تعریف کی۔ یہ بھی کہا کہ آپ کی تصویریں دیکھنے کے بعد ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اب ہیروشیما دیکھنے نہیں جائیں گے (ویسے بھی ہمارے دورے میں ہیروشیما جانے کا کوئی پروگرام نہیں تھا)۔ ہم نے یہ بھی کہا کہ اب زندگی بھر عالمی امن کے لیے کام کرتے رہیں گے۔ وہ بہت خوش ہوئیں اور بولیں " جنگ کی بربادی کے خلاف ہماری یہ ادنیٰ سی کوشش ہے۔ ہیروشیما پر ایٹم بم کے گرنے سے دو لاکھ ساٹھ ہزار آدمی مرے تھے مگر ہم اتنی بڑی ٹریجیڈی پر صرف نو سو تصویریں ہی بنا سکے ہیں۔ اصولاً ہر مرنے والے کی ایک ایک تصویر ہونی چاہیئے تھی؟ ماروکی جوڑا ہندوستان بھی آچکا ہے۔ دونوں ہندوستان سے محبت کرتے ہیں۔ ان کے کمرے میں ایک دریا کی تصویر بھی لگی تھی۔ پوچھا "کیا آپ اس دریا کو پہچانتے ہیں"؟ تصویر دیکھی تو چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ یہ کسی بھی دریا کی تصویر ہو سکتی ہے۔ ہم بھلے ہی آرٹ کے ناقد نہ ہوں چالاک ضرور ہیں ہم نے کہا " ہمیں تو یہ گنگا دکھائی دیتی ہے"۔ بولیں "آپ نے بالکل ٹھیک پہچانا۔ گنگا کی شان نرالی ہے۔ اس کی سج دھج ہی الگ ہے۔ میں گنگا کو امن کی علامت سمجھتی ہوں"۔

مسز ماروکی نے بڑی آؤ بھگت کی۔ دو گھنٹے اپنے پاس بٹھایا۔ بعض ہندوستانی آرٹسٹوں کی خیریت پوچھی۔ ہم نے مسز ماروکی کو نہ صرف ان آرٹسٹوں کی خیریت کی اطلاع دی بلکہ یہ بھی کہا کہ انھوں نے آپ کو سلام پہونچانے کے لیے کہا ہے۔ مسز ماروکی نے اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پلائی۔ ہم جانے لگے تو مسز ماروکی کی آنکھوں میں محبت اور شفقت کے آنسو تھے۔ بولیں " بہت جلد پھر کہیں نہ کہیں آپ سے ملاقات ہوگی۔ اپنے افسانوں میں ہمیں محفوظ رکھنا " اتنا

سُننا تھا کہ ہماری آنکھوں میں بھی عقیدت کے آنسو نکل آئے۔ اس جاپانی دیہات کی وہ شام ہمیں اب تک یاد ہے۔ ہیروشیما کی تباہی کی تصویریں بار بار آنکھوں کے آگے گھومتی رہیں۔ یوں لگا جیسے ہیروشیما میں مرنے والے سب کے سب ہمارے رشتہ دار تھے۔ اس رات ہم کتنی دیر تک نہ سو سکے۔ گمان ہونے لگا کہ کہیں ہم سچ مچ آرٹ کے ناقد تو نہیں بن گئے۔

آرٹ سے ہماری دلچسپی کی اطلاع جاپان میں پھیلی تو دوسرے آرٹسٹ بھی ہم سے ملنے کے لیے بے چین ہونے لگے۔ ایک ڈنر میں جاپان کے ایک مشہور مصور مسٹر وکاتا ایک مترجم کے ہمراہ ہم سے ملنے کے لیے آئے۔ ہم سے کہا کہ اگر ہم ان کے گھر ایک دن قیام فرمائیں اور ان کی تصویروں کو دیکھیں تو یہ بات ان کے لیے باعثِ فخر ہوگی۔ ہم نے جھوٹ موٹ ہی اپنی مصروفیات کا ذکر کیا اور کہا کہ ہمیں اور بھی کئی آرٹسٹوں سے ملنا ہے۔ وقت بہت کم ہے۔ پھر بھی آپ چونکہ خاص طور پر آئے ہیں اسی لیے ضرور آئیں گے۔ معلوم ہوا کہ موصوف ٹوکیو سے (۰۷) کیلو میٹر دور اومیا نام کے شہر میں رہتے ہیں۔ طے یہ ہوا کہ ہم اتوار کو ٹرین سے اومیا پہونچتے ہیں اور وہ اسٹیشن کے مشرقی دروازے پر ہمارے منتظر رہیں۔ سو ایک اتوار کو ہم مسٹر وکاتا سے ملنے کے لیے اومیا چلے گئے۔

مسٹر وکاتا چونکہ ہم سے ایک مترجم کی مدد سے ملے تھے۔ اسی لیے ہم نے سوچا تھا کہ ہم سے تبادلۂ خیال کرنے اور آرٹ کے بارے میں ہمارے زرّین خیالات کو جاننے کے لیے وہ مترجم کا بندوبست ضرور کریں گے۔ پھر اس معاملہ میں غرض ان کی تھی۔ لہٰذا ہم اپنی مترجم کو ساتھ نہیں لے گئے۔ اومیا پہونچے تو مسٹر وکاتا اپنے بال بچوں سمیت دو موٹروں میں ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ بہت خوش ہوئے۔ پھر اشارے سے پوچھا "آپ کی مترجم؟" ہم نے بھی اشارہ سے پوچھا "اور آپ کی مترجم؟" پتہ چلا کہ انھوں نے محض اس خوش فہمی میں کہ ہم اپنی مترجم کو ساتھ لیتے آئیں گے۔ اپنے طور پر مترجم کا بندوبست نہیں کیا ہے۔ اب وہ جاپانی میں ہم سے کچھ کہتے تھے اور ہم انگریزی میں ان سے نہ جانے کیا کہتے تھے۔ مسٹر وکاتا انگریزی کا ایک ہی جملہ جانتے تھے اور وہ تھا 'تھینک یو' خیر ہم ان کی انگریزی کے مقابلے زیادہ جاپانی جانتے تھے۔ کیونکہ ہم جاپانی کے پانچ چھ جملے جانتے تھے۔ ہاتھوں کے اشارے سے وہ ہمیں کچھ کہتے تھے اور ہم بھی ہاتھوں کے اشارے سے ان کا جواب دیتے تھے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ ہمیں 'مسکری آرٹسٹ' بننے کا شرف حاصل ہوا۔ ہم نے سوچ لیا کہ اب پورا ایک دن ہماری خموشی گفتگو اور بے زبانی زبان بن جائے گی۔

مسٹر وکاتا نے اشاروں سے اپنے ارکان خاندان کا تعارف کرایا۔ اشاروں میں رشتوں کا اظہار بہت مشکل ہوتا ہے۔ لہٰذا بڑی دیر تک ان کی بیٹی کو ان کی بیوی اور بیوی کو موصوف کی والدہ سمجھتے رہے۔ زبان کی دشواری کو محسوس کر کے مسٹر وکاتا نے اپنی ایک دوست کو فون کیا جن کے بارے میں مسٹر وکاتا کو یہ خوش فہمی تھی کہ وہ انگریزی جانتی ہیں۔ وہ آئیں تو مسٹر وکاتا بہت خوش ہوئے۔ ان سے جاپانی میں کچھ کہا اور خواہش کی کہ وہ ان کی بات ہم تک انگریزی میں پہونچادیں۔ انھوں نے پوری صدق دلی کے ساتھ انگریزی میں مسٹر وکاتا کی بات ہم تک پہنچانے کی کوشش کی مگر ان کی انگریزی اتنی اعلیٰ معیار کی تھی کہ ہم ان کی انگریزی تک اپنی سمجھ کو نہ پہونچا سکے۔ مسٹر وکاتا کی دوست کی انگریزی کی ایک مثال ہم پیش کرنا چاہیں گے۔ ایک مرحلہ پر انھوں نے ہم سے پوچھا۔ MR HUSSAINI ARE YOU A BIG MAN IN YOUR COUNTRY. کیا آپ اپنے ملک کے بڑے آدمی ہیں۔

ہم نے حسبِ استطاعت ان کے سوال کو سمجھ کر پوچھا "ہم نے آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا، اگر بڑے آدمی ہونے سے آپ کا مطلب مالدار آدمی ہونے سے ہے تو ہم قطعاً بڑے آدمی نہیں ہیں۔ صرف دو ہزار روپے ماہوار تنخواہ پاتے ہیں۔ اگر بڑے آدمی سے آپ کا مطلب بڑا ادیب ہونے سے ہے تو بے شک ہم اپنے ملک کے بڑے ادیب ہیں۔ یوں بھی ہمارے ملک میں کوئی چھوٹا ادیب پیدا ہی نہیں ہوتا۔

مسٹر دکاتا کی دوست کچھ دیر سوچتی رہیں۔ اپنے ذہن میں انگریزی جملوں کی صف بندی کرتی رہیں پھر اپنے ہاتھ کو آسمان کی طرف اٹھا کر بولیں۔ I WANT TO KNOW WHETHER,

ALL INDIANS ARE MULTI- STOREYED LIKE YOU?

(کیا سارے ہندوستانی آپ کی طرح کئی منزلہ ہوتے ہیں)۔

تب ہمیں احساس ہوا کہ موصوفہ ہمارے لمبے قد کے حوالے سے یہ جاننا چاہتی ہیں کہ کیا سارے ہندوستانی ہم جیسے لمبے ہوتے ہیں۔ ایسے میں ہم نے جواب دیا NO MADAM SOME OF THE BUILDINGS ARE TALLER THAN ME

جب مسٹر دکاتا کو احساس ہوا کہ ان کی دوست بھی اتنی ہی انگریزی جانتی ہے جتنی کہ ہم جاپانی تو وہ زبان کی طرف سے مایوس ہو گئے اور سچ مچ آرٹسٹ بن گئے۔ اب انہوں نے ہم پر اپنی محبت نچھاور کرنی شروع کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے خاندان نے جاپان کا روایتی لباس کیمونو پہنا اور ہمیں پکڑ کر ایک خاص کمرے میں لے گئے۔ پتہ چلا اب چائے پینے کی تقریب ہوگی۔ مسٹر دکاتا نے اس ساری تقریب کو فلمانے کا پروگرام بنایا اور کیمرہ چلا دیا۔ جاپانیوں کے ہاں چائے کی تقریب (TEA - CEREMONY) کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس تقریب کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کی عزت کرنا سیکھیں۔ ایک خاتون نے چائے بنانے اور اسے پیش کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ چائے پیش کرنے والی ایک خاص ادا سے آپ کے سامنے چائے کا پیالہ رکھتی ہے اور زمین بوس ہو جاتی ہے جس کو چائے پیش کی جا رہی ہو اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ مودبانہ بیٹھا رہے اور چائے پیش کرنے والی کے سامنے تعظیماً جھکتا رہے۔ چائے کی تقریب میں شرکت کرنے والے اور چائے پینے کے خاص آداب ہوتے ہیں جن سے ٹانگوں میں خاصا درد ہوتا ہے ایک ہی پوز میں گھٹنوں بیٹھ کر اور اپنی ٹانگوں کو خاصی تکلیف دے کر ہم نے یہ آداب سیکھ لیے تھے۔

ہمیں مسٹر دکاتا کا گھر بہت عالیشان دکھائی دیا۔ جاپانی گھر بہت چھوٹے ہوتے ہیں لیکن یہ گھر کافی وسیع اور کشادہ تھا۔ گھر کے ہر گوشے سے ٹپکتا تھا کہ ایک آرٹسٹ کا گھر ہے۔ چائے کی تقریب کے بعد مسٹر دکاتا ہمیں اپنے اسٹوڈیو میں لے گئے اور ایک کے بعد ایک پینٹنگ ہمارے سامنے رکھنے لگے۔ جس محبت کے ساتھ وہ پینٹنگوں کو ہمارے سامنے رکھتے تھے اُس سے اُن کا خلوص ٹپکتا تھا۔ ان کی کئی پینٹنگس کو دیکھنے کے بعد ہم نے اُن کی دوست سے کہا "مسٹر دکاتا کی خوبی یہ ہے کہ وہ انسانی آنکھ کو ایک نئے ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں۔ ہر تصویر میں آنکھوں کا زاویہ مختلف ہوتا ہے اور ان کی ادا الگ ہوتی ہے"۔ ہماری رائے کو جاپانی میں سن کر مسٹر دکاتا بھڑک اُٹھے اور اپنی دوست کی معرفت جواب دیا "مجھے بڑی خوشی ہے کہ آپ نے میری مصوری کی روح کو پہچان لیا ہے"۔ اس دن پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اگر ہم آرٹ کے ناقد بننا چاہیں تو بن سکتے ہیں۔

مسٹر دکاتا کی پینٹنگس کے ذریعے اپنی نظروں کو سرور عطا کر کے ہم ڈرائنگ روم میں واپس آئے تو ان

کا سارا خاندان ہمارا منتظر تھا۔ ہم ابھی بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ پانچ سال کی ایک چھوٹی سی لڑکی نے ہمیں کاغذ سے بنا ہوا ایک سارس دیا۔ پتہ چلا اس لڑکی نے ہمارے لیے بطور خاص بنایا ہے۔ ہم نے اس کے گال تھپتھپائے تو وہ کاغذ لے کر ایک اور سارس بنانے میں مصروف ہو گئی۔ ہم چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کی فنکاری میں گم ہو گئے۔ اتنی چھوٹی سی لڑکی اور ہاتھ کی یہ صفائی۔ مسٹر وکاتا کا سارا خاندان فنکاروں کا خاندان ہے۔ بیوی مجسمے بناتی ہیں، نواسی کاغذ کے پرندے بناتی ہے۔ لڑکا بھی تصویریں بناتا ہے۔

ہم نے پورا ایک دن زبان کو زحمت دیئے بغیر مسٹر وکاتا کے گھر گزار دیا۔ اس دن ایک عجیب و غریب احساس یہ ہوا کہ بعض صورتوں میں زبان ترسیل کا ذریعہ نہیں ترسیل میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔

مسٹر وکاتا نے رنگوں اور خطوط کی زبان کے ذریعہ ہم سے اتنا کچھ کہہ دیا تھا کہ اگر ہم جواب میں اپنی زبان کا استعمال کرتے تو وہ لڑکھڑا جاتی۔

ہم جانے لگے تو مسٹر وکاتا اپنے پورے ارکان خاندان کے ساتھ ہمیں چھوڑنے کے لیے اومیا اسٹیشن پر آئے۔ انھوں نے صرف "تھینک یو" کہا کیونکہ وہ اتنی ہی انگریزی جانتے تھے اور ہم نے صرف "دوموآری گاتو گزائی مس" کہا کیونکہ ہم اتنی ہی جاپانی جانتے تھے۔ ان کی نواسی کچھ نہیں جانتی تھی۔ سو ہم جانے لگے تو اس نے دوڑ کر کاغذ سے بنا ہوا ایک اور خوبصورت سارس ہمارے حوالے کر دیا۔ یہ سارس اب بھی ہمارے پاس محفوظ ہے ہم جب بھی اس سارس کو دیکھتے ہیں تو لگتا ہے اس کے سامنے دنیا کی ساری زبانیں ہیچ ہیں۔ اس سارس میں معنی و مفہوم کے جتنے پہلو چھپے ہوئے ہیں ان کا احاطہ کرنے کی سکت دنیا کی کسی زبان میں نہیں ہے۔ یہ سارس اب اپنے پنکھ کھولے سدا ہماری یادوں میں اڑتا پھرتا ہے۔ ■ ■

ایک روز تو ان کتب فروش صاحب نے کمال ہی کر دیا۔ جب ایک صاحب نے ان سے غالب کی کوئی غزل سنانے کی خواہش کی تو کہنے لگے "غالب کی ایک عدد تازہ غزل ہوئی ہے۔ کہیے تو سناؤں"۔ پھر غالب کے تخلص ثانی کو بطور ردیف استعمال کر کے غالب کی غزل یوں سنانے لگے۔

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
ہستی ہے مت قریب میں آ جائیو اسد
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد
بیداد عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسد
دل دیا جان کے کیوں اسکو وفادار اسد
مرگیا صدمۂ یک جنبش لب سے غالب
تاریخ کاوش غم ہجراں ہوا اسد

مجتبیٰ حسین ۔ ہم طرفدار ہیں غالب کے، سخن فہم نہیں

تکلف برطرف

مجتبیٰ حسین

لندن میں ہمیں دفن کرنے کی تیاریاں

صاحبو! کون کہتا ہے کہ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں یہ سب جھوٹ ہے، فریب ہے، تین سال پہلے لوکیو جاتے وقت ہماری زندگی کے تقریباً چار گھنٹے ہمارے ہاتھ سے نکل گئے تھے رات کے تین بجے دہلی سے چلے تھے تو ایک گھنٹہ بعد مرغ کی بانگ تو سنائی نہیں دی تھی البتہ سورج سمندر میں سے نکل آیا تھا۔ ہماری گھڑی میں بھارت کے دن کا ڈیڑھ بجا تھا مگر ٹوکیو پہنچتے پہنچتے اندھیرا ہو گیا تھا اس وقت سے ہمیں اپنی عمر عزیز کے چار قیمتی گھنٹوں کے ضائع ہونے کا قلق تھا اب تین سال بعد لندن گئے تو ہمیں اپنا یہ کھویا ہوا وقت واپس مل گیا ہم صبح ۹ بجے دہلی سے چلے تھے شارجہ میں کچھ دیر رک کر دمشق پہنچے تو سورج تب بھی سوا نیزے پر تھا دمشق سے میونخ کی طرف روانہ ہوئے تو تب بھی سورج آن بان کے ساتھ چمک رہا تھا بلکہ میونخ کے آتے آتے تو عجب سماں تھا بے چارہ سورج غروب ہونے کے لئے بے چین تھا اور ہمارا طیارہ اسے "شرفِ غروبیت" عطا کرنا نہیں چاہتا تھا بڑی دیر تک سورج اور طیارہ میں آنکھ مچولی رہی۔ مگر سورج بالآخر سورج ہے۔

ہمارا طیارہ میونخ کے ہوائی اڈے پر اترا تو سورج نے اطمینان کا لمبا سانس لیا اور غڑاپ سے غروب ہو گیا پھر جب ہم میونخ سے چل کر لندن کے ہوائی اڈے پر اترے تو ہماری گھڑی میں بھارتی وقت کے مطابق رات کا ڈیڑھ بجا تھا اور لندن کی گھڑیوں کو ابھی رات کے نو بجانے کی بھی توفیق نہیں ہوئی تھی تین سال بعد ہمیں اپنا کھویا ہوا وقت نہ صرف واپس مل گیا بلکہ لفظ میں ایک گھنٹہ بھی مل گیا اب ہم ان فالتو پانچ گھنٹوں میں اردو کی کچھ اور بھی خدمت کریں گے اردو والے ہوشیار ہو جائیں

لندن کے ہیتھرو ایرپورٹ پر اترنے سے پہلے ہم پر یوں بھی عجیب سی ہیبت طاری تھی کیونکہ ہم اس ملک میں قدم رنجہ فرما رہے تھے جہاں کے شیکسپیئر، ورڈز ورتھ، بائرن، شیلے، کیٹس، ڈکنس برنارڈ شا، اور بہت سے دوسرے ادیب جن کے نام ہمیں فی الحال یاد نہیں آ رہے کی دھاک ہم پر بچپن سے بیٹھی ہوئی ہے شخصیت جب ملک سے بڑی ہو جاتی ہے تو ملک بھی خواہ مخواہ بڑا نظر آنے لگتا ہے ہیتھرو کے صاف ستھرے ایرپورٹ پر اتر کر ہم امیگریشن کی لائن میں جا کھڑے ہوئے ہم سے اگلے مسافروں سے طرح طرح کے سوالات پوچھے جا رہے تھے کہ لندن کیوں آ رہے ہو؟ کسی اور جگہ کیوں نہیں گئے؟ کب تک قیام کا ارادہ ہے؟ لندن میں قیام کے اخراجات کون بے وقوف برداشت کر رہا ہے وغیرہ وغیرہ چونکہ امیگریشن کے کئی عہدیدار تھے اس لئے ہم یہ سوچتے ہوئے اپنی باری کا انتظار کرتے رہے کہ دیکھیں ہمیں کون سا عہدیدار بھگتا ہے ہمیں کیا پتہ تھا کہ ہمارے حصہ میں آنے والا امیگریشن عہدیدار خود بھی مزاح نگار ہو گا اس نے ہمارا پاسپورٹ دیکھنے کے بعد ہم سے لندن آنے کی غرض و غائت پوچھی۔

ہم نے کہا کہ "اردو مجلس (لندن) کی دعوت پر برطانیہ آئے ہیں جلسوں وغیرہ کی صدارت کریں گے کچھ اپنی سنائیں گے کچھ آپ کی سنیں گے اور اپنے ملک کو واپس چلے جائیں گے۔ یہ رہا اردو مجلس کا دعوت نامہ۔

اس نے دعوت نامہ کو غور سے دیکھا اور کہا "یہ اردو مجلس کیا ہے؟"

ہم نے کہا "لندن کے اردو بولنے والوں کی تنظیم ہے"۔ پوچھا "اردو سے آپ کا کیا تعلق ہے؟"

ہم نے طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا کہ "تعلق کی بھی خوب رہی بھیا! اس زبان کے مایہ ناز ادیب ہیں اور ساری زندگی اس زبان کی خدمت کرتے آئے ہیں اب آپ کے ملک میں بھی اردو کی تھوڑی سی خدمت کرنا چاہتے ہیں؟"

پوچھا "آپ ادھر ہمارے ملک میں آئیں گے تو ادھر آپ کے ملک میں اردو کی خدمت کون انجام دے گا؟"

ہم نے کہا "آپ اس کی فکر نہ کریں۔ دو سو برس تک آپ ہماری فکر کر کے دبلے ہوتے رہے۔ یوں بھی ہمارے ملک میں دس بارہ ہزار افسانہ نگار اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ شاعر پہلے ہی سے اس زبان کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ ہم ادھر آ جائیں تو کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا"۔

اس نے حیرت سے ہماری طرف دیکھ کر پوچھا "یہ بتائیے کہ آپ کتنے عرصہ تک لندن میں اردو کی خدمت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

ہم نے کہا کہ "یہی کوئی ایک مہینہ تک آپ کے لندن میں اس زبان کی خدمت کریں گے"۔

پوچھا۔ ایک مہینہ تک آپ لندن میں اس زبان کی خدمت کریں گے تو کیا اتنی خدمت اس زبان کے لئے کافی ہوگی لیکن آپ بہت زیادہ خدمت انجام دیتے ہیں۔

ہم نے کہا۔ ذرہ نوازی کا شکریہ! لیکن ہمیں لندن میں بہت زیادہ خدمت انجام دینے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ آپ کے ملک میں بھی کم از کم ہزار ڈیڑھ ہزار افسانہ نگار اور چار پانچ ہزار شاعر اس زبان کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔

اس نے ہنس کر کہا۔ جب اس زبان کے اتنے سارے خدمت گزار خود برطانیہ میں موجود ہیں تو آپ نے یہاں آنے کا تکلف کیوں کیا؟

اس کے اس اچانک اور غیر متوقع سوال پر ہمیں تشویش ہونے لگی ہمیں لگا کہ اس کی نیت اچھی نہیں ہے ... اپنے ملک میں آنے کی اجازت نہیں دینا چاہتا لہٰذا ہم نے آخری حربے کے طور پر اپنے دوست نقی تنویر کا وہ حلفیہ بیان پیش کر دیا جس کے بارے میں نقی تنویر نے ہمیں لکھا تھا کہ اگر اردو مجلس کی دعوت نامے کی بنیاد پر امیگریشن والے تمہیں ویزا دینے میں ٹال مٹول کریں تو میرا یہ حلف نامہ ان کی خدمت میں پیش کر دینا اس حلف نامہ کی رو سے لندن میں تمہارا قیام اور تمہاری ذات سے متعلق اخراجات کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے ہم اپنے دوستوں کے بیان پر چاہے وہ غیر حلفیہ ہی کیوں نہ ہوں ضرورت سے زیادہ بھروسہ کر لیتے ہیں چنانچہ ہم نے خود اس بیان کو پہلے سے نہیں پڑھا تھا۔ عہدیدار مذکور پہلے تو اس حلف نامہ کو غور سے پڑھتا رہا۔ پھر بولا آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ اور لوگ تو لندن میں آباد ہونے کے ارادہ سے آتے ہیں اور آپ یہاں بہ نفس نفیس آ کر دفن ہونا چاہتے ہیں کیا آپ کے ملک میں دفن ہونے کی سہولت بھی نہیں ہے۔

ہم نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ نعوذ باللہ! ہم آپ کے ملک میں کیوں دفن ہونے چلیں۔ دفن ہونے کے لئے ہمارے ملک سے بہتر کوئی اور جگہ نہیں ہے۔ آپ نے ہمارے عالیشان مقبرے نہیں دیکھے کہ کس شان سے مردے کو دفن کیا جاتا ہے۔ تبھی تو ایسی بات کر رہے ہیں۔ ویسے یہ کفن دفن والا آپ کا سوال ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔

اس نے نقی تنویر کا حلف نامہ ہماری طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ آپ نے اپنے دوست کا حلف نامہ غالباً نہیں پڑھا اگر پڑھ لیتے تو لندن نہ آتے آپ خود پڑھ کر دیکھ لیجئے تب ہمارا سوال آپ کی سمجھ میں آجائے گا۔

اب جو ہم نے حلف نامہ کو پڑھنا شروع کیا تو ہماری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ نقی تنویر کے حلف نامہ کا متن کچھ اس طرح تھا: میں نقی تنویر بقائمی ہوش و حواس خمسہ اپنا یہ حلفیہ بیان قلم بند کراتا ہوں کہ میرے دوست مجتبیٰ حسین کے لندن میں قیام کے سارے اخراجات کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوگی۔ میں

مزید یہ اعلان کرتا ہوں کہ اگر لندن میں مجتبیٰ حسین کا انتقال ہو جائے تو میں اس کی نعش کو بھارت روانہ کرنے کا بندوبست کروں گا یا پھر برطانیہ میں ہی کسی موزوں جگہ پر ان کی تدفین کا انتظام کروں گا اور یہ سارے اخراجات میں خود برداشت کروں گا۔

امیگریشن عہدیدار نے ہمارے چہرے پر خوف و پریشانی کے آثار کو بھانپ کر کہا۔ مسٹر حسین آپ کے دوست کی نیت اچھی نہیں ہے کیا آپ اب بھی لندن شہر میں جانے کی اجازت لینا چاہیں گے؟ یا واپسی کا ارادہ ہے۔

ہم نے اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ان دنوں دوست اور دشمن میں تمیز کرنا بہت دشوار ہے۔ یہ ذات شریف میرے بچپن کے دوست ہیں اور ذرا دیکھئے کہ میرے تعلق سے ان کے ارادے کتنے خطرناک ہیں۔ ویسے یہ اب آپ پر منحصر ہے کہ مجھے ویزا دیں یا نہ دیں۔

امیگریشن عہدیدار نے ہنس کر کہا۔ اب تو آپ کو ویزا ضرور دوں گا۔ یہ میری مجبوری ہے کیونکہ آپ تو مر کر بھی برطانیہ کا کچھ بگاڑ نا نہیں چاہتے۔ اس نے دھڑ سے میرے پاسپورٹ پر ویزا کی مہر لگائی۔ پھر آنکھ مار کر بولا مسٹر حسین! ایک بات یاد رکھئے اگر آپ کا دوست کسی کو دفن کرنا ہی چاہتا ہے تو میری یہ خواہش ہے کہ وہ آپ کو دفن نہ کرے بلکہ اردو کو دفن کر دے کیونکہ اردو کو دفن کرنے یا اس کی نعش کو بھارت روانہ کرنے میں اتنے اخراجات نہیں آئیں گے جتنے کہ آپ کو یہاں دفن کرنے میں آئیں گے۔ میں تو آپ کی اور آپ کے دوست کے فائدے کی بات کر رہا ہوں۔

ہم اپنا پاسپورٹ لے کر بوجھل قدموں سے وہاں سے نکل گئے ہمیں یوں لگا جیسے ہم خود ہی اپنے کندھوں پر اپنی نعش کو اٹھائے جا رہے ہیں سامان واپس کرنے والے بیلٹ پر جا کر اپنا سامان اٹھایا پھر خود کار راستہ پر سامان سمیت اپنی میت کو جتن سے کھڑا کیا اور آگے کو نکل گئے۔ دو ایک جگہ ہیتھرو ایئر پورٹ پر اردو میں بھی مسافروں کے لئے ضروری ہدایات نظر آئیں۔ ایئر پورٹ کو صاف ستھرا رکھنے کے لئے سگریٹ کے ٹکڑے نہ پھینکو، مونگ پھلی کے چھلکے نہ بکھیرو۔ براہ کرم اپنا تھوک اپنے منہ ہی میں رکھو وغیرہ وغیرہ۔ مگر ہماری ذہنی کیفیت کچھ ایسی تھی کہ ہیتھرو ایئر پورٹ پر اردو عبارت پڑھ کر وہ اپنا مسرت حاصل نہ ہوئی جو عام طور پر خود بھارت میں کبھی اردو عبارت کے نظر آنے پر حاصل ہو جاتی ہے۔ یوں بھی صفائی سے متعلق اردو میں اس عبارت کو درج کرنے کا مقصد اردو کی اہمیت کو تسلیم کرنا نہیں تھا بلکہ اس طرح صفائی کے تعلق سے اردو بولنے والوں کی شہرۂ آفاق عادات و اطوار کو دنیا والوں پر اجاگر کرنا تھا ورنہ کیا وجہ ہے کہ اس غیر ضروری ہدایت کو چھوڑ کر بقیہ ساری ضروری ہدایتیں اردو میں درج نہیں تھیں۔

ہیتھرو ایئر پورٹ پر ہدایات اتنی واضح ہوتی ہیں کہ کوئی مسافر راستہ بھٹکنا چاہے تو تب بھی نہیں بھٹک سکتا۔ یہاں بھٹکنے کے لئے محنت اور جستجو کرنی پڑتی ہے یوں بھی ہمیں پتہ تھا کہ سارے راستے ہمیں مقتل کی طرف لے جا رہے ہیں تبھی تو یہ اہتمام تھا ہم ٹرالی پر اپنا سامان رکھے کسٹم کے حلقہ سے باہر نکل آئے تو دیکھا نقی تنویر ریلنگ سے لگے کھڑے تھے ہمیں دیکھتے ہی خوشی سے ان کی باچھیں کھل گئیں اور ہم نے دل میں سوچا کہ دیکھو تو ظالم کو ہمیں دفن کرنے کی کتنی مسرت ہے ہم باہر آئے تو نقی ہم سے بغلگیر ہونے کے لئے جتنا آگے بڑھتے تھے ہم اتنا ہی پیچھے ہٹتے تھے۔ ہم اصل میں یہ اطمینان کرنا چاہتے تھے کہ کہیں نقی کے ہاتھ میں چھری چاقو تو نہیں ہے بغلگیری کا مرحلہ طے ہوا تو نقی نے کہا کہ بہت اداس اور نڈھال دکھائی دیتے ہو تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟

ہم نے کہا کہ ویسے تو سارے سفر میں چاق و چوبند رہے۔ ابھی ابھی تمہارے ہیتھرو ایئر پورٹ پر اترنے اور امیگریشن عہدیدار سے بات کرنے کے بعد ہماری یہ حالت ہو گئی ہے۔

نقی نے کہا۔ امیگریشن والوں نے تمہیں تنگ تو نہیں کیا ہم نے کہا کہ امیگریشن عہدیدار تو بہت بھلا آدمی تھا۔ تم جانتے ہو شکایت تو ہمیں اپنوں ہی سے ہوتی ہے۔ خیر اس مسئلہ پر بعد

میں بات چیت کریں گے۔

نقی نے کہا۔ آخر بات کیا ہوئی یہ تو بتاؤ۔

ہم نے کہا ہمیں فوراً اس جگہ لے چلو جہاں تم نے ہمارے قیام کا بندوبست کیا ہے اس وقت ہماری جذباتی اور نفسیاتی حالت کچھ اچھی نہیں ہے۔ تنہائی میں کچھ دیر غور کرنا چاہتے ہیں۔ یوں بھی سولہ گھنٹے سفر کر چکے ہیں۔

نقی نے کہا کہ فوراً چلنا تو ناممکن ہے کیونکہ تمہارا طیارہ مقررہ وقت سے ٢٥ منٹ پہلے ہی لندن پہنچ گیا ہے اور ڈاکٹر ضیاءالدین شکیب نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ بھی ریسیو کرنے کے لئے آئیں گے وہ ماہر آثار قدیمہ ہیں اپنے وقت پر آئیں گے ان کا انتظار کرنا ضروری ہے۔

ہم نے دل میں سوچا نقی کتنا خطرناک آدمی ہے ایک ماہر آثار قدیمہ کو بھی شریک جرم کرنا چاہتا ہے۔

اتنے میں ڈاکٹر شکیب آ گئے تو ہم نے انہیں جیسے تیسے ریسیو کیا۔ ڈاکٹر شکیب ان ماہرین آثار قدیمہ میں سے ہیں جو دوسروں کو آثار قدیمہ میں تبدیل ہوتے دیکھ کر تو بہت خوش ہوتے ہیں لیکن اپنے آپ کو ہمیشہ جوان رکھتے ہیں، چنانچہ ہمارے بالوں میں پھیلتی سفیدی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بولے "اب تمہاری شخصیت معتبر ہوتی جا رہی ہے" ہم نے کہا "زندگی کی آخری گھڑیوں میں آدمی میں اتنی معتبری تو آ ہی جاتی ہے"۔ نقی اور شکیب دونوں کو یہ فکر تھی کہ ہم ایرپورٹ سے باہر نکل آئیں تو ہم لندن کی سردی کو کس طرح قبول کریں گے، ہم نے کہا آپ حضرات ہماری فکر نہ کریں دوستوں کی سرد مہری سے ہماری پرانی شناسائی ہے۔ ہم دانتوں کو بجاتے ہوئے نقی کی کار میں بیٹھ گئے تو نقی نے اچانک ہمارے اطراف ایک بیلٹ کو باندھنا شروع کر دیا۔ جب ہم سیٹ سے اچھی طرح جکڑ دیئے گئے تو ہمیں اچانک یہ خیال آیا کہ یہ سب ہمیں ہلاک کرنے اور بعد میں دفن کرنے کی تیاریاں ہیں ورنہ کون اپنے جگری دوست کو اس طرح باندھتا ہے۔ ہم سے رہا نہ گیا، بولے "یار نقی تم ہمارے دوست ہو تمہارے لئے ہماری جان حاضر ہے ہم بیلٹ میں جکڑے بغیر بھی جان دے سکتے ہیں بلکہ اپنی جان خود اپنی ہتھیلی پر رکھ کر تمہیں پیش کرنے کو تیار ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم ہمیں لندن میں دفن کرنے کا خطرناک ارادہ رکھتے ہو۔ مگر جان من پہلے ذرا لندن کو دیکھ لینے تو دو۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے" نقی نے زوردار قہقہہ لگا کر کہا "اب سمجھ میں آیا کہ تم میرے حلف نامہ سے خوفزدہ ہو۔ یار میں نے تمہیں دفن کرنے کی بات صرف امیگریشن والوں کو مطمئن کرنے کے لئے لکھی تھی بچپن کے دوست ہو میری قسم پر بھروسہ کرتے شرم نہیں آتی ساری زندگی جھوٹی قسمیں کھاتے گزری۔ رہی کار میں تمہیں بیلٹ سے باندھنے کی بات تو بھیا یہ یہاں کا دستور ہے بیلٹ نہ باندھو تو پچاس پونڈ جرمانہ ہو جاتا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ جرمانہ بیلٹ نہ باندھنے والے سے ہی وصول کیا جاتا ہے تم ابھی ابھی لندن آئے ہو۔ تمہارے پاس جرمانہ ادا کرنے کے لئے پچاس پونڈ کہاں سے آئیں گے"۔ نقی کی بات کو سن کر دل کو کچھ اطمینان آیا۔ تاہم حفظ ما تقدم کے طور پر ہم نے ڈاکٹر شکیب کو گواہ بنا کر نقی سے یہ وعدہ لیا کہ خدانخواستہ اگر ہمیں کچھ ہو گیا تو وہ ہمیں لندن میں دفن نہیں کریں گے بلکہ ہماری نعش کو وطن عزیز کو روانہ کر دیں گے تاکہ وطن والے ہمارا ایک اچھا اور واجبی سا مقبرہ بنائیں سال کے سال دھوم دھام سے ہمارا عرس منائیں۔ اس وعدہ کے بعد نقی کی کار لندن کی سڑکوں پر دوڑنے لگی۔

سفر نامہ سوویت یونین؛

مجتبیٰ حسین

دُنیا کے غفورو ایک ہو جاؤ

غفور جہاں گستری ہمارے چار روزہ دورۂ ازبکستان میں ہمارے مترجم، منتظم، میزبان، ترجمان اور نہ جانے کیا کیا تھے۔ ۸ ستمبر ۱۹۸۶ء کی خوشگوار صبح کو ان سے ہماری ملاقات ہوٹل ازبکستان کی لابی میں ہوئی جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے۔ معلوم ہوا کہ سوویت یونین کے سب سے بڑے ادبی اشاعتی مرکز "رادوگا" میں اردو کے ایڈیٹر اور صدر شعبہ ہیں۔ تعارف کے بعد جب ہم نے ان کا نام پوچھا تو بولے "یہ ہیچمدان اور کمترین عوام الناس میں رخصت الائیو غفور جہاں گستری کے نام سے شناخت پذیر ہے" سخن گستری سے چونکہ ہمارا پرانا تعلق ہے اسی لئے جہاں گستری کی بات تو سمجھ میں آگئی لیکن "رخصت الائیو" کا معمہ ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ پوچھا "یہ رخصت الائیو کیا ہے؟"

بولے "علم و دانش اور اردو زبان و ادب کا جو ادراک مبداء فیاض سے اس ہیچمدان کو ودیعت ہوا ہے اس کی مدد سے خاکسار نے بھی اس "رخصت الائیو" کے سرچشمے کی تحقیق و تدقیق کرنے کی سعی و کاوش کی ہے لیکن ناکام و نامراد رہا۔ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا مشتق کیا ہے؟"

ہم نے کہا "علم و دانش اور زبان و ادب کا جو ادراک مبداء فیاض سے ہمیں عطا ہوا ہے اس کے مطابق یہ "رخصت الائیو" یا تو "رخصت اللہ" ہے یا "رخصت الٰہی" ہے ہمیں نہیں معلوم کہ ازبک زبان میں رخصت کے کیا معنی ہوتے ہیں ہمارے ہاں رخصت بہت اچھی چیز ہوتی ہے جیسے رخصتِ اتفاقی اور رخصتِ خاص وغیرہ۔ ہمارے سرکاری ملازمین میں بہت مقبول ہے بلکہ ان کا من بھاتا کھاجا ہے۔ عام فہم زبان میں اسے چھٹی کہتے ہیں لیکن عام فہم زبان آپ کی سمجھ میں تو نہیں آئے گی۔ کیسے آپ کو سمجھائیں۔ ہماری دانست میں رخصت اللہ یا رخصت الٰہی کا عام سا مفہوم یہی ہے کہ یا تو اللہ نے آپ کو چھٹی دے رکھی ہے یا آپ نے اللہ کو ---"

بولے "مہمانِ گرامی قدر! اس حقیر و فقیر بندۂ پُر تقصیر کے نام کے اسرار و رموز کو جاننے میں آپ اپنی حیاتِ جاوداں کی عزیز ساعتیں اور بیش بہا ذہانتیں کیوں ضائع کرتے ہیں ناچیز کو صرف غفور کہئے۔ آپ کے ہاں بھی یہ چیز ہوتی ہے؟"

ہم نے کہا "غفور نہ صرف ہمارے ہاں ہوتے ہیں بلکہ ساری دنیا میں پائے جاتے ہیں ہمارے حیدرآباد دکن میں تو غفوروں کی ایک الگ قسم بھی پائی جاتی ہے جسے ڈنڈ غفور کہتے ہیں اس کی توضیح و تشریح ہم نہیں کریں گے کیونکہ ہمیں نہ صرف آپ کی دوستی بلکہ ہند روس دوستی بہت عزیز ہے۔ اس دنیا میں کوئی سا بھی غفور تو خود ہمارے [illegible]

ہیں ۔ آپ ہشتمویں غفور ہیں۔ یوروپ میں پانچ غفور سے ہیں جو ہمارے دوست ہیں امریکہ میں بھی دو غفور ہمارے دوست ہیں۔ باقی کے غفور سے ہندوستان میں ہیں وسط ایشیا میں کوئی غفور ہمارا دوست نہیں تھا اب خدا نے آپ کو اس منصب جلیلہ پر فائز کیا ہے"

ہماری بات کو سن کر غفور جہاں گستری نے خالص لکھنوی انداز میں سلام کرتے ہوئے کہا " آپ کی ذرہ نوازی غفور شناسی اور غفور پروری کا شکریہ مگر ہم اصل موضوع سے روگردانی کرتے جا رہے ہیں۔ مجھے سب سے پہلے آپ کا رسمی طور پہ استقبال اور خیر مقدم کرنے کا نادر اور نادر موقع عنایت کیجئے ' آپ نے ازبکستان کی سرزمین پر قدم رنجہ فرما کر ہماری عزت و توقیر میں جو اضافہ کیا ہے اس کے لئے میں سالم و کامل صمیم قلب کے ساتھ آپ کی خدمت اقدس میں اپنے شخصی اور ادبی عوام کے عمومی جذباتِ تہنیت و تشکر و تبریک پیش کرتا ہوں "گر قبول افتد زہے عز و شرف"

ہمارے ہندوستانی ہم سفر اشتیاق عابدی نے دبی زبان میں ہم سے پوچھا " مجتبیٰ بھائی ! یہ غفور صاحب کیا کہہ رہے ہیں ؟"

ہم نے کہا" بڑی تکلیف کے ساتھ کتابی اردو میں ہمارا شکریہ ادا کر رہے ہیں"

اس کے بعد یہ معمول سا بن گیا کہ اگر ازبکی زبان میں کوئی ہم سے بات کرتا تو غفور جہاں گستری "طلسم ہوش ربا" والی اردو میں اس کا ترجمہ ہمارے لیے کرتے اور بعد میں ہم غفور جہاں گستری کی اردو کا ترجمہ خود اپنی اردو میں اشتیاق عابدی کے لیے کرتے تھے۔ پتہ نہیں غفور جہاں گستری نے یہ اردو کہاں سے سیکھی اور کیسے سیکھی۔ اردو کے ایسے مشکل ، ثقیل اور متروک الفاظ جنھیں تیس ، چالیس برس میں ہم نے نہ کہیں سنا ' نہ پڑھا نہ لکھا۔ انھیں غفور جہاں گستری کی وساطت سے ازبکستان میں سننے اور برتنے کا موقع ملا۔ ان سے مل کر نہ صرف اردو کا مستقبل روشن نظر آیا بلکہ اس کا ماضی تو اتنا روشن نظر آیا کہ ہماری بصارت اور بصیرت دونوں چکا چوند ہو گئیں۔ معلوم ہوا کہ موصوف فیض احمد فیض سے نہ صرف مل چکے ہیں بلکہ ان سے گھنٹوں اپنی مخصوص اردو میں تبادلۂ خیال بھی کیا ہے

ہم نے کہا کہ "ہمیں پتہ ہے کہ آپ فیض احمد فیض سے مل چکے ہیں۔"

بڑے تجسس کے ساتھ پوچھا " آپ پر یہ حقیقت کیسے منکشف ہوئی کہ خاکسار فیض احمد فیض کی دلنواز صحبت خاص سے مستفیض و فیض یاب ہو چکا ہے"۔ ہم نے کہا" فیض کی شاعری پر آپ کی اردو کے اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ آخری عمر میں بڑی مشکل شاعری کرنے لگے تھے۔ آپ سے نہ ملتے تو ان کی شاعری میں یہ موڑ کہاں سے آتا۔"

نظریں جھکا کر اور قدرے شرما کر بولے " آپ کی غفور نوازی کا شکریہ۔"

چار دن ازبکستان میں ان کے اور ان کی اردو کے ساتھ ایسے گذرے کہ ذہن کے نہاں خانے میں ہمیشہ محفوظ رہیں گے۔ پہلے دن تاشقند کی سیر کرا کے رات کو وہ اپنے گھر چلے گئے تو اشتیاق عابدی نے ہم سے کہا۔ "اب آپ اپنے بستر استراحت کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز فرمائیں تا کہ نیند آپ کو اپنی پُر سکون آغوش میں سمیٹ لے اور آپ اس جہانِ فانی کے آلام و مصائب نیز افکار و حوادث سے عرصۂ مختصر کے لئے ہی سہی رستگاری حاصل کر سکیں۔"

ہم نے ہنس کر کہا" فیض کی شاعری کے بعد اب آپ کی نثر بھی غفور جہاں گستری کی اردو سے متاثر ہونے لگی ہے

عابدی صاحب! سچ تو یہ ہے کہ غفور جہاں گستری سے مل کر ہمیں بے ساختہ بیل کی والدہ کی یاد آ رہی ہے"۔

اشتیاق عابدی نے حیرت سے پوچھا "بیل کی والدہ! یہ کیا قصہ ہے؟"

ہم نے کہا "یہ قصہ بیس بائیس برس پرانا ہے۔ آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈیمی نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ تلگو کے افسانوں کا اردو ترجمہ کیا جائے۔ اس کام کے لئے ایک تلگو ادیب کا انتخاب کیا گیا جو دونوں زبانوں پر قدرت رکھتے تھے۔ ایک المیہ افسانہ تھا جس میں ایک غریب کسان کی زندگی کو پیش کیا گیا تھا۔ اس کہانی میں کسان کا نوجوان بیل مر جاتا ہے منظر کچھ اس طرح کا تھا کہ نوجوان بیل مر چکا ہے ایک طرف بیل کی نعش پڑی ہے۔ دوسری طرف کسان اداس بیٹھا ہے اور تیسری طرف وہ گائے بھی اداس کھڑی ہے جس نے اس بیل کو جنم دیا تھا۔ افسانے کا یہ موڑ نہایت متاثر کن تھا لیکن مترجم نے فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتے ہوئے اس منظر کو اپنی عالمانہ اردو میں یوں بیان کیا تھا "ایک طرف نوجوان اور لاغر بیل کی نعش بے گور و کفن پڑی تھی' دوسری طرف رنجور و ملول کسان بیٹھا تھا اور تیسری طرف بیل کی والدہ کھڑی آنسو بہا رہی تھی۔" دوسرے دن مترجم موصوف ترجمہ کے بارے میں ہماری رائے جاننے کے لئے آئے تو ہم نے کہا "ترجمہ تو نہایت فصیح و بلیغ ہے ہمیں پسند آیا لیکن ایک افسانہ میں بیل کی والدہ کا ذکر ہے اس طرز تخاطب پر ذرا نظر ثانی کر لیں تو مناسب ہے"۔

تیسرے دن وہ ترجمہ پر نظر ثانی کر کے ہمارے پاس آئے۔ ہم نے بیل کی والدہ والا صفحہ کھولا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اب کی بار فاضل مترجم نے "بیل کی والدہ" کو کاٹ کر "بیل کی والدۂ محترمہ و معظمہ" بنا دیا تھا۔

یہ تو خیر ایک لطیفۂ معترضہ تھا۔ بات غفور جہاں گستری کی ہو رہی تھی جتنی مشکل اردو وہ بولتے تھے اتنے ہی سادہ انسان وہ ہمیں نظر آئے جیسا کہ عام طور پر سارے غفور ہوتے ہیں' نہایت معصوم' مخلص' بے ریا' محنتی اور شریف۔ تاشقند جا کر ہی ہمیں یہ پتہ چلا کہ غفور چاہے ہندوستان میں رہیں یا یوروپ میں یا وسط ایشیا میں سب ایک جیسے ہوتے ہیں اسی لئے تو ہم مذاق مذاق میں انھیں یہ نیا نعرہ دے آئے ہیں کہ "دنیا کے غفورو ایک ہو جاؤ"

ان کی پابندی وقت کا یہ عالم ہوتا تھا کہ صبح آٹھ بجے آنے کے لئے کہہ جاتے تھے تو ٹھیک سات بج کر انسٹھ منٹ پر دروازے پر ان کی دستک سنائی دیتی تھی چونکہ انھیں معلوم تھا کہ ہم ادیب ہیں اسی لئے ایسی جگہوں پر لے جاتے تھے جو ادیبوں کی دلچسپی کا سبب بنیں۔

پہلے دن لینن چوک کی سیر کرا چکے تو کہنے لگے "اب میں آپ کو باغ شعراء لے چلتا ہوں جو علی شیر نوائی تھیٹر کے آگے واقع ہے"۔

ہم نے کہا "غفور صاحب! مانا کہ ہم ادیب ہیں لیکن شاعروں سے نہ صرف گھبراتے ہیں بلکہ ان سے حتی الامکان بچنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ سوویت یونین کا دورہ بھی اس لیے کر رہے ہیں کہ کچھ دن کے لئے ہی سہی اردو کے شاعروں سے ہماری جان چھوٹے اور ہم مکرر ارشاد اور سبحان اللہ کہنے سے بچے رہیں۔ آپ تو یہاں بھی ہمیں "باغ شعراء" میں لے جا رہے ہیں کہیں کسی شاعر نے ہمیں کلام سنا دیا تو؟ اور اگر اس کا کوئی شعر غلطی سے سمجھ میں آ گیا تو؟"

غفور جہاں گستری بولے "آپ خوف زدہ نہ ہوں۔ میں آپ کو اُن مردہ شاعروں کے پاس لے جا رہا ہوں جو امر ہو چکے ہیں"۔

ہم نے پوچھا "کیا مطلب؟"

بولے "باغِ شعراء میں آپ کو زندہ شاعر نہیں ملیں گے۔ اس باغ میں تو ازبکستان کے سارے عظیم المرتبت شاعروں کے مجسمے آپ کو دیکھنے کو ملیں گے"۔

ہم نے کہا "کیا آپ کے ہاں بھی پانی کی اتنی قلت ہوتی ہے کہ حکومت ہم جیسے ادیبوں اور فنکاروں کے مجسمے نصب کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے"

بولے "ازبکستان میں خیر اب تو پانی کی قلت نہیں ہے لیکن کسی زمانے میں ازبکستان میں پانی اتنا نایاب ہوا کرتا تھا کہ ہمارے لوک ادب میں پانی کے ایک قطرہ کو موتی کے ایک دانہ سے زیادہ قیمتی بتایا جاتا تھا۔ لیکن مجتبیٰ حسین صاحب! میری سمجھ میں ایک بات نہ آئی۔ پانی کی قلت سے ادیبوں کے مجسموں کا کیا تعلق ہے؟"

ہم نے کہا "بہت گہرا تعلق ہے ہمارے ہاں جب بھی پانی کی قلت ہو جاتی ہے تو حکومت عوام کی پیاس بجھانے اور ان کا کلیجہ ٹھنڈا کرنے کے لئے ادیبوں اور فنکاروں کے مجسمے کھڑے کردیتی ہے چنانچہ ہندوستان میں ہمارا تعلق جس ریاست سے ہے وہاں لوگ بوند بوند پانی کے لئے ترس رہے ہیں اور حکومت عوام پر فنکاروں کے مجسموں کی بارش برسا رہی ہے۔ ہماری ریاستی حکومت کا خیال ہے کہ جب سارے فنکاروں کے مجسمے نصب ہو جائیں گے تو ان حساس فنکاروں کے مجسموں کی آنکھوں سے عوام کی بے بسی اور مجبوری پر اتنے آنسو بہہ نکلیں گے کہ ساری ریاست میں سیلاب آ جائے گا"۔

غفور جہاں گستری کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آسان بات یوں بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ بولے "ہماری حکومت عوام کا کلیجہ اس طرح ٹھنڈا نہیں کرتی۔ خیر میں آپ کے ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کرنا چاہتا۔ ہو سکتا ہے آپ کی ریاستی سرکار ٹھیک کر رہی ہو"۔

خیر تھوڑی دیر بعد ہم باغِ شعراء میں تھے۔ ایسی خوبصورت اور پُر فضا جگہ ہے کہ ہم جیسے شاعر دشمن کا جی بھی شعر گوئی کی طرف مائل ہونے لگا۔ شاعروں کے کیسے باوقار اور پُر شکوہ مجسمے ہیں۔ علی شیر نوائی، بطلقی، نادرہ، مولانا مقیمی، ظہیر الدین فرقت، حکیم زادہ نیازی، عبداللہ قادری، حمید عالم جان، غفور غلام اور موسیٰ ایبک اپنے اپنے ڈھنگ سے فکرِ شعر میں محو ہیں ایک گوشے میں بڑی سی پگڑی باندھے ایک مجسمہ کھڑا تھا۔ ہم نے پوچھا "آپ کی تعریف؟"

غفور جہاں گستری بولے "یہ بابور ہے بابور۔ ازبکستان کا مشہور عالم اور شاعر۔ اس کے "بابر نامہ" کا ذکر آپ نے سنا ہوگا"۔

یہ سنتے ہی ہمارا سر تعظیماً جھک گیا اور ہم نے غفور جہاں گستری سے کہا "غفور صاحب! خبردار، باادب، باملاحظہ ہوشیار۔ آپ جس بابور کا یوں سرسری ذکر کر رہے ہیں وہ ہمارے سلطان ابن سلطان، خاقان ابن خاقان، بانیٔ سلطنت مغلیہ، گیتی پناہ، شہنشاہ ہندوستان ظلِ سبحانی اعلیٰحضرت ظہیر الدین محمد بابر ہیں۔ کم از کم ان کا نام تو احترام سے لیجئے۔ یہ ہمارے حکمراں رہ چکے ہیں"۔

غفور جہاں گستری بولے "ہوں گے آپ کے حکمراں مگر یہاں تو بابور دلوں پر حکمرانی کرتا ہے۔ اس کے شعر کا سکہ چلتا ہے اور اس کے علم کا ڈنکا بجتا ہے"۔

سوویت یونین میں ادیبوں اور فنکاروں کی جو عزت ہے اسے دیکھ کر ہم کچھ اور بھی احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ شاہراہیں ان کے نام سے ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیاں فنکاروں کے ناموں سے منسوب ہیں تاشقند کے کئی اسٹیشنوں کے نام شاعروں اور ادیبوں کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ ہم نے غفور جہاں گستری سے پوچھا "اتنے دیو ہیکل اور بھاری مجسموں کی تیاری کا بجٹ

کتنا خرچ آتا ہوگا۔"

بولے "ایک ایک مجسمہ پر کئی کئی ہزار روبل خرچ آتا ہے؟"

ہم نے کہا "اگر آپ ازراہِ ادب نوازی ہمیں بھی روزانہ صرف دس روبل دیا کریں تو ہم خود بہ نفسِ نفیس بطورِ مجسمہ آپ کے باغِ شعرا میں کھڑے ہونے کو تیار ہیں۔ اتنا سستا مجسمہ آپ کو نہیں ملے گا۔"

ہمیں غفور جہاں گستری پر اس وقت غصہ آیا جب انھوں نے ہماری پیشکش کو ہنس کر ٹال دیا۔ بولے "اپنے ملک میں پانی کی قلت کی دعا کیجئے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک دن خود آپ کے شہر میں آپ کا مجسمہ کھڑا ہو جائے اور ہم نے بات کو کاٹ کر کہا "جس پر تھکے ماندے پرندے بیٹھ کر بیٹ کرتے رہیں گے۔"

غفور جہاں گستری کا ذکر ہماری اگلی قسطوں میں بھی آتا رہے گا۔ فی الحال ہم ان کی انسان دوستی اور فرض شناسی کے ایک واقعہ پر ان کے ذکر کو ختم کرنا چاہیں گے۔

ازبکستان میں پہلے ہی دن سے وہ ہماری صحت کے بارے میں ضروری اور غیر ضروری ہدایتیں دیا کرتے تھے ہمیں چھینک بھی آجاتی تو ان کا دل دھڑکنے لگتا تھا۔ کہتے تھے آپ کو ازبکستان سے ماسکو اور لینن گراڈ بھی جانا ہے۔ ماسکو پہنچنے تک آپ کی صحت کو ٹھیک رکھنے کی ذمہ داری میری ہے اسی لئے اپنی صحت کی حفاظت کیجئے۔ بخارا کی سیر سے ہم دوبارہ تاشقند واپس آنے لگے تو اچانک بخارا کا موسم بے حد سرد ہو گیا۔ لوگوں کا بیان تھا کہ پچھلے پچاس برسوں میں ایسا موسم دیکھنے کو نہیں ملا۔

ہم رات کو ایک چھوٹے سے طیارہ کے ذریعہ بخارا سے تاشقند آئے۔ پون گھنٹے کی پرواز میں وہ بار بار ہمارا حال پوچھتے رہے کہ بخارا کے موسم سے کہیں آپ کو بخار تو نہیں آرہا ہے۔ آنکھوں میں کہیں جلن تو نہیں ہو رہی ہے۔ اشتیاق عابدی نے طیارہ میں کھانسنا شروع کیا تو بے چین سے ہونے لگے۔ رات کو ہمیں ہوٹل پر چھوڑ کر جانے لگے تو بولے "بخارا کے سرد اور غیر متوقع موسم کے لئے میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔ یہ میرے اختیار میں نہیں تھا کہ بخارا کو اس موسم سے اور اس موسم کو آپ سے بچاتا۔ کل تاشقند میں آپ کا بے حد مصروف آخری دن ہے کئی جلسوں میں آپ کو شرکت کرنی ہے اور خطاب بھی کرنا ہے اپنی صحت کو ٹھیک رکھیئے اور ہو سکے تو اپنی اپنی تقریروں کی بھی تیاری کر لیجئے۔ میں صبح آٹھ بجے کمرہ پر آجاؤں گا۔"

اس بار اشتیاق عابدی کو اور ہمیں ایک بڑے سے ڈبل بیڈ کمرہ میں ٹھہرایا گیا۔ ہم تو حسبِ عادت گھوڑے بیچ کر سو گئے۔

صبح پانچ بجے ہماری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اشتیاق عابدی اپنے بستر میں پڑے ہند روس دوستی کے موضوع پر بہ آوازِ بلند تقریر کر رہے ہیں۔ ہم بھی کچھ کم چالاک نہیں ہیں بڑی آہستگی کے ساتھ میز پر سے قلم اور کاغذ اٹھایا اور لگے ان کی تقریر کے اہم نکات کو نوٹ کرنے۔ اشتیاق عابدی کہے چلے جارہے تھے، "ہند۔ روس دوستی کے بغیر عالمی امن کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ روس کی دوستی وقت کی کسوٹی پر پرکھی ہوئی دوستی ہے سوویت یونین نے کب کب اور کہاں کہاں اور کیسے کیسے کٹھن وقت میں ہماری مدد کی ہے۔ میری اماں ___ میری اماں (کراہنے کی آواز) سوویت یونین ہمارا سب سے گہرا دوست ہے۔ میری اماں ___ میری اماں۔" تقریر تو ان کی بہت مدلل اور اثر انگیز تھی مگر یہ درمیان میں "میری اماں۔ میری اماں" کی تکرار سے ہمیں تشویش سی ہوئی۔ دبے پاؤں ان کے قریب جا کر ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو یوں لگا جیسے ہم نے جلتے ہوئے توے پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ ہم نے انھیں جگانے کی کوشش کی تو ایک عجیب سی بحرانی کیفیت میں پوچھا "کون ہے؟"

ہم نے کہا "آپ کا دوست ہوں مجتبیٰ"

کروٹ بدلتے ہوئے بولے "کوئی مجتبیٰ میرا دوست نہیں ہے۔ سوویت یونین ہی میرا واحد دوست ہے۔ مجھے

سوویت یونین کی دوستی پر فخر ہے میری اماں ـــ میری اماں۔"

ہم نے تاڑ لیا کہ معاملہ سنگین ہو گیا ہے دیارِ غیر میں کسی سے مدد طلب کریں اور طلب کریں بھی تو کس زبان میں۔ ہم جس زبان میں اپنا مدعا یا مرض کی کیفیت بیان کرتے ہیں اس کے جاننے والے تو غفور جہاں گستری ہی ہیں جو بمشکل ڈھائی گھنٹے بعد آئیں گے۔ ہندوستان سے ہم مختلف النوع امراض کی جو دوائیں اپنے ساتھ لے گئے تھے وہ اشتیاق عابدی کو دیں مگر اِن کی ہندہ روس دوستی میں کوئی افاقہ نہ ہوا بلکہ آخر میں تو امریکہ کو کھلم کھلا گالیاں تک دینے لگے۔ ٹھیک سات بج کر پانچ منٹ پر غفور جہاں گستری آئے تو ہم نے انھیں سارا ماجرا کہہ سنایا۔ یہ سنتے ہی غفور جہاں گستری پسینہ میں شرابور ہو گئے۔ چکرا کر گرنے ہی والے تھے کہ ہم نے انھیں تھام لیا اور کہا "ہمارے ہاں آدابِ تیمارداری ایسے نہیں ہوتے۔ تیماردار کو مضبوط دل کا ہونا چاہیئے" غفور جہاں گستری نے ہماری کوئی بات نہیں سنی اور اچانک کمرے سے چلے گئے۔ پانچ ہی منٹ بعد وہ دو عدد لیڈی ڈاکٹروں، تین عدد نرسوں اور ایک اسٹریچر کے ساتھ نمودار ہوئے۔ ڈاکٹروں نے اشتیاق عابدی کا معائنہ شروع کر دیا۔ تو یہ پسینہ پونچھتے ہوئے بولے "ہم نے سارے انتظامات کر لیئے ہیں۔ نیچے ایمبولینس گاڑی بھی ایستادہ ہے۔"

ہم نے کہا "اور اس کے بعد کے انتظامات کے بارے میں بھی کہہ دیا ہوگا۔"

انھوں نے ہماری بات سُنی اَن سُنی کر دی۔ انھیں ہماری بات سننے کا ہوش ہی کہاں تھا۔ اشتیاق عابدی کے نانا کرتے لیڈی ڈاکٹروں نے ان کے دونوں کولھوں پر دو انجکشن داغ دیئے اور کہا "دو گھنٹوں کے اندر اندر اگر انھیں پسینہ آ گیا تو تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" پروگرام کے مطابق دس بجے ادارۂ شرقیات میں ہمارا خیر مقدم تھا۔ نرس کو اشتیاق عابدی کے پاس چھوڑ ہم اکیلے ہی سوئے مقتل چلے۔ اشتیاق عابدی سے کہا "آپ فکر نہ کریں ہم سنبھال لیں گے۔ ہندوستان کی طرف سے اچھی سی تقریر بھی کر دیں گے رات کو آپ کی تقریر تو ہم نے سن ہی لی ہے۔ اس میں سے "میری اماں ـــ میری اماں" کو نکال کر باقی تقریر کر دیں گے۔"

دو گھنٹے بعد ہم واپس آئے تو اشتیاق عابدی بدستور تقریر کیئے جا رہے اور پسینہ کا دُور دُور تک پتہ نہیں تھا۔ اب غفور جہاں گستری کی پریشانی بے قابو ہو گئی اور وہ پسینہ میں شرابور ہونے لگے۔ وحشت سے بولے "شومیٔ قسمت سے یہ بہت بُرا ہو رہا ہے۔ ہم تاشقند میں ہندوستانی مہمانوں کے تعلق سے بہت فکرمند رہتے ہیں۔ اگر عابدی صاحب کو فوراً پسینہ نہ آیا تو ہم انھیں ماسکو نہیں جانے دیں گے یہیں اسپتال میں داخل کروا دیں گے۔ آپ ماسکو چلے جائیے۔ یوں بھی ان کا تاشقند سے ہندوستان واپس جانا زیادہ آسان ہے بہ نسبت ان کے ماسکو سے ہندوستان جانے کے۔"

یہ سنتے ہی اشتیاق عابدی رضائی پھینک کر اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے جسم سے پسینہ کا وہ سیلاب اُمڈا کہ اسی سے غسلِ صحت فرمانے لگے۔ معصومیت میں لپٹی ہوئی غفور جہاں گستری کی سچی بات کا یہ ادنیٰ سا کرشمہ تھا۔ اشتیاق عابدی کو پسینہ میں شرابور دیکھ کر غفور جہاں گستری کے چہرے پر سکون اور مسرت کے وہ آثار دکھائی دیئے جو عموماً ایک بچہ کو جنم دینے کے بعد ماں کے چہرے پہ دکھائی دیتے ہیں۔

ڈاکٹر بیگ احساس
(حیدرآباد)

مجتبیٰ حسین بحیثیت کالم نگار

کالم نگاری ادب اور صحافت کے درمیان "کا پُل" جیسی ہوتی ہے ذرا سی بد احتیاطی پر اس پُل کی کرچیں بکھر جاتی ہیں اور ادب و صحافت دونوں دوسروں پر ایک دوسرے کے سامنے اجنبیوں کی طرح کھڑے رہ جاتے ہیں۔

کالم نگاری ترسیل اور تخلیق کا بہترین امتزاج ہوتی ہے جو خبر کو ٹرانسپیرنٹ بنا کر ایک نئی دنیا کی تخلیق کرتا ہے۔ اُردو کالم نگاری میں طنز و مزاح کی روایت "اودھ پنچ" نے بنائی ہے انگریزی سامراج نے جب اظہار پر پابندی لگا دی سیاسی جد و جہد پر پہرے بٹھا دیئے گئے تو اس زوال آمادہ معاشرے کی گھٹن میں "اودھ پنچ" کے دانشوروں نے اپنے شگفتہ تلوار کی دھار کی طرح تیز اور بے باک تحریروں سے شستہ اور دلفریب اسلوب میں کالموں کے ذریعہ اپنے مقصد کا اظہار کیا۔ ان کالموں میں عوام کی کچلی ہوئی روح کا کرب بھی تھا اور شائستہ لیکن شدید احتجاج بھی تھا۔ احتجاج ایسا جو سب کی سمجھ میں آئے لیکن قابل گرفت نہ ہو۔ چنانچہ ان کالموں نے ماحول میں حرارت اور ظرافت پیدا کی۔ منشی سجاد حسین کی اس خدمت کو اُردو ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

کالم نگاری کا یہ سلسلہ اودھ پنچ میں ۱۸۷۷ء میں شروع ہوا اور آج تک اُردو اخباروں کا جزو بنا ہوا ہے۔

یوں تو کالم کئی طرح کے لکھے جاتے ہیں، سیاسی، معاشرتی، معاشی، کاروباری جائزے، کھیل کود سے لے کر ذرائع ابلاغ کے پروگراموں تک سب کچھ کالم کا موضوع بن سکتے ہیں۔ لیکن اُردو کالم نگاروں نے ہمارے معاشرے کے روزمرہ دکھ، سکھ، آنسوؤں اور مسکراہٹوں سے آگہی حاصل کی۔ ان کی سوچ، نگاہ اور قلم سماج کے تضاد کو کالم میں ڈھالنے لگا۔ اودھ پنچ کے کالم نگاروں میں رتن ناتھ سرشار، تربھون ناتھ ہجر، منشی جوالا پرشاد، احمد علی شوق اور خود سجاد حسین شامل ہیں اس کے علاوہ اخبار فتنہ میں ریاض خیرآبادی کا کالم فتنہ، عطر فتنہ، منادی، اور زمیندار میں خواجہ حسن نظامی کے کالم "زمیندار" ہی میں حاجی لق لق کے کالم، زمیندار اور انقلاب میں عبدالمجید سالک کے کالم "افکار و حوادث" "شیرازہ" مثلا چراغ حسن حسرت کے کالم، ہند سماچار میں کنہیا لال کپور کے کالم، ملاپ میں فکر تونسوی کا "پیاز کے چھلکے" ان کے علاوہ شوکت تھانوی، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، ابراہیم جلیس، ابن انشا، یوسف ناظم، احمد جمال پاشا، عطاالحق قاسمی، خامہ بگوش، انتظار حسین، جمیل الدین عالی، نصراللہ خاں، مجید لاہوری، عبدالمجید اسی روایت کا تسلسل ہیں۔ تخلص بھوپالی کی "نیا ملا" والی خالہ اور ملا رموزی کی داستان بھی کالم نگاری میں انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر ان کالموں کو ترتیب دیا جائے تو پورے ایک عہد کا سماجی تاریخ اور اس دور کے عوامی رجحانات ملتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ کالم کا موضوع ہنگامی ہوتا ہے لیکن ایسے کالم جن میں دوامی قدروں کا اظہار ہو وہ کلاسیک ادب بن گئے ہیں۔ قاضی عبدالغفار نے "لیلیٰ کے خطوط" پہلے کالم کی صورت ہی میں لکھے تھے۔ پھر اس خطوط کا یہ مجموعہ شائع ہوا تو ادب میں کلاسیک کا درجہ پا گیا۔ اسی طرح خواجہ حسن نظامی کا "جھینگر کا جنازہ" ادب میں کلاسیک کا درجہ رکھتا ہے۔ دکن میں بھی کالم نگاری کی تاریخ بہت پرانی ہے "پیام" "رہبرِ دکن" اور "سیاست" کے کالم عوام میں بہت مقبول تھے۔

مجتبیٰ حسین نے اپنی پہلی مزاحیہ تحریر بصورت کالم لکھی۔ ان کا پہلا مزاحیہ مضمون "۱۹۶۴ء میں صبا" میں شائع ہوا لیکن ان کا مزاحیہ کالم "شیشہ و تیشہ" (سیاست) میں ۱۸ اگست ۱۹۶۲ء کو شائع ہوا۔ اس طرح مجتبیٰ کے مزاح کا سفر کالم نگاری سے شروع ہوتا ہے۔ شاہد صدیقی کے انتقال کے بعد مجتبیٰ حسین نے شیشہ و تیشہ میں کالم لکھنا شروع کیا اور ۱۹۷۲ء میں دہلی چلے جانے کے بعد بھی یہ سلسلہ چلتا رہا اور ۱۹۷۹ء تک جاری رہا۔

مجتبیٰ حسین کی کالم نگاری بھی ان کی مزاح نگاری کی طرح حسنِ بیان اور واقعہ نویسی کا حسین امتزاج ہے مجتبیٰ حسین سیاسی آدمی نہیں ہیں بلکہ SOCIAL ANIMAL یا سماجی جانور ہیں اس لئے وہ سوچتے ہیں کہ سماج اگر ٹھیک ہو جائے تو سیاست اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گی۔ اس لئے وہ سماج کے مختلف رجحانات کو گرفت میں لیتے ہیں اور اپنی کالم نگاری کا موضوع بناتے ہیں روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے معمولی واقعات جن میں تضاد یا عدم توازن ہو ان کے مرغوب موضوعات ہیں مثلاً طلباء کا امتحان میں نقل کرنے کا رجحان، پانی کی سربراہی کا اچانک بند ہو جانا، عید کے چاند کے سلسلے میں گڑبڑ وغیرہ۔ ان عام موضوعات میں وہ مزاح تلاش کرتے ہیں اور اس واقعہ کو ابھارنے کے لئے وہ زورِ تخیل سے ایسے کئی امکانی واقعات تراش لیتے ہیں جن کے پس منظر میں اصل واقعہ ابھر کر سامنے آتا ہے اور اس کے مضحک پہلو پوری طرح واضح ہو جاتے ہیں۔ ایک شخص نے ڈاکٹر سے ٹیلیفون کرنے کی اجازت مانگی اور جب ڈاکٹر نے اجازت نہیں دی تو شخص مذکور نے گولی چلا دی۔ یہ واقعہ اپنی جگہ بڑا عجیب و غریب ہے اس واقعہ کی روشنی میں مجتبیٰ جو امکانی واقعات تخلیق کرتے ہیں وہ اس طرح ہیں۔

"ہو سکتا ہے کہ سڑک پر چلتے چلتے کوئی آپ کو سلام کرے اور آپ جلدی میں سلام کا جواب نہ دے سکیں تو فوراً پستول چلنے کی آواز آئے گی اور گولی آپ کے سینے کے پار ہو جائے گی ... مثلاً آپ نے اپنے کسی دوست کو کوئی اچھا سا شعر سنایا اور دوست نے اس شعر پر بھڑک کر اچانک پستول چلا دیا اور غضب کے شعر کہتے ہو خدا تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نظرِ بد سے بچائے۔" اگر ایسی چھوٹی موٹی باتوں کے لئے بھی پستول استعمال ہونے لگا تو وہ دن دور نہیں جب دنیا میں فیملی پلاننگ کی کسی اسکیم کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔" (پستول عرض کیا ہے)

عوام کی اپنے مسائل سے عدم واقفیت، اندھی تقلید، جذباتی اشتعال انگیزی اور سادہ لوحی کا یہ نمونہ دیکھئے "ایک جلوس میں ایک صاحب بار بار اپنا گلا پھاڑ کر "لے کے رہیں گے، لے کے رہیں گے" کا نعرہ لگا رہے تھے۔ جب ہم نے ان سے پوچھا وہ کیا لینا چاہتے ہیں تو انھوں نے معصومیت سے جواب دیا مجھے کیا معلوم میں کیا لینا چاہتا ہوں۔" مزاحیہ تحریر وہی لکھ سکتا ہے جو درد کو محسوس کرتا ہو۔

مجتبیٰ حسین کی تحریروں میں ایک کرب چھپا ہے۔ یوں مجتبیٰ حسین پطرس اور رشید احمد صدیقی دونوں کے دبستانوں کا احترام کرتے ہیں لیکن ان کی تحریروں میں جو کرب چھپا ہے وہ معرکہ خیز ہے۔ مزاح نگاری میں یہ کرب عظیم بیگ چغتائی کا تسلسل ہے۔ دراصل وہ کرب ہی ہوتا ہے جس پر مجتبیٰ حسین مزاح کا لبادہ اوڑھا دیتے ہیں۔ ان کے

کالم "ٹیلی ویژن کا گلا گھونٹنا"، "نیا زمانہ نیا آرٹ" "بوتل میں بند جمہوری عہد" اس کرب کا مظہر ہیں۔

"ان دنوں نوجوان لڑکے، لڑکیوں سے نہیں بلکہ ان کے جہیز سے شادیاں کرنے لگے ہیں۔ ہمیں اس نوجوان کی یاد آرہی ہے جس نے اپنے ہونے والے خسر کو لکھا تھا کہ "اسے جہیز میں ایک موٹر، ایک مکان، ایک ٹیلی ویژن سیٹ اور ایک ریفریجریٹر دیا جائے اور جہیز کی ان چیزوں کو دینے کے بعد بھی اگر آپ اپنی لڑکی کو دینا چاہیں تو ضرور دے دیں ورنہ میں لڑکی کے بغیر بھی ہنسی خوشی زندگی گذار سکتا ہوں۔"
(ٹیلی ویژن کا گلا گھونٹنا)

مادی آسائشوں کی اس دنیا میں انسان کی قیمت کتنی گر گئی ہے اور شادی بیاہ جس طرح کاروبار بن گیا ہے لڑکے کس طرح سے لالچی ہوگئے ہیں یہ سارا کرب اس مزاحیہ تحریر کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔

دو مالدار طالب علموں نے ایک فلم میں چوری کا منظر دیکھ کر ایک شخص کے گھر چوری کرنے کا منصوبہ بنایا اور اسے عملی جامہ پہنانے کی کوشش میں گرفتار ہو گئے۔ مجتبیٰ اس تفریحی جرم کی خباثت اور اس خطرناک رجحان کو طنز و مزاح کے ذریعہ اس طرح ابھارتے ہیں۔

"ایک زمانہ تھا جب لوگ ضرورتاً چوری کیا کرتے تھے اب تفریحاً چوری کرنے لگے ہیں اگر آپ زندگی سے بیزار ہو گئے ہیں، آپ کے پاس کوئی مصروفیت نہیں ہے، گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے مگر آپ پھر اداس ہیں تو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے آپ فوراً کسی کے گھر چوری کرنے چلے جائیں اس سے زندگی میں سرگرمی پیدا ہوگی جوش و خروش پیدا ہوگا اور تھوڑی دیر کے لئے زندگی سے آپ کی مایوسی ختم ہو جائے گی"

یہ معاشرے پر طنز ہے جہاں ساری مادی سہولتیں حاصل ہیں لیکن لوگ تفریحاً جرم کا ارتکاب کرتے ہیں

مزاح کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ مبالغہ اس انداز سے پیش کیا جائے جس پر اس حقیقت کا گمان ہو اور مجتبیٰ حسین اس مبالغے کے ماہر ہیں لیکن انہوں نے بڑی احتیاط سے خود کو غلو سے محفوظ رکھا ہے۔

مجتبیٰ حسین مزاح کی خاطر واقعات کو مبالغہ کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ مثلاً

"ایک مکان کی بالائی منزل پر عید منائی جارہی ہے گلے ملے جا رہے ہیں مگر اسی مکان کی نچلی منزل میں روزہ چل رہا ہے استدلال اس خصوص میں یہ پیش کیا جا سکتا ہے کہ صاحب بالائی منزل چونکہ اونچائی پر واقع ہے اس لئے بالائی منزل والوں کو چاند نظر آگیا تھا اور نچلی منزل چونکہ بہت نیچے واقع ہوئی ہے اس لئے نچلی منزل والوں کو آج چاند نظر آئے گا"

یا

"جتنے پرچے ہوتے تھے اتنی ہی شیروانیاں بھی سلوا لیتے تھے معاشیات کی شیروانی، سماجیات کی شیروانی، سیاسیات کی شیروانی، اردو کی شیروانی، نفسیات کی شیروانی، ہم امتحان کی تیاری شروع کرنے سے پہلے شیروانیوں کی سلوائی کا آغاز کر دیتے تھے اور سچ پوچھئے تو شیروانیوں کی سلوائی ہی امتحان کی اصل تیاری ہوتی تھی:

مزاح نہ پورا سچ ہوتا ہے، نا پورا جھوٹ!

ظاہر ہے کوئی لکھ پتی طالب علم ہی اتنی شیروانیوں کی سلوائی کا متحمل ہو سکتا ہے لیکن یہ مبالغہ مزاح پیدا کرتا ہے اور اس واقعہ کو ابھارنے میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے جس کو مزاح نگار نے موضوع بنایا ہے۔

اس مبالغے میں کس قدر طنز چھپا ہوا ہے دیکھئے

"صبح جب اس کی ٹونٹی پر پانی کا پہلا قطرہ نمودار ہوتا ہے تو گھر میں ایک شور سا مچ جاتا ہے کہ لو پانی آگیا۔"

پھر اس قطرہ کو بڑی احتیاط سے کسی شیشی میں محفوظ کر دیا جاتا ہے کہ بوقت ضرورت کام آئے۔"

انتظار حسین نے عطاالحق قاسمی کی کالم نگاری پر رائے دیتے ہوئے لکھا کہ

"اصل میں جس طرح غزل میں دیکھا جاتا ہے کہ شاعر مصرعہ کیسے نکالتا ہے۔ کالم میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ لکھنے والا فقرہ کیسا لکھتا ہے۔ فقرے میں دھار ہونی چاہیئے یہ نہیں ہے تو کالم نہیں لکھنا چاہیئے۔"

(روزنِ دیوار سے، دوسرا ایڈیشن)

مجتبیٰ حسین کے پاس یہ دھار بہت تیز ہے وہ بڑے خوبصورت فقرے نکالتے ہیں

"ویسے ہم ٹیوٹی کورن کے شخص مذکور کو تنقید کا نشانہ نہیں بنانا چاہتے کیونکہ وہ ایک معمولی آدمی ہے ہم نے بڑی بڑی حکومتوں کو بغیر کسی وجہ کے گولی چلاتے ہوئے دیکھا ہے۔ مثلاً ویت نام کے عوام نے آزاد رہنے کی اجازت طلب کی اور امریکہ نے فوراً گولی چلادی، یحیٰی خان نے بنگلہ دیش کے عوام کے سینوں میں گولی داغ دی۔ عرب عوام نے پُرامن زندگی گذارنے کی خواہش کی اور اس خواہش سے متاثر ہو کر اسرائیل نے عرب ممالک پر بمباری شروع کر دی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب بڑی بڑی حکومتیں اور مہذب ممالک بات بات پر فائرنگ کر سکتے ہیں تو پھر ٹیوٹی کورن کا شخص مذکور گولی چلانے سے کیوں محروم رہے۔" (پستول عرض کیا ہے)

مجتبیٰ حسین لفظوں کے جوہری ہیں۔ ذرا سی تراش خراش کے ساتھ وہ لفظوں کے ہیرے اس طرح تراشتے ہیں کہ ان کی قدر و قیمت کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے جیسے "ماضی میں جلسے ہوتے تھے تو مقررین کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا اب انھیں صرف ڈائس پر بٹھایا جاتا ہے پہلے آؤ بھگت ہوتی تھی تو اب "ضلع جگت" ہوتی ہے اس کی وجہ تو یہ ہے کہ مقررین اور سیاسی قائدین خود چور دروازہ سے ایسے جلسوں کے انعقاد کا انتظام کرتے ہیں گویا "سامعین سست اور مقررین چست" والا معاملہ پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے۔"

مجتبیٰ حسین لفظوں سے کھیلنے کے ماہر ہیں کبھی کبھی تکرار سے وہ الفاظ کو معنیٰ کی کئی جہتیں عطا کرتے ہیں

"ان دنوں دنیا کی ہر شئے نہ صرف مقصدی بلکہ ہمہ مقصدی ہونے لگی ہے مثال کے طور پر ادب مقصدی ہوتا ہے فلمیں مقصدی ہوتی ہیں اور پراجیکٹس ہمہ مقصدی ہوتے ہیں مقصدی اور ہمہ مقصدی کی طرح "بے مقصدی" کی ایک نئی اصطلاح وجود میں آرہی ہے مثلاً اب چوری کی لاتعداد اقسام کو دو بڑے شعبوں "مقصدی" اور "غیر مقصدی" میں تقسیم کیا جانے لگا ہے۔ مقصدی چوری تو وہ ہے جس سے ہمارے آبا و اجداد بھی واقف تھے۔ اور ہم بھی واقف ہیں غیر مقصدی چوری ذرا نئی بات ہے جس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ "مال صاف کرنے کے بجائے صرف ہاتھ صاف کیا جائے۔" (شیشہ و تیشہ ۲۳ اگست ۱۹۶۲ء)

بعض نقادوں کا خیال ہے کہ مزاح شائستگی کی ضد ہوتا ہے۔ لیکن مجتبیٰ کے مزاح میں شائستگی اور طنز میں گہری کاٹ ہے اور اس کاٹ میں بھی شائستگی کا دامن نہیں چھوڑتے۔ مجتبیٰ کی تحریروں میں طنز کا عنصر بڑے متوازن انداز میں ملتا ہے جیسے ہمارے ایک دوست کا بیان ہے کہ ہمیں محکمہ آب رسانی سے پانی کی سربراہی کے بارے میں کوئی شکایت نہیں کرنی چاہیئے۔ جب خدا نے انسان کی آنکھوں میں آنسو بھر دیئے ہیں تو پھر محکمہ آبرسانی کا احسان اٹھانے کی کیا ضرورت ہے اگر منہ دھوتے وقت نل بند ہو جائے تو فکر نہ کیجئے بلکہ رونا شروع کر دیجئے تھوڑی ہی دیر میں آنسوؤں سے آپ کا چہرہ دھل جائے گا۔ پھر ہمارا خیال ہے کہ انسان جتنے آنسو بہا سکتا ہے محکمہ آبرسانی اتنا پانی کہے

اسے قطرے نلوں سے سربراہ نہیں کر سکتا۔" (دو تل میں بوند)

ہندو پاک کی عوام اس بات کو کبھی نہیں بھول سکتی کہ حالات و سیاست کے جبر نے انھیں علیحدہ کر دیا ہے اور درمیان میں ایک مصنوعی لکیر کھینچ دی گئی ہے اس لئے وہ ایسے دوست ہیں جن میں رقابت اور رشک کا جذبہ موجود ہے۔ دونوں ممالک کی عوام ہر مسئلے کو سیاسی معاہدوں سے جوڑ دیتی ہے۔ ہر بات کو ہندوستان و پاکستان کی سیاست سے جوڑ دینا اور ان ملکوں کے درمیان ہوئے کسی بھی معاہدے کو ہر مسئلہ کا حل سمجھنے پر طنز کی یہ روشن مثال دیکھئے۔

"یعنی پاکستان میں تو کل عید ہو گئی اور ہندوستان میں آج ہو رہی ہے پھر تاشقند اعلانات کا کیا فائدہ ہوا؟ آخر تاشقند اعلان نامہ کی خلاف ورزی نہیں تو اور کیا ہے؟" (جمہوری عید)

مجتبیٰ حسین یوں تو بالعموم اپنی بات اشاروں میں کہتے ہیں لیکن کبھی کبھی وہ قاری پر بھروسہ نہیں کرتے اور بات کی وضاحت کرنے لگتے ہیں جیسے

"ہم نے اس سے پہلے بھی اس قسم کی خبر پڑھی تھی کہ ایک لڑکے نے اپنی نئی نویلی دلہن کی ٹانگ توڑ دی تھی کہ وہ اپنے ساتھ جہیز میں ریڈیو نہیں لائی تھی بظاہر ہے کہ ٹیلی ویژن ریڈیو سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔"

لیکن مجتبیٰ بات کو یہیں ختم نہیں کرتے اس کی وضاحت کرنے لگتے ہیں۔

اس مسئلہ پر اگر امر تسر کا لڑکا اپنی بیوی کی ٹانگ توڑتا تو بات مناسب نہیں تھی ٹیلی ویژن کی قیمت کا اندازہ کرتے ہوئے یہ ضروری تھا کہ وہ اپنی بیوی کا گلا گھونٹ دے یہ سراسر حساب کا معاملہ ہے۔

اس کی یہ ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ انھوں نے اخبار کے قاری کو مدِ نظر رکھ کے یہ تحریر لکھی ہوگی۔ ادب کے قاری اور اخبار کے قاری کے معیار اور ذہنی سطح میں فرق تو ہوتا ہی ہے شاید اسی لئے مجتبیٰ کو زیادہ وضاحت کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کبھی کبھی ان کی زبان میں وہ روانی نہیں رہ جاتی اور تکرار سقم بن جاتی ہے۔

مثلاً اس خبر کو پڑھنے کے بعد ہم کافی دہشت زدہ ہو گئے ہیں یہی وجہ ہے کہ کل سڑک پر چلتے ہوئے جب ایک شخص نے ہم سے سگریٹ جلانے کے لئے دیا سلائی کی ڈبیہ مانگی تو ہم نے بجلی کی سرعت کے ساتھ دیا سلائی کی ڈبیہ اسے نکال کر دے دی اور قبل اس کے کہ وہ ڈبیہ واپس کرتا ہم وہاں سے ایک میل آگے نکل گئے۔"

یہاں ڈبیہ کی تکرار اور کے کہ کا استعمال مجتبیٰ کی خوبصورت تحریر سے میل نہیں کھاتے — یا

"یوں بھی جلوس میں ایسے افراد کی اکثریت ہوتی ہے جو صرف تفریحاً جلوسوں میں شامل ہوتے ہیں ایسے جلوسوں سے بہتر تو یہی ہے کہ گدھوں کا جلوس نکالا جائے۔ پھر گدھوں کو جلوس میں شرکت کرنے کے لئے کوئی معاوضہ بھی نہیں دینا پڑتا اور آپ تو جانتے ہیں کہ اکثر جلوسوں پر پولیس لاٹھی چارج بھی کرتی ہے اور جیسے ہی لاٹھی چارج ہوتا ہے جلوس منتشر ہو جاتا ہے گدھوں کے جلوسوں پر لاٹھی چارج شروع ہو تو گدھے اتنی آسانی سے نہیں بھاگیں گے؟

یہاں جلوس اور جلوسوں کی تکرار کھلتی ہے اور ایسا لگتا ہے مجتبیٰ حسین کفایت لفظی سے کام نہیں لے رہے ہیں؛

مجتبیٰ حسین اردو ادب کے ان چند مزاح نگاروں میں سے ہیں جو ساری اردو دنیا میں جانے جاتے ہیں اور بعض دنیائیں اردو کو ان کے توسط سے جانتی ہیں انکی تحریروں میں ایک رچاؤ اور پختگی آ گئی ہے اس دوران انھوں نے دنیا کے کئی ممالک کا سفر بھی کیا ہے اپنے اس وسیع تجربات اور مشاہدات سے وہ کالم نگاری کو مالا مال کر سکتے ہیں لیکن بدقسمتی سے انھوں نے کالم لکھنا بند کر دیا ہے

❊ ❊ ❊

مرتب: سید حسن جاوید صدیقی

چند ادیبوں کے خطوط — مجتبیٰ حسین کے نام

مجتبیٰ حسین کے نام ان کے احباب، مداحوں اور چند ادیبوں اور دانشوروں کے خطوط کا انتخاب کرتے ہوئے مجھے کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اوّل تو مجتبیٰ صاحب خطوط کا جواب دینے کے معاملے میں نہایت سست واقع ہوئے ہیں اور اس وقت تک کسی کے خط کا جواب نہیں دیتے جب تک خط لکھنے والے کی کوئی اہم بات یا ضرورت توجہ طلب نہ ہو۔ اپنے نجی خطوں میں وہ کبھی ادب یا حالاتِ حاضرہ کو زیرِ بحث نہیں لاتے۔ ان کا خیال ہے کہ نجی خطوط کے ذریعہ نہ تو حالاتِ حاضرہ کو بہتر بنایا جا سکتا ہے اور نہ ہی ادب کے مسائل کا کوئی حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ان کے نام آئے ہوئے سیکڑوں خطوط میں نے دیکھے ہیں اور ان خطوط میں بیشتر خطوط وہی ہیں جو ان کے دہلی آنے کے بعد انھیں وصول ہوتے رہیں۔ حیدرآباد کے قیام کے دوران ان کے نام جو خطوط آئے تھے، ان میں سے اکثر یا تو تلف ہو چکے ہیں یا جن کا اب سراغ ملنا بھی دشوار ہے۔

چونکہ مجتبیٰ حسین عملی زندگی میں کبھی ادیب کی زندگی جینے کی کوشش نہیں کرتے اور ہر وقت اپنے انسان ہونے کو مقدم تصور کرتے ہیں اور بحیثیت انسان دوسرے انسان کے کام آنے کو اپنا فرض جانتے ہیں اسی لیے ان کے نام آئے ہوئے اسّی فیصد خطوط (جن میں بعض نہایت اہم اور نامور شخصیتوں کے خطوط بھی شامل ہیں) ایسے ہیں جو مکتوب الیہ کی ضرورتوں، اور تقاضوں پر محیط ہیں۔ بعض بڑی شخصیتوں اور نامور ہستیوں، جن کی شہرت کے چہار دانگ عالم میں ڈنکے بجتے ہیں، کے خطوط کو جو مجتبیٰ حسین کے نام آئے ہیں، شائع کر دیا جائے تو بہت سوں کی نیک نامی خطرے میں پڑ سکتی ہے مگر میں نے ان کے خطوط کو اس انتخاب میں شامل کرنے سے گریز کیا ہے۔ (ہو سکتا ہے کہ یہ خطوط بعد میں بہت سی شخصیتوں کو سمجھنے میں مدد دے سکیں) میں نے اس انتخاب میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ ان خطوط کو شامل نہ کروں جو کسی دکسی غرض یا مفاد کے تحت مجتبیٰ حسین کو لکھے گئے تھے۔ ان کے نام آئے ہوئے بے شمار خطوط میں سے چند خطوط کا انتخاب کرنا بہت دشوار کام تھا۔ مجھے ان خطوط کے انتخاب کے سلسلے میں مزید کچھ نہیں کہنا ہے۔ ہمارے یہاں سطور سے زیادہ بین السطور کی ہمیشہ اہمیت رہی ہے بلکہ سطور لکھتے ہی بین السطور کے لیے ہیں۔ لوگ تو خط کا مضمون تک لفافے کو دیکھتے ہی بھانپ لیتے ہیں۔ یہ تو خط ہیں جو اردو کے ایک قلندر صفت بے لوث ادیب کے نام لکھے گئے ہیں۔ بین السطور سے آپ مطلب رکھیں۔ میرا کام تو ان خطوں کو اس طرح پیش کرنا ہے کہ کہیں آبگینوں کو ٹھیس نہ لگ جائے (آبگینے میرے نہیں، مجتبیٰ حسین کے)۔

مجھے امید ہے کہ یہ خطوط نہ صرف قارئین کی دلچسپی کا سبب بنیں گے بلکہ ان سے مجتبیٰ حسین کی شخصیت کو سمجھنے اور خود ان احباب کی شخصیتوں کو سمجھنے میں بھی مدد ملے گی جنھوں نے یہ خط لکھے ہیں۔

فہرستِ خطوط

۷. خورشید الاسلام
۸. خواجہ عبدالغفور
۹. رضا نقوی واہی
۱۰. سید ہاشم علی
۱۱. پروفیسر پی. ایل. ملہوترہ
۱۲. محمد علی صدیقی
۱۳. حفیظ الکبیر قریشی
۱۴. لدمیلا واسیلیوا
۱۵. اسمٰعیل آذر
۱۶. فیاض احمد فیضی
۱۷. منظر سلیم
۱۸. مسز شاشورے
۱۹. حبیب حیدرآبادی
۲۰. جہانگیر انس
۲۱. راشد آذر
۲۲. ڈاکٹر معین الدین عقیل
۲۳. عزیز قیسی
۲۴. پروفیسر نثار احمد فاروقی
۲۵. جوہر سیوانی
۲۶. ساحر ہوشیارپوری
۲۷. محسن جلگانوی
۲۸. گیان سنگھ شاطر
۲۹. شریف اسلم
۳۰. افتخار عارف
۳۱. شہزاد منظر
۳۲. ڈاکٹر اطہر پرویز
۳۳. شفیقہ فرحت
۳۴. مسز اسانو
۳۵. تاجدار احتشام
۳۶. قاضی سلیم
۳۷. شاذ تمکنت
۳۸. احمد جمال پاشا
۳۹. پروفیسر وحید اختر
۴۰. کنہیا لال کپور
۴۱. سلیمان خطیب
۴۲. انتظار حسین
۴۳. یوسف ناظم
۴۴. عمیق حنفی
۴۵. حمایت علی شاعر
۴۶. نریندر لوتھر
۴۷. مشفق خواجہ
۴۸. وجاہت علی سندیلوی
۴۹. غلام احمد فرقت
۵۰. بھارت چند کھنہ
۵۱. پروفیسر جگن ناتھ آزاد
۵۲. پروفیسر سوزوکی تاکیشی
۵۳. دلاور فگار
۵۴. مسیح انجم
۵۵. حکیم منظور
۵۶. تقی تنویر
۵۷. کیلاش ماہر
۵۸. رشید قریشی
۵۹. شہریار
۶۰. پروفیسر اسادہ
۶۱. منصور قیصر
۶۲. مسرور خورشید
۶۳. پریم شنکر شریواستو
۶۴. عطاء الحق قاسمی
۶۵. عاصم قادری
۶۶. جمیل عادیہ
۶۷. اختر حسن
۶۸. ڈاکٹر افضل اقبال
۶۹. کرشن فہمی
۷۰. ارشاد پنجتن
۷۱. احمد یوسف
۷۲. سکندر توفیق
۷۳. ظفر گورکھپوری
۷۴. شمس مینائی
۷۵. مظہر امام
۷۶. حمایت اللہ
۷۷. اقبال متین
۷۸. کیشوراؤ
۷۹. ڈاکٹر اخلاق اثر
۸۰. ہلال رضوی
۸۱. اسد اللہ
۸۲. لائق حسین
۸۳. ہری جوشی
۸۴. ایرینا میکسلمینکوف

۵۵

راجندر سنگھ بیدی

بمبئی

۱۸ر جولائی ۱۹۶۷ء

مکرمی مجتبیٰ صاحب! تسلیم!

آپ کے خلوص کے پیشِ نظر میں خود کو "مشتبیٰ" گرداننے لگا ہوں۔ پہلے کا جواب لکھ کر رکھا تھا کہ آپ کا دوسرا خط آگیا۔ چنانچہ پہلے جواب کو پھاڑ کر پھینک دیا اور فی الفور دوسرا لکھا ـــ عجلت میں تاکہ اسے پوسٹ کرنے سے پہلے کہیں ڈاکیہ ہی نہ آجائے۔

میں زندگی کے حالات پیدائش سے موت تک یوسف ناظم صاحب کی نذر کر چکا ہوں۔ اور ایک تصویر بھی جو آپ کے جشنِ مزاح کے لیے کافی ہوگی۔ اس پر طرفہ آپ خطبۂ صدارت مانگتے ہیں۔ میں خطبہ لکھنے کی کوشش ضرور کروں گا کہ آپ سے دوستوں کی فرمائش ہے مگر یہ کب ہو سکے گا، کہہ نہیں سکتا۔

سووینیر کے لیے ایک سیفٹی مضمون "بیوی یا بیماری" بھجوا رہا ہوں یوسف ناظم کی معرفت، تاکہ سووینیر نہ رک جائے۔

اس فقرے کو غور سے پڑھیے ـــ لوگ جشنِ بیدی منانا چاہتے ہیں'۔۔۔ کیا آپ کے خیال میں درست ہوگا۔ ایک مہمان کے ساتھ ایسا سلوک اچھا لگے گا؟ کیا آپ کے خیال میں شبِ افسانہ کافی نہیں؟ اگر ۱۲ر ۱۳ر کو جشنِ مزاح ہو تو ۱۴ر کی شام کو شبِ افسانہ ہو جائے تاکہ میں آزادی کا دن بمبئی میں منا سکوں۔۔۔۔

حیدرآباد میں دوستوں سے ملنے کے سلسلے میں ابھی سے میرا خون خچر ہونے لگا ہے۔ جگر صاحب کے الفاظ میں آپ کے تغافل سے تو نہ مروں گا' البتہ کرم بے حساب مجھے مار سکتا ہے ـــ ان دنوں بیمار ہوں۔ زیادہ کھا سکتا ہوں نہ پی سکتا ہوں۔ میرے اعزاز میں آپ لوگ کھائیں گے پیئیں گے تو مجھے بے حد خوشی ہوگی۔

جشن کا افتتاح مخدوم صاحب ایسی شخصیت سے کروائیے۔ گورنر یا چیف منسٹر سے کروایا تو خواہ مخواہ ان سے الجھنے کو جی چاہے گا۔ اگر اس میں کچھ 'سیاست' ہے تو عابد صاحب بہت ہیں ـــ مخدوم صاحب اور عابد صاحب کی خدمت میں میرے سلام۔

یوسف ناظم اسسٹنٹ کمشنر لیبر کو میں نے کل ایک میٹرنٹی ہوم کے سامنے چکر کاٹتے دیکھا ہے۔

آپ کا: راجندر سنگھ بیدی

کرشن چندر

بمبئی

۲۵ر مارچ ۱۹۷۴ء

پیارے مجتبیٰ!

مہندر جی ہمیں اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔ ۲۰ر مارچ کو میں صبح دلی پہنچا۔ ۲۰ر مارچ کو صبح میں ہی انھیں دل کا شدید دورہ پڑا۔

۱۳ر مارچ کو وہ ختم ہوگئے تو بس ان کا ابدی نیند میں ڈوبا ہوا چہرہ دیکھا۔ جن ہاتھوں سے اسے گود میں کھلایا تھا ان ہی ہاتھوں سے اسے آگ کے سپرد کردیا۔

دلی اور حیدرآباد میں احباب کو بتا دینا۔ مجھ سے سب کو لکھا نہیں جائے گا۔ خلیق انجم سے ٹیلی فون پر بات ہوئی تھی کہ میں فوراً لوٹ رہا ہوں۔ زیدی صاحب کو بھی بتا دینا اور دوسرے دوستوں کو بھی۔

تمہارا اپنا، کرشن چندر

سہیل عظیم آبادی

پٹنہ

۱۲ر جنوری ۱۹۷۸ء

برادرم ـ محبت!

مرحوم ابراہیم جلیس سے متعلق تمہارا مضمون پڑھا۔ آنکھیں بھیگ گئیں۔ اللہ نے مرحوم کو ذہانت اور لطافت کے ساتھ تیز قلم عطا فرمایا تھا۔ وہ ابھرے ہی تھے کہ پاکستان نے ان کو ہم لوگوں سے چھین لیا اور اب موت نے سب چھین لیا۔ مرحوم سے میری ذاتی ملاقات نہیں تھی۔ ملنے کا موقع کبھی نکل نہیں سکا۔ مگر میں دل سے ان کا مداح ہوں۔ ہم لوگوں کے بعد جو نسل افسانہ نگاری کے میدان میں آئی تھی ان میں وہ بہت ہی ممتاز شخصیت کے مالک تھے مجھے ان سے شکایت تھی کہ پاکستان جا کر وہ افسانہ نویس سے اخبار نویس بن گئے تھے۔ لیکن کون جانتا ہے۔ زندگی کس کو کس راستے پر گھسیٹ لے جائے۔

مجھے یہ تو علم تھا کہ [illegible] مرحوم محبوب حسین جگر صاحب کے چھوٹے بھائی تھے۔ تمہارے اس مضمون سے معلوم ہوا کہ تم تینوں بھائی تھے۔ میں کتنا کم علم آدمی ہوں۔ ابراہیم جلیس کی موت واقعی اردو ادب کا المناک حادثہ ہے۔ خدا کرے تم اچھے ہو۔

خیر اندیش: سہیل عظیم آبادی

فکر تونسوی

نئی دہلی

۷ر اپریل ۱۹ء

(۱) مجتبیٰ صاحب! آپ کی اشتعال انگیز دعوت مل گئی۔ یوں لگتا ہے وسط مئی کا وقت آپ نے اس لئے چنا ہے کہ ادھر چل انڈا چھوڑے ادھر مزاح نگار اپنے پران چھوڑ دیں۔ ارے بھائی! مئی میں لوگ ہل اسٹیشن پر جاتے ہیں اور آپ مزاح نگاروں کو حیدرآباد کی لو کھانے کے لئے بلا رہے ہیں کہ وہ لوگوں کو ہنسائیں اور خود زار و قطار روئیں۔ یہ کون سے ناکردہ گناہوں کی سزا ہے جو آپ ہمارے مزاح نگاروں کو دینا چاہتے ہیں۔

مزاح نگاروں کا اجتماع ایک خوبصورت خیال ہے۔ لیکن ذرا آپ کو یہ اطلاع پہنچے کہ کنہیا لال کپور موگا سے گاڑی پر چڑھے تو پانی پت اسٹیشن پر جنت سدھار گئے۔ اور غلام احمد فرقت دہلی اسٹیشن تک پہنچتے پہنچتے راستے میں ہی پہنچ گئے، انا للہ ہو گئے اور فکر تونسوی بمبئی تک تو پہنچ گئے تھے اس کے بعد کے حالات تاریکی میں ہیں کہ ان پر کیا گذری۔

تو بھیا! میری مانو۔ اگر پونہ بزرگوں کی نصیحت زہر لگتی ہے کہ اس ہنستی کھیلتی کانفرنس کو کسی خوشگوار موسم پر ٹال دو۔ البتہ اگر آپ بضد ہیں تو میں اپنی لاش یہاں سے پارسل کرکے کانفرنس میں بھیج دوں گا۔

میرے بقول آپ کے حیدرآباد کے لاکھوں مداح یہ سن کر بڑے خوش ہوں گے کہ ان کے محبوب طنز نگار فکر تونسوی نے مئی کے مہینے میں مرنے سے انکار کر دیا۔

لکھئے، کچھ اثر پڑا میری دانشمندانہ حماقت سے ——— فکر تونسوی ———

(۲) ۹؍اپریل ۱۹۶۶ء

مجتبیٰ جی! ایک اور خط میرا نہیں آپ ——— اور مجھے یوں لگا کہ اگر کانفرنس نہ ہوئی تو منتظمین میں سے کسی نہ کسی کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ اور فرشتے مجھے گھسیٹتے پھریں گے کہ یہی قاتل ہے۔

ابھی ابھی ایک دوست نے حیدرآباد کی سخت تعریف کی، بلکہ حیدرآباد سے بھی زیادہ اس ریل گاڑی کی جو حیدرآباد جاتی ہے۔ نجانے تعریف کا اثر تھا یا آج کی موسمی رپورٹ کا کہ میں جذبات کی رو میں بہہ گیا۔ اور فیصلہ کر لیا کہ حیدرآباد ضرور جاؤں گا۔ گرمی ہو یا خزاں انسانیت کی خدمت تو کرنی ہی چاہئے۔

امید ہے آپ خوشی سے دیوانے ہو گئے ہوں گے۔

مندرجہ ذیل امور پر روشنی ڈالئے:

۱ کس تاریخ کو حیدرآباد پہنچنا لازمی ہے۔
۲ کرائے جانے کا کرایہ کب ملے گا؟ زادِ راہ کے بارے میں اخلاقی پوزیشن کیا ہے؟
۳ کانفرنس میں صرف ایک طنزیہ مضمون پڑھنا ہوگا یا کچھ اور بھی (مثلاً ریزولیوشن کی ڈرافٹنگ وغیرہ)
۴ یہ مضمون مطبوعہ ہونا چاہئے یا غیر مطبوعہ؟
۵ دہلی سے میرے علاوہ کون صاحب ہیں جو آمادگی ظاہر کر چکے ہیں؟ تاکہ ہمرکابی کی جا سکے۔
۶ سوونیر کے لئے تقریر اور لائف اسکیچ بھیجنے کی ڈیڈ لائن۔
۷ وہ بات جو میں پوچھنا بھول گیا ہوں، اسی کا جواب بھی لکھ بھیجئے ——— فکر تونسوی ———

(۳) ۱۲؍اپریل ۱۹۶۶ء

مجتبیٰ صاحب! تمہارا چوتھا خط ملا۔ میرا یہ پانچواں خط ہے۔ تم نے لمبے لمبے خط لکھ کر مجھے اتنا متاثر کیا کہ ابھی جی چاہتا ہے کہ کانفرنس کی بجائے یہ خط و کتابت ہی چلتی رہی تو ہندوستان کو زیادہ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

ارے بھائی! میں حیدرآباد جانے کے لئے یہاں اتنا پروپیگنڈا کر چکا ہوں کہ اب اگر نہ جاؤں تو لوگ کہیں گے، جھوٹا، دغاباز، چنانچہ اپنی اس تکنیکل غلطی اور تمہاری طوالت خطوط کے ہاتھوں نالاں ہو کر حیدرآباد ضرور آؤں گا۔ گرمی کا بہانہ تو ابتدائی بہانہ تھا۔ اب تو اس سے آگے کئی منزلیں گزر چکی ہیں۔

لہٰذا ہپ ہپ ہرّے!

لیکن میرے انتقامی جذبے کو جب تسکین ملے گی۔ جب آپ کنہیا لال کپور اور فرقت کو جا ہے ہاتھی پر لاد کر ہی حیدرآباد لے آئیں اور رشید احمد صدیقی صاحب بھی تشریف لا رہے ہیں یا نہیں! میں یہ سب کچھ اس لئے لکھ رہا ہوں تاکہ با جماعت جنازے انہیں قبرستان میں پہنچا دئے جائے۔ ورنہ کانفرنس کی ناکامی کے لئے تو میں اکیلا ہی کافی ہوں۔

کرائے کے روپے ابھی تک نہیں ملے۔ مل جائیں تو بد اخلاق بننے کا چانس کم ہو جائے گا ورنہ پیسہ ہی تو بے تمیزی کا ضامن ہوتا ہے۔
اور کیا لکھوں آؤں گا، ہم آؤں گا، آؤں گا، نہیں آؤں گا تو میری رسوائی تو ہو گی ہی۔ سالگ آپ کی گردن بھی ناپ لیں گے۔
ایک خط اور لکھو ورنہ کانفرنس کے بعد تو آپ خط بھی نہ لکھیں گے ——— فکر تونسوی

(۴) ۴ر جون ۱۹۶۷ء
بھائی مجتبیٰ! کہاں ہو؟ تمہاری خاموشی تو میرے ٹائیفائیڈ سے بھی زیادہ جانکاہ بن رہی ہے ——— دو خط لکھ چکا ہوں کہیں تم ناراض تو نہیں ہو گئے۔
میرے جرم کی سزا تم خود ہی تجویز کرو۔ میں ابھی تک ٹائیفائیڈ کے مابعد اثرات کا مقابلہ کر رہا ہوں۔ گھر میں ہی پڑا ہوں۔ دفتر تک جانے کی سکت بھی نہیں۔ بستر پر پڑے پڑے کالم لکھے جا رہا ہوں ——— فکر تونسوی

مولانا عبدالوحید صدیقی
بانی ایڈیٹر "نئی دنیا" دہلی

——— نئی دہلی

۲۰ر جون ۱۹۷۳ء
مکرمی! سلام مسنون! ——— دوسرا جام بکف آج مل گیا۔ خوب ہے۔ کتابیں شاہد میاں لائے تھے، ان سے آپ کے شکریہ کے ساتھ بھرپور استفادہ کیا جائے گا۔ یہ آپ نے اچھا کیا کہ مزاح نگاروں کی تصویروں کے لئے لکھ دیا ہے۔ کاش ان میں سے کچھ حضرات اپنی غیر مطبوعہ تخلیقات بھی عنایت فرماتے ——— مجھے ان کے پتے معلوم ہوں تو ان کے نام "واقعات" جاری کر دوں اپنی تصویر بھی جلد بھیج دیجئے۔
اس میں شک نہیں کہ میں "نئی دنیا" کے سلسلے میں بے حد مصروف ہوں۔ پہلے شمارے کی کتابت ہو رہی ہے۔ انشاءاللہ ۲۴ یا ۲۵ر جون تک کاپیاں اور نگیٹو طباعت کے لئے چلی جائیں گی۔ شاہد میاں سے آپ کا حوصلہ افزا پیغام کہہ دیا ہے۔ وہ خود آپ کی پُرخلوص عنایات سے فائدہ اٹھائیں گے ——— خدا آپ کو اپنے افضال سے نوازے۔ والسلام
آپ کا، عبدالوحید صدیقی

ابراہیم جلیس

——— کراچی (پاکستان)

عزیزم مجتبیٰ حسین ——— السلام علیکم!
تفصیلی خطوط تمہارے نام اور بڑے بھائی جان کے نام پرسوں پوسٹ کر چکا ہوں۔ فی الحال یہ خطوط عبدالرحمٰن صاحب کو پہنچانا چاہتا ہوں کہ لڑکے رحیم میاں کو دے دو کہ وہ ان خطوط کو فوراً بجھوا دیں۔

بڑے بھائی جان کا خط پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ان کو بھی الگ سے تفصیل خط لکھا ہے۔ میں اکتوبر میں الفرڈ والٹن میلے میں تاشقند جا رہا ہوں۔ تین ماہ تک بسلسلہ سودیت یونین کا دورہ کروں گا۔ وہاں سے تمہیں پھر خط لکھوں گا۔ تمہاری بیگم اور بچوں کو دعائیں مجھے صرف راشدہ کا نام یاد ہے۔ باقی بچوں کے نام بھی لکھو۔ تمہارا : ابراہیم جلیس

خورشید الاسلام

علی گڑھ

(۱) ۵ر مارچ ۱۹۷۹ء

برادر عزیزم ـــــ سلام شوق!

آپ کی ترقی کی خبر آپ کے خط سے پہلے مل چکی تھی۔ بے حد خوشی ہوئی۔ میں آپ کو عزیز رکھتا ہوں اور آپ کا دعاگو ہوں ـــــ خدا آپ کو ہمیشہ کامیاب اور تندرست رکھے ۔ آپ کا : خورشید الاسلام

(۲) ۲ر جنوری ۱۹۸۴ء

عزیزم ۔ خدا تمہیں ڈیڑھ سو برس کی عمر صحت اور خوشیوں کے ساتھ عطا کرے ۔

دنیا میں بیشتر لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ جن کی ہمدردی شکریہ کی مستحق ہوتی ہے ۔

تم ان لوگوں میں سے ہو جن کی کسی مدد کا شکریہ ادا کرنا توہین کے مترادف ہوتا ہے ۔

مسلسل مخلصانہ تعلقِ خاطر، شکریہ کا محتاج نہیں ہوتا۔

میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ ـــ تمہارا بڑا بھائی ـــــ خورشید الاسلام

(۳) ۲۱ر فروری ۱۹۸۶ء

عزیز گرامی قدر مجتبیٰ صاحب

میرا ایک عرصہ دہلی آنا نہیں ہوا۔ آپ سے ملنے اور باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے، البتہ میں آپ کو وقتاً فوقتاً یاد کرتا رہتا ہوں۔ ابھی پرسوں آپ کے بارے میں ایک صاحب سے باتیں کر رہا تھا۔ انہیں میری باتوں پر (آپ کی تعریف پر) حیرت کے ساتھ خوشی محسوس ہوئی۔ جس کا اظہار بھی انھوں نے کیا۔ آپ علی گڑھ آتے ہی نہیں۔ علی گڑھ آئیے اور میرے یہاں ٹھہریے ۔

نارنگ کی خیریت بھی عرصے سے معلوم نہیں ہوئی۔ یہ تک معلوم نہیں ہوا کہ وہ دہلی یونیورسٹی میں آگئے یا نہیں؟

آج صبح شمس الرحمٰن فاروقی اور آپ کی طرف سے ایک دعوت نامہ موصول ہوا۔ آپ دونوں نہایت قابلِ تعریف ہیں کہ آپ ایک بزرگ ادیب کی پذیرائی کے لئے ایک جشن کر رہے ہیں ۔ خدا اسے کامیاب کرے۔

آپ کا دعاگو اور محب

خورشید الاسلام

خواجہ عبد الغفور — آئی۔ اے۔ ایس

بمبئی

۱۹۷۶ء

عزیزم السلام علیکم!

آپ کا خط اور خاکہ ملا۔ خاکہ پُر لطف ہے لیکن میری ناقص رائے میں "لطیفوں کے کمشنر" والا خاکہ زیادہ دلچسپ ہے اور بے ساختہ ہے البتہ اس نئے مضمون میں کچھ تھوڑی سی چیزیں اضافہ کی گئی ہیں پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ اس پرانے ہی میں خاطر خواہ ترمیم و اضافہ کیا جائے تو آپ کے مجموعہ کے لائق ہوگا۔ ورنہ ہم جیسوں کو آپ چاہے کتنی ہی کھینچ تان سے اوپر لائیں اس مجموعے میں شائع کرنے کے لائق نہ ہوں۔ اتفاقیہ کٹنگ مل گئی جو مرسل ہے۔ احتیاط سے رکھئے اور بعد میں لوٹا دیجئے یہ ہمیں بہت پسند ہے۔ کرشن کا خاکہ ضرور مکمل کرکے عطا کیجئے۔ میں منتظر رہوں گا۔ آپ کے زیر طبع مجموعہ کے تعلق سے مجھے خیال آیا کہ میں ایک مضمون ترتیب دے رہا تھا خاکہ نگاری پر اور خاکہ نگاروں پر۔ اس کے آخری حصہ کو بدل کر اس پورے مضمون کو ہی آپ سے متعلق کر دوں گا۔ اگر یہ پسند خاطر ہو تو بعد ملاحظہ واپس فرمائیں تاکہ اس کو مکمل کر دوں یا اسی کو کافی سمجھتے ہوں تو اس کو بطور تعارف یا کسی اور ڈھنگ سے استعمال کر لیجئے۔ آمنہ اور اکبر کو پُر خلوص سلام شوق، بچوں کو پیار — فقط تمہارا خواجہ عبد الغفور

رضا نقوی واہی

پٹنہ

۱۰ر دسمبر ۱۹۷۹ء

مجبی مجتبیٰ حسین، خوش رہئے —

ایک طویل مدت کے بعد خط لکھ رہا ہوں لیکن کوئی ندامت نہیں ہے۔ کیونکہ آپ نے بھی اس مدت میں میری خبر نہیں لی! برابر کی چوٹ رہی — جہاں تک تغافل کا معاملہ ہے۔

حیدرآباد کے فسادات کی خبر نے تردد میں مبتلا کر دیا ہے۔ دریافتِ خیریت کے لئے وہاں کے چند احباب کو فساد کے دوران ہی خط لکھا تھا، لیکن کسی کا جواب نہ آیا۔ خدا کرے سب لوگ بخیریت ہوں۔ آپ کے بارے میں شگوفہ میں من موہن تلخ کا مضمون پڑھا بہت پسند آیا۔ دعا ہے کہ نظر لگے نہ کہیں تیرے دست و بازو کو

زندہ دلان کی سالانہ تقریبات کا علم بھی شگوفہ کے ہی ذریعہ ہوا کہ کون کون فنکار شریک ہوئے۔

۹ر دسمبر کو کل ہند جشنِ ظرافت کمیٹی کی پہلی میٹنگ میرے ہاں ہوئی۔ مشہدی اور شبیر بھائی وغیرہ شریک ہوئے۔ طے پایا کہ ۲۴ر اور ۲۵ر فروری کو جشنِ ظرافت منعقد کیا جائے۔ ۲۴ر کو سمینار اور ادبی نشست اور ۲۵ر فروری کی شام لطیفہ کے بعد مزاحیہ مشاعرہ کا پروگرام منظور ہوا۔ میں نے مشہدی کی رائے سے جو فہرست شرکا طے کی ہے وہ حسب ذیل ہے

ادبی نشست ۔ مجتبیٰ حسین، فکر تونسوی، یوسف ناظم، نریندر لوتھرا اور شفیقہ فرحت، سیمنار ۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی (بھوپال) اور چند بہار کے پروفیسر حضرات ۔ مشاعرہ حمایت اللہ، مصطفےٰ علی بیگ، بوگس، طالب خوندمیری، محمود شیر، ناظم انصاری، مشتاق پردیسی، ہلال سیوہاروی، آفتاب لکھنوی، اور پٹنہ و بہار کے چند شعراء۔

اس فہرست میں اگر ترمیم یا اضافہ کی ضرورت محسوس ہو تو آپ فوراً لکھئے۔ ہم لوگ آپ کو جشنِ ظرافت کمیٹی کا ایک اہم رکن سمجھتے ہیں ۔ دوسری بات یہ کہ فکر تونسوی صاحب کو اس بار ضرور پٹنہ کی سیر کرائیے ۔ انہیں یہاں آنے کے لئے آمادہ کیجئے اور بہلا پھسلا کر ساتھ لیتے آئیے تیسری بات یہ ہے کہ ہم لوگ کئی سال سے حمایت اللہ کو مدعو کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ لیکن وہ ہر بار جھکائی دے کر نکل جاتے ہیں ۔ ممکن ہے "ہوم ڈپارٹمنٹ" مشاعروں میں آوارہ گردی سے انہیں روکتا ہو ۔ اگر واقعی یہ بات ہو تو آپ براہِ راست "ہوم منسٹر صاحبہ" کو لکھئے کہ 'پیرول' پر حمایت صاحب کو (جشنِ ظرافت کمیٹی کی ضمانت پر) رہا کر دیں تاکہ وہ مشاعرہ میں آپ بیتی سنانے کا موقع نکال سکیں۔

اس بار ہم لوگ بہار کے گورنر اے ۔ آر ۔ قدوائی صاحب کو PATRON بنانے والے ہیں ۔ دو ایک دن میں ان سے ملاقات کی جائے گی ۔ اس کے بعد فنڈ اکٹھا کرنے کا کام شروع ہوگا ۔ ہاں اس مرتبہ سووینیر نکالنے کا بھی پروگرام ہے خدا کرے سب کام اچھی طرح انجام پائے ۔

بقیہ اللہ کا فضل ہے جواب کا شدت سے انتظار رہے گا ۔ ــــ رضا نقوی واہی

سید ہاشم علی ۔ وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

ــــــــــ علی گڑھ

۱۲ مئی سنہ ۱۹۸۶ء

مائی ڈیر مجتبیٰ !

تمہارے ۷ مئی سنہ ۱۹۸۶ء کے خط کا شکریہ جدید تقسیم اسناد سچ مچ بے حد شاندار ہے مگر ٹی وی والوں کے پاس نہ تو وائس چانسلر کو جو اس تقریب کا سب سے اہم فرد تھا ' دکھانے کا سلیقہ تھا اور نہ ان میں اتنا احساسِ جمال تھا کہ وہ رائیڈنگ کلب کے خوش لباس اور خوش شکل لڑکوں کو یا اس اجتماع کو جس میں کئی اہم شخصیتیں شامل تھیں ' ڈھنگ سے پیش کرتے ۔ وہ صرف اتنا ہی جانتے تھے کہ کیمرہ کی آنکھ کو صرف ایک چہرے پر مرکوز ہونا ہے ۔ اور تقریب سے وابستہ اس خوبصورتی کو وہ بالکل فراموش کر گئے جو چہار سو پھیلی ہوئی تھی۔

میں یہ نہیں جانتا کہ سیاستدانوں کے ذہنوں پر میری تقریر نے کیا اثر مرتب کیا اور مجھے تو شبہ ہے کہ سیاستدانوں کی پالیسی میں تبدیلی کے لئے میری تقریر اثر انداز ہوئی ہو اور اس کی رپورٹنگ بھی ہوئی ہو ۔

غالباً شہریار نے بتایا کہ تم علی گڑھ آ رہے ہو ۔ میں تم سے ملاقات کا منتظر ہوں ۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں انگریزی میں جواب دے رہا ہوں لیکن اگر میں نے تمہیں اردو میں جواب دینے کی کوشش کی ہوتی تو کیا عجب روزِ محشر آجاتا اور میں تمہیں جواب بھی نہ دے پاتا ۔ محبتوں کے ساتھ ، سید ہاشم علی ۔

(نوٹ : انگریزی سے ترجمہ کیا گیا) ۔

پروفیسر پی۔ ایل۔ ملہوترہ (ڈائرکٹر این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی)

نئی دہلی

۷؍جولائی ۱۹۸۴ء

تانی ڈیر مجتبیٰ حسین! مجھے یہ جان کر بے پناہ مسرت ہوئی کہ تم نے وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے ہاتھوں غالب انعام جیسا قابلِ فخر انعام حاصل کیا ہے۔ میری دلی مبارکباد اور نیک تمنائیں قبول کرو۔

نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ اردو ادب کے لئے تمہاری خدمات کو تسلیم کرتی ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ مستقبل میں ایسے کئی اعزازات قبول کروگے۔ نیک خواہشات کے ساتھ

پی۔ ایل۔ ملہوترہ ــــــ ڈائرکٹر نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ۔ نئی دہلی۔

محمد علی صدیقی

کراچی (پاکستان)

۲۳؍مئی ۱۹۸۶ء

برادرِ محترم مجتبیٰ حسین صاحب ــــ تسلیمات!

بہت تاخیر کے ساتھ آپ سے سلسلۂ جنبانی کا آغاز کر رہا ہوں۔ کراچی واپس لوٹے پورے تیس (۳۰) دن گذر چکے ہیں۔ دہلی یاترا کے قصے یا ناقصے سنا سنا کر تھک چکا ہوں۔ جو گیندر پال کے یہاں آپ تشریف لائے اور ملاقات کا موقع عنایت کیا۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی قیمتی کتابوں کا تحفہ بھی۔ ابھی صرف دو کتابیں نظر سے گذری ہیں۔ میں اعتراف کرتا چلوں کہ ان مضامین کے جو وقتاً فوقتاً نظر سے گذرتے رہے ہیں۔ میں نے آپ کا بالاستیعاب مطالعہ اب شروع کیا ہے۔ رمضان میں روزہ دار ہونے یا رہنے کے سلسلے غالباً روزہ کی شرط نہیں۔ سہ پہر سے شام تک کافی وقت مل رہا ہے۔ کل شہریار رحلیس سے پریس کلب میں ملاقات ہوئی۔ وہ حال ہی میں نیویارک سے آئے ہیں۔ میں نے ان سے آپ کا ذکر کیا ــــ ابراہیم جلیس صاحب سے میرے تعلقات بہت ہی اچھے اور برادرانہ تھے۔ آپ نے کیا خوب لکھا ہے۔ سب ہی خاکے لاجواب ہیں۔ میں بعض بعض جملوں پر عش عش کر اٹھا۔ زیادہ سخن فہم حضرات نے زیادہ حظ اٹھایا ہوگا لیکن میں اس قدر ضرور عرض کروں گا کہ آپ یقینی طور پر صاحبِ طرز ادیب ہیں۔ کچھ نہ کچھ اردو یا انگریزی میں (تبصرہ یا مضمون) لکھنے کا ارادہ ہے۔ واللہ اعلم یہ کام کب تک میرے اور آپ کے درمیان ایک وعدے کے طور پر سوالیہ نشان بنا رہے گا۔ بہر دست میرے پاس متعدد مضامین کا کام بکھرا پڑا ہے۔ اس سال کے آخر تک میں ایک دو منصوبوں سے فارغ ہو جاؤں گا تو پھر قلم اٹھاؤں گا۔

مجھے خوشی ہے کہ دہلی میں زیادہ عرصہ قیام نہ رہا۔ ورنہ ابھی سے ڈر رہا ہوں کہ آپ کے اور میرے درمیان نجانے کون سا 'بُعد' دائرہ فن میں آکر تخلیقی قربت بن جاتا۔ بہر حال یہ محض آپ کے فن کا اعتراف ہے۔ حسنِ طلب نہیں ہے۔ آپ مطمئن رہیں کہ

میں طنز وظرافت سے شغف اور طنز نگاروں سے رشتۂ مناظرت بناتا آیا ہوں۔ کہ اس قبیلہ کے بیشتر حضرات شوخ جملوں کے شوق میں بڑی اچھی دوستیاں کھو دیتے ہیں۔

سمیع حسن صدیقی کے کیا حال ہیں۔ ابھی تک اس نوجوان کی تحریریں نظر سے نہیں گذریں۔ ان سے کہیں کہ کچھ بھجوائیں۔ میں رشتہ میں ان کا ماموں ہوں۔ امروہہ کے جس محلہ میں قیام تھا وہاں سب ایک ہی دادا کی اولاد آباد تھی۔ ویسے یہ میرے لئے اور میں ان کے لئے اجنبی ہیں۔ میں نے جب نقل مکانی کی تو یہ پیدا بھی نہ ہوئے تھے۔ لیکن مجھے امروہہ والوں کے شغف کے بارے میں معلوم ہوا تو بہر حال خوشی ہوئی۔

مجتبیٰ صاحب! ایک درخواست ہے۔ اگر کوئی قابلِ ذکر کتاب نظر سے گذرا کرے تو ظاہر ہے ایسا حادثہ مہینوں میں ہوا کرے گا، تو مجھے بھجوا دیا کریں۔ میں پاکستان سے آپ کے لئے قابلِ ذکر کتاب روانہ کر دیا کروں گا۔ یہ درخواست دو تین دوستوں سے کی گئی ہے۔ ہم سب ایک دوسرے سے تاحال خوش ہیں۔ کتابیں اگر سیاسی ہوں اور انگریزی میں ہوں تب بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

محمد علی صدیقی

حفیظ الکبیر قریشی

کینڈا

۱۹ رمارچ ۱۹۸۴ء

برادر، تسلیم! آپ کا گرامی نامہ جمعہ کو ملا۔ اور اسی وقت جواب لکھ رہا ہوں۔ اگر آپ کا امریکہ سے کینڈا آنے کا خیال ہو۔ تو براہِ کرم ہمیں اپنے پروگرام سے مطلع فرمائیں۔ آپ سے نیاز حاصل کر کے بہت خوشی ہوگی اور علم دوست حضرات آپ سے مل کر مسرت حاصل کریں گے۔ آپ جب امریکہ پہنچ جائیں تو اپنی سہولت سے کسی شام فون کر دیں۔

انجمن کی جانب سے ۲۸ ر اپریل کو شامِ غزل کے تحت ایک جلسہ ہو رہا ہے۔ اگر آپ اس سے پہلے آئیں تو آپکی آمد کے سلسلے میں ایک نشست بھی منعقد کی جا سکتی ہے۔

براہِ کرم آپ اپنے پروگرام سے مطلع رکھیں — مخلص فقط: حفیظ الکبیر قریشی

لدمیلا واسیلیوا

ماسکو

(۱)

محترمی المکرمی مجتبیٰ حسین صاحب — دست بستہ سلام!

آج ڈاکٹر مرشد اکاون آیا تھا اور امید ہے ان سے ملاقات ہو پائے گی۔ انھوں نے فرمایا کہ آپ نے میرے لئے

اپنی کتابیں بھیجیں آپ کی بہت بہت شکرگزار ہوں۔

آپ کا بھیجا ہوا INVITATION مل گیا۔

ان شاء اللہ "معجزہ" ہو جاتے تو آپ سے بھارت میں ملنے کا موقع نصیب ہوگا۔ عابدی صاحب کو میری طرف سے سلام پہنچائیے گا۔ اور ان لوگوں کو بھی جو مجھے یاد کرتے ہیں۔ آپ کی نیازمند : لدمیلا واسیلیوا

---

(۲) ۱۸ر نومبر ۱۹۸۶ء

محترمی و مکرمی مجتبیٰ صاحب — دست بستہ سلام!

چار دن ہوئے آپ کا عنایت نامہ ماسکو میں گھوم گھوم کر آخرکار مجھ تک پہنچ گیا۔ آپ کے پرخلوص جذبات ~~کے لئے بہت بہت شکریہ۔ اس سے پہلے ڈاکٹر پرشاد کے ذریعہ بھیجی ہوئی~~ آپ کی دو کتابیں اور خط مل چکے تھے میرا دلی شکریہ اور "پیغام زبانی" ڈاکٹر صاحب نے پہنچا یا ہی ہوگا۔ معاف کیجئے کہ ان کے ساتھ خط تک نہیں بھیج پائی۔ ان سے ملاقات ان سے جانے سے کوئی ۱۰ منٹ پہلے ہی ہوئی تھی۔ ان سے آپ کو پتہ بھی چلا ہوگا کہ کانفرنس کیلئے دعوت نامہ مجھے مل چکا ہے اور میرے لئے بالکل غیر متوقع اور حیرت کی بات ہوئی کہ میرے دفتر کے ارباب اقتدار نے نہ صرف کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ اس کا خیر مقدم بھی کیا اور (مجھے ابھی تک اس کا پورا یقین بھی نہیں!) فوراً میں نے ٹکٹ بک کیا (۲۳ر ڈسمبر کے لئے) اس کے بعد ہی کاغذی معاملہ شروع ہوا — عام طور پر اس میں کوئی دو ڈھائی مہینے لگ رہے جاتے ہیں کیوں کہ پاسپورٹ اور ویزا لینے میں اتنی تو دیر لگتی ہے دیکھیں کیا ہو سکتا ہے ۲۳ر ڈسمبر تک یہ سب ہو جائے پھر انشاء اللہ آپ کی اور عابدی صاحب کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوگی یعنی معجزہ ہو جائے گا۔

ان شاء اللہ آپ سے دہلی میں ملاقات ہوگی۔ کانفرنس کے لئے میں مقالہ تیار کرنا شروع کر رہی ہوں۔ کچھ دن پہلے میں نے قمر رئیس صاحب کو اطلاع بھیجی تھی۔ پتہ نہیں ان کو میرا خط ملا یا نہیں۔

آپ کے صاحبزادے کو چھوٹا سا پیکٹ جو ڈاکٹر پرشاد کے ہاتھ آپ نے بھیجا تھا میں نے پہنچوایا لیکن وہ خود ابھی تک ملے نہیں اگر میرا جانا پکا ہوا تو ان سے مل کر ہی آؤں گی کسی نہ کسی طرح ان کو ضرور پکڑ دوں گی۔

آپ کی طرف سے سب کو سلام پہنچایا۔ سب لوگ خاص طور سے ڈاکٹر سخا جوف آپ کو سلام اور بہترین تمنائیں بھیج رہے ہیں۔ ان سے اور آنا سوورووا سے آپ مجھ سے پہلے ہی ملیں گے۔ آنا کا سب کچھ تیار ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں ٹکٹ (یعنی میرے معاملے کے مقابلے میں بالکل برعکس ہے۔

ایک بار پھر آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں مجھے بے حد خوشی ہے کہ غائبانہ تعارف کے دنوں (بلکہ برسوں کے دوران) میرے ذہن میں آپ کا جو تصور تھا وہ بالکل سچا نکلا۔ سچ پوچھئے تو آپ اس تصور سے اور بھی زیادہ پیارے اور نیک انسان نکلے — ڈسمبر میں آپ سے ملنے کی امید میں

آپ کی احسان مند اور نیازمند

لدمیلا واسیلیوا

اسمٰعیل آذر

کٹک

۲۰ جنوری ۱۹۷۹ء

(۱) برادرِ محترم مجتبیٰ صاحب! تسلیمات!

بڑی خوشی ہوئی یہ جان کر کہ آپ کے مضامین کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں کیا انہیں کتابی شکل بھی دی گئی ہے۔ آپ کے جن مضامین کا ترجمہ اڑیا میں ہو چکا ہے وہ یہ ہیں۔ ریلوے منتری مسافر بن گئے' مرزا کی یاد میں' گھر کا ٹیلیفون' مہمان' ہوٹل شبانہ' نوکری کی تلاش میں' تعزیتی جلسے' جنابِ صدر' انتخابی نعرے اور ہمارا نوکر یہ سارے مضامین (سوائے گھر کا ٹیلیفون' کے) شائع ہو چکے ہیں۔ کیا یہ سب رسالے آپ کے پاس محفوظ ہیں؟ فی الحال ادیبوں کے گھریلو حالات بالتصویر کا ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ افسوس کہ مجھے اتنا وقت نہیں ملتا ـــ ورنہ اب تک کتاب بھی چھپ چکی ہوتی۔ صرف چھٹیوں میں ترجمے کے کام کے لئے وقت نکال پاتا ہوں۔

پارسل ملتے ہی مطلع فرمائیے گا۔ آپ کا، اسمٰعیل آذر۔

(۲) ۲۷ فروری ۱۹۸۰ء

محترم مجتبیٰ حسین صاحب ـــ تسلیمات!

ایک طویل مدت کے بعد خط لکھ رہا ہوں۔ سرفراز نامہ معہ "عرضِ مصنف" موصول ہوا تھا۔ جشنِ ظرافت کی تاریخ مقرر نہیں ہو پا رہی ہے اب تک میں اسی انتظار میں تھا کہ بات طے ہو جائے تو آپ کو لکھوں مگر کسی نہ کسی پریشانی کی وجہ سے بات نہیں بن رہی ہے۔ بہرحال مجھے پوری امید ہے۔ مشاعرہ اپریل کی کسی تاریخ میں ہونا قرار پا جائے گا۔ دوسرے خط میں قطعی تاریخ سے انشاء اللہ آگاہ کراؤں گا۔ آپ کو مذکورہ مشاعرہ میں شرکت ضرور کرنی ہے اور مضمون بھی پڑھنا ہے یہاں ظرافت کے چرچے بڑے زوروں پر چل رہے ہیں ـــ مگر تاریخ ہے کہ نزدیک آتی ہی نہیں ـــ

آپ کی کتاب چھپ چکی ہے۔ غالباً اس کا اجراء مارچ کی پہلی تاریخ کو ہوگا۔ اس کا اجراء آپ کی موجودگی میں ہونا طے پایا تھا۔ چونکہ نرس ساہتیہ سمیتی اس کتاب کی ناشر نہیں ہے۔ اس لئے پروگرام بدلنا پڑا۔ کیونکہ رسم اجراء ادا کرنے کا حق اسے نہیں پہنچتا۔ اب طے ہے جس دن ہمارا پروگرام ہوگا اس کے دوسرے دن نرس ساہتیہ سمیتی' آپ کے اعزاز میں ایک تقریب کرے گی اس تقریب میں کتاب کی ایک جلد سپاس نامے کے ساتھ آپ کو پیش کی جائے گی۔ نتورانند صاحب نے آپ کے مضمون "مہمان" کو ڈرامائی روپ دیا ہے اس تقریب میں ڈرامے کو اسٹیج بھی کروانا چاہتے ہیں ـــ ہمارے مشاعرے کی تاریخ جوں جوں بڑھتی ہے۔ نتورانند صاحب اتنا ہی پریشان ہوتے جاتے ہیں۔ وہ آپ سے ملنے کے لئے بے چین ہیں وہ آپ کے متعلق ہمیشہ سوچتے رہتے ہیں۔

پرسوں انہوں نے خواب میں دیکھا کہ آپ کو ریسیو کرنے کے لئے ہمارے ساتھ وہ بھی اسٹیشن پہنچ گئے ہیں اور جیسے ہی آپ ٹرین سے اترتے ہیں انہوں نے بڑھ کر آپ کو سینے سے لگا کر خوب زور سے بھینچ لیا۔

آپ نے گذشتہ خط میں میری اور فتور اللہ صاحب کی نسبت جس محبت و شفقت کا اظہار کیا ہے اس سے ہم دونوں بھی سرشار ہو چکے ہیں بلکہ میں تو یوں کہوں گا کہ میں جب آپ کا خط فتور اللہ صاحب کو پڑھ کر سنا رہا تھا تو مجھ سے زیادہ ان کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ جب میں نے آپ کی تصویر ان کے حوالے کی تو بڑی دیر تک دیکھتے رہے۔ اور بار بار دیکھا (نہ جانے تصویر میں وہ کیا تلاش کر رہے تھے) وہ تو آپ کے بالکل گرویدہ ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ میں نے مجتبیٰ حسین صاحب کے مضامین کا اندازِ بیان دیکھ کر اپنا اسلوب بدل دیا ہے۔

جواب سے جلد نوازیں ——— بدلہ نہ لیجئے گا۔ خیر اندیش: اسمٰعیل آذر

(۴) ۲۸ دسمبر ۱۹۸۴ء

برادر محترم مجتبیٰ صاحب ——— سلام مسنون!

عرصۂ دراز کے بعد حاضر خدمت ہو رہا ہوں۔ کوتاہی کے لئے نادم ہوں۔ اس دوران آپ نے بھی غریب کی خبر گیری نہیں کی ———

جوہر سیوانی کے انتقال کی خبر سے بے حد صدمہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت کرے۔ انھوں نے طنز و مزاح کی بڑی خدمت کی اور تادمِ آخر اس صنف کو پروان چڑھاتے رہے۔ اس سلسلے میں ادارہ شگوفہ سے میں اپیل کروں گا کہ مرحوم کی یاد میں ایک خصوصی شمارہ شائع کرے۔

"آدمی نامہ" "جاپان چلو جاپان چلو" وغیرہ کی کاپیوں کے لئے میں اب تک انتظار کر رہا ہوں۔ موخر الذکر کی کاپی جو آپ نے سمیع حسن صاحب کو عنایت کی تھی وہ میرے پاس آگئی ہے۔ اور جب تک یہ میرے پاس محفوظ رہے گی سمیع حسن کی یاد آتی رہے گی۔ سمیع صاحب سے کہئے گا کہ اگر وہ چاہتے ہیں کہ مجھے یاد نہ آئیں تو مذکورہ کتابوں کا انتظام میرے لئے کردیں۔

فتور اللہ صاحب اپنی آنکھوں کے آپریشن کے لئے بہت جلد حیدرآباد جا رہے ہیں۔ انھوں نے اس سلسلہ میں سروجنی آئی ہسپتال کو لکھا ہے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں نریندر لوتھر صاحب کو لکھوں کہ وہ اس سلسلہ میں ان کی مدد کریں۔ میں نے لوتھر صاحب کو لکھ دیا ہے۔

عالمی جشن مزاح کا دعوت نامہ مل چکا ہے میں انشاء اللہ بر وقت حیدرآباد پہنچ جاؤں گا۔ بھابی صاحبہ کو آداب۔

آپ کا ——— اسمٰعیل آذر

فیاض احمد فیضی

——— (بمبئی)

۲۵ فروری ۱۹۸۶ء

محترم مجتبیٰ حسین صاحب ——— السلام علیکم!

آپ کا ۲۰ فروری کا عنایت نامہ مجھے ابھی ابھی ملا۔ آنکھیں مل مل کر پڑھا، پڑھنے کے بعد غور کیا تو آنکھیں ملنے کی تین وجوہات سمجھ میں آئیں۔ پہلی مشکوک وجہ میری کمزور بینائی، دوسری آپ کی خوش خط تحریر اور تیسری یقینی وجہ آپ کے قلم سے میرے مضامین کی تعریف۔ براہِ کرم اپنے اگلے خط میں اس بات کی تصدیق فرمائیں کہ مذکورہ خط آپ ہی

نے لکھا ہے۔

کاش کہ آپ نے اپنے خط میں میرے مضامین کی تعریف نہ کی ہوتی۔ اس لئے کہ اب اگر میں آپ کی مزاح نگاری کے روشن چراغ کو اپنی تعریفوں کے سورج کی کرنوں سے نہلانے کی کوشش کروں تو وہ تعریف و توصیف کی بیت بازی کہلائے گی۔ پھر بھی ایک بات میں انتہائی سنجیدگی سے آپ کے گوش گذار کرنا چاہتا ہوں کہ آج ہندوستان میں صرف ڈیڑھ مزاح نگار موجود ہیں۔ ایک مجتبیٰ حسین اور آدھے مسیح انجم۔

اب رہی دانت کھٹے کرنے والی بات اس سلسلے میں عرض ہے کہ میری کیا مجال ہو سکتی ہے کہ میں اپنے بزرگوں کے دانت کھٹے کرنے کا خیال بھی دل میں لاؤں۔ کیا میری اور کیا میری شوربہ جیسی مزاح نگاری ویسے مجھے بزرگ قلم کاروں کی اس چاہت کے خلوص پر بالکل شبہ نہیں ہے کہ وہ خود بھی چاہتے ہیں کہ ان کے بھی دانت اب کھٹے ہوں۔ مگر معاف کیجئے گا مجھے اس بات پر یقین نہیں ہے کہ ان کے سارے دانت اصلی ہیں۔

شیام کشن نگم صاحب تک آپ کا آداب اور سلام پہنچانے کا خاطر خواہ انتظام کیا جا رہا ہے۔ اگر کچھ تاخیر ہو جائے تو معافی چاہوں گا۔ آپ نے اچھا کیا انہیں شکریہ کا خط نہیں لکھا۔ پرخلوص عنایات کا شکریہ الفاظ میں ادا ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر آپ کوشش بھی کریں تو وہ احساس رہ جائے گا جو غالبؔ کو معشوق کی عطا کردہ جان اسی پر قربان کر دینے کے بعد ہوا تھا۔

مندرجہ بالا فلسفہ کا سہارا لیتے ہوئے میں آپ کی اس کرم فرمائی کے شکریے سے گریز کر رہا ہوں۔ جو آپ نے مجھے جشن بہاراں میں مجھے شامل کر کے مجھ پر کی ہے۔ (کرم فرمائی۔) خدا حافظ۔ آپ کا مخلص: فیاض احمد فیضی

منظر سلیم

——— تاشقند (روس)

۱۷ر دسمبر ۱۹۸۶ء

مکرمی مجتبیٰ صاحب۔ آداب (——— محترمہ بیگم صاحبہ کو اور آپ کو نیا سال بہت بہت مبارک ہو۔

آپ نے بڑا احسان کیا جو "آدمی نامہ" میرے لئے چھوڑ گئے تھے۔ اس سے بہت کچھ آپ کے بارے میں اور بہت کچھ دوسرے ادیبوں شاعروں کے بارے میں معلوم ہوا۔ سوچا تھا کہ خاکوں کے متعلق ذرا تفصیل سے لکھوں گا۔ پھر خیال آیا کہ بڑے بڑے لوگ لکھ چکے ہیں میں بھلا کون سی نئی بات لکھ سکوں گا۔ اب نئے سال کی مبارکباد کے ساتھ ان کے چھوٹے چھوٹے بالکل سادہ و معصوم نظر آنے والے جملوں کے لئے بھی مبارکباد دینا چاہتا ہوں جو خاکوں کے بیچ بیچ میں یوں اچانک آ گئے ہیں۔ جیسے کسی کی اچھی غزل کا سب سے اچھا شعر ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے ہمارے معاشرے کو کتنا اور کس نظر سے دیکھا ہے۔ اور جو کچھ دیکھا ہے اسے دوسروں کو دکھانے کی کیسی شاندار صلاحیت رکھتے ہیں۔ دلی آرزو ہے کہ آپ کی تحریروں میں اس طرح کے جملوں کی تعداد میں اضافہ ہو ——— منظر سلیم

مسز شاشولے

ــــــ ٹوکیو (جاپان) ــــــ

(۱) ۲۸ اکتوبر ۱۹۸۹ء

محترم مجتبیٰ حسین صاحب ! السلام علیکم !

امید ہے کہ آپ لوگ خیریت سے ہوں گے۔ مجھے بہت مسرت ہوئی کہ آپ کو "جاپان چلو جاپان چلو" کا جاپانی زبان میں ترجمہ پسند آیا۔ پروفیسر سوزوکی اور مسٹر آساداکو بھی میری طرح کتاب کی اشاعت پر بہت خوشی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ ان کی رہنمائی کے بغیر اس کی تکمیل بہت دشوار تھی۔ پہلا تبصرہ شائد اگلے مہینے ایک رسالے میں چھپے گا۔ شوق کو تازہ رکھئے۔ جلد ہی یہ سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ بیگم ایتو (ڈائرکٹر جنرل یونیسکو ثقافتی مرکز برائے ایشیاء کی بیگم صاحبہ) نے مجھے لکھا ہے۔ یہ کتاب پڑھ کر مجھے اپنے شوہر کی بہت سی یادیں تازہ ہوئیں۔ حسین صاحب سے کہئے کہ میں آپ کی بہت شکرگذار ہوں۔ بیگم ایتو کا خط میرے لئے بھی بڑی حوصلہ افزائی کا سبب ہوا ہے۔

آج کل میں کرشن چندر کی کہانیوں کا مجموعہ شائع کرنے کی تیاری میں مشغول ہوں۔ دعا کیجئے کہ وہ بھی "جاپان چلو" کی طرح کامیاب ہو۔ کل میں نے ہوائی ڈاک سے آپ کے ہاں پانچ کاپیاں بھجوائیں ہیں۔ امید ہے کہ اس خط سے پہلے آپ کو مل چکی ہوں گی۔

اپنی بیگم صاحبہ سے کہئے کہ مجھے اب تک حیدرآباد کے مزیدار کھانے کی یاد آتی ہے۔ بہت بہت شکریہ۔

آپ کو گھر کو سلامتی کی دعا دیتے ہوئے۔ خدا حافظ آپ کی، شاشولے

(۲)

محترم مجتبیٰ حسین صاحب اسلام علیکم ! ــــ امید ہے کہ آپ لوگ خیریت سے ہوں گے۔

معاف کیجئے کہ بہت دنوں کے بعد آپ کو یہ خط لکھتی ہوں۔ پچھلے سال کے آخر میں میرے گھر (خاندان) کا ایک مسئلہ واقع ہوا۔ آج تک اسی کے لئے میں کوئی کام بھی نہیں کر سکی۔

تین رسالوں میں چھپے ہوئے "جاپان چلو" کے تبصرے روانہ کر رہی ہوں۔ میری بے ادبی پر معاف کیجئے گا۔

خدا حافظ ــــ آپ کی، شاشولے

حبیب حیدرآبادی

ــــــ (لندن)

۱۵ جولائی ۱۹۸۷ء

پیارے مجتبیٰ ــ تسلیم !

امید کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے کمال الدین احمد صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ بڑی خوشی ہوئی۔

ان سے کہنا کہ آئندہ جب کبھی لندن آئیں ہمارے ساتھ کچھ وقت گذاریں ۔
ہمارے سفر کی روئداد یہاں کے اخبار "راوی" میں اقساط میں چھپتی رہی ہے ۔ آپ کی خدمت میں روانہ کر رہا ہوں ۔
آپ کا "غفور والا" مضمون پھر ایک بار پڑھنے میں آیا ــــ بے اختیار ہنسی آتی رہی ۔ اللہ پاک آپ کے ادبی منازل کو اور اونچا کرے ۔ آپ کا : حبیب حیدرآبادی

مجیب الرحمٰن جہانگیر انس

——— رانی پور ، سیوان ۔ بہار

۵ر دسمبر ۱۹۸۶ء

محترم المقام مجتبیٰ حسین صاحب ! سلام مسنون !!
عرض خدمت یہ ہے کہ میں نے اس سال بہار یونیورسٹی سے اردو میں ایم ۔ اے (فرسٹ کلاس) بطور پرائیویٹ امیدوار کیا ہے ۔ مجھے طنزیہ و مزاحیہ ادب سے خصوصی دلچسپی ہے ۔ جدید دور کے طنزیہ و مزاحیہ قلمکاروں میں آپ کے فن نے مجھے کافی متاثر کیا ہے ۔ میرا ارادہ بہار یونیورسٹی سے پی ۔ ایچ ۔ ڈی کرنے کا ہے ۔ اس کے لئے میں نے محترم احمد جمال پاشا سے (جن سے میرا خصوصی تعلق ہے) مشورہ کرنے کے بعد موضوع کا انتخاب کیا جس کا عنوان ہے "مجتبیٰ حسین ــــ شخصیت اور فن" نگراں ہوں گے فاروق صاحب ریڈر بہار یونیورسٹی ۔ اس سلسلے میں مجھے آپ کے تعاون کی سخت ضرورت پڑے گی ۔ امید ہے آپ اپنے تعاون سے نوازنے کی زحمت گوارا کریں گے ۔
اطلاعاً عرض ہے کہ میں بھی کبھی کبھی طنزیہ و مزاحیہ مضمون لکھتا ہوں جن میں سے اکثر شگوفہ و دیگر میگزین میں شائع ہو چکے ہیں ۔ بچوں کے لئے اخلاقی مضامین پر مشتمل چار کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں ــــ مقامی پندرہ روزہ "شعلۂ افکار" کے مدیر کے فرائض چار سال تک انجام دے چکا ہوں ۔ وزیر آغا اینڈ گروپ کے رنگ میں دس بارہ انشائیے مجموعہ کی شکل میں عنقریب شائع ہونے والے ہیں ۔ بہر کیف جواب کا انتظار رہے گا ۔ والسلام ۔ مخلص : مجیب الرحمٰن جہانگیر انس ۔

راشد آذر

——— حیدرآباد

۱۱ر اگست ۱۹۸۶ء

پیارے مجتبیٰ ــــ اب کی بار دہلی میں ملاقات نہ ہو سکی جس کا افسوس ہے ۔ آئندہ آؤں تو ملیں گے ۔
کل شاذ کے بڑے لڑکے نژاد کی شادی تھی ۔ شاذ کی برسی ۱۸ر اگست کو ہے ۔ میرا جی نہیں ہوا کہ شادی کی تقریب میں شرکت کروں ۔ کل شاذ بہت یاد آیا ۔

حسبِ وعدہ جج صاحب کے لئے نظم اور رسالے کے لئے مضمون بھیج رہا ہوں۔ پہنچا سکو تو مہربانی ہوگی۔ میں نے مضمون کو خاصا بدل دیا ہے۔ اور مختصر بھی کیا ہے۔ اس مضمون میں جو "صدائے تیشہ" میں چھپا تھا اور موجودہ مضمون میں بہت فرق ہے ویسے بھی مضمون بہت کم لوگوں نے پڑھا ہے۔ اور جنھوں نے پڑھا تھا ان کو بھی یہ مضمون مختلف لگے گا۔ آج کل سردار جعفری کے فری ورس پر کام کر رہا ہوں۔ ایک مضمون آئندہ ماہ تک لکھ کر ان کو بھیجنا ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ پاکستان سے ایک رسالہ ان کے نمبر کی شکل میں نکل رہا ہے۔ ان کا خط بھی آیا تھا جس میں انھوں نے خواہش ظاہر کی تھی کہ چونکہ ان کے فری ورس پر کسی کا مضمون نہیں ہے اس لئے میں لکھوں بہت خوبصورت فری ورس ہے۔ ——— کبھی کبھی خط لکھا کرو۔ تمہارا راشد آذر

ڈاکٹر معین الدین عقیل

استاد شعبۂ اردو جامعہ کراچی

——— (کراچی)

۲۱ مئی ۱۹۸۶ء

مکرمی و محترمی مجتبیٰ حسین صاحب! سلام مسنون !!

حیدرآباد میں آپ سے ملاقاتیں نہایت سرسری رہیں لیکن میں انھیں بھی اپنے سفرِ حیدرآباد کا حاصل سمجھتا ہوں۔ نہایت ممنون ہوں کہ آپ نے اپنی دو تازہ تصانیف "آدمی نامہ" اور "جاپان چلو جاپان چلو" سے بھی نوازا۔ میں آپ کی اِکا دُکا تحریریں کو گاہے گاہے پڑھ کر آپ کا گرویدہ رہا ہوں۔ لیکن آپ سے مل کر اور آپ کی بہت ساری تحریروں کو یکجا پڑھ کر آپ سے میرا ذہنی قرب، جو مذکورہ تحریروں کے ساتھ ساتھ مرحوم جلیس صاحب سے اپنی نیازمندی کے باعث پہلے ہی استوار تھا، خاصا بڑھ گیا ہے۔ بعض تخلیقی اصناف مثلاً "غزل، افسانہ" اور طنز و مزاح میں ہم پاکستان کو فی الواقعی بھارت کی ان اصناف کے مقابلہ میں خاصہ "ترقی یافتہ" سمجھتے ہیں لیکن مزاح میں آپ کی تحریریں ہمارے اس اعتماد کو متزلزل کر دیتی ہیں ——— خدا آپ کو آپ کا یہ امتیاز ——— اور آپ کے قلم کی جولانی اور ندرت و انفرادیت مبارک کرے اور ہمیں آپ کی اس طرح کی تخلیقات پڑھتے رہنے کا موقع دیتا رہے۔ یہاں کار لائقہ کے لئے میں حاضر ہوں۔

نیک خواہشات کے ساتھ   والسلام : عقیل

عزیز قیسی

——— بمبئی

۲ر جولائی ۱۹۸۲ء ——— میاں مجتبیٰ حسین! سلام و خلوص !!

تم نے "طنز" میں تبصرہ دیکھ لیا ہوگا۔ وحید اختر نے دیکھا وہ بہت خوش ہوئے۔ خلافِ توقع۔ کچھ لوگ ان تبصروں سے بدمزہ ہو رہے ہیں ان کا خیال ہے کہ قیسیؔ اچھا خاصہ آدمی تھا۔ تبصرہ نگار کیوں بن گیا۔؟

اور کیا حالات ہیں؟ تمہاری کتاب "جاپان چلو" نہیں ملی۔

جواب جلدی دینا۔ تمہارا قیسیؔ

(۲) ۱۵؍اکتوبر ۱۹۸۵ء

مجتبیٰ ـ واہ میاں ـ یوسف ناظم کو جاتے ہی خط لکھ دیا اور مجھے تو آنے سے پہلے بھی خط نہیں لکھا۔ باقر مہدی کے ارشادات ’’ ‘‘ مجھ تک کیوں نہیں پہنچائے ـ یوسف ناظم تو پیغام رسانی کے سلسلے میں بھی مزاح سے کام لیتے ہیں۔

شاہد علی خاں تمہارے جانے کے غالباً دوسرے ہی دن یہاں وارد ہوئے۔ ان سے کئی گلے کرنے تھے۔ گلے کرنے کا پروگرام بنا تو یوسف ناظم بھی ساتھ ہو گئے۔ لہٰذا ان تک گلے پہنچتے پہنچتے مزاح کی لپیٹ میں آگئے اور شاہد علی خاں کو جواب دینے کی سہولت یوسف ناظم نے فراہم کردی۔

تمہاری کتابوں کے جاپانی زبان میں ترجمے ہو رہے ہیں تو کبھی میری کتاب کا اردو میں ترجمہ تو ہو (بنام تبصرہ) میں شاید نومبر کے آخر ہفتہ میں دلی آؤں۔ تم کہیں باہر (جاپان‘ انڈونیشیا‘ فلپائنز وغیرہ) تو نہیں جا رہے ہو؟

یوسف ناظم اچھے ہیں۔ اب تو ادب میں کچھ یادگار کارنامے بھی کرنے لگے ہیں۔ تھرسٹن ہیری کا مزاحیہ ترجمہ چھپ چکا ہے اور ان کی اپنی مزاح کی سنجیدہ کتاب بھی شائع ہو گئی ہے۔ ملازمت سے ریٹائر ہونے کا بدلہ وہ ادب سے لے رہے ہیں۔ اللہ ان کو راہِ راست پر لائے۔ باقر مہدی کے لیے کیا ارشاد کیا لکھ بھیجو۔ ان کی تحریف سن کر بھی ہنسی آتی ہے۔ اور برائی سن کر بھی۔ ان کا دم اس روتی بسورتی ادبی فضا میں غنیمت ہے۔

امید کہ تم بخیر و عافیت ہوں گے۔ حیرت ہے کہ میری بیوی اور بیٹی بھی تم کو یاد کر رہے ہیں اور سلام بھی کہہ رہے ہیں۔ اور حیرت مزید یہ کہ تمہاری نادیدہ بیگم کو بھی سلام کہہ رہی ہیں۔ دنیا کیا سے کیا ہوتی جا رہی ہے بھئی؟ تمہارا خیر طلب: عزیز قیسی

جوہر سیوانی

سیوان (بہار)

۲۷؍جولائی ۱۹۸۴ء

محترمی سلام و نیاز!

دہلی سے سیوان تک کا لمبا سفر آپ کی یاد کی ٹھنڈک کی چھاؤں میں طے ہو گیا۔ محسوس ہی نہیں ہوا کہ دہلی کب چھوڑی اور سیوان کب آگیا۔ آپ کی نظرِ عنایت میرے لیے متاعِ خلوص ہے۔

دہلی جانے سے پہلے دہلی کے اجنبی ماحول سے الجھن کا احساس ہو رہا تھا مگر آپ حضرات کی صحبت نے گھریلو ماحول پیدا کر کے سیوان کے خیال کو میرے ذہن میں داخل نہیں ہونے دیا۔ آپ کا اندازِ نوازش زرّیں حرفوں میں لکھے جانے کے لائق ہے۔ آپ نے جو سرمایۂ خلوص عطا کیا ہے اس سے میرے ذہن کا خزانہ مالا مال ہے۔

راجدھانی کی مصروفیات مشہور ہیں۔ پڑوس کی خبر نہیں ہوتی۔ لیکن انسانیت کی جو پہچان آپ کے ذات میں ملی اس کی مثال مجھے کم ملی ہے۔ بہرحال آپ راجدھانی میں انسانیت کی زبان‘ مہمان نوازی کی جان‘ اور ادب کا نشان ہیں۔ جس نے آپ سے ملاقات کی اسے خلوص و مہر کی تفسیر مل گئی۔

میں نے دہلی کی پوری روداد محترم واہی صاحب کو لکھ دی ہے۔ خدا حافظ! آپ کا چھوٹا بھائی: جوہر سیوانی

ساحر ہوشیارپوری

ــــــــــــــ (دہلی)

۲۸ اپریل ۱۹۷۹ء

مجتبیٰ بھائی! خلوص و محبت!

؎ خاکے لکھ لکھ کر ایڈیٹر ہو گئے ؛ تم مقدر کے سکندر ہو گئے

اس شعر میں معنیٰ تلاش کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ شعر کے دو لخت ہونے کی اس سے بہتر مثال شاید ہی کہیں ملے۔
مقصد یہ تھا کہ تمہاری ترقی پر دلی مبارکباد پیش کر دوں۔ سو قبول کرو۔ اور اوپر لکھے دونوں مصرعوں پر لعنت بھیجو۔

تمہاری ایک شام مجھ پر واجب ہے کیوں کہ تم نے یہ دعوت گذشتہ سال قبول کر لی تھی۔ (تمہیں وہ شام یاد ہوگی) تاریخ کا تعین تم کر لو۔ مقام میرا غریب خانہ ہی ہوگا۔

صرف محمود سعیدی سے مشورہ کر کے مطلع کر دینا۔ دعاگو۔ مخلص تمہارا ساحر ہوشیارپوری

گیان سنگھ شاطر

ــــــــــــــ (ڈھاکہ)

(۱) ۱۴ دسمبر سنہ ۱۹ء

مجتبیٰ حسین! یاد کرنے کو تو میں تمہیں "میرے پیارے" کے لقب سے یاد کر سکتا تھا کیونکہ تم نے میرے خط کا جواب نہیں دیا اس لئے میرے دل میں تمہارے لئے جو پیار تھا وہ حیدرآبادی اصطلاح میں 'ذرا' کم ہو گیا ہے۔ تم نے اس کمی کو پورا نہ کیا تو میں خوشونت سنگھ سے سفارش کر دوں گا کہ وہ تمہاری کتابوں پر تبصرہ کرتا ہے اور تمہیں دیس بدیس بدنام کرتا ہے۔

تم نے ٹیلیفون پر سوئیٹر لانے کو کہا تھا۔ تمہارا کہنا سر ماتھے پر لیکن میں کیا کروں بنگلہ دیش والے اللہ کے بندے ہیں اور اللہ پر اس قدر یقین رکھتے ہیں کہ اللہ نے ننگے پیدا کیا ہے اور ننگے ہی رہنا چاہئے۔ وہ تو خیر ہے کہ ہم بی۔ این۔ او سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ لوگ ہمیں اس دھرتی کی پیداوار نہیں سمجھتے ورنہ یہ ہمارے کپڑے اتار لیتے اور ہمیں اپنی طرح جینے پر مجبور کر دیتے۔

تم نے اس بار میرے خط کا جواب نہ دیا تو میں دلی آ کر سب سے پہلے ۔۔۔ تم میرے اور خشونت سنگھ کے دوست ہو کر ایک بات نہیں جانتے اسی لئے اطلاع کے لئے لکھ رہا ہوں۔

"نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دشمنی اچھی"

گیان سنگھ شاطر

---

(۲)

پیارے مجتبیٰ! سلامت رہو!!

یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ تم اردو تہذیب کے علم بردار بن کر برطانیہ جا رہے ہو۔ یہ بے چاری اردو زبان کیسی زبان ہے اپنے گھر میں برباد ہو رہی ہے اور دوسروں کے گھر میں پنپ رہی ہے۔ دیکھئے نا! میں نے تمہارے سفرنامے پر انگریزی زبان میں تبصرہ پڑھا اور وہ بھی ہندوستان ٹائمز میں اور خشونت سنگھ کے قلم سے۔ تم سیاست میں چھپتے تھے تو نقّال بنے پھرتے تھے۔ نہ جانے اب تمہاری کیا حالت ہو گی۔ خدا تم پر رحم کرے۔ اسے کہتے ہیں: ؎

کھجور پر چڑھا آسمان پر اترا

رہی میری حالت! میں آسمان سے کھجور پر ۲۸ تاریخ کو گر رہا ہوں وہاں پر اٹک گیا تو بچ رہوں گا ورنہ جہنم میں ملاقات ہو گی۔

میں تمہارے خط کا جواب 'ورنہ' سے ڈر کر نہیں دے رہا، کیوں کہ بقول شخصے ؎

میرا مجھ میں کچھ نہیں جو کچھ ہے سو تیرا

تمہیں اور بھابی جان کو سریندر یاد کرتی ہے اور نئے سال کی مبارکباد بھیجتی ہے اور میں! تمہارا شاطر

(۳)

پیارے مجتبیٰ حسین! تم جس قدر پیارے آدمی ہو تمہارا نام اسی قدر بیہودہ ہے۔ تمہیں کہو لیے نام کو تمہاری جیسی شخصیت سے کیا نسبت ہے۔ تم مجتبیٰ کی جگہ 'دلبر' ہوتے۔ 'محبوب' ہوتے تو بات ہی اور ہوتی۔ کوئی تمہارے لئے کیسے ہی جذبات رکھتا لیکن طرزِ تخاطب میں ویسا مظاہرہ نہ کر سکتا۔ کہیں میری بیوی میرے سامنے تمہارا نام لے کر پکارتی تو میں فرطِ رشک سے اسے طلاق دے دیتا اور طلاق کا حق حاصل کرنے کے لئے مجھے خواہ مسلمان ہونا پڑتا۔

لیکن تمہارا ہونا بھی میرے لئے' بلا سے کم نہیں۔ میں تمہارے نام پر نہ سہی تمہاری مسلمانی پر رشک کرتا ہوں۔ اس رشک کی وجہ کے حقوق ہیں جو اسے مولوی اُسترے کی دھار پر دلواتا ہے۔ میں کب کا مسلمان ہو گیا ہوتا لیکن برا ہو میری بزدلی کا جو مجھے اس سود مند کام سے روکے ہوئے ہے۔ میرے جیسے کتنے بزدل ہوں گے جو اپنے ارمان سینے میں چھپائے زیرِ زمین سوئے ہوں گے۔

دہلی میں تم سے ملاقات نہ ہو سکی اور کیا لکھوں! پہچانو اور جانو یہ کس کا خط ہے۔

تمہارے ہزاروں اور شائقینوں میں سے ایک ـــ دور اُفتادہ۔

شریف اسلم

(جدہ)

۱۲ر جولائی ۱۹۸۴ء

مائی ڈیر مجتبیٰ! دبیر الملک مرزا نوشہ کے نام نامی اسم گرامی سے موسومہ ایوارڈ کی پیشکشی پر دل کی گہرائیوں سے تہنیت و مبارکباد۔

مرزا صاحب کا یہ شعر تو تمہیں یاد ہوگا ہی ؎

لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخن گرم ٭ تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پہ انگشت

طنز و مزاح کے میدان میں تم ان کے ذہنی وارث بن کر ابھرے ہو لیکن حیرت ہے کہ مرزا صاحب کے سخن گرم کے برخلاف تمہارا 'سخن سرد' ہزاروں' لاکھوں دلوں کو گرما کر انھیں ٹھنڈی ٹھنڈی گدگدیوں سے ہمکنار کر رہا ہے۔ میری مانو تو تم اولین فرصت میں مزار غالب پر حاضر ہو آؤ۔ اور وہاں کھڑے ہو کر تصور کی نگاہ سے دیکھو کہ اپنے سے موسومہ ایوارڈ مجتبیٰ حسین کو دیے جانے پر خود مرزا صاحب کتنے شاداں و فرحاں ہوں گے۔

میں اس بات کے لیے بے حد معذرت خواہ ہوں کہ میرے حیدرآباد سے اٹھ کر جدہ آنے کے بعد پچھلے چار پانچ سال کے دوران تم نے چار پانچ نامہائے محبت لکھے لیکن میں محض اپنی 'سستی' کاہل بلکہ نکمے پن کے باعث ایک بھی جواب نہ دے پایا لیکن انشاءاللہ جاریہ سال کے دوران اور آئندہ بھی باقاعدہ خط و کتابت کے ذریعہ اس کوتاہی کو تلافی کر دوں گا۔ مائی ڈیر مجتبیٰ! تم مجھے غافل نہ سمجھنا' خط و کتابت نہ ہونے کے باوجود میں 'سیاست' کی معرفت تمہاری تمام ادبی سرگرمیوں سے حتیٰ کہ غیر ادبی سرگرمیوں سے بھی کماحقہٗ واقف ہوں۔

میری طرف سے طنز و مزاح کے باوا آدم یعنی آبروئے قرطاس و قلم' المخاطب جناب فکر تونسوی کو آداب و تسلیمات۔ بھابی جان اور بچوں کو بھی میری جانب سے مبارکباد پہنچا دو اور مجتبیٰ کے حوالے سے کہو "اے اہل زمانہ قدر کرو۔ ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم"

تمہارا شریف اسلم

افتخار عارف

(لندن)

(۱)

پیارے مجتبیٰ! ڈھیروں محبتیں!!

لندن سے آنے والے ایک پاکستانی کا چہرہ تمہیں یاد بھی ہے ؎

ہمیں سب یاد ہے ذرا ذرا ٭ تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کم کم ملاقاتیں رہیں۔ ہجوم بس رہیں۔ ہنگاموں کے بیچ رہیں مگر ایسی کہ آج جو ذرا "سامانِ سفر" کھولا ہے تو یاد آتے چلے جا رہے ہو' یہاں احباب پوچھتے ہیں۔ ساقی کو تراشا دے دیا ہے۔ خوش ہیں۔

ادھر کا کیا احوال ہے۔ خط کا وعدہ پورا ہوگا؟؟ نیاز مند: افتخار عارف

سنہ ۱۹۸۳ء

(۲)

پیارے مجتبیٰ بھائی' آداب!

مصروفیات کا اندازہ مجھے آپ کے خط سے پہلے ہو گیا تھا' ظاہر ہے میزبانی کی روایتوں کو باقی رکھنے والے اپنی حرکتوں سے باز کیسے رہ سکتے ہیں' زندہ باد' دونوں ملکوں کے ادیبوں اور شاعروں کے درمیان بڑھتے ہوئے رشتوں کو خدا سلامت رکھے بکس کبھی کبھی تو ڈر لگنے لگتا ہے۔ تقی تنویر' عباس زیدی' ڈاکٹر شکیب' حبیب حیدرآبادی' صدیقہ شبنم' اکبر حیدرآبادی سب سے

آپ کی محبتوں اور نوازشوں کے تذکرے رہے۔ بقول ہمارے رسا چغتائی کے ؎

اک ترا ذکر چھڑ گیا تھا یونہی ؎ پھر جو یادوں کا تذکرہ نکلا

یادوں کی دھوپ چھاؤں اداس تو بہت کرتی ہے۔ مگر اس کی ایک جزا بھی ہے۔ انسان پر اور انسانی رشتوں پر یقین اور جاتا ہوا اعتبار بحال ہو جاتا ہے

گیان چند جین آئے اور رخصت ہو گئے، او بیند ناتھ اشک آئے ہوئے تھے۔ کل ہی عالم عابد حسینی پہنچیں۔ مغنی تبسم بھی آنے والے ہیں، پھر ڈاکٹر خلیق انجم اور فاروقی تو بھائی آپ بھی ہمت کر ڈالئے۔ آپ کا گھر ہے آپ کے خادم ہیں آپ سے محبتیں کرنے والے ہیں۔ اچھا ہے ہم لکھو جائیں۔ مل بیٹھیں اور سنئے ادھر دہلی میں ان دنوں صورت بربادی یاراں کیا ہے احباب کو میری طرف سے سلام کہئے۔ میرے لائق کوئی کام ہو تو حاضر،

نیاز مند : افتخار عارف

(۳) جنوری ۱۹۸۴ء

پیارے مجتبیٰ ! محبتیں !!

تمہارا خط آیا۔ زندہ باد۔ سر آنکھوں پر۔ چشم ما روشن و دل ما شاد

تمہارے اعزاز میں اردو مرکز ایک شام مزاح کا اہتمام مارچ کے پہلے ہفتے میں کر رہا ہے منظور؟ اپنی ساری کتابیں لیتے آنا۔ یہ نہ ہو کہ معلوم ہو کہ معاف کیجئے گا بھول آیا۔ اور ہمارے دوستوں نارنگ، خلیق، محمود، شارب، علی باقر سے ملتے ہوئے آنا۔ اور ہماری کتاب علی باقر سے لیتے آنا۔ فیض والا مضمون ضرور لانا۔

نیاز مند : افتخار عارف

(۴) مئی ۱۹۸۴ء

پیارے مجتبیٰ ! پہنچ گئے ؟ خوش ہو ؟ مختصر ملاقات رہی مگر دلچسپ رہی یہاں لوگ تمہاری "پر غالبیت" کے باوجود تمہیں پیار سے یاد کرتے ہیں۔ تصویریں یہاں چھپ گئی ہیں، پاکستان بھی بھیج دی گئی ہیں۔ تمہارے لئے بھیج رہا ہوں ــــ "بیسویں صدی" سے بھی خط آیا تھا۔ انھیں بھی بھیج دینا اور "سیاست" میں بھی چھپوانا۔ "قومی آواز" میں بھی تراشے میں بھی بھیجنا۔

تمہاری تقریب کی کامیابی کی بازگشت سارے شہر میں ہے۔ یوسفی صاحب، عابدی بھائی، طلعت، شاہ صاحب، لطفی صاحب، احمد فراز، تمہاری بھابی سلام کہتے ہیں۔

انشاء اللہ جلد ہی ملاقات ہو گی، یہاں کا کوئی کام ہو تو حاضر ہوں۔ تمہارا : افتخار عارف

(۵) ۱۴ مئی ۱۹۸۴ء

پیارے مجتبیٰ ! دعائیں، پیار، محبتیں !!

تمہارا خط آیا۔ سلام تمہارے لوگوں کو پہنچائے گئے۔ پیغام تمہارا یوسفی صاحب قبلہ کو دیدیا اور ممتاز حسین صاحب کو بھی دے دیا۔ شکیب صاحب، برادرم مصطفیٰ، علی خاں، عزیز الدین احمد، صدیقہ بھابی، حبیب صاحب، عابدی بھائی اور آپکی بھاوج آپ کو سلام کہتی ہیں۔ قسطیں تمہاری چھپ رہی ہیں۔ اس سنیچر کو یوسفی صاحب والا مضمون چھپا ہے پورے کا پورا پرچہ تمہیں بھیج رہا ہوں۔ تمہارے جانے کے بعد بھی تمہارا ذکر چل رہا ہے اور کیوں نہ چلے اچھی تحریروں کا اپنا ایک قرض بھی تو ہوتا ہے آدمی عمر بھر ان کا مقروض ہوتا ہے۔ وقتاً فوقتاً گفتگو میں یوسفی صاحب سے تمہارا ذکر رہتا ہے وہ تمہارا بڑی شفقت سے تذکرہ کرتے ہیں۔ وعدہ ان کو یاد دلاتا رہتا ہوں۔ عید کے بعد ان کے ساتھ ایک محفل کا بندوبست کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ اس کا TAPE تم کو بھیج دوں گا۔ ساتھ ہی اتوار یا غالباً سنیچر کو حیدرآباد رکن اسمبلی الیکشن والوں کا مقابلہ ہے۔ تمہارا : افتخار عارف

شہزاد منظر

(کراچی)

۲۲ مئی ۱۹۸۵ء

برادرم مجتبیٰ حسین صاحب ـــ سلام مسنون!

امید ہے آپ معہ الخیر ہوں گے اور آپ کا "انڈو پاک مشاعرہ" بخیر و خوبی ختم ہوگیا ہوگا۔ قتیل شفائی سے کراچی میں سادات امروہہ کے مشاعرے میں ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ اتنے کم وقت میں انکے لئے ہندوستان جانا ممکن نہیں تھا اسی لئے وہ نہیں گئے۔ پروین شاکر کے بارے میں معلوم نہ ہوسکا۔ البتہ حمایت علی شاعر حیدرآباد چلے گئے ہیں یقیناً آپ سے ملاقات ہوئی ہوگی۔

ان دنوں گوپی چند نارنگ، قمر رئیس، کنور مہندر سنگھ بیدی، مجروح سلطان پوری، سردار جعفری، اختر سعید خاں اور عصمت چغتائی کراچی آئے ہوئے ہیں جن کے باعث بڑی گہما گہمی ہے۔ ان دنوں آپ کی کتابیں زیر مطالعہ ہیں اور بہت لطف آرہا ہے۔ "آدمی نامہ" ابھی ابھی مکمل کیا ہے۔ اس میں کنہیا لال کپور پر آپ کا خاکہ خوب ہے اللہ آپ کو اور بھی لکھنے کی توفیق دے۔

اب آپ پاکستان کے رسائل میں بھی لکھا کریں۔ آپ کے یہاں بھی قدردانوں کی کمی نہیں ہے کاش آپ کی کتاب کا پاکستان سے کوئی ایڈیشن شائع ہوتا۔

میں نے ہندوستان کے دورے کے تاثرات قلم بند کرنے شروع کردیئے ہیں۔ اس میں آپ کا بھی خصوصی تذکرہ ہوگا۔ آپ نے مختصر سی ملاقات میں جس خلوص اور محبت کا ثبوت دیا ہے اس کے لئے میں آپ کا ہمیشہ ممنون رہوں گا۔ راجندر سنگھ بیدی پر میرا کام ادھورا رہ گیا ہے۔ اس لئے انشاء اللہ آئندہ سال ستمبر یا اکتوبر میں دہلی آؤں گا۔ اور الہ آباد اور بمبئی میں بھی جاؤنگا۔

آپ کا اپنا : شہزاد منظر

ڈاکٹر اطہر پرویز

(علی گڑھ)

۱۹۸۴ء

برادرم مجتبیٰ صاحب تسلیم!

بھئی آپ نے تو کمال کردیا۔ اب خط کا جواب بھی نہیں دیتے۔ میں "الفاظ" کا اگلا شمارہ آپکے گوشے کے ساتھ شائع کررہا ہوں۔ آپ ایسا کریں کہ فاروقی صاحب کا مقالہ، سید رحمت علی کا خاکہ فوراً بھجوادیں۔ اسکے علاوہ اپنی بھی کوئی تحریر ہو جو آپ مناسب سمجھیں۔ میں نے شہریار صاحب سے بھی بات کی وہ بھی چند روز میں آپ سے ملیں گے تو میری فرمائش کو پیش کریں گے۔ آپ جتنا جلد ہوسکے یہ مضامین بھجوادیں۔ ان کے علاوہ بھی اگر کوئی چیز ہو تو وہ بھی بھجوادیں۔ میں نے اگلے شمارے میں آپکا گوشہ طے کردیا ہے اسطرح آپ اس میں مزید تاخیر نہ کریں۔

○ آپ کی کتاب مجھے نہیں ملی بھجوائیے تاکہ اس پر بھی آنا فانی کی جائے۔ آپ کی جو تصویریں صادقین نے بنائی ہیں وہ بھجوادیں

اس کو سرورق پر دوں گا۔
آپ کے خطوط اور مضامین کا انتظار رہے گا۔ مخلص: اطہر پرویز

شفیقہ فرحت

بھوپال (مدھیہ پردیش)

(۱)

خدا کی ذات سے تو ہمیں پہلے بھی کوئی خوش فہمی نہیں تھی اب تمہاری طرف سے بھی مایوس ہو چکے تھے۔ اور ملک اور بیرونِ ملک کے تمام غیر ادبی پرچوں میں "تلاشِ گمشدہ" کے تحت کچھ اس قسم کا اشتہار دیا جانے والا تھا۔

"شیطان کی طرح مشہور اور اسی کی طرح معروف مزاح نگار مجتبیٰ حسین جو صورت سے مرثیہ نگار لگتے ہیں صدیوں سے لاپتہ ہیں۔ جس شخص نے ان کے تازہ ترین قہقہے سنے ہیں یا ان کی شوخیٔ تحریر کے نتیجے میں خود قہقہے لگائے ہیں وہ براہِ تبسم اس پتہ پر اطلاعی قہقہے بھیجے۔۔۔"

سچ مچ راشدہ یا انجم عثمانی کو خط لکھنے کا ارادہ تھا۔ لیکن ہماری کاہلی نے رسوائی سے بچا لیا (دونوں کو ــــ!)

پٹنہ سے ابھی تک تو کوئی دعوت نامہ آیا نہیں مگر امید پر دنیا قائم ہے۔ ہم بھی اس کی آس میں مسرور و شاداں ہیں۔ اگر آگیا اور خارجی اور داخلی سرحدوں پر خیر و عافیت رہی تو آجائیں گے ورنہ دھوم دھام سے ماتم ــــ!

جب متوقع ملاقات میں صرف ڈیڑھ مہینے باقی ہے تو آپ کے خط کی توقع فضول ہے ــــ؟ خیر بوقت ملاقات ــــ اگر خدا اور داہی کا کرم ہوا تو ــــ

شفیقہ فرحت

(۲) ۲۳ ستمبر ۱۹۸۳ء

اب اس کاہلی کا ماتم کیا کہ جس کے نتیجے میں ایک عالم سے شرمندہ ہیں۔

غالب ایوارڈ کے اعلان سے لے کر آج کل میں تصویر چھپنے تک ہزار بار "تار، خط، ٹیلیفون" سب سے مبارکباد کا ارادہ کیا۔ جب سارے وسائل بے وقت کی راگنی میں تبدیل ہو گئے تو خود عزم کیا (ایک عدد سفرنامے کی خاطر نہیں ــ!) مگر ہائے وائے۔

اب یہ تمہارے ذوق حوصلے اور جذبے پر منحصر ہے کہ اسی خط کو جو چاہو تصور کر لو۔

عالمی جشنِ مزاح کی خبریں زبانی طیور کی ہر چہار اطراف سے آ رہی ہیں TIMES OF INDIA کے انٹرویو نے طلسمی دنیا کا سا سماں باندھ دیا ــ اس گھن گرج رعب دبدبے اور ہجوم میں ہمیں نہ بھول جانا۔ شفیقہ فرحت

مسز اسانو

ٹوکیو (جاپان)

۲۶ دسمبر — ڈیئر مسٹر حسین!

آپ کے ۲۴ نومبر کے خط کے لئے شکر گذار ہوں۔ آپ نے اپنے سفرنامہ میں جس طرح میرا ذکر کیا ہے اور جس طرح مجھے

پیش کیا ہے۔ اسے جان کر میں مسرت سے معمور ہوگئی ہوں۔
اگرچہ میرا دورۂ دہلی طے ہوچکا ہے مگر پھر بھی تھوڑی سی غیر یقینی صورت حال برقرار ہے۔ فی الحال میرا پروگرام یہ ہے کہ میں ۲۵ جنوری کو جاپان ائیر لائینس کی فلائٹ ۴۶۱ سے دہلی پہنچ رہی ہوں۔ اور ۲ فروری کو جاپان ائیر لائینس کی فلائٹ ۴۶۲ سے واپس چلی جاؤں گی۔ نیشنل بک ٹریڈرس نے لودھی ہوٹل میں میرے قیام کا انتظام کیا ہے۔
ملاقات کی متمنی آپ کی اسانو۔

تاجدار احتشام

(بھوپال)

۱۴ جون ۱۹۷۸ء

ڈیر مجتبیٰ! آج ایک طویل عرصہ بعد تم سے مخاطب ہوں۔ اس تمام عرصہ میں خط لکھنے کی خواہش ہمیشہ رہی اور نیک نیتی کے ساتھ رہی۔ خط نہ لکھنے کی وجوہات طویل ہیں اور میں تقریباً تمام بزرگوں، عزیزوں، دوستوں اور رشتہ داروں کو یہ وجوہات لکھ لکھ کر اتنا بور ہوچکا ہوں کہ ان کے دہرانے کی اب ہمت نہیں رہی۔
شاعر تمہاری نظر سے ضرور گزر رہا ہوگا۔ اس میں نیا سلسلہ "گفتگو" بھی شروع کیا ہے۔ تم پر اور فکر تونسوی صاحب پر اتنی بات چیت ہوئی کہ جس مقصد کے تحت یہ سلسلہ شروع کیا تھا وہ مقصد ہی فوت ہوگیا۔ اس بات سے ہٹ کر یہ حقیقت ہے کہ تم نے اب تک جو کچھ بھی لکھا وہ سب اس گفتگو سے بڑھ کر ہے۔ اور اس کا حق ادا کرنا ہم سب کے لئے بلکہ ہماری ساری برادری کے لئے مشکل ہوگیا ہے۔ بھائی میرے کچھ تو سانس لیا کرو تم اتنی تیزی سے لکھتے ہو کہ پڑھتے پڑھتے سانس پھولتی ہے۔ دم لینے کی مہلت تو دو کچھ سوچنے کی مہلت دیا کرو کہ اطمینان سے محظوظ ہولیا کرو۔ خاکے لکھنے کا سلسلہ بھی اچھا ہے۔ میری رائے میں (میری رائے کا تمہاری رائے سے متفق ہونا قطعی ضروری نہیں) صرف خاکے لکھنا بھی مفید نہیں ہے۔ سارے کئے دھرے پر، تمام نیکیوں پر پانی پھرنے کا خدشہ ہے۔ ہمارے ادب میں ایک تو ویسے ہی طنز و مزاح نگاروں کی کمی ہے کچھ لوگوں کا دم غنیمت ہے آجکل لوگ خلوص اور نیک نیتی کو کہاں دیکھتے ہیں۔ کس بازار میں اس کی قدر ہوتی ہے۔ کچھ اتہ پتہ ہمیں بتاؤ۔ میں تو اس مجتبیٰ کو ڈھونڈتا ہوں جس کی کتابوں کو میں نے دو تین مرتبہ پڑھا ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ کچھ کچھ تمہارے ہاں بھرتی کی باتیں آنا شروع ہوگئی ہیں۔ (خدا نہ کرے یہ بسیار نویسی کی وجہ نہ ہو)۔ ایک بات یہ بھی کہ کچھ ہلکا سا پنجابی پن بھی آگیا ہے۔
یہ سطریں بالکل بے اختیارانہ طور پر لکھ دی ہیں۔ تم آج جس بلندی پر پہنچ گئے ہو ہوسکتا ہے، وہاں یہ سطریں ناگوار خاطر ہوں (خدا نہ کرے ایسا ہو) میری ہی نہیں ہم سب کی اور شاید ساری ادبی دنیا کی خواہش ہے کہ تم اس سے بھی آگے بڑھو۔
کل محترمہ شفیقہ فرحت سے بڑی دیر تک مختلف موضوعات پر بات چیت رہی اور کافی دیر تک تمہارا ذکر خیر ہوتا رہا۔ ہوسکتا ہے کہ میرے اس خط کا پہلا حصہ ان باتوں کی وجہ سے ہی ایسا ہوگیا ہو۔ میں تین چار دن سے

بھوپال میں ہوں۔ (یعنی سسرال میں) تین چار دن مزید رکوں گا۔ (سسرال میں اس سے زیادہ نہیں ٹھہرنا چاہئے لیکن بیوی کو یہاں ٹھہرانے میں فائدہ ہے) دہلی آنا چاہتا تھا پروگرام بھی تھا مگر افسوس ایک دو ماہ بعد شاید آنا ہو۔

بیسویں صدی کا تازہ شمارہ میری نظر سے نہیں گذرا۔ سُنا تھا کہ بیدی پر تمہارا خاکہ شائع ہوا ہے۔ اور بیدی کیساتھ کوئی ایسی تصویر بھی شائع ہوئی ہے جس میں والد محترم بھی ہیں۔ تم نے والد محترم پر خاکہ لکھا' شکریہ ادا نہیں کروں گا۔ کیا تم رسمیات کے قائل ہو؟ مگر شاعر نے کیا بگاڑا ہے۔ کیا گناہ کیا ہے۔ اتنے دنوں سے تم نے کچھ بھی تو نہیں بھیجا۔

لے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی۔ نکر صاحب سے بھی کچھ بھجواؤ۔ ان کا "فکر نامہ" پڑھنے کی بڑی خواہش ہے۔

"صبح ادب" لکھنؤ کا اعجاز صدیقی نمبر شائع ہو رہا ہے۔ کچھ لکھنے کا موڈ ہو تو ذرا دیکھو "شاعر" کا اعجاز صدیقی نمبر آئندہ سال کے ابتدائی مہینوں میں شائع ہوگا بالکل اسی انداز میں جس انداز میں اب تک والد محترم نے "شاعر" کے نمبر شائع کئے ہیں ـــــ (کوشش یہی ہے۔ کامیابی کہاں تک ہو سکے گی اس کا ابھی اندازہ نہیں) اس نمبر کے لئے بھی کچھ لکھنا انتہائی ضروری ہوگا۔ بلکہ ابھی سے لکھنا شروع کر دو۔ نمبر کا کام آئندہ مہینہ سے شروع ہو جائے گا۔

آئندہ سال "شاعر" اپنی زندگی کے پچاسویں سال میں داخل ہو رہا ہے۔ کتنی عجیب بات ہے یہ ایک معجزہ ہے۔ ادبی پرچہ اور پچاس سال تک زندہ ہے (سسک سسک کر زندہ رہنا اسی کو کہتے ہیں) بمبئی کی طرف کب دیکھ رہے ہو۔ آنے سے پہلے اطلاع دینا۔ دہلی واپس پہنچنے پر نہیں۔

محترمہ آمنہ صاحبہ سے میرا اور ہم بھائیوں کا آداب کہنا۔ ان کے ناول کو بے حد پسند کیا گیا۔ میرے ذہن میں ایک بات تھی میں نے شفیقہ فرحت صاحبہ سے بھی کہی کہ ایک خوبصورت سا مزاحیہ ناول لکھا جانا چاہیئے۔ قسط وار "شاعر" میں چھاپا جائے اس معاملہ میں تمہاری کیا رائے ہے اور تم کہاں تک سنجیدگی سے اس پر عمل کر سکتے ہو۔ اس خط کو پوسٹ کرنے سے پہلے تمہارے خط کا انتظار کر رہا ہوں۔

تمہارا : تاجدار احتشام

قاضی سلیم

ـــــــــ اورنگ آباد

۱۱ر نومبر ۱۹۸۳ء

ڈیر مجتبیٰ! السلام علیکم !!

آپ کا خط مجھے مل گیا تھا مگر ان دنوں میں ایک اور نئی مصیبت میں گھر گیا ہوں۔ کولہے کی ہڈی کے فریکچر کا جو آپریشن سرکاری میڈیکل کالج ہوسپٹل اورنگ آباد میں ہوا تھا وہ ڈھائی مہینہ بعد پتہ چلا کہ فیل ہو گیا ہے۔ اور ہڈی کا جوڑ کھلتا جارہا ہے اس لئے اب تک میں بستر سے اٹھ نہیں سکا اور تکلیف کم نہیں ہوتی ہے بیوقوف سرکاری ڈاکٹر نے پتہ نہیں کیا غلطی کی۔ اب کہتا ہے کہ بمبئی یا پونا میں کسی اچھے سرجن سے دوبارہ آپریشن کروانا ہوگا۔ اب چونکہ نیچرل ہڈی کا جوڑ خراب ہو چکا ہے اس لئے میٹل کا جوڑ لگانا ہوگا میں اس اطلاع پر بہت پریشان ہو گیا ہوں اور خاص طور پر بانو کو جس نے دو ڈھائی مہینہ میرے لئے رات دن تکلیف اٹھا کر صحت کو متاثر کر لیا ہے۔ اب از سر نو اسی مصیبت میں مبتلا ہونا ہے پھر دوبارہ گھر بھر کے لئے بوجھ بن جانے کا احساس میرے لئے عذاب ہے۔

میرے بہنوئی اسمٰعیل صاحب بمبئی یا پونا میں کسی سرجن سے اپائنٹمنٹ لے کے آئیں گے۔ تو میں بمبئی یا پونا چلا جاؤں گا۔ اس تکلیف میں مجھے لیٹے ہوئے لے جانا بھی ایک پرابلم ہوگا بہرحال جو بھی خدا کو منظور ہوگا۔

ابھی ابھی طے کرلیا ہے کہ پونا چلا جاؤں لکھی یہ خط پوسٹ نہیں ہوا تھا کہ پونا سے اسمٰعیل کا فون آیا ہے کہ ڈاکٹر شٹی سے اپائنٹمنٹ مل جائے گا۔ اور بہت اچھا سرجن ہے ایک ہفتہ بعد نکلوں گا۔

شمس الرحمٰن فاروقی کا پتہ گھر کا میرے پاس نہیں ہے۔ ان کا جواب بھی آپ ہی کے پاس بھیج رہا ہوں۔ امید ہے کہ گھر کی کنجیاں آپ کے پاس محفوظ ہوں گے۔ ایک دفعہ کبھی فرصت میں کھول کر چیک کرلیجئے اور روشن لال کو کہئے کہ ہر روز گھر کے اطراف ایک چکر لگالیا کرے۔ بھابی کو سلام بچوں کو دعائیں۔ تمہارا: قاضی سلیم

(۲)

پیارے انور، معظم اور مجتبیٰ! بہت سی دعائیں!!

آج یہ خط تینوں کو لکھ رہا ہوں۔ الگ الگ خط لکھتا تو وہی جذبات دہرانے پڑتے، اس لئے ایک ہی مکتوب سے کام چل جائے گا۔ بہت دنوں سے آپ لوگوں نے مجھے یاد نہیں کیا۔ سوچا تھا عید کے موقع پر مبارکباد بھی دوں گا اور خیر و عافیت بھی معلوم ہو جائے گی۔ آج اپنے آپ سے کیا ہوا وعدہ پورا کر رہا ہوں۔ وعدہ اور ایفائے وعدہ کے بیچ حالات یکسر بدل گئے ہیں۔ لگتا ہے ہمیشہ کی طرح اس عید کے بھی اہل ثابت نہیں ہوئے ویسے پچھلی سو عیدوں سے وہی ہوتا آرہا ہے اس دفعہ بظاہر کوئی نئی شکایت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ رمضان سے پہلے کی وارداتیں، سانحے، قبول و منظور کرکے خدا و ند قدوس سے صلح و صفائی کرلی تھی۔ اپنی بے پناہ قوت برداشت پر نازاں، پانچ سات ساتھیوں، چھوٹی سی گرہستی پر قانع صابر و شاکر صرف STATUS کی دعا مانگ رہا تھا کہ شاذ تمکنت نے مرنے میں پہل کرکے دکھ دینے کا نیا پہلو تلاش کرلیا۔ جو زخمی چھلنی دل کے لئے ایک نیا تجربہ بھی تھا۔ اس لئے کہ ساتوں ساتھی اب تک زندہ چلے آرہے تھے، جو بچپن سے ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور اب بڑھاپے کی مقدس سرزمین سے گذرنے کا عزم تھا۔ شعر و ادب کی کوہ پیمائی پر ساتھ ہی نکلے تھے ایک ٹیم بنا کر ایک ہی رسی کو پکڑے ہوئے اپنے مراحل پر قابو پاتے ہوئے اوپر تک چڑھ آئے تھے اس طرح کہ دشوار گذار گھاٹیوں میں کسی ایک کا بھی پاؤں پھسلے تو سب کو ایک ساتھ جھٹکا لگے۔ سب کے پاؤں اکھڑنے محسوس ہوں، شاذ بظاہر مجھ سے بہت قریب نہیں رہے۔ کبھی میں نے اسے اپنے مقابل نہیں سمجھا۔ وحید اختر اور بشر سے جوڑ کر دیکھا ہے مگر ہم سب کے ایک ہی ڈور میں بندھے ہونے کا احساس کبھی بھی مجھ سے جدا نہیں ہوا۔ جب وہ گرا تو مجھے لگا کہ میرے پاؤں زمین سے اکھڑنے لگے ہیں کسی کھڈ میں لڑکھڑاتا جا رہا ہوں، شاذ کی رحلت پر میرا یہ تاثر خود میرے لئے خلاف توقع تھا۔ "شاید اسی لئے بہت رونا آیا۔" ہم تعداد میں بہت کم تھے جو ذہنی سفر میں ساتھ تھے ان میں سے بھی ایک ایک کے کم ہونے کی شروعات شاذ نے کردی ایسا محسوس ہوا جیسے موت کو چھو کر دیکھ رہا ہوں۔ اس لئے بقیہ پسماندگان کے لئے تہہ دل سے دعا کر رہا ہوں اور یہ بھی دعا ہے کہ دوسرا کوئی زہر میں بجھا تیر میرے سینے کی تلاش میں نکلے تو میرا پتہ نہ دے وہ پہاڑوں چٹانوں سے سر ٹکراتا پھرے۔ مشیت سے انتقام لینے کا یہ بھی تو طریقہ ہو سکتا ہے، ویسے میں اب بہت کمزور ہوگیا ہوں، ایسا بھی نہیں ہے۔ البتہ یہ سچ ہے کہ دل میں کسی نئے زخم کی اب گنجائش نہیں رہی، میری آنکھ دیکھنے اور میرے کان سننے کا عذاب سہہ چکے ہیں۔ اب تو حالت یہ ہے کہ اپنے سے دس بیس سال بڑی عمر کا کوئی بزرگ مرتا ہے تو مجھے دکھ کی بجائے ایک طرح کی طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ سجدۂ شکر بجا لاتا ہوں کہ مرنے والے نے اتنی طویل عمر پائی شاذ سبھی پر یہ

کیفیت گذرتی ہوگی مگر ہماری تہذیب ریاکاری سکھاتی ہے اس لئے ہم نوحہ کناں ہوتے ہیں آج شاذ کی رحلت کے عظیم سانحے پر میں اقبال کرتا ہوں کہ جوشؔ، فراقؔ اور فیضؔ کی اموات پر مجھے کوئی صدمہ نہیں ہوا ہم سب کو وہ موت سہانی لگتی ہے ۔ جو ہم سے بیس پچیس سال دور نظر آئے یا پھر اس لئے کہ جوشؔ، فراقؔ اور فیضؔ اپنا کام پورا کر چکے تھے۔ عظمت کی جن بلندیوں تک انہیں پہنچنا تھا پہنچ چکے تھے جو کتابیں ان پر اترنی تھیں اتر چکی تھیں، "اَلْمُلْکُ تَحْتُمْ تِیْنُکُمْ" کی منزل آپہنچنے رونے کی نہیں عقیدت سے سر جھکا دینے کی ہے روحِ گذران کو احترام سے سلام کرکے رخصت کرنے اور عقیدت کے پھول نچھاور کرنے کا مقام ہے ان کے کلام کو آنکھوں سے چوم کر سر پر رکھ لینے کا وقت ہے۔ مجھے لگتا ہے وہ اس وقت مرے جب انہیں مرجانا چاہئے تھا، خدا کی بنائی ہوئی فطری موت جو قانونِ قدرت کے مطابق اپنے وقت پر ظہور پذیر ہوئی۔ آہستہ آہستہ جسم کے کل پرزے گھستے گھستے پتلے پڑتے گئے۔ چلتے چلتے زندگی کی گاڑی دھیرے دھیرے کسی موڑ پر رک گئی۔ اس فطری موت کے بعد تو یہ زندگی عذابِ مسلسل بن جائے گی اور یہ دھرتی جہنم زار ـــــ میں ایسی موت کو خوش آمدید کہتا ہوں مگر اس کو چھوڑ کر روح کشید کرنے کے جتنے بھی طریقے ہیں سراسر ظلم اور مشیت کے اندھے جبر پر مبنی ہیں میں احتجاج کرتا رہوں گا چیخ چیخ کر کرتا رہوں گا۔ چاہے پوری زندگی چیخ بن کر رہ جائے۔ چاہے میری شاعری کو آپ صحت مند ادب سے خارج کردیں شاذ تمکنت کی موت کو کیوں قبول کرلوں۔ ہر موت طبعی قانونِ قدرت کے خلاف ہے حادثاتی ہے اس لئے اردو دنیا کے لئے جوشؔ، فراقؔ اور فیضؔ کی موت سے بڑا سانحہ ہے بھلا یہ کونسی سی موت ہوئی کہ جب بلندیوں پر پہنچنے کے لئے دو چار ہاتھ رہ گئے تو کمر توڑ کر اسے تحت الثریٰ میں پھینک دیا گیا ٹرک کے نیچے کچلے جانے میں فرق ہی کیا ہے۔ شاذ کسی غیر مرئی مخلوق کی قدموں سے کچلا گیا اس طرح جیسے اگر پنکھا کھولنے کے لئے اٹھوں تو وہ بدقسمت چیونٹی میرے پیروں سے روندی جائے جو اتفاق سے اسی لمحہ گھر سے نکلی تھی ۔ دل پھٹ جاتا ہے اس وقت جب اچھے سے بہتر صلاحیت والا اور اپنے سے دو چار سال کم عمر والا ہم سے چھین لیا جائے۔ ایسے میں ہم موت سے خود بھی دوچار ہوتے ہیں ببول کی کانٹوں بھری جھاڑیوں پر چادر ڈال کر کھینچنے سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ وہی موت کے گزرنے کی بیان کی گئی ہے۔ میری روح کی چادر کو کانٹوں بھری جھاڑیوں سے کھینچے جانے کا احساس مجھ پر دو روز طاری رہا۔ پھر میں اس کا عادی ہوگیا کہ تڑپ کم ہوئی مگر کسک شاید زندگی بھر رہے ۔ موت کے خونخوار گدھ کے پنجے شاذ کی روح لیجا رہے تھے اسی وقت ان سارے دلوں پر بھی حملہ آور ہوئے جن میں شاذ کی محبت تھی یا جن کی یادوں کا ایک حصہ شاذ سے منسوب تھا۔ جیسے کوچ کرنے والا مسافر اپنا سارا اثاثہ سمیٹ کر جاتا ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ ہندوستان، پاکستان کے سارے ادیبوں، شاعروں کو یہی محسوس ہوا ہوگا جیسے دل کا ایک ٹکڑا نوچ کر علیحدہ کیا گیا، خاص طور پر دکن کے لوگوں نے تو اپنی ایک بڑی امید کھو دی۔ تب ہی تو سب سہمے ہوئے ڈرے ڈرے چپ چپ ہیں کوئی نہیں بولتا ایک دوسرے کو شاذ کی یاد بھی نہیں دلاتے ایسا لگتا ہے کہ ہم سب تھوڑے تھوڑے مر گئے ہیں۔ کیا کہیں کہ بلندی کے لئے کتنی منزلیں باقی تھیں۔ کیا دکن کا یہ تھا رسنا د عظمت سے محروم ہی رہے گا۔

کب تک میرے مولا۔ کب تک۔ کب تک

خیر اندیش، قاضی سلیم

احمد جمال پاشا

نشاط افزا (سیوان) بہار ________

۷ رمارچ ۱۹۸۰ء ـــــ پیارے مجتبیٰ بہت سے پیار!!

میں نے آج تمہارا دل آویز خاکہ "کمار پاشی" پڑھا اور شروع سے اخیر تک ہنستا اور لطف اندوز ہوتا رہا۔

واہ! واہ! کیا تشبیہیں، استعارے، رعایتیں، کنائے اور تلمیحیں استعمال کی ہیں۔
میری جانب سے اس فنکارانہ، قہقہہ بار شاہکار پر بھرپور مبارکباد قبول کرو۔ "کمار پاشی" اگر اپنی شاعری سے زندہ نہ رہ سکے تب بھی مجتبیٰ حسین کے خاکہ سے زندہ رہیں گے۔ ویری گڈ۔ تمہارا اپنا: احمد جمال پاشا

(۲) ۱۵ر جنوری ۱۹۸۵ء
کرمی مجتبیٰ صاحب فاتح جاپان، یورپ و امریکہ و دیگر ممالک محروسہ وغیرہ وغیرہ ـــــ بھئی آپ نے مجھے کہاں کھینچ بلایا؟
۱۷ر کو دہلی جینتی جنتا سے پہونچ رہا ہوں۔ امید ہے کہ نہ صرف آپ ملاقات کے لئے وقت نکالیں گے۔ بلکہ خواہش ہے کہ اپنے دولت خانے اور فکر تونسوی کے خانۂ انوری کی بھی زیارت کروائیں گے۔ آپکا اپنا: احمد جمال پاشا

شاذ تمکنت

حیدرآباد

۱۵ر اپریل ۱۹۷۸ء
ممتاز عثمانین مجتبیٰ! پیار
ہفتہ بھر پہلے تمہارا پر تکلف خط ملا۔ ویزا کے کاغذات مل گئے بہت بہت شکریہ۔
زندہ دلان حیدرآباد کا 'عرس' (بقول تمہارے) اب آگے بڑھ گیا ہے۔ شاید اس ماہ کے اواخر میں ہو۔ تب تم سے ملاقات ہوگی۔ شنکر شاد مشاعرہ کی کامنٹری پڑھی۔ سطر سطر میں تمہاری شوخی جھلک رہی ہے۔ خاص طور پر صلاح ایڈیٹر کے تعلق سے تم نے جو کچھ بھی لکھا ہے۔ اسے یا تو میں سمجھ سکتا ہوں یا وہ جس نے مشاعرہ سنا ہو۔
میں تمہاری کتابیں ہدیتہً حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ یہاں دو چار دوکانوں پر پوچھا نہیں ملیں۔ اب مخطوطات میں ڈھونڈونگا یا سالار جنگ میوزیم جاؤں گا۔
بہر حال تم سے مل کر اور تمہاری تحریریں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا واقعی حسین ہے۔
نیم خواب پڑھی؟ کیسی لگی؟
واجبات یعنی لواحقین کو سلام اور بچوں کو دعائیں۔ تمہارا اپنا: شاذ تمکنت

پروفیسر وحید اختر

علی گڑھ (یو۔پی)

۵ر اکتوبر ۱۹۷۸ء
برادرم مجتبیٰ صاحب! تسلیمات!!
آپ کا خط ۲۷ر ستمبر کا لکھا ہوا ملا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کوزس کی تلاش میں ہیں، اسے کسی مردود دیا

کچھ پردہ داروں نے ایسا چھپا دیا ہے کہ اس کا سراغ ہی نہیں مل رہا ہے۔ شہر یار سے کہہ کہہ کر تھک گیا اور وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہار گئے۔ اب تک کوئی پتہ نہیں چلا۔ تلاش کا یہ سلسلہ سال ڈیڑھ سال سے تو چل ہی رہا ہوگا۔ دیکھئے ایک بار اور جستجو کرنا پڑے گا السعی منی والاتمام من اللہ۔ خود جناب "عتیق صدیقی" سے بھی دریافت کروں گا اور کوشش کروں گا کہ اسے ڈھونڈ نکلوا کر آپ کو بھیج دیا جائے۔

کل حضرت متین سروش کے آمد کا اندیشہ تھا۔ ان کا خط مجھے کل ہی ملا جس سے پتہ چلا کہ وہ بھارت یاترا پر کوئی "ستار العیوب" کا ٹکٹ بنوا کر نکلے ہیں، جہاں چاہیں جائیں اور بغیر ٹکٹ والوں کے زمرے میں پکڑے نہ جائیں۔ انھوں نے لکھا کہ چونکہ اس فہرست تماشگہ میں علی گڑھ ایک ناگزیر منزل کے طور پر درج ہے، اس لئے وہ ریلوے والوں کے بے حد اصرار پر علی گڑھ آ رہے ہیں۔ مجھے ان کا خط ۴ ر کو ملا اور وہ ۴ ر ہی کو یہاں وارد ہونے والے تھے۔ انھوں نے لکھا تھا کہ میں اپنی علی گڑھ میں موجودگی کی تصدیق صدر شعبہ یا وائس چانسلر سے کروا کے بھیج دوں، اس کا موقع نہ تھا، پھر بھی کل دن بھر ان کا انتظار کرتا رہا۔ دوسرا دن بھی طلوع ہو گیا مگر آفتاب شعر و شاعری افق علی گڑھ پر اب تک طلوع ہوتا نظر نہیں آتا۔

مرزا سروش صاحب کا یہ معمول ہے کہ ہر دو چار سال بعد لکھتے ہیں کہ میں فلاں تاریخ کو آ رہا ہوں پھر لکھتے ہیں کسی کام کی وجہ سے پروگرام بدل گیا۔ اب فلاں دن آؤں گا۔ چار پانچ تبدیلیوں کے بعد وہ سکوت اختیار کر لیتے ہیں۔ میں سمجھ لیتا ہوں کہ مغلوں کا یہ تن تنہا لشکر علی گڑھ کی سرحد پر خیمہ زن تھا، مال غنیمت سے مایوس ہو کر پلٹ گیا۔ ایک بار تو یہ ہوا کہ مرزا صاحب کے خطوط کا تانتا بندھا ہوا تھا اور خدشہ ہر دم تھا کہ اب آئے تب آئے۔ اس بیچ میں ان کے بجائے ادیب اور قیصی یہاں آ گئے۔ ہمارے بچے چھوٹے تھے، انھوں نے یہ سن رکھا تھا کہ متین سروش آنے والے ہیں، ادیب اور قیصی کو دیکھ کر وہ سمجھے کہ ان میں ایک متین ہے اور دوسرا سروش ——— لیکن ادیب نے بڑی کوشش کے بعد بچوں کو اپنا نام بولنا سکھایا ——— اور انھیں یہ باور کرایا کہ یہ دوسرے صاحب (یعنی عزیز قیصی) متین سروش ہیں۔ جب تک وہ لوگ رہے بچے قیصی کو متین فروش چچا کہتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قیصی کی رائے نہ صرف بچوں کے بارے میں خراب ہو گئی بلکہ وہ مجھ سے بھی کشیدہ ہو گئے۔ اب تک کشیدہ ہیں، اگست میں میں بمبئی گیا، قیصی کو لکھ دیا تھا کہ میں ۲۵ ر کو آ رہا ہوں۔ وہ اس سے دو چار دن قبل گھر کو تالا لگا کر معہ اہل و عیال حیدرآباد روانہ ہو گئے ——— بچوں کی حماقت کی سزا مجھے بھگتنی پڑی۔ لیکن قیصی کو بھی متین سروش کہلوائے جانے پر اتنے دن کینہ نہ پالنا چاہئے۔

بہر حال ان ہی حضرت مرزا متین سروش کی آمد آمد کی دھوم ہے۔ رن کانپ رہا ہے۔ مگر کل نہیں آئے تو شائد اب بھی نہ آئیں۔ انھوں نے حسب معمول کسی قریبی شہر سے اپنی آمد علی گڑھ کا اعلان کر کے اپنے قریب ہونے کا اعلان کر دیا۔

امید کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ ہاں، اگر وجد (سکندر علی وجد صاحب) کا پتہ معلوم ہو تو لکھئے۔

آپ کا وحید اختر

(۲) ۴ ر جنوری سنہ ۱۹۸۴ء

برادر عزیز! تسلیمات!!

کل "آواز" میں "پچھلے جنوری ہم دور سے پہچان لیتے ہیں" پڑھا۔ اب تک تو آپ نئی جنوری سے بخوبی متعارف ہو چکے ہوں گے ——— نیا سال خدا کرے آپ کے لئے بہتر و خوشگوار تجربے ساتھ لائے۔

حیدرآباد کے مشہور مزاح نگار یوسف ناظم حال مقیم بمبئی کے لگاتار اور بار بار اصرار پر "شگوفہ" کے طنز و مزاح نمبر

کے لئے بالاآخر سوالنامے کا جواب بھیج دیا۔ جب بھی یہ کاوشِ زیورِ طبع سے آراستہ ہو آپ میرا جواب نامہ بغور پڑھئے اپنا ذکر خیر و تعریف کے ساتھ پائیں گے۔

آپ سے شرمندہ ہوں کہ وعدہ کیا تھا کہ آپ کی کتاب کی رسم اجراء کے موقع پر شائع ہونے والے بروشر کے لئے بزبان انگریزی مضمون قلم بند کر دوں گا۔ مگر ذہن سے نکل گیا۔ نشے میں کئے گئے وعدوں کا یہی حشر ہوتا ہے۔ ابھی حال میں مختار الدین آرزو صاحب نے مجھ سے تقاضہ کیا کہ مالک رام صاحب کی نثر پر مضمون جلد بھیجئے۔ میں نے کہا کیسا مضمون؟ بولے مالک رام صاحب نے لکھا ہے کہ آپ نے وعدہ کیا تھا؟ پوچھا کیسا وعدہ؟ کب کیا تھا؟ پھر خود ہی دماغ پر بار ڈالا تو لاشعور سے تحت الشعور اور پھر تحت الشعور سے شعور کی دہلیز تک ایک شام کے وعدے کو ڈھونڈ کر برآمد کیا —— ان بزرگوار نے تو میرے سکر سے فائدہ اٹھا کر وعدہ لے لیا تھا لیکن آپ سے میں نے بعدِ مجلس جب کہ دل پر مصائب کربلا کے اثر سے رقت طاری تھی، بعالم صحو، ہمایوں کے گھر، جمنا پار، گگن وہار میں وعدہ کی تجدید بھی کی تھی —— بہر حال جب خیال آیا تو وقت نہیں رہ گیا تھا، لہٰذا خود کو یہ سوچ کر بہلا لیا کہ مجتبیٰ دوست ہیں، اس تقصیر سے درگذر کریں گے کیوں کہ یوں بھی حیدرآبادی تقصیر معاف کرنے اور تقصیر سہنے میں فرق نہیں کرتے۔ بہر حال میں واقعی معذرت خواہ ہوں، تلافی یا کفارے کے لئے آپ کے جلسے میں شرکت کرتا، دعوت نامہ ملا تھا مگر اسی تاریخ مجھے بنارس میں ریڈران اور پروفیسران وغیرہ کا انٹرویو لینا تھا۔ اور میں قبولیت نامہ بھیج چکا ہوں۔ انٹرویو دینا تو (ملازمت یا ترقی کے لئے) تکلیف دہ کام ہے۔ انٹرویو لینے میں لطف آتا ہے۔ شہریار سے آپ کے جلسے اور اس کے بعد قاضی سلیم کے خانۂ خالی میں دعوتِ جشن کی روداد سنی تو اپنی عدم شرکت پر اور ذرا افسوس ہوا۔

میری رخصت بمشکل سال بھر کے لئے منظور ہوئی ہے جس سے فروری کی ۲۰ ر تک استفادہ کرنا ضروری ہے، لیکن ابھی تک ایران سے ضروری کاغذات سفر وغیرہ نہیں آئے۔ امید ہے کہ اس ماہ آ جائیں گے میں فروری کے آخر میں یا مارچ کے شروع میں انشاء اللہ ایران چلا جاؤں گا۔ اگر رخصت میں ابھی سے توسیع نہ ہو سکی تو وہاں سے کرواؤں گا

السعی منی والاتمام من اللہ ——

سنا ہے کوملراج کوہل پانچ ہزار انعام ملنے کی خوشی میں جشن منا رہے ہیں۔ آپ کو مدعو کیا ہوگا، اگر آپ کو اطلاع نہ تھی تو اس کو اطلاع سمجھئے اور ان سے ربط پیدا کیجئے۔ شہریار یہاں سے اس دعوت میں شریک ہونے والے ہیں۔ اگر آپ مدعو کئے جائیں تو کوہل کو میری طرف سے مبارکباد دے دیجئے۔ اگر مدعو نہ ہوں تو فون پر انہیں میری مبارکباد پہنچا دیجئے۔ بقول متین سروش "حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے مدعو ہی نہیں کیا گیا۔"

سنا ہے کہ ہمارے خان صاحب دوست عزیز قیسی دہلی آئے تھے۔ اور ٹکٹ گم کر کے بیٹھے تھے، اب تک تو وہ بخیر و خوبی بمبئی واپس ہو گئے ہوں گے۔ یوسف ناظم کا ارادہ نومبر میں دہلی آنے کا تھا اور ان کا عزم یہ تھا کہ وہاں سے علی گڑھ بھی قدم رنجہ فرماتے مگر انھوں نے لکھا کہ مجتبیٰ نے وہ کام کروا دیا جس کے لئے دہلی جانا تھا۔ ان کو بدگمانی یہ ہے کہ آپ نے عجلت سے یہ کام اس لئے کروا دیا تاکہ ان کے ورودِ دہلی و میزبانی کے شرف سے محفوظ رہیں واللہ اعلم بالصواب۔

ہاں یاد آیا اطہر پرویز "الفاظ" میں آپ کا گوشہ چھاپنے کو بھی بے تاب ہیں اور میرا بھی لیکن ان کو گلہ یہ ہے کہ ہم دونوں کے درمیان کوئی کشاکش ہے۔ جس کے نتیجے کے طور پر نہ آپ مجھ پر مضمون لکھ رہے ہیں اور نہ میں آپ پر —— اور ان کا خیال ہے کہ دونوں کے گوشے ایک دوسرے کے مضامین کے بغیر تشنہ رہیں گے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اس کشاکش میں پہلے آپ

میں آپ ہی یا میاں لیں۔ اور پہل کیجئے ورنہ ایران میں ایک گوشہ بسالیں گے تو یہاں کون گوشہ چھاپے گا۔
امید کہ آپ مع اہل و عیال بخیریت ہوں گے۔ احباب (اگر کوئی مجھے پوچھے تو) سے سلام کہئے۔

خدا حافظ آپ کا وحید اختر

کنہیالال کپور

ـــــــــ موگا (پنجاب)

۲۳ ستمبر ۱۹۷۵ء

ڈیر مولانا فکر تونسوی اور عزیز مولوی مجتبیٰ حسین، سلام، کورنش، سجدہ وغیرہ وغیرہ۔

آپ کا پیغام محترمہ عصمت چغتائی صاحبہ کی وساطت سے ملا۔ آپ نے جس غداری کا ثبوت دیا ہے اس کی مثال غداروں کے اس ملک ہندوستان میں نہیں ملے گی۔ جب آپ ایوانِ غالب تک نہیں آسکے۔ تو کیا یہ خاکسار اتنا بے حیا اور بے عزت ہے یا تھا۔ کہ آپ کے دولت خانہ پر آتا۔ خیر لعنت بھیجئے (اپنے آپ پر)

آمدم برسر مطلب "زندہ دلانِ لدھیانہ" ادبی ملنگوں کا ایک کلب ہے وہ میرے اعزاز میں ایک مختصر سی تقریب کا اہتمام نومبر ۱۹۷۵ء کے تیسرے یا چوتھے ہفتہ میں لدھیانہ میں کرنا چاہتا ہے۔ اس کی خواہش ہے آپ دونوں اس میں شرکت فرمائیں۔ اور اپنے مزاحیہ مضامین (ضروری نہیں جو مجھ پر لکھے گئے ہیں۔) سے اسے محظوظ فرمائیں۔ ریلوے ٹکٹ وغیرہ کے کرایہ کے لئے آپ دونوں کو زیادہ سے زیادہ مبلغ ایک سو پچاس روپے دے سکیں گے۔ (یعنی پچھتر روپے فی کس) یہ اس لئے دوبارہ واضح کر دیا ہے کہ آپ کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

اگر آپ کو یہ پیشکش منظور ہو تو واپسی ڈاک مطلع فرمائیں۔ نہیں تو میں موگا سے دو آدمی کہ جن کی شکل و صورت آپ سے ملتی جلتی ہو پکڑ کرلے جاؤں گا اور انہیں فکر تونسوی اور مجتبیٰ حسین کا نام دے کر کام چلا دوں گا۔

جواب کا منتظر کنہیالال کپور مرحوم و مغفور؟

۳۰ اکتوبر ۱۹۷۵ء

ڈیر علامہ فکر تونسوی و مولانا مجتبیٰ حسین تسلیمات!

آپ کا محبت نامہ ملا۔ جوں ہی اسے گلے لگایا سارے گلے شکوے جاتے رہے۔ تو یہ سب قصور ایوانِ غالب والوں کا تھا میں خواہ مخواہ آپ سے ناراض ہوتا رہا۔ میں اپنے تمام سخت اور نازیبا الفاظ (مع سود در سود) واپس لیتا ہوں۔ اور آپ دونوں سے معذرت چاہتا ہوں۔ ٹی۔ وی پر میں نے آپ اور مسٹر نریندر لوتھر کا ذکر کیا ہے۔ وہ کوئی کسی پر احسان نہیں کیا تھا وہ تو آپ کا حق تھا مولانا اپنی قدر و قیمت پہچانیے ؎

قیمت خود ہر دو عالم گفتہ ای　　نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

ہم یعنی خاکسار اور کرشن چندر، رشید احمد صدیقی وغیرہ ماضی کے مزاح نگار ہیں۔ آپ (یعنی آپ) مستقبل کے اور فکر تونسوی حال کے (کیوں کہ ان کے مزاحیہ اور طنزیہ تحریریں پڑھ کر در و دیوار کو حال آجاتا ہے)۔

لدھیانہ کا جلسہ کب ہوگا؟ اس کا علم اہل لدھیانہ کو بھی نہیں ہے۔ مجھے یا میرے فرشتوں کو تو خیر کیا ہوگا۔ لیکن اگر واقعی ہوا۔ اور جب بھی ہوگا۔ آپ کو دس بارہ دن کا نوٹس ضرور دیا جائے گا۔

تاکہ آپ سامانِ سفر اکٹھا کر سکیں۔ فکر صاحب سے کہیں ملاقات نہ ہونے کا غم نہ کریں یار زندہ (یا مردہ) صحبت باقی کرشن چندر سے ملے ۲۹ سال ہوگئے ہیں۔ لیکن میں مایوس نہیں ہوں۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں جہنم میں ایک دوسرے سے ضرور ملیں گے۔

آپ دونوں کا پرستار
کنہیا لال کپور بدکردار و بدگفتار

سلیمان خطیب

ـــــ پانی محل (گلبرگہ)

۴ر اپریل ۱۹۶۸ء

عزیزم مجتبیٰ حسینی ـــ السلام علیکم!

تمہارا شکوہ نامہ نظر نواز ہوا۔ بے انتہا مسرت حاصل ہوئی کہ کم از کم تمہاری تحریرِ دلپذیر کی زیارت نصیب ہوئی۔ تم نے قریب آکر گفتگو کی۔ شکوک و شبہات کی تخم ریزی کیوں ہو رہی ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔ یوں ہوا کہ میں نے اخبار میں کتاب کی رسم اجرا کی خبر پڑھی۔ مجھے بے پناہ مسرت ہوئی کہ میرا چھوٹا بھائی "صاحبِ کتاب" ہوا ہے اور ایک چھوٹا موٹا مزاحیہ مشاعرہ بھی ترتیب دیا جا رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ "چھوٹے موٹے شعرا" مشاعرہ کو بے کیف کر دیں۔ اس محفل کے شایانِ شان نہ ہو۔ کیوں نہ مجتبیٰ میاں سلمہٗ کو دولہا بنتا ہوا اپنی آنکھوں سے دیکھوں، ہار پہناؤں گلے لگالوں کہ تو نے گلبرگہ کی لاج رکھ لی! حیدرآباد کی لاج رکھ لی۔ میرا سر چار مینار کے کلس کو چھونے لگا۔! بغیر کسی دعوت نامہ کے وہاں پہنچ گیا۔ اور جگر صاحب سے کہہ دیا کہ صرف اس تقریب میں شرکت کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ سب کو بڑا تعجب ہوا! آخر محفل میں شریک رہا۔ "نذرِ عقیدت" پیش کی۔ تم سے ملا چلا آیا۔ اس میں شکایت کی بات ہے شرمندگی کیوں ہوئی۔ مجھے کتاب ملی۔ بہت بہت شکریہ کتاب کا۔ خطیب نوازی کا۔!!

لیکن اردو ہال میں کتاب میں نے پیسے دے کر خریدی تھی۔ یہ کتاب حیدرآباد میں مری بچی شمیم ثریا (بی اے) نے رکھ لی۔ اچھا کیا کہ تم نے کتاب بھیج دی۔ میں مفت خواں حضرات کے زمرے سے باہر ہوں۔ مفت خواں بڑے آرٹسٹ ہوتے ہیں۔ مجھے یہ آرٹ نہیں آتا۔ جب گھر پہنچا تو تمہارا دعوت نامہ ملا۔ کہیں اپنے لوگ۔ گھر والے۔ دعوت کا انتظار کرتے ہیں؟ یہ تو میرے گھر کی تقریب تھی۔ چھوٹے بھائی کی تکلیف کی کیا بات! خیر جانے دو ان فضولیات میں مت پڑو۔

"تمہاری کتاب" کی تلاوت شروع کی تھی کہ نومولود پروفیسر طیب انصاری طلوع ہوئے۔ کتاب چھین لی۔ اللہ شریف چلے گئے یہ ذاتِ شریف جب اللہ شریف سے کتاب چاٹ کر واپس ہوں گے تو میں شروع کرونگا۔ یوں بھی طیب انصاری کو حودی چاٹنے کی خاندانی عادت ہے۔ اللہ کے مجاور جو ٹھہرے۔!! دعا کرو کہ کتاب صحیح سلامت دالیس آجائے۔

کل وقار خلیل آئے تھے۔ پانی محل میں شب بسر کی صبح چلے گئے۔ یہ بھی اپنے طرف کی "خاکِ مقدس" ہے اک مشتِ خاک۔ طوفان برکاب۔!! اچھا خدا حافظ۔ دعا گو سلیمان خطیب۔

انتظار حسین

لاہور، پاکستان

۱۹ مئی ۱۹۸۴ء

بھائی مجتبیٰ حسین۔ السلام علیکم

بھائی تمہیں آتے ہی خط لکھتا مگر پھر میں نے سوچا کہ وقفہ بہت ضروری ہے۔ دوستوں کو اتنا تھکایا ہے۔ تھوڑا سستا لینے دو۔ یہ کہیں گے کہ خدا خدا کرکے رخصت ہوئے اور فوراً ہی تھکے دوستوں میزبانوں کو خیریت کے خط لکھ لکھ کر تھکانا شروع کر دیا۔ سو میں مناسب وقفے کے بعد خط لکھ رہا ہوں۔ ایک تو حیدرآباد میں جیسی تم نے ہماری مہمان نوازی کی اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے اور غالباً حیدرآباد کے اخباروں میں بعد بھی اچھا خاصا لکھا گیا ہے۔ مجھے اس طرح پتہ چلا کہ یہاں اپنے حبیب اللہ اوج ہیں حیدرآباد والے۔ تم جانتے ہوں گے۔ انہوں نے شاید حیدرآباد کے اخباروں کا اپنے لیے انتظام کر رکھا ہے۔ انہوں نے ایک روز رستے میں مجھے پکڑ لیا۔ بہت خوش ہوئے کہ تم حیدرآباد ہو آئے۔ پھر پوری روداد سننے کی خواہش ظاہر کی۔ اور وہاں کے اخباروں کی خبریں سنائیں۔ اب کسی روز ان کے پاس جاؤں گا۔

دوسری بات۔ تمہاری کتابیں بحفاظت لے آیا ہوں۔ اب بیٹھ کر یکسوئی سے پڑھوں گا۔ سچی بات ہے ابھی تک تمہارے رنگ مزاح کا مجھے پوری طرح اندازہ نہیں تھا۔ اب کچھ ہوا ہے۔

کبھی پاکستان کا دورہ لگاؤ۔ اس کے لیے تمہارے پاس پورا جواز موجود ہے۔ آخر ابراہیم جلیس مرحوم کے بیوی بچے تو کراچی ہی میں ہوں گے۔

ہماری تصویریں کسی معتبر آنے جانے والے کے ہاتھ بھجوانے کی کوشش کرنا۔ نارنگ صاحب کو آنے جانے والوں کا زیادہ پتہ رہتا ہے۔ بیگم سلام کہتی ہیں۔

تمہارا انتظار حسین

یوسف ناظم

بمبئی

۱۰ ستمبر ۱۹۸۵ء

برادرم مجتبیٰ حسین صاحب۔ السلام علیکم

کل شام کو کوئی ۴ بجے ہوں گے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی فون اٹھایا تو آواز آئی "میں مجتبیٰ حسین کا دوست [illegible]۔ ان کی چٹھی آپ کو بھی آئی ہوگی" اور ایک ہی سانس میں وہ کئی باتیں کہہ گئے قطع کلام کی میری عادت نہیں اس لئے میں نے انہیں ٹوکا نہیں۔ بڑی دیر بعد جب مجھے کچھ عرض کرنے کا موقع ملا تو پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ وہ جھنڈا یا جھنڈھا ہیں۔ شام میں کوئی پانچ بجے آپ کے دونوں خط ایک ساتھ وصول ہوگئے (یہ دونوں خط ایک ہی لفافہ میں بھی بھیجے جا سکتے تھے ایسا میرا خیال ہے) لکھا ہی خط ملا وہ کہتے ہیں میں انہیں ہوائی جہاز کا کرایہ دلواؤں گا

حد ہوگئی مزاح نگاری کی۔ میں کون ہوتا ہوں ذرا ان سے پوچھئے۔ بہرحال میں نے آپ دونوں کی واپسی کے ریزرویشن کا بندوبست کر دیا ہے۔ خالد آج آپ کے ٹکٹ لیتے آئیں گے۔ اب فکر آئیں یا نہ آئیں انہیں واپس تو جانا ہی ہوگا۔ ۲۶ر کو میں آپ کا منتظر رہوں گا۔ وجاہت علی سندیلوی بھی آ رہے ہیں یوں نریندر لوتھر کا راضی نامہ (جو مستعفی کے معنوں میں غلط استعمال ہوتا ہے) آچکا ہے۔ فیاض رفعت کو دو دن پہلے تک آپ کا خط ملا نہیں تھا۔ میں نے آپ کا فون نمبر انہیں دے دیا تھا۔ اور شاید کل انہوں نے فون کیا بھی ہو۔ اندرجیت لال کے خط ملتے رہتے ہیں انہیں نریندر لوتھر کے پتے کی تلاش تھی۔ لکھا کہ مجتبیٰ حسین کا فون کام نہیں کر رہا ہے۔ اس لئے میں پتہ لکھ دوں۔ یہ دلی میں اکثر ہوتا کیا رہتا ہے۔

شاذ کے انتقال کا واقعی صدمہ ہوا۔ آپ کا مضمون سیاست میں میں نے پڑھ لیا۔ تصویر آنکھوں میں پھر گئی۔ میرا مضمون بھی وہاں پیر کی اشاعت میں چھپا ہے۔ اور اتفاق سے عنوان "شاذ کی یاد میں" ہی ہے۔ یہاں ۲۴ر کو شاذ اور زیب غوری کی تعزیتی میٹنگ ہوئی تھی۔ جس کی صدارت جعفری صاحب نے کی۔ کافی تعداد میں لوگ جمع ہوگئے تھے۔ اچھا ہوا آپ نے دلی میں تعزیتی جلسہ منعقد کروا دیا۔

۸ر ستمبر کو شام کشن نگم کے گھر ایک دعوت تھی۔ اردو کے سبھی لوگ جمع تھے۔ مشاعرہ بھی ہوا۔ معلوم نہیں حسن کمال کیوں نہیں آئے۔ صابر صاحب سے بات چیت ہوتی رہتی ہے کل بھی ہوئی تھی۔ لیکن فکر کے کسی خط کا ذکر نہیں آیا۔ ظ انصاری پرسوں کی دعوت میں ملے تھے وہ دلی آتے اور جاتے رہتے ہیں کہہ رہے تھے کہ اخبار کا معاملہ جہاں تھا وہیں رکا ہوا ہے۔

میں آج کل افسردہ ہوں عائشہ کا فون آیا تھا وہ ۲۸ر تک وہاں رکنا چاہتی ہیں۔ لیکن میں نے کہہ دیا نہیں۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

آپ کے یہاں آنے تک شاید میری کتاب "ارمغانِ سنسکرت" چھپ کر آجائے گی۔ بھرتری ہری کی ۳۰۰ نظموں کا منظوم ترجمہ ہے۔

آپ نے ہندوستانی مزاح 'نمبر پر تبصرہ لکھا یا نہیں ایک لحاظ سے اچھا ہی ہوا کہ آپ گھر میں مقید ہوگئے اب آپ کو گھر میں رہنے کی مشق کرنا پڑے گی۔ شروع شروع میں تھوڑی تکلیف ضرور ہوگی لیکن رفتہ رفتہ آپ عادی ہو جائیں گے بہرحال اپنی بیگم کا خیال رکھئے۔ انہیں واقعی بیٹے کی عدم موجودگی کھلتی ہوگی۔ ان سے کہئے بچوں کا مستقبل زیادہ اہم ہے۔ (میم لفظ مقدم ہے)

آپکا یوسف ناظم

عمیق حنفی

لکھنؤ

۱۹ر نومبر ۱۹۸۱ء

بھائی مجتبیٰ حسین صاحب! وعلیکم السلام

۲ ار نومبر کا نوشتہ نظر نواز ہوا۔ میں نے دوبارہ اجیکاپور سے آمنہ ابوالحسن صاحبہ کے پتے پر خط لکھے مگر جواب سے محروم رہا۔ پھر کسی دوست نے دہلی سے اطلاع دی کہ جناب جاپان تشریف لے گئے ہیں۔ پھر جناب گنگر یون کے ساتھ آپکی تصویر دیکھ کر بری طرح جلا مگر کوئلہ بنا نہ راکھ ابتک سلگ رہا ہوں۔

نہیں بھائی ــ دہلی آنے کی صورت نہیں نکل رہی ہے شاید اگلے ماہ کوئی بات بنے۔ میرا خاکہ واقعی آپ نے خوب اڑایا تھا۔ لوگ ابتک طے نہیں کرسکے کہ خاکہ نگار کا کمال ہے یا صاحب خاکہ کا۔ آپ کی کتاب آدمی نامہ کا ذکر خیر بھی وحید اختر نے اپنے خط میں کیا تھا۔ اور پھر شہریار نے یہاں سنایا۔ وہ بھی میرے خط کے پر تبصرہ کر رہے تھے۔ دیکھئے بھائی اب کسی اور کا خاکہ اتنا زوردار نہ لکھنا۔ کتاب ڈاک سے ہی بھیجدیں۔ ڈاک کا خرچ میں اٹھالوں گا۔

میں نے احباب میں آپ کا ذکر کیا ہے اردو کے بہترین طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے کیا ہے میرا خاکہ لکھنے کے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔

یونسکو کی سروس ضرور قبول کرلیں اور ایک میرے لیے بھی ڈھونڈھ لیں خوش رہنے کا ڈھنگ ابھی کہاں آیا۔ مجھ جیسی ہستی کی محبت کا لطف تو اٹھالیا مگر مجھ جیسی ہستی کو اپنی صحبت کا لطف کہاں اٹھانے دیا۔ تشنگی باقی ہے۔

حامد حسین صاحب سے اب تک تو ملاقات ہوئی نہیں۔ لکھنؤ آجائیں تو مزا آجائے۔ دو ایک مہینوں میں کیوں دو ایک ہفتوں میں آنے کا پلان بنائیں بھائی ــ اپنے خط کے ترنم سے پڑھنا سیکھ لیجئے۔ ترنم کی فیس بہر حال زیادہ اور بہتر ہے۔

جناب کے پاس جاپان تو بندے کے پاس سرگجا۔ جناب نے سفر نامہ لکھ ڈالا ہے اور بندہ لکھنے کا ارادہ رکھتا ہے ویسے ایک نظم تو اس فردوس زاد پر "شعور" میں نظر سے گذری ہوگی۔

ایک بات تو بتلایئے کیا یہ کاتب سالے مجھ سے زیادہ پڑھے لکھے ہوتے ہیں کہ آپ کی تحریر نہ صرف پڑھ لیتے ہیں بلکہ کتابت بھی کر ڈالتے ہیں۔

آپ کی بھابی جواباً سلام داغتی ہیں۔ بچوں کو دعائیں کہ اب تو پیار کی منزل سے بہت آگے نکل گئے ہیں۔

فقط عمیق حنفی

حمایت علی شاعر

بمبئی

۱۰ ر اپریل ۱۹۸۶ء

برادر عزیز مجتبیٰ حسین صاحب ـ سلام خلوص!

آج ہی صبح آپ سے فون پر بات ہوئی، مگر جی چاہا کہ آپ کو خط بھی لکھ دوں۔ شاید علی خاں کو میں نے اورنگ آباد سے پیش لفظ اور ایک کتاب "ہارون کی آواز" بذریعہ رجسٹر پوسٹ روانہ کی تھی امید کہ دونوں چیزیں مل گئی ہوں گی ــ اورنگ آباد میں مغنی تبسم اور انور معظم سے اس سلسلے میں بات ہوئی تھی اور آپ نے بھی تو مغنی سے کہا تھا (گیسٹ ہاؤس میں) آپ کی طرف سے اطلاع ملتے ہی انشاءاللہ کتاب کی رونمائی کی تیاریاں ہو جائیں گی۔ حمایت اللہ اور دیگر احباب

بھی اس تقریب کے آرزو مند ہیں۔ اچھا ہوتا کہ اقبال سیمنار کے دوران یہ یادگار تقریب بھی ہو جائے گی۔ یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب کتاب تیار ہو جائے۔ اس لیے شاہد علی خاں پر منحصر ہے۔ خدا کرے وہ اس دوران کتاب چھپوا دیں چنانچہ اس کام کا سہرا بھی آپ ہی کے سر بندھتا ہے۔ شاہد علی کو علٰحدہ بھی خط لکھ رہا ہوں۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں اس کتاب کے حقوق کے سلسلے میں انہیں خط لکھ دوں۔ میرا خیال تھا کہ دیباچے کے ساتھ میں نے وہ خط بھی بھیج دیا ہے۔ مگر اب دیکھا تو وہ خط میرے ہی بریف کیس میں رہ گیا تھا۔ بہرحال اب بھیج دے رہا ہوں۔ اس کتاب یعنی "حرف حرف روشنی" کی اشاعت پر مجھے کوئی اعتراض نہیں بلکہ خوشی ہے اور اس کے حقوق میرے چھوٹے بھائی میر عنایت علی کے نام محفوظ ہیں مگر اس سلسلے میں کوئی کاروباری معاملت ہو تو اس سے کی جائے پتہ میں شاہد علی خاں صاحب کو دے آیا تھا۔ آپ کو مزید لکھ رہا ہوں۔ اس سلسلے میں عنایت کے خط کی ضرورت ہو تو وہ بھی بھیج دوں گا۔

آپ کا اپنا

حمایت علی شاعر

---

(۲) کراچی

۱۴ر جولائی ۱۹۸۶ء

برادر مجتبیٰ حسین صاحب ! سلام خلوص

میں ۲۹ر اپریل کو کراچی پہنچ گیا تھا اس کے بعد یونیورسٹی کے کاموں میں اتنا مصروف رہا کہ دم مارنے کی فرصت نہیں ملی۔ پچھلے ماہ گرمی بھی شدید تھی۔ ایک تو رمضان اور دوسرے موسم کا ستم۔ کئی بار ارادہ کیا کہ بیٹھ کر خطوط لکھوں ۔ مگر ۔ رہ گیا۔

اب تو یونیورسٹی میں چھٹیاں ہو گئی ہیں۔ مسلسل دو ماہ تک کراچی میں رہوں گا اور سارے کام نپٹاؤں گا۔

پچھلے سال جب میں ہندوستان آیا تھا تو آپ سے تعلق صرف ایک خط تک تھا میں سوچتا تھا کہ یہ شخص کیسا ہوگا۔ کیا اس میں بھی ابراہیم جلیس کی سی خوبیاں ہوں گی۔

اس وقت میں نے آپ کے صرف چند مضامین پڑھے تھے لیکن مضامین اکثر دھوکہ بھی دیتے ہیں تحریروں میں جو آدمی بہت شگفتہ نظر آتا ہے زندگی میں اکثر اس کے برعکس ملتا ہے۔ مجھے یہ تجربہ ہو چکا ہے۔ مثلاً شفیق الرحمان، مشتاق احمد یوسفی وغیرہ یہ لوگ زندگی میں نہایت سنجیدہ، خاموش طبع اور RESERVE قسم کے واقع ہوئے ہیں بہت کم کھلتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ اچھے لوگ نہیں، ان کی اور خوبیاں اپنی جگہ مگر تحریروں میں جو تصور بندھتا ہے ۔ وہ کچھ اور ہوتا ہے۔

آپ کو اس اعتبار سے میں نے بالکل ابراہیم جلیس کا آئینہ پایا۔ بے تکلف، ملنسار، دوست دار، ہنس مکھ۔ یہی خوبی ابن انشا میں بھی تھی۔ اور اب سید ضمیر جعفری میں ہے یہ خوبی شخصیت کو سماجی طور پر بھی پُرکشش بنا دیتی ہے۔

آپ کی مقبولیت کا راز بھی اسی میں پوشیدہ ہے پچھلے سال جب میں ہندوستان گیا تھا آپ سے ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ البتہ حیدرآباد دکن کے دوران قیام آپ کی ایک کتاب مل گئی تھی "بہرحال" ۔۔۔۔ میں اسے خرید لایا تھا۔ اس کتاب میں کچھ خاکے ہیں میں نے سب سے پہلے عزیز قیسی کا خاکہ پڑھا تھا اور میں آپ کو کچھ اور بھی قریب

محسوس کرنے لگا تھا۔ ابراہیم جلیس کی وساطت سے آپ سے جو جذباتی تعلق تھا۔ وہ اپنی جگہ مگر اس خاکہ نے گویا ایک قدرِ مشترک پیدا کردی تھی۔

اور اس بار جب دہلی میں آپ سے ملا۔ کچھ دن ساتھ رہا اور پھر اورنگ آباد اور حیدرآباد دکن کی مزید قربتیں ـــــ تو یوں محسوس کرتا ہوں ؎

" یہ وقت اور فاصلہ دھوکا نظــر کا تھا "

آپ میرے اتنے قریب آچکے ہیں کہ دوری کا احساس بھی نہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ تحریروں میں بھی جیسا سوچا تھا زندگی میں بھی ویسا ہی پایا۔ دہلی میں آپ نے جو دو کتابیں دی تھیں تصہ مختصر اور قطع کلام دونوں کتابیں میں نے دہلی اور اورنگ آباد کے سفر کے دوران پڑھ لیں تھیں۔ خیال تھا کہ حیدرآباد جاکر دوسری کتابیں بھی مل جائیں گی وہاں آپ ایسے معروف رہے کہ آپ کو بھی خیال نہ رہا۔ حالانکہ ہم نے دہلی میں پروگرام بنایا تھا کہ حسامی بک ڈپو سے کتابیں حاصل کرلیں گے۔۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ پر اپنا ایک مطالعہ لکھوں اور ایک خواہش یہ بھی پیدا ہوتی ہے کہ آپ کے مضامین کا ایک انتخاب پاکستان میں بھی چھپنا چاہیئے۔ ممکن ہو تو خود شائع کردیں یا پھر میں اپنی پسند سے کرلوں۔ مگر اس کے لئے سب کتابوں کا میرے پاس ہونا ضروری ہے۔ کیا میں امید کرلوں کہ بقیہ کتابیں آپ مجھے بھیج دیں گے۔ دہلی کے دوستوں کو میرا اسلام پہنچا دیں خصوصاً گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، رفعت سروش، زبیر رضوی اور کمار پاشی وغیرہ کو ـــــ ممکن ہے اگلے سال مارچ میں پھر ملاقات ہوجائے۔ بھابی کو سلام کہیئے اور بچوں کو دعائیں ـــ!

ویسے آپ لکھتے خوب ہیں۔ نہایت شگفتہ۔ نہایت لطیف۔ مجھے آپ کا انداز پسند ہے۔ آپ نے جتنی جلد ادبی دنیا میں نام پیدا کیا اور مقبولیت کی حدود میں داخل ہوگئے قابلِ رشک ہے۔ میری محبتیں اور دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اچھا اب اجازت چاہوں گا وقت ملے تو خط کا جواب ضرور دیں۔

ـــــــــ آپ کا حمایت علی شاعر ـــــــــ

کیلاش ماہر

گنگٹوک

۱۳ ستمبر

ڈیر مجتبیٰ حسین

کرنل بھاسکر کے ذریعے تمہارا محبت نامہ مجھ تک پہنچا۔ بہت دنوں تک تو وہ بھی اس خط کو سینے سے لگائے رہے۔ اچانک ایک دو ماہ بعد جب خیال آیا تو کے۔ سی۔ ماتھر کی تلاش شروع کی۔ اچانک فوجی کلب میں انھوں نے مجھے پہچان لیا۔ میں نے انہیں گھر آنے کی دعوت دی۔ اور تمہارے دستی رقعے سے ملاقات ہوگئی پتہ پھر کہیں کھو گیا آج ہی ملا ہے اور تم سے مخاطب ہوں۔

دلّی واقعی بہت دور ہوگئی ہے۔ ماہر صاحب جو کبھی دوستوں کی محفل کی رونق تھے۔ کب کے جہانِ شعر

سے کوچ کر گئے۔ اب تو اس پہاڑی دیش میں دفتر یا دوکان اور گھر کے علاوہ کوئی دیگر ٹھکانہ ہی نہ رہا۔ اپنی ہی بات دُہرانے کو جی چاہتا ہے۔

ع کرسیوں کی چاہ لے ڈوبی متاعِ فکر و فن ؎ پیٹ کی دوزخ کے آگے راستہ کوئی نہ تھا

فرصت ہو تو کبھی خط لکھ دیا کیجیے میں تو زبان بھول چکا ہوں خط لکھتے ہوئے بھی یہ گمان گزرتا ہے کہ املا بھی صحیح ہے کہ نہیں باتی اور راز خط لکھنے سے بالکل معذور ہیں۔ دلّی جب بھی آنا ہوتا ہے۔ محض دو چار دن بمشکل سے قیام رہتا ہے اس مدت میں گھریلو کام ہی اتنے نکل آتے ہیں کہ کسی سے خواہش کے باوجود ملاقات نہیں ہوتی بچے دلّی ہی میں رہتے ہیں۔

کبھی ہلنے سے ادھر آجاؤ اچھا وقت گزرے گا اور دلّی کی ہنگامی زندگی سے بھی نجات مل جائے گی۔ اور مزید بہانہ مسٹر و مسز بھاسکر بھی ہیں۔

دوستوں کو آداب کہنا

تمہارا کیلاش ماھر

رشید قریشی

حیدرآباد

۲۷؍اپریل ۱۹۸۴ء

مائی ڈیر مجتبیٰ

امید ہے خیریت سے دلّی پہنچ گئے ہوں گے۔ یہاں بھی تمہارے جانے کے بعد سے خیریت کے حالات آہستہ آہستہ واپس ہو رہے ہیں تم نے جو اپنا مضمون ادبی اجلاس میں سنایا تھا اس کے چرچے ابھی تک ہو رہے ہیں۔ اور جس محفل میں جاتا ہوں اس پر تعریفی تبصرے سننے کو ملتے ہیں تم اب اپنے فن کی انتہائی بلندیوں پر ہو۔ فیضانِ انشاء باران رحمت کی طرح تم پر اتر رہا ہے تم اللہ کا شکر ادا کرو۔

رشید قریشی

(۲)

مجتبیٰ!

خشونت سنگھ کے شکوہ اور جواب شکوہ پر تمہارا مضمون نظر سے گذرا! نظر سے کیا سچ پوچھو تو دل سے گذرا! اس مضمون کو تم نے بہت سنبھل سنبھل کے لکھا۔ اس لئے اس میں بہت گہرائی آگئی ہے۔ جو مجھ عمر رسیدہ کے لیے بہت پرلطف اور نکتہ نواز ثابت ہوئی۔ اس کتاب کا جو نسخہ تمہیں "تحفتہً" ملا ہے۔ اسے اپنے ساتھ لیتے آؤ۔ جب بھی حیدرآباد آؤ۔ ہم بھی پڑھ لیں گے۔

ہاں تم نے کھنہ صاحب کو خط لکھا! وہ اب صحت یاب ہو رہے ہیں۔ اور خطوں کے جواب دے رہے ہیں۔ احتیاطاً میں ان کا پتہ لکھ رہا ہوں۔ بچوں کو دعا۔ مسز مجتبیٰ کو سلام

رشید قریشی

شہریار

علی گڑھ

۵ر مارچ ۱۹۸۰ء

برادرم، آداب و نیاز

آپ کے دو خطوں کا قرض مجھ پر ہے۔ شرمندگی کے اظہار سے اصل نہیں تو سود تو ادا ہو ہی سکتا ہے۔ میں ۸ر کی صبح ڈی لکس سے آؤں گا۔ اگر آپ اسٹیشن پر مل جائیں تو دن مزے سے گزرے کہ اس روز آپ کی چھٹی بھی ہے۔ اب ساری باتیں زبانی ہوں گی۔

'خیر و خبر' کے لئے کچھ مواد تیار رکھئے گا۔

بھابی کو سلام کہئے۔

نیازمند

شہریار

(۲)

۱۸ر فروری ۱۹۸۱ء

مجتبیٰ صاحب

اس بار کی ملاقات کو ملاقات میں شمار نہ کیجئے، مشاعرے سے آپ اچانک چلے گئے۔ مشاعرہ نہایت بور تھا۔ ۴ بجے واپس پہنچا اور تہیہ کیا کہ آئندہ کسی پرائیویٹ مشاعرہ میں شریک نہیں ہوں گا۔ دوسرے دن صبح اٹھا تو جسم میں بری طرح درد تھا۔ کھانسی تھی اور بخار بھی تھا۔ فاروقی کے یہاں سے صدیق کے یہاں چلا گیا۔ دن بھر پڑا رہا۔ دوسرے دن صبح آسام میل سے واپس چلا آیا۔ ٹرین میں پیٹ میں شدید درد شروع ہو گیا پھر ہاتھ اور پیٹھ میں بھی درد ہونے لگا۔ بڑی طرح پسینہ آیا۔ اسٹیشن سے سیدھا ڈاکٹر کے یہاں گیا۔ دو روز بڑی تکلیف میں گزرے۔ طبیعت اب بھی گڑبڑ ہے۔ یونیورسٹی کھل گئی ہے۔ بظاہر معاملات ٹھیک ہیں۔

جس دعوت کا تذکرہ آپ نے کیا ہے، اس میں میں شاید ہی شریک ہوتا۔ نانگیا صاحب سے میں نے کہا تھا کہ اس بار ان سے مل کر جاؤں گا۔ آپ میری مجبوری انہیں بتا دیجئے گا۔ یونیورسٹی ذرا اور معمول پر آجائے تو آپ کو علی گڑھ آنے کی دعوت دوں گا۔ اس بار دہلی آیا تو صرف آپ سے ملنے آؤں گا۔ بھابی کو آداب۔ بچوں کو دعائیں۔

نیازمند شہریار

(۳)

۱۰ر ستمبر ۱۹۸۵ء

مجتبیٰ صاحب

آپ کا خط ملا۔ کاش بمبئی جانے سے پہلے میرا یہ خط آپ کو مل جائے۔ افتخار عارف کو میں نے لکھا ہے۔ آپ بھی لکھ دیں۔ آپ ان دوست کو بھی لکھیں جن کا ذکر آپ نے خط میں کیا ہے۔ اکتوبر میں میرا بڑا ناٹ پروگرام

ہے۔ ۱۱ر سے ۱۷ر اکتوبر تک سری نگر، بھوپال اور برہان پور جانا ہے۔ ۱۴ر اکتوبر کو دہلی میں رہوں گا۔ آپ ۱۴ر میرے لئے مخصوص رکھیں۔

مصباح کے جانے سے یقیناً آپ لوگ تنہائی محسوس کر رہے ہوں گے۔ گھر واقعی سونا ہو گیا ہوگا۔ بھابی کو تسلّی دیتے رہئے بلکہ ان کا دل اِدھر اُدھر لگائیے۔ نجیبہ بھی بور ہو رہی ہوگی۔

ٹیلی فون کرنے کی ہر کوشش ناکام ہو رہی ہے۔ میں نے چاولہ صاحب کے بچے کی پُرزور سفارش کر دی تھی۔ امید ہے کہ اس کا داخلہ ہو جائے گا۔ بھابی کو سلام

آپ کا شہریار

(۴)

۷ر جنوری ۱۹۸۱ء

مجتبیٰ صاحب!

نیا سال مبارک ہو۔ پُرانے سال کی خطاؤں کو بھی معاف کر دیجئے۔ میں ۱۶ر دسمبر کو بھوپال سے لوٹا۔ بھوپال کا یہ سفر کئی اعتبار سے یادگار رہا۔ بلانوشی کے پچھلے سارے ریکارڈ توڑ دیئے۔ خود بھی ٹوٹتے ٹوٹتے بچا۔ بھوپال ہی میں طبیعت خراب ہو گئی۔ باقی ماندہ یہاں آکر ہوئی۔ آپ کو خط لکھنے کا ارادہ ملتوی کرتا رہا کہ دہلی آنے کا پروگرام بھی تھا اور ہوا وہی جو عام طور سے "لیٹ لطیفوں" کے ساتھ ہوتا ہے نہ خط ہی لکھ پایا اور نہ دہلی ہی آپایا۔ قصے میں تھوڑی سی شرمندگی اور خفت آگئی۔ اب اس کو کم کرنے کی ایک ہی صورت نظر آتی ہے کہ میں دہلی آؤں تو جلد ہی آؤں گا۔ آپ تو بالکل ٹھیک ہیں نا؟ بھابی کو آداب کہیئے بچوں کو دعائیں اور پیار۔ مجھے یقین ہے کہ شب کے پچھلے پہر آپ اسکوٹر سے نہیں لوٹتے ہوں گے۔ جاپان کا سفرنامہ کتنا چھپ چکا ہے۔ دہلی والے قومی آواز میں بھی کچھ لکھتے کہ ہم لوگ بھی آپ سے باخبر رہیں۔

نارنگ صاحب سے ملے ہوئے زمانہ ہو گیا۔ آجکل وہ کیا کر رہے ہیں۔ ان سے میرا سلام کہیئے۔ جاپان جانے کے پروگرام کا کیا ہوا؟ آپ جائیے اور جا کر مجھے بلائیے۔ تو پھر جاپان کو مل کر فتح کریں یا خود کو ہار آئیں۔

خط کے جواب کا انتظار ہے۔

آپ کا شہریار

(۵)

۲۱ر جولائی ۱۹۸۳ء

مجتبیٰ صاحب!

میں ۱۹ر کی رات کو واپس آگیا۔ گھر آکر معلوم ہوا کہ نجمہ کے پیر میں موچ آگئی ہے اور موصوفہ چلنے پھرنے سے معذور ہیں۔ اس لئے ورکشاپ میں نہیں آیا۔ نارنگ صاحب کو بھی بتا دیجئے۔

آپ علی گڈھ آنے کی دھمکی دیتے رہیں گے کہ کبھی آئیں گے بھی۔ حیدرآباد کا سفر دلچسپ رہا۔ آپ کے ساتھ بھی ایک بار حیدرآباد کا سفر ہونا چاہیئے۔ جگر صاحب اور عابد علی خاں بہت محبت سے ملے۔

بحمہ نے آپ کے خاکے پڑھے، آپ کی بہت قائل ہوگئی ہیں۔ بھابی کو سلام، بچوں کو پیار۔ گھر کا پتہ لکھئے تاکہ آئندہ خط اس پتے پر لکھوں۔

نیازمند

شہریار

پروفیسر اسادہ

ٹوکیو یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز، ٹوکیو

جنوری سنہ ۱۹۸۲ء

محترم مجتبیٰ حسین صاحب

نیا سال مبارک !!

آپ کی یاد تو آتی رہتی ہے۔ مگر آپ کی طرف سے کوئی خط ندارد۔ بڑی مدت کے بعد آپ کو لکھ رہا ہوں۔ اس لیے بھی کہ پچھلے اکتوبر میں میری تقرری شعبۂ اردو، ٹوکیو یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز میں ہوئی۔ اب سوزوکی صاحب کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔

باقی خیریت ہے۔

نیازمند

اسادہ

نریندر لوتھر

حیدرآباد

۱۶ اگست سنہ ۱۹۷۶ء

پیارے مجتبیٰ۔

تمہارا خط کل ملا۔ شکریہ۔ شاہ علی کا بِل چکوا دوں گا۔ نہ جانے کیوں ابھی تک اتنا پرانا بِل ادا نہیں کیا گیا۔ حیدر صدیقی ان معاملوں میں ذرا سست ہے اور مجھے ایسی باتوں سے بہت کوفت ہوتی ہے۔

یہ خط اس لئے لکھ رہا ہوں کہ میں ۱۸ اگست کی صبح دہلی پہنچوں گا۔ ۱۹ کو ایک میٹنگ ہے اور ۲۰ تاریخ کو واپس لوٹوں گا۔ ۱۹ کو تو میں غالباً فرید آباد چلا جاؤں گا۔ ۱۸ کو سویرے یا پھر ۱۹ کو ملاقات ہو سکتی ہے۔ سب کو خبر کر دینا۔

یہاں ۱۲ تاریخ کو خواجہ عبدالغفور کی کتاب "گل و گلزار" کی رسمِ اجراء ہوئی تھی۔ اس کے لئے جلدی میں ایک مضمون لکھا تھا۔ اچھا رہا۔ رشید قریشی، کمنہ صاحب اور ہاشم علی اختر صاحب نے بھی مضامین پڑھے۔ فنکشن کامیاب رہا۔

مجھے "۲۰ ویں صدی" اور "سودن" کے دو شمارے نہیں ملے جن میں بالترتیب زندہ دلان کی روداد اور میرا مضمون "خاکہ" چھپا تھا۔ یا ابھی چھپا نہیں؟

راہل اب یہیں منتقل ہو گیا ہے۔ اس کا انگریزی ڈرامہ ۷ر تاریخ کو یہاں ہوا تھا۔ بہت کامیاب رہا۔ اس میں میرا بھی ایک چھوٹا سا رول تھا۔

بلراج ورما کو کیا نیا گھر مل گیا ہے؟ ان کے ڈرامے کے بارے میں اظہر افسر کا کہنا ہے کہ دہلی سے اجازت لینی پڑیگی۔ اس کا کیا قاعدہ ہے! میں نے اظہر افسر سے کہا ہے کہ اجازت لے لیں۔ اس طرف سے بھی ذرا تحریک ہو جائے تو آسان ہو جائے گا۔

ہم سب کی طرف سے یادیں

فقط نریندر لوتھر

---

(۲)

۲۹ر ستمبر ۱۹۷۳ء

پیارے مجتبیٰ

صرف مبارکباد کہنے کے لیے خط لکھ رہا ہوں۔ "لو آگئی برسات" بے حد پسند آیا۔ بہت ہی لطیف پیرائے کا مضمون تھا۔ میں نے پڑھا۔ سب کو پڑھ کر سنایا۔ یہ نریندر لوتھر کا انداز کہاں سے لیا؟

ویسے تو میں چاہتا تھا کہ فوراً خط لکھوں لیکن یہاں مصروفیات کا یہ عالم ہے کہ دو سطور بھی نہ لکھ پایا۔ ویسے جس کسی کو ملتا ہوں۔ پوچھتا ہوں بھئی وہ مضمون پڑھا؟ حتیٰ کہ عابد صاحب سے بھی پوچھ بیٹھا! اور جگر صاحب کو مبارکباد دی۔ لیکن اس مضمون کی وجہ سے ہم لوگ بہت SUFFER کر رہے ہیں۔ اس مضمون کو پڑھ کر برسات جیسے بند ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ میرا مشورہ ہے کہ اس ملہار مضمون کے بعد ایک دیپک مضمون لکھو تاکہ حیدرآباد اور یہاں کا اسپیشل آفیسر بربادی سے بچ سکے۔

سنا ہے اب تمہیں پہیے لگ گئے ہیں۔ نقل و حرکت کو کم کرنے کے لئے اب OPEC نے پٹرول کی قیمت میں ۱۰٪ اضافہ کر دیا ہے۔ کچھ اثر ہوگا یا نہیں۔

فکر صاحب کا کیا حال ہے؟ میری طرف سے ان کو بلراج کو اور آمنہ اور اکبر کو یاد اور سلام

فقط

نریندر لوتھر

---

(۳)

۲۵ر اپریل ۱۹۸۴ء

عزیزی مجتبیٰ۔

اس لڑکی کی مدد کرو۔ ثواب میں اضافہ ہوگا۔ اگر ثواب حد سے زیادہ تجاوز کر چکا ہے تو کچھ میرے کھاتے میں ڈال دینا۔ میں ۲۹ر کو دہلی آرہا ہوں۔ ۳۰ر کی صبح کو کمشنڈ و چلا جاؤں گا۔ شاید ملاقات ہو۔

سنا ہے دلیپ سنگھ دل کا روگ لے کے لیٹ گیا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟ ایک ریسرچ کرنی چاہیئے کہ دل کے روگ کا طنز و مزاح کے ساتھ کوئی تعلق ہے؟

باقی پھر۔

آپ کا

نریندر لوتھر

مشفق خواجہ

کراچی

۹ر جنوری ۱۹۸۶ء

مخدومی و مکرمی۔ سلام مسنون

میں ۱۹ر دسمبر کو کراچی پہنچ گیا تھا، لیکن آتے ہی بیمار پڑ گیا۔ سفر چونکہ بیوی کے ساتھ تھا، اس لیے بیماری میں بھی اس نے ساتھ دیا۔ میں تو آٹھ دس روز میں ٹھیک ٹھاک ہو گیا، لیکن بیوی ابھی تک بخار میں مبتلا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ بیوی صحت مند ہو یا بیمار دونوں صورتوں میں خاصی مہنگی پڑتی ہے۔

یہی سبب تھا کہ آپ کو تاخیر سے خط لکھ رہا ہوں اور خلیق انجم صاحب کے ذریعہ بھیج رہا ہوں۔ انجم صاحب دلّی میں رہیں یا کراچی آئیں، دونوں صورتوں میں میرے لیے مفید ہوتے ہیں۔ دلّی میں میزبان ہوتے ہیں اور کراچی میں مہربان یعنی بہت سے شمارے ان کے ساتھ بھیج رہا ہوں خدا کرے یہ سب چیزیں مستقلاً تک پہنچ جائیں۔

دلّی میں آپ نے جس طرح مہمان نوازی فرمائی، اس کا شکریہ قلم کی زبان سے نہیں دل کی زبان سے ادا کرتا ہوں۔ آپ پہلے مرد ہیں جن سے میرا دل متاثر ہوا ہے یہ حرکت میرے دل کی وضعداری کے بالکل خلاف ہے۔

"تخلیقی ادب" کے چھٹے شمارے میں ایک گوشہ آپ کے بارے میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے آپ اپنے چھ سات نمائندہ مضامین کا انتخاب کر دیجئے۔ ایک نیا مضمون لکھ دیجئے۔ "میں کیوں لکھتا ہوں" — خواہ یہ مضمون آپ کی اپنی کتابوں کے دیباچوں سے ماخوذ کیوں نہ ہو۔ دو مضمون اور شامل کروں گا۔ ایک آپ کی شخصیت کے بارے میں اور ایک فن کے بارے میں۔ اگر اس نوعیت کے مضامین چھپ چکے ہوں تو وہی بھجوا دیجئے۔

میری بیگم — آمنہ بھی آپ کا اور بھابھی جان کا شکریہ ادا کرتی ہیں کہ آپ دونوں نے بڑے خلوص سے مسافر نوازی فرمائی۔

آپ کی ایک تصویر بھی بھیج رہا ہوں۔ خدا کرے آپ کو پسند آئے۔ جواب سے ضرور نوازیں۔

آپ کا خیر اندیش

مشفق خواجہ

وجاہت علی سندیلوی

لکھنؤ

۲ر دسمبر ۱۹۸۶ء

بہت پیارے مجتبیٰ! خلوص و نیاز اور بہت سی دعائیں۔

نہیں چاہتا تھا کہ تمہیں خط لکھوں کیونکہ مجھے آپ کی مصروفیتوں کا (جن میں اب سیاحتوں کا بھی اضافہ ہو گیا ہے) بخوبی اندازہ ہے کئی دفعہ دل چاہا کہ لکھوں لیکن اسی خیال سے ضبط کیا۔ مگر آج "شاعر" بمبئی میں تمہارا مضمون ساحل

سے کہو میں نہیں آؤں گا" پڑھ کر بے چین ہوگیا اور ایک طرح کی اضطراری کیفیت میں یہ خط لکھنے پر مجبور ہوگیا ہوں اپنی مصروفیتوں میں دخل درمعقولات دینے کے لئے تم خود ہی دعوت دے رہے ہو۔ تو میں کیا کروں

ع گردشِ مجنوں بچشمک ہائے لیلا آشنا

تمہارا انشائیہ صرف اچھا یا بہت اچھا نہیں خود بیسویں صدی کے لئے ایک مایۂ ناز سرمایہ ہے۔ یقین جاننا دو مرتبہ پڑھ چکا ہوں اور پھر بھی دل نہیں بھرتا۔ رسالہ سرہانے رکھ لیا ہے۔ گاہے بگاہے اس کو پڑھتا اور تمہیں دعائیں دیتا رہوں گا تم اکیسویں صدی میں ضرور اسی تابناکی سے داخل ہوگے۔ بعض جملے تو بجلی کے کرنٹ کی طرح رگ وپے میں دوڑ گئے اور اس جملے پر...... "چھلنی میں صرف اردو اکیڈیمیاں باقی رہ جائیں گی" بیساختہ رقص کرنے کو جی چاہا۔ اردو اکیڈیمیوں کی کارگذاری پر اس سے چبھتا ہوا بلیغ اور حقیقت پر مبنی طنز ہو ہی نہیں سکتا۔ تمہارے ہاتھ چوم لینے کو جی چاہتا ہے۔ تمہاری تخلیقات جہاں بھی ملتی ہیں۔ بڑے ذوق وشوق سے پڑھتا ہوں اور کچھ ایسا خوش ہوتا ہوں کہ جیسے یہ خود میں نے ہی لکھا ہے۔ نہیں معلوم تم پر اپنا یہ حقِ ملکیت کس لیے سمجھتا ہوں۔ اس خط میں "تم" کا صیغہ کسی اظہارِ بزرگی یا لڑکپن کے لیے نہیں بلکہ محض وفورِ محبت کی وجہ سے ہے۔

بمبئی میں تم سے صرف سرسری ملاقات ہو پائی تھی۔ وہاں میں خود اپنے مذاق کا شکار ہوگیا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ کوئی مباحثہ ہوگا کیوں کہ دعوت نامہ بذریعہ تار ملا تھا۔ تفصیل درج نہ تھی۔

دہلی کا بھی ایک دعوت نامہ مجھے دیر سے ملا۔ ورنہ ضرور آتا ملاقات ہوجاتی۔ ملنے کا بہت جی چاہتا ہے۔

بہرکیف دہلی آؤں گا ضرور اسے ایک طرح کی دھمکی ہی سمجھو۔ ماسکو کیا روس تو گھوم آئے ہو نئے سفرنامے کا بے چینی سے انتظار ہے۔

مخلص

وجاہت علی

بھارت چند کھنہ

حیدرآباد

۷ راگست ۱۹۷۶ء

جناب مجتبیٰ صاحب! تسلیمات

خط آپ کا ملا۔ آپ کا خط بھی شکستہ خط کی تعریف میں آتا ہے مگر فرق یہ ہے کہ عام شکستہ خط کے حروف سیدھے ہاتھ کی جانب جھکے ہوئے ہوتے ہیں اور آپ کی تحریر کے حروف کا جھکاؤ بائیں جانب ہے۔ آپ کے تعلق سے غالباً یہ ایک نیا نکتہ ہے۔ جس کی دریافت کا سہرا میرے سر ہونا چاہئیے۔ بہرحال اسکو پڑھنے کی مشق کر کر کے میں اب مطلب سمجھنے کے قابل ہوتا جارہا ہوں۔

میرے "پونم" میں چھپے مضمون کو پسند کرنے کے لئے مشکور ہوں۔ مضمون پر میرا نام نہ ہونے کو میں ایک نیک فال سمجھتا ہوں کیونکہ اگر کاتب صاحب یہاں کسی اور کا نام یا خود اپنا نام چھپا کر دیتے تو میں ان کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔

"کرکٹ" پر نظم میرے نام سے چھپی ہے ۔ وہ ہے بھی میری، مگر اس کی نوک پلک ایک مستند شاعر نے درست کی ہے ۔

بیدی صاحب کسی فلم کے معاملے میں یہاں آئے تھے اور انہیں بلڈ پریشر کی تکلیف نے دبوچ لیا ۔ اب روبہ صحت ہیں ۔ بمبئی میں کرشن چندر رجا کے قلب پر پھر حملہ ہوا ہے ۔ عابد علی خان صاحب جو حال ہی بمبئی گئے تھے ان کو اسپتال میں مل کر آئے ہیں ۔ ابھی ان کی حالت خطرے سے خالی نہیں ۔ خالق ان دونوں کو صحت دے ۔

خاکسار

بھارت چند کھنہ

غلام احمد فرقت کاکوروی

دلّی

۲ رمئی سنہ ۱۹۶۶ء

محبی ۔ تسلیم

آپ کے ۲۰ راپریل کے خط سے پہلے میں آپ کو لکھ چکا تھا کہ میں ان تاریخوں میں حاضر نہ ہوسکوں گا مگر اس کے بعد جب آپ کا بحر طویل میں لکھا ہوا خط پھر ملا تو میں نے اسے اپنے یہاں کے پرنسپل بیگ صاحب کے سامنے رکھ دیا ۔ اور ان سے کہا کہ اگر کوئی گنجائش نکل سکتی ہو تو بتلئیے ۔ چنانچہ پرسوں انہوں نے مجھے اجازت دیدی اس لیے اب میں دلّی سے ۱۲ ر کو روانہ ہوکر ۱۴ ر کو حیدرآباد پہنچ سکوں گا ۔ میں چاہوں گا کہ اس خط کے ملتے ہی آپ کانفرنس کا تفصیلی پروگرام مجھے بھیجدیں ۔ نکر تونسوی سے بھی میں ٹیلی فون پر بات کرلوں گا ۔ اگر ممکن ہوا تو میں اور وہ دونوں ایک ساتھ روانہ ہونے کی کوشش کریں گے ۔

رہا تصویر اور سوانح حیات کا تعلق تو سوانح حیات کی تو کانفرنس متحمل نہ ہوسکے گی ۔ البتہ اپنی تصویر کل تک بھیجدونگا ۔

مخلص

غلام احمد فرقت کاکوروی

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

جموں وکشمیر

۲۵ رجون سنہ ۱۹۷۷ء

گذر گئے وہ نگاہ کرم بچائے ہوئے
ہم انتظار میں بیٹھے تھے کوئی پہچانے

برادر عزیز، آپ غالباً گلمرگ سے پرسوں رات چلے گئے یہاں محفل انتظار سجی کی سجی رہ گئی ۔
میں ۲۷ ر کو دہلی پہنچ رہا ہوں قیام کشمیر ہاؤس میں ہوگا ۔ (چانکیہ پوری میں) آپ سے ملنے آؤں گا ۔

دونوں مسودے میرے پاس ہوں گے۔ اس وقت خط آپ کو لکھ کے دے دیا جائے گا۔

ارجن دیو کو آداب

نیاز مند

جگن ناتھ آزاد

---

(۲)

۸ر نومبر ۱۹۷۷ء

برادرم عزیز، تسلیم

میں کل بخیر و عافیت دہلی واپس پہنچ گیا۔

آتے ہی آپ کا مقالہ "تناظر" کے متعلق پڑھا۔ لطف آ گیا۔ آپ کے انداز بیان کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ کتاب کی رسم اجراء کی تاریخ جب طے ہو جائے تو مجھے از راہ کرم فوراً اطلاع دیجئے گا۔ ایک تو ریزرویشن کیلئے آسانی رہے گی دوسرا یہاں ایک سلیکشن کے لیے تاریخ طے کرنا ہے۔ انہی دنوں میں۔ یہاں غالباً ۲۹ر نومبر طے ہو رہی ہے اس صورت میں ۲۸ر کتاب کی ریلیز کے لیے مناسب رہے گی۔

والسلام

نیاز مند

جگن ناتھ آزاد

---

(۳)

۳ر اگست ۱۹۸۵ء

کہو مجتبیٰ! پیارے، کس رنگ میں ہو؟ نہ کوئی نامہ نہ پیام بالکل بھلا ہی دیا۔ مجھ فقیر کو یاد رکھنا کوئی گراں سودا نہیں ہے۔

اب کے تم سے حیدرآباد میں بھی ملاقات نہیں ہوئی۔ مشاعرہ حسب معمول بہت زوردار تھا۔

آج حیدرآباد سے ایک تار ملا ہے ——— (WRITERS MEET POSTPONED) بھیجنے والے کا نام ہے۔ ملک۔ بس اتنا ہی لکھا ہے۔ لیکن مجھے تو کسی (WRITERS MEET) کا دعوت نامہ ہی نہیں ملا تھا۔ اگر ان ملک صاحب کا نام پتا معلوم ہو جائے۔ تو کم از کم انہیں تار کی رسید ہی دے دوں میرا یہ طریقہ ہے۔ بہر طور تمہارے خط کا انتظار رہے گا میں ۱۴ر، ۱۵ر کے قریب دہلی آ رہا ہوں۔ قیام آدرش کے یہاں ہو گا میں تمہیں قبل از وقت خط لکھوں گا۔ انشاءاللہ محفل جمے گی۔

والسلام

جگن ناتھ آزاد

پروفیسر سوزوکی تاکیشی

ٹوکیو یونیورسٹی ٹوکیو۔ جاپان

۲۰ر نومبر ۱۹۸۶ء

مکرمی جناب مجتبیٰ حسین صاحب

السلام علیکم! کافی عرصے بعد آپ کو خط لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ امید ہے مزاج گرامی بخیر

ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ اس خط کے پہنچنے کے فوراً بعد مزاج گرامی میں تبدیلی آگئی ہو۔ بہرحال معافی چاہتا ہوں۔ یہاں مشہور مثل ہے "روشنی کا سایہ تیرگی مانند ہے" آج کل میں اس مثل کی سچائی کو شدت سے محسوس کررہا ہوں۔ آپ کو تو خوب معلوم ہے کہ جاپان میں وقت بھارت سے جلدی گذر جاتا ہے۔

آپ کی عنایت کردہ کتاب "آدمی نامہ" نہایت پسند آئی۔ میں اسے اپنے کورس میں استعمال کرنے کی سوچ رہا ہوں۔ زندہ اردو کا بہترین نمونہ آپ نے پیش کیا ہے۔ شکریہ۔ اگلی کتاب کے لیے بھی پیشگی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

معروفیت میں زبردست اضافہ ہوگیا ہے۔ اس سال سے ایک نجی یونیورسٹی میں اردو کا لازمی کورس کھل گیا اور بندہ پڑھانے جایا کرتا ہے۔ بہت دور ہے پھر بھی اردو کی خدمت کا نیا موقع پاکر مجھے دلی مسرت ہوئی۔ باقی جاپانی۔ اردو لغت مرتب کرنے کا کام کچھوے کے رینگنے کی رفتار سے جاری ہے۔ ہماری یونیورسٹی میں ہفتہ جشن منایا جارہا ہے۔ تھوڑا وقت نکال کر ٹائپ رائٹر کے سامنے بیٹھا ہوں۔ سنائیے پھر تشریف لانے کا پروگرام نہیں ہے؟ میں خود تو ہر سال ایک خیالی منصوبہ بناتا ہوں جس کو عملی جامہ پہنانا دوسری بات ہے۔ استاد صاحب نے آپ کو سلام پہنچانے کا حکم ملا ہے۔ اچھا آج تو اجازت چاہتا ہوں۔ خدا حافظ

آپ کا **محوزو کی تاکیشی**

دلاور فگار

بدایوں، یوپی

۱۲ اپریل ۱۹۶۶ء

محترم مجتبیٰ حسین صاحب تسلیمات

بہت طویل اور مفصل نوازش نامہ ملا۔ میں سردست اس کا مکمل جواب دینے سے معذور ہوں۔ کل ہی ایک ضروری امر کے سبب سے بمبئی سے واپس آیا ہوں اور کل پھر بمبئی ہی کو واپسی ہے

ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں۔

میں آپ کی زندہ دلی کی قدر کرتا ہوں اور اس پرمسرت اور پربہار تقریب میں شرکت اور اس جلسہ کی صدارت منظور کرتا ہوں جس کا ذکر آپ نے اپنے مکتوب میں فرمایا ہے۔

فوٹو، مزاحیہ مضمون اور کلام واپسی پر بھیج سکوں گا۔ ۲۳ اپریل کو وطن واپس آسکوں گا اور ۲۵ اپریل تک آپ کے احکام کی تعمیل ہوسکے گی۔

غالباً میں ۱۸ اپریل کی شب میں حیدرآباد میں کسی سنجیدہ مشاعرہ میں شرکت کے لئے بمبئی سے گرفتار کرکے حیدرآباد لایا جارہا ہوں۔ مشاعرہ کہاں ہے؟ اور کون لوگ منتظم ہوں گے کچھ نہیں معلوم؟ سنا ہے بہت بڑے پیمانہ پر انتظامات ہوئے ہیں منصور فریدی صاحب بمبئی سے مجھے حراست میں لے کر حیدرآباد پہونچیں گے۔ اس سے زیادہ مجھے خود نہیں معلوم ہے۔ آپ یا آپ کا کوئی نمائندہ اس مشاعرہ میں مجھ سے مل سکتے ہیں؟

میں ۱۹ اپریل کو ہی حیدرآباد سے پھر بمبئی واپس روانہ ہوجاؤں گا۔ ۲۱ اپریل کو بمبئی میں حاضری ضروری ہے۔

اور ۲۳؍اپریل کو بمبئی سے بدایوں کے لئے روانہ ہوسکوں گا۔

باقی بروقت ملاقات والسلام خلوص کار

دلاور فگار

مسیح انجم

حیدرآباد

۱۶؍مئی ۱۹۸۴ء

عزیز ترین بھائی مجتبیٰ حسین

السلام علیکم۔ لندن اور امریکہ کے کامیاب دورے سے واپسی پر میری مبارکباد قبول فرمایئے۔ اب تو آپ اپنے سارے پنڈنگ کاموں کو نپٹانے میں مصروف ہوں گے۔ روزنامہ سیاست میں آپ کے تاثرات سفر پڑھنے کو ملے۔ حمایت بھائی کے ذریعہ بھی بہت ساری باتیں معلوم ہوئیں۔ بی بی سی لندن سے نشر کیا ہوا آپ کا انٹرویو بھی سنا۔ آپ کا جس شاندار طریقے سے خیر مقدم کیا گیا، بہت ہی کم ادیبوں کے نصیب میں ہوتا ہے۔ میں وہ ساری باتیں آپ کے منہ سے سننے کے لئے بے چین ہوں۔ صوفی صاحب نے تو بطور خاص اپنے ڈرائنگ روم کو سجایا ہے۔ وہ آپ کو ریڈ کارپیٹ ویلکم دینے کے لئے بے حد بے چین ہیں اس درمیان ان سے دوچار ملاقاتیں ہوئیں بس آپ ہی کا ذکر رہا۔ آپ کا خط بھی پڑھنے کو ملا۔

دلی اردو اکیڈیمی کی جانب سے ۳۰؍مارچ کو "جشن طنز و مزاح" کا جو اہتمام کیا گیا تھا۔ اس سے تو آپ بخوبی واقف ہوں گے۔ کیونکہ وہ پروگرام تو آپ ہی کا تجویز کردہ تھا۔ پروگرام میں جو کچھ ہوا اور جیسا کچھ بھی ہوا ساری تفصیلات تو آپ کے علم میں آئی ہوں گی۔ آپ کے جاسوس تو ہر جگہ اور ہر شہر میں موجود ہوتے ہیں بقول مصطفیٰ کمال میں خود بھی تو ایک جاسوس یا ایجنٹ ہوں جو آپ کو معلومات پہنچاتا رہتا ہوں۔ سخی حسن صاحب نے جلسے کی ساری روئیداد سنائی ہوگی۔ آپ کی کمی بری طرح کھٹکتی رہی اگر آپ ان دنوں دلی میں ہوتے تو پروگرام کو چار چاند لگ جاتے۔ دلی میں آپ کی یاد ہر طرح تڑپاتی رہی۔ غالب اکیڈیمی میں ایک گروپ فوٹو کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس میں آپ موجود تو ہیں لیکن بہت ہی بیک گراؤنڈ میں چلے گئے ہیں۔ گروپ فوٹو میں اپنے آپ کو نمایاں نہ کرنا اور پس منظر میں چلے جانا اور ظاہری نمود و نمائش کرنے والوں کو آگے رکھنا آپ کی فطرت میں ہے۔

عالمی جشن مزاح کی تیاریاں جاری ہیں۔ خطوط لکھے جارہے ہیں لیکن اس جشن میں آپ کو کلیدی رول ادا کرنا ہوگا۔ کیونکہ یہ ساری آگ آپ ہی کی لگائی ہوئی ہے۔ حمایت بھائی سے معلوم ہوا کہ انہوں نے آپ کو فون پر ساری تفصیلات بتائی ہیں۔ بہرحال اس جشن کے سلسلے میں آپ کو بہت کچھ کرنا ہوگا۔ ادبی اجلاس کو کنڈکٹ کرنے کی ذمہ داری آپ ہی کو سونپی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مضمون بھی پڑھنا ہوگا۔ جون میں آپ کے آنے کے بعد ساری تفصیلات طے کرلی جائیں گی۔ آپ کی آمد کا شدت سے انتظار رہے گا قطعی تاریخ سے مطلع کریں۔

مسیح انجم صاحب سے مختصر سی ملاقات رہی۔ بڑے اچھے اور خلیق انسان ہیں۔ ٹوٹ کر چاہنے والے۔ ان کو میرا سلام کہئے گا۔

آپ کا مسیح انجم

حکیم منظور

جموں توی (جموں کشمیر)

یکم اگست ۱۹۷۷ء

عالی مرتبت جناب مجتبیٰ حسین صاحب مدظلہٗ طولعمرہٗ وغیرہ

جناب عالی۔

خدمت عالی میں بندہ یہ گذارش کرنا چاہتا ہے کہ حضور پرنور فیض گنجور کا "نامۂ عالی" باصرہ نواز" ہوا۔ حضور نے جو کچھ ارشادات فرمائے ہیں ان سے اس بندۂ حقیر و پُرتقصیر کا اختلاف کرنا بے ادبی ہی نہیں، بے ذوقی اور بے مذاقی بھی ہوگی بلکہ "بے" کی جگہ یہ ساری خطائیں "بد" کے ساتھ ثابت ہوں گی۔

میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میرے پاس اتنے الفاظ نہیں جن سے میں آپ کی بزرگی اور اپنی کمتری کا اظہار کرسکوں۔ الفاظ کی یہ کمی اس وجہ سے ہے کہ میں ایک ایسی جگہ سے تعلق رکھتا ہوں جہاں اردو کسی کی مادری زبان نہیں اور جہاں تہذیبِ نو کے نقوش ابھی تک پہنچے نہیں اس وجہ سے ہم لوگ اکثر لوگوں کے ساتھ تہذیبی شرائط کے ساتھ ہم کلام نہیں ہو پاتے۔ ہم لوگ اتنے گنوار ہیں کہ جو بھی ہمیں ملتا ہے اسے ہم اپنے جسم و جان کا ایک حصہ سمجھتے ہیں اور اسے جب یاد کرتے ہیں۔ تو اسے مکرمی کہہ کر یاد نہیں کرتے۔ میں نے یہ سوچا تھا کہ آپ میرے اپنے ہیں۔ اور اسی سطح پر میں نے جموں میں آپ سے تمام گفتگو کی تھی۔ مگر آپ کے دہلی پہنچتے ہی میں آپ کے لئے "مکرمی" بن گیا اور آپ کے قلم سے "آپ، آپ" کی گردان شروع ہوئی۔

آپ نے وعدہ فرمایا تھا کہ جولائی میں بہرحال ایک دن کے لئے ہی سہی جموں تشریف لائیں گے۔ برادرم راز صاحب سے اگر آپ نے پروگرام بنایا تو انشاءاللہ سال ۲۰۷۷ء میں بھی کبھی پورا نہیں ہوگا۔ ایسٹ پٹیل نگر راز صاحب کے لئے فردوس بر روئے زمین سے کم نہیں اصولاً تو وہ بات میرے لئے ہے کیوں کہ وہاں "راز رہتے ہیں" اور ایسٹ پٹیل نگر میرے لیے واقعی فردوس بر روئے زمین" ہے مگر اس شخص نے اسے اپنے نام رجسٹرڈ کروالیا ہے۔

کہئیے بیوی بچوں کے ساتھ کیسی گذرتی ہے؟ میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کیونکہ میری بیوی بچوں کے بغیر نہایت خراب گذر رہی ہے میں آج کل ہر اس آدمی کو رشک سے دیکھتا ہوں جو اپنی بیوی اور اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے جی چاہتا ہے ایسے تمام لوگوں کو جبراً تین تین دن کے لیے قید کروالوں تاکہ ان کو میری مصیبت کا پتہ چلے بہرحال یہ نہ بھی ہوا تو بھی اللہ کچھ نہ کچھ رحم فرمائے گا ہی۔

اگر "ستم ہائے روزگار" نے فرصت دی تو اس فرصت کا بھرپور فائدہ اٹھا کر اس خط کا جواب دینا اور اس پر موٹے حروف میں لکھنا

چلا چل لفافے کبوتر کی چال —— جو ہوگی محبت ملے گا جواب

الداعی الی الخیر دارین

حکیم منظور

نقی تنویر

لندن

۱۱/ اپریل ۱۹۸۳ء

ڈیر مجتبیٰ !

لندن واپس آنے کے بعد سے مسلسل سوچ رہا تھا کہ خط لکھوں۔ مگر کچھ مسائل اور کچھ مصروفیات ایسی رہیں کہ کسی کو بھی خط لکھنے کا موقع نہ مل سکا۔ بات یہ ہے کہ اس وقت میں کچھ سنگین مسائل سے گذر رہا ہوں اور یہ مسائل میرے دہلی اور حیدرآباد کے سفر میں بھی بادل کی طرح چھائے رہے۔ یہاں آنے کے بعد ساقی سے ملاقات نہیں ہوئی افتخار دہلی آئے تھے ملاقات ہوئی ہوگی۔ لیکن ان سے تمہارے لندن کے ٹرپ کے تعلق سے بات کا موقع نہ مل سکا۔ اب اس خط کے لکھنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ دھرم پال جن کا خط اور فون میرے دہلی آنے کے درمیان آیا تھا۔ ۱۹/ اپریل کو دہلی پہنچ رہے ہیں۔ وہ تم سے ملاقات کریں گے۔ ویسے ان کا پتہ اے۔ کے۔ گجرال۔ ڈاکٹر شکلا۔ دی۔ ڈی۔ چھبڑہ۔ یونس دہلوی کئی لوگوں سے مل جائے گا۔ میں نے دھرم پال سے تمہارے سفر کے تعلق سے بات کر لی ہے اور وہ اس سلسلے میں تم کو تفصیلات سمجھا دیں گے۔ اور مجھے امید ہے کہ کام بن جائے گا کوشش اس بات کی ہے کہ کسی طرح ٹکٹ کا انتظام ہو جائے۔ جہاں تک یہاں پر رہنے اور ٹھہرنے کا سوال ہے' اس سلسلے میں کسی بات کی فکر نہیں ہے۔ یہاں رہنے کے دوران میں حیدرآباد ایسوسی ایشن (جن سے میں نے بات کی ہے) اردو مرکز اور ٹیلی ویژن وغیرہ سے جو پیسے ملیں گے اسے تم یورپ کے سفر پر استعمال کر سکتے ہو۔ میں یوسف اور وقار کو اس بات کے لئے تیار کرنے والا ہوں کہ دو تین ہفتوں تک کار سے یورپ کا سفر کیا جائے اور اس میں تمہارا ساتھ ہو جائے تو اور بھی مزہ آئے گا۔ مجھے امید ہے کہ میں نے جو پلان بنایا ہے۔ وہ کامیاب ہو جائے گا۔ لندن پریس سروس کے تعلق سے میں نے تمہیں مختصراً بتایا تھا۔ یہ سروس میں دھرم پال اور دوسرے کچھ ساتھی مل کر شروع کرنے کے لئے کوشاں ہیں خصوصاً اردو۔ ہندی اور بنگالی (بعد میں دوسری زبانوں) کے لئے مختلف موضوعات پر یہاں سے ہر پندرہ روز میں دو یا دو مضامین بھیجے جائیں اس طرح یہ ایک سنڈیکیٹڈ سروس ہوگی۔ چھ مہینوں تک ہم اسکو فری دیں گے۔ ان کے بعد جو اخبار و رسائل اس سے مطمئن ہوں۔ انہیں اسکیل آف چارج کے تحت پیسے دینے ہوں گے جو شروع میں ہندستان میں ہی جمع ہوں گے۔ اس سروس کا ایک مقصد جیسا میں نے بنایا تھا۔ یہ ہے کہ ہندستان کی قومی تجارتی بین الاقوامی ایجنسیوں سے خبریں لیتے ہیں اور قومی ایجنسیاں بھی زیادہ بڑے بزنس مینوں اور مارواڑیوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ چھوٹے اور اوسط درجہ کے اخباروں اور رسائل کو صحیح انداز کی خبریں اور مضامین نہیں ملتے جن سے تیسری دنیا کے مسائل' مغربی ممالک میں نسلی امتیاز کے مسائل۔ اور مشرقی تمدن پر مغربی مصنوعی تہذیب کی یلغار کے تعلق سے CLEAR PERSPECTIVE نہیں ملتا۔ دائیں بازو کے زاویۂ نظر سے نہیں ایک بالکل UNBIASED اور آزادانہ انداز سے —— دھرم پال مزید تفصیلات سنائیں گے۔ دہلی کے فلم فیسٹول پر اب تک کچھ پرچوں میں مضامین آ چکے ہیں۔ سیاست کا مضمون تم نے پڑھا ہوگا۔ میری طرف سے بھابی کو سلام اور مہمان نوازی کا شکریہ۔ سنجی اور بشارت کو بھی سلام اور بچوں کو بہت پیار۔

نقی تنویر

منصور قیصر

راولپنڈی، پاکستان

۳۱ اکتوبر ۱۹۸۲ء

بہت ہی پیارے مجتبیٰ حسین

جگ جگ جیو

منیر احمد شیخ کی وساطت سے بچّی کی شادی کا دعوت نامہ مل گیا تھا۔ دعوت نامہ کو اس لئے محفوظ کرلیا ہے کہ ایک تو آپ کی محبت کی نشانی ہے اور دوئم یہ کہ اس کی کتابت و تزئین صادقین نے کی ہے اور یوں یہ ایک ایسا فن پارہ بن گیا ہے جس میں جذبہ بھی ہے اور حسن بھی (صادقین کے بغیر آج کل اسلام آباد خالی خالی نظر آتا ہے)۔ میں بہت چاہنے کے باوجود بھی شادی میں شرکت نہ کرسکا اس غیر حاضری کے لئے آپ جو بھی سزا تجویز کریں مجھے منظور ہے۔ سبب یہ تھا کہ ان ہی دنوں ایک آبائی مکان کے تنازعے کے سلسلے میں مجھے ملتان میں ایک ملٹری کورٹ میں پیش ہونا پڑا۔ لیکن فیصلہ پھر بھی نہ ہوسکا۔ برصغیر کی یہ پرانی روایت ہے کہ آبا و اجداد کی وراثت میں بے مقصد تنازعے بھی ملتے ہیں اور یہ حقیر فقیر ان باتوں سے دور بھاگتا ہے۔ گذشتہ دنوں روزنامہ "جسارت" کراچی کے ادبی ایڈیشن میں مشفق خواجہ صاحب نے اپنے قلمی نام "خامہ بگوش" سے آپ کے بارے میں ایک کالم لکھا تھا۔ کالم کا محرک کسی کا ایک خط تھا جس میں اس نے اعتراض کیا تھا کہ پاکستان اور ہندوستان میں ادیبوں کے ہم نام ہونے کے سبب کنفوژن پیدا ہوتا ہے' پھر اس نے آپ کا حوالہ دیکر اس خدشے کا اظہار کیا کہ یہ کوئی فرضی نام ہے جس پر مشفق خواجہ نے آپ کا پس منظر بتا کر آپ کی اس کتاب کے حوالے دیئے جس میں آپ کے خاکے شامل ہیں۔ افسوس کہ میں یہ کالم اپنی "ازراہِ تفریح" میں محفوظ نہ کرسکا۔ ممکن ہے کراچی کا کوئی دوست آپ کو بھجوا دے۔ منیر احمد شیخ سے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ آپ دوستوں کے بغیر خلا محسوس کرتا ہے۔ دوستوں کا کیا حال ہے۔ آپ کی نئی تصنیف چھپ گئی ہوگی۔ آپ پاکستان کا چکر کب لگا رہے ہیں۔ میں بھی وہاں آنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا ہوں۔

میرے لائق کوئی خدمت؟

دعاگو، منصور قیصر

مسرور خورشید

پیرس، فرانس

۲۶ مئی ۱۹۸۴ء

جلیل القدر مجتبیٰ حسین

آداب عرض!

اُمید کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔ اب تک آپ کے خط کا انتظار کرنے کے بعد میرے قلم نے پہلے خود حرکت کی۔ میرے دل نے اس بات کی تصدیق تو کردی کہ جو خلوص ہم دونوں میں مختصر عرصہ کے بعد ہی پیدا ہوگیا تھا وہ ابد تک رہے گا۔ رپورتاژ کے تراشے اب تک نہیں ملے۔ جانے کیا بات ہوئی۔ امید ہے کہ آپ نے میرا فون نمبر اور پتہ حسین صاحب آرٹسٹ کو دے دیا ہوگا۔ محترمہ اہرینا کو یہاں

تشریف لانے والی تھیں معلوم نہیں ہوسکا کہ ان کا ورود پیرس کب ہوگا۔ ایک فرانسیسی نژاد ہندوستانی رقاصہ پر انگریزی میں میرا ایک مضمون ہے۔ آپ ہندوستان کے کسی اچھے اخبار اور رسالے میں چھپوا سکتے ہیں۔ اس سال کے اواخر میں وہ ہندوستان جا رہی ہیں میں چاہ رہا تھا کہ مضمون پہلے چھپ جائے تو بہتر ہے۔ پاکستان کے انگریزی اخبارات میں چھپوا سکتا ہوں لیکن وہ محترمہ کے لئے منفعت بخش نہیں ہوگا۔ آپ کے دوست جو مانٹریل سے پیرس کا رخت سفر باندھنے والے تھے ان کا خط مجھے نہیں ملا۔ عصمت چغتائی کی کتاب 'جنگلی کبوتر' جو گرودت اور شاہد لطیف کی زندگی پر لکھی گئی ہے بھیج سکتے ہیں تو بھیج دیں ممنون رہوں گا۔ خدا حافظ

آپ کا اپنا۔ مسرور خورشید

پریم شنکر شریواستو

جودھپور (راجستھان)

---

۵ رنومبر ۱۹۸۵ء

شاذ تمکنت کی طرح آپ کو "مجو میاں" کہوں یا "برادرِ عزیز" کہوں یا "برادرم مجتبیٰ" کہوں یا "تاجدار مزاح نگارانِ ہند" کہوں یا "پاسبانِ آبروئے اردو" کہوں یا "فخر ادیبانِ سرزمینانِ حیدرآباداں" سے تم ہی بتاؤ یار اب کیا کہیں تمہیں؟ چلیے فی الحال مائی ڈیر مجتبیٰ حسین!

ہی کہہ لیتے ہیں اور آپ کے جگ جگ جینے' اور زیادہ نہیں تو کم از کم ابھی نصف صدی اور آگے تک آپ کے ذہن و قلم کی سلامتی کی دعا کرتے ہیں' اور آپ سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ لطیف مزاح کی گل افشانیاں اس جنتِ ارضی سے بعید بھی یعنی فردوس بریں میں بھی کرتے رہیں گے تاکہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ مزاج فرشتوں میں بھی حسِ مزاح کا مادّہ پیدا ہوسکے۔ آمین! گزشتہ فروری میں عالمی مزاح کانفرنس کے دوران آپ سے سرسری ملاقات کے بعد کئی بار سوچا آپ کو خط لکھوں۔ ستمبر کے مہینے میں میرا نئی دہلی میں قیام بھی رہا' لیکن بہت چاہتے ہوئے بھی آپ سے ملنا نہیں ہوسکا۔ یہ خط لکھنے کا موڈ اس وقت مجھے یوں آگیا کہ کل کے ہی انگریزی اخبار "دی ٹائمز آف انڈیا" مورخہ ۴ رنومبر جےپور ایڈیشن" کے "PEOPLE" کالم میں یہ خبر پڑھکر مجھے دلی مسرت ہوئی اور فخر بھی ہوا کہ آپ کی کتاب "جاپان چلو" کا ترجمہ جاپانی زبان میں کیا جارہا ہے نیز آپ پہلے اردو ادیب ہیں جس کی کتاب جاپانی زبان میں طبع ہورہی ہے۔ صد آفریں و ہزار ہا مبارکباد' مجتبیٰ صاحب! ؎

"میرے نزدیک تو آؤ' تمہاری میں بلائیں لوں!"

"شگوفہ" کے ستمبر ۱۹۸۵ء شمارے میں آپ کا مضمون "شاذ تمکنت کی یاد میں" پڑھا اور اسی عنوان سے یہی مضمون یکم نومبر کے "ہماری زبان" میں دیکھا۔ دونوں کا تقابل جو کیا تو لگا "شگوفہ" والوں کے پاس شاید کاغذ کی کمی تھی جو آپ کا مضمون نامکمل شکل میں چھاپا اور شاذ کے قہقہے پر اُس کی تان توڑ دی اور آگے ایک بھرتی کا جملہ (جو پتہ نہیں آپ نے یا مصلحتاً کمال سبقی) جلدی میں چسپاں کر دیا۔ مکمل مضمون "ہماری زبان" میں پڑھا۔ پڑھکر دل ہی دل میں آپ کو داد دی اور واہ! واہ! [illegible] مجتبیٰ کہہ لیا! میرے پڑوس میں دور دور تک کوئی اردو داں' یا ادبی ذوق رکھنے والے اصحاب کا نام و نشاں نہیں ہے ورنہ انہیں پڑھکر سناتا۔ آپ کا انداز خصوصاً آپ کا ہے۔ پھر بھی اس کے پس پشت میں ڈکنس اور کہیں کہیں کرشن چندر کے [illegible] کا شائبہ مجھے ہوا لیکن یہ اثر آپ کی شخصیت اور آپ کے انداز بیان میں کچھ ایسا پیوست ہوگیا ہے کہ

اب وہ آپ کا اپنا ہی انداز کہلائے گا۔ بتایئے میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟ حیدرآباد سے آپ کی دو کتابیں خریدیں۔ "تکلف برطرف" اور "بالآخر"۔ پیسوں کی کمی کی وجہ سے زیادہ نہیں خرید پایا۔ اب "جاپان چلو" کہیں سے منگواؤں گا۔ یوں اس کے کچھ حصے ہندی کے رسالے "سارِیکا" میں نظر سے گذرے تھے۔ "تکلف برطرف" کی جلد سازی کے دوران حسامی بک ڈپو والے آپ ہی کی طرح مجھ قاری سے مذاق کر بیٹھے یعنی صفحات ۱ تا ۳۰ سیدھے ہیں تو ۳۱ تا ۶۲ اُلٹے! اسکی ایک پلیٹ مخلص بھرپالی پڑھ کر تو مزہ ہی آگیا۔ "خوش دلانِ جودھپور" کے کچھ ممبران کو بھی سنایا۔ ہم نے تو جودھپور میں SOCIETY OF HUMOUR قائم کردی۔

آپ کا خیر اندیش

پریم شنکر سریواستو

عطاء الحق قاسمی

لاہور (پاکستان)

۷ راگست ۱۹۸۲ء

برادرِ عزیز، سلام مسنون!

یار اس میں شکریے کی کونسی بات تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ مجتبیٰ حسین کی صورت میں ایک اور توانا مزاح نگار سامنے آیا ہے، سو میں نے یہی بات لکھدی۔ اصل مضمون تو ابھی قرض ہے کیونکہ میں نے یہ بہت روا روی میں لکھا ہے۔ آپ یورپ کا چکر لگانے سے پہلے ایک پھیرا پاکستان کا ضرور لگائیں کہ ہم تو ابھی سے شہر کی زیبائش میں مشغول ہیں۔ جھنڈیاں لگا رہے ہیں محرابیں بنا رہے ہیں اور آرائشی دروازے نصب کر رہے ہیں، ایک دفعہ آکر تو دیکھیں۔ امجد اسلام امجد اور احمد حسن حامد آپ کو سلام لکھوا رہے ہیں۔ منور تو پنڈی میں رہتا ہے۔ میں ۱۳ راگست کو ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے پنڈی جا رہا ہوں آپ کا سلام اُسے کہوں گا۔ امجد نے آپ کی کتاب پر "فنون" کے لئے تبصرہ لکھا ہے۔ اشاعت پر پرچہ آپ کو بھیجوں گا۔

تمہارا عطاء الحق قاسمی

(۲)

۷ راپریل ۱۹۸۳ء

پیارے مجتبیٰ، سلام مسنون!

یہ خط میں آپ کو امرتسر سے لکھ رہا ہوں۔ یہاں میں تھوڑی دیر بعد ایک مسجد میں موجود اپنے دادا جان کی قبر پر جاؤں گا اور پھر اپنا آبائی مکان دیکھوں گا۔ لیکن یہ سطور تو میں آپ کی اس محبت کا شکریہ ادا کرنے کے لئے لکھ رہا ہوں جس کا ثبوت آپ نے ہمارے قیام دلی کے دوران دیا۔ سنا ہے اس طرح شکریہ ادا کرنا بُری بات ہے، لیکن میں کونسا اچھا آدمی ہوں؟ میرے اور امجد کی طرف سے آمنہ ابوالحسن، مصطفےٰ علی اکبر صاحب اور قاضی سلیم صاحب کی محبتوں کا بھی بہت بہت شکریہ ادا کر دیجئے کہ وہ لوگ ہیں! امرتسر میں حالات بہت کشیدہ ہیں۔ یوں بھی گھر کی یاد بہت ستا رہی ہے۔ لہٰذا یہاں سے صبح کوچ کر جاؤں گا۔ "عطائیے" کی اشاعت کی بات چیت آگے بڑھے تو مجھے مزید مطلع کیجئے۔

آپ کا بھائی عطاء الحق قاسمی

(۳)

۱۴ر مارچ ۱۹۸۵ء

برادرِ عزیز سلام مسنون!

جس طرح شفیق الرحمان کی "حماقتیں" اور "مزید حماقتیں" ہیں اس طرح تمہاری مجبتیں اور مزید مجلتیں ہیں۔ جن میں تم آئے دن اضافہ کرتے رہتے ہو اگر تم اسی طرح خوش ہو تو ہم تمہیں منع کرنے والے کون ہیں؟ چند تراشے بھجوا رہا ہوں، پڑھو اور عبرت پکڑو۔ "مسافتیں" کتابی صورت میں شائع کراؤں گا۔ "بھارت یاترا" والے کالم تو بس صحافتی نوعیت کی چیزیں ہیں۔ "مسافتیں" کی دوسری قسط میں ایک فقرہ مسز ثریا کٹھی کے بارے میں بھی ہے انھیں پڑھوا دینا تاکہ بوقت ضرورت کام آسکے۔ بیتدی صاحب اور ڈاکٹر خلیق انجم کا ایڈریس میرے پاس نہیں۔ چنانچہ ایک تو ابھی فون پر میری طرف سے ان کا بہت بہت شکریہ ادا کر دو اور دوسرے یہ تراشے انھیں بھی ضرور پڑھواؤ کیونکہ اگر وقت ضائع ہونا ہے تو صرف تمہیں کا کیوں ہو! اس دفعہ آمنہ ابوالحسن سے رابطہ نہ ہو سکنے کا دلی افسوس ہے، انہیں میری طرف سے بہت بہت سلام کہو۔

تمہارا عطاء الحق قاسمی

عاصم قادری

سلطان پور، یوپی

محترمی مجتبیٰ حسین صاحب!

السلام علیکم۔ "شاعر" کے ہم عصر اردو ادب نمبر ۱۹۷۷ء میں آپ کا مزاحیہ مضمون "برف کی الماری" پڑھا بہت پسند آیا۔ بات یہ ہے کہ اب عام طور سے رسائل میں جو افسانے شائع ہوتے ہیں ان میں تجریدیت اور علامتیت اتنی اور ایسی دبیز ہوتی ہے کہ ان کے مطالعہ کے دوران سر پھٹ جانے کا اندیشہ ہونے لگتا ہے اور اپنی فہم و فراست پر اعتماد خطرے میں پڑ جاتا ہے اس لئے میں افسانے نہیں پڑھتا۔

آپ کا مضمون (افسانہ) پڑھکر انبساط اور پسندیدگی کا احساس ابھرا وہی ان سطور کا محرک ہے میں نے اس سے پہلے آپ کا کوئی افسانہ نہیں پڑھا۔ آپ کے مزاح میں تضحیک اور طنز میں خون خرابے کا انداز نہیں ہے بڑی شگفتگی معصومیت اور دلکشی ہے۔ میں ادب اور افسانے کا کوئی مبصر نہیں یہ میرا تاثر ہے آپ کے قدر شناس اہل علم میں بہت ہوں گے۔ ان سطور کی غایت نہ تحسین (ناشناس) ہے نہ داد طلبی۔ آپ کو مخاطب کرنے کی جسارت محض اضطراری ہے۔

خیر اندیش، عاصم قادری

اختر حسن

بمبئی

۲۱ر اکتوبر ۱۹۶۷ء

برادرم مجتبیٰ!

اس وقت آپ ہی کا ذکر ہو رہا ہے یہاں رحیم صاحب بیٹھے ہوئے ہیں کتابت بھی آپ کے مضمون کی ہو رہی ہے یعنی ہمارے آفس میں "مجتبیٰ ڈے" منایا جا رہا ہے۔
اس وقت آپ کے پتے پر چار خطوط بھیج رہا ہوں۔ ان خطوط پر کھنہ صاحب کے مشورے سے "ایڈریس" ٹرھانا ہوں گے اور تھوڑی سی پیروی کرنا ہو گی۔ اگر آپ یہ کام کر سکے تو ہمارا بھی فائدہ ہو گا اور آپ کا بھی (تھوڑا سا)۔
کہیئے بمبئی میں رہنے کا ارادہ ہے ؟
سنجیدگی سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالئے تو میں بھی سنجیدگی سے غور کروں۔

نیاز کیش، اختر حسن

ڈاکٹر افضل اقبال

حیدرآباد

۲۱ر نومبر ۱۹۸۳ء

برادر محترم مجتبیٰ صاحب !
تسلیم، مزاج گرامی
آج کے "سیاست" میں یہ خوش خبری پڑھکر بے حد مسرت ہوئی کہ آپ کو اردو ادب میں مزاح کے فروغ کے لئے اور ستائش کے طور پر "نشانِ امتیاز" سے نوازا گیا ہے۔ میری جانب سے دلی مبارکباد قبول کیجئے۔
آپ کے سفرنامۂ جاپان کی اشاعت اور رسم اجرا کی تفصیل پڑھکر بڑی مسرت ہوئی۔ آپ کا سفرنامہ میں "سیاست" میں بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا میرے پاس اس سفرنامے کے چند تراشے بھی موجود ہیں۔ سفرنامے کی کتابی صورت میں اشاعت کا بڑا انتظار تھا۔
آپ کے مزاح میں بڑا بے ساختہ پن ہے۔ آپ کا کوئی مضمون پورا پڑھے بغیر چھوڑنا ناممکن ہے۔ ہر اتوار کو سیاست میں آپ کے مضامین کا بڑا انتظار رہتا ہے اور جب بھی آپ کا مضمون چھپتا ہے میں سب کام چھوڑ کر سب سے پہلے آپ کا مضمون پڑھتا ہوں اب کے خوشونت سنگھ کا انٹرویو بڑا دلچسپ اور فکر انگیز تھا۔
باقی خیریت، فقط

مخلص، افضل اقبال

یونس فہمی

ناندیڑ

۱۸ر جون ۱۹۸۵ء

محترم بھائی مجتبیٰ حسین صاحب ! السلام علیکم
۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۲ء میرا قیام حیدرآباد میں رہا۔ اس زمانے میں آپ سے گاہے بگاہے نیاز حاصل ہوتا رہا۔ لیکن مجھے یقین

ہے کہ میں آپ کے ذہن سے لازماً محو ہو گیا ہوں گا۔ کیونکہ جو بھی ملاقاتیں ہوئیں نہایت مختصر رہیں، ویسے آپ کی تخلیقات سے میں اس وقت بھی متاثر تھا اور آج بھی ہوں۔

میں بی این جہادو دیالیہ (کالج) میں اردو پڑھاتا ہوں۔ عثمانیہ سے ایم اے کیا ہے اور ڈاکٹر سید حمید نظامی شطاری [illegible] کی نگرانی میں طنز و مزاح پر ایک DISSERTATION بعنوان "اردو شاعری میں طنز و مزاح" لکھا ہے۔

عثمانیہ سے ایم اے کرنے کے بعد میرا ارادہ بلکہ خواہش تھی کہ عثمانیہ سے پی ایچ ڈی کر لوں۔ لیکن نامساعد حالات کے باعث ایسا ناممکن ہے اسی لئے مرہٹواڑہ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کا رجسٹریشن کروا لیا ہے جو عموماً ارجولائی سے قبل ہوا کرتا ہے۔

طنزیہ و مزاحیہ ادب سے میری دلچسپی کے زیر اثر میں اپنے تحقیقی مقالے کو آپ کی تخلیقات کی نذر کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ رجسٹریشن فارم پر میں نے ٹاپک کے خانے میں " مجتبیٰ حسین، فن اور شخصیت" لکھ دیا ہے۔ فارم یونیورسٹی کو نہیں بھیجا ہے، آپ سے اجازت کا طالب ہوں۔ اس لئے اس ضمن میں آپ ہی کا تعاون میرے لئے مددگار ثابت ہوگا۔

میں آپ کی گوناگوں مصروفیات سے واقف ہوں لیکن مجھے رجسٹریشن کروانا ہے اور اس کے لئے وقت بہت کم ہے اس لئے آپ سے ادباً گذارش کرتا ہوں کہ اپنی رائے اور قیمتی مشوروں اور اجازت سے جلد سرفراز فرمائیں تاکہ میرا کام بھی جلد شروع ہو سکے۔

اگر آپ حیدرآباد آئیں ہوں تو جناب مصطفےٰ کمال ایڈیٹر شگوفہ اور جناب عاتق شاہ سے بھی میرے بارے میں دریافت فرما سکتے ہیں۔

میں بڑی بے تابی سے آپ کے جواب کا انتظار کروں گا۔

نیازمند یونس فہمی

ارشاد پنجتن

برلن

۱۶/جولائی ۱۹۸۲ء

مجتبیٰ صاحب! آداب عرض

جناب، کچھ خطوط ادھورے رہ جاتے ہیں اور کچھ ادھار ہو جاتے ہیں۔ یہ خط جیسے ادھار تھا۔ بقول آپ کے 'اگر محکمۂ پوسٹ نے مجھ پر رحم اور آپ پر کرم کیا تو میرا بوجھ اتر جائے گا اور آپ کا جی ہلکا ہو جائے گا۔ ویسے اس خط کی ایک کاپی بنا کر رکھ لوں گا اور جب ہندوستان آؤں گا تو بذات خود اپنے ہاتھوں آپ کے حوالے کروں گا تاکہ اگر یہ خط نہ بھی پہنچے تو باقی وہ خیالات جو میری دوری نے آپ کے گمان میں ابھارے ہوں گے وہ بلا کسی صفائی کے صاف ہو جائیں گے۔ مجھے پوری امید ہماری عمروں سے ہے اور بھروسہ اپنی زندگیوں پر کہ اس ہونے والی ملاقات تک ہم دونوں بہ حیات اور قابلِ ہوش و شعور رہیں گے (آمین ثم آمین)۔

دہلی میں خوش اخلاقی کا جو خوبصورت مظاہرہ آپ نے کیا وہ میرے لئے ہمیشہ مسرت کا باعث رہے گا کہ نہ صرف

آپ نے مجھے اپنی دونوں کتابیں بھیجیں بلکہ اسی لمحہ خود جلوہ گر بھی ہوئے اور دو کمانڈمنٹ عطا کیے۔" ورنہ اس صدی میں ایسی فیاضی دیکھنے کو کہاں ملتی ہے۔"

اگر آدمی نیک ہو تو کسی کی احسان مندی سے فراموش نہیں ہوتا۔ میری نیک نیتی کم از کم مجھ پر ظاہر ہے' اس لئے آپ کا احسان مند ہوں کہ اس غریب الزبانی میں آپ نے نہ صرف مجھے اپنی زبان سے دوچار کیا بلکہ کئی قہقہوں سے گرمایا جو برسوں سے یہاں کی ٹھنڈک میں سرد پڑ گئے تھے۔ چارلی چپلین نے کہا بھی ہے اور لکھا ہے کہ "وہ دن جو ہنسی کے معاملہ میں خالی رہا وہ بیکار گیا"۔ آپ کی کتابیں پڑھ کر میں نے کئی بیکار دن با کار کر لئے۔ شکریہ

آپ کا' ارشاد پنجتن

بلراج ورما

دہلی

یکم جنوری ۱۹۸۷ء

پیارے مجتبیٰ حسین' پیار

نئے سال کی آمد پر ہمارا پیار۔ ہماری دعائیں اور وہ تمام خواہشات جنھیں نیک مانا جاتا ہے' قبول کرو اور خوش ہو جاؤ۔ تمہارا خوش رہنا وطنِ عزیز کے لئے بے حد ضروری ہے کیونکہ تمہیں اپنی خوشیاں بانٹنے کا سلیقہ آتا ہے۔ اس سال نئے سال کا ٹی وی پروگرام ایک دم زیرد تھا تم نہ ہوتے تو لوگ ٹی وی کے سکرین توڑ دیتے۔

خدائے بزرگ و برتر سے دعا ہے کہ وہ تمہیں اور تمہارے پریوار کے ہر فرد کو اپنے حفظ و امان میں رکھے تاکہ تم اپنی مسرتیں ہمیشہ کی طرح بانٹتے رہو۔ (آمین)

یعنی کہ' تم جیو ہزار برس اور ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار۔

حقیر نقیر جسے تم کبھی اپنا بڑا بھائی مانتے تھے' بلراج ورما

سکندر توفیق

حیدرآباد

۳۰ جنوری ۱۹۸۳ء

برادرم مجتبیٰ! السلام علیکم

۲۹ جولائی ۱۹۸۳ء کی شام میں آپ کا خط' پراسپکٹس اور درخواست کا فارم وصول ہوا۔ "نانا" بن جانے پر بہت بہت مبارکباد۔ بھئی ایسا فضل سب ہی کو نصیب نہیں ہوتا سکینہ کی اور میری طرف سے نہ صرف خود مبارکباد قبول کیجئے بلکہ بھابی کو بھی پہونچا دیجئے یہ تو ایسا موقع ہے کہ آپ کو ایک مضمون لکھ کر COMMOMERATE کرنا چاہیئے

آپ جب بھی حیدرآباد آئیں مجھے ضرور مطلع کیجئے۔ ملاقات کے ضمن میں بچشم روشن دلِ شاد محض رسمًا نہیں لیکن

حقیقتاً کہہ رہا ہوں۔ اگر آپ فون ہی کر لیں ملاقات کچھ مشکل نہیں۔

پرانے احباب میں میرے گروپ کے لوگ تقریباً سب کے سب ہی ہندوستان سے باہر ہیں اور میں صرف یہی گنگناتا رہتا ہوں مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں، آپ آئیں تو یہ COMMUNICATION GAP شاید ختم ہو۔

آپ کے اسسٹنٹ صاحب کا خط پالی ٹیکنک کے پتہ پر مل گیا تھا جس میں اردو ورکشاپ کے سلسلہ میں آپ کی مصروفیت کا علم ہو گیا تھا۔ میں ۱۲ر جولائی کو ایک ہفتہ کے لئے انگریزی ورکشاپ میں حصہ لینے مدراس جا رہا ہوں۔ دراصل مدراس دیکھنے کے لئے ورنہ اب مجھے کیا کوئی پڑھا سکتا ہے۔

"نانا" آپ نواسی کے بنے ہیں یا "نواسے" کے۔ ہماری طرف سے اسے بہت بہت پیار باقی والسلام

مخلص سکندر

ظفر گورکھپوری

بمبئی

۲۷ر جون ۱۹۸۶ء

محترم بھائی مجتبیٰ حسین صاحب!

آداب، آپ کا محبت نامہ ملا، شکریہ

"گورکھرو کے پھول" پر آپ کے بے لاگ اور دو ٹوک اظہارِ خیال سے جی خوش ہو گیا۔

آپ کا دعائیہ جملہ "خدا کرے گورکھرو کے پھول، اردو کی ہر لائبریری میں مہکیں" دل پر نقش ہو گیا۔

آپ سے گذارش ہے یہی رائے چند سطور کے پیراگراف پر مشتمل مرتب انداز میں ارسال فرما دیں۔ تاکہ جب کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو تو اس میں شامل کر سکوں۔ فقط

آپ کا، ظفر گورکھپوری

مظہر امام

سری نگر (کشمیر)

محبی مجتبیٰ حسین صاحب!

سلام مسنون، نئے سال کی مبارکباد قبول فرمائیے!

میرے ایک عزیز پروڈیوسر وجے ہنڈو کسی انٹرویو کے سلسلہ میں آپ کے یہاں جا رہے ہیں۔ میں نے یہ موقع غنیمت جانا کہ آپ سے سلسلہ مراسلت کا آغاز کر لوں۔ یعنی یہ دھمکی کہ آئندہ بھی اپنی حماقتوں سے آپ کو طنزیہ ادب میں اضافہ کرنے کا موقع دوں گا۔

آپ کے مضامین باقاعدگی سے دیکھتا ہی نہیں بلکہ پڑھتا بھی ہوں اور اگر یہ جھوٹ ہے تو اس جھوٹ کو بھی سچ مان لیجئے کہ سب سے پہلے آپ کا مضمون پڑھتا ہوں۔

آپ نے کتنوں کا خاکہ اڑایا" اور کتنوں کو امر کر دیا اللہ یہ دوسروں کو امر کرنے کا سلسلہ بند کیجئے، ورنہ ہم آپ کو امر کرنے کی کوشش کریں گے۔

کیا آپ نے اپنی نئی کتاب چھپوانے کی قسم کھائی ہے۔ قاری ابھی اتنے باذوق نہیں ہوئے کہ کوئی کتاب جلد چھپ جائے اور مجھے بھی جلد ایک مفت عنایت کیجئے کیونکہ مجھ جیسے "عظیم فنکار" کتاب خرید کر نہیں پڑھتے۔ اس سال کے اوائل میں پونا اور بمبئی میں یوسف ناظم سے کئی ملاقاتیں رہیں۔ بمبئی میں خواجہ عبدالغفور صاحب سے ملا۔

آپ کا اپنا مظہر امام

حمایت اللہ

حیدرآباد

۲۰ نومبر ۱۹۸۳ء

پیارے مجتبیٰ بھائی!

السلام علیکم

بفضل خدا "لندن" امریکہ اور کینیڈا کا سفر بہت ہی کامیاب اور مزیدار رہا۔ ہر جگہ لوگوں نے آپ کی آمد کے تعلق سے پوچھا خصوصاً لندن میں سب آپ کے منتظر ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی صاحب سے بھی ملاقات رہی۔ ان کو حیدرآباد آنے کی دعوت بھی دی۔ دو جلسوں میں انہوں نے اپنے مضامین سنائے ' اچھے تھے اور سنانے کا انداز بھی اچھا تھا۔

لندن میں آپ کی بہت یاد رہی۔ افتخار عارف صاحب بھی آپ کا تذکرہ کر رہے تھے۔ کاش آپ کے پچھلے پروگرام کے تحت آپ ہمارے ساتھ ہوتے تو بڑا مزا آتا اور دھوم مچ جاتی۔ ویسے آپ کے بغیر ہم دونوں نے زندہ دلان اور اکیڈمی کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ آپ ہوتے تو اور زبردست ہنگامہ ہوتا۔ انشاء اللہ آئندہ ساتھ ہی جائیں گے۔ بھابی کو میرا اور ڈاکٹر صاحب کا سلام کہیئے' بچوں کو دعا۔ ڈاکٹر صاحب آپ کو سلام لکھواتی ہیں۔

خدا حافظ ۔ حمایت اللہ

اقبال متین

حیدرآباد

۱۹ مارچ ۱۹۸۰ء

پیارے مجتبیٰ۔ میں تم سے بہت خفا تھا۔ اب نادم ہوں۔ مجھے لکھو کہ تم نے مجھے معاف کر دیا۔ ویسے تصویر نہ بھیج کر تم نے مجھے پھر خفا ہو جانے کا ایک اور موقع فراہم کر رکھا ہے۔ کہیں یہ خفگی "فقیر کا غصہ فقیر کی جھولی میں" کے مصداق شاید الٹی پڑے۔ لہذا گزارش کرنی پڑے گی۔ ایک میرے لئے اپنی آٹوگراف کے ساتھ ایک عمدہ سی تصویر بھجوا دیار۔ بس اسے البم میں سجا کر خوش ہو لوں گا۔

میں نے فکر تونسوی کی ایک عمدہ سی تصویر شاہ علی کے پاس سے حاصل کر لی ہے۔ ان کا آٹوگراف کبھی لے لوں گا

ساری تفصیلات ان کے بارے میں چاہئیں۔ میں خط لکھوں گا۔ لیکن وہ جواب دیں نا۔ تمہیں معلوم نہیں ہماری جوانی کے زمانے میں ہم نے ایک دوسرے سے قلمی محبت کی تھی۔ اس شخص کے کئی حسین خطوط میرے پاس موجود ہیں۔ میں تو ان دنوں تھا ہی محبت کے قابل۔ لڑکیاں چاہتی تھیں یار۔ میں نے منکر تونسوی پر ترس کھا کر تھوڑی سی گھاس ڈال دی تھی۔ وہ میرے افسانوں کو پسند کرتا تھا۔ اور میں اس کی نظموں کو۔ خاصا اچھا شاعر تھا۔ شوہر پران کا احسان ہے۔ اسے چھوڑ دیا طنز پر ان کا احسان تھا اسے پکڑ رکھا۔

مجھے اپنے افسانوں کے تراشے مغنی تبسم اور یوسف سرمست کی دست برد سے بچ کر بحفاظت مل گئے ہیں۔ شاید منیر صاحب نے مغنی صاحب کو دیئے تھے اور مغنی نے یوسف سرمست کو۔

آمنہ کا ایک اچھا سا خط ملا ہے۔ تم نے اس سے کچھ نہیں تو انسانیت ہی سیکھی ہوتی۔ خفا نہ ہو۔ پیار دوا در تصویر بھیجو۔ بلراج ورما کو الگ سے خط لکھ رہا ہوں۔

تمہارا' اقبال متین

کیشوراؤ

حیدرآباد

مورخہ ستمبر ۱۹۸۶ء

جناب مجتبیٰ حسین صاحب — نہیں — بھائی مجتبیٰ — !

آداب عرض ہے۔ آج عرصہ دراز کے بعد آپ کا جواب آیا۔ یہ جواب کیا تھا کسی گمشدہ گزشتہ خواب کی تعبیر۔ مجھے بڑا افسوس تھا۔ میں نے اپنی پوری ایمانداری سے ایک پرانے حیدرآبادی احساس کے تحت آپ کو خط لکھا تھا۔ عرصہ دراز تک جواب نہیں آیا تو سمجھا کہ مجتبیٰ حسین صاحب میں سب کچھ باقی ضرور ہو گا مگر اس میں کا حیدرآبادی کہیں گم ہو گیا ہے۔ حیدرآبادی تہذیب کی معصوم سانسوں کو کسی نے ختم کر دیا ہے۔ ایسا ہی کچھ احساس کل تک تھا۔ یہ سچ ہے کہ حیدرآبادی پھیلتا تو ہے مگر پھیل کر بھی وہ حیدرآبادی ضرور رہتا ہے۔ اس میں علاقہ داریت کا احساس ایک خوب صورت نگینہ ہے۔

یہ اُردو اس آدمی کی ہے جو اردو ادب' زبان' قواعد اور صرف و نحو سے مکمل طور پر ناواقف ہے۔ لیکن کبھی کبھی بچپن کی بادلوں کی دوپہر میں لکھ کر احساس سکوں کا مشکور ہونا چاہتا ہے۔ آج اپنے ملک میں زبانوں کے ساتھ تقریباً ایک مہذب وحشیانہ طرز فکر کے شکار ذہنوں۔ نے وہی سلوک کیا ہے جو کبھی جلتے ہوئے روم کو دیکھتے ہوئے نیرو نے کیا تھا۔

بھائی مجتبیٰ میں خوش خط نہیں ہوں یہ تو اس زبان کی خوبی ہے جس نے مجھے ایسا لکھنا سکھایا ہے یہ میرا اپنا اثاثہ ہے۔ میں سخی حسن صاحب صدیقی کا مشکور ہوں۔ نام سے ہی نہیں کام سے بھی شاید یقیناً وہ شخص سخی ہوگا اور اگر نہیں ہے تو میں دعا گو ہوں کہ وہ حاتم بن جائے۔ میرے ایک خط نے دو انسانوں کو مجھ سے گفتگو کرنے کا بالواسطہ شاندار موقع فراہم کیا ہے۔ اب میں جلیس صاحب کی بات کرنا چاہتا ہوں۔ ۱۹۴۸ء میں ابراہیم جلیس صاحب نے "احسان فراموش ہندوستان" سرخی سے ایک مضمون یا خاکہ تحریر فرمایا تھا۔ مجھے اس کی تلاش ہے۔ آپ سے رہنمائی کی درخواست ہے۔ میں حیدرآباد ہی میں ہوں مگر کسی بھی محفل کے لئے بلکل اجنبی ہوں۔ ہاں آج سے چار یا پانچ سال پہلے آپ سے نمائش میدان کے

کلب کے سبزہ زار پر ایک اندھیری شام کے وقت کم روشنی میں پڑھا گیا آپ کا ایک مضمون ایک دھندلے تعارف کا سبب تھا۔ وہ شام شاید آپ کے ذہن میں موجود ہو آپ ادیب اور میں سامعین کا ایک غیر حرکی جز۔

۳۴ برس پہلے آپ گلبرگہ سے حیدرآباد آئے۔ گلبرگہ کالج میں دو سال تک قیام پذیر رہے۔ نوجوانی کے دو برس نیم کے درختوں کی سبک رو ہوا۔ تنگی کے پیچھے چھوڑ کر پیلا دوشالہ کا شہر۔ یہ دو برس نوجوانی کے دو برس نہیں بلکہ ایک جواں عزم کا مچلتا پیکر۔ یہ ساری ساعتیں آپ ہی کی ہم راز رہی ہوں گی۔ اسی وقت کے احساس نے مجتبیٰ کے طنز و مزاح کے مزاج کی تشکیل کی ہوگی۔ گلبرگہ شاید ابراہیم جلیس کا بھی رہا ہوگا۔ سلیمان خطیب کا تو تھا ہی' محمد علی صاحب مرحوم اور بھیم راؤ دلیشپانڈے یہ دو مرحوم پالائیں ہیں۔ کیا عجب خوبصورت اتفاق ہے کہ اسی گلبرگہ سے مجبوب گلشن کے گلبرگہ سے آپ حیدرآباد آئے اور پھر دہلی جاکر ایسے بیٹھ گئے کہ دہلی وطن ثانی ہوگیا اور گلبرگہ اور حیدرآباد' ابتدائی زندگی کے ایک اچھے کامیاب سفر کے دلکش سنگ میل ہو گئے۔ کارواں گذر گیا غبار دیکھتے رہے۔ شاید گوپال داس نیرج نے ایسے ہی کسی وقت کے لئے لکھا ہو۔

اس بے حجابانہ تکلف تحریر کے لئے درخواست کروں یا التجا' یا پھر خواہش کہ کسی نادانستہ ناشائستگی کے لئے معاف فرمائیں۔ "جاپان کا سفر" کے معروف ترین مسافر کی خیریت کے لئے دعاگو ہوں۔

اس خط کے جواب کے لئے ایک اور سجی حسن صدیقی کی تلاش نہ کیجئے۔ طنز و مزاح کے فن کار سے کوئی یہ خواہش کیسے کرے گا کہ وہ ایک خوش خط بھی ہو۔ آج سماج کی گندگی نے خوب صورت حروف کی شائستگی کو پامال کر دیا ہے۔ خوش خطی کی نہیں خوش مزاجی کی بات ہے۔ آپ کی تحریر کی اسیرت بذات خود ایک مکمل لا مثال حسن ہے۔ جواب کا ...... انتظار

میرے ادیب کے سفر کا کارواں مسلسل محفوظ رہے اور کامیابی کی ہر منزل ایک اور نئی امید کو جنم دے۔

آپ کا' کیشوراؤ

ڈاکٹر اخلاق اثر

بھوپال

۱۲ر جنوری ۱۹۷۸ء

برادر مکرم

السلام علیکم!

ابھی ابھی "آج کل" ملا۔ ابراہیم جلیس کی یاد میں" پڑھا۔ قریب ہوتے تو جاکر لپٹ جاتا۔

آنسو بہہ جاتے تو دل کا درد دور ہو جاتا۔ پلکوں تک آنسو آئے اور لوٹ گئے اور خون کے ساتھ شامل ہو گئے۔ میں نے ابراہیم جلیس پر کچھ نہیں لکھا مگر وہ میرے پسندیدہ ادیبوں میں سے تھے۔ ان کے ایک افسانہ سے بصیرت حاصل کی اور زندگی کا اندھیرا دور ہو گیا۔

میں آپ سے ہمدردی کا اظہار کیوں کر کروں' میں بھی غم زدہ ہوں۔

آیئے ہم مرحوم کے لئے دعا کریں۔

آپ کا۔ اخلاق اثر

ہلال رضوی مرحوم

رام پور

مورخہ دسمبر ۱۹۸۳ء

معظم و محترم جناب مجتبیٰ صاحب! آداب و نیاز

امید ہے آپ نور چشمی کے عقد و نکاح کی مصروفیت سے بخیر و خوبی فراغت پا گئے ہوں گے۔ میں نے مبارکباد کا پیغام ایک ٹیلی گرام کے ذریعہ بھیجا تھا جو یقین ہے مل گیا ہو گا۔

میرے مجموعہ کی کتابت ہو چکی ہے اور اسے اب آخری شکل دینا باقی ہے۔ کتابت آفسیٹ کے فل سائز پر ہے جس کا ٹائٹل صادقین صاحب نے بنایا ہے۔ علامہ عرشی مرحوم اور نارنگ صاحب کی رائے شامل ہیں چونکہ میں طنز و مزاح کا شاعر ہوں اس لئے آپ کی رائے کا ہونا ضروری ہے۔ کافی دن سے آپ سے گذارش کی جا رہی ہے واجد سحری بھی غالباً آپ کو یاد دلا چکے ہیں۔

برائے مہربانی اب چند سطور لکھنے کی زحمت کر ہی ڈالیئے۔

ایک ہفتہ بعد کتاب کے سلسلے میں میرا دہلی آنا ہو گا انشاءاللہ آپ سے نیاز حاصل کروں گا۔

آپ کا ہلال رضوی

پروفیسر شکیل الرحمان

سری نگر

۱۲ اپریل ۸۷ء

پیارے بھائی! خوش رہیئے

۳۰ مارچ کا خط کل ملا۔ مجھے یقین تھا کہ اس خبر سے آپ بہت خوش ہوں گے۔ دعا کیجئے کامیابی حاصل ہوتی رہے۔ میرے آتے ہی خدا کے فضل و کرم سے یہاں کا ماحول متاثر ہوا ہے اور ایک ہفتہ میں چند کام ایسے کر دیئے ہیں کہ ہر شخص خوش ہے۔ اردو دنیا میں بھی خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ اپریل کے آخر تک شعبۂ اردو کی جانب سے CREATIVE WRITERS SCHEME (یہ اسکیم میں نے شروع کی ہے) کے تحت آپ کو اور جوگندر پال کو دعوت نامے جائیں گے، قبول کیجئے گا اور مئی میں آ جائیے گا۔ ملاقات ہو گی اور خوب باتیں کریں گے۔

محترم اشتیاق عابدی صاحب کو خط لکھا تھا۔ انھوں نے تو جواب میں اپنی بے پناہ شفقت اور محبت کے تحفے بھیج دیئے ہیں کس طرح شکریہ ادا کروں۔ آج خط لکھ رہا ہوں۔ سنا ہے وہ برلن اور ماسکو تشریف لے جا رہے ہیں۔ اُن کے ساتھ میری کتاب "مرزا غالب اور ہند مغل جمالیات" کی چند جلدیں چلی جائیں تو کتنا اچھا ہو، غالب اکیڈمی حضرت نظام الدین میں کتاب موجود ہے۔ میں نے اس کا ایک نسخہ عابدی صاحب کی خدمت میں بھی پیش کیا ہے۔ آپ کی خاص توجہ چاہتا ہوں۔ اتنا مصروف ہو گیا ہوں کہ اس کی نکاسی کا انتظام نہیں کر سکتا۔ اردو میں اتنی خوب صورت کتاب ابتک

شائع نہیں ہوئی ہے۔ نیز مرزا غالب پر ایک کام بھی ابھی تک نہیں ہوا ہے۔ محترم ہاشم علی صاحب (وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی) نے اس کتاب کو بیحد پسند کیا ہے۔ اُن کا خط آیا ہے۔

جلدی خط لکھئے گا۔ انتظار رہے گا۔

خدا حافظ

آپ کا اپنا۔ شکیل الرحمان

اسداللہ

برلن

۱۱/ اکتوبر ۱۹۸۴ء

برادر!

پچھلے دو ہفتوں سے آپ پر بڑا پیار آرہا ہے اور میں ہر روز آپ کو یاد کررہا ہوں۔ قصہ یہ ہے کہ جگر صاحب کا حیدرآباد سے خط آیا ہے اور اُن سے اطلاع ملی ہے کہ آپ نے دہلی سے انھیں مطلع کردیا تھا اور ان لوگوں نے نظام کلب میں ہمارے قیام کا انتظام کیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ آپ خود سفر کی تیاری میں تھے اس لئے ممکن ہے کہ آپ کو حیدرآباد فون کرنے یا خط لکھنے کا وقت نہ ملا ہو۔ لیکن اب جب حیدرآباد سے اطلاع ملی تو آپ کے خلوص اور آپ کی وضعداری کا پتہ چلا اس کے لئے میں آپ کا ممنون ہوں۔

حبیب حیدرآبادی اور احمد فراز سے درخواست کی تھی کہ آپ تک یہ پیغام پہونچائیں کہ لندن سے ہماری طرف ضرور آیئے۔ لگتا ہے آپ کا قیام امریکہ میں زیادہ دن رہا اور آپ یورپ کے لئے وقت نہیں نکال سکے۔ اگر آپ یہاں آسکتے تو مجھے بے حد خوشی ہوتی۔

اب آپ اِدھر یورپ کے دَورے پر کب نکل رہے ہیں۔

جنوری میں آپ کہاں ہوں گے؟ شاید میرا دہلی آنا ہو۔ اس دفعہ تنہا آؤں گا۔ دہلی، بمبئی اور حیدرآباد کے سفر کا پروگرام ہے ممکن ہو تو مجھے خط ضرور لکھیئے۔ اپنی فیملی کے بارے میں بھی بتلایئے۔ بچے کون کن جماعتوں میں پڑھ رہے ہیں؟

آپ کا۔ اسد

ہری جوشی

اندور

۲۷/ اگست ۱۹۸۵ء

جناب مجتبیٰ حسین صاحب! آداب

سب سے پہلے عید کی مبارکباد قبول کیجئے۔ سارے خاندان کے لئے۔ امید ہے آپ بخیر وعافیت ہوں۔

آج آپ کی یاد مجھے اس لئے بھی آئی کہ پچھلے دنوں نئی دنیا میں دلّی والی محفل کی رپورٹ چھپی تھی۔ وہ میرے سامنے آگئی ہے۔ آپ نے بڑا مضمون لکھ کر اس جلسہ میں سنایا تھا۔ مہربانی کرکے اس پروگرام میں آئے تھے اس کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

میں نئی دنیا کا تراشہ بھیج رہا ہوں۔ راجیشور، ہریش کانت کے چھوٹے بھائی ہیں۔

میرے لائق کوئی خدمت ہو تو لکھیں۔

میں خوش ہوں۔ ممکن ہو تو مہربانی کرکے ڈاکٹر شیر جنگ گرگ صاحب کو تراشا بھی دکھادیں۔ ان کا پتہ میرے پاس نہیں ہے۔

آپ کا۔ ہری جوشی

ایرینا میکسیمنکوف

ماسکو

۱۴ر جنوری ۱۹۸۷ء

محترم اور عزیز دوست

مجتبیٰ صاحب! ـــــ نیا سال مبارک

امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ بہت افسوس ہے کہ آنے کا موقع نہیں ملا۔ انشاء اللہ کبھی پھر ملیں گے۔ پچھلے دنوں سے محمد نے مجھے CONTACT نہیں کیا۔ شاید بہت مصروف ہے۔ مجتبیٰ صاحب، آپ اور وہ دن جو آپ کے ساتھ گزارے مجھے بہت یاد آرہے ہیں۔

نیک ترین تمناؤں کے ساتھ

آپ کی اپنی، ایرینا

...... : مجتبیٰ صاحب ہنسنے کو ایک مقدس فرض جانتے ہیں اور قہقہہ لگانے کو دنیا کا سب سے بڑا اڈونچر۔ چنانچہ اپنی تحریر کے ذریعے وہ اپنے ہزاروں پڑھنے والوں کو نہ صرف ہنسنے پر بلکہ قہقہہ لگانے پر مجبور کردیتے ہیں ....

آپ کی تعریف؟ ـــــ ڈاکٹر رشید موسوی

شگوفہ جلد ۱۰ شمارہ ۲

رحمٰن جامی

مجتبیٰ حسین

طنز و مزاح کی ہے زباں مجتبیٰ حسین
اونچا ہے تیرا نام و نشاں مجتبیٰ حسین

تجھ سے رہا نہ جھوٹ نہاں مجتبیٰ حسین
سچائی کی طرح ہے عیاں مجتبیٰ حسین

تیرا گماں بھی ہے یقیں، زندگی کی طرح
تیرا یقین بھی ہے گماں مجتبیٰ حسین

ہندوستاں میں اردو غریب الوطن سہی
تجھ سے امیر ہے یہ زباں مجتبیٰ حسین

جاپان و روس بھی نہ بچے تیرے طنز سے
گرویدہ تیرا ہے یہ جہاں مجتبیٰ حسین

سرمایۂ حیات ہے اردو زبان کا
تو خود ہے اپنا سود و زیاں مجتبیٰ حسین

غالب ہوا ہے سب پہ تیرا تیر نیم کش
تو طنز کا ہے تیر و کماں مجتبیٰ حسین

جامی کا بھی یہی ہے بیاں بطنِ شعر میں
ہے جسم و جانِ زندہ دلاں مجتبیٰ حسین

بوگس حیدرآبادی

مجتبیٰ کے سب کے سب قائل ہیں آج
کس کو ہو سکتا ہے ان سے انحراف
آج ہے زندہ دلوں کی بزم میں
اُن کی خدماتِ ادب کا اعتراف

مجتبیٰ کو چھوڑکر یہ زندہ دل
محفلیں اپنی سجا سکتے نہیں
مجتبیٰ ہیں زندہ دل پیدائشی
زندہ دل ان کو بھلا سکتے نہیں

سراج نرملی

تین شعر

آپکا مضمون ہر اک "پریشیس"
آپ ہیں اک "بِسٹ رائٹر" ہیومرس

ہیں "بہرحال" انڈین فیمس ادیب
مجتبیٰ صاحب ہیں کتنے خوش نصیب

عرض کرتا ہے یہ "بالآخر" سراج
آپ کے سر پہ "ظرافت" کا ہے تاج

بالآخر

اداریہ

نامور مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے اپنے تخلیقی سفر کے پچیس سال مکمل کر لئے۔ اس سفر کا زندہ دلانِ حیدرآباد، اس کی تحریک اور ماہنامہ شگوفہ سے خاص تعلق ہے۔ اتفاق سے زندہ دلانِ حیدرآباد اور مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کی عمر ایک ہے۔ ایک طرف ایک فرد ہے اور دوسری جانب ایک ادارہ۔ لیکن یہ مقولہ یہاں صحیح طور پر منطبق ہوتا ہے کہ مجتبیٰ اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔ تخلیقی سفر کے ۲۵ سال کی تکمیل پر شگوفہ نے اس فعال، پُرکشش، مقبول اور نامور شخصیت اور اس کے فن کا تفصیلی جائزہ لینے کی اپنی بساط کے مطابق کوشش کی ہے۔ ۲۵ سال کے سفر کی یہ داستان خاصی دلچسپ ہے۔ زیرِ نظر شمارہ کے ذریعہ اس داستان کے تقریباً تمام گوشوں کا احاطہ کیا گیا اور بحیثیت مزاح نگار مجتبیٰ حسین کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ آزادی کے بعد اُردو طنز و مزاح کے ارتقاء کی بھی ہلکی سی تصویر سامنے آئی ہے۔ یقین ہے کہ اس خصوصی نمبر کی اشاعت کے نتیجہ میں طنز و مزاح کی رفتار کو سمجھنے میں مدد ملیگی

عام طور پر خصوصی نمبروں کی اشاعت معلنہ وقت پر ممکن نہیں ہوتی۔ اسی لئے اشاعت کی تاریخ میں توسیع کرتے ہوئے، اسے ہر اعتبار سے مکمل بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن اس شمارہ کا آج یعنی ۱۹ر نومبر ۸۷ء کو شائع ہونا ضروری تھا جبکہ مجتبیٰ حسین کے اعترافِ خدمات کے لئے بڑے پیمانہ پر جلسہ کا اہتمام کیا گیا ہے اکثر مضامین آخری لمحوں میں وصول ہوئے اور ساری کتابت صرف ۱۵ دن میں ہوئی۔ طباعت کا کام بھی دو ہی دن میں مکمل ہوا۔ اس خصوصی نمبر کی صورت گری میں میرے دوستوں اور مجتبیٰ کے چاہنے والوں نے شب و روز ایک کردیئے، ان سب کے ناموں کا ذکر ممکن نہیں۔ پھر بھی خاص طور پر مضطر مجاز، صلاح الدین نیر ڈاکٹر رحمت یوسف زئی، رؤف رحیم، سخی حسن صدیقی (دہلی)، محمد اسلم (دہلی)، مالکان حسامی بکڈپو نصیر احمد قاسم بھائی، میر مشتاق علی مالک نیشنل پریس، محمد عبدالرشید (دائرہ پریس)، سلام خوشنویس اور مسعود انور کا خاص طور سے ممنون ہوں کہ ان کی شبانہ روز توجہ کے بغیر اس خصوصی اشاعت کا وقت پر شائع ہونا ممکن نہ تھا۔

مجتبیٰ حسین کے اعترافِ خدمات کیلئے جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی صدارت میں ایک کل ہند کمیٹی تشکیل دی گئی ہے۔ اس کمیٹی کے تمام عہدیداروں اور اراکین بالخصوص جناب عابد علی خاں، پروفیسر اشتیاق عابدی، جناب کمال الدین احمد، جناب کے یل ساقی نارنگ، جناب کے ایم خاں کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے جن کے تعاون کے بغیر اس ضخیم نمبر کی اشاعت کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا تھا۔

۱۹ر نومبر ۸۷ء بارہ ۱۱ بجے دن

مصطفیٰ کمال